ترتیب

افسانے

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

آیئے آج اسی شمارے کی باتیں کریں۔

میری خوش قسمتی کہ اب کے نقوش کا عام شمارہ نکل رہا ہے۔ خاص نمبر نکالنا اور تلوار کی دھار پر چلنا، میرے نزدیک ایک ہی بات ہے۔ ارادہ ہے کہ ابھی دو چار ایسے ہی "غریبانہ قسم" کے عام شمارے نکالوں۔ تاکہ ذرا سستالوں اور اس قابل ہو سکوں کہ اپنے ادبی گناہوں کا کفارہ پھر کسی اہم نمبر کی صورت میں ادا کر سکوں۔

۱۹۴۴ء کی بات ہے کہ ہمارے ہاں "مستورات کے اخبار" میں ایک افسانہ "بونے" بھی پڑا تھا۔ اُسے پڑھا تو صادق حسین سے ملاقات ہوئی۔ وہ افسانہ چھپ گیا۔ چھوٹا سا سیدھا سادا، مگر اچھا افسانہ تھا۔ غالباً یہ ان کا پہلا ہی افسانہ تھا۔ اُس وقت مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ ایک دن یہ ایسے افسانے لکھیں گے کہ "نقوش" ان کی اشاعت پر سینہ تان سکے گا۔

ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ جب تک لکھنے والا مر تا مرنے کے قابل نظر نہ آئے۔ اُسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اب کے نقادوں سے پوچھوں کہ آپ صادق حسین کے افسانے پڑھ رہے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں پڑھ رہے تو میری بات سُن لیں۔ یہ نئے افسانہ نگاروں میں تو ممتاز نظر آرہے ہیں۔ پرانے لکھنے والوں سے ان کے افسانوں کا تقابل احتراماً مقصود نہیں۔ بہرحال ان کے اکٹھے تین افسانے پیش کیے جا رہے ہیں۔

اپنے ادب کا دامن بھی وسیع ہو گا۔ جب ہم دنیا کے بڑے ادیبوں کی بھی اپنے ہاں کچھ نہ کچھ منتقل کرتے رہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ہمیں جاپانی ڈرامے کی ایک خاص صنف سے روشناس کرایا ہے اور شروع میں چند ایک صفحے بطور تمہید لکھ کر بڑی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ ضرورت ہے سوجھ بوجھ رکھنے والے ادیب (معاف کیجیے گا، ہر ادیب کے حصے میں سوجھ بوجھ نہیں آیا کرتی) برابر اُردو میں ایسی چیزیں منتقل کرتے رہیں۔ ان کا ادب پر احسان ہوگا۔

یکتے کا فر اور منفرد ادیب جناب نیاز فتحپوری ۹ رمئی ۱۹۶۰ء کو لکھنؤ سے لاہور پہنچے۔ ادارۂ نقوش میں لاہور کے دانشوروں نے ان کا استقبال کیا۔ خوب خوب باتیں ہوئیں۔ مزے مزے کی چوٹیں ہوئیں۔ اب میں کیسے اُن نقوش میں آپ کو شریک کروں؟ اور کیسے بتاؤں کہ زبان و ادب کے کیسے کیسے اَدق مسئلے منٹوں میں پانی ہوئے۔ بہرحال چند تصویریں اس محفل کی یادگار ہیں۔ جو تصویری مضمون کی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

آج سے پندرہ بیس برس پہلے راجہ مہدی علی خاں کی نظمیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ پھر نہ ملیں۔ چنانچہ میں نے راجہ مہدی علی خاں کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ بھی لگا رکھا تھا۔ مگر پچھلے دنوں ان کے تین خط آئے۔ پھر ایک زندہ قسم کی نظم بھی ملی۔ اب میں کیسے یقین کروں کہ راجہ مہدی علی خاں مر چکے تھے۔



ادارۂ نقوش میں

نیاز فتحپوری

کے ساتھ

ایک شام

جس میں ممتاز ادیبوں، صحافیوں اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی













دیوانِ غالب اُردو کا ایک اور نادر مخطوطہ

امتیاز علی عرشی

اس امر میں بھی مرزا غالب دوسرے اُردو شاعروں سے ممتاز ہیں کہ ان کے دیوانِ اُردو کے جتنے نسخے ان کی زندگی کے لکھے ہوئے ملتے ہیں کسی اور کے دیوان کے اتنے نہیں ملتے۔

میں نے "نسخۂ عرشی" کی ترتیب و تصحیح میں ۶ قلمی اور ۵ مطبوعہ نسخوں سے کام لیا تھا۔ خیال تھا کہ اب مزید مخطوطہ شاید نہیں ملے گا لیکن ابھی کتاب چھپنے سے پہلے کراچی میں ۱۸۴۵ء کے ایک قلمی نسخے کی نشان دہی کی گئی تھی کہ اس کے فوراً بعد ایک مخطوطہ بدایوں میں بھی نکل آیا۔ آئندہ سطور سے معلوم ہوگا کہ یہ نسخہ کس قدر قیمت کا ہے۔

پہلے یہ بتا دوں کہ اس موتی کے مالک جناب احید الدین نظامی صاحب مالک نظامی پریس بدایوں ہیں۔ موصوف صاحبزادے ہیں جناب مولانا نظام الدین حسین نظامی مرحوم کے جنھوں نے دیوانِ غالب سادہ و باشرح کے متعدد و بہترین نسخے شائع فرما کر ملک پر بہت بڑا ادبی احسان کیا تھا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے غالب کے اُردو دیوان کے فارسی دیباچے کی تاریخ ایک رام پوری نسخے کی مدد سے متعین کی تھی نیز نامی پریس کانپور کے بعد حسنِ طباعت کا جو اعلیٰ معیار آپ نے قائم کیا تھا وہ آج بھی قابلِ داد و ستائش ہے۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور احید صاحب اور ان کے بچوں کو مرحوم کی اقتدا کا حوصلہ عطا فرمائے۔

دیوانِ غالب کا یہ نسخہ جسے میں آئندہ نسخۂ بدایوں کے نام سے پکاروں گا ۸½ × ۵½ انچ ناپ کا ہے۔ روشنائی کالی، عنوان اور جدول شنگرفی اور باریک لاجوردی ہے۔ کاغذ بانس کا دیسی بنا ہوا ہے۔ ہر ورق میں رکاب بھی ہے اور ہر ورق داغ بھی۔ خط شکستہ آمیز نستعلیق ہے معمولی کرم خوردگی بھی پائی جاتی ہے۔ جلد پرانی مگر عام حالت اچھی ہے۔

سرورق پر مہر ہے جس میں "محمد ذوالفقار الدین ۱۲۵۲ھ" کندہ ہے۔ ورق ۱ (الف) پر قصیدۂ فارسی در مدح شہزادہ سلیم شروع ہوا ہے۔ ورق ۲ ب پر ختم ہوا ہے۔ قصیدے کے ۵۵ شعر ہیں اور مطلع حسبِ ذیل ہے ؎

دریں زمانہ کہ کلکِ رصد نگار حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم!

یہ قصیدہ کلیاتِ غالب فارسی کے تمام مخطوطوں اور مطبوعہ ایڈیشنوں میں موجود ہے لیکن نسخۂ بانکی پور نوشتہ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء)، نسخۂ مطبوعہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء)، نسخۂ رامپور زبارہ سنگیشی، مکتوبہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں اس کا عنوان ہے "در مدح عرش آرام گاہ محمد اکبر شاہ

بادشاہ غالب شاہ": ہوسکتا ہے کہ نسخۂ بدایوں کا عنوان غالب کا مجموعہ ہو اور اس لیے کہ اس میں شاہ سے پہلے شاہزادے کی مدح کی گئی ہے ——

ورق ۴ الف پر فارسی کا ایک قطعہ ہے جس کا عنوان ہے "سہرا نامہ کہ بہ نواب اکبر علی خاں نوشتہ شد" یہ خطوط آہنگ میں چھپ چکا ہے اس کا عنوان ہے "بنام نواب سید علی اکبر خاں متولی امام باڑہ ہگلی بنگالہ" (آغاز آہنگ پنجم)

ورق ۴ الف پر ایک فارسی نظم ہے جو انھوں نے بلی کی ثنا و صفت میں لکھی تھی۔ اس کا پہلا بیت یہ ہے ——

دارم بہ جہاں گربۂ پاکیزہ نہادے
کز بال پر براو بود موج رم او

قطعہ گیارہ اشعار کا ہے اور اس عنوان سے نقل کیا گیا ہے: "دست نوازش بہ پشت گربۂ مسکیں فرود آوردن و بلابہ ولاغ از آزار جانداران باز داشتن" یہ قطعہ نسخۂ رام پور ۱۲۶۴ھ میں اسی عنوان کے ساتھ اور دوسرے نسخوں میں بے عنوان موجود ہے۔ تعداد اشعار سب میں نسخۂ بدایوں کے مطابق ہے۔

ورق ۵ الف سے (جس پر ایک کا ہندسہ ڈالا گیا ہے) طغرے دار لوح کے نیچے دیوان کا آغاز ہوا ہے۔ اوپر کے بائیں کونے میں باریک قلم سے "نوشتہ ورق جزو اول دیوان ہندی مرزا اسد اللہ خاں غالب" لکھا ہے اور اس نوٹ کے نیچے مذکورۂ بالا مہر ثبت ہے۔ دیباچۂ دیوان نئے ورق داغ کے مطابق ۲ الف کے حاشیے پر یوں نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل دیوان کو نقل کرنے کے بعد اسے لکھا گیا تھا۔

اشعار کا آغاز بجائے "بسم اللہ" کے "ہو اللہ" سے ہوا ہے اور مضامین کی ترتیب مطابق ذیل ہے:-

ردیف الالف (بدون عنوان)	ورق ۵ الف
" الباء الموحدہ	" ۱۳ ب
" التاء المثناۃ الفوقانیہ	" ۱۴ الف
" الجیم المعجمۃ التازیہ	" ۱۵ الف
جیم فارسی	" ۱۵ الف
ردیف الدال المہملہ	" ۱۵ ب
" الراء المہملہ	" ۱۶ الف
" الزاء المعجمہ	" ۱۸ الف
" السین المہملہ	" ۱۹ الف
" الشین المعجمہ	" ۱۹ ب
" العین المہملہ	" ۱۹ ب
" الفاء	" ۲۰ الف

[illegible]

... میں کو بس ہی مجھی
صبح دملی ... ن نہ مجھی

اور نور کہتی کو ہم ... کیا رہنی تھی
... اک شعر میں انداز ... رہنی تھی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رنگ ہوائی باشہ بانی نشاں کا — دکھا قہر کہ اب ہی ہے پیک موت کی

نہ بہا کیکی کرن نہ تو بیٹھا ہے — ہن اوس ذکسیر بہ کہ محسن نشان

ردیف الکاف التازیہ	ورق ۲۱ الف
کاف فارسی	" ۲۱ الف
ردیف اللام	" ۲۱ الف
المیم	" ۲۱ ب
النون	" ۲۲ الف
باب الواو	" ۲۸ الف
ردیف الہاء	" ۲۹ ب
الیاء	" ۲۹ ب

اس کے بعد ورق ۵۱ ب کالم ۱ میں لکھا ہے "تمام شد دیوانِ ریختہ" کالم ۲ سے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ پہلا قصیدہ ہے "ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار" اس کا عنوان ہے "منتخب قصیدہ منقبت حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام"۔ ورق ۵۳ الف کالم ۲ سے دوسرا قصیدہ بعنوان "انتخاب قصیدہ منقبت حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام" شروع ہو کر ۵۴ ب پر ختم ہوا ہے۔

ورق ۵۴ ب تا ۵۵ ب پر ہے "قطعہ در تمہید پیچکی ڈالی کردوستی برکف دست نہادہ از مہربانی دادہ بود"۔ نسخۂ رام پور قدیم میں بھی یہی عنوان ملتا ہے۔

ورق ۵۵ ب سے ۵۶ الف تک رباعیاں ہیں۔ ان کی تعداد ۸ ہے۔ ۵۶ ب سادہ ہے، ۵۷ الف سادہ ہے ۵۷ ب سے ۵۹ ب کی سطر ۲ تک نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر و رخشاں شاگرد غالب کی مشہور فارسی نثر بطرز لیان ہے۔

آخر میں ۸ ورق پر حکیم مومن خاں مرحوم کا ساقی نامہ ہے جس کا پہلا شعر ہے ؎

کھولیو ساقی اسے کو سبو کے
پیتے ہیں کب سے گھونٹ لہو کے

تعداد اشعار

اس نسخے کے اشعار کی تعداد بہ تفصیل ذیل ہے :-

غزلیات :

الف	۲۲۶	د	۳۹
ب	۱۲	ز	۲۰
ت	۱۹	س	۷
ج	۴	ش	۲
چ	۶	ع	۸
ح	۹	ف	[illegible]

ک	۱۵	ہ	۲۹
گ	۲	و	۳
ل	۹	ی	۴۳۵
م	۸		
ن	۱۴۳	میزان کل	۹۷۸
		قصائد	۶۰
		قطعات	۱۳
		رباعیات	۱۶
		میزان	۱۰۶۷

اشعار کی یہ تعداد متن تک محدود ہے۔ کچھ شعر نسخے کے حاشیوں پر بھی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی تعداد یہ ہے:

غزلیات ردیف الف		۴
" " ن		۴
" " و		۹
" " ی		۹
قصائد		۱
قطعات		۲
رباعیات		۴
میزان		۱۱۰۰ = ۱۰۶۷ + ۳۳

اس صورت میں متن و حواشی دونوں کے اشعار کی تعداد ۱۱۰۰ ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) کے دیباچے صفحہ ۸۳ میں بیان کیا ہے رام پور کے سب سے پرانے مخطوطہ دیوان میں اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے اس میں ردیف الباء کا یہ شعر موجود نہیں ہے —

شرح ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسم گل
رہبر قطرہ بہ دریا ہے خوشا موج شراب

چونکہ یہ شعر نسخۂ حمیدیہ کے حاشیے اور نسخۂ شیرانی کے متن دونوں میں ملتا ہے جو نسخۂ رام پور سے پرانے ہیں اس لیے اس شعر کو کاتب کا سہو سے محذوف مانا جائے گا اور اس صورت میں نسخۂ رامپور کے اشعار کی کل تعداد ۱۰۶۸ ہو گی۔

لیکن جیسا کہ اوپر کے نقشے سے ظاہر ہوتا ہے نسخۂ بدایوں کا متن ۱۰۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس سے بظاہر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ نسخۂ بدایوں رام پور کے قدیم نسخے سے عمر میں بڑا ہے لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے جیسا کہ میں آئندہ واضح کروں گا۔ اس کمی کی وجہ نسخۂ بدایوں کے کاتب کا ایک سہو ہے۔ اس نے ردیف نون کی ایک ۴ شعر کی غزل جس کا مطلع ہے ؂

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

متن میں نہیں لکھی ہے اور غلطی سے آگاہ ہونے کے بعد حاشیے میں اس کا اضافہ کیا ہے۔ اگر یہ ۴ شعر متن میں ہوتے تو نسخۂ بدایوں کی تعداد اشعار نون بھی ۱۱۰ ہو جاتی۔ ۔ اور اس اضافے سے کل شعر ۱۱۰ تک پہنچ جاتے۔

زمانۂ ترتیب

اس نسخے میں نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیّر کی لکھی ہوئی فارسی تقریظ بھی پائی جاتی ہے۔ تقریظ کا سال تالیف ۱۲۵۴ھ ہے جو مارچ ۱۸۳۸ء سے شروع ہو کر ۱۸۳۹ء کے مارچ ہی پر ختم ہوتا ہے۔ متن میں ایسی کوئی نظم موجود نہیں جو اس سال کے بعد لکھی گئی ہو لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ اسی سال کا مرتبہ نسخہ ہے۔

آیا یہ وہی اصل نسخہ ہے جو نیّر کی تقریظ کے ساتھ پہلی بار لکھا گیا تھا؟ اس کا جواب میری دانست میں "نہیں" ہے کیونکہ اس میں اس قسم کی املائی غلطیاں ہیں جو نیّر کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ ہے اسی کی نقل اور نقل بھی میری دانست میں میرزا صاحب کے ان دوست نے کرائی تھی جن کے بارے میں انھوں نے اپنے اردو خطوں میں جگہ جگہ لکھا ہے کہ وہ میرا کلام جمع کرتے رہتے تھے یعنی حسین مرزا۔ اس خیال کی بنیاد اس مُہر پر ہے جو اس نسخے میں ثبت ہے اور جس میں "محمد ذوالفقار الدین ۱۲۵۲ھ" کندہ ہے کیونکہ حسین مرزا کا بڑا نام یہی تھا۔ اس کی تائید حواشی کے مندرجات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ نئے نئے شعر وہی حاشیوں پر لکھتا رہے گا جسے مرزا صاحب کے کلام کو جمع کرنے کا شوق ہوگا۔

مذکورہ بالا امور کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ نسخہ تاریخی ترتیب میں نسخۂ رام پور قدیم کے بعد آتا ہے کیونکہ نسخۂ رام پور میں نہ تو نیّر کی تقریظ ہے اور نہ اس میں وہ دس نئے اشعار ہیں جو نسخۂ بدایوں کی خصوصیات کے تحت آ رہے ہیں۔

خصوصیات

اس نسخے میں کچھ خصوصیات بھی ہیں مثلاً

۱۔ اس میں پرانے رسم الخط کے مطابق اعراب بالحروف کا طریقہ برتا گیا ہے چنانچہ "دکھا" کو "دیکھا" اور "منہ" کو "موہنہ" لکھا گیا ہے۔ کئی جگہ "نے" کو "نیں" (نون غنہ در آخر) بھی لکھا ہے۔ گھبرانا کو گھبڑانا لکھا ہے جو اسی لفظ کا ایک قصباتی لہجہ ہے۔

۲۔ اس میں دو شعر تمام دوسرے نسخوں سے زائد ہیں اور وہ یہ ہیں ؂

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں انداز رسا رکھتے تھے

اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا !
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے
جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بعد کے نسخوں میں غالب نے صرف مقطع برقرار رکھا اور پہلے دونوں شعر حذف کر دیے۔ جہاں تک شعروں کی خوبی کا تعلق ہے اپنے اندازِ بیان و طرزِ فکر دونوں کے لحاظ سے رکھنے کے قابل تھے لیکن پھر بھی انھیں کاٹ دینے کی وجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتی کہ ان کی موجودگی مقطع کے مضمون کو محدود کر دیتی ہے اور صرف مقطع وجہِ شکایت کی تعمیم ہونے کے باعث آفاقی و ہمہ گیر رہتا ہے۔

۴۔ اس نسخے میں ۳۔۴ شعر حاشیوں پر مندرج ہیں جو بظاہر اس کی علامت ہے کہ یہ ترتیبِ نسخہ کے بعد کہے گئے تھے۔ اس حاشیہ نگاری سے جہاں یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ نسخہ کا تعلق غالب کے کسی دوست یا عزیز سے تھا وہاں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اشعار تاریخی اعتبار سے کس زمانے سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اشعار یہ ہیں:

ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال
ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم

ان اشعار میں سے پہلے ۶ شعر رام پور کے قدیم نسخے کے متن میں موجود ہیں۔ چونکہ وہ نسخہ از روئے تاریخ زیرِ نظر نسخے سے پرانا ہے اس لیے میری دانست میں یہ کاتبِ نسخہ کا سہو تھا جس کی حاشیے پر تصحیح کر دی گئی ہے۔

۵۔ اس سلسلے میں یہ بات رہ گئی کہ رام پور کے نسخۂ قدیم کی طرح قصیدے کا یہ مطلع ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس نسخے کے متن میں بھی نہیں ہے بلکہ یہاں حاشیے پر لکھا ہوا ملتا ہے جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ مطلع ۱۸۱۶ اور ۱۸۲۱ کے درمیان کسی وقت لکھا گیا تھا۔

آخر میں غالب کی مذکورہ بالا رباعی کی تاریخ کے متعلق اپنی تازہ تحقیق بھی عرض کر دوں۔ اس کا چوتھا مصرع ہے :

ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

اس مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سال یہ رباعی لکھی گئی تھی ہندو مسلم تہوار جمع ہو گئے تھے۔ یہ بات مسلم ہے کہ دوالی ہمیشہ کاتک کی آخری کسی تاریخ کو ہوتی ہے جب کہ چاند چھپ چکا ہوتا ہے اور شبِ قدر عام طور پر رمضان کی ۲۷ تاریخ کو تسلیم کی جاتی ہے۔ ان امور کے پیشِ نظر علمِ ہیئت کی مقررہ تاریخوں پر غور کیا جائے تو متعین ہو جاتا ہے کہ ہندو مسلم تقریبوں کا یہ اجتماع ۲۷ رمضان ۱۲۵۷ھ مطابق ۸ کاتک ۱۸۹۸ بکرمی موافق ۱۲ نومبر ۱۸۴۱ء کو ہوا تھا لہٰذا یہ رباعی ۱۲ نومبر ۱۸۴۱ء کو یا اس سے ایک دو دن پہلے لکھی گئی ہوگی۔

اس نتیجے سے ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ دیوان کا پہلا ایڈیشن اپنے سرورق کے اعتبار سے "شہر شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو چھاپا ہوا" تھا لیکن اس ایڈیشن میں مذکورۂ بالا رباعی بھی داخل ہے لہٰذا بجائے ماہ اکتوبر کے ۱۲ نومبر کے بعد اس کا چھاپا تمام ہونا چاہیے اور اس صورت میں سرورق کی تاریخ کو آغازِ کتابتِ نسخہ کی تاریخ قرار دینا چاہیے۔ اس آخری خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سرورق جداگانہ نمبر صفحہ کے ساتھ نہیں چھپا ہے۔ اگر یہ صفحہ اصل کی کتابت کے بعد لکھا گیا ہوتا تو اپنا جداگانہ نمبر صفحہ بھی رکھتا ہوتا جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے۔

ان اسباب و وجوہ کی بنا پر یہ نسخہ غالب پر کام کرنے والوں کے لیے دلچسپی کا بے حد باعث ہوگا۔

اُردو مرثیہ

محمد طاہر فاروقی

دوسرے اصنافِ سخن کی طرح مرثیہ بھی اُردو میں فارسی سے آیا۔ فارسی ادبیات میں مرثیہ واقعاتِ کربلا کے علاوہ دوسرے سانحاتِ غم کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا مگر مرثیہ کا یہ مفہوم کہ وہ حادثہ کربلا کے واقعات و سوانح کے لیے مخصوص ہو، فارسی ہی میں متعین ہو چکا تھا۔ اُردو نے فارسی سے مرثیہ لیا تو اس مفہوم و موضوع کی تخصیص کو بھی برقرار رکھا۔

اردو مرثیہ کو معراجِ فن پر پہنچے ہوئے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن بحیثیت صنفِ نظم کے اس کی عمر چار سو سال سے متجاوز ہے جس طرح دیگر اصنافِ نظم نے شمال سے قبل دکن میں نشو و نما پائی اور ارتقا حاصل کیا تھا اسی طرح اُردو مرثیہ بھی دکن میں اس وقت مروج و مقبول تھا جب شمال میں کسی نے اس کی طرف التفات بھی نہ کیا تھا۔ تقریباً ڈھائی سو سال تک مرثیہ صرف دکن میں اپنی فنی ترقی کے ابتدائی مدارج طے کرتا رہا اور اس بات کو دو سو سال سے بھی کم مدت گزری ہے کہ شمالی علاقوں میں مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی گئی۔

اس برِ عظیم پر مغلیہ سلطنت کے آغاز سے قبل دکن میں کئی خود مختار سلطنتیں قائم تھیں جو علم و فن کی تربیت اور سرپرستی کے معاملے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتی تھیں۔ ان کے درباروں اور سلطنتوں میں دکنی اُردو قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے مروج تھی۔ اس لیے ان بادشاہوں کے زیرِ سایہ فارسی سے زیادہ دکنی کو فروغ حاصل ہوا۔ دکن کی ان حکومتوں میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی دو ریاستیں مستقل شیعہ مذہب رکھتی تھیں اور یہاں شیعیت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈے میں امام باڑے بھی موجود تھے اور وہاں مرثیہ خوانی بھی ہوتی [illegible]

> "[illegible] قطب شاہ کے زمانے میں جشنِ میلادِ مبارک کی تقریبوں کے ساتھ ساتھ محرم کی تعزیہ داری میں بھی تقی ہوتی۔ تمام ممالک محروسہ میں ایامِ عاشورہ تک نوبت نقارہ موقوف رہتے۔ گوشت اور پان کی دوکانیں بند ہو جاتیں۔ تمام [illegible] ماتم میں شریک ہوتے تھے۔"
>
> "گولکنڈہ میں دو شاہی عاشور خانے تھے۔ یہاں مرثیہ خواں اور مداحِ شہدا ہر شب کو جمع ہوتے اور اُردو میں مراثی اور مناقب پڑھتے تھے۔ چھٹی تاریخ کو عاشور خانے کے باہر کے علم اٹھائے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ محبانِ ائمہ اطہار ہاتھوں میں مشعل لیے ہوتے اور ذاکر و مداح مرثیہ خوانی اور مداحی اشعار پڑھتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ دسویں تاریخ کو خود سلطان عبداللہ سیاہ لباس اور برہنہ پا علموں کے ساتھ ہوتا تھا۔ مرثیہ خواں آگے آگے مرثیے پڑھتے جاتے تھے۔"

بیجاپور کے شاہی عاشور خانے میں بھی یہی سب کچھ اہتمام ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرپرستی اور ترقی کے ان تمام اسباب کی موجودگی میں اُردو مرثیہ گوئی کو رواج اور قبولِ عام حاصل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسے شعراء کی خاصی طویل فہرست نظر آتی ہے جو صرف مرثیہ گوئی کرتے تھے اور ان کے علاوہ دوسرے شعراء بھی گاہے گاہے مرثیہ لکھ کر ثوابِ دارین حاصل کرتے تھے۔

دکنی دور کے مرثیوں میں کہیں کہیں واقعہ نگاری اور مرقع کشی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اس زمانے کے مرثیے ادبی اور فنی محاسن سے عاری ہیں۔ ان کا اصل مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ جنابِ امامؑ اور آپ کے رفقا کی یاد تازہ کی جاسکے اور ان کے غم و الم میں رویا اور رُلایا جاسکے۔ فنی تکمیل کا کام قدرت نے لکھنوی اساتذہ کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر سے اٹھارویں صدی کے وسط تک کافی طویل مدت ہے۔ اس ڈھائی سو سال کے عرصہ میں اُردو مرثیہ دکن میں پروان چڑھتا رہا اور بہت سے خوش گو مرثیہ خواں پیدا ہوئے۔ اشرف، وجہی، نوری، ہاشمی، ذوقی، نعیم احمد، رضی، قادر، امامی، قائم، شرف، برہان اور ہاشم علی اس عہد کے کامیاب اور مقبول مرثیہ گو گزرے ہیں۔

اس طویل دور میں مرثیہ کے لیے کوئی ایک ہیئت مقرر نہ تھی۔ غزل، مثنوی، قطعہ، مربع، مخمس مختلف شکلوں میں مرثیے ملتے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ مسدس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ ان شعراء کے مرثیوں کے مکمل مجموعے موجود نہیں ہیں لیکن مختلف تذکروں اور بیاضوں سے ان کے کلام کی کچھ مثالیں دستیاب ہو جاتی ہیں لیکن زمانے کی اس ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ ان میں سے بعض شعرا کے جو نمونے ملتے ہیں وہ ان کی اس شہرت و مقبولیت کے شایاں نہیں سمجھے جاسکتے جو انھیں اپنے زمانے میں حاصل تھی۔

ان مرثیوں کی زبان جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے قدیم دکنی اُردو ہے پھر ان میں کوئی بڑی ادبی اور فنی خوبی بھی نہیں پائی جاتی اس لیے آج ان کو سننے سنانے میں کوئی خاص مزا نہیں البتہ تاریخی تسلسل برقرار رکھنے کے لیے بعض ایسے حصے سُنئے جن میں لسانی اُلجھن کم سے کم ہے۔

دکن میں مرزا تخلص کے دو مرثیہ گو تھے۔ ایک بیجاپور میں دوسرا گولکنڈہ میں۔ گولکنڈے کے مرزا نے بہت مرثیے لکھے تھے جو مختلف بیاضوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ زبان وہی دکنی ہے مگر سوز و گداز سے بھرے ہوئے اور پُر اثر ہیں۔ ایک مثال سُنیئے ؎

الوداع اے الوداع شاہِ شہیداں الوداع
الوداع ابن علیؑ دو جگ کے سلطاں الوداع

شاہِ دو عالم ہوئے مظلوم حیراں الوداع
یو چلے دنیائے فانی سوں عزیزاں الوداع

یو شفق نیں ہے گگن پر صبح و شام اس درد سوں
نت بھراویں لہو سے دامن گریباں الوداع

ہاشمی کو بیجاپور کے نامی گرامی مرثیہ گویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک مرثیہ سُنئے جس کی زبان سادہ اور آسان ہے ؎

دل بندِ مصطفیٰؐ کا تابوت لے چلے ہیں
فرزندِ مرتضیٰؑ کا تابوت لے چلے ہیں

سلطانِ دو جہاں کا سردار اولیا کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

حضرت حسین حسن کا سشاو زبیں زمن تھا
حضرت نبی امتھا کر تابوت لے چلے ہیں

حضرت کے تھے نیک سعید کے تھے غلام
ہمارے شہید پیارے تابوت لے چلے ہیں

بکس کے منظیدہ میں تین مرثیہ گو سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ذوقی، اشرف اور نعیم احمد۔ ذوقی ایک کہنہ مشق شاعر تھے مختلف اصناف سخن میں مشق کی ہے۔ مثنوی اور مرثیہ میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے مرثیہ کا نمونہ یہ ہے

مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک سب عالم ہو جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں

وہ جا ابد وزخ وطن آتے ہیں دل کے تن
جوں برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں

وہ شمع بزم مصطفیٰ باد اجل سوں گل ہوا
سب سندل سوں تن سلیا ہیں گلاتے کیوں نہیں

چھوڑ دو سنگل دنیا کے کام سوں تن تکاٹ سنگ خاص و عام
ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلاتے کیوں نہیں

سنتے ہو تم اسے مومناں شہ کی شہادت کا بیاں
مصیب خاک دھوں کے دیاں تن کو ملاتے کیوں نہیں

اشرف بھی اسی زمانے کا شاعر اور مرثیہ گو ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ سنئے

پانو کمتیں اصغر نہیں اب میں جھولاؤں کس کے تئیں
سکھ جو ہے پالنا اب میں سلاؤں کس کے تئیں

نہلا کے میں کپڑے پہنا کے کرتی بنائی گل تمن
وہ پھول سو کھا نیر بن اب میں بناؤں کس کے تئیں

سوتا تھا وہ جب نیند بھر پینے اٹھاتی دودھ کوں
ہیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں

جب مسکراتا وہ بچہ میں شاد ہوتی دل سے
بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں

جب شہ کو تکیں دیکھتی ہے جا کے دی گود میں!
سونا کفن وہ اوڑھ کر اب میں ملاؤں کس کے تئیں

تیم احمد عجیب سا نام ہے مگر زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس کا تخلص بھی یہی تھا۔ صرف مرثیے کہتا تھا۔ ایک نمونہ سنئے جو عجیب نظم ہے تو ہے بھی مسدس نہیں ہے ؎

سیف گھائل ہے حسینی تن تیرا　　جسم پرخوں ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کیا بھر تن تیرا　　کیوں نہ بسیرا ہوا ہے بدن تیرا
نہیں ملتا بوند کس کے تئیں پانی
سخت طفلاں کے سر پہ حیرانی
سیف اصغر نے تجھ کو رومانی　　جگ سوں پیاسا گیا ہے تن تیرا
تیر لگ کے گلے سوں مرجو پڑا ہے　　وا مصیبت میں بال پن تیرا
اے توں دلبر حسینؑ کے اصغر
آج رونا نہیں توں ہمت کر

مغلوں کے زمانے میں دکن فتح ہوا تو شمال و جنوب میں پھر تعلقات آمد و رفت جاری ہو گئے چنانچہ دکنی مرثیے بھی دہلی پہنچنے لگے اور یہاں کی مجلسوں میں پڑھے جانے لگے۔ پرانے تذکروں سے صاف طور پر ایسی شہادتیں ملتی ہیں۔
اس زمانے کے ایک مشہور شاعر حافظ رضی الدین رضیؔ کے مرثیہ کا نمونہ دیکھئے ؎

غم سوں ہے بیزار میرا دل　　دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشن غم میں ہے شہیداں کے　　لالۂ داغ دار میرا دل
نت شہیداں کے زخم غم سیں　　شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل
غم کی بجلی پڑی ہے جب کتے　　تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے　　ہو کے غم کا شکار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضیؔ
کیوں نہ ہو پر غبار میرا دل

قادر تخلص کے دو مرثیہ گو گزرے ہیں۔ ایک بیجاپور کے دوسرے حیدرآباد کے۔ حیدرآبادی قادرؔ کا زمانہ بعد کا ہے۔ یہ صرف مرثیے کہتے تھے۔ سادگی جذبات اور تسلسلِ خیال کے لحاظ سے ان کے مرثیوں کو امتیاز حاصل ہے۔ نمونہ دیکھئے ؎

ہوا شہرت محرم میں، بو غم سے شاہ عالی کا
کہ ہے فرزند پیارا وہ دونوں عالم کے والی کا
چھپا ہے دین کا چندر کہ جس کے سوگ سوں جگ پر
فلک پر ملک میں نا سلے شمیانا رات کالی کا
ستارے سب یہ قدسیاں نے ملا کر سب گگن اوپر
حسینؑ کے عرش کرں باندھے منڈپ موتیاں کی جالی کا

نہیں پایا شک شبنم سن ... کی

دیکھو غم کے جھمیلے سلامت غم کے مالی کا

امامی برہان پوری اس زمانے کا ایک اور مشہور اور مقبول مرثیہ گو ہے۔ شوقیہ مرثیے کہتا تھا۔ بیان میں دلکشی اور زور پایا جاتا ہے۔ اس کے ایک مرثیہ کا جو مربع ہے کچھ حصہ سنئے۔

محشر میں جب محمد شاہ زمن اٹھیں گے
سب انبیائے مرسل پرغم حزن اٹھیں گے
حیدر علی لہو سوں آلودہ تن اٹھیں گے
لیتے لہو کے بھلکاں سے بے حسن اٹھیں گے

آلودہ خاک وخوں میں دنداں مصطفےٰ لے
لہو سوں تر بتر سب دستار مرتضےٰ لے
ٹکڑے حسنؑ کے دل کے جامہ حسینؑ کا لے
تربت سے فاطمہ جب لے یو برن اٹھیں گے

... غم میں ہرگز کرنا نہیں خواصی
ہر چند تو امامی عالم منی ہے عاصی
امید تو قوی ہے پائے گا تو خلاصی
کرنے کے تیں شفاعت جب پنجتن اٹھیں گے

ہاشم علی برہان پوری اس دور کا بلند پایہ شاعر اور مرثیہ گو تھا۔ اس نے مربع، مخمس، قطعہ، غزل سب شکلوں میں مرثیے لکھے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مرثیے سننے کے لیے خواب میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اس کے ایک مربع کی مثال ملاحظہ ...

آج پرخوں کفن ترا اصغر ۔ آج شوکھا ہے تن ترا اصغر
لال ہے گلبدن ترا اصغر ۔ حیف یو بالپن ترا اصغر

کیوں ہیں نفاں کیتا ل ... ۔ کیوں گلے سیں یہ تیر کھا ری ...
تجھ کوں سوتے کبھو نہ کتی بار ۔ حیف یو بالپن ترا اصغر

اللہ گلے کا دوہر دھر لاتا ہیں ۔ نیند آئی تجھے سلاؤں ہیں
چل تماپا لنا جھولاؤں ہیں ۔ حیف یو بالپن ترا اصغر

اس طویل دکنی دور میں فنی حیثیت سے مرثیہ نے ترقی نہیں کی لیکن شک نہیں کہ متاخرین کے لیے سب راہیں اسی وقت ہموار کر دی گئی تھیں۔ عربی کرداروں کو مقامی رنگ دینا لکھنوی دور کی خصوصیت ہے لیکن اس کے اثرات اس دکنی دور میں نمایاں ہیں۔

بیانات، واقعات اور مکالمات سب متاخرین کے لیے مختص ہیں لیکن ان کے ابتدائی خط و خال دکنی مرثیوں میں مل جاتے ہیں۔ کسی صنف کے ابتدائی زمانے میں تکمیل کا احساس تلاش کرنا ہی بے سود ہے۔ یہی بات پورے دکنی مرثیوں پر صادق ہے لیکن اس زمانے کا یہ احسان ہرگز نہیں بھلایا جاسکتا کہ مرثیہ اسی عہد میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع سے دکنی مرثیے شمالی علاقوں میں پہنچنے شروع ہو گئے تھے اور یہاں کی مجلسیں ان سے گرمانے لگی تھیں۔ اسی زمانے میں فضلی نے روضۃ الشہدا کا اُردو میں وہ مجلس کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس میں انھوں نے ایک مسلسل نظم لکھی ہے جس میں حضرت قاسم کی بیوہ دلہن ان کی شہادت پر بین کرتی ہیں۔ چند شعر سنئے ؎

یہ کیا بُرا پھیرا تھا مرا اے رے لوگو　　　　دولہا کو سر اتی نہ ہیں اور موت سوائی
اشتے کے گنے بیٹھ کہا اے مرے نوشہ　　　　تو مر گیا اور میرے تئیں موت نہ آئی
اے میرے بنے تیری بنی تیرے بنا اے　　　　کفنی گلے میں ڈال کرے گی یہ گدائی
اے میرے بنے ساس کو میں منہ کیا دکھاؤں　　　　دل میں کہے گی کیسی بہو بیاہ کے لائی

اٹھارویں صدی کے شروع میں شمالی ملک میں بھی مرثیہ اپنی اس ابتدائی شکل میں نظر آتا ہے جس میں کوئی ادبی اور فنی خوبی نہیں۔ حسنِ بیان ادھر نہیں ہے۔ اس کا مقصد ابھی محض رونا اور رلانا ہے۔ اسی لیے ادبیت اور فنکاری نظر نہیں آتی لیکن یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اس کے بعد تھوڑی سی مدت میں مرثیہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ ترقی کرتا ہے اور اس رتبہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں نقاد یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مرثیہ گوئی کے میدان میں دنیا کی کوئی زبان اُردو کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتی۔

فضلی کی وہ مجلس کا زمانہ ۱۷۳۲ء کے لگ بھگ ہے۔ سوداؔ اور میرؔ اس وقت پیدا ہو چکے تھے۔ انھوں نے مرثیے بعد کو کہے ہوں گے لیکن اسی زمانے میں چند اور مرثیہ گو مشہور ہو چکے تھے۔ ان کے مرثیے آج ناپید ہیں بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دوسروں کے مرثیوں میں خلط ملط ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسی زمانے میں دہلی اور اطراف میں شعراء نے دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ مرثیہ کی طرف بھی توجہ کرنی شروع کر دی تھی۔

میرؔ اور سوداؔ کے ناموں کے ساتھ مرثیہ گو حضرات میں یہ نام نمایاں بتائے جاتے ہیں مسکینؔ، گداؔ، حزیںؔ، اماؔنی، صوفیؔ، سکندرؔ، غمگیںؔ، ان سب میں سوداؔ اور سکندرؔ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان استادوں نے شہادت کے مختلف پہلوؤں کو جمع کر کے ایک ہی مرثیہ میں نظم کیا اور ان میں ربط و تسلسل قائم کیا۔ نیز یہ کہ انھوں نے علاوہ دیگر اصنافِ نظم کے مسدس میں بھی مرثیے لکھے۔ سکندر کے مرثیے نہیں ملتے۔ ایک مسدس ان کی جانب منسوب ہے اور دھوم دھام سے مقبولیت کے ساتھ پڑھا جا رہا ہے۔

میر تقی میرؔ کا مرثیہ ان کے شایانِ شان نظر نہیں آتا۔ بہرحال نمونہ یہ ہے، سُنئے ؎

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے　　　　مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے　　　　حسینِ علیؑ کی شہادت کی شب ہے
محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے　　　　ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی واسئے ویلا مچی ہے　　　　کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے

مرزا سودا کو مرثیہ کی ادبی حیثیت کی سمت پوری توجہ تھی۔ ان کے کلیات میں انہیں مرثیے پائے جاتے ہیں۔ دیباچہ میں مرثیوں کی بابت لکھتے ہیں:-

"... لیکن متصل یہ بیت دقائق طاق مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربطِ معنی سے دیا۔ چنانچہ اس کام میں فقیر سا کسو نے مرتبہ قبول نہیں پایا ..... میں لازم ہے کہ مرثیہ مدنظر رکھ کر مرثیہ کہے کہ رلائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرلے۔"

سودا جیسا جامع کمالات، استادِ فن دوسرا پیدا نہ ہوا مگر مرثیہ کو وہ بلندی عطا نہ کرسکے جس کی طرف انھوں نے توجہ دلائی ہے۔ زبان البتہ دکنی دور کے مقابلے میں صاف ہوگئی ہے۔ یہ دور میر و مرزا کا عام احسان ہے اس میں صرف مرثیہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بہرحال سودا کے مرثیے کا نمونہ یہ ہے:-

کریں نہ اہلِ جہاں کس طرح سے شیون و شین
سروں کو اپنے نہ پیٹیں سو کیوں وہ کر کے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسینؑ
یہ تعزیہ ہے رسولِ خدا کے محرم کا

ہزار طرح کے دریا رواں تھے دنیا میں
جو کوئی تھا سو وہ سیراب تھا ہر اک جا میں
کئی غریب جو تھے کربلا کے صحرا میں
نصیب ان کو نہ قطرہ ہوا کسی یم کا

یہ ظلم کس کی زباں کو ہے کہنے کا یارا
نبیؐ کا قتل کیا ظالموں نے گھر سارا
جو ان میں طفل تھا شش ماہہ اس کو بھی مارا
کیا نہ عمر نے کچھ فرق زائد و کم کا

اب تک جو مرثیہ کا ارتقا تھا اس میں سودا کے عرصے کے بعد بھی ادبیت اور فنی حیثیت کم سے کم نظر آتی ہے البتہ میر و سودا کے فوراً بعد مرثیہ ایک مستقل اور اہم صنفِ سخن بن جاتا ہے اور ایسے شعرا کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے جنھوں نے مرثیہ کو ترقی دے کر عظمت اور اہمیت بخش دی۔

ان شعرا میں یہاں دلگیر، مرزا فصیح، میر خلیق اور میر ضمیر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دلگیر اور فصیح حج کے لیے گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ خلیق و ضمیر نے اپنی کوششیں یہاں جاری رکھیں اور اس لیے ان ساتھیوں سے زیادہ نام پایا ورنہ مرثیہ میں تسلسلِ بیان کے ساتھ اس کی پوری ہیئت کو متعین کرنے اور لازم بنانے میں یہ چاروں شریک ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس معاملے میں فصیح کو دلگیر پر، خلیق کو ان دونوں پر اور ضمیر کو باقی رفقا پر برتری حاصل ہے۔ مجموعی طور پر ہم یقیناً ان چاروں استادوں کے احسانمند ہیں کہ انھوں نے مرثیہ گوئی کو

ایک مستقل فن بنا کے اردو ادب کو مالا مال کر دیا۔

میاں دلگیر کا ایک بند بطور نمونہ کے سنئے۔ امام حسینؑ سفر کی تیاری فرما رہے ہیں۔ بی بی صغریٰ ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرتی ہیں۔ آپ ان کو سمجھاتے ہیں ؎

دشمنِ جاں ترے بابا کا زمانہ ہے تمام
طعنہ زن صاف ترے منہ پہ کہیں گے یہ کلام
شکل ہوئی فرقت کی نہ یہ بنتِ امام
باپ کے جاتے ہی بس ترک کیا آب و طعام
دادی کے طور سے ہرگز نہیں دکھ سہہ سکتی!
بولو صغرا کی ہے اور صبر نہیں کر سکتی!

حاجی مرزا جعفر علی فصیح کے مرثیے کئی جلدوں میں مرتب ہوتے تھے۔ ایک مرثیہ کے ابتدائی بند سُنئے ؎

ہے فصیح آلِ پیمبر کے ثنا خوانوں میں | کیا چمکتا ہے کلام اس کا سخن دانوں میں
دخل کرتا ہے اثر وار سخن کانوں میں | جیسے بجلی کی چمک آتی ہے والانوں میں
نالۂ غم زدہ سوتوں کو جگا دیتا ہے!
جان میں گرمِ سخن آگ لگا دیتا ہے

اس کی تصنیف جو پڑھتے ہیں محبانِ حسینؑ | روندتا چرخ کو ہے غلغلۂ شیون و شین
گرچہ مدت سے ثنا خواں ہے مقیمِ حرمین | روح کو اس کی ہے پُرشہۂ شبیرؑ میں چین
چشم تر نہرِ حسینیہ ہے دل حائر ہے
کربلا سینہ ہے اور جانِ حزیں زائر ہے

کبھی اشکوں سے بھگوتا ہے زمینِ عرفات | کبھی ہے آنسوؤں سے مزدلفہ میں برسات
حرمِ اللہ میں ہے اشک فشانی دن رات | ذبح کے وقت منیٰ میں ہے لبوں پہ یہ بات
تشنہ لب ذبح ہوئے دن میں عزا دارِ حرم
کٹ گئے تیغِ مخالف سے نہالانِ حرم

حضرت حرؑ اور ان کے تینوں رفیق (بھائی، بیٹا، غلام) اہل بیتؑ سے اجازت لے کر ان کی دعاؤں کے سایے میں میدان میں آتے ہیں۔ وہ منظر اور حضرت حرؑ کی شہادت کی تفصیل مرزا فصیح سے سنئے (دیکھئے ابھی مرثیہ کی تفصیلات اس درجہ پہ نہیں آئی ہیں کہ گھوڑا، تلوار اور رزم وغیرہ پہ بند کے بند لکھ دیے جاتے)

سنتا ہوا صدائے دعا اپنے کان سے | حرؑ آیا قتل گہ میں شہادت کی شان سے
آتی تھی مرحبا کی صدا آسمان سے | میداں میں کھینچی تیغ دوبارہ میان سے

ترکش سے برقِ چشمِ عدو خیرہ ہو گئی
بادل سا نوال گھر آیا ہوا تیرہ ہو گئی
تکبیر جو ان کے سینے میں بھالے آن کر | سوفار چومتے لبِ مشرق جان کر
جب نیزہ باز مارتے تھے نیزے تان کر | کھنچتے تھے ہم کو بارِ خدا امتحان کر
گلزار ہو رہا جسم کھلیں زخم پھول سے !
شرمندگی نہ ہو ہمیں آلِ رسولؐ سے
جب ہر طرف سے پڑنے لگا تیغ عمود | گھوڑوں سے کود خاک پہ پہنچے نکھرو
چاروں طرف سے تیر چلانے لگے حسود | وہ جاں نثار شکر کے کرنے لگے سجود
ناگاہ دریچے کھل گئے باغِ نعیم کے
آنے لگے بہشت سے جھونکے نسیم کے
رضواں نے لا کے خلعتِ رحمت پہنا دیا | آ کر ملک نے جامِ شہادت پلا دیا
حوروں نے ہر شہید کو بیڑا کھلا دیا | زہراؑ نے اپنی چشم سے دریا بہا دیا
رومال اپنا لال کیا حُر کے خون سے
آتی تھی بوئے عطر اس سادر کے خون سے

میر ضمیر نے مرثیہ کی ہیئت کو متعین کیا اور اس کے فنی حدود مقرر کیے۔ اب تک مرثیہ کی شکل بہت سادہ ہوتی تھی۔ غزل کے انداز پر سلام ہوتا تھا۔ پھر واقعاتِ شہادت کا مختصر بیان۔ تسلسلِ بیان پیدا کرنے کی کوشش ہونے لگی تھی لیکن مرثیہ میں سب سے مقدم سمجھا گیا تھا۔ ضمیر و خلیق اور خاص طور پر ضمیر نے اس کی ماہیت بالکل بدل دی۔ ترتیب کے ساتھ پہلے چہرہ باندھا۔ پھر رخصت، سراپا، آمد، رجز، گھوڑے، اسلحہ اور دوسری چیزوں کی تعریفیں، بیانِ شہادت اور سب سے آخر میں دعا۔ مناظر کی تصویر کشی بھی جا بجا درمیان میں آجاتی تھی لیکن خلیق نے رزمیہ مرثیے نہیں لکھے۔ رزمیہ مرثیے میر ضمیر کی ایجاد ہیں۔

میر خلیق کے مرثیوں کی بابت مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ:

"میر نواب صاحب نامی ..... (نے) ایک مجموعہ چھاپا تھا جس میں میر خلیق، مونس اور انیس کے چند مرثیے جمع کیے تھے۔ اس میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں لیکن اکثر وہ ہیں جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں اور جو میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں لیکن زبان اور طرزِ ادا سے قیاس ہوتا ہے کہ میر انیس ہی کے نتائجِ فکر ہیں اور اگر وہ واقعی میر خلیق کا کلام ہے تو بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔"

لیکن یہ سب قیاسات ہیں۔ میر خلیق کے مرثیے سامنے نہ ہوتے ہوئے اس رائے پر یقین نہیں کیا جا سکتا البتہ میر ضمیر کی اولیت

اور عبارت شک اور شبہ سے بالاتر ہے۔

میر ضمیر اپنے ایک مرثیہ میں وہ واقعہ بیان کرتے ہیں جب حضرت مسلمؑ کوفے میں اکیلے رہ گئے ہیں اور چاروں طرف سے فوج نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ آپ باہر نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ؎

دیکھی اک برق چمکتی ہوئی تلواروں سے
شہر کے کوچے تھے معمور ستمگاروں سے

حضرت مسلمؑ تن بہ تقدیر آمادۂ جنگ ہو جاتے ہیں۔ میر ضمیر کم لفظوں میں کتنے بڑے واقعے کی تفصیل کامیابی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں۔

قید کر لینے کی مسلمؑ کے بہت کی تدبیر ۔۔۔ شیر اللہ کے جیسے کہیں ہوتے ہیں اسیر
جب کئی جسم مبارک پہ لگے نیزہ و تیر ۔۔۔ یا حسینؑ ابنِ علیؑ کہہ کے نکالی شمشیر

پھر تو جس سمت جھکے اور جدھر وار کیا
قدِ آدم سے سوا لاشوں کا انبار کیا

میر خلیق امام عالی مقام کے مدینے سے کوچ فرمانے کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

گھر سے جب بہرِ سفر سیدِ عالم نکلے ۔۔۔ سر جھکائے ہوئے با دیدۂ پُرنم نکلے
خویش و فرزند کمر باندھ کے باہم نکلے ۔۔۔ رو کے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے

رات سے گریۂ زہراؑ کی صدا آتی ہے
دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لیجاتی ہے

یہ بیاں کر کے چلے اس سے شہِ کون و مکاں ۔۔۔ بیکسی چہرے پہ چھائی تھی تو آنسو تھے رواں
لوگ سر پیٹ کے اس طرح سے یوں گریہ کناں ۔۔۔ پیچھے تابوت کے جس طرح سے ہو شور و فغاں

غل تھا اے سیدِ ذی جاہ خدا کو سونپا
اے مدینے کے شہنشاہ خدا کو سونپا

ذات شبیرؑ کی تھی اک رحمتِ ربِ باری ۔۔۔ کون اب دکھ میں غریبوں کی کریگا یاری
فیض کس گھر سے مدینے میں رہے گا جاری ۔۔۔ پائیں گے کس کی دعاؤں سے شفا آزاری

شہر سے سایۂ الطافِ خدا جاتا ہے
مشکلیں باقی ہیں اور عقدہ کشا جاتا ہے

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :۔

"انتہا یکساں ہیں دونوں استادوں کی رفتار الگ الگ تھی کیونکہ میر ضمیر استعداد علمی اور زور طبع کے بازوؤں سے بلند پروازی کرتے تھے اور پرے اترتے تھے۔ میر خلیق مرثیت کے کوچے سے اتفاقاً ہی قدم آگے بڑھاتے تھے وہ مضمون آفرینی کی ہوس نہ کرتے تھے اور ہمیشہ محاورے اور لطفِ زبان کو خیالاتِ درد انگیز کے ساتھ ترتیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے۔"

میر ضمیر نے مرثیہ کو تشبیہات و استعارات، روایات و محاکات، مناظرِ قدرت اور رزمیہ بیانات سے مالا مال کیا۔ سراپا کے ایجاد سے مرثیہ کو دو آتشہ بنا دیا اور طولانی و مرتب بندوں کے مرثیے لکھے۔ اب تک مرثیہ سوز کے لہجے میں پڑھا جاتا تھا۔ میر ضمیر نے سب سے پہلے تحت اللفظ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ ان کے بعد سب اسی ڈگر پر چلنے لگے اور یہی پسندیدہ طریقہ قرار پایا۔

خلیق و ضمیر نے مرثیہ کو جس اوجِ کمال پر پہنچا دیا تھا اور اسے جیسا مکمل فن بنا دیا تھا بظاہر اس میں ترقی کی کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔ یہ انیس و دبیر کی نابغیت ہے کہ انھوں نے مرثیہ کی طرف توجہ کی تو اس زمین کو آسمان بنا دیا اور اپنے بزرگوں کے فن کو اتنا بلند کر دیا کہ ان کے مرثیے زینتِ طاقِ نسیاں بن گئے۔

رزمیہ (PIC) یونان میں ہر اس نظم کو کہتے تھے جس میں موضوع کے ساتھ الفاظ پر، بیان کے ساتھ زبان پر اور خیال کے ساتھ طرزِ ادا پر زور دیا جاتا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ (ELLIOD) اور اوڈیسی (ODDESSY) ورجل کی اینیڈ (AENEAD) فردوسی کا شاہنامہ، والمیکی کی رامائن اور ویاس کی مہابھارت دنیا کی بہترین رزمیہ تصنیفات شمار کی گئی ہیں۔ اُردو کا مرثیہ بھی ایک بڑا رزمیہ ہے اور بلاشبہ ان شہ پاروں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

رزمیہ کی سب سے بڑی خصوصیتیں دو ہیں۔ موضوع کی عظمت اور اسلوب کا شکوہ۔ اور مرثیے میں یہ دونوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ موضوع کی عظمت کے لیے کسی لمبی چوڑی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام حسینؓ اور ان کے رفقا کی شہادت جیسا اہم اور پُرعظمت واقعہ ظاہر ہے۔ دراصل اُردو مرثیہ اس عظیم سانحے کی بازآفرینی ہے۔ رزمیہ ایک امت کے افکار، جذبات اور ولولوں کی ترجمانی کیا کرتا ہے اور ایک پورے عہد کے خیالات اس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اُردو مرثیہ میں اسلامی اخلاق و کردار کی عظمت ہے، ایثار و قربانی ہے، حق کے لیے سرفروشی کا جذبہ ہے، صداقت کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کی تڑپ ہے، چھوٹوں پر شفقت اور بزرگوں کا احترام ہے، دوستوں سے محبت اور دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی مثالیں ہیں۔ غرض اُردو مرثیہ اسلام کی بلند قدروں کا حامل ہے اور اس کے کردار ان قدروں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔

رزمیہ کے لیے جس تخیل کی بلندی اور پاکیزہ وجدان کی ضرورت بتائی گئی ہے وہ ہمارے مرثیہ نگاروں میں موجود ہے بلکہ اکثر دوسرے رزمیہ نگاروں سے بہتر ہے اس لیے کہ ان دونوں اوصاف کے ساتھ ان میں ایک خاص قسم کا جوش اور عقیدت مندانہ خلوص بھی پایا جاتا ہے جس نے مرثیے کے کرداروں میں زندگی کو اور زیادہ تابناک بنا دیا ہے اور اس کو ابدیت اور ان قدروں کو آفاقیت عطا کی ہے۔ اُردو مرثیے کی فضا ایک وسیع اور غیر محدود فضا ہے۔ مرثیہ نگار اس میں اپنے تخیل کی بلند پروازی دکھاتا ہے اور اس نقطے پر پہنچ جاتا ہے جہاں دوسروں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تخیل کی یہ بلند پروازی PIC کی خاص چیز ہے۔ اس سے رزمیہ میں عظمت و شان اور شوکت و شکوہ پیدا ہوتا ہے اور یہ صفت مرثیہ میں بدرجۂ کامل پائی جاتی ہے۔

مرثیے پر دو بڑے اعتراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ محض رونا رُلانا سکھاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس میں تاریخی واقعات کو بڑی حد تک بدل دیا گیا ہے بلکہ بہت سے واقعات اپنی طرف سے تراش کے شامل کر دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مرثیہ مجلسوں کے لیے لکھا جاتا ہے اس کی حیثیت کسی تاریخی کتاب کی نہیں ہے اس لیے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں کے مقصد کے لیے رنگ آمیزی اور مبالغہ از بس مفید اور ضروری ہوتا ہے۔ پھر اس پر اس زاویے سے بھی نظر ڈالنی چاہیے کہ مرثیہ ایک طرف رُلاتا ہے تو دوسری طرف جھنجھوڑتا بھی ہے۔

مرثیہ محض رلانا نہیں بلکہ سوتے ہوئے ملّی شعور کو بیدار کرنا ہے۔ رلانا مرثیے کا ابتدائی درجہ ہے۔ یہ اس کا مقصدِ اصلی نہیں بلکہ اس کی اگلی منزل ہے بلند جذبات کو بیدار کرنا اور اعلیٰ اخلاق کو ابھارنا۔ اسی طرح رزم و پیکار اور معرکہ آرائی مرثیے کی انتہا نہیں بلکہ اس کی انتہا ہے اخلاق کو استوار کرنا، مزاحمت اور مقاومت کا جذبہ پیدا کرنا اور کردار کو بلندیوں تک پہنچانا۔ اگر انیس کے مرثیہ کو غور و تامل سے دیکھا، پڑھا جائے تو وہ ان مقدس اور بلند مقاصد کو پورے حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

حق یہ ہے کہ انیس و دبیر کے مراثی میں سے حسنِ ترتیب کے ساتھ اگر واقعاتِ کربلا اور اس کے ماقبل و مابعد کے حالات کو ایک مسلسل مدوّن کتاب کی شکل میں لایا جائے تو کوئی سبب نہیں کہ ان کو دنیا کی رزمیہ کتابوں میں بہت آگے جگہ نہ ملے۔ اس وقت یہ دعویٰ صرف اس لیے محلِ نظر ہوتا ہے کہ مرثیے میں رزمیہ کی تمام خصوصیات منتشر صورت میں پھیلی ہوئی ہیں اور کسی ایک مرثیے کو پڑھتے وقت ہمارے ذہن میں یکمشت نہیں آتیں۔

انیس کے مراثی اردو ادب اور رزمیہ شاعری کا شاہکار ہیں۔ مناظرِ قدرت کے بیان، انسانی جذبات کی مصوری اور رزم آرائی میں ان کو حیرت ناک قدرت حاصل ہے۔ فنی مہارت، بلند تخیل، مضمون آفرینی اور نفسیاتی ژرف نگہی کی اس سے بہتر مثالیں تلاش کرنی بے سود ہیں۔ میدانِ جنگ اور معاملاتِ رزم کی ایسی مکمل نقشہ کشی ہے کہ پوری تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ انیس کے ہاں مبالغہ بھی ہے اور تکلف و تصنع بھی لیکن ان کی شاعرانہ خوبیوں نے ان سب پر ایسا پردہ ڈالا ہے کہ یہ چیزیں عیب کی جگہ حسن بن گئی ہیں۔ ایک اور بات بھی ہے۔ انیس نے اتنے کثیر اور اتنے طویل مرثیے لکھے اور اتنے مختلف مطالب و مضامین بیان کیے کہ ان سے زبان کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع ہوگیا اور شاعرانہ حسنِ بیان اور طرزِ ادا کے لیے بے انتہا راستے کھل گئے اور اس معاملے میں یقیناً مرثیے نے غزل اور مثنوی سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دی۔ اسی طرح محاورات اور الفاظ نے انیس کے ہاتھوں نئی زندگی اور تابناک روپ پایا۔ سادہ، عام فہم اور سلیس زبان استعمال کرکے انیس نے فطری شاعری کا ایک بلند معیار قائم کیا۔

شبلی نے انیس کے کلام میں جو خوبیاں تلاش کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ ان کا کلام فصیح و بلیغ ہے۔ روزمرہ بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ انتخابِ الفاظ مضمون و موضوع کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ تکرار اور ردیف و قافیہ میں بھی موقع اور محل کے لحاظ سے موزونیت قائم کرتے ہیں۔ جزئیات نگاری میں استادانہ مہارت، جذباتِ انسانی کے بیان کا خاص سلیقہ، منظر نگاری اور مظاہرِ قدرت کے بیان میں فن کاری کا کمال، واقعہ نگاری میں مہارت اور تشبیہات و استعارات میں جدت و ندرت ہے نیز مبالغہ کی ناپسندیدہ شکلوں سے انھوں نے احتراز کیا ہے یا حسنِ بیان سے ان کو قابلِ قبول بنا دیا ہے۔

چند مثالیں دیکھیے۔ میر انیس صبح کا منظر پیش کرتے ہیں ؎

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح — ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہوگیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہوگیا

خورشید نے جو رُخ سے اٹھائی نقابِ شب — در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب

انجم کی فرد فرد سے لے کر حساب شب　　دفتر کشائے صبح نے الٹی نقاب شب
گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ شرق و غرب کا نظم و نسق ہوا
یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں　　چُن لے چمن سے جس طرح پھولوں کو باغباں
آئی بہار میں گُلِ مہتاب پر خزاں　　مرجھا کے گر گئے ثمر و نخلِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

حضرت امام حسینؑ کی جماعت صبح عاشورہ میں مصروفِ نماز ہے کہ مخالفوں کی طرف سے دستِ ستم بڑھتا ہے۔ پھر انیس کی زبانی سنئے ؎

گردوں پہ جب ریاضِ سحر کا ورق کھلا　　یعنی کتابِ ذکرِ خدا کا سبق کھلا
بزمِ جہاں میں دفترِ نظم و نسق کھلا　　ظلمت نہاں ہوئی درِ باغِ شفق کھلا
پہنچا فلک پہ ماہ کو حکم انقلاب کا
موجِ ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا
ہونے لگے چراغِ نجومِ آسماں پہ گُل　　قرنا پھُنکی سپاہِ عدو میں بجا دُہل
برپا حسینیوں میں ہوا یاں اذاں کا غل　　پڑھنے لگے نماز شہنشاہِ جزو و کل
قدسی ہوئے نثار جماعت کی شان پر
نعرے نمازیوں کے گئے آسمان پر
سجدوں میں یاں جھکے تھے ابھی عابدوں کے سر　　فوجِ ستم میں ہو گئیں صف بندیاں ادھر
دو چار تیر آ کے گرے جب قریبِ در　　حضرت پہ آ کے روک لی عباسؑ نے سپر
کی عرض سرکشی پہ یہ سب فوجِ شام ہے
فرمایا آپ نے یہ اجل کا پیام ہے

حضرت عباسؑ میدانِ جنگ میں تلوار چلا رہے ہیں۔ انیس کی زبان سے تلوار کی کاٹ کا بیان سنئے ؎

نکلی ادھر غلاف سے وہ برقِ شعلہ ریز　　چلنے میں خود ذوالفقار تھی جس کی زبان تیز
چمکے شرر بھڑکنے لگی آتشِ ستیز　　گھبرا اجل نے بند ہوئے کوچۂ گریز
آیا خدا کا قہر ہر اک روسیاہ پر
بجلی محیط ہو گئی ساری سپاہ پر
جب وار چل گیا سپرِ آہنیں کٹی　　دستانہ کٹ کے ہاتھ کٹا آستیں کٹی

مغفر کٹا، دو نیم ہوا سر جبیں کٹی　　سینے کو طے کے زین سے جو اتری زمیں کٹی
پھر تک تھا فرس تو دو پارہ سوار تھا
اللہ رے صفا کہ تیغ نے جانا خیار تھا

آئی جدھر لہو میں سراسر بھری ہوئی　　خالی صفوں میں اور سوا ابتری ہوئی
بے جاں تھا جس پہ سایہ فگن وہ پری ہوئی　　پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل دوڑتی ہوئی
آنکھ اس کی قہر تھی کوئی کیونکر اٹھا نہ جائے
چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اس کی گات نہ جائے

جس کے گلے سے مل کے چلی کٹ کے رہ گیا　　بسمل بھی تیغ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا　　سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا
دو پتلیاں بھی بہرِ تماشائی رہیں
سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں

حضرت امام حسین علیہ السلام کی سواری کی شان اور گھوڑے کی آن بان ملاحظہ کیجیے ؎

مولا چڑھے فرس پہ محمد کی شان سے　　ترکش لگا باہر نے پہ کس آن بان سے
نکلا یہ جن و انس و ملک کی زبان سے　　اترا ہے پھر زمیں پہ براق آسمان سے
سارا چلن خرام میں کبکِ دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دلھن کا ہے چہرہ پری کا ہے

غصے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے　　جوبن پہ جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے　　تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
گردن میں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہے
بالا دری میں اس کو ہما پر بھی فوق ہے

تھم کر جو اپنی فرس خوش قدم بڑھا　　جوں جوں وہ سمتِ دشت بڑھا اور دم بڑھا
گھوڑوں کی ہیچ اور سے باگیں علم بڑھا　　ماہیت بڑھا کے سروِ ریاضِ ارم بڑھا
پھولوں کو لے کے بادِ بہاری پہنچ گئی
بستانِ کربلا میں سواری پہنچ گئی

مرزا دبیر کے مراثی ضخامت میں انیس سے زیادہ ہیں لیکن نقادوں نے ان کا رتبہ انیس کے بعد رکھا ہے۔ یہ عجیب لطیفے کی بات ہے کہ ان کے اپنے زمانے میں دبیر کو انیس پر ترجیح دی جاتی تھی مگر انیس کی قدر و عزت بھی کچھ کم نہ تھی۔ انیسیوں اور دبیریوں نے دونوں کو باہم ٹکرایا اور مقابلے اور مناظرے کا طوفان برپا کر دیا — لیکن یہ دونوں کبھی اس طرح ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے اور ایک دوسرے کے

رتبے کو پہچانتے ہیں۔

مرزا دبیر کے کلام میں بھی یہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انیس کے کلام میں بیان کی گئیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ دبیر کا منتخب کلام انیس کے عام کلام سے ٹکر لے سکتا ہے ورنہ ان کے ہاں تکلف و تصنع اور لفظی صنعت گری کی بہتات ہے۔ الفاظ اور بندشوں کی شان و شکوہ، تخیل کی بلندی اور مضمون آفرینی ان کے ہاں انیس سے زیادہ ہے۔ یہ لکھنؤ کا خاص رنگ اور خاص مزاج تھا اسی لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس زمانہ میں دبیر کو انیس سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ مجلسوں میں خواص کے حلقوں میں بہ مقابلہ میر انیس کے مرزا دبیر زیادہ شریک ہوا کرتے تھے اس لیے بھی اہل لکھنؤ ان سے زیادہ عقیدت رکھتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ مرزا دبیر شاعرانہ مزاج رکھتے تھے اور فن پر بھی ان کو عبور تھا اس سبب ان کے ایسے مرثیے اور مرثیوں میں ایسے مضامین بھی ہیں جہاں مذکورہ بالا صفات اعتدال سے کام میں لائی گئی ہیں اور زبان و بیان، سلاست و روانی، روزمرہ و محاورہ کا لحاظ کیا گیا ہے اور یہی مقامات اور حصے ایسے ہیں کہ ان کو انیس کے کلام میں ملا دیجئے تو امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بس انیس کو دبیر پر تفوق صرف اس اعتبار سے حاصل ہے کہ ان کے ہاں ایسے مقامات بہت زیادہ ہیں اور دبیر کے ہاں کم۔

شبلی کا یہ قول کہ "فصاحت ان کے (دبیر کے) کلام کو چھو نہیں گئی ہے۔ بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال بندی و مضمون آفرینی البتہ ہے" سراسر نادرست ہے۔ موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں سید نظیر الحسن نے "المیزان" لکھی اور تفصیل سے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا اور دبیر کے کلام سے ایسی مثالیں پیش کیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دبیر کے مرثیوں میں بھی وہ تمام محاسن پائے جاتے ہیں جو شبلی نے صرف انیس کی خصوصیات بتائے ہیں۔

یہ لطیفہ ادبی تاریخ میں یادگار ہے جس سے شبلی کی انصاف پسندی کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ جب ان کو "المیزان" بھیجی گئی تو انھوں نے مصنف کو ایک طویل خط لکھا جس میں لکھتے ہیں: ـ

> "ضعف کی وجہ سے روزمرہ کے ضروری مشاغل کے سوا کسی کام کا نہیں رہا۔ تاہم آپ کی کتاب کی دلچسپی نے میرا کافی وقت لیا۔ آپ نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے کتاب کا جواب لکھا ہے جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے۔ آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی۔ کیونکہ اس بہانے سے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا اور ایک باکمال (دبیر) کے جوہر اچھی طرح کھلے۔ آپ کی عنایت کا مشکور اور طرزِ تحریر کا مداح ہوں۔"

انیس و دبیر کا جامع فرق چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انیس کا مقصد اثر آفرینی ہوتا ہے اور دبیر کا مضمون آفرینی۔ انیس کے ہاں نازک خیالی ہے اور دبیر کے ہاں بلند آہنگی۔ انیس اپنا زورِ بیان جذبات پر صرف کرتے ہیں اور دبیر نکتہ آفرینی پر۔ انیس زبان و محاورے کی طرف متوجہ ہیں اور دبیر شوکتِ الفاظ اور علمی نکات پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں۔ ایک نقاد نے خوب کہا ہے کہ "دبیر اپنا کمال منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور انیس کے سامنے ہم خود جھک جاتے ہیں۔" مگر یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ موازنہ مجموعی حیثیت سے ہے ورنہ دبیر کا کتنا کلام ہے کہ انیس کے مرثیوں میں شامل کر دیا جائے تو ہرگز امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا دبیر کے کلام کا نمونہ دیکھیے۔ صبح کربلا کا منظر پیش کرتے ہیں ۔

گلگونۂ شفق جو ملا روئے صبح نے ۔۔۔ اسپندِ مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیِ طورِ صبح نے ۔۔۔ ٹھنڈے سب چراغ کر دیے کافورِ صبح نے
لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے انجمِ رخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سفیدۂ طلعت نشانِ صبح ۔۔۔ سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
باندھا عمامہ صبح کا پہنا کتانِ صبح ۔۔۔ چرخِ چہارمی پہ گیا خطبہ خوانِ صبح
رُو سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرمِ سجدہ عیسیِ خورشید ہو گئے

پرچم کشا ہوا علمِ زر فشانِ مہر ۔۔۔ لی روز نے پناہ بزیرِ نشانِ مہر
آیا عروج پہ شہِ اقلیم ستانِ مہر ۔۔۔ اور لشکرِ شعاع نے تانی سنانِ مہر
نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈال کر
مغرب میں پھینکی رات کی پتلی نکال کر

مرزا دبیر کی زبانی حضرت عباسؑ کے سراپا کے چند بند سنیئے ۔ فرماتے ہیں ۔

گو خلعتِ تحسین مجھے حاصل ہے سراپا ۔۔۔ پر وصف سراپا کا تو مشکل ہے سراپا
ہر عضوِ تن اک قدرتِ کامل ہے سراپا ۔۔۔ یہ روح ہے سرتا بہ قدم دل ہے سراپا
کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے
مضمون بھی اپنا نہیں لڑتا ہے کسی سے

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ کیا نہ ثنا کی ۔۔۔ صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل یہاں قدرت نے جلا کی ۔۔۔ طالع نے کس آئینے کو یہ خوبی عطا کی
ہر آئینے میں چہرۂ انسان نظر آیا
اس رخ میں جمالِ شہِ مرداں نظر آیا

بے مثل جبیں ہے نگہِ اہلِ یقیں میں ۔۔۔ بس ایک یہ خورشید ہے افلاک و زمیں میں
جلوہ ہے عجب ابروؤں کا قربِ جبیں میں ۔۔۔ دو مچھلیاں ہیں چشمۂ خورشید مبیں میں
مردم کو اشارہ ہے یہ ابرو کا جبیں پر
ہیں دو مہِ نو جلوہ نما چرخِ بریں پر

———

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت — نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت
چہرے پہ مہِ عید کی بے جا ہے اشارت — وہ عید کا مژدہ ہے یہ حیدر کی بشارت
ابرو کی مہِ نو میں نہ جنبش ہے نہ ضو ہے
اک شب وہ مہِ نو ہے یہ ہر شب مہِ نو ہے

حضرت حُر میدانِ جنگ میں آتے ہیں اور اپنی تلوار کے جوہر دکھا رہے ہیں یہ مرزا دبیر کی زبان سے سُنئے —

اللہ رے شان دمِ شمشیرِ آبدار — دکھلا دیے صفائی کے سب ہاتھ ایک بار
دریائے حرب و ضرب کے گرداب گاہ بار — جوہر کا ایک بال بھی ڈوبا نہ زینہار
اک وجد تیغ کو بھی یہ صف دیکھ کر ہوا
اٹھا اک طرف نہ تیغ کا ناخن بھی تر ہوا

غواص تھی یہ تیغ کہ دریا تھی یہ حسام — دریا بھی وہ کہ جس کا سمندر ہے ایک جام
ماہیوں کی طرح سے ارماحِ فوجِ شام — دریائے آبِ تیغ میں تھیں غوطہ زن تمام
یوں غرقِ آبِ تیغ تنک ظرف ہونے تھے
جد و پدر کا نام بھی بالکل ڈبونے تھے

ڈر ڈر کے آبِ تیغ سے سب کم کر گئے — غصے سے ہو کے ہیں جو بچے کچھ ٹھہر گئے
روحوں کا ایک پل بنا اور سر اتر گئے — اک وار میں فرات کے پار ان کے سر گئے
حیرت سے جاں فنا ہوئی قالب کھڑا رہا
کشتی تو غرق ہو گئی لنگر پڑا رہا

شمشیرِ حُر کے رعب سے بسمل تھے اشقیا — گر پیدلوں کی سمت کو رخ تیغ نے کیا
سر کاٹ کے زمیں پہ کاندھے سے رکھ دیا — واں سے پھری سواروں کا آ کے دم لیا
حیرت سے کٹ کے بھی نہ گرا سر زمین پر
تن گر پڑا زمین پہ سر بیٹھا زین پر

انیس و دبیر کے زمانے میں نیز ان کے بعد کئی دوسرے باکمال مرثیہ گو گزرے ہیں لیکن قدرتی بات تھی کہ انیس و دبیر کے کمال اور شہرت کے سامنے ان میں سے کسی کو فروغ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ میر خلیق کے تین لڑکے تھے۔ انیس، مونس اور انس۔ انس بھی مرثیہ کہتے تھے لیکن ان کے مرثیوں کو کوئی خصوصی حیثیت حاصل نہ ہوئی البتہ میر مونس مرثیہ گوئی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں مشکل زمینیں اختیار کی ہیں لیکن زبان کی شستگی اور سلاست و روانی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ ان کو سلام گوئی میں بے مثال مانا گیا ہے۔ مونس کے مراثی تین ضخیم جلدوں میں مرتب ہو چکے ہیں۔ میر مونس کے ایک مرثیے سے میدانِ کربلا میں صبح کا منظر دیکھیے —

آمد وہ آفتاب کی اور وہ سحر کا نور — کافور ہو گیا تھا فلک پر قمر کا نور

بالا تھا نخلِ طور سے ہر اک شجر کا نور　　پھیلا تھا چاندنی کی طرح دشت و در کا نور
غنچوں کے منہ جو صبح سے شبنم سے دھوتے تھے
گویا گلوں نے عطر میں چہرے ڈبوئے تھے
بستانِ کربلا کی وہ بُوباس وہ بہار　　مرغانِ خوش نوا کا چہکنا وہ بار بار
کو کو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار　　نالے وہ بلبلوں کے وہ سبزہ وہ لالہ زار
کرتے تھے وجد کبکِ دری کوہسار میں
بن میں غزال مست تھے فیضِ بہار میں

ایک مرثیہ کی تمہید ملاحظہ کیجئے ؎

اے چشمِ تر برس کے خجل کر سحاب کو　　سرسبز کر حدیقۂ کشتِ ثواب کو
رو ان کی پیاس پر کہ جو ترسے ہیں آب کو　　غم جن کا آج تک ہے رسالت مآبؐ کو
جاں کاہ واقعہ ہے امامِ انام کا
کرتا ہوں ذکر قتلِ شہِ تشنہ کام کا
جب دوپہر میں قتل ہوئی سب خدا کی فوج　　کوثر پہ تشنہ کام گئی مقتدا کی فوج
باقی رہی مصیبت و رنج و بلا کی فوج　　تنہا علیؑ کا لال تھا اور اشقیا کی فوج
بے جاں تھے اقربا شہِ گردوں جنابؑ کے
اختر پڑے تھے خاک پہ گرما آفتاب کے

جنابِ امامؑ سوار ہوتے ہیں ؎

روح الامینؑ نے آن کے جب تھام لی رکاب　　مرکب پہ جلوہ گر ہوا زہراؑ کا آفتاب
وہ کرّ و فر وہ دبدبہ وہ سطوتِ جنابؑ　　گویا چڑھے تھے غزوۂ خیبر پہ بوتراب
نصرت اِدھر تو فتح اُدھر ساتھ ساتھ تھی
تھامے ہوئے رکاب ظفر ساتھ ساتھ تھی
اسپِ حسینؑ حسن میں رشکِ براق تھا　　پریوں کو جس کے دیکھنے کا اشتیاق تھا
شہباز سے بھی تیز پری میں وہ طاق تھا　　رکھنا زمیں پہ اپنے قدم اس کو شاق تھا
حیراں تھے جانور بھی یہ عالم تھا جان کا
کٹتا تھا ہر طرارے میں قصد آسمان کا

سراپائے امامِ عالی مقامؑ ملاحظہ ہو ؎

تھے کمسنی میں حسینؑ شبیہِ شہِ اممؐ　　روشن وہی جبیں وہی زلفوں میں پیچ و خم

اور وہی عمامہ وہ پیچیدہ و بہم　　　رُخ چاند سا وہی وہی شوکت وہی حشم
ایسا حسیں جہاں میں نہ انساں نہ جن ہوا
گھر سے اندھیری رات کو نکلے تو دن ہوا
حق میں ہے چشم پاک شہنشاہ خوش نہاد　　　نور بصر ہے جس کی سیاہی کا خانہ زاد
قرباں تری چشم سیہ کے اے قبلۂ مراد　　　عین عطا یہ ہے کہ ہو اس نسخے پہ صاد
تیری ہی رحمتوں سے بصد زور و شور ہیں
وہ بھی تو دیکھیں دیدۂ دل جن کے کور ہیں
خورشید نور ہے رخ شاہ فلک وقار　　　حُسن و جمال مصطفوی جس سے آشکار
مہتاب کیا مقابلہ کرتا ہے بار بار　　　روشن یہ وہ سیاہ، یہ کامل وہ داغدار
کیونکر دکھاؤں عارض انور جناب کا
افسوس منہ ادھر کو نہیں آفتاب کا

جناب امام کی تلوار کی کاٹ میر انیس کی زبانی سنئے ؎

آئی جدھر کو جیب زباں نکال کے　　　سوئے جنوب رہ گئے بھاگے شمال کے
پامال تھے پرے سیہ بد خصال کے　　　جلوے دکھا رہی تھی پری اپنی چال کے
جس پر گری وہ خاک سپر وقت جنگ تھا
اس شعلہ رو کے سایہ میں بجلی کا ڈھنگ تھا
بڑھتے ہی صف سے پاؤں سر پہلواں کٹا　　　دوہے کی ڈھال کٹ گئی گرز گراں کٹا
خنجر کمر پہ کھینچا تو بسانِ زباں کٹا　　　برچھی کٹی قلم ہوا نیزہ، نشاں کٹا
دو ہو گیا وہ جنگ پہ جو شخص تل گیا
اک اک پہ کاٹ تیغ دو پیکر کا کھل گیا
تھرائے تھے منہ اس کا ستمگار دیکھ کر　　　بھنوں کے دم نکل گئے تھے دھار دیکھ کر
چہرہ بگاڑ دیتی تھی جستار دیکھ کر　　　سر کاٹتی تھی لاکھ میں سردار دیکھ کر
مخفی نگاہ سے کہیں اہل ستم نہ تھے
جوہر بھی اس کے دیدۂ بینا سے کم نہ تھے
تیغ دو سر نے معرکہ جیتا لڑائی میں　　　دم بھر لگی نہ دیر صفوں کی صفائی میں
ضربت کی دھوم ہو گئی ساری خدائی میں　　　خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم ترائی میں
اعدا کے بھاگ جانے کی راہیں جو بند تھیں

مرثیہ کا مضمون جذبہ و عقیدت کا طلبگار ہے۔ سانحۂ کربلا اور شہادت کے واقعات سے ہر مسلمان کو کامل وابستگی اور والہانہ عقیدت ہوتی ہے۔ پھر دربار اودھ نے ماحول ایسا بنا دیا تھا کہ مرثیہ گو حضرات کی زیادہ سے زیادہ قدر کی جاتی تھی اس لیے انیسویں صدی میں لکھنؤ مرثیہ گوئی کا مرکز بن گیا ——— انیس و دبیر کے خاندان اور شاگردوں نے اپنے زور بیان سے اچھے اچھے گل کھلائے اور مرثیہ کے وسیع دامن کو اور زیادہ وسیع کیا۔

انیس و دبیر کے سلفوں کے علاوہ لکھنؤ میں دو اور ممتاز خاندان تھے جنہوں نے مرثیہ نگاری میں بڑا نام پایا تھا۔ عشق کا خاندان جس کی میر انیس کے گھرانے سے رشتہ داری بھی ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے انیس و دبیر کی زندگی ہی میں مرثیہ گوئی شروع کر دی تھی۔ دوسرے لکھنوی مجتہدین کا خاندان جن میں بعض حضرات شعر و شاعری کا ذوق رکھتے اور اچھے مرثیے لکھتے تھے۔ ان حضرات میں فاخر، جاوید، آشفتہ وغیرہ باکمال مرثیہ گو گزرے ہیں۔

خاندانِ عشق میں سید مرزا تعشق سب سے ممتاز مرثیہ گو تھے۔ گو یہ انیس سے عمر اور رتبہ میں بہت چھوٹے تھے مگر انیس ان کے ذوقِ سلیم کے اس حد تک معترف تھے کہ مجلس میں پڑھنے سے پہلے اپنا مرثیہ اکثر تعشق کو سنایا کرتے تھے۔ تعشق کو غزل سے بڑا لگاؤ تھا جس کا اثر ان کے مرثیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس خاندان میں عشق و تعشق کے بعد رشید، تمبہ اور مؤدب وغیرہ اچھے مرثیہ گو گزرے ہیں۔ خاندانِ دبیر میں سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز مرثیہ گو مرزا دبیر کے بیٹے مرزا اوج تھے۔ ان کے کلام میں دبیر و انیس دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خاندانِ دبیر کے شاگردوں میں شاد عظیم آبادی، صفیر بلگرامی اور افضل حسین ثابت سب سے نمایاں مرثیہ گو ہوئے ہیں۔

مرزا اوج کے کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔ میدانِ کربلا میں رات کے بھیانک وقت کی تصویر کھینچتے ہیں ؎

ظلمت ہوئی جب زلف کشا پردۂ شب میں　　بخت سیہ روز چھپا پردۂ شب میں
سر کی جو رخ مہر سے ردا پردۂ شب میں　　روپوش ہوا مہر سما پردۂ شب میں
چہروں سے نقابوں کو ہٹانے لگے انجم
گردوں پہ صفیں اپنی جمانے لگے انجم

گھاٹوں پہ وہ کم ظرفوں کا آ آ کے اترنا　　اور پیاس سے وہ عترتِ شبیر کا مرنا
وہ ہونکنا شتروں کا وہ اطفال کا ڈرنا　　وہ رات کا وقت اور وہ غضب شورشِ قرنا
سہمے ہوئے جو گودیوں میں سوتے تھے بچے
اس غلغلے سے چونک کے غش ہوتے تھے بچے

حضرت عباسؓ نے نہر فرات سے مشک بھر لی ہے مگر یزیدی فوج مانع ہوتی ہے۔ گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ حضرت عباسؓ کی شجاعت کا یہ منظر مرزا کے الفاظ میں سنئے ؎

ساحل پہ مثل سبزۂ خود رو صفیں جمیں　　آگے بڑھے وغا کو سرانِ سپاہ کیں
پھر ایستانِ شبیہ علمدار شاہ دیں　　سینوں میں دل الٹ گئے الٹی جو آستیں

خم شکلِ ماہِ نو ہوا جستار زین پر
رایت سے مشک کھول کے لٹکا دی زین پر

اس نے نظر کی مشک کی جانب اٹھا کے سر — گردن ادھر قلم ہوئی تارِ نظر ادھر
پیدل کوئی سوار بڑھا اس طرف اگر — رستے ہی میں گرا دیا خود سر کو ٹوک کر
ممکن نہ تھا ہوا کا گزر جو حصار میں
جنگِ شکار کھیل رہا تھا کچھار میں

جس سمت برق تیغ چمکتی ہوئی چلی — شعلے کی تھی زبان کہ لپکتی ہوئی چلی
سایے سے اس کے دھوپ سمٹتی ہوئی چلی — پیچھے قضا چلی پہ جھجکتی ہوئی چلی!
سب کو پڑے تھے جان کے لالے ادھر ادھر
ہاتھوں سمیت گرتے تھے بھالے ادھر ادھر

آخر حضرت عباسؓ شہید ہو جاتے ہیں۔ جناب امامؑ حضرت علی اکبرؑ کے ساتھ لاشہ عباسؓ پر پہنچتے ہیں۔ یہ حالت مرزا افسح سے سنیئے۔

اس وقت ان کے سینے میں آ کر رکا جو دم — گھبرا کے سر کیا قدمِ شاہِ دیں پہ خم
پیاسا چلا جہاں سے بہشتی سوئے ارم — ہچکی جو آئی کانپ گئے سر سے تا قدم
کملا کے رنگ پھول سے منہ کا بدل گیا
آنکھیں سوئے امام رہیں دم نکل گیا

اک آہ سرد بھر کے اٹھے سیدِ زماںؑ — روتے ہوئے خیام کو حضرتؑ ہوئے رواں
مشک و علم اٹھا کے چلے اکبرؑ جواں — ہر ہر قدم پہ گرتے تھے سرور یہاں وہاں
ابتر تھا حالِ زارِ امامِ سعیدؑ کا
گردن جھکائے ساتھ تھا گھوڑا شہید کا

خاندانِ انیس میں کئی ایسے باکمال مرثیہ گو گزرے ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں کی نیک نامی میں اضافہ کیا۔ مونس اور انس کے بعد میر انیس کے بیٹے نفیس، ان کے بھتیجے وحید، نفیس کے بیٹے عروج، نفیس کے نواسے عارف اور انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید سب صفِ اول کے مرثیہ گو تھے۔

انیس کی وفات کے وقت نفیس کی عمر تقریباً پچاس سال کی تھی۔ تمام فن اپنے والد سے حاصل کر کے استاد بن چکے تھے۔ اس قدر کمال دکھایا کہ انیس کے کلام سے اپنا کلام ملا دیا۔ صرف اتنا فرق نظر آتا ہے کہ علمیت کا ذوق رکھنے کے سبب سے زور و جوش کے موقع پر کلام کو پرشکوہ بنا دیتے ہیں۔ نفیس نے مرثیہ میں ساقی نامہ کا بھی اضافہ کیا تھا۔ کچھ مثالیں دیکھیے۔ صبح کا منظر پیش کرتے ہیں۔

بیاضِ صبح کا جب چرخ پر ظہور ہوا — جو زور تیرگیِ شب کا تھا وہ دور ہوا

روئے سحر سے خجل حسنِ روئے حور ہوا　　محیطِ کون و مکاں آسماں کا نور ہوا
مطیع خالقِ لیل و نہار اٹھنے لگے
پئے نماز جماعت گزار اٹھنے لگے

دکھا رہی تھی ادھر خوبیاں سحر کی ضیا　　کہ جس کی ضو سے گھٹی جاتی تھی قمر کی ضیا
وہ آبِ بحر کی ضو اور وہ دشت و در کی ضیا　　ہر اک چمن کا وہ جلوہ، وہ ہر شجر کی ضیا
گلوں سے مل کے جو باہر نسیم آتی تھی
مشامِ جاں کو بسانے شمیم آتی تھی

تلوار کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

یہ تیغ وہ ہے سیلِ فنا کہتے ہیں جس کو　　یہ برق وہ ہے قہرِ خدا کہتے ہیں جس کو
باڑھ اس کی وہ آفت ہے بلا کہتے ہیں جس کو　　منہ اس کا وہ منہ ہے کہ قضا کہتے ہیں جس کو
جاتی نہیں بے جاں لیے جب آتی ہے سر پر
ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کب آتی ہے سر پر

سید ہادی وحید انس کے بیٹے اور انیس کے بھتیجے تھے۔ مرثیوں میں علمیت کا اظہار اور اصطلاحات کو کام میں لانا انیس کے بعد بہت بڑھ گیا تھا۔ وحید اس رنگ کے استاد تھے اور بڑے کمال کے ساتھ علمی رنگ کو نباہ جانتے تھے۔ نفیس کے بعد ان کو مرثیہ گوئی میں کامل سمجھا گیا ہے۔

پیارے صاحب رشید کو ان قدیم باکمالوں کے سلسلے کی آخری کڑی بتایا جاتا ہے۔ ان کے مرثیے نہایت شاندار ہیں۔ زبان کی صفائی، روزمرہ، محاورہ بندی، سلاست اور روانی ان کو ورثہ میں ملی تھی جس کا انھوں نے پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے ساقی نامہ اور بہاریہ دونوں کا اپنے مرثیوں میں خاص التزام کیا۔ اس سے مرثیت میں جتنی کمی آئی ادبیت نے اس کی تلافی کر دی۔ کچھ مثالیں دیکھیے پہلے ساقی نامہ کا ایک بند سنیے ؎

کدھر ہے لے مرے ساقی شرابِ کوثر دے　　رکے نہ ہاتھ پیاپے پلا برابر دے
نہ جس کا نشہ گھٹے حشر تک وہ ساغر دے　　نہ دے سبو و خم و جام دل مرا بھر دے
ترنگ نشے کی ہے رنگ اب بگڑتا ہے
کہ دیں پناہ سے اک دیں فروش لڑتا ہے

صبح عاشورہ کا منظر پیش کرتے ہیں ؎

صبح عاشورہ کی رخصت کا جو ساماں ہوا　　مستعدِ مرگ پہ اک رات کا مہماں ہوا
آسماں کا محل آباد تھا ویران ہوا　　کہ ستاروں کا جو مجمع تھا پریشان ہوا
تھی جو دو چار گھڑی خلق میں مہماں شبنم
روتی تھی منہ پہ دھرے رات کا داماں شبنم

حضرت عبداللہ بن جعفر و زینبؑ کے صاحبزادے عون اور محمد ابھی کم عمر ہیں لیکن جوشِ شہادت ان کو بیتاب کر دیتا ہے بمشکل ماں کی سفارش پر جناب امامؑ سے اجازت ملی ہے۔ ان صاحبزادوں کی جنگ کا حال رشید کی زبان سے سنئے ؎

دونوں پالے ہوئے آغوشِ گل و ریحان علیؑ ہٹ کے گھوڑوں پہ چڑھے شیرِ نیستانِ علیؑ
دلبرِ فاطمہ دلبندِ نبیؐ جانِ علیؑ دبدبہ جعفرِ طیار کا اور شانِ علیؑ
ان سے تا چرخ صدائے دف و قرنا پہنچی
دفعتاً فوج میں آنے کی خبر جا پہنچی

باگیں اٹھتے ہی روانہ ہوئے گھوڑے اک بار ہر کماں زہ ہوئی تیروں کی ہوئی اک بوچھار
نقشِ پا بجھ گئے لیکن نہ رکے یہ راہوار نیمچے لے کے بڑھے فوجِ ستمگر کے سوار
گل کھلے لاکھ مگر ان کی سواری نہ رکی
جھکیں شاخیں نہ روشِ بادِ بہاری نہ رکی

جب کئے وار تو سب فوجِ ستمگار چلی ساتھ ہی ان کے بھی شمشیرِ شرربار چلی
کٹ گئے سر صفِ لشکر طرفِ نار چلی صفِ آخر میں ہوا شور کہ تلوار چلی
ضرب وہ تھی کہ جگر داروں کے دل توڑ دیئے
دو جواں بچوں نے دو لاکھ کے منہ موڑ دیئے

آ گیا حشر جو لشکر پہ وہ جرار چلے نیمچے کر کے علم فوج کے اس پار چلے
کہہ کے یہ جان و دلِ حیدرِ کرار چلے حشر تک نام رہے آج وہ تلوار چلے
فوجیں ہٹ جاتی ہیں جب گرمِ وغا ہوتے ہیں
مرنے والوں کے ارادے ہی جدا ہوتے ہیں

سب نشاں اور پرے اشرار نے کھولے باندھے پرچم اک ایک علمدار نے کھولے باندھے
ڈورے تلوار کے کفار نے کھولے باندھے پٹکے افواجِ ستمگار نے کھولے باندھے
بیم و امید میں سب فوج چلی جاتی ہے
کبھی بھاگو کبھی ٹھہرو کی صدا آتی ہے

سید علی عارف میر نفیس کے نواسے تھے اور نانا کے آغوش ہی میں انھوں نے پرورش پائی تھی چنانچہ ان کے مرثیوں میں نفیس کی زبان اور طرزِ ادا کا پورا اثر پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے قائم کردہ قصر کے آخری ستون تھے جن کے بعد کوئی بڑا باکمال مرثیہ گو پیدا نہ ہوا۔ عارف کے ساقی نامہ کا ایک بند سنئے ؎

ساقیا! ہاں دیئے جرأت کا پلا دے ساغر بھر کے اک بادۂ تسنیم سے لا دے ساغر
واسطہ ساقیِ کوثر کا اٹھا دے ساغر خود ہی بڑھ کر مرے ہونٹوں سے لگا دے ساغر

جوشِ جذبات سے سر کلک قلم کرتا ہوں
جنگ حیدر کے نواسے کی رقم کرتا ہوں

صبح کی منظر کشی کرتے ہیں ؎

رن میں جب آمدِ صبحِ شبِ عاشور ہوئی — تیرگی شرم سے ظلمات میں مستور ہوئی
صبح کے فیض سے جنگل کی زمیں نور ہوئی — خلعتِ نور ملا، لیلیٰ شبِ حور ہوئی
وہ سماں اور وہ نورِ سحری کا جلوہ
نظر آنے لگا ہر شے میں پری کا جلوہ

کچھ فلک پر جو نہی پاٹے گئے آثارِ سحر — آمدِ خورشیدِ خاور کی ہوئی گرم خبر
تھا جو معلوم کہ درپیش ہے دن بھر کا سفر — باندھ لی شمس نے بھی نورِ سحر کی چادر
عکس اشجار سے پیدا تھی عجب جلوہ گری
نظر آتا تھا ہر اک رنگ عقیقِ جگری

مرثیے کا مضمون جذبہ و عقیدت کا طلبگار تھا اس لیے سب اہلِ دل اور صاحبانِ عقیدت مرثیے لکھنے اور اپنا زورِ بیان دکھاتے تھے۔ شیعہ چھوڑ سُنی گھرانوں میں بھی مدتوں یہ رسم قائم رہی کہ موزوں طبیعت لوگ سال بھر میں زیادہ نہیں تو ایک اور بڑا نہیں تو چھوٹا مرثیہ ضرور لکھتے تھے اس لیے ایسے سب ناموں کی فہرست مرتب کرنا بھی ناممکن ہے۔ شاد عظیم آبادی، بیان و یزدانی میرٹھی، آغا شاعر دہلوی اچھے مرثیہ گو تھے۔ اس آخری زمانہ میں نجم آفندی نے مرثیے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اچھے مرثیے لکھے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے مرثیوں کو نئے قومی اور اصلاحی انداز میں پیش کر کے ایک نئی راہ قائم کی۔ اسی طرح قائم رضا نسیم امروہوی نے مرثیے میں ایک مفید جدت پیدا کی یعنی انھوں نے مرثیے کو قومی رنگ میں لکھا اور شہدائے کربلا کے اخلاقِ حسنہ اور کربلا کے سانحات کو آفاقی رنگ میں پیش کر کے مکارمِ اخلاق کے عملی اور تعمیری پہلوؤں پر زور دیا۔

اُردو میں مرثیے کے عام مفہوم کے مطابق اس کا مقصد مراثیِ کربلا سے ہوتا ہے لیکن اپنے اصل اور وسیع مفہوم کے لحاظ سے مرثیہ عام ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں بھی اُردو میں مرثیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ یہ فرق اس موقع پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ تعزیت کی نظمیں اور قطعے یا قطعاتِ تاریخ مرثیے کے ذیل میں نہیں آتے۔ مرثیے کے دو اہم اجزا یعنی رنج و غم کا اظہار اور مرنے والوں کے اخلاق و کردار کا تذکرہ جب تک حسن و خوبی کے ساتھ نہ بیان کیا جائے، اسے مرثیے کے ذیل میں جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ اُردو کے ایسے مرثیوں میں سب سے پہلے غالب کی مسلسل غزل مرثیۂ عارف کا ذکر کرنا ضروری ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص شگفتہ اور مؤثر انداز میں عارف کا مرثیہ لکھا ہے مگر اپنے اختصار اور غزل کے اسلوب کے باعث اس میں رثائی عنصر اس قدر نہیں جتنی ادبیت ہے۔ اسی طرح اس زمانے کی دوسری ممتاز چیز مرثیۂ مومن ہے جس میں ادبیت کم اور رثائیت زیادہ ہے اور اسی لیے وہ غالب کی شگفتگی کے برعکس زیادہ موثر ہے۔ اس قسم کے مرثیوں میں حالی کے دو مرثیے غالب اور حکیم محمود خاں پر ادبِ اُردو میں انفرادی اور امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ غالب کا مرثیہ ان کی شخصیت اور ان کے مرتبے کی جیسی صحیح تصویر پیش کرتا ہے، ایسی موثر عکاسی ایک طویل مضمون میں بھی آسان نہیں۔ مرثیۂ محمود خاں کی یہ خصوصیت یادگار ہے

کہ وہ مرثیہ کہا ہے اور شہر آشوب بھی۔ اس میں اس دور کی دہلی کے علم و فن اور ادب کے عروج و زوال کی مکمل مرقع کشی کی گئی ہے اس لیے پڑھنے والے بیدل اور حکیم محمود خاں کی شکست کے ناپائیدار نقش قائم ہو جاتے ہیں۔ اسی زمانے کی ایک دوسری یادگار چیز شبلی کی وہ نظم ہے جو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ماتم میں لکھی تھی۔ فطری جذبات اور کامل تاثر کے لحاظ سے یہ مختصر نظم خاص تعریف کی مستحق ہے۔ حالی کا مرثیہ غالب جو ترکیب بند میں لکھا گیا ہے اس قدر مقبول ہوا کہ مولانا احسن مارہروی نے داغ کا اور راز رامپوری نے مولانا محمد علی مرحوم کا مرثیہ اسی اسلوب پر لکھا۔ یہ دونوں مرثیے حالی کے تتبع میں لکھے گئے مگر ادبی حسن اور صحیح جذبات سے معمور ہونے کے باعث اثر آفرینی میں مرثیۂ غالب کا نقش ثانی نظر آتے ہیں۔

گذشتہ صدی کے بالکل آخر میں حرب سبتہ کی سرت پر بے شمار نظمیں کہی گئیں اور ان میں سے بعض اپنی رثائی حیثیت میں یقیناً قابل لحاظ ہیں۔ موجودہ دور میں علامہ اقبال اور قائد اعظم کی رحلت پر بے شمار نظمیں اور قطعے لکھے گئے۔ فنی کسوٹی پر پرکھئے تو ان میں سے صرف بعض کو مرثیے کی اس صنف میں جگہ دی جائے گی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ جس طرح مراثی واقعات کربلا میں موجودہ دور کے شعرا کوئی یادگار کارنامہ پیش نہ کر سکے اسی طرح کوئی دوسری رثائی نظم ابھی سامنے نہیں آئی جسے فنی اور ادبی اعتبار سے خاص مرثیے کا مستحق قرار دیا جا سکے۔

حفیظ جالندھری کی نظم "غرق ہوئی کشتی کا ملاح" شاہنامۂ اسلام میں شامل ہو جانے کے بعد اس کا ایک بلیغ حصہ بن گئی ہے۔ لیکن ابتدا میں اس کا موضوع مولانا محمد علی مرحوم کا سانحۂ وفات تھا اور اس لحاظ سے دیکھئے تو اس نظم کو رثائی شاعری میں ایسی منفرد حیثیت حاصل ہوتی ہے جس کی نظیر ملنی ناممکن ہے۔

آتش کی غزل گوئی

ڈاکٹر وحید قریشی

اودھ کی سرزمین آتش کا گہوارہ تھی۔ یہاں کے گلی کوچے دلی کے برباد شدہ ایوانوں کی مٹی سے تعمیر ہوئے تھے۔ دلی کے خوش نوا فیض آباد کی گلیوں کی زینت بنتے رہے۔ یہ سلسلہ کم و بیش ایک ربع صدی کو حاوی رہا ہے۔ پھر لکھنؤ کا نصیبہ جاگا اور عظمت رفتہ کے نقیب یہاں اٹھ آئے۔ برصغیر میں آتش کے اجداد کا پہلا وطن دلی تھا۔ پھر یہ لوگ فیض آباد آئے جہاں شجاع الدولہ کے زمانے میں امن و راحت کی ایک اجتماعی فضا قائم ہو چکی تھی۔ ابدالی کے حملوں نے دلی کا سہاگ لوٹ لیا تھا۔ مرہٹوں کی یورشیں بھی کچھ کم خطرناک نہ تھیں۔ دلی کی اقتصادی حالت بہت مخدوش ہو چکی تھی۔ ان حالات نے وہاں بسنے والوں کو دوسرے علاقوں میں جا بسنے پر مجبور کر دیا۔ بعض خاندان روہیل کھنڈ میں پھیل گئے جہاں بعض پامن موجود تھے۔ بعض نے اودھ کا رخ کیا اور سرسبز ہوئے کچھ قناعت پر تکیہ کیے دلی میں ڈٹے رہے۔ آتش کا خاندان اودھ آیا اور فیض آباد میں فروکش ہوا۔ آتش یہیں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ابھی ان کا بچپن ہوگا کہ آصف الدولہ نے دارالحکومت لکھنؤ بنا لیا۔ فیض آباد کی بیشتر رونق لکھنؤ اٹھ آئی۔ شعراء و ادباء کا رخ بھی ادھر ہی کو ہو گیا۔

ادبی لحاظ سے فیض آباد کی شعری تحریک کا بنیادی رشتہ دلی کے دبستان شعر سے ملتا ہے۔ دہلوی شعراء کی آمد خاص کر سودا کے فیض آباد آ جانے سے دہلوی شعراء کی تازہ گوئی کے زیر اثر اودھ کی شاعری پھلی پھولی۔ یہ صحیح ہے کہ سودا سے قبل میر غنیبار وغیرہ کی وجہ سے سنگلاخ زمینوں اور رعایت لفظی کا کچھ چرچا ضرور تھا لیکن یہ رجحان اہمیت اختیار نہ کر سکا۔ زبان میں بھی دہلوی محاورے اور روزمرہ کا رس تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مقامی اثرات نے سر اٹھایا۔ ایہام گوئی کے خلاف ردعمل جو دلی میں شروع ہوا تھا اور جس کے لیے فارسی ادب نے نمونے مہیا کیے تھے اودھ میں بھی برسرکار رہا۔ تازہ گوئی ایک سب سے سادے تغزل کی تحریک تھی جس کے اولین نمونے پاک و ہند میں اکبری دور سے ملتے ہیں۔ فارسی شاعری کی یہ جاندار اور ادبی روایت میر و سودا کے دور میں اودھ میں آئی۔ یہ دہلوی شاعری ایک ایسے دور کی پیداوار ہے جب سوسائٹی زوال پذیر ہو چکی تھی۔ ہر طرف بے اطمینانی اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ ہماری شاعری کے موضوعات اس اثر سے نہ بچ سکے۔ زندگی کی ناپائیداری کا احساس، اپنے ذاتی غم کا اظہار اور دوسروں بھی چاہے تصوف کا مسلک ہو چاہے عشق و عاشقی کا شعار ہو ہر جگہ یہ غم و الم کی لہر نمایاں ہے۔ ایسے میں دنیاوی شان و شوکت اور درباری رکھ رکھاؤ کی طرف توجہات کبھی کبھار ہی جا سکتا ہے۔ میر و سودا کے ساتھ یہ تصورات اودھ پہنچے۔ اودھ کی ریاست اقتصادی طور پر دلی کے مقابلے میں امن کی بہتر ضامن تھی۔ درباری رنگ رلیاں دربار سے نکل کر دارالحکومت کی عام معاشرتی زندگی میں داخل ہو گئیں۔ تصوف اور دنیاداری کے رجحانات باہم دست و گریباں ہوئے۔ اپنی ذات کے علاوہ گرد و پیش کی طرف دیکھنے کی بھی توفیق پیدا ہوئی۔ سودا کی زندگی ہی میں جعفر علی حسرت

اور ان کے ساتھیوں کا مسلک کامیاب ہو رہا تھا۔ میر بھی میر کے انھیں پسند کرتے تھے لیکن اردو ایک نئی تحریک سے روشناس ہو گئی۔ ہماری اردو شاعری کا رُخ سادگی اور بے ساختگی کی طرف ہو گیا۔ یہ رستہ زندگی سے ملا اور بول چال کا انداز دلوں میں گھر کر گیا۔ جعفر علی حسرت کی صاف بیانی بھی نکھار رہی تھی۔ اب اس شاعری کا دور دورہ تھا جو مصحفی، جرأت اور [illegible] کی شاعری کہلاتے تھے۔ ولی کا فارسی پڑھا ہوا تھا۔ لکھنؤ کا فارغ حضرات کی عامیانہ سطح سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ جب شاعری کا امام [illegible] سے لکھنؤ منتقل ہوا یہ بات سامنے آئی۔ مصحفی، میر تقی میر اور مصحفی کی آمد سے بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ آصف الدولہ کے عہدِ حکومت کے آخری دنوں میں دو شعری رجحانات ساتھ ساتھ چلنے لگے ہیں۔ مصحفی اور ان کے شاگردوں کی داخلیت پسندی اور تازہ گوئی ایک طرف اور انشا، جرأت اور ان کے ساتھیوں کی خارجیت پسند "چوما چاٹی" والی شاعری دوسری طرف لیکن یہ تحریکیں بند ڈبوں میں نہیں چل رہی تھیں اس لیے ایک دوسری کو متاثر بھی کر رہی تھیں۔ مصحفی بھی خارجی رجحانات سے کنی نہ کاٹ سکے۔ ان کا ذاتی رنگ تو شاید دونوں قسم کے رجحانات کے میل سے پیدا ہوا ہے۔ مصحفی کے شاگرد بھی اگرچہ میر سے ہم عصر "راشتن" کو شاعری کے لیے لازمی جانتے تھے لیکن ان کے یہاں بھی بیشتر سرگزشت بے کیف افسانہ ہی تھی اس لیے ان کے بیان میں بھی اس گروہ کا عمل دخل ضروری تھا۔ جو اس گروہ نے انشا، رنگین، جرأت اور اس گروہ کے دوسرے شعرا کو عامہ ہندی کی وساطت سے باہر کی دنیا سے مربوط کر دیا تھا۔ مصحفی اور ان کے ساتھیوں کا راستہ بھی اکثر اسی شاہراہ کو کاٹ کر گزر رہا ہے۔

انشا اور رنگین کی نئی چیز زبان کی حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھی۔ دلی کی بولی کو اگر لکھنؤ میں زندہ رہنا تھا تو عام بول چال کے اثرات سے الگ نہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ مقامی اثرات سے زبان کی شکل بدلنی شروع کر دی۔ تذکیر و تانیث اور محاورے روزمرے میں دلی و لکھنؤ کا فرق پیدا ہو گیا۔ خارجی رجحانات نے زبان کو سنوارنے کا احساس دلایا اور اس کے استعمال میں صنعت گری اور رعایتِ لفظی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاعری بڑی سرعت سے داخلی خصائص کی بجائے خارجی صورت تراشی کی طرف آ رہی تھی۔ کسی بہتر آورش کی غیر موجودگی میں یہی سہارا کیا کرتا تھا۔ جب یہ شعرا اوجِ عمر کو پہنچے ایک نئی نسل سامنے آئی جس میں انیس و دبیر اور آتش و ناسخ تھے۔ لکھنؤ اور دلی کا فرق اس دور میں گہرا ہو گیا۔ ناسخ کی شاعری عام لکھنوی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ خارجی رجحانات زیادہ واضح ہو گئے۔ شعرا اپنے ردِ عمل کی بجائے محبوب کی ذات اور اس کے سراپا میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اچھا شعر اپنے مفہوم اور جذبات و احساسات کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی محاورے کو کھپانے، کسی ترکیب کو سلیقے سے باندھنے، بندش کی چستی اور نکتہ آفرینی کی وجہ سے اچھا شعر کہلاتا تھا۔ لفظی صنعت گری اور رعایت کا بول بالا تھا۔ کسی اعلیٰ آورش کی غیر موجودگی میں ایسی خلا ہر جا یہاں کی سطح نظر ہو سکتی تھی۔ شعر ذوقِ ادب کی تربیت نہیں بلکہ زبان سکھانے اور سند لینے کے کام آنے لگے۔ زبان کو مانجھنے اور سنوارنے کا یہ اثر لکھنؤ سے دلی کی طرف بھی آیا۔ شاہ نصیر اور ذوق کا معنوی رشتہ اس دبستانِ فکر کے ساتھ بھی ہے۔ اظہار کا وسیلہ ہونے کی بجائے مقصد ہو جانے سے زبان کو فائدہ ہوا لیکن اردو شاعری کو اس سے بڑا نقصان پہنچا۔

صنعت گری پیچھے دراصل اس فضا کا منطقی نتیجہ تھی جس میں یہ رجحانات پنپ رہے تھے۔ نوابانِ اودھ کا دربار ظاہری رکھ رکھاؤ اور اوپر سے ٹھاٹھ رکھتا تھا۔ شجاع الدولہ کے زمانے کی دولت کا وہ عالم نہ تھا۔ برطانوی استعمار نے اودھ کی سلطنت پر کئی تالے ڈال دیے تھے۔ وہ شہری زندگی جس نے طوائف کی گود میں پرورش پائی تھی اور وہ ناچ رنگ جس کے لیے لکھنؤ کا فن کار آج تک امر سمجھا جاتا ہے، بظاہر قائم تھی لیکن اس کی تہ میں وہ سکون و اطمینان کی گنگا نہیں بہتی تھی جو شاہانِ اودھ کے ابتدائی دربار کا خاصا تھی۔ ہر آدمی مصنوعی زندگی اور اس کے کرشمے لوازم کو نباہ رہا تھا لیکن غم و الم کی پرچھائیاں بھی آس پاس منڈلا رہی تھیں۔ اس سے محبوب کے سراپا کی دلآویزی کچھ نکھر آئی لیکن کھل کھیلنے کا رجحان بڑھ گیا۔

آتش، ناسخ اور ان کے ساتھی اسی آگ میں جل رہے تھے۔ اس فرار کی ذہنیت نے غم و خوشی دونوں کے عارضی ہونے کا احساس دلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان شعرا کے ہاں جانی اثر نہ ہے کیونکہ ثبات کی بے ثباتی کا درس دینے والے اپنے پیغام کی کمزوری سے بھی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رنگ میں وہ خلوص نہیں جو شعر کو گہرائی اور معنویت عطا کرتا ہے۔ سبب شاید یہ بھی ہے کہ یہ لوگ شعر کے خارجی حسن کی طرف زیادہ توجہ کرتے رہے اور بندش کے نکھارنے سنوارنے اور بنانے کی طرف سے غافل ہو گئے تھے۔ بہرحال ان کی شاعری کی تہ میں وجاہت کے باوجود حزن و یاس کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز بظاہر داخلیت کی طرف لے جانے والی تھی لیکن لکھنؤ دلّی تو نہ ہو سکتا تھا چنانچہ غم و حرماں کو ایسے راستے اختیار کرنے پڑے جو خارجی پیکر تراشی کے لیے بھی گنجائش نکالتے رہیں۔ اپنا غم اپنا نہ رہے، دوسرے کا غم ہو جائے یا اس کی ظاہری شکل و صورت اتنی مل جائے کہ اپنے غم سے اس کا کوئی کھلا ہوا رشتہ نہ رہے تو بات بن سکتی تھی۔ اس احساس نے طبیعت کے رجحان میں تسکین پائی۔ یہ تصورات نوابانِ اودھ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اب مرثیہ نگاری کے چرچے نے غم کے اظہار کی وہ شکل پیدا کی جو اپنا ذاتی غم نہ تھا یہاں ذاتی غم نے ایک نیا روپ اختیار کیا ہے۔ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری محض ثواب حاصل کرنے کے لیے نہیں غم کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے۔ اس گریہ و شیون کی ڈرامائیت نے لکھنؤ کی پرتصنع زندگی سے رشتہ کاٹا تھا۔ اس زمانے میں اگر زندگی بسر کرنا ایک آرٹ تھا تو مرثیہ نگاری بھی آرٹ بن کر رہ سکتی تھی۔ غزل کی شاعری میں سلام نے فروغ پایا لیکن عشقیہ غزلوں میں یہ گنجائش نہ ہو سکتی تھی وہاں احساسِ مرگ کے برملا ذکر نے گور و کفن کا روپ دھار لیا۔ زندگی کا تصنع بے اطمینانی اور حزن کو نہ دبا سکا۔ لکھنوی غزل کا بڑا حصہ اس ماتمی فضا میں سانس لینے لگا جس میں آتش رہتے بستے تھے۔

آتش مصحفی کے شاگرد اور انھیں کے مدرسۂ فکر کے پجاری تھے اس تعلق کی بنا پر آتش کی شاعری تازہ گوئی کے دور سے جا ملتی ہے بلکہ بہت پیچھے جا کر تمثیل گوئی کے دور سے بھی رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ یہ اس کی شاعری کا ایک رُخ ہے دوسری طرف وہ معاملہ بندی کی ابتدائی صورتوں سے بھی واقف ہے۔ مصحفی کی شاعری بھی انھیں ملا جلا نظریات سے بنی ہے۔ آتش بھی ایسے ہی تغزل اور تجربے کے متوالے ہیں ان کی شاعری بھی جسمانی اور حسی (SENSOUS) ہے لیکن مصحفی اور آتش میں مزاج کا فرق بھی ہے۔ مصحفی بصارت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں آتش کی قوتِ شامہ زیادہ تیز ہے۔ حواسِ خمسہ کا یہ رجحان اس دور کا عام رجحان ہے۔ شاعروں کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد نہ تھا لے دے کر نظر حسن کی ظاہری چمک دمک پر ہی پڑ سکتی تھی حیات عمل اور حرکت سے محروم تھی۔ کوئی لائحہ عمل بھی سامنے نہ تھا۔ سیاسی حالات اور اقتصادی عوامل نے حیاتِ انسانی کو اسی چوکھٹ پر لا ڈالا تھا۔ جب فضائیں جامد ہو جاتی ہیں اور مستقبل کا کوئی خواب بھی قوم کو بیدار نہ کر سکے تو افراد کی زندگیوں کا بے مقصد ہو جانا لازمی ہے۔ ایسے میں جو آدرش قومی زندگی میں پیدا ہو سکتا ہے وہ جسمانی لذت پرستی کے سوا اور کیا ہوگا۔ لکھنوی تمدن کا یہی آخری سہارا تھا۔ دولت کی فراوانی دکھائی دے رہی تھی، خوشحالی بھی تھی لیکن اندر ہی اندر زوال اپنا کام کر رہا تھا۔ خوشحالی کا فریبِ نظر قومی بقا کا ضامن نہ ہو سکتا تھا۔ جمود و تعطل نے عیش و عشرت کا در کھول دیا۔ زندگی نہ ماضی کے کسی ضابطے پر غور کر سکتی تھی نہ مستقبل کو دیکھ سکتی تھی۔ زوال کا احساس ضرور تھا جو سوچنے سے روکتا تھا اور آگے نہ بڑھنے دیتا تھا۔ ایسے میں توجہ حال پر ہی ہو سکتی تھی اور حال کی دلچسپیوں میں لکھنؤ کی عام تمدنی فضا کی چکاچوند بہت تھی۔ دولت تھی لیکن اس کا صحیح مصرف سامنے نہ تھا۔ شاہانِ اودھ کی زندہ دلی — امرائے دولت کی عیش پسندی نے عیش آباد۔ لکھنؤ کی طوائفوں کا رکھ رکھاؤ مصنوعی زندگی کا آئینہ دار ہی نہیں دولت کے نکاس کا ایک طریقہ بھی ہے۔ دولت جذبات کی آسودگی کے کام آئی۔ ایسے میں انسان ذہن کی بجائے حواس پر ہی بھروسا کر سکتا تھا۔ لکھنؤ کے شاعر حواسِ خمسہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میر حسن پانچوں حواس سے کام لیتے ہیں، مصحفی قوتِ لامسہ، باصرہ اور سامعہ تک محدود رہے۔ آتش باصرہ اور شامہ کے

زیادہ متعلق ہیں ؎

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گل ساتھ   ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

شب مہ میں جو دریا کے کنارے جا کے روتا ہوں   گزر جاتی ہے کشتی مار کر ٹھوکر سر گل سے

بصارت سے زیادہ سامعہ اور سامعہ سے زیادہ شامہ نے آتش کی غزل میں جلوہ دکھایا ہے ؎

دو روزہ ہے یہ لطف عیش و نشاط دنیا   بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں

جیسے کپڑے یار کے سونگھے تھے ہم نے ایک دن   نکہتِ گل پر گمانِ بوئے پیراہن رہا

بدن میں جانِ تازہ آتی ہے سونگھے سے اے آتش   عجب خوشبو ہے اس گل پیرہن کے پاس ہاروں میں

نکہتِ گل سے مجھے یار کی بو آتی ہے!   خار سے یاد مجھے پڑنے کی خو آتی ہے

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے   نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

یاد کر اس گل کو آتش مثلِ شبنم رو دیا   پیرہن کوئی اگر خوشبو نظر آیا مجھے

بو کا لفظ آتش کے ہاں عموماً پیرہن سے متعلق ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اس کا تعلق قبر کے تصور سے بھی گہرا ہوا ملتا ہے ؎

اپنے خوں کی بو نہیں آتی ہے یاں کی خاک سے
زندگی میں کوئے قاتل سے سفر کیوں کر کریں

یہ رجحان ان کے ہاں غالباً روایتی شاعری کی وساطت ہی سے آیا ہے۔ ان کی بعض محبوب تراکیب جو جذبات کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہیں یہ ہیں 'یوسف' 'پیراہنِ یوسف' 'بوئے پیراہنِ یوسف' 'گل' 'پری' 'صبح' 'شام' یہ بار بار ان کی شاعری میں آتے ہیں ان کی مدد سے آتش کے جذبات اظہار کی صورت پاتے ہیں لیکن انھیں آتش نے شاعری کی عام روایت سے لیا ہے۔ اوپر کے اشعار کی 'بو' 'بوئے پیراہنِ یوسف' بھی حق ہے لیکن اشعار کی لذت میں بھی کلام نہیں شاعر کے تخیل تجربے نے اسے شاعری بنا دیا ہے۔

آتش کے ہاں دوسرا اساسی روایتی تصور زہد کا تذکرہ ہے لکھنو کی ماتمی شاعری میں اس موضوع کی کمی نہیں لیکن اسے تقلیداً قبول کرنا دوسری بات ہے اور اپنی نفسی زندگی کا محور بنا کر پیش کرنا دوسری بات ہے۔ آتش کی شاعری میں یہ بات رسم کی پاسداری نہیں ہے بلکہ اس میں آتش کی ذات کو بھی بڑا دخل ہے۔ آتش زندگی کی رنگارنگی کو دیکھتے ہیں، اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس کے بارے میں رجائی نقطۂ نظر بھی پیدا کر لیتے ہیں لیکن حیاتِ گذراں کی ناپائیداری کا احساس بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ حسن کے عارضی ہونے کا بھی انھیں احساس ہے ؎

کیا بیاں عالمِ زوالِ حسنِ خوباں کا کروں
روشنی جاتی رہی سرو چراغاں رہ گیا

اس حرماں نصیبی پر آتش قلندرانہ روپ بھی دھارتے ہیں اور زندگی کے بارے میں متشکک (SCEPTK) بھی ہو جاتے ہیں۔ قدیم عاشقانہ تصورات کو وہ پسند کرتے ہیں لیکن انھیں وقتی اور عارضی بھی جانتے ہیں۔ وہ مذہب و اخلاق کی طرف جھکتے ہیں اور کبھی کبھی واعظ کا لہجہ بھی بنا لیتے ہیں۔ کبھی اسے بھی خیرباد کہہ کر قلندری کا درس دینے لگتے ہیں۔ اخلاقی اور دینی رجحانات کا رخ دنیا کی بے ثباتی کی طرف بھی پھر جاتا ہے سبب شاید یہ ہے

کہ آتش جن اقدارِ حیات کے دلدادہ ہیں انھیں برقرار رکھنا چاہتے ہیں لیکن انھیں اس کا بھی یقین سا ہے کہ یہ اقدار اب مٹنے والی ہیں اور نئے حالات میں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہ IDEAL جب ڈانواں ڈول ہوتے ہیں تو کبھی شک کا اظہار کرتے ہیں کبھی خود فراموشی، قلندری، جسمانی لذّت اور جذبات کی پرستش کام آتی ہے۔ دماغ کی بجائے دل کی واردات جگہ لے لیتی ہے۔ ایسے میں آتش خوش بھی ہوتے ہیں غم سے نڈھال بھی ہوتے ہیں، موت کی خواہش بھی کرتے ہیں اور ایک گونہ بے نیازی کی وجہ سے بعض اوقات شہر کی کھال کو قاقم و سنجاب سمجھنے لگتے ہیں ؎

جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو — دل پر ہجومِ غم ہو جبیں پر شکن نہ ہو
شادی نہیں قبول مجھے غم قبول ہے — میری خوشی سے تنگ مرا پیرہن نہ ہو

مفلسی میں بھی احساسِ مفلسی کے ساتھ ساتھ ایک آن بان ہے۔ ایک بیرزا منشی ہے ایک لکھنوی رکھ رکھاؤ ہے ؎

فرشتے سنتے ہیں آوازۂ دریا ئس کا شور — کبھی ہمارا جو واں اژدہام ہوتا ہے

ساقیانِ ماہ پیکر پر کیا کرتا ہوں حکم — میکدے میں عالمِ مستی ہے سلطاں مجھے

چند پریاں بھی کروں شکلِ سلیماں تسخیر — یہ قلمرو بھی رہے زیرِ نگیں تھوڑی سی

مجھ صوفی کے جو نعرے سے حال اس کا آگیا — مطرب نے ٹکڑے سر سے مرے ارغنوں کیا

اک الف سے قد کے سودے میں ہوا آتش فقیر — چار ابرو کو صفا کر کے قلندر ہو گیا

یہ قلندرانہ وضع آتش کا خاص انداز ہے جس کے گل بوٹے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ اس کا سبب ذہنی ماتمی فضا اور اطمینان کا فقدان ہے۔ نشے کی ترنگ آتش کو خوشی کی طرف لے جاتی ہے۔ بعض شعرا ان کے ہاں ایسے بھی ملیں گے جن میں غم والم کا شائبہ تک نہیں۔ ایسے میں وہ زندگی اور اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ محبوب کے پیکر اور شراب کے لطف میں وہ اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ غم کا ہلکا سا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ فارسی شاعروں میں یہ صفت غالباً صرف حافظ شیرازی کو حاصل ہے کہ ان کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں لمحاتی لذتیں اتنی خوشگوار نظر آتی ہوں کہ انسان ان کی ناپائداری کے خیال کو ذہن میں نہیں لاسکتا۔ ماتمی فضا میں اس طرح کی الگ تھلگ صفت کی وجہ یہ ہے کہ حافظ جس دور میں ہوئے وہ بھی ظاہری شان و شوکت کا دور تھا لیکن منگولوں کے حملوں کے اقتصادی اثرات نے اس نظامِ فکر کی کمزوری کو بھی ظاہر کر دیا تھا۔ اس سے بعض ذہنوں میں غم و خوشی کے تصورات الگ الگ لہروں کی صورت میں ترقی پانے لگے۔ آتش بھی اسی طرح کے اقتصادی طور پر پرانتشار دور میں ہوئے ہیں۔ ایسے میں جب زندگی غم ہی غم اور ماتم ہی ماتم ہو تو مسجد میں صفِ ماتم بچھا لینا کافی ہوتا ہے۔ غم کو ہر وقت سرِ بازار رسوا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بازار کی رونق تو بحال رہنی چاہیے ؎

ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو — مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا
یوسف کو دیکھنے کا ہے آنکھوں کو اشتیاق — بندِ نقاب کو سرِ بازار توڑیے

کوچۂ یار میں چلئے تو غزل خواں چلئے
بلبلِ مست کی صورت سے غزل خواں چلئے

آئی تھی کس کے سنبلِ عنبر شمیم سے
گلزار ہو رہے ہیں معطر نسیم سے

موجِ گل کی ہوا سے کیف ساقی ہے کا
بطِ مے اڑ کے لبِ مست کو چھو آئی ہے

اک جام میں کھلتا ہے طلسمات جہاں کا
مستی میں کسے مرتبۂ جم نہیں ہوتا

دل میں خیالِ حسنِ محبوب و شب ہے
آزردہ ہوا ہے یوسفِ مہماں سرائے تن میں

فصلِ گل میں گوشۂ جنت ہے خانہ آج
دولتِ ساقی سے مالامال ہے پیمانہ آج

رعونت پا رہا ہے کوئی کشتیِ مے
بادباں ابر او رساقی ناخدا ہو جائے گا

تجلی ذات نے ساقی شہر میں روشنی
لالے نے روشن کیا کوہ و بیاباں میں چراغ

آتش میں عکسِ چشمِ یار کا عالم نہ پوچھ
دیکھ لے آتش کنول پھولے ہوئے تالاب میں

رات کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

خاک پہ سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

شام سے وصل کی شب آنکھ نہ جھپکی تا صبح
شادیٔ دولتِ بیدار نے سونے نہ دیا

شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرح ناک تھی روح، دل شادماں تھا

دخترِ رز مری مونس ہے ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں یہ نور جہاں بیگم ہے

آتش کی بعض غزلیں ہیں۔ احساسِ انبساط دو چار شعروں کے بعد اپنا رخ غم و حرماں کی طرف موڑ لیتا ہے۔ آخری زمانے کی غزلوں میں یہ غم و الم پہلے دیوان کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جو سراپا ماتم ہیں۔ ملال کی یہ کیفیت دنیا کے آنی و فانی ہونے کے احساس کی وجہ سے ہے ؎

تختِ طاؤس کو ساماں بن کے غبار اڑ جاؤ
باؤ کے گھوڑے کی آتش ہے سواری تیار

صبح نزدیک ہے بیدار ہو دل اے غافل
زہرہ و مشتری و ماہ و سہا جاتے ہیں

کہوں کیا ہوئی عمر کیوں کر بسر
میں جاگا کیا بخت سویا کیا

کوئی زمانے سے جاتا ہے کوئی آتا ہے
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

دلِ بے تاب کو فریاد و فغاں کرنے دو
پہلے غمازی کر قصہ بیاں کرنے دو

سامنے آہی گیا لشکرِ اندوہ و ملال
اب تو سینے سے مری آنکھوں کو نشاں کرنے دو

آخرِ کار تہِ خاک ہے مسکن سب کا
اہلِ دولت کو بلند آج مکاں کرنے دو

آج تک آہ کے کرّوں سے بدن نیلا ہے
آسماں کو مجھے ہمسائے جہاں کرنے دو

پھوٹ بہنے دو انھیں یار کے آگے آتش
دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیاں کرنے دو

دن کو بیداری میں زندوں سے نہیں پاتا فراغ
رات بھر مردے نظر آتے ہیں مجھ کو خواب میں

کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود میں
میں بگولے کی طرح سے خاک اڑا کر رہ گیا

جب کسی لیلیٰ شمائل کا سنا کانوں سے ذکر
بیدِ مجنوں کی طرح تھر تھرا کر رہ گیا

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

خدا دراز کرے عمر چرخِ نیلی کی
یہ بیکسوں کے مزاروں پہ شامیانہ ہوا

یہ رنج و ملال آتش کو کوچۂ واعظ میں بھی لے گیا ہے۔ اخلاقی درس و تدریس ان کے ہاں بھی بہت ہے ؎

خیالِ تن پرستی چھوڑ کر حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

برہمن کو باتوں کی حسرت رہی
خدا نے بتوں کو نہ گویا کیا

جو قناعت کے مزے سے آشنا ہو جائے گا
بھیک کا کاسہ اسے دستِ دعا ہو جائے گا

گر نہ کسی نے کیا تھرتھرا دل اپنا
عرق عرق مجھے دیکھ جس کو انفعال ہوا

یہ وہی رجحان آتش کو دنیا کی بے ثباتی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ اپنی قلندرانہ زندگی کے سبب اس سے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں۔
اس طرح گور کا مضمون انھیں بہت پسند ہو جاتا ہے ؎

یقینِ مرگ جو عشقِ بتاں میں تھا آتش
ہر اک صنم مری آنکھوں میں سنگِ مدفن تھا

دل چھوٹ کے جاں سے گور کی منزل میں رہ گیا
کیسا رفیق ساتھ سے مشکل میں رہ گیا

کون سے دن نئی قبر نہیں اس میں بنتی — یہ خرابہ وہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

نہ ڈھلنے دیں گی مری قبر سے آج اے آتش — سر کے گل گور کے سائے میں بھی ڈھل جاؤں گا

موت کا خیال اور زندگی کی حرارت آتش کے ہاں ایک پرخلوص جذبہ ہے لیکن کبھی کبھی ان کی مشکلات طبیعت یہاں بھی ڈھل جاتی ہے ؎

ہم مشتاق ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شب تار نہ ہو

تاہم گور عموماً اس کے لیے تسکینِ دل کا سامان ہے۔ یہ موضوع اس کے ہاں روایتی سہی رسمی نہیں ہے۔ یہ غم کا علاج اور زندگی کا بدل بھی ہے جس میں خوف اور ڈر نہیں بلکہ اس میں مسرت کا دلفریب تصور ہے جس سے موت اور شبِ عروسی میں گہری مماثلت دریافت ہو جاتی ہے۔ مرگ و عروسی آتش کے ہاں ہم معنی لفظ ہیں ؎

میں جو نوشہ تو وہ بن جائے گی آغوش عروس — گور سے آئے گی تنہا کی صدا میرے بعد
زندگی ایک دن قیامت کے یہ سارے جھگڑے — مجھ کو کیا غم ہے اگر حشر ہوا میرے بعد

کفن خلعت ہے جو میں دولہا جنازہ تختِ شاہی — برائی نوحہ گر ہمراہ ہیں شہنا نوازی کو

موت طلبِ لذت کا باب کھول دیتی ہے اور آتش اپنی اکثر غزلوں میں اس کے گن گانے لگتے ہیں۔ رجائی لہجے کے ساتھ ساتھ المیہ انداز بھی اہم ہو جاتا ہے لیکن یہ غمناک فضا اپنے اثر میں رجائی لہجے سے زیادہ دیرپا ہے۔ اگرچہ اکثر رجائی اشعار میں بیرونی سطح پر الم کا ہلکا سا اثر بھی نہیں تاہم تصنوعیت کے دوسرے مظاہر کی طرح یہ کھوکھلی اور سطحی ہے۔ اس کا اثر دوررس اور نئے نئے مفاہیم سے روشناس کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلے میں آتش کا المیہ کلام زود اثر اور لذت میں اسے عظیم شعراء کے زمرے میں لے جاتا ہے۔ یہاں آتش کا غم ایک کسک اور درد رکھتا ہے۔ یہ درد دیرپا بھی ہے اور اس کے اظہار میں نئی نئی وسعتیں اور خلوص کے نئے نئے ثبوت ملتے ہیں۔ آتش کی یہ خونبہ شاعری بڑی جان رکھتی ہے اور رنگ و نور کے اعتبار سے اس کا سلسلہ دبستانِ مصحفی سے لے کر دبستانِ میر تک پھیلا ہوا ہے۔ وہی گہرائی، وہی ضبط، وہی سنجیدگی اور انسانی نفسیات سے واقفیت آتش کے کلام میں بھی ہے جو معاملہ بندی کے شاعروں کے کلام کے ایک بڑے حصے کو تازہ گو شعراء کے کلام سے ملا دیتا ہے ؎

آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا — چہرۂ شاہدِ مقصود عیاں ہے کہ جو تھا
روز کرتے ہیں شبِ ہجر کو بیداری میں — اپنی آنکھوں میں سبک خواب گراں ہے کہ جو تھا
اثرِ منزلِ مقصود نہیں دنیا میں — راہ میں قافلۂ ریگِ رواں ہے کہ جو تھا

چاندنی میں جب تجھے یاد اے مہِ تاباں کیا — رات بھر اختر شماری نے مجھے حیراں کیا

مرغانِ باغ آتشِ گل نے جلا دیے	صیّاد ہاتھ مل کے چمن سے نکل گیا

خون ہوتا ہے جگر زمزمہ سنج کر بے یار	دل دکھاتی ہے مغنّی تری آواز اپنا

آہ و نالے سے سوا چرچا خموشی کا ہوا	پاسِ رسوائی نے ہم کو اور رسوا کر دیا

حالِ مجنوں تو نہیں فرق دگر دیکھا کچھ	سارباں آج ہے کیوں چہرۂ لیلیٰ اُترا

کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود میں	میں بگولے کی طرح سے خاک اُڑا کر رہ گیا

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے	ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے
فرقتِ یار میں کرتی ہے قیامت برپا	روزِ محشر سے نہیں کم شبِ مہتاب مجھے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے	ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا	زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی	دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے
نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش	برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

راحتِ مرگ کو نہ پوچھ آتش	نہ رہی قدر زندگانی کی

فراقِ یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گزری	جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بے تابانہ آتا ہے

دوستوں سے اس قدر صدمے سہے ہیں جان پر	دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

دل پہ چوٹ اس رخِ رنگیں کے نظارے سے لگی	پھول سے صدمہ پہنچتا ہے مجھے پتھر کا

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری	خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا — خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری
دماغ اپنا بھی اے گل بدن معطر ہے — صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بو تیری
شبِ فراق میں یہ حال تھا دمِ صبح — چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری
کسی طرح سے نہ نکلے گا آتشِ مجنوں — فقیر بیٹھے ہیں رہ کو یہ گو تیری

آتش کو خود بھی احساس ہے کہ ان کا عشقیہ کلام ہی اس کے لیے سرمایۂ افتخار ہے ؎

بلبل ہوئی حسد سے دو زرد وار تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

اور عاشقانہ غزل گوئی آتش کی ہمارے ہاں ایک ہی تو اہم روایت تھی ہجر و فراق اور درد و الم والی غزل گوئی جس میں ہر تجربہ عشق و عاشقی کی صداقت سے تقویت پاتا ہے ۔ اس غزل گوئی کی عام جذباتی فضا عشقیہ الفاظ و اصطلاحات سے برگ و بار حاصل کرتی ہے ۔ آتش کی غزل گوئی کی یہی معراج ہے جو اس دور کی عام شعری فضا سے مختلف اور گذشتہ شعری تحریکات کے زیادہ قریب ہے ۔

سرسید کے خطوط

سرسید احمد خاں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے عظیم محسن ہیں۔ ان کی ذات قدیم و جدید کے درمیان ایک بے حد اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو ایک نئی تنظیم، جدید سیاست، ایک ترقی پذیر نظریۂ تعلیم، ایک حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر اور جیتا جاگتا ادب دیا۔ ان کے خطوط ان کی جدوجہد کا عکس ہیں۔ جن کے جمع و ترتیب کا کام مدت سے جاری ہے۔ مولانا حالی نے ان خطوط سے حیاتِ جاوید کی تالیف میں مدد لی۔ سر راس مسعود نے اشاعت کی ابتدا کی۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے ان میں بہت سا اضافہ کر کے مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے مکاتیب سرسید کے نام سے بہت بڑا مجموعہ شائع کیا۔ رہی سہی کسر ڈاکٹر مختار الدین آرزو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کی فرمائش پر پوری کر رہے ہیں۔ مگر ابھی کئی ذخیرے ایسے ہیں جن تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی — یہ خطوط شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم کے نام ہیں جو سید امتیاز علی تاج کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں:

(۱)

محبی، شفیقی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا مجھے نہایت افسوس ہے کہ میرا خط آپ تک نہیں پہنچا۔ میں نے ایک مفصل خط آپ کو لکھا ہے۔ جو خیالات آپ کے دل میں گذرے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ میں اپنے دوستوں کا جاں نثار و خاک پا ہوں۔ تصور کیسا؟ معافی کیسی؟ آزردگی کیسی! ایسے خیالات کبھی میری طرف دِہا بھی نہ فرمائیے۔ مولوی سمیع اللہ خاں مع اپنے صاحبزادے کے اپریل میں ولایت جائیں گے۔ نہایت خوشی ہو کہ آپ بھی ساتھ جاویں۔ مگر قبل از روانگی اپنے تئیں انڈین سول سروس میں منتخب کرالو۔ یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے جس طرح پر ہو، تم مجھ سے ملو۔ میں شروع دسمبر میں کلکتہ چلا جاؤں گا۔ اخیر دسمبر کی تعطیل میں تم بھی کلکتے چلے آؤ۔ میرے پاس رہو۔ سب طرح آسائش اور میرے دل کو راحت ہوگی۔ طمانیت سے سب باتیں حاصل ہوں گی۔ مسودۂ درخواست مرتب ہو جائے گا۔ اور سب تدبیریں بتا دوں گا۔ کلکتہ آنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سیر بھی کرو گے۔ ملاقات بھی ہوگی۔ دل خوش ہوگا۔ کیا امر تم کو کلکتہ آنے کا مانع ہے۔ میں تم کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔ جو بات ہو مجھ کو لکھو۔ اگر کلکتہ

آنے میں کسی امر کی ضرورت ہو مجھے لکھو میں اس کا انجام کر دوں گا۔ تمہاری عمر اس وقت ایسی ہے کہ انڈین سول سروس کی اچھی تدبیر ہو سکتی ہے۔ چند روز بعد تدبیر ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ والسلام

خاکسار سید احمد
علی گڑھ۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۷۶ء

(۲)

محب دلنواز من!

آپ کا عنایت نامہ مع مضمون کے پہنچا جس کے پڑھنے سے میری دلنوازی ہوئی، میرے دل کو تقویت ہوئی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ میں نے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ میری یہ آرزو ہے کہ ہماری قوم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر یقین رکھے۔ اور ترقی پاوے۔ اور اگر یہ یقین جاتا رہا تو وہ ہماری قوم نہیں رہی۔ پھر اگر وہ آسمان کے تارے ہو جائیں۔ تو ہم کو کیا ایک محض حماقت کی سمجھ ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ میں کوئی علاحدہ فرقہ قائم کرتا ہوں یہ تو میرے مقصد کے خلاف ہے جو فرقے اسلام سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ ان کو ملا رکھنا چاہتا ہوں۔

آپ کا مضمون جو کہ خاص میری نسبت تھا ہر چند چاہا کہ اس کے چھاپنے کا قصد نہ کروں مگر ایسا دل میں بیٹھ گیا اور اس کی سچائی کا ایسا دل پہ اثر ہوا کہ چھاپنے پر مجبور رہا۔ شاید آپ نے میرے دل کو تراش کر یہ مضمون لکھا ہے جس میں میری دلی کیفیت ہے۔ انشاءاللہ اس شنبہ کے بعد جو شنبہ ہوگا۔ اس دن کے اخبار میں چھپے گا۔ تفسیر اور تصانیف احمدیہ اس قدر تاخیر سے نمبر چھپیں گی جیسا کہ آپ حساب لگاتے ہیں۔ اتفاقات سے کمپوزیٹر بیمار ہو گئے اور چلے گئے۔ ایک مصحح مر گیا۔

یہ شہر نہایت چھوٹا ہے۔ الہ آباد سے کمپوزیٹر طلب ہوئے ہیں مجھے امید ہے کہ تفسیر و جملہ کتب دو برس کے عرصے میں اگر زندگی ہے تو چھپ جاویں گی۔ تفسیر کا بہت بڑا کام ہے۔ اور اس کی مشکلاتِ ظاہری کا حل کرنا اور واقعی و اصلی بات کا بتانا ذرا مشکل پڑ جاتا ہے۔ بہرحال خدا کی مدد چاہیے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

تصویر اپنی خدمت اقدس میں بھیجتا ہوں۔ کلکتہ جا کر دوسری بھیجوں گا۔

خاکسار سید احمد
علی گڑھ ۲۹ر نومبر ۱۸۷۶ء

(۳)

محبی و مشفقی!

چوتھی مئی کا عنایت نامہ میرے پاس ہے جس کا جواب لکھتا ہوں۔ پندرھویں مئی کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور سیدھا شملہ چلا جاؤں گا۔

بروقت معاودت ضرور آپ سے ملاقات ہوگی۔ انجمن اسلامیہ لاہور میں جو آپ نے گفتگو کی۔ اس کا میں شکر گزار ہوں مگر حال یہ ہے کہ میں ایک واعظ مذہب بننا نہیں چاہتا۔ نہ ایسے جلسوں میں جو مذہبی نام سے ہوں۔ شریک ہونا یا ان میں لکچر دینا پسند کرتا ہوں۔ صرف یہ خیال ہوتا ہے کہ اپنے احباب کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کروں تاکہ ان کو اس پر غور کرنے کا اور جو نقص اس میں ہو۔ اس کی اصلاح کا موقع ملے۔ اور مجھ کو بھی فائدہ پہنچے۔ پس اس کام کے لیے کوئی عام مجلس کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال موسم سرما میں جو ہوگا وہ ہوگا۔ اس وقت اس کی گفتگو بے فائدہ ہے۔ تہذیب الاخلاق چھپنا شروع ہوگیا۔ چار ورق چھپ چکے ہیں۔ بقیہ اور چھپ جائیں تو بخدمت احباب روانہ ہوگا۔ ایک مضمون میرا ہے۔ ایک مولوی مشتاق حسین کا اور ایک منشی ذکاء اللہ صاحب کا۔ منشی ذکاء اللہ صاحب نے "لٹریچر" پر سلسلہ وار آرٹکل لکھنے شروع کئے ہیں اور اس کے متعدد نمبر ہوں گے۔ والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۱۳ مئی ۱۸۷۹ء

---

(۴)

مشفقی و محبی!

آپ کا عنایت نامہ و نوٹ بیس روپیہ بابت خریداری تہذیب الاخلاق پہنچا۔ ممنون عنایت کیا۔ اصل یہ ہے کہ میں نے تہذیب الاخلاق صرف آپ کے شوق کے سبب سے مکرر جاری کر دیا ہے۔ اس بات کی کچھ پرواہ نہیں ہے کہ بقدر خرچ خریدار ہوں گے یا نہیں۔ میرا ارادہ ہے ایسی لغو باتوں میں تمام عمر ضائع ہوتا رہا ہے۔ آپ میرے نقصان کا کچھ خیال نہ کریں۔ محمد برکت علی خاں صاحب تو دوست قدیم ہیں مگر اور کسی غیر شخص سے اصرار کرنا یا لجاجت اس کی خریداری پر کرنا کچھ ضرور نہیں ہے۔ حقیقت میں تہذیب الاخلاق بند ہونا نامناسب تھا۔ گویا تحریر مضامین اور خیالات سب بند ہوگئے تھے۔ اس کے سبب برا یا بھلا تحریر کا لگا لگا رہے گا۔ بعض بعض مضمون قابل پڑھنے کے تحریر ہوتے ہیں۔ بعضے صرف معمولی ہیں۔ بہرحال ایک امر جاری رہنے سے امید ہے کہ کوئی عمدہ مضمون بھی آجائے گا۔ مولوی چراغ علی۔ منشی ذکاء اللہ صاحب مولوی الطاف حسین حالی۔ منشی مشتاق حسین نے مضامین بھیجنے کا وعدہ کیا ہے اور ایک اور صاحب ہیں۔ جو مولوی مستعد ہیں اور تمام خیالات تہذیب الاخلاق و تفسیر کے ان کے دل میں بھر گئے ہیں اور تمام پچھلی تعلیم کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ بھی وعدہ تحریر مضامین کرتے ہیں۔ مگر نام ظاہر کرتے ہوئے کانپتے ہیں۔ بہرحال اس کا جاری رہنا بہتر ہے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد — شملہ پارک ہوٹل ۱۲ جون ۱۸۷۹ء

---

(۵)

محبی و شفیقی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مضمون مرسلہ چھپنے کو بھیج دیا۔ تصانیف احمدیہ چھپ رہی ہے۔ مگر تہذیب الاخلاق کے چھپنے سے کام

زیادہ ہو گیا ہے۔ اس سبب اور نیز اس سبب سے کہ اس کے پروف میرے پاس شملہ پر آتے ہیں۔ تاخیر سے چھپتی ہے۔ شملہ پر میں نے کام تفسیر کا بہت کیا ہے۔ سورہ بقر کی کل تفسیر قریب ختم ہونے کے ہے۔ نہایت مشکل مشکل مقام جو ظاہرا معلوم ہوتے تھے۔ نہایت صفائی اور خوبی سے حل ہوئے ہیں اور مجھے یقین کامل ہے کہ وہی مطلب قرآن کا ہے۔ جو میں نے بیان کیا۔ میں آپ کی عنایت و محبت کا ہمیشہ شکر گزار ہوں۔ علاوہ آپ سے ایک خاص محبت اس خیال پر رکھتا ہوں کہ مجھ کو آپ سے قومی فائدے پہنچنے کی توقع ہے۔ خدا آپ کو زندہ رکھے۔ اور بوڑھا کرے اور میرا جو خیال آپ کی نسبت ہے، اس کو پورا کرے۔ آپ کے والد ماجد آپ کے ان خیالات کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ پسند کرتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ میرا نوجوان بیٹا بگڑ گیا۔ بروقت مراجعت شملہ کسی مقام پر اب ضرور ملاقات ہونی چاہیے۔ پنجاب میں جو قانون مال گزاری اور قانون لگان جاری ہے۔ وہ غالباً اردو زبان میں لوگوں نے چھاپے ہوں گے۔ ایک ایک کاپی اگر ان کی دستیاب ہو تو مرحمت فرمائیے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد شملہ —— ۱۲ جولائی ۱۸۷۹ء

---

(۶)

مجی و مشفقی!

ایک خط ملفوف ہے اس کو پڑھ کر اور دوسرے لفافے میں رکھ کر کاتب خط کے نام روانہ فرما دیجیے۔ آپ کی تحریر سفیر ہند میں پڑھ کر نہایت خوش ہوا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پہلو اور باریکیاں ان مسائل کی بخوبی آپ کے پیش نظر ہیں۔ اور ہر ایک کو کماحقہٗ غور کیا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا دماغ اس قسم کے مضامین سمجھنے کے مناسب نہیں ہے۔ ان پر کیا موقوف ہے۔ ہمارے علما کی قوت دماغی ان ہی معمولی کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ پھر طاقت مطالب دیگر پر غور کی باقی نہیں رہتی۔ رسالہ اشاعۃ السنہ میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ "فطرت" کے لفظ پر کیسی لغو اور غیر مناسب تقریر لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلق وہ نہیں سمجھتے۔ والسلام

دو رسالے نسبت مزارعان پنجاب پہنچے۔ جن کا نہایت دلی شکریہ قبول ہو۔ فقط

خاکسار

سید احمد۔ ۲۰ جولائی ۱۸۷۹ء شملہ پارک ہوٹل

---

(۷)

مجی و مکرمی!

عنایت نامہ پہنچا۔ نماز فی حد ذاتہٖ نہایت مناسب فطرت انسانی کی ہے۔ ارکان معینہ اس فطرت کے محافظ ہیں اور اس لیے بمنزلہ اس کے جزو کے ہیں۔ باقی رہا تعین ارکان بہ ہیئت موجودہ۔ اس کی نسبت جو شبہ کیا جائے وہی شبہ بعینہٖ اس ہیئت پر بھی وارد ہو گا۔ جو اور طرح پر قرار دی جائے۔ اس لیے یہ شبہ از قبیل شبہ عامۃ الورود ہو گا جو مقبول نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہیئت موجودہ کی خوبی اور عمدگی کا ثبوت چاہیے۔ جو علانیہ ظاہر ہے۔

آپ کا مضمون چھاپہ خانہ والوں نے تہذیب الاخلاق کے ساتھ چھاپنا تجویز کیا ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ تہذیب الاخلاق ماہ رجب بھی اب تک نہیں آیا۔ معلوم نہیں کیا آفت پڑی ہے۔ والسلام

خاکسار آپ کا نیازمند

سید احمد شملہ پارک ہوٹل ، ۲۷ جولائی ۱۸۷۹ء

---

(۸)

مکرمی و عزیزی:

تمہارا مضمون تہذیب الاخلاق کی نسبت متعدد دفعہ میں نے پڑھا۔ اس وقت بھی پڑھ رہا ہوں۔ جو بات میرے دل میں آئی آپ کو لکھتا ہوں۔

شکر ہے خدا کا ہماری قوم میں تم سا نوجوان لائق پیدا ہوا۔ خدا تم کو زندہ سلامت رکھے۔ مضمون کی عمدگی۔ اس کا طرز بیان۔ اس کی ترتیب اس کے شستہ الفاظ بے انتہا تعریف کے لائق ہیں۔ جو بات خدا نے ہم کو داڑھی سفید ہو جانے کے بعد دی وہ خدا نے تم کو اس عمر میں دے دی کہ شاید ابھی پوری ڈاڑھی بھی نہ نکلی ہوگی ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی تابندہ ستارۂ بلندی

خدا تم کو زندہ رکھے اور جیسی مجھ کو امید تمہاری ذات سے قوم کی بھلائی کی ہے۔ خدا اس کو پورا کرے۔ انگریزی علوم علی الخصوص لٹریچر کی تحصیل میں زیادہ محنت کرو۔ معلوم نہیں کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے یا نہیں۔ اگر نہ ہوئی ہو تو جلدی مت کرنا۔ یہ ایسا پھندا ہے کہ انسان کو مشکلات میں پھنسا دیتا ہے۔ والسلام

آپ کا دلی ترقی خواہ

خاکسار سید احمد ، شملہ پارک ہوٹل ، ۲ اگست ۱۸۷۹ء

---

(۹)

مکرمی و محبی!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ اگرچہ مجھ کو آپ کے تشریف لانے سے نہایت خوشی ہے۔ مگر بابر چار روز کا سفر کرنا جو آپ کو تکلیف دے گا اس کا افسوس ہے۔ بہرحال ملاقات ہونے کے بعد سب کچھ مبدل بخوشی ہو جائے گی۔ آتے وقت علی گڑھ مت ٹھہرنا۔ جب یہاں آؤ گے تو مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب بھی یہاں ہوں گے۔ ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ اور بروقت مراجعت شاید ساتھ بھی ہو گا۔ اور مدرسۃ العلوم کی بھی علی گڑھ میں خوب سیر ہو گی اور مراجعت کے وقت تک مدرسہ کھل بھی جاوے گا۔ اگر راستے میں سے اپنے پہنچنے کا ٹھیک وقت بذریعہ تار برقی بتا دو گے تو میں آدمی و سواری سٹیشن پر بھیج دوں گا۔ شاید کچھ غلطی ہو جائے۔ اس لیے لکھتا ہوں کہ میرے محلے کا نام تو آپ کو معلوم ہے۔ مگر گاڑی والے یہ نام کم سمجھتے ہیں۔ اس محلے کو ہندوستانی "ہاتھی پھاٹک" کہتے ہیں۔ پس اگر شاید میرا

آدمی ملے تو جس گاڑی بان سے کہو گے برابر سے آ ئے گا۔ اسٹیشن پر کثرت سے گاڑیاں کرایہ کی حاضر و موجود رہتی ہیں۔ یہ سب باتیں احتیاطاً لکھ دی ہیں۔ والسلام

خاکسار
سید احمد کلکتہ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۹ء

---

(۱۰)

عزیزی محبی!

تمہارے تین خط پہنچے۔ پہلا خط جو شکریہ کا تھا اس کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ مجھ کو تم سے دلی محبت ہے اور ہر طرح ترقی کا خواہاں ہوں۔ پچھلے دو خطوں کو پڑھ کر افسوس ہوا۔ ولایت جا کر تعلیم حاصل کر کے ہندوستان میں وجہ معاش حاصل کرنے کے جو بغیر ولایت جائے حاصل نہیں ہو سکتی، صرف تین کام ہیں۔ بیرسٹری۔ انجنیری۔ ڈاکٹری۔ اول کام تم بھی ناپسند کرتے ہو۔ اور میں بھی چنداں پسند نہیں کر سکتا۔ صرف بیرسٹری کے بعد دو امر کی ضرور امید ہے۔ ایک یہ کہ بذریعہ بیرسٹری گو وہ کیسی ہی کم ہو۔ تین چار سو روپیہ مہینہ ضرور ملے گا۔ اور اس سے زیادہ ترقی ہو جانی تقدیری بات ہے۔ دوسری یہ کہ بعد واپسی ہندوستان کوئی ابتدائی عہدہ عدالت کا ضرور مل سکے گا اور اسی سلسلہ میں جلد ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ اور ہندوستان کے امتحانوں سے نجات ملے گی۔ بارسٹری میں اس سے زیادہ توقع نہیں ہے۔ انجنیری میں داخل ہونے کو ان وجوہات سے جو آپ نے لکھی ہیں۔ بلاشبہ نہایت مشکل اور نہایت دقت ہے۔ ڈاکٹری میں بھی وہ دقت پیش آوے گی۔ معہذا ڈاکٹری اس لیے زیادہ نامناسب ہے کہ ہندوستانیوں کو سول سرجن کا عہدہ ملنا انگریز اور لیڈیاں پسند نہیں کرتیں، اور اس لیے ہندوستانی فوجی ڈاکٹری پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ پس درحقیقت تمہارے لیے کوئی ایسا موقع نہیں ہے۔ کہ بعد واپسی ولایت سے ایسا عہدہ پا سکو جو یہاں کی تعلیم سے حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ پس آپ کا ولایت جانا دو امر کی توقع پر ہو سکتا ہے۔ اول بارسٹری کے لیے جس سے ان فوائد کے سوا جو اوپر مذکور ہوئے۔ اور کسی بات کی توقع نہیں۔ شاید یہ ہو کہ عدالت کے ابتدائی عہدے ملنے میں ولایت کی تعلیم کے سبب کچھ آسانی ہو۔ دوسرے بغرض عمدہ تعلیم حاصل کرنے کے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ انگریزی میں عمدہ تعلیم ہندوستان میں حاصل ہونی ناممکن ہے۔ اور ولایت میں جو عمدہ انگریزی تعلیم حاصل ہو جاوے گی۔ وہ لازوال دولت ہے اور ولایت سے واپس آنے کے بعد اسی تعلیم کے ذریعے سے چار پانچ سو روپیہ ماہواری ہر صورت سے کما سکتے ہو۔

تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ اگر تم چار برس کے لیے بھی ولایت جا سکتے ہو تو جاؤ۔ فی الفور جاتے ہی کسی یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤ۔ اور لٹریچر کی شاخ اختیار کرو۔ برس روز تک کسی چیز کا بجز محنت کے ترقی تعلیم پر خیال مت کرو۔ برس روز کے بعد "لنکن ان" میں بارسٹری کے لیے داخل ہو جاؤ۔ تعلیم بدستور یونیورسٹی میں جاری رکھو۔ اور صرف لکچر کے زمانے میں "لنکن ان" میں آکر لکچر سن جایا کرو۔ دو برس بعد امتحان دینا ہو گا۔ چند روز پہلے امتحان کے لیے اپنے تئیں تیار کر لو۔ اور اگر "لنکن ان" میں یہ قاعدہ اب بھی ہو کہ جو شخص تین برس تک لکچر سنے۔ اس کو امتحان کی ضرورت نہیں ہے۔ تو امتحان کا خیال بھی مت کرو۔ تین برس برابر لکچر سنتے جاؤ۔ اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اس قدر محنت کرو کہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لاؤ۔ یہ دولت ایسی ہو گی جس سے مسلمانوں کو تمہاری ذات پر فخر ہو گا اور

ہمیشہ کو تمہاری ذاتی اور دلی خوشی کا باعث ہوگا۔ اور اگر یہ امور تمہاری دانست میں اور تمہارے والد ماجد کی دانست میں کافی معاوضہ ولایت جانے کا اور چار برس تک صعوبات سفر اختیار کرنے کا اور سب زائد روپیہ خرچ ہونے کا نہ ہو۔ تو ارادہ موقوف کرو۔ ان بہ تقدیر یہاں تعلیم میں کوشش کرو۔ تم کو انگریزی لٹریچر میں ترقی کی بہت حاجت ہے اور اس پر بہت زیادہ کوشش درکار ہوگی۔ والسلام

خاکسار تمہارا خیر طلب

سید احمد ، کلکتہ ۔ ۱۶ فروری ۱۸۸۰ء

---

(۱۱)

محبی و مشفقی!

آپ کے دو عنایت نامے پہنچے۔ آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔ میں بخیریت ہوں اور اپنے کام میں دن رات مشغول ہوں۔

نسبت آرٹیکل کے جو آپ نے لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہونا نہایت دقت کی بات ہے۔ شاید وہ انجام نہیں ہو سکے گا۔ کوئی ایسا لکھنے والا یہاں نہیں ہے۔ جو اس کو اسی خوبی سے انگریزی میں لکھ دے۔

درحقیقت جو لوگ یونیورسٹی پنجاب کے طرفدار ہیں وہ اس سے ناخوش ہوئے ہوں گے۔ اور کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ تمام پنجاب کے اخبار اس کی تردید کریں گے۔ وہ آرٹیکل خاص پنجاب کی یونیورسٹی پر نہیں ہے۔ بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی پر ہے۔ ان میں جن کتابوں کے نام ہیں۔ اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ بلکہ علوم مشرقی کے ذکر میں ان کا نام آیا ہے۔ اگر کسی کو اس قدر بھی سمجھ نہ ہو۔ تو اس کی بھی زیادہ تشریح کا کوئی مضمون چھاپنا محض بے فائدہ ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہاں ان کتابوں کا ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ جو انگریزی سکیم میں ہیں۔ ان کی نسبت میں نے لکھ دیا ہے کہ برائی تدبیر ہے۔ جو ناقص قرار پا کر چھوڑ دی گئی۔ علاوہ ترجموں سے ترقی اعلیٰ درجے کی ناممکن ہے۔ پس میرے نزدیک اس مضمون کے لکھنے پر زیادہ تر صرف اوقات محض فضول ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج ضرور یونیورسٹی ہو جائے گا۔ لارڈ رپن کی ایسی ہی پالیسی ہے۔ بلکہ اکثر حکام کی۔ افسوس یہ ہے کہ خود ہندوستانی اپنا بھلا برا نہیں سمجھتے۔ اب ہم اس قابل ہوں تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ گورنمنٹ کی کچھ بھی پالیسی ہو ہم کو وہ کرنا چاہیے جو ہمارے لیے فی الواقع مفید ہے۔ والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۔ ۸ دسمبر ۱۸۸۰ء

---

(۱۲)

محبی و مشفقی!

عنایت فرمائے من۔ دو قطعہ عنایت نامہ معہ دو قطعہ کرنسی نوٹ ایک پچاس روپے کا بابت چندہ اور دوسرا بیس روپے کا بابت تفسیر پہنچا۔ آپ کی عنایت و محبت کا شکر گزار ہوں۔ تفسیر سورہ آل عمران کی ختم ہو گئی ہے۔ عنقریب تقسیم ہو گی۔ اس کی تفسیر

میں بھی چند مشکل مقام تھے جن کو اپنے عقیدہ و علم کے موافق حل کیا ہے۔ حضرت مسیح کی ولادت کی نسبت میرے دل میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ قاضیوں کی تعلیم کے لیے مدرسۃ العلوم میں جماعت کا قائم ہونا محض غلط ہے۔ والسلام

آپ کا محب قلبی

سید احمد علی گڑھ - ۴ مارچ ۱۸۸۱ء

---

(۱۳)

محبی و مشفقی!

آپ کے دو عنایت نامے پہنچے۔ آپ کی عنایت و یاد آوری کا شکر کرتا ہوں۔ تفسیر زرد کاغذ کی معدود باقی ہے۔ ایک جلد حسب طلب روانہ کی ہے۔ میں بفضل الٰہی بخیریت ہوں۔ گرمی کے موسم میں حسب معمول میری طبیعت کسی قدر علیل ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی اس گرمی میں بھی ہوتی ہے مگر کوئی خاص علامت نہیں ہے معمولی بات ہے۔ آپ کے ملنے کو نہایت دل چاہتا ہے۔ اگر تعطیل میں چند روز یہاں چلے آؤ تو آپ کی محبت و عنایت کے اور میری دلی نیاز کے بالکل مناسب ہو۔ آپ نے لکھا تھا کہ حضرت عیسیٰ کے خلق طیر کی نسبت کوئی اور بات آپ کے خیال میں آئی ہے جس کے دریافت کرنے کا میں بہت مشتاق ہوں۔ پس جو تقریریں اس کی نسبت آپ کے خیال میں ہوں ان سب کو لکھ کر میرے پاس بھیج دیجئے۔ والسلام

آپ کا نیاز مند

سید احمد - علی گڑھ - ۲ مئی ۱۸۸۱ء

---

(۱۴)

محبی و مشفقی!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۸ مئی پہنچا۔ آپ کی صحت و تندرستی سے دل خوش ہوا۔ تعطیل میں جو آپ نے قصد تشریف آوری کیا ہے۔ اس سے نہایت مسرت ہوئی ہے جس قدر خوشی مجھ کو آپ کے ملنے سے ہوگی۔ بیان نہیں ہو سکتی۔

[illegible] بھیج گیا ہے۔ شرح قانون شہادت و خطبات آج روانہ خدمت ہوئی ہیں۔

حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ کو جو میرے حال پر نہایت عنایت فرماتے ہیں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ منجملہ مکانات مدرسۃ العلوم کے ایک مکان اس چندہ سے میری ناچیز کوششوں کی یادگار کے نام سے بنایا جائے۔ میں تو ایسی بات کو اپنی نسبت پسند نہیں کرتا مگر میں خاموش رہا۔ اچھی نیت سے کہ اگر مدرسۃ العلوم کا کوئی مکان اس بہانے سے بن جائے تو از بس چہ بہتر۔ آپ نے اور جناب مخدومی محمد برکت علی خاں صاحب نے جو اس پر توجہ کی اس کا میں بھی شکر گزار ہوں۔ اصل یہ ہے کہ مدرسۃ العلوم کو غیر متوقع ترقی ہو گئی ہے۔ اس وقت دو سو سے زیادہ مسلمان پڑھتے ہیں اور قریب پونے دو سو کے بورڈر ہیں۔ اگر یہ مدرسہ نہ ہوا ہوتا تو ان میں سے ایک کے پڑھنے کی بھی توقع نہ تھی۔ اس ترقی کے سبب حاجات مدرسۃ العلوم بھی زیادہ ہو گئی ہیں اور زیادہ تر تائید کا محتاج ہو گیا ہے۔

پس جو امر کہ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے پیش کیا ہے۔ گو وہ حق بجانب نہ ہو اور نہ کوئی میری ایسی کوشش ہے جس کا صلہ ایسا دیا جائے۔ مگر اس سے مدرسۃ العلوم کی حاجتوں کو بہت تائید ملے گی۔ پس اس کو بھی منجملہ تائیدات مدرسۃ العلوم تصور کر کے کوشش کرنی زیبا ہے۔ اور میرے نام کو اس میں بطور حرف غلط کے سمجھنا چاہیئے۔

مولوی محمد حسین صاحب کچھ ہی کہتے اور لکھتے ہوں ہمارا اور ہمارے دوستوں کا طریقہ ان کے ساتھ اخلاق اور ادب کا رہنا چاہیئے وہ ذی علم اور قابل ادب ہیں۔ اور کوئی ایسی بات جس سے ان کے دل کو رنج پہنچے نہ ہونی چاہیئے۔ ہمارا مشرب محبت ہے۔ ہمارے دل میں رنج کو جگہ ہی ہونی نہ چاہیئے۔ تحریرات میں وہ بدتہذیبی کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا کیا نقصان ہے۔ بلکہ اگر افسوس ہے تو یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو بٹہ لگاتے ہیں۔ نسبت خلق طیر کے جو آپ نے تحریر کیا۔ اس کا شکر کرتا ہوں۔ مگر وہ نسیان نہیں ہے۔ میں ابھی تک اس قابل نہیں ہوں کہ اس کا فیصلہ لکھ سکوں۔ شاید چند روز بعد ہو جاؤں۔ مگر نہایت مشکل ہے۔ اب تک قرآن مجید کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ ان دونوں مقاموں پر جہاں وہ ذکر ہے ایسی آیات واقع ہیں کہ ان کا ربط دینا نہایت مشکل ہے مگر خدا اس کے حل میں مدد دے گا۔

بعالی خدمت جناب خان بہادر محمد برکت علی خاں صاحب میرا سلام نیاز پہنچا دیجئے گا۔

مخدومی محمد حیات خاں صاحب کے مقدمے کا نہایت رنج و افسوس ہے۔ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔ خدا فضل کرے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۲۰ مئی ۱۸۸۱ء

---

(۱۵)

محبی و مشفقی!

عنایت نامہ پہنچا۔ اور حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ آپ کی ملاقات کو دل چاہتا تھا۔ اس تعطیل میں نہ آنا بہتر ہوا۔ موسم اچھا نہیں ہے۔ تعطیل دسمبر میں ضرور تشریف لایئے گا۔ ملنے، بیٹھنے، باتیں کرنے، سیر کرنے سب کے لیے اچھا موسم ہوگا۔ کیا عجب ہے کہ اس زمانے میں کوئی جلسہ کمیٹی بھی ہو۔

ہم ہندوستانیوں کی تمام مجلسیں بے جان ہیں۔ یا تو ان میں کچھ کام نہیں ہوتا۔ یا کسی یورپین افسر کے ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں اور اس کے مقاصد یا رائے کی تکمیل کی بھی آلہ بن جاتی ہیں۔ یہ قوت ہم میں نہیں ہے۔ کہ ہم اپنا کام اپنی رائے اور اپنی قوت سے چلائیں۔ ہم سے اور مسٹر کیس صاحب ڈرکیٹر پبلک انسٹرکشن سے نہایت ناموافقت تھی۔ ملاقات اور صاحب سلامت بھی نہ ہوتی۔ ہمارے تمام کاموں سے وہ برخلاف تھے۔ سبب صرف یہ تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ سینٹ ٹیفک سوسائٹی اور مدرسۃ العلوم ان کے قبضے میں ہوا اور ہم صرف ان کے ہاتھ میں بطور ایک آلہ کے ہوں۔ ہم نے نہایت استقلال سے کسی بات میں دخل دینے نہیں دیا۔ اور خود آپ اور اپنی رائے سے اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے کام چلایا۔ اور میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرسۃ العلوم کا جو کچھ حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضے میں چلا جائے۔ بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔ لوگ عام فائدے کے کاموں میں حکام کے سامنے بھی اپنا رسوخ چاہتے ہیں مگر حقیقت میں اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم اس ضلع کے

حکام کا نہ ختم ہونے والا رعب ادب کرتے ہیں تمام جلسوں میں انہی کو افسر بناتے ہیں۔ انعام انہی کے ہاتھ سے تقسیم کرواتے ہیں، مگر ہمارے کام میں ان کو ایک نقطہ برابر بھی مداخلت نہ ہوتی۔ وہاں کے حالات نہایت افسوس کے قابل ہیں۔ مگر "خود کردہ را درماں نیست" جس کام سے قوم کا فائدہ منصور تھا اپنے ہاتھوں اس قوم کے لیے زہر بنا لیا۔ ہمارا کالج بفضل الٰہی نہایت ترقی پر ہے۔ مکانات کی نہایت قلت ہو گئی۔ اس سبب داخلہ روک دیا گیا، ورنہ اس وقت چار سو سے زیادہ طالب علم ہوتے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ — ۸ اگست ۱۸۸۱ء

---

(۱۶)

مخدومی و مکرمی!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۱ دسمبر پہنچا۔ آپ کی علالت کا حال سن کر سکتہ کی حالت میں رہ گیا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر مرض موذی سے نجات اور حملہ ہائے بخار سے عقب گزاری کا حال اسی خط میں مذکور تھا۔ اور جو صدمہ کہ میرے دل پر ہوا تھا وہ بہت جلد رفع ہو گیا۔ الحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔ ضعف جو باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد رفع ہو جاوے گا۔ مگر پرہیز و احتیاط سے تغافل کرنا نہ چاہیے۔ مجھ کو کئی دفعہ خیال آیا کہ کیوں آپ کا عرصہ سے عنایت نامہ نہیں آیا۔ مگر سہل خیالات پر وہ خیال رفع ہوتا رہا۔ یہ نہ معلوم تھا کہ اس کا ایسا بڑا و سخت سبب ہے جس سے آیندہ ہمیشہ خدا تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے۔ ان اطراف میں بھی بخار کی کثرت رہی۔ میں بھی اس عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب بفضل الٰہی صحت ہے۔ آپ سے ملاقات کو دل چاہتا ہے۔ شروع مارچ مدرسہ میں جدید عمارات مدرسہ کے کھولے جانے کا جلسہ ہو گا۔ نہایت خوشی ہو گی۔ اگر آپ بھی اس جلسے میں شریک ہو سکیں۔ سوسیٹی کا چھاپہ خانہ ایک ابتر حالت میں ہے۔ سورۂ مائدہ کی تفسیر چھپا رہا ہے۔ جس قدر تاخیر ہوئی ہے۔ چھاپہ خانہ کے سبب سے ہوتی ہے۔ خلق طیر۔ احیاء اموات وغیرہ سب کی تفسیر اس میں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد اس کو اور خدا نے چاہا تو تمام قرآن کی تفسیر ملاحظہ فرماؤ گے۔ آپ پر بھی فرمائش ہے کہ اپنی صحت مزاج سے جلد جلد مطلع فرماتے رہیں۔ والسلام

خاکسار دعاگوئے شما

سید احمد۔ علی گڑھ — ۱۴ دسمبر ۱۸۸۱ء

---

(۱۷)

مخدومی و مشفقی!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ...... مقام لاہور میرے پاس پہنچا۔ آپ کی صحت و تندرستی سے نہایت خوشی ہوئی۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحیح و تندرست رکھے۔ امید ہے کہ روز بروز صحت و تندرستی و قوت زیادہ ہوتی جائے گی۔ آب و ہوا کا تبدیل کرنا نہایت مناسب

ہوا۔ اور میرے اور مقامات مشہور کے دیکھنے سے دل کو فرحت ہوئی ہوگی۔ معلوم نہیں کہ اخیر روئداد کمیٹی یادگار منشی مشتاق حسین صاحب نے آپ کے پاس بھیجی یا نہیں۔ غالباً نہ بھیجی ہوگی۔ اس لیے اس کی ایک کاپی میں بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر آپ خوش ہوں گے۔ اگر عمارت تجویزہ بن جاوے، تو کالج کو نہایت مفید ہوگی۔ اور بہت سی مشکلات رفع ہو جاویں گی۔ تفسیر آہستہ آہستہ چھپتی ہے "والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما" کی تفسیر نہایت مشکل پیش آئی ہے۔ اس کے حل کی بھی بعض ضروری کتابیں دیکھنی ہیں۔ کونسل میں اگرچہ کام ہے۔ مگر میں تفسیر کے لکھنے یا اس کے متعلق کتابوں کے دیکھنے سے کبھی غفلت نہیں کرتا۔ والسلام

خاکسار آپ کا ترقی خواہ

سید احمد

۲۳ جنوری ۱۸۸۲ء کلکتہ۔ ۲۵ نمبر روڈ

---

(۱۸)

مجی دمشفقی مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ کل کی ڈاک میں میرے پاس رسالہ محاکمہ ولادت مسیح پہنچا۔ اسی وقت میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ اور رات کو ختم ہوا۔ اس کے پڑھنے سے اس وجہ سے خوشی نہیں ہوئی کہ میری رائے کی اس میں تائید کی گئی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے خوشی ہوئی کہ نہایت عمدگی و ترتیب و صفائی سے لکھا گیا ہے۔ اس سے بہتر نہیں لکھا جا سکتا۔ کچھ مجھ سے لکھنا رہ گیا تھا۔ وہ اس میں پورا کر دیا گیا ہے۔ ابن مریم مشہور ہونے کا سبب نہایت عمدہ بالکل صحیح مطابق واقعہ تحریر ہوا ہے۔ مجھ کو یہ خیال نہ تھا کہ یوسف کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے سوا اور بھی بعض عمدہ و جدید باتیں ہیں۔ اگر میری تفسیر کا دوسرا ایڈیشن ہو تو آپ کے رسالے میں سے چند باتیں اس میں اضافہ ہوتی ضرور ہوں گی۔ ایک آدھ جگہ جناب مولوی محمد حسین صاحب کی نسبت سخت لفظ ہیں۔ اگر وہ بھی نہ ہوتے تو نہایت بہتر ہوتا۔ امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہیں۔ والسلام

خاکسار

سید احمد۔ ۸ ر اپریل ۱۸۸۲ء

---

(۱۹)

مجی و مشفقی شفیق عالم۔ آپ کا عنایت نامہ مقام پٹیالے سے پہنچا۔ آپ کی عنایت اور آپ نے جو سید محمود کے تقرر پر مبارکباد دی ہے۔ اس کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میرا ارادہ شملہ جانے کا ہے اور صرف چار پانچ روز وہاں رہوں گا۔ پنجاب یونیورسٹی بل پر جب سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوگی۔ اس زمانے میں جاؤں گا۔ ابھی معلوم نہیں کہ کب پیش ہوگی۔ مگر مجھے امید ہے کہ تاریخ پیشی سے ایک ہفتہ قبل مجھ کو اطلاع مل جاوے گی۔ جس وقت تاریخ روانگی مقرر ہوگی میں آپ کو اطلاع دوں گا۔

جلد دوم تفسیر لغایت آخر سورۂ مائدہ طیار ہوگئی چھپ گئی۔ اس کو مرتب کرنا ہے۔ بہت جلد تقسیم ہوگی۔

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ

۲۰ جون ۱۸۸۲ء

---

(۲۰)

محبی مکرمی مشفقی۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کی صحت و تندرستی سے اس قدر خوشی ہوئی ہے جس کو میرا دل جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ تم کو ہمیشہ تندرست و صحیح سالم با مطالب پر کامیاب رکھے۔ آمین۔

بقیہ اوراق جلد اول تصانیف چند روز ہوئے کہ روانہ کئے ہیں۔ یاد نہیں کہ کس پتے پر۔ اگر نہ پہنچے ہوں تو مطلع فرمایئے کہ دوبارہ بھیج دوں گا۔

تفسیر جلد دوم کا غذ زرد اوراق جلد سوم تا نمبر ۶۲۔ آج روانہ کئے جاتے ہیں۔ اجنہ پر بحث جو مجھ کو لکھنی تھی۔ اسی سورۂ انعام میں یا معشر الجن کی تفسیر میں لکھ دی ہے۔ وہ بحث چھپ رہی ہے۔ پروف میں نے دیکھ لیا ہے۔ عنقریب چھپ جاوے گی۔ اگر زیادہ شوق ہو تو اس بحث کا مسودہ بھیج دوں۔ حشر کی بحث آئندہ ہوگی۔

میرا ارادہ ہے ماہ دسمبر میں پنجاب آنے کا۔ مقصد صرف خلیفہ محمد حسن صاحب سے پٹیالہ میں ملنے کا اور گورداسپور میں سردار محمد حیات خاں سے ملنے کا اور لاہور میں آپ سے اور محمد برکت علی خاں صاحب سے ملنے کا ہے۔ غالباً ہمارے دوست محمد اسمٰعیل خاں صاحب بھی ساتھ ہوں گے سید محمود آج علی گڑھ آ پہنچیں گے۔ جب وہ یہاں سے اپنے علاقہ ڈسٹرکٹ جج رائے بریلی پر چلے جائیں گے اور کالج کے طالب علموں کی یونیورسٹی کے امتحان کے لیے الٰہ آباد اور کلکتہ کی روانگی کا بندوبست ہو جاوے گا۔ اس وقت میں کوئی تاریخ روانگی مقرر کروں گا۔ اور آپ کو اطلاع دوں گا۔ میں تو مناسب نہیں سمجھتا کہ میرے وہاں آنے کی بابت کچھ زیادہ چرچا کیا جائے۔ میں مثل ایک معمولی آدمی کے تفریح طبع اور دوستوں سے ملنے کیلئے آتا ہوں۔ اس کی دھوم دھام کیا۔ ہاں اگر کالج کے لیے کچھ چندہ مل سکے تو جو دھوم دھام چاہو کرو۔ مگر اس کی توقع نہایت کم ہے۔ بجز دھوم دھام کے کیا فائدہ۔ آئندہ جو تمہاری خوشی ہو۔ والسلام

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء

(۲۱)

محبی و مکرمی مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ میں نے اوراق تفسیر وغیرہ اس لیے نہیں روانہ کئے تھے کہ شبہ تھا کہ اس وقت آپ کہاں ہیں۔ آج روانہ کئے ہیں۔

مولوی اقبال علی صاحب نے سفر نامہ پنجاب مرتب کر کے بھیج دیا ہے جو چھپ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں سردار دیال سنگھ بہادر کا حال اضافہ کروں۔ آپ ان کے خاندان کا مختصر حال مع ان کے زمانہ سفر ولایت وغیرہ امور کے جو قابل اندراج ہوں۔ تحریر فرما کر ارسال فرمائیں۔ اور جس امر کی تحقیق کی ضرورت ہو۔ سردار صاحب سے مل کر دریافت کر لیں۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم پر بہت احسان کئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مرزا ارشد صاحب نے جو اشعار و نظم کے یونیورسٹی ہال کے جلسے میں پڑھے تھے۔ وہ بھی ان سے لے کر بھیج دیجئے۔ اپنی خیر و عافیت سے ہمیشہ مطلع فرماتے رہئے۔

والسلام

خاکسار

سید احمد۔ علی گڑھ

۳ اپریل ۱۸۸۴ء

آج کی شاعری

ایک تعارف

ڈاکٹر محمد حسن

پچھلے دس برس میں ہماری شاعری میں ایک نیا لب و لہجہ نمایاں ہوا ہے۔ سنہ ۵۵ء کے لگ بھگ ترقی پسندی کے اثرات مدھم ہونے لگے۔ اسی زمانے میں آزاد نظم کا زوال اور غزل کی "تجدید" کا چلن ہوا بلکہ جلال و جمال سے زیادہ اندازِ سخن کی کھنک اور لہجے کی نرمی پر توجہ کی جانے لگی۔ شاعری پیچیدگی اور ربودگی کی سمت بڑھی۔ واضح اور روشن راستوں کی جگہ نیم واضح، نیم روشن دھندلکوں نے لے لی جہاں رینگتے سائے، زخمی پرچھائیاں اور پُراسرار اجنبی قدم قدم پر راستہ کاٹتے ہیں۔ یہاں تنہائیوں کا راج ہے اور اس سناٹے میں اگر کوئی رفیق ہے تو یادیں ہیں یا خاموشی و رو یا دیار یادوں سے آتی ہوئی کسی انجمن کی سسکی کی آواز۔

مگر اس تبدیلی پر استفہامیہ قائم کیجئے، کب اور کیسے اس کی ابتدا ہوئی تو یہ بات واضح ہو گی کہ ادب میں زمانے اور اقدار خاموشی سے تبدیل ہوتی ہیں۔ پچھلے دس برس میں ہمارے اساتذہ کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں، ان میں وہی کس بل، وہی انداز، وہی شاعرانہ مزاج جھلکتا رہا جس سے وہ جانے پہچانے جاتے تھے۔ پچھلے دس برس میں جگر مرادآبادی نے نہایت لطیف غزلیں لکھی ہیں یہی نہیں "ساقی سے خطاب" جیسی ایک سے زیادہ نظمیں بھی لکھی ہیں جنہیں جگر کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی غزلوں اور رباعیوں کی آن بان میں بھی فرق نہیں آیا۔ بعد کے آنے والوں میں راشد نے "ایران میں اجنبی" شائع کی اور یہ مجموعہ حقیقتاً "ماورا" پر ایک اضافہ ہے۔ فراق کے مجموعے بھی شائع ہوئے، الگ الگ غزلیں بھی چھپیں اور ان میں فراق کا رنگِ سخن اپنے پورے نکھار کے ساتھ سامنے آیا۔ فیض اس عہد کے جادوگر بن کر آئے اور شاعری کی قلمرو میں ان کا سکہ دیر تک چلتا رہا۔ فیض کا اثر نئی نسل نے زیادہ تر ان کی غزلوں کی بنا پر قبول کیا۔ فیض نے مغرب آشنا ذہن اور عہدِ جدید کے لطیف ارتعاشات کو یکجا کر کے نیا تغزل پیدا کیا۔ اس نئے تغزل میں احساس کی تازگی، اجتماعی شعور کا داخلی روپ اور اندازِ بیان میں فارسی دروبست اور TRANSFERRED EPITHET کا اور دوسرے مغربی اسالیب کا امتزاج ہے۔

ان کے علاوہ پچھلے دور کے جانے پہچانے شعرا میں سے بعض نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں اور قابلِ ذکر نظمیں اور غزلیں لکھیں ان میں اثر لکھنوی، جمیل مظہری، آنند نرائن مُلا، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، حفیظ ہوشیارپوری، شور علیگ، شاد عارفی، روش صدیقی، ساغر نظامی، مجید امجد، مختار صدیقی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اختر الایمان، جعفر طاہر، جذبی، علی جواد زیدی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، ندیم، وامق جونپوری، قتیل شفائی، مجروح سلطانپوری، پرویز شاہدی، ظہیر کاشمیری، تاباں، مسعود اختر جمال، سلام مچھلی شہری، نشور واحدی،

سلیمان اریب، سید فیضی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان فن کاروں کی کئی کامیاب نظمیں اب بھی کانوں میں گونجتی ہیں لیکن یہاں اس دور کی شاعری کے مختصر اس حصے سے بحث کرنا مقصود ہے جو نئے فن کاروں نے تخلیق کیا۔ یہ فن کار وہ ہیں جن کے نام ان دس سال میں جانے پہچانے گئے۔

ان نئے فن کاروں کے نام لینے یا ان کے شاعرانہ کردار کا تعین کرنے سے پیشتر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نئی نسل نے روایت کی اپنے طور پر تراش خراش کی ہے کئی اساتذہ کے دیوان دوبارہ طاق نسیاں سے اتارے ہیں اور ان کی شخصیت اور کلام کو نئی معنویت بخشی ہے اپنے دور کے جانے پہچانے شاعروں میں بھی نئے سرے سے اس نے اپنے محبوب فن کاروں کا انتخاب کیا اور ان کے کلام کو نئی ترتیب اور نئی اہمیت سے سنوارا۔

قدمائی تجدید کے سلسلے میں میر کا نام لیا جا سکتا ہے حالانکہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ میر کا اثر نہ اس قدر وسیع ہے نہ اس قدر براہ راست ہے جس قدر خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے نوجوان شعرا میر تک مختلف ذرائع سے پہنچے ہیں اور عام طور پر جسے میر کا اثر سمجھا جاتا ہے وہ میر تک پہنچانے والے واسطے یا رابطے کا اثر ہوتا ہے مثلاً میر کی تقلید کا راستہ بہت کچھ اختر الایمان کے ذریعے ہاتھ لگا ہے اور اسے تسامح سے اختر الایمان کی جگہ میر سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ قدما کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پرانی بحروں اور زمینوں میں طبع آزمائی کا بھی چلن ہوا مگر یہ جوش و خروش زیادہ دن تک باقی نہیں رہا اور اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

عہدِ جدید کے شعرا میں فیض اور فراق نئی نسل کے محبوب شعرا کہے جا سکتے ہیں اور ان دونوں کا اثر نمایاں طور پر نئی شاعری پر پڑا۔ فیض سے انداز بیان کی سجاوٹ اور فراق سے لہجے کی کھنک اور سپردگی۔ یوں فیض اور فراق اس سے پہلے بھی پڑھے اور پسند کیے جاتے تھے مگر جن عناصر کو نئی نسل نے منتخب کیا وہ نئے تھے۔ اس کے علاوہ جمیل مظہری، شور علیگ، نثار عارفی، حفیظ ہوشیارپوری، مجید امجد اور بعض دوسرے شاعروں کو بھی نئی نسل نے اہمیت بخشی لیکن میرے نزدیک نئی شاعری خاموش انداز میں جن دو اسالیب سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے وہ اختر الایمان اور سلام مچھلی شہری کے اسالیب ہیں۔ اختر الایمان کی خود کلامی کا انداز، سپردگی اور رائندگی، داخلیت کا گہرا رچا ہوا لب و لہجہ، چوٹ کھائی ہوئی اور زمانے کے حوادث میں کڑھتی ہوئی انفرادیت کا بانکپن ——— یہ سب کچھ کسی نہ کسی حد تک نئی نسل نے اختر الایمان سے سیکھا ہے یہ اور بات ہے کہ اختر الایمان نے بڑی ذہانت اور چابکدستی کے ساتھ اپنی شاعری اور شخصیت کو مخصوص لب و لہجے کے باوجود یاس پرست یا داخلیت زدہ نہ ہونے دیا وہ کلیۃً اعتزال میں کبھی قید نہیں رہا ہے اور اس کی دنیا کبھی صرف رینگتے سایوں اور پُراسرار پرچھائیوں میں کھو کر نہیں رہ گئی ———!

اختر الایمان نے اس دور میں کئی کامیاب نظمیں لکھیں جن میں "ترکِ وفا" "قافلہ" "آگہی" "میرا نام" "آخری ملاقات" "ایک لڑکا" "ایک نظم" اور اس کے علاوہ وہ مختصر نظم "اعتماد" یہ سب نظمیں قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں تنہائی اور انفرادیت ہے یہ ایک ایسے انسان کی سرگزشت ہیں جو بمبئی یا اس سے بڑے کسی صنعتی شہر کی شاہراہ پر ایک کنارے کھڑا سوچ رہا ہے کہ اس ساری افراتفری میں انسان کی انسانیت اور اس کا نشاطِ روح کہاں گم ہو گیا ہے۔ نئی شاعری نے اختر الایمان سے تنہائی اور انفرادیت تو لی ہے مگر اس کی سوچ بچار کی وسعتیں پوری طرح نہیں لی ہیں ———

سلام مچھلی شہری کی کامیاب ترین نظمیں اس دور سے پہلے کی ہیں۔ سلام نے مکالموں، خطوں اور بکھرے ہوئے تاثر پاروں کی شکل میں اپنی نظموں میں بہت سے نئے تجربے کیے ہیں۔ ڈرامائی تاثر پاروں کی تکنیک، گرد و پیش کے واقعات کو نظم کرنے اور ان کی مدد سے خیال

تک پہنچنے کا انداز' افسانوی طرز کو اختیار کر کے ان کی خارجیت سے نظم کے بنیادی تاثر کو برآمد کرنے کی کوشش' محبوب سے براہِ راست تخاطب اور سہجے طنز یہ انداز سے گفتگو' یہ سب کوششیں اور تجربے سلام نے اپنا شعار کیے ہیں۔ اسی طرح اپنی نظموں میں مستعدی' بت تراشی' رقص اور جدید تہذیب کی پرچھائیوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی سلام نے کی ہے۔ ان تجربوں کا نئی شاعری پر گہرا اثر پڑا ہے۔

پس منظر کے اس مختصر سے جائزے کے بعد نئے شعری مزاج کا تعین کرنا ضروری ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے پہلے اس دور کے ۱۹۴۰ء' اہم شعرا کی مشہور اور محبوب نظموں کے عنوان قابلِ توجہ ہیں۔ یہ عنوان جان بوجھ کر منتخب نہیں کیے گئے ہیں ان کی فہرست آج کل رسالوں کے کالموں سے بنائی گئی ہے اور یہ فہرست عنوان کی بنا پر نہیں بلکہ نظموں کی ادبی اہمیت کے پیشِ نظر ترتیب دی گئی ہے۔

پل صراط۔ رقصِ ناتمام۔ شہرِ وفا۔ زخمی دریچے۔ آخرِ شب۔ ایک صبح۔ دوسری محبت۔ اجنبی۔ خونِ ناب۔ پیراہن' بیری زندگی۔ دیا' نیم شبی۔ بزدل۔ آسیب۔ بہروپ۔ دریچہ۔ ایک دن۔ سزا۔ غم کدے میں اجنبی۔ فریبِ نقشِ تاباں۔ سوچنے کی بات۔ مطلعِ حیات۔ گہرے دکھ کی بات۔ صبا کا ایک جھونکا۔ یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں۔ ذرے کی موت۔ جہنم جہنم کی پیاس۔ گنہگار فرشتے۔ سمندر اور انسان۔ پرتو۔ جب شعلے بجھ گئے۔ دوسرا غم۔ سہاگ رات۔ خلوت کا چراغ۔ خراب آباد۔ سورج مکھی کا پھول۔ پورے چاند کی رات۔ دادگر۔ چاندنی کے شہر میں۔ حیات و موت۔ رسمِ وداع۔ اپنی تنہائی کے نام۔ درد کے جیلے غم کے بہانے۔ پیچھے سایے۔ خلاؤں سے اُترو۔

ان کا مقابلہ ۱۹۴۹ء کے "شاہراہ" کی شعری تخلیقات کے عنوانوں سے کیجیے: "مزدوروں کے پاؤں میں زنجیر" "شیشم سنگ سسلہ" "اے دوست ابھی آرام نہ کر" "نورسیدہ نقادو" "سرگذشت" "سلاخوں کے پیچھے" "پہرہ" "جرس کارواں" "غزال اس نے چھیڑی" — "نیا پرچم" "سہارے" "دوسری دلوا پینین" "روشنی تیز کرو" "ذرو! قطرو!!" "معذرت" "آزادی سے پہلے آزادی کے بعد" "محملِ غیر"۔

اس موازنے سے اندازہ ہوگا کہ ہماری شاعری کا مزاج زیادہ نرم' زیادہ مبہم اور پُراسرار ہوگیا ہے اسے رلیوڑ گی اور دھندلکے سے زیادہ قربت حاصل ہوگئی ہے اور اس کے راستے نیم تاریک نیم روشن ہیں جن پر گزرنے والے کم ہیں' تنہائی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے اور کبھی کبھی بے نام اور سائے دیکھے اجنبیوں کی پرچھائیاں یہاں لہراتی ہیں جو کبھی رنگین ہوتی ہیں کبھی بھیانک۔

نئے شاعر کے مزاج کی نمائندگی ابنِ انشا اور ناصر کاظمی کرتے ہیں کچھ دور آگے آنے کے بعد شاذ تمکنت کا نام بھی آتا ہے ناصر کاظمی نے غزل کی "تجدید" کی۔ ناصر کی غزلیں سپردگی' ربودگی' داخلیت' کھوئے کھوئے سے انداز' خود فراموشی اور نیم خوابی کے عالم کی عکاس ہیں ناصر کا لب و لہجہ کلاسیکی غزل سے نکھر کر اور تحلیل ہوگیا ہے مگر ناصر کی غزلوں کی خصوصیت تنہائی اور خود فراموشی کے احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خود فراموشی محض نجی اور ذاتی نہیں ہے بلکہ اس احساس نے قدرتی مناظر' آسمان کے چاند' زمین کے اونچے اونچے پیڑوں اور آباد شہروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ یہ عالمِ تنہائی' دھوکی' ایک باریک سی چھوٹ اور ملگجی چاندنی — یہی ناصر کی دنیا ہے۔ ناصر اپنی دنیا کا قیدی نہیں اس کا فرمانروا ضرور ہے مگر ایک ایسا فرمانروا جو مطلق العنان ہے نہ مکمل طور پر خود مختار بلکہ اس کی آواز اس کی دنیا کی ایک ایک پتی ایک ایک پھول سے چھن کر آتی ہے۔ اس کی آرزوئیں بڑی چھوٹی سی ہیں۔ دوستوں کی محفلیں' قہقہے' دیار رنگ و بو میں راتیں ہم سفروں کے ساتھ گذارنے کا ارمان' خلوص اور پیار کے ولولے — مگر غور کیجیے تو اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے منصوبے' انسان کے چاند تک سے جانے اور ستاروں پر کمندڈالنے کے حوصلے بھی انہی چند چھوٹے چھوٹے خوابوں کی تعبیریں ہیں کہ انسان' ہر ملک ہر زمانے کا انسان خوش رہنا چاہتا ہے' ہنسنا کھیلنا چاہتا ہے۔

ناصر کی دنیا کھوئی ہے۔ ذات میں کائنات کی سی پہنائی پیدا کرنا آسان ہے بھی نہیں۔ یہ اقبال جیسے دو چار گنے چُنے فن کاروں ہی کا حصّہ ہے اور ادب کی قلمرو میں ہر شاعر سے دیو قامت ہونے کا تقاضا کرنا بھی مناسب نہیں لیکن ناصر کے ہاں صرف تشبیہ و استعارہ کی تازگی اور SENSE IMAGES تاثراتی تصویروں کا نیا پن ہی نہیں ہے خلوص کی چمک اور تجربے کی روشنی بھی ہے۔ یہ محض تقلید نہیں ہے تخلیق بھی ہے۔ گو اس کا دائرہ محدود ہے اور اس کی دنیا برگِ گل کی طرح مختصر ہے چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا ؎

چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں — سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تری یادیں

———

پون چلی تو گل و برگ دف بجانے لگے — اداس خوشبوئیں لو دے اٹھیں نقابوں میں

———

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر — چاند کس شہر میں اترا ہوگا

———

دن بجائیں گجر گونج صف بہ صف ہر طرف — خشک مٹی سے پھوٹے گا نم صبر کر صبر کر

———

زندگی اس کے تصور میں کٹی — دور رہ کر بھی وہی کام آیا

ان اشعار میں انداز بیان کا نیا کس بل ہے مگر ان میں تنہائی اور تابناک داخلیت کا احساس ہوتا ہے۔ ناصر کی شاعری کی فضا گھٹی گھٹی اور تنگ نہیں ہے۔ یہاں نیم چھتوں اور دم گھونٹ دینے والے در و دریچے نہیں ہیں، ہاں ایک ربودگی ہے جو افق تا افق چھائی ہوئی ہے۔

ابن انشا نے اس ربودگی کی سرحدیں اور آگے تک روشن کی ہیں۔ میرے نزدیک ابن انشا بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں، ان کے ہاں تسلسل اور ربط، فضا کا احساس، تشکیل و تعمیر کا شعور ملتا ہے۔ ابن انشا ایک خاص انداز سے اپنے دور کے بعض اہم حقائق کو داخلی انداز اور اپنے نیم رومانی بلکہ بقول خود ان کے "الف لیلوی" اور "نیم بوہیمین" روپ میں ڈھال لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ "چاند نگر" ۵۵ء میں چھپی اور اس کے چھپتے ہی ادبی دنیا چونک اٹھی۔ ایک نیا، خوشگوار، تازہ لب و لہجہ "چاند نگر" میں سنائی دیا، شعری زبان کو ایک نئی سمت DIMENSION ایک نئی شخصیت ملی جس کا اندازہ "پچھلے پہر کے سناٹے میں" کے ایک بند سے ہوگا :-

ماضی کی ڈیوڑھی کی چلمن
کھلے دریچے کی جالی سے
چھن چھن آئیں
روپ کی جوت، حنا کی لالی، کل کی یادیں
سوندھی خوشبو، ٹھنڈی بوندیں
کل کے باسی آنسو جن سے
فردا کی بالیں کا فردا بھیگ رہا ہے

دو اور متفرق اشعار دیکھئے ؎

دور اس رات کے آنگن میں رات کی رانی
مہک رہی ہے دلِ بے قرار بات تو سن

بستی قریب گھوم چکے اب دشت کو جائیں، بَن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو! آؤ اب اپنے وطن کو چلیں

"افتاد" اور "بغداد کی ایک رات" اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں "چاند نگر" پر ریویو کرتے ہوئے میں نے ابنِ انشا کی شاعری کے دو میلانات کا تجزیہ کیا تھا۔ ایک چاند راتوں میں بھٹکتا پھرنے والا نوجوان ہے جس کا پتہ ستارے ماتھے والوں سے پوچھا جاتا ہے اور جس میں عشقیہ عنصر غالب ہے، اس میں بھی مزاجاً بانکپن ہے۔ یہ سرمستی اور سرشاری بھی گلزار کھلاتی ہے۔ نئے مناظر آنکھوں کے سامنے لاتی ہے جیسے اچانک خیال کا پردہ کھینچ کر کوئی وسیع میدانوں اور شاداب خیابانوں کو ہمارے سامنے لا رکھتا ہے جہاں قافلے گرمِ سفر ہیں، جہاں حدی کی آواز ہے، رحیل کا درا اس کی صدا ہے اور قبائلی زندگی کی سادہ معصومیت اپنے اولیں شباب کے الھڑپن میں مخمور ہے لیکن ابنِ انشا کا اصلی روپ "افتاد" اور "بغداد کی ایک رات" کے مصنف کا ہے جو اپنی داخلیت اور تیکھے اندازِ بیان کے دامن میں تاریخ اور عصرِ حاضر کی طنابیں کھینچ کر ان کے سر پر شعری حقیقت کا تاج رکھ دیتا ہے۔ وہ پلک جھپکائے اور تیوری پر بل ڈالے بغیر عہدِ نو کے مسائل اپنی ذات میں سمو لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ ابنِ انشا غالباً نئے شاعروں میں اکیلا شاعر ہے جو اپنی داخلیت کو وسعت دے کر اس میں ذات و کائنات کو سمونے کا عمل کامیابی سے انجام دے سکا ہے جس کے اندازِ بیان کی لطافت اور شعریت فکر سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوتی۔

اسی لیے ابنِ انشا کو میں نے مستقبل کا شاعر کہا تھا جس کی آواز میں وہ کس بل موجود ہے جو عموماً آذری شخصیتوں میں ہوا کرتا ہے مگر ۱۹۵۵ء کے بعد ابنِ انشا کی اکثر نظموں میں ان کا پہلا روپ زیادہ اُجاگر رہا ہے اور دوسرے انداز کی نظمیں اور غزلیں بہت کم ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ "صبا کا ایک جھونکا" "ایک اور عزیمت" "یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں" "انشا کہو مزاج مبارک کو ان وطنوں" یہ سب کی سب کامیاب اور دامنِ دل کھینچنے والی نظمیں ہیں مگر ابنِ انشا کی کمند ستاروں ہی پر کیوں پڑے خورشید پر کیوں نہ پڑے، اندازِ بیان کی اس تازگی اور احساس کی اس پہنائی کے بعد ابنِ انشا سے اس سے زیادہ بلند تقاضے کیے جائیں تو کچھ عجب نہیں۔

شاذ تمکنت کا فن ان دونوں سے قدرے جداگانہ ہے۔ شاذ نے نئے طرز کے الفاظ VOCABULARY اور دل گداختگی اور قدرت سے ہم آہنگی لی ہے۔ اختر الایمان کی تنہائی اور خود کلامی سے اپنے خلوت کے چراغ کو روشن کیا ہے اور اس میں اپنی شخصیت کا کس بل شامل کیا ہے۔ "آب و گل" اور "رقصِ ناتمام" میں اختر الایمان کا اثر نمایاں ہے۔ اسی طرح "آخرِ شب" میں سلام کا اثر نمایاں ہے۔ اس کے باوجود شاذ کا اپنا لب و لہجہ بننے لگا ہے۔ اس لب و لہجے میں شخصیت کا گداز اور شعریت LYRIASM دونوں موجود ہیں۔ شاذ اُداسی اور افسردگی، سپردگی اور خود فراموشی کے شاعر ہیں مگر یہ خود فراموشی گریز کا نتیجہ نہیں بلکہ احساس کی شدت اور تجربے کی گہرائی کا نتیجہ ہے۔ شاذ کی نظموں میں تازگی اور شگفتگی ہے مثلاً "اے سایہ خزاں کے نرم جھونکو" یا "رت جگا" یا "پاکی داماں کی حکایت" جیسی نظمیں گو مضمون کے اعتبار سے پامال ہیں مگر احساس کی ندرت اور اندازِ بیان کے اچھوتے پن نے ان میں جان ڈال دی ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجئے:۔

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
جب زلف کھلیں تو سنسناؤ
افشاں کے ذرے لگے تم کو جگنو
وہ مانگ ہے مرے شفق کا قصہ
اس مانگ کے درپئے یہ کہنا
تم پو کی سنائی راگنی ہو
میں صبح کا تارا بن گیا ہوں
آنکھوں میں تمہاری دید کی پیاس
کس درد سے لے کر ڈوبتا ہوں

"آخر شب" کا ایک تاثر ——

چپکے ٹیلے پہ سناٹے کے قدموں کے نشاں
بھیگتی راتوں میں چپ چاپ ابھر دیتے ہیں
پاس ہی سوئے ہوئے کھنڈروں کے کاواک حروف
اپنے گھر سے ہوئے نقاش کو دیتے ہیں صدا
چاندنی خستہ و درماندہ کھڑی ہے خاموش

گو شاذ تمکنت کے ہاں ابھی ناہمواری اور کچے پن کا احساس ہوتا ہے مگر اندازِ بیان کی تازگی اور ندرت کی بنا پر ان سے امیدیں قائم کرنا غلط نہ ہوگا۔

شاذ تمکنت کے ساتھ ہی باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، عزیز قیسی اور حمایت علی شاعر کے نام بھی آتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اور جمیل الدین عالی پر (جو زیادہ تر دوہے لکھتے ہیں مگر جب غزل لکھتے ہیں تو اس میں بھی بانکپن اور شعریت کا التزام رکھتے ہیں) داخلیت کا گہرا اثر ہے۔ اعظمی نے اس زمانے میں 'نیا جنم'، 'سہاگ رات'، 'خراب آباد'، 'واپسی'، 'خلوت کا چراغ' اور 'سورج مکھی کا پھول'، کئی نظمیں لکھیں ان کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی ہندی روزمرہ کا سوندھا پن، تنہائی، خود کلامی، افسردگی اور خود فراموشی ملتی ہے۔ افتادگی کا یہ احساس خلیل اعظمی نے رچا بسا کر پیش کیا ہے "اب پچھلی رات کا پراسرار سناٹا، گلیوں کی اداسی اور گھر کے آنگن کی خاموش آرزومندی کی فضا ملتی ہے۔ خلیل کی غزلیں نظموں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہیں مگر ان میں احساس کی تازگی اور اظہارِ بیان کی لطافت موجود ہے۔ لہجے کی یہ کسک اور رنگینی شاعر خلیل کی فضا کی شعریت، تشبیہوں کی ندرت اور احساس کی تازگی کے اعتبار سے خلیل کی غزلیں اور نظمیں ایک نئے آہنگ کی غماز ہیں ان میں خلیل کی شخصیت کا سوز اور AUTOBIOGRAPHICAL لب ولہجہ ملتا ہے۔ 'آدمیوں کے میلے میں' اس اعتبار سے سب سے نمائندہ نظم ہے۔

باقر مہدی کی شاعری کا لب ولہجہ بہت نمایاں طور پر سوانحی AUTOBIOGRAPHICAL ہے اور اس لیے اس میں تقلید اور روایت پرستی کا انداز کم ہے اور حقیقی تجربے اور خلوص کا عنصر زیادہ ہے مگر اس عشقیہ سرگزشت سے آگے بڑھ کر باقر کی ان نظموں پر بھی توجہ کرنی

چاہیے جن میں فکری آہنگ نمایاں ہے۔ "شعور" میں یہ کوشش واضح طور پر ملتی ہے۔ باقر کی شاعری نہ نقلی جوہر MAKE BELIEVE ہے نہ خواہ مخواہ اپنے اوپر افسردگی طاری کرنے کی مشق ہے۔ باقر کا عشق اور اس کے مسائل بھی ارضی اور حقیقی ہیں۔ ان کی شاعری میں سپردگی کی جگہ پر مقاومت اور تقلید کی جگہ پر براہِ راست تاثر اور تجربے پر اعتماد کا انداز ملتا ہے۔ کسی غیر ضروری آرائش کے بغیر جذبے کا بے کم و کاست بیان باقر کی خصوصیت ہے۔

اس منزل پر اس کی صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ نئے شاعروں میں تین واضح میلانات نظر آتے ہیں۔ ایک میلان وہ ہے جس کے ضمن میں ناصر کاظمی، شاذ تمکنت، خلیل اعظمی کا تذکرہ کیا گیا اس میں داخلیت کا گہرا اثر ہے۔ سپردگی اور ربودگی بھی نمایاں ہے اور ان کا دائرہ ذات کے اردگرد رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا میلان وہ ہے جس نے نیا اسلوب اور DICTION تو اپنایا ہے مگر اس ڈکشن میں عصری مسائل سموئے ہیں اور اپنی شاعری کو آفاقی وسعتیں دینے کی کوشش کی ہے اس میں ابن انشا اور بعض دوسرے شعراء کا ذکر ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہیں جن کا ڈکشن DICTION لب و لہجہ تو اس قدر چونکا دینے والا نہیں ہے مگر مختلف انداز سے وہ عصری مسائل اور فکری آہنگ کو شاعری میں جگہ دیتے رہے ہیں ان میں احمد ریاض مرحوم، باقر مہدی، معصوم رضا راہی، حمایت علی شاعر، شفیق فاطمہ شعریٰ، فارغ بخاری، متین سروش، عبدالرؤف عروج، مصطفیٰ زیدی، شہاب جعفری اور عمیق حنفی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ تیسرا میلان غزل کے روایتی مزاج کی نئی روایت کے ساتھ تجدید کا ہے جس کی رہنمائی شان الحق حقی، زہرہ نگاہ اور بعض دوسرے شعراء نے کی۔

پہلے میلان کے سلسلے میں عزیز قیسی کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی نظموں میں مٹھاس، ربودگی اور سرمستی کا احساس ملتا ہے عزیز قیسی کی نظموں میں سنگھار اور آراستگی موجود ہے۔ "پورے چاند کی رات" اس طرح شروع ہوتی ہے :-

حنا بدست سمن فام سر سنگھار کیے — حسین ہاتھوں میں مہتاب کا چراغ لیے
بدن چرائے خود اپنی حیا کے بوجھ سے خم — بچائے اپنے ہی شانوں سے گیسوئے برہم
پلک کی چھاؤں میں ٹھنڈک لیے فضاؤں کی — نگاہِ ناز میں تاثیر سو دعاؤں کی
اتر رہی ہے شبِ ماہ نرم زینوں سے — قدم بچا کے ستاروں کے آبگینوں سے

عزیز قیسی بھی ان شاعروں میں شامل ہیں جن کی شاعری میں نجی لب و لہجہ اور بغاوت کی آواز گونجی ہے مگر ان کے استعاروں اور تشبیہوں میں اپنا ایک منفرد حسن ہے۔ "وہ نہیں بھولتا" غالباً اس لحاظ سے ان کی نمائندہ نظم کہی جا سکتی ہے۔

دوسرے میلان کے سلسلے میں ابن انشا اور باقر کے علاوہ احمد ریاض، عمیق حنفی، راہی، شفیق فاطمہ شعریٰ، وحید اختر، حمایت علی شاعر، عبدالرؤف عروج، فارغ بخاری، متین سروش، شہاب جعفری اور بعض دوسرے شعراء کا نام آتا ہے ان میں احمد ریاض، راہی اور حمایت علی شاعر ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں ان کی شاعری میں شکست، اضمحلال اور مایوسی کی جگہ یقین کی روشنی ملتی ہے یہ اور بات ہے کہ ہر جگہ یہ روشنی اسی تابناک شاعری میں نہیں ڈھل سکی ہے۔ احمد ریاض ان میں سب سے زیادہ کامیاب تھے۔ احمد ریاض نے فکر کی پختگی کو احساس کی شادابی کی شکل دے دی تھی اور خلوص کی آنچ میں تپا کر اور الفاظ پر قدرت حاصل کر کے اپنے عقیدے کو فن کے درجے تک لے آئے تھے۔ ان کی نظمیں "راستے منزلیں" اور "خلاؤں سے آگے" اور ان کی کئی غزلیں ان کی شاعری کے کس بل کا ثبوت ہیں۔

راہی کے کلام میں یقین اور عقیدے کے باوجود اس دور میں نجی لب و لہجہ اور اپنی ذات سے قربت کا احساس پیدا ہوا ہے اور

دوسرے شاعروں کی طرح AUTOBIOGRAPHICAL سا انداز پیدا ہوا ہے۔ راہی نے جوشِ زمین اور زندگی سے پیار اور تخیل کی جولانی کے ذریعے اپنی شاعری میں تابندگی قائم کی ہے جس کا شاید سب سے اچھا نمونہ "یقین کا چراغ" میں ملتا ہے۔ اس قدر روشن اور رواں نظمیں اس دور میں خاصی کمیاب ہیں۔

پیالۂ زہر میں بھی امرت بھرا ہے وقت کی چشمِ نم نے　　　چناب کی لہروں پہ جلایا ہے پیار کا اک چراغ ہم نے
کیا ہے جادۂ حیات کو ہماری ہی جنبشِ قلم نے　　　ہمیں سے نغموں کا لوچ مانگا کسی کی محفل کے زیر و بم نے
یہ وحشتِ آہوانِ صحرا کئی فسانے سنا رہی ہے!
صبا ابھی نجد کے بیاباں سے کتنے پیغام لا رہی ہے
ہمیں نے عہد میں بتایا کہ رات کے اس طرف سحر ہے　　　ہمیں بتاتے تھے آج بھی یہ اجل کہاں زندگی کدھر ہے
تمہارے زنداں بھی کیا کریں گے صبا ہماری پیامبر ہے　　　تمہاری شمشیر تیز ہو گی ہماری آواز تیز تر ہے
ہزار پہلے گئے ہیں لیکن مثالِ سبزہ لہک رہے ہیں
خزاں کے دل میں بہار بن کے کرن کی طرح ہم کھٹک رہے ہیں

حمایت علی شاعر نے اس دور میں کئی کامیاب نظمیں لکھیں۔ ان میں جوش کم اور دردمندی اور تفکر زیادہ نمایاں ہے۔ "کوریا سے بنگال تک" طویل نظم یقیناً ان کا کارنامہ ہے ان میں زندگی کا خارجی روپ زیادہ ہے اور ذاتی عنصر کم۔ حمایت علی شاعر نے اپنے احساس و ادراک کو محدود نہیں کیا ہے اور شخصی تاثر پہ قناعت نہ کر کے بین الاقوامی سیاسیات کے پس منظر میں اپنے تخلیقی نقش و نگار بناتے ہیں لیکن حمایت علی شاعر اس سیاسی اور خارجی شعور کو مہذب کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور ان کا لب و لہجہ خطیبانہ ہونے سے بچ گیا ہے۔

اس میدان کے باقی نمائندوں میں ایک لحاظ سے سب سے اہم نام مصطفےٰ زیدی کا ہے اور دوسرے لحاظ سے شفیق فاطمہ شعریٰ کا۔ مصطفےٰ زیدی تیغ کے نام سے ہمارے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں زیادہ توازن اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے، ان کے مصرعے زیادہ سجل اور ڈھلے ہوئے ہونے لگے ہیں اور ان کے احساس کے دائرے وسیع تر ہوتے ہیں۔ مصطفےٰ زیدی نقیب یا مبلغ نہیں ہیں لیکن اپنے بیانیہ انداز کی بھی وہ سماج کے چند پہلو چھوڑ جاتے ہیں جو ذہنوں کے لیے نقشِ قدم کا کام دیتے ہیں۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کا نام ابھی چند سال ہی سے سامنے آیا ہے مگر نئے لکھنے والوں میں فکر کے نئے پہلو پیش کرنے اور انداز بیان میں مختلف تجربے کرنے میں وہ بہت سے شعراء سے آگے ہیں۔ شفیق فاطمہ شعریٰ عام طور پر آزاد نظم نہیں لکھتیں مگر ان کی پابند نظموں میں روایتی پابندیاں بہت کم ملتی ہیں۔ جو چیز شعریٰ کی شاعری کو جاندار بناتی ہے وہ ان کی ندرتِ احساس ہے۔ وہ جہان سے سرسری نہیں گزرتیں مگر معمولی سے معمولی منظر میں حقائق کی کوئی رمز دیکھ لیتی ہیں۔ شعریٰ کے لیے زندگی نہ سیاہ ورق ہے نہ دیکھی بھالی راہوں پر آسان سفر ہے بلکہ تجربوں، سوالوں اور احساسات سے لبریز ایک ایسی یاترا ہے جس کا ہر قدم نیرنگیوں سے لبریز ہے۔ شعریٰ کا تفکر خیال انگیز ہے، وہ فارمولے اور آسان حل لے کر نہیں آتی ہیں صرف احساسات کی شدت اور ادراک کی بصیرت کے ساتھ ان تجربوں سے حقائق کی جھلکیوں تک پہنچنے کا سلیقہ لے کر آئی ہیں اور یہ بڑی بات ہے کہ یہ سلیقہ شاعرانہ ہے۔ "ایلورا" اور "ایک ایسی صبح" میں یہ استفہامیے بڑی فن کاری کے ساتھ قائم کیے گئے ہیں۔ "بازار" ایک لطیف طنز ہے۔ "ایلورا" کے دو بند ملاحظہ کیجیے:-

وحشت میں حسن ہے ہنگامے ہیں سموری ہے
اور بستی میں وہ سناٹا کہ احساس کا دم گھٹتا ہے
رہ گزاروں پر ہیں چلتی ہوئی لاشوں کے ہجوم
زندگانی کی سزا ضعف ہے مجبوری ہے
گمیں دیاروں کی بدبو سے فضا ہے مسموم
انتہا علم کی چنگیزی و تیموری ہے
عشق ہے تاب و تواں سے محروم
اور جوانی کا صلہ یاس ہے مجبوری ہے
فکر پر قید ہے
حرفِ حق کہنے میں رسوائی کا اندیشہ ہے
آبرو صید ہے
زندگانی کی فغاں تیز و شر ریشہ ہے
ہر طرف ظالم و مظلوم ہی ہیں حاکم و محکوم ہی ہیں
کس سے پوچھیں کہ ہے انسان کہاں
کس سے پوچھیں کہ ہے کیوں آج بھی زندان کہاں

اس سے آگے کا آخری بند ہے:۔

میرے شیشے میں ہیں خونیں آنسو
حوصلوں آرزوؤں اور امنگوں کا لہو
اپنی محفل کو بناتے ہوئے شرم آتی ہے
یہ ندامت مجھے آبادی سے
دور، ویرانوں میں لے آتی ہے
جہاں غاروں میں دیے جلتے ہیں
جہاں فطرت کے لکڑ زاروں میں نغماتِ حسیں ڈھلتے ہیں

"جب بھی سحر آئی" کا ایک بند دیکھئے:۔

جب بھی سحر آئی یہاں
بادۂ گل گوں کا نشہ
ابر کے پیکر میں رچا

چشمۂ مسیحا میں بہا
موج کے ساغر میں ڈھلا
آتشِ گلزار بنا غنچۂ احمر میں رچا

(شعری)

عمیق حنفی خیال اور عقیدے کے اعتبار سے واضح نظریات کے آدمی ہیں مگر ان کی شاعری کا نیا پن ان کی شاعری کی ہندوستانیت میں مضمر ہے انھوں نے ہندی کے رواں الفاظ اور ہندو صنمیات کی اصطلاحوں اور تلمیحوں سے اُردو شاعری کو نیا لب ولہجہ بخشا ہے عمیق کی شخصیت پھیلا اور وسیع تر ہونا چاہتی ہے۔ ان کا احساس رچا بسا ہوا ہے اور تازہ بستیوں اور نئی بلندیوں کی کھوج میں رہتا ہے عمیق کی شاعری میں ذات سے زیادہ کائنات کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔

"آج کل" دہلی میں اکتوبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں عمیق حنفی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے اس پر جو نوٹ مصنف نے دیا ہے وہ قابل توجہ ہے:۔

"غزل شاعری کے علاوہ موسیقی کی صنف بھی قرار دی جاتی ہے زیرِ نظر غزل میں جوگیا کی کیفیات اور تغزل میں خالص ہندوستانی فضا پیدا کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ ہندی شاعری میں گیت دو طرح کے ہوتے ہیں——— (۱) خالص ادبی اور (۲) غنائیہ یعنی جنھیں گایا جا سکے اگر غزل کی ایسی ہی دو قسمیں کر دی جائیں تو یہ زیرِ نظر غزل قسم دوم میں شمار ہو گی:

یاد آتے ہو تو من میں ہُوک اٹھتی ہے پیا — جیسے سارنگی پہ کوئی چھیڑتا ہو جوگیا
اب سناؤں میں کوئی سکھ ہے نہ جنگل میں ہوں! — اے گھنی زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں تو نے کیا کیا
پھول رُت میں اپنا پچھوں کے گریباں چاک ہیں — پھول کا دامن سیا بھی تو کسی نے کیا سیا
بیل منڈوے سا لپٹ جاتی ہے جس انداز سے — یوں کسی کی یاد نے دل کو مرے لپٹا لیا

چھیڑ دے کوئی کہانی گیت کا ٹیپ توڑ دے
ٹکڑے ٹکڑے ہو نہ جائے درد سے پھل جیا

عمیق حنفی

وحید اختر کی شاعری بھی اضمحلال اور شکست خوردگی سے دامن بچانے میں کامیاب ہوئی ہے گو ان کے ہاں ذاتی اور رنجی لب ولہجہ نمایاں ہے۔ وحید اختر کے ہاں جرأتِ فکر ہے اور ان کی نظمیں عام طور پر فکر کا کوئی زاویہ چھوڑ جاتی ہیں۔ وحید اختر فکر کے اس استفہامیہ میں اپنی تنہائی اور انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے ہاں پہلے ہیلاں کے شاعروں کی طرح بیان کی آرائشگی اور سجاوٹ نہیں ہے مگر براہِ راست بات کہنے کا تیکھا انداز اور شخصیت کا جیتا جاگتا اظہار ملتا ہے۔ "حیاتِ دہر" "شبِ تاب" "درِ وداع" "اپنی تنہائی سے کلام" اور رخالیاں میں سب سے زیادہ "واپسی" ان کے فن کی نمائندگی کرتی ہے۔

وحید اختر کی "واپسی" کے دو شعر:۔

پیکار گہِ زیست کی گرمی سے ہیں بیدار
جیناہے تو عزائم کو تو دم لینے نہ پائیں
دامن نہ چھٹے قافلۂ وقت کا اک آن
زندہ ہیں تو گل کو نہ اٹھائیں گی بہاریں

فارغ بخاری، متین سروش اور عبدالرؤف عروج کی تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان شعراء کے قدم داخلیت اور دروں بینی کے اس طوفان میں بھی مضبوطی کے ساتھ جمے رہے۔ فارغ بخاری کی نظم "سناٹا"، متین سروش کی "آہٹ" اور عبدالرؤف عروج کی "دریچہ" اور "بہروپ" تفکر کی بلکی لہریں سمیٹے ہوئے ہیں۔ شہاب جعفری نے اس دور میں کئی اچھی نظمیں لکھیں۔ شہاب کی افتادِ طبع علامتوں SYMBOLISM اور خود کلامی کی طرف راغب ہوئی مگر اس خود کلامی میں شکست خوردگی کا احساس نہیں ہے بلکہ یہ احساس پوشیدہ ہے کہ اس عمل میں سرگرم اور تشنج اور کاروباری پن سے بوجھل دنیا نے ہر انسان کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے اور اس کے نشاطیہ پہلو کو، اس کے انسانی روپ کو مفلوج کر دیا ہے۔ "فرصتِ چند نفس" کے یہ تین مصرعے خاصے اہم ہیں ——

"کہ اس جہاں میں ہمیشہ دن ہے
ہمیشہ سورج ہی اپنے سر پر کھڑا ہوا ہے
یہ کائنات اک شکستہ گاڑی ہے ایک پہیّے پہ چل رہی ہے"

اس کے علاوہ "نرتیسے کی موت" "گنہگار فرشتے" اور "جنم جنم کی پیاس" میں بھی شاعر کی روح کا تجسس اور اس کی شاعری کے بنیادی تفکر کا سراغ ملتا ہے۔

تیسرے میلان کی نمائندگی خالص غزل گو شعراء کرتے ہیں ان میں غالباً جس قدر نمایاں طور پر شان الحق حقی اور بعد کو زہرہ نگاہ کو اس مدت میں شہرت حاصل ہوئی ہے اتنی دوسروں کو نہیں ہوئی۔ شان الحق حقی روایت پرست نہیں لیکن ان کے لب و لہجے میں روایت کی گونج ہے۔ زہرہ نگاہ نے غزل میں تابِ مقاومت اور یاس میں آس کی شان سے غزل میں ایک نیا مزا پیدا کیا ہے۔ ان میں فکر کی گہرائی کی تلاش بیکار ہے مگر غزل کے مزاج سے مطابقت اور اس کے اسالیب و آداب کو نباہنا انھوں نے ضرور سیکھا ہے۔ شان الحق حقی اور زہرہ نگاہ کی غزلیں میاں غزلیں ہیں ان میں نئے احساس کی گونج بھی ہے اور پرانے آداب کی جھنکار بھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غزل کی تمہید کے تذکرے کے باوجود اور بہت سی غزلیں لکھے جانے کے باوجود اردو غزل کی روایت میں اس دور نے کچھ بہت قابلِ لحاظ اضافہ نہیں کیا ہے۔

اس خاکے کو سامنے رکھا جائے تو نئے شعری مزاج کی چند خصوصیات نمایاں ہونے لگتی ہیں جن میں غالباً سب سے زیادہ اہم رجحان ذات کی طرف واپسی کا ہے جو کچھ شعرا کے ہاں داخلیت اور دروں بینی کی شکل میں ظاہر ہوا اور کچھ کے ہاں نجی لب و لہجے کی شکل میں —— لب و لہجہ کی کھنک قدرے عام ہوئی، خود اور انفرادیت کے چرچے ہونے لگے۔ AUTOBIOGRAPHICAL دراصل ذات اور دروں بینی کا احساس فی نفسہٖ مریضانہ نہیں ہاں یہ دو دھاری تلوار ضرور ہے جو بے ہنر کے ہاتھ میں خطرناک اور ہنر مند کے ہاتھ کی آرائش بن جاتی ہے۔ یوں غور کیجیے تو ذات ہی خلاصۂ کائنات بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ہر فرد کی خوشی اس کا سکون اور نشاط یہی سارے اجتماعی منصوبوں کا آدرش ہے لہٰذا

ہر عظیم خیال، فلسفہ اور مشاہدہ شاعر کو ذاتی جذبے میں ڈھال کر اور نئی بنا کر ہی پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ اس میں تجربے کی روشنی اور خلوص کی آنچ پیدا ہو سکے۔ مگر دروں بینی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاعر کائنات کی پہنائی، دوسروں کے لیے چھوڑ دے اور خود اپنی ذات کے ایک گوشے میں منقلب ہو جائے۔ نئی شاعری کی اڑان عام طور پر محدود رہی ہے کہ اس کی پرواز میں عرفان جگر شامل رہا ہے اور ان کے تجربے زیادہ پرخلوص اور حقیقی ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عظیم مسائل اور بڑے CANVAS کی جگہ چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی چیزیں موضوع شعر بننے لگیں۔ روزمرہ کی زندگی کے حسن پر نظر پہلے کبھی صنوبر کے سائے کے بعد سے "تارے" "گنجے فرشتے" تک ہمارے دانشوروں کا رجحان تعدے برہمن اور میت تشکر سا رہا ہے مگر پچھلے نو دس برسوں میں NORMALCY عمومی زندگی کی چاہت، گھر کے آنگن کی سوندھی مٹی سے پیار، گھر کی دیواروں کی رفاقت کا احساس بڑھا ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے احساس کا دامن سمٹا ہے گو وہ سمٹ کر اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ ہمارے ہاتھ آ گیا ہے مگر کائنات کے طوفان، ہماری تہذیبی زندگی کی طغیانیاں، ہمارے بر اعظم کی کروٹیں، ہمارے اندر بدلتی ہوئی کیفیتیں اور ضمیر کائنات کے عظیم زلزلے ہم کو کم متاثر کر پاتے ہیں کیونکہ ہم اپنے گھر کی نمی کی خوشبوؤں اور دکھوں کے چراغ کی روشنی میں بہت کچھ گم سے ہوئے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس قدرے NORMAL میلانِ طبع کے ساتھ ساتھ فطرت اور منظر کشی کا ایک نیا زاویہ سامنے آیا۔ فطرت کی تصویریں جس قدر پیار اور جس جذباتی لگاؤ سے کھینچی گئی ہیں اتنی اس سے پہلے بہت کم ملیں گی۔ فطرت یہاں کالی داس یا ورڈزورتھ کی قدرت نہیں ہے بلکہ وہ گویا انسان کے ان نہاں خانوں کی تلافی کرتی ہے جو صنعتی نظام اور دنیا کے سنگین حقائق سے پیدا ہونے والی ناآسودگیوں سے بنا ہے ہیں۔ وہ انسان جو نیم تصبوں کے بیچ دم گھونٹ دینے والی فضا میں رہتا ہے، کھلے افق، پھیلے ہوئے آسمان، سرو کے پیڑ، موسیقی اور شاخ صنوبر اٹکے ہوئے چاند کا ذکر کرتا ہے اور آزادی اور کشادہ دلی سے سانس لیتا ہے۔

اس کے علاوہ عام طور پر نرمی، سپردگی اور ربودگی کی آوازیں اس دور میں زیادہ مقبول ہوئیں ان میں ہر آواز پرخلوص اور تصنع سے آزاد نہیں تھی بعض نے غم کو اپنے اوپر طاری کیا، بعض اس مانی لے کو اپنانے میں لگ گئے جو عزیز لکھنوی کے لکھنؤ میں اصل شاعری سمجھی جانے لگی تھی مگر یہ بات غلط نہیں ہے کہ اس دور میں لہجے کی نرمی اور فناد گی، خود فراموشی اور فسردگی کے عناصر واضح طور پر ملتے ہیں ان میں یادوں کی خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے گلزار ہیں۔ ان جانے اور گمنام دکھ درد کے جھرمٹ ہیں۔ ایسے راستے ہیں جہاں ہر وقت جھٹپٹے کا وقت رہتا ہے اور بہتے ہوئے دریا کے ٹھہرنے کے وقت بھی دل شاعر نہیں ٹھہرتا۔ تشکیک کبھی کبھی بیزاری اور کلبیت بھی ان راہوں پر آ نکلتی ہے مگر جو گداز اس دکھ سے پیدا ہوا ہے وہ اندازِ بیان میں گھلاوٹ، مٹھاس، ندرت اور نرمی لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اندازِ بیان کے اعتبار سے اچھی خاصی تعداد میں نئے الفاظ، تشبیہیں، تاثر پارے اور استعارے زبان میں داخل ہوئے ہیں اور نئے احساس کے ارتعاش نے مختلف طریقے پر شاعری کی دنیا کو زیادہ شاداب اور وسیع کیا ہے۔

ان خصوصیات کی روشنی میں ایک سوال بار بار سامنے آتا ہے کیا ہماری شاعری نو رومانیت NEO-ROMANTICISM کے دور سے گزر رہی ہے؟ صنوبر کے سایوں سے نکلنے کے بعد اور ترقی پسندی کے ابتدائی چند سال میں بھی اردو شاعری پر رومانیت ہی کا غلبہ رہا ہے اور ہمارے اکثر شاعر جذباتیت اور رومانیت ہی کے جوش سے انقلاب اور حقیقت نگاری کی راہ تک پہنچے ہیں اب

پھر وہ صدمے یا ایسے خلا کا احساس SENSE OF NOTHINGNESS برتنے میں اس شے سے بڑی ماورائی حقیقت کا عکس دیکھنا تخیل اور جذبے کی فراوانی اور جوش، روایت سے لگاؤ اور شخصی اور نجی احساس پر زور دینا رومانیت کے چند بنیادی نکات کہے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رومانیت کا رنگ شاعر بہ شاعر اور عہد بہ عہد بدلتا رہا ہے اور بنیادی اقدار کے علاوہ جزوی اقدار میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ایسی صورت میں کیا ہماری شاعری کے اس نئے آہنگ کو نو رومانی کہنا حقیقت سے بہت بعید بات ہوگی ؟

اس خاکے سے نئی شاعری کا جو تصور ذہن کے سامنے آتا ہے وہ شکست خوردہ یا منتظر مرگ شاعری کا نہیں ہے۔ اس شاعری میں کوئی واضح سمت نہیں ہے بلکہ مختلف میلان ہیں خیال کی نئی نئی کونپلیں پھوٹی ہیں، احساس کے نئے نئے ارتعاش جاگے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات مبارک ہے کہ ہمارے شاعروں نے اپنے حواس و ادراک پر اعتبار کرنا سیکھا ہے، مانگے کی روشنی سے چراغ روشن کرنے کی عادت بہت کچھ چھوڑی ہے اور جس طرح بچہ پہلی بار چلنے پر لڑکھڑاتا ہے اپنے اوپر اعتماد کرتے ہوئے جھجکتا ہے آگے بڑھنے اور آگے بڑھ کر ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی بات نہیں سوچ سکتا اسی طرح ہماری شاعری بھی کچھ لڑکھڑاتی جھجکتی دکھائی دیتی ہے اس میں عظیم مسائل کی گونج نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے دور میں جو غالب اور اقبال کے دور سے کئی لحاظ سے عظمت آفریں اور پیچیدہ دور ہے غالب اور اقبال کی تفکر کو بھی ساتھ لے کر نہیں چل سکی ہے۔ اس میں تشکیک بھی پیدا ہوئی اور فرار بھی مگر یہ اپنے اوپر اعتمادی کا نتیجہ تھی اس لیے اس سے مایوس ہونے کی وجہ نہیں اسے مبارک اور نیک فال سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ جو یقین اور استناد تشکیک اور خود اعتمادی اور اپنے غور و فکر کے نتیجے کے طور پر آئے گا اس میں زیادہ توازن بھی ہوگا اور زیادہ استقامت بھی۔ ہاں داخلیت پرستی اور مریضانہ دروں بینی کے خطرات سے آگاہ کرنا اور نئی شاعری کو جزرسی میں گرفتار ہونے سے بچانا ہماری تنقید نگاری کے فرائض میں ہے۔

اب جائزہ میں درد ہے، گیت، قطعات، رباعیات، ڈرامائی شاعری، کینٹو وغیرہ لاتعداد شعری اسالیب شامل نہیں اور یہ بحث نظم اور غزل ہی تک محدود رکھی گئی ہے اور اس میں بوجوہ مختلف فن کاروں کے رجحانات سے تفصیلی بحث نہیں کی جا سکی مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ نئی شاعری کی اقدار کے تعین اور میلانات کی وضاحت کی ضرورت ہے اس میں بھی بہت سی نئی سمتیں اور نئے رجحان پیدا ہوئے ہیں اس نے بھی مشاطہ بن کر عروس سخن کو سنوارا ہے اور اس اضافے کو ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی تاریخی اہمیت ہے۔ آئندہ کسی مضمون میں نئی شاعری کے ان میلانات پر زیادہ تفصیلی بحث کروں گا مگر اس مضمون کے خاتمے کے لیے غالب کا یہ شعر نہایت مناسب ہے ؎

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی مباش منکرِ غالب کہ در زمانہ تست

———

فارسی شاعری اور کشمیر

محمد عبد اللہ قریشی

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ کسی ملک کی طبعی حالت وہاں کے لوگوں پر، اُن کے اخلاق و عادات پر اور اُن کی صنعت و حرفت پر اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ کشمیر اس کی زندہ مثال ہے۔ قدرت نے اپنی فیاضی سے اس خطے کو دولتِ حسن سے اس قدر مالا مال کیا ہے۔ کہ وہ جائز طور پر "گلزارِ دنیا"، "عروسِ خدا" اور "باغِ دلکشا" کے ناموں سے پکارا جاتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "جنتِ ارضی" اور "فردوس بریں" کے خطابات سے مخاطب ہوتا ہے۔ ایسی سرزمین فنونِ لطیفہ اور بالخصوص شاعری کے لیے کیوں موزوں نہ ہو گی؟ اناج کے سرسبز و شاداب کھیت، پھلوں سے لدے ہوئے درخت، چاولوں کی خوشبو دار مہک، مختلف قسم کے خوش رنگ و خوش آواز پرندے، سوئٹزرلینڈ اور ناروے کے سے گھنے جنگل، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے قدرتی چشمے اور پہاڑی ندی نالے ایسی چیزیں نہیں جو شاعر کے جذبات میں تلاطم برپا نہ کر سکیں۔ سی ہیبرٹ اسی حسین و جمیل وادی سے متاثر ہو کر کہتا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برف سے منڈھے ہوئے ہمالیہ پہاڑ کے حواشی میں ایک خوبصورت تصویر جڑ دی گئی ہے۔"

مسز جی سی برونس لکھتی ہیں کہ "کشمیر کی ہوا میں سانس لینا گویا شعرستان میں رہنا ہے۔" اور اس میں شک بھی نہیں کہ کشمیر دنیا کی بہترین غزل کا ایک شاداب ترین شعر ہے۔ یہ برف سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے زمردیں پہاڑ اس شعر کا مضمون، یہ محبت کا سکون بخشنے والی آنکھوں کی طرح ہر وقت منور رہنے والے سرد و شیریں پانی کے بہتے ہوئے ندی نالے اس شعر کی روانی، یہ گرتی ہوئی آبشاروں کی ترنم ریزی اور خوش الحان پرندوں کی نغمہ سرائی اس شعر کی موسیقی اور یہ مختلف قسم کے ثمر ور و سایہ دار درخت اور رنگ برنگ رنگ افروز پھول اس شعر کے حسین ترین استعارے ہیں۔ ہر شے جذبات کو بھڑکانے کا تہیہ کیے اپنے فردوسی خوان کرم بچھائے دعوت کیف و سرور دے رہی ہے۔

یہ خواب کی دنیا ہے جہاں تخیل کی سرحدیں بے پناہ ہو جاتی ہیں۔ یہ دن کے وقت خیال بندی کا طلسم ہے اور رات کے وقت سحر کاریٔ خیال۔ اس کی فضا یکسر معمور حسن اور تمام تر لبریز محبت ہے۔ اس لیے جو شخص حسین ماحول سے متاثر ہو سکتا ہے، لطیف ہوا سے محبت کی آواز سننے کی اہلیت رکھتا ہے، معرفت کردگار کے دفتر بے پایاں کو الٹ پلٹ کر دیکھ سکتا، بصیرت کی آنکھ سے گل پوش وادیوں کی رنگ آمیزی، مناظر جمیل کی شادابی و دلفریبی، شگفتہ کلیوں کی نزہت افزائی اور پھولوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی شاخوں کی نکہت بیزیوں کا مشاہدہ کر سکتا ہے، وہ یہاں رہ کر اچھے سے اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت کے بے گنتی روپ۔ انسان اور سماج کے بے شمار سوانگ

ایسے ہیں کہ ان سب کی تصویر کھینچ سکتی اور ان کو تخیلی پیکر دیا جا سکتا ہے۔

”یہ ضروری نہیں کہ تخیلی پیکر کسی انسان کا کیرکٹر یا انسان کی مصورانہ تصویر ہی ہو۔ صبح شام سورج کی روشنی کے رنگ برنگی قوس قزحی نظارے، پہاڑوں کے اتار چڑھاؤ، ابھار اور ڈھلاؤ جھیلوں کا سانس لینا، سمندری موجوں کا پہاڑوں کی طرح ابھرنا، بادلوں کی طرح پھیلنا، ندیوں کا سانپ کی طرح لہرانا، نالابوں اور چشموں کا آنکھیں پھاڑ کے ستاروں کو تکنا، زمین کا نشیب و فراز، درختوں کے جھنڈ، گھاس کا لہلہانا، موسموں کی بہاریں۔ غرض فطرت کا ہر منظر سہاؤنا یا ڈراؤنا، سماج کا مدّ و جزر، انسانی تعلقات کی پیچیدگیاں، اقتصادی بلندیاں اور پستیاں، سیاسی سکون اور تلاطم، صداقت پر قربانیاں، گندم نما جو فروشیاں، نفس کی کیفیتیں، جذبات کا جوار بھاٹا، خواہشات نفسانی کا حیرت ناک کھیل، غرض فطرت انسانی کا انفرادی اور اجتماعی ہر رنگ شاعر کی مصوری کے لیے ایک زبردست موضوع ہے۔“[1]

یوں تو کشمیر میں قدرت نے ہر چیز کو شاعری کا جامہ پہنا رکھا ہے۔ لیکن کھیتوں کی نیلائی اور گوڈائی کا منظر بھی اس قدر روح پرور اور کیف انگیز ہوتا ہے کہ اگر آپ جون کے اوائل میں اس جنت ارضی کی سیر کریں اور علی الصباح کسی کھیت کی طرف نکل جائیں تو آپ کو ایک عجیب و غریب تماشا نظر آئے گا۔ بیس بیس تیس تیس آدمیوں کی ٹولیاں کھیتوں میں بیٹھی ہوئی گھاس پھوس سے پاک صاف کرتی نظر آئیں گی۔ اس وقت ان کی حالت ”دست بکار و دل بیار“ کے مصداق ہوگی۔ وہ کام کے ساتھ ساتھ نہایت میٹھے سروں میں کچھ گیت گا رہے ہوں گے۔ صبح کا سہانا وقت، آفتاب کے طلوع کا دلکش منظر اور اس پر ان کی مدھ بھری میٹھی صدائیں دلوں پر ایک خاص اثر کریں گی اور ایسا محسوس ہوگا جیسے نغمہ زمین سے ابل کر سننے والوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس وقت عام انسان پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اور شاعر تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر علائق دنیا سے کچھ ایسا کنارہ کش ہو جاتا ہے کہ محسوس کرنے لگتا ہے، میں ایک ایسی سرزمین میں پہنچ گیا ہوں جہاں کا ذرہ ذرہ اپنی آغوش محبت وا کئے زبان بے زبانی سے کہہ رہا ہے ؎

دگر از غم دنیا دل تو گشت ملول
نزد من آکہ ترا یار وفادار منم

علاوہ ازیں ہری ہری گھاس پر شبنم کے موتی، نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے، گاتی ہوئی آبشاروں کی ترنم ریزی اور بادِ باراں کی سحر خیزی بھی شاعر کے دماغ میں پند و موعظت کے طوفان پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ انھیں اپنے رنگ میں رنگ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا اور خود ان پر وجد کرتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کشمیر ایک زبردست علمی اور ادبی مرکز ہونے میں کسی سے پیچھے رہا ہو۔ مگر افسوس کہ کشمیری شاعری کی آج تک خاطر خواہ قدر نہیں کی گئی۔ اور بہت کم آدمی ایسے ملتے ہیں جنھیں اس بات کا علم ہے کہ کشمیر نے اس صنف کی جی کھول کر خدمت کی ہے۔ کشمیر کی صنعت و حرفت نے ملک کے طول و عرض میں کافی شہرت حاصل کی مگر اس کی تہ میں زیادہ تر وہاں کے تاجروں اور غیر ملکی سیاحوں کی ہمت اور قدر دانی کارفرما نظر آتی ہے۔ شاعری چونکہ ان مخطوطات میں پوشیدہ تھی جنھیں آج تک روشنی کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا، اس لیے وہ پردۂ اخفا ہی میں رہی۔ اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کشمیر نے شاعری اور بالخصوص فارسی شاعری

---

[1] سریلے بول بہ تصرف

کی خاطر کیا کچھ کیا اور فارسی زبان کی ترویج و ترقی میں کشمیریوں کا کتنا حصہ ہے؟

آج ایران اپنے فردوسی، حافظ، رودکی اور نظامی پر بہت ناز کر رہا ہے۔ مگر کشمیر بھی شائق، غنی، کامل، صرفی پر فخر کرنے میں اس سے کچھ کم حق بجانب نہیں۔ عبدالوہاب شائق نے شاہنامے کی طرز پر کشمیر کی ایک منظوم تاریخ تصنیف کی جو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ غنی کا دیوان کشمیر کی حدود سے نکل کر ہندوستان اور ایران تک پہنچا اور اساتذہ فن سے اپنے کمالات کا اعتراف کراتا رہا اور باوجود اس کے کہ فارسی شاعری میں صدہا انقلابات آئے، غنی کی زبان کو انقلاب کی ہوا سے کوئی گزند نہ پہنچا اور آج سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے کلام پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ مرزا اکمل الدین بیگ کامل کی مثنوی بحر العرفان صوفیانہ خیالات کے لحاظ سے عدیم النظیر چیز خیال کی جاتی ہے۔ ملا یعقوب صرفی، ملا بہاؤ الدین متو، ملا اشرف ڈاری بلبل اور ملا حمید اللہ حمید کاشمیری شاہ آبادی کے لکھے ابھی تک طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئے مگر وہ بھی لاجواب چیزیں ہیں۔

یوں تو حکومت اسلامیہ کے ساتھ ہی فارسی زبان کشمیر میں پہنچ گئی تھی مگر اس کی ترقی کا اصل دور سلطان قطب الدین[۱]، سلطان سکندر[۲] اور سلطان زین العابدین[۳] عرف بڈشاہ کے عہد میں شروع ہوا۔ اس سے پیشتر حکومت کا کاروبار سنسکرت زبان میں چلتا تھا، بڈشاہ نے دارالترجمہ اور دارالتصنیف کے شعبے قائم کر کے ملک کے بہترین باکمالوں کو اپنے ہاں جمع کیا اور پھر ان پر انعام و اکرام کی بارش کر کر کے اپنی قدر دانی اور معارف پروری کا ثبوت دیا۔ چنانچہ سید محمد امین منطقی اویسی، ملک الشعراء ملا احمد کاشمیری، ملا ندیمی، ملا فصیحی، ملا طبعی، ملا جمیل، ملا محمد شاعر، ملا احمد رومی، ملا نور الدین، ملا علی شیرازی، ملا نادری، مولانا حسین غزنوی وغیرہم اس دور کی چند قابل قدر ہستیاں ہیں۔ ان سب نے مل کر فارسی کی جڑیں زمین میں گاڑ دیں۔

بڈشاہی دربار کے ملک الشعرا ملا احمد کی قوت استدلال، لطافت طبع، قادر الکلامی اور بدیہہ گوئی کا تمام مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ دربار شاہی کے علمی مباحثوں میں جو ادبا اور شعرا حصہ لیتے تھے۔ ملا احمد ان سب کا سرتاج تھا۔ تاریخ وقائع کشمیر اور ترجمہ مہابھارت اس کی یادگاریں۔ وفات کے بعد مزار الشعرا میں دفن ہوا۔

ایک دن بزم آراستہ تھی۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ملا احمد دستار کا شملہ پیشانی پر شاخ وار لٹکا کر جھومتے جھامتے بلکہ ہانپتے کانپتے دربار میں آئے۔ بادشاہ نے مسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا؂

شاخ پیشانیٔ ملا احمد کشمیر بہ بیں
گر نہ دیدستی تو در آفاق انسان شاخوار

بادشاہ مذاق صحیح اور طبع سلیم رکھتا تھا۔ اس کے درباری مصاحب اور شعرا بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ملا احمد تو ملک الشعرا ہی تھا۔ فوراً بول اٹھا؂

شاخ پیشانی خدیوا گر گ وارے داشتم ۔۔۔ تا نیایم درمیان مادہ گاواں در شمار

---

۱ عہد حکومت ۱۳۷۹ء لغایت ۱۳۹۳ء
۲ عہد حکومت ۱۳۹۴ء لغایت ۱۴۱۷ء
۳ " ۱۴۲۳ء " ۱۴۷۴ء

جواب کی برجستگی ملک الشعراء کے ذہنِ رسا کا پتہ دے رہی ہے۔[1]

ایک دن ملا احمد نوشہرہ میں سلطان کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں کاسۂ گدائی یعنی کچکول لیے آیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ اسے بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ بادشاہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ طیش میں آ کر فرمایا۔ یہ کچکول تم کو کس نے دیا ہے؟ وہ تو خاموش رہا۔ ملا احمد اٹھا اور فی البدیہہ بولا ؎

اے آنکہ ترا تاجوری داد سری داد
در دست گدا کوزۂ دریوزہ گری داد

اس شعر کا سننا تھا کہ بادشاہ کا غصہ فرو ہو گیا۔[2]

سید محمد ابن اویسی منطقی نے بادشاہ کے گھر میں پرورش پائی۔ لیکن جب بادشاہ نے آپ کی فراست و کیاست دیکھ کر بعض امور مملکت آپ کے سپرد کرنا چاہے تو آپ نے مندرجہ ذیل شعر کے علاوہ ایک طویل ترجیع بند میں دنیا سے کنارہ کشی کا اظہار کر دیا ؎

ز ماسوائے تو آنانکہ فارغ البال اند
بہ عالمے نہ فروشند ذوقِ تنہائی

علم و فضل کے باوجود آپ کو انکساری و فروتنی پر فخر تھا۔ فرماتے ہیں ؎

گناہ ما ز عدم گر نیامدے بہ وجود
وجود عفو تو در عالمِ عدم مے بود

لیکن [illegible]ھ میں اشرار کی ایک جماعت نے آپ کو شہید کر دیا۔ جاں کنی کی حالت میں آپ نے فرمایا ؎

مے فارغم ز مصلحت اہلِ روزگار — مے داں یقیں کہ کشتنِ من بود بے گناہ
اکنوں بیا و شعر بخواں بر مزارِ من — تا روحِ طالبانِ ستمگر شود تباہ

صورتِ قبرم ز بعدِ مرگ ویراں خوشتر است
نامرادے ہمچو من با خاک یکساں خوشتر است

ملک الشعراء ملا نادری بھی اس عہد کی ایک نادر شخصیت تھے۔ تاریخ اور دیوان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی لکھیں۔ مگر اب اس شعر کے سوا ان کی کوئی یادگار باقی نہیں ؎

برقعِ نور است بر رخسارِ آتش ناکِ تو
یا ز تابِ عارضت آتش فتادہ در نقاب

---

[1] تاریخ بڈشاہی مصنفہ منشی محمد الدین فوق صفحہ ۲۹۲

[2] تاریخ بڈشاہی صفحہ ۲۹۴

بڈشاہ نے کشمیری پنڈتوں کو بھی ترغیب دی کہ وہ فارسی زبان سیکھ کر حکومت کے عہدے سنبھالیں۔ اس گروہ میں جس نے سب سے پہلے فارسی زبان کی طرف توجہ کی وہ سپرو کہلایا۔ سپرو کشمیر میں اس شخص کو کہتے ہیں جس نے سب کچھ پڑھ لیا یا پڑھنے میں سبقت کی۔ علامہ اقبال کا خاندان سپرو پنڈتوں ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ کشمیری بالطبع وسیع النظر اور ذہین ہوتے ہیں۔ نئے ماحول کے مطابق ڈھل جانے کی صلاحیت ان میں مبالغہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ فارسی سے مانوس ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا کی ذہانت رفتہ رفتہ کشمیریوں میں سرایت کر گئی اور اسلامی تمدن کی پذیرائی فراخ حوصلگی سے ہونے لگی۔ کشمیری پنڈت کثیر تعداد میں فارسی اور عربی کے عالم ہوئے اور ان کو فارسی سے ہمیشہ ایک گہرا لگاؤ رہا۔ یہ اسی فارسی دانی کا اثر تھا کہ وہ کشمیر کے کشمیری سلاطین، چک بادشاہوں، مغل اور افغان حاکموں، سکھ اور ڈوگرہ راج میں حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر ہمیشہ فائز رہے، مجلسی زندگی میں بھی ان کا وقار بلند رہا اور وہ فارسی کو اپنی زبان سمجھ کر اس میں دلی جذبات و خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

چک شاہی حکومت اگرچہ مدت تھوڑا عرصہ کشمیر میں قائم رہی مگر اس دور میں بھی فارسی شاعری کی ترقی نہ رکی۔ چنانچہ میر علی اور نامی حسین شاہ چک کے زمانے میں، مہری سلطان علی شاہ چک کے عہد میں اور محمد امین مستغنی یوسف شاہ چک کے دور میں نہایت مشہور، عالی دماغ اور خوش بیان شاعر ہوئے ہیں جن کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے؎

گل بدستم چہ نہی در کف من خار خوش است
ایں گلِ تازہ براں گوشۂ دستار خوش است

—

سبو سبو دہ و خُم خُم دلِ لوند مرا
قدح چہ آب زند آتشِ بلند مرا (میر علی)

—

ہرگز دلم بغیر تو مائل نمی شود · در دیدہ نقشِ روئے تو زائل نمی شود
از دوریت چہ باک کہ از بُعدِ ظاہری · اصلا میان ما و تو حائل نمی شود

دستم بریدہ باد چہ کار آیدم بگو
در گردنِ بتاں ہمچو حمائل نمی شود (نامی)

—

مرتضیٰ بادشہ مسند عالی نبی است · آفتابیست کہ برج شرفش دوش نبی است (مہری)

—

برہمن گر وِ تو گردم رہ کعبہ بنما
کہ ز ایمانِ خودم شرم بسے می آید (مستغنی)

—

دوشینہ بچشم دل نہاں از مردم
دیدم نہ بہشت بلکہ کشمیر دوم
خاکی ز عبیر و مشک آگندہ ہمہ
آبی ز صفا وجود خود یافتہ گم (مستغنی)

من خندہ نیم بہ طبع عاشق ناساز
یا گریہ کہ بر روئے ردم چوں غماز
یا نالہ کہ سر بگوشش بیگانہ نہم
من دردِ دلم خلوتی محرم راز (مستغنی)

یوسف شاہ چک خود بھی فارسی اور کشمیری دونوں زبانوں کا اچھا شاعر تھا۔ یہ شعر اس کے طبع زاد ہیں ؎

دلِ پُر دردِ من جاناں بسانِ غنچہ پُر خون است
چہ بے رحمی نہ پُرسیدی کہ احوالِ دلت چون است

کاسۂ سر شد قدح از گردشِ دوراں مرا
دارد ایں زیر خراب آباد سرگرداں مرا

ایک دفعہ وہ سیر کے لیے پرگنہ پھاگ میں گیا جسے وادیٔ وانگت کہتے ہیں۔ وہاں ایک سبزہ زار میں دو چشمے پاس ہی پاس پھوٹتے تھے۔ ایک کا نام نار سر اور دوسرے کا مار سر تھا۔ منظر بڑا ہی دلکش اور روح پرور تھا۔ مگر وہ جو کہا کرتے ہیں کہ اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ اس نے یوسف شاہ پر الٹا ہی اثر کیا۔ اپنی ملکہ حبہ خاتون کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اس کی جدائی کے خیال نے دماغ کو گدگدایا اور یہ شعر بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا ؎

بہ یادِ دو زلف بتِ کشمیر نژادے
شد نار سر و مار سر از گریۂ چشم

یعنی بت کشمیر کی زلفوں کی یاد میں میری آنکھیں اتنا روئیں کہ نار سر اور مار سر دو چشمے جاری ہو گئے۔

کشمیر کا بادشاہ حسین شاہ چک بھی قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کے یہ شعر اب تک زبان زد خاص و عام ہیں ؎

حمایل کردہ تیغ و بستہ خنجر یار می آید — دلا برخیز! کارے کن کہ جاں درکار می آید
آں ترک آل پوش سوار سمند شد — یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

اس عہد میں فارسی شاعری نے کافی وسعت اور ہردلعزیزی حاصل کی۔ یہاں تک کہ تیموریوں کے ذوقِ سخن پروری، فیاضی اور قدردانی کی بدولت یہ معراجِ کمال تک پہنچ گئی۔ گھر گھر چرچا ہو گیا۔ ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے رہنے لگے، موزونیٔ طبع ایک عام چیز بن گئی اور شعرگوئی ضروریاتِ طبیعت میں شامل ہو گئی۔ صرفیؔ۔ ناجیؔ۔ مظہریؔ۔ غنیؔ۔ اوجیؔ۔ فطرتؔ۔ ذہنیؔ۔ میر الٰہی۔ ملا محمد صالح ندیمؔ۔ ملا طغرا۔ گویا۔ جویا۔ یکتاؔ۔ تجلی۔ توفیق۔ ملا محمد زمان نافعؔ۔ ملا فروغی۔ حاجی محمد اسلم سالمؔ اور ان جیسے دیگر باکمال شعرا کی جماعتِ کثیر اس عہد کی مشہور یادگار ہے۔ انھوں نے اپنی سخن سنجیوں سے کشمیر کا نام شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا اور فارسی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر چمکنے لگا۔

اس وقت درباری اور ملکی زبان فارسی تھی اور چونکہ یہ زبان انسانی جذبات کی ترجمانی، قلبی واردات کی ادائگی اور صوفیانہ خیالات کی وحدت آفرینیوں کے بیان کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس لیے کشمیری شعرا نے بھی اپنے خیالات و تاثرات کے اظہار کے لیے اسی کو منتخب کیا۔ اور اس میں وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ اہلِ زبان بھی دنگ رہ گئے۔ کشمیر فارسی شاعری کا نہایت زبردست مرکز بن گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے فارسی شاعری نے جنم ہی اسی جگہ لیا ہے۔

علوم و فنون کی قدردانی اور باکمالوں کی سرپرستی کے اعتبار سے تیموریوں کی سلطنت کا زمانہ ہندوستان کا روشن ترین زمانہ ہے ہندوستان کا شہنشاہ اکبر اور ایران کا شاہ عباس صفوی ہم عصر تھے۔ اور اگرچہ شاہ عباس صفوی بھی فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے لحاظ سے سلاطینِ ایران میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ پھر بھی اس کے عہد میں ایرانی باکمالوں کا تانتا ہندوستان میں بندھا رہا۔ یہاں پہنچ کر جن اربابِ فن کی رسائی شاہی دربار تک ہو جاتی تھی وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ وہ تحت الثریٰ سے ثریا تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن جو خانِ خاناں کی نظر میں جچ جاتے تھے وہ بھی یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی مشتِ خاک اکسیر بن گئی ہے۔ یہاں فیضیؔ اور ان کی جماعت موجود تھی۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ مقابلے پر قصائد لکھے جاتے تھے۔ چونکہ مسابقہ کی کوشش ہر وقت جاری رہتی تھی۔ اس لیے کوئی لمحہ مشقِ سخن کے بغیر نہ گزرتا تھا۔ یہی چیز تھی جس نے شعر کو سحرِ حلال بلکہ اعجاز بنا دیا۔ چنانچہ "عرفیؔ۔ نظیریؔ۔ طالب آملی۔ کلیمؔ۔ قدسیؔ اور غزالیؔ کے کلام میں جو لطافت، نزاکتِ ادا، باریک خیالی اور رنگین آرائی پائی جاتی ہے، وہ شفائیؔ اور محتشم کاشی میں نہیں ہے۔ جو ایران ہی میں رہے۔ حالانکہ یہ دونوں اسی زمانے کے شاعر اور شعرائے ایران کے سرتاج اور دربارِ شاہی کے انتخاب تھے[1]"

ایرانی طبعاً حسنِ فطرت اور مناظرِ قدرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ایران اور خطۂ کشمیر کی آب و ہوا میں ایک خاص مماثلت بھی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جو ایرانی ہندوستان آتا وہ کشمیرِ جنت نظیر نہ دیکھتا۔ یوں بھی سلاطینِ ہند اور اُن کے اُمرا موسمِ گرما کشمیر ہی میں گزارتے تھے۔ اس طرح ایرانی شعرا بھی ان کے ساتھ کشمیر پہنچ جاتے تھے۔ کچھ تو اکبر و جہانگیر کے ذوقِ سخن پروری نے کشمیر کو اس رنگ میں رنگ دیا اور کچھ ایرانیوں نے اسے شعرگوئی کا مرکز بنا دیا۔ بلکہ بعض تو مر کر بھی یہیں دفن ہوئے۔ چنانچہ سری نگر میں ڈل کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر بعض مقامی شعرا کے پہلو بہ پہلو حاجی محمد جان قدسی مشہدی، ملا طغرا مشہدی، میر فتح اللہ شیرازی، میرزا محمد قلی سلیم طہرانی، حکیم ابوطالب کلیم ہمدانی، رشیدا فتحپوری، عنایت خاں آشنا، میرزا ابوالقاسم وغیرہ آسودۂ خواب ہیں اور ان کی آخری آرامگاہ کو مزار الشعرا کہتے ہیں۔

۱؎ شعر العجم جلد ۳ ص ۱۸۳-۱۸۲

اکبر نے کشمیر فتح کرنے کے بعد تین دفعہ اس حسین و جمیل وادی کا دورہ کیا، دشوار گزار راستے طے کر کے مرغزاروں کے نشاط افزا نظارے دیکھے اور لوگوں کے حالات سے واقف ہو کر ان کی تالیف قلوب کی۔ ابو الفضل نے اپنے سحر طراز قلم سے ان سفروں کا دلچسپ حال بیان کیا ہے۔ سنہ ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) کے پہلے سفر کشمیر میں شہزادہ سلیم، شہزادہ مراد، شیخ فرید بخشی، زین خاں کوکا، خان خاناں، حکیم ابو الفتح گیلانی، امیر فتح اللہ شیرازی، ابو الفضل، فیضی اور بہت سے دیگر امرا و شعرا جلو میں تھے۔ فیضی کا مشہور قصیدۂ کشمیریہ اسی سفر کی یادگار ہے۔ جس طرح ابو الفضل نے نثر میں طلسم باندھا ہے اسی طرح فیضی نے نظم میں جادو بیانی کی ہے۔ کشمیر کی شان میں اس کے یہ شعر بہت مشہور ہیں ؎

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر
کہ بار عیش گشاید بہ خطۂ[۱] کشمیر

درو بجائے گیاہ زعفران ہمی روید
کہ آب و خاک طرب را چنیں بود تاثیر

زمین او چو دل بے غماں طرب خیز است
سپہر کردہ مگر خاک او بہ بادہ خمیر

قصیدہ کشمیریہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے اس سفر میں عرفی بھی ہم رکاب تھا۔ ایک قطعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے کسی موقعہ پر ایک گھوڑا انعام دیا۔ لیکن عرفی کو پسند نہ آیا اور اس نے شکر کا اظہار کرنے کی بجائے الٹا گھوڑے کی ہجو کہی جو یہ ہے[۲]

شاہنشہا حقیقت اسپے کہ دادۂ — بشنو ز لطف تا برسانم بعز عرض
ہستم برو سوار و لیکن پیادہ ام — گامے بطول میزنم اکنوں رہم بعرض

اس کے باوجود عرفی کشمیر کی تعریف میں یہ شعر کہے بغیر نہ رہ سکا ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

امیر فتح اللہ شیرازی نے کشمیر پہنچ کر عجائبات و حالات کشمیر پر ایک رسالہ لکھا جو بادشاہ کے حکم سے اکبر نامہ میں شامل کر لیا گیا۔ مگر وہ خود تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ علاج کیا گیا لیکن یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کے لیے مرجھا کر وہیں خاک میں مل گیا۔ فیضی نے اس کا مرثیہ لکھا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

دا حسرتا کہ رفت فلاطون درز میں — دا حسرتا کہ مرد ارسطوئے کارداں
ہرگز نہ مردہ اند و نمیرند اہل دل — حرفے ست نام مرگ برین قوم ترجماں

---

[۱] خطۂ کشمیر
[۲] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۴۳

اکبر ہی کے زمانے میں ملا عشقی نے مولانا جامی کے اس شعر ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

کے جواب میں یہ غیر فانی شعر کہا ؎

ہنوز آں ابر رحمت دُر فشاں است　　　　مے و میخانہ با مہر و نشاں است

ملا ذہنی اور اوجی بھی ان ایام میں کشمیر کے دو بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری زیادہ تر غزل کے میدان تک محدود ہے۔ فطرتی بھی اکبر کے زمانے میں ہوا ہے۔ وہ ملا ذہنی کا شاگرد اور ملا ندیمی اور ملا نعیمی کا ہم عصر تھا۔ ایک دفعہ مندرجہ ذیل اشعار کے صلے میں شہنشاہ نے اسے بارہ ہزار روپیہ انعام عطا کیا[1]

قسمت نگر کہ در رخ دہر جوہری عطاست
آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او کرد کر معائنۂ خود ز آئینہ
ایں می کند مشاہدۂ حق در آفتاب

ابو الفضل آئین اکبری[2] میں مظہری کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ وہ اوائل عمر ہی سے شعر کہتا تھا۔ اسے سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ اس نے ایران، خراسان اور ہندوستان کی سیر کی۔ محتشم کاشی اور وحشی یزدی سے استفادہ کیا۔ اور اکبر کے ملازمین کی سلک میں منسلک ہوا جس نے [illegible] / ۱۵۹۰ء میں اسے کشمیر کا میر بحر مقرر کر دیا۔ مظہری نے چھ ہزار اشعار کہے اور ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) میں بمقام سری نگر انتقال کیا۔ اس کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

چہ حالت است ندانم جمال سلمیٰ را　　　　کہ بیش دیدنش افزوں کند تمنیٰ را
بہ بست دیدۂ مجنوں ز خویش و بیگانہ　　　　چہ آشنا نگہے بود چشم لیلیٰ را

اقبال حسن کار ترا بیش بودہ است
دہ نہ صلاح کار ندانستۂ کہ چیست

ہر کس کہ بہ چشم ما سبک شد　　　　بر خاطر آسماں گراں است

اکبر تیسری اور آخری مرتبہ ۱۰۰۶ھ میں کشمیر گیا۔ اسی سال اس نے ہری پربت پر قلعہ ناگر نگر کی تعمیر کا حکم دے کر قحط زدہ

---

[1] خزانۂ عامرہ مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۸۷۱ء صفحہ ۲۶۷
[2] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۵۸۴

کشمیریوں کو فاقہ کشی سے بچایا۔ خزاں کے دن تھے۔ لیکن بادشاہ نے اس موسم میں بھی سری نگر کے باغوں میں سیب شفتالو اور چنار کی فصل ملاحظہ کی اور خزاں کی رنگ آمیزیوں پر بہار کا عالم دیکھ کر فرمایا ؎

ذوقِ فنا نیافتہ ورنہ در نظر
رنگیں تر از بہار بود جلوۂ خزاں

جہانگیر شہزادگی کے عالم میں باپ کے ساتھ کشمیر ہو آیا تھا۔ اسے یہ خطہ بہت پسند تھا۔ اس لیے بادشاہ بننے کے بعد اس نے گلگشت کشمیر کا اکثر لطف اٹھایا۔ ایک سفر کا حال اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ اپنی توزک میں لکھا ہے۔ یہ سفر اس نے اپنے جلوس کے چودھویں نوروزی جشن کے بعد جو ۴ ربیع الاوّل ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) کو منعقد ہوا، شروع کیا۔ ۳۷۶ کوس کا فاصلہ ۱۶۸ دن میں طے کیا۔ چھ ماہ کشمیر میں گزارے۔ ۱۵ ربیع الثانی ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء) کو پندرھواں جشن نوروز دریائے کشن گنگا کے کنارے اور سولھواں جشن ۲۷ ربیع الآخر ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۱ء) کو واپس آگرہ پہنچ کر منعقد کیا۔

اسی سفر میں اس نے طالب آملی کو ملک الشعرا کے خطاب سے ممتاز کیا۔ طالب آملی اکبر کے عہد میں ماژندران سے ہندوستان آیا اور لاہور، آگرہ، دہلی پھرتا پھراتا کشمیر پہنچا۔ اس جگہ کی خوبی اور آب و ہوا کی لطافت دامنگیر ہوئی اور وہ وہیں رہ پڑا۔ ۱۶۲۵ء میں یہ بلبل گلستانِ سخن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ کشمیر کے متعلق اس کے یہ شعر بہت مشہور ہیں ؎

فیض بیالہ بخشد آب و ہوائے کشمیر — از خشت خم نہادند گویا بنائے کشمیر
چوں غالب عشقبازاں ہر لحظہ در مشامم — بوئے محبت آید از کوچہ ہائے کشمیر

کشمیر می ستانم از حق بجائے جنت
اما نمی ستانم جنت بجائے کشمیر

ایک دفعہ کشمیر میں تھا کہ عید الضحیٰ آگئی۔ دربارِ عید وہیں منعقد ہوا۔ شعرا نے قصیدے پڑھے اور انعام حاصل کیے۔ یہ دیکھ کر ایک کشمیری تُک شاعر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ بھی ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کے حضور حاضر ہوا۔ بادشاہ نے قصیدہ پڑھنے کی اجازت دی۔ مطلع کا پہلا مصرعہ یہ تھا ع

اے تاجِ دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

یہی مصرعہ پڑھنے پایا تھا کہ جہانگیر نے آگے پڑھنے سے روک دیا۔ اور پوچھا۔ کیا تم عروض جانتے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ نہیں جہانگیر کے چہرہ پر غیظ و غضب کے جو آثار مصرعہ سننے سے نمودار ہوئے تھے وہ غائب ہو گئے۔ فرمایا کہ اگر اس مصرعہ کی تقطیع کی جائے تو وہ یوں ہو گی :—

اے تاج دو	لت بر سرت	از ابتدا	تا انتہا
مستفعلن	مستفعلن	مستفعلن	مستفعلن

لت بر سرت میں بد فالی ہے۔ شاعر کے لیے لازم ہے کہ وہ اس قسم کے تمام قبائح سخن سے آگاہ ہو۔ اگر تم عروض سے واقف ہوتے تو میں اس کو بے ادبی پر محمول کر کے تمہیں سزا دیتا۔

اس تنبیہ کے بعد اسے انعام دے کر رخصت کیا۔

جہانگیر خود بھی موزوں طبع تھا۔ بعض اوقات بے ساختہ اس کی معمولی فقرہ بولتا تو وہ بھی موزوں ہوتا۔ اس نے اپنی تزک میں کشمیر کا حال بھی ذکر کیا ہے نثر میں شاعری کی ہے۔ اس نے ابوطالب کلیم کو ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ ایک دن شکارگاہ میں بادشاہ کے چیتے نے ایک کالا ہرن شکار کیا۔ بادشاہ کی زبان سے بے اختیار یہ مصرع نکلا ؏

چیتۂ بادشاہ زد کالا

کلیم پاس کھڑا تھا اس نے فوراً کہا ؏

گشت صحرا ہمہ پر از لالہ

جہانگیر نے اسی وقت بارہ ہزار روپیہ انعام دیا۔ ان قدردانیوں کی شہرت سن کر ایران و توران سے کئی موزوں طبع عہدہ دار اور شاعر ہندوستان آ گئے۔

جہانگیر کا انتقال بھی ۱۶۲۷ء میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے راستے میں راجوری کے مقام پر ہوا۔ بستر مرگ پر اس کی آخری خواہش یہی کہ میں کشمیر چاہتا ہوں، صرف کشمیر۔ بقول شاعر ؎

از شاہ جہانگیر دم نزع چو پرسند
با حسرت دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

شاہجہاں نے شہزادگی کے عالم میں باپ کے ساتھ کئی مرتبہ لیکن بادشاہ ہو کر چار مرتبہ کشمیر کی سیاحت کی۔ پہلی بار ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۴ء) میں اور چوتھی بار ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱ء) میں۔ آخری سیر میں بادشاہ نے دارا شکوہ کے پیر ملا شاہ بدخشانی کی زیارت بھی کی۔ ملا شاہ نے بادشاہ کی آمد پر ایک نظم پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

امروز شاہ شاہان مہمان شد است ما را
جبریل با ملائک دربان شد است ما را

ملا شاہ کی کلیات برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

ایک بار ابوطالب کلیم بادشاہ کے ہمراہ گیا وہ کشمیر کی رنگینی اور آب و ہوا کی دلآویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ بادشاہ سے درخواست کی مجھ کو یہیں رہنے کی اجازت دی جائے۔ میں یہاں بیٹھ کر اطمینان سے فتوحات شاہی نظم کروں گا۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ ۱۰۵۰ھ میں جب بادشاہ پھر کشمیر گیا تو کلیم نے قصیدۂ تہنیت پیش کیا اور خلعت اور دو سو اشرفیاں انعام پائیں۔

کلیم کی بہترین غزل وہ ہے جو اس نے اپنے محسن و مربی ظفر خاں احسن کی یاد میں کہی جب وہ اپنی نظامت کا دوسرا دور (۱۰۵۲ھ سے ۱۰۵۶ھ تک) ختم کر کے کشمیر سے رخصت ہوا۔ اس مرصع غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

شکوۂ درد ترا کے پیش درماں می کنیم — تشنہ می میریم و شکر آب حیواں می کنیم
بے تو تاریک است کشمیر اے چراغ دیدہ ہا — ما بہ روز یم در شب سیر بستاں می کنیم
در کمین عیش از بس دیدۂ بد دیدہ ایم — بادہ را از چشم ساغر نیز پنہاں می کنیم

گل اگر در سینہ در کشمیری آید چہ سود | ماکہ گل از اشک خونیں در گریباں می کنیم
ماجرائے دیدہ میگوئیم پیش سیل اشک | اینچنیں شکوۂ کشتی نیل طوفاں می کنیم
از ظفر خاں بود ایں جمعیت و طرح غزل | باکہ دیگر زلف معنی را پریشاں می کنیم
تا تو رفتی دل بفکر خویشتن افتادہ است | سرچہ می بازیم آنکہ فکر ساماں می کنیم
بادۂ کشمیر از بزم تو صاحب نشہ بود | بے تو ما خاطر فشاں سے پریشاں می کنیم

داغ می ماند کلیم از لالہ زار از دست رفت
ہر چہ دشوار است ما بر خویش آساں می کنیم

"اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ کلیم نے ظفر خاں احسن سے بارہ برس پہلے وفات پائی تو اس غزل پر مرثیہ کا گمان ہونے لگے۔ خیالات کا تسلسل، انداز بیان کی روانی جذبات کی شدت و فراوانی اور سوز و گداز غرض مرثیہ کے تمام عناصر اس غزل میں موجود ہیں۔"[1]

کلیم کشمیر کی تعریف میں کہتا ہے ؎

شمیم خلد گدائے بہار کشمیر است | شگفتگی گل خار دیار کشمیر است
اگرچہ مایۂ دلبستگی است قامت سرو | عنان ہوش بدست چنار کشمیر است
بدیدہ خاصیت توتیا دہد لیکن | بہ چشم آنچہ نیاید غبار کشمیر است
پیام عالم بالا کہ گوش تشنۂ اوست | ترانۂ الست کہ با آبشار کشمیر است

گذشتن از لب ساقی گلعذار کلیم
خنک چو تو بہ زسے در بہار کشمیر است

کلیم ۱۰۶۱ھ میں کشمیر ہی میں فوت ہوا۔[2] غنی نے تاریخ وفات کہی ؎

طور معنی بود روشن از کلیم

ملا طغرا مشہدی نظم و نثر دونوں میں استاد کامل تھا۔ وہ ہندوستان میں آکر سب سے پہلے شاہزادہ مراد بن شاہجہاں کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اس کی شہرت میرزا ابوالقاسم تک پہنچی جو کشمیر میں منصب دیوانی پر ممتاز تھا تو اس نے طغرا کو اپنے پاس بلا لیا۔ طغرا نے کشمیر پر ایک مختصر سا منظوم رسالہ لکھا جس میں کشمیر اور رہنے کی دلفریبی کا ذکر کرتے ہوئے داد سخنوری دی اور کشمیر کے باغات، اقسام میوہ و گل اور سبزہ و گل کے ذکر میں انشا پردازی کا کمال دکھایا۔ کشمیر کی تعریف میں اس کی یہ رباعی بہت مشہور ہے ؎

کشمیر بود نسیل خزاں عالم نور | بر طالب فیض دیدنش ہست ضرور
گوئی کہ دریں باغ چمن ساز قضا | آوردہ نہال شعلہ از خرمن طور

رسائل طغرا مدت تک ہماری درسی کتب میں شامل رہے ہیں۔ اس کی کلیات ساقی نامہ، غزلیات، قصائد، قطعات، فرد، چھوٹی چھوٹی

---

[1] "نصرت" کشمیر نمبر ۲۸ فروری ۱۹۶۰ء ص ۳۴

[2] شعر العجم جلد سوم ص ۱۶۸

ترجیع بند، ترکیب بند اور مخمسات پر مشتمل ہے۔

حاجی محمد جان قدسی مشہدی ۱۰۴۲ھ میں حج سے واپسی پر شاہ جہان کے دربار میں پہنچا۔ بادشاہ نے ایک قصیدے کے صلے میں خلعت اور دو ہزار روپیہ عطا کئے۔ دو سال بعد نوروز کی تقریب پر قصیدہ پڑھا اور اپنے وزن کے برابر پانچ ہزار پانچ سو روپے انعام پائے۔ ایک اور قصیدے پر اس کا منہ سات مرتبہ جواہرات سے بھرا گیا۔ قدسی نے قصیدے اور غزل دونوں میں نام پیدا کیا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ ایک مثنوی ہے جس میں اس نے شاہ جہان کے سفرِ کشمیر کا حال بیان کیا ہے۔ وہ کشمیر کے متعلق کہتا ہے ؎

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر — کہ سر بر زد بہشت از خاک کشمیر
چہ کشمیر آبروئے ہفت کشور — نگاہ از دیدن او تازہ و تر
نبود اہل جناں را سیرگاہے — بہ کشمیر از جناں کردند راہے

ایک مرتبہ قدسی کشمیر کی کسی مجلس میں غزل سنا رہا تھا۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا ؎

ساقی بہ صبوحی قدحے پیشتر از صبح
برخیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

ایک کشمیری طالب علم نے پہلے مصرع کو یوں دہرایا ع

ساقی بہ صبوحی "نفسے" پیشتر از صبح

قدسی نے نہ صرف اس اصلاح کو قبول کیا بلکہ معترض کے ذوق کی داد بھی دی۔

قدسی کی خواہش تھی کہ کشمیر میں چپہ بھر زمین ملے تو وہ وہیں رہ پڑے ؎

دریں گلشن کہ ہم گل ہست ہم خار
مرا ہم جائے دہ یک آشیاں وار

خدا نے اس کی آرزو پوری کی اور کشمیر کی گلپوش وادی نے ۱۰۵۶ھ میں ہمیشہ کے لیے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے مثنوی گلگشت کشمیر میں اس شعر کی یوں تضمین کی ہے ؎

چو قدسی نغمہ سنج ایں چمن شد — چمیں بر درگہ حق نغمہ زن شد
"دریں گلشن کہ ہم گل ہست ہم خار — مرا ہم جائے دہ یک آشیاں وار"

رسیدہ بر ہدف تیر دعائش
بزیر گلبنی دادند جائش

۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں جب شاہجہان تیسری مرتبہ کشمیر گیا تو اس نے اپنے جلوس کا انیسواں جشن وہیں منایا۔ نامور شاعروں نے قصیدے پڑھے اور انعام حاصل کیا۔ ایک کشمیری شاعر (غالباً ملا محمد صالح ندیم) نے ایک نہایت پُرمعنی اور لاجواب قصیدہ سنایا جس میں صرف تعریف ہی نہیں بلکہ رعایا کے دکھڑوں کا بھی ذکر تھا۔ بادشاہ نے سن کر رعایا کو بہت سی رعائتیں دیں۔ اس قصیدے کے چند

شعر یہ ہیں ؎

جمعیت آنکس بستن و آورجمن فرمود شاہ
شاہ کیخسرو سریر و خسرو خاقاں کلاہ

سروداد انشں پژوہا داد و داد دیں پرورا
اہل کشمیرند در دیواں عدالت داد خواہ

آں ستم بیکشتہ کاہی را عوض بگرفتہ کوہ
آں جفا جوئے کہ کوہے را بدل نا دادہ کاہ

بجز ایں قوم از قوم خامہ برخواند حسرد
حال ایں جمع از شکنج نامہ دریابد نگاہ

آں یکے در خاک و خوں غلطیدہ چوں از زخم صید
واں دگر در پیچ و تاب افتادہ چوں از شعلہ کاہ

در چمن نارو کہ بالا در رو نہد شاخ درخت
از زمیں مشکل کہ بیروں سر کشد برگ گیاہ

دست بردی شد چناں رپا کہ نرگس ہم بباغ
می کند ہر سو نہفتہ سیم و زر و بیروں نگاہ

زعفراں کو بہر خنداں سازد اندوہناک را
آمدند از زعفراں در گریہ جمع بے گناہ

زیر دست آزاریے ظاہر کہ در کشمیر شد
نے بہ نیشاپور و بلخ آں شد نہ در مرو و ہراۃ

پیش ازیں مسجد بنائے شد بجائے بتکدہ
ایں زماں بت خانہ برپا شد بجائے خانقاہ

عدل را فرما کہ ایں قوم از بلا گردد خلاص
داورا برگو کہ ایں جمع از ظلم یابد پناہ

یہیں ظفر خاں صوبہ دار کشمیر نے اپنی تصنیف سے ایک مثنوی ہفت منزل بادشاہ کی نذر کی جس میں کشمیر کے باغات، عمارات اور خود کشمیر کی صفت و ثنا تھی۔ بادشاہ اس کے مطالعہ سے نہایت محظوظ ہوا۔

محمد قلی سلیم شاہ جہان کے دورِ حکومت میں ہندوستان پہنچا اور اختصاص خاں کا ملازم ہو گیا۔ جب اختصاص خاں کو اسلام خاں کا لقب دے کر کشمیر کا حاکم مقرر کیا گیا تو سلیم بھی اس کے ہمراہ کشمیر آیا اور یہیں فوت ہوا۔ سلیم نے غزل، قصیدہ اور مثنوی میں مشق بہم پہنچائی۔ اس کی زبان صاف اور بیان شیریں ہے۔ اس کی کلیات میں مثنوی کشمیر اور مثنوی قضا و قدر اس کے کمالِ فن کی شاہد ہیں۔

ملا محسن فانی نہایت جید عالم فلسفی اور بلند پایہ منشی تھے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے۔ غنی کے استاد تھے۔ مگر دنیا شاعری سے بڑھ کر ان کی علمی فضیلت کی قائل ہے۔ کتاب دبستان المذاہب انھیں کی تصنیف ہے۔

میر الٰہی سادات ہمدان سے تھا۔ وہ ظفر خاں احسن کے ساتھ کشمیر آیا اور یہیں ۱۰۵۳ھ میں فوت ہوا۔ اس کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

یا الٰہی ز الٰہی تو چہ پرسی در حشر
آنچہ او کرد تو دیدی و چہ گفتن دارد

ظفر خاں کو جب کشمیر کی صوبہ داری کا خلعت بخشا گیا تو شاہجہان نے فرمایا کہ اس سے رعایا کو خوش رکھنے کی ضمانت لی جائے۔ میر الٰہی نے عرض کیا ؏

خدا ضامن رسول و چار یار ش

بادشاہ بہت خوش ہوا۔ ظفر خاں سے کہا کہ اگر میر الٰہی کو میرے ہمراہ کشمیر روانہ کر دیا جائے تو بڑی عنایت ہو۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ میر الٰہی خاک مذکور کی مفارقت میں مرتے دم تک کشمیر میں رہا۔ اس نے نوشہرہ کے جنوب میں الٰہی باغ (۱۰۴۹ھ) لگوایا جس کی تعریف ظفر خاں احسن نے اپنی مثنوی میں اس طرح کی ہے

نشاں چوں جناب سحرا الٰہی شدے	ثمر صحرا گلستانیست خود روئے
بہ بینی سراسر صحرا شگفتہ	بغرش سبزہ گل مستانہ خفتہ
بہاراں کا شفتہ از سیر مرغزار است	کہ مرغ دست آموزش بہار است
یکے از باغہا باغ الٰہی است	کہ جنوں سازش کش چہرہ کاہی است

دراں گلشن یکے کہنہ چنار است
زنخل عمر کوئی یادگار است

میر الٰہی کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے ہے

اے رحمت تو سرخط لوح مزار ما	دیباچہ زصنع تو دیوان ذات ما
از پرتو کرم چو شود معصیت گداز	مشتے عرق شود ہمگی سیئات ما

تا آں زماں کہ مہر ز مغرب کند طلوع
بے نام تو نہ باد الٰہی حیات ما

کشمیر میں فارسی شاعری کو زیادہ فروغ ظفر خاں احسن کی صوبہ داری کے زمانے میں ہوا جو جہانگیر کے آخری ایام سلطنت سے شاہجہاں کی فرمانروائی کے وسطی عہد تک پھیلا ہوا ہے۔ ظفر خاں کا اصل نام احسن اللہ خاں تھا۔ ۱۰۴۱ھ میں اپنے باپ خواجہ ابوالحسن کی وفات کے بعد کشمیر کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے تبت فتح کیا اور ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی۔ ظفر خاں احسن نہایت سلجھا ہوا مذاق رکھتا تھا۔ تاریخ شعر کا یہ اہم ترین واقعہ ہے کہ ایران کا مشہور شاعر مرزا صائب اصفہانی جس نے سلاطین کی دعوت پر خاک ایران سے باہر قدم نکالنا منظور نہ کیا ظفر خاں کی داد و دہش اشعار آبدار اور اس کے حسن صورت و سیرت سے مسحور ہو کر سالہا سال اس کے پاس کشمیر میں پڑا رہا۔ ظفر خاں نے بھی دریا دلی سے اس کی قدردانی کی یہاں تک کہ سلاطین و ملوک کی یاد اس کے دل سے محو ہو گئی۔ مرزا صائب نے ظفر خاں کی مدح میں بہت سے شعر کہے جن میں سے تین یہ ہیں ہے

خانِ تو کہ تو ترہ برند بخوان
خانۂ دیگراں بیک خانیست

———

من و دل چہ فریاد و افغاں کنیم ظفر خاں ظفر خاں ظفر خاں کنیم

———

خان خاناں را بہ بزم و رزم صائب دیدہ ام
در سخاوت در شجاعت چوں ظفر خان تو نیست

ظفر خاں احسن کا علمی مرتبہ یہ تھا کہ کلیم اور صائب ایسے بلند رتبہ ایرانی شاعر اسے استاد مانتے اور اس کی مربی گری کا اعتراف کرتے تھے۔ احسن کبھی کبھی صائب کے کلام میں اصلاح بھی دیا کرتا تھا اور صائب اس اصلاح کو بہ تشکر قبول کر لیتا تھا۔ صائب نے اپنے دیوان کی ترتیب بھی اس کے اشارے اور مشورے سے کی چنانچہ ایک قصیدے میں اس کا اعتراف کرتا ہوا کہتا ہے ؎

کلاہ گوشہ بخورشید و ماہ می شکنم
بر این غرور کہ مدحت گرِ ظفر خانم
ز نوبہارِ سخایش چو قطرہ ریزہ شوم
قسم خورد بسر کلک ابرِ نیسانم
بلند بخت خدایا ہمیشہ تو بینا
کہ از نسیم ہوا داریت گلستانم
حقوقِ تربیت را کہ در ترقی باد
زباں کجاست کہ در حضرتت فرو خوانم
تو پائے تختِ سخن را بدستِ من دادی
تو تاجِ مدح نہادی بفرقِ دیوانم
تو جاں ز دخل بجا مصرع مرا دادی
تو در فصاحتم دادی خطابِ سحبانم
ز دقتِ تو معنی شدم چناں باریک
کہ میتواں بدلِ مور کرد پنہانم
چو زلفِ سنبل ابیاتِ من پریشاں بود
نداشت طرۂ شیرازہ بوئے دیوانم
تو غنچہ ساختی اوراقِ بادہ بردۂ من
اگر نہ خار نمی ماند از گلستانم

ظفر خاں نے بھی جا بجا صائب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک شعر ہے ؎

طرزِ یاراں پیشِ احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوئی ہائے او از فیضِ طبعِ صائب است

ایک دن ظفر خاں کی مجلس میں ایران کی خاص مصطلحات کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ اہل ایران کے بعض محاورات ایسے ہیں جن سے ہندوستانی قطعاً ناواقف ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے کلام میں محاورات نہیں ملتے۔ اس ضمن میں چند محاورات مثلاً پیش کئے۔ ان میں ایک محاورہ "دیار فروشی" بھی تھا۔ صائب نے کہا کہ ہندوستان کے اکثر شعرا اس کے معنی ہی نہیں جانتے۔ ظفر خاں نے کہا۔

میر اشمار شعراء میں نہیں بلکہ امراء میں ہے۔ ادب میں اس نے معنی اور محل استعمال سے واقف ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ شعراء اس سے بے بہرہ ہوں۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں ظفرخاں نے یہ شعر پڑھا ؎

بہ کجا کہ روم وصف دوستاں گویم
برائے "یار فروشی" دکاں نمی باید

ظفرخاں نے آج کل کے تذکرات کے نمونہ پر ایک عجیب و غریب مرقع تیار کیا تھا جس میں شاعر اپنا منتخب کلام اپنے ہاتھ سے درج کرتا تھا اور اس کے دوسری طرف شاعر کی تصویر ہوتی تھی۔ (مآثر الامراء جلد دوم صـ۷۶۲)

علم دوستی اور سخاوت میں عبدالرحیم خان خاناں کے بعد دوسرا کوئی امیر ظفرخاں احسن سے بڑھ کر پیدا نہیں ہوا۔ اس کا اپنا دیوان نہایت مختصر ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کے مذاقِ سخن کا پتہ چلتا ہے ؎

دلم بہ گوشۂ تو امیدوار می آید
نگاہ دار کہ روزے بکار می آید

———

در گوشۂ خانہ بعمیں گفت و شنید است   یاراں برسانید دماغم شب عید است

———

تن دم بہ دل شکستگی خود کہ پیش من
قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است

———

گوشۂ چشمے اگر ساقی بہار ارد بجاست   عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

کلیات احسن کا بہترین نسخہ جو مصنف کے لیے کشمیر میں تیار ہوا تھا بانکی پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔

ظفرخاں کی بیوی بزرگ خانم تھی جو ملکہ ممتاز محل کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی۔ ظفرخاں کا لڑکا میرزا محمد طاہر الملقب بہ عنایت خاں آشنا اسی کے بطن سے تھا۔ وہ بھی باپ کی طرح شاعری اور شعراء کا مربی تھا اور نہایت سلجھا ہوا مذاق رکھتا تھا۔ اس نے شعر و شاعری کے چرچوں میں آنکھ کھولی اور بہ فن اسے ترکہ میں ملا۔ ایک دفعہ عالمگیر نے اسے سرمد کے طور طریقے ملاحظہ کرنے پر مامور کیا۔ آشنا اس کی حرکات و سکنات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے یہ شعر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا ؎

بر سرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است از و کشف عورت است

اس کے یہ شعر بہت مشہور ہیں ؎

بنشیں بہ گوشۂ اگر آزردۂ زخلق   پائے شکستۂ تو بجائے نہ رفتہ است
سامان دل ز قطع تعلق شود زیاد   گل بیشتر دہد چو کنی شاخ را قلم

دولت بوقت پیری تیغ بخت نکبت است

چو ردیف وقت شام پریشانی آورد

اس کا دیوان جو قصائد، غزلیات اور مثنویات پر مشتمل ہے، ہندوستان کے کئی کتب خانوں میں ملتا ہے۔

سلیم طہرانی، قدسی مشہدی، کلیم ہمدانی، صائب اصفہانی اور غنی کاشمیری مدت تک کشمیر میں ہمدم اور ہم قلم رہے۔ ان کے باہم مشاعروں میں خیال بندی اور مضمون آفرینی نے ایک نئی شکل اختیار کی جسے مثالیہ شاعری کہتے ہیں۔ شاعری میں ایک روش پہلے سے رائج تھی جسے تازہ گوئی یا سبک ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں بعض شاعروں نے تخیل کے زور سے ایسی پیچیدہ باتیں کہنی شروع کر دی تھیں کہ شاعری چیستان بن کر رہ گئی تھی۔ مثالیہ مضامین بھی خال خال پائے جاتے تھے۔ چنانچہ امیر خسرو کا ایک پورا قصیدہ اسی صنعت میں ہے۔ لیکن کلیم، صائب اور غنی کی ہم سخنی نے اس طرز کو شستہ کر کے جولانگاہ بنا کر گویا ایک خاص فن کا درجہ عطا کر دیا۔

مثالیہ شاعری میں شاعر پہلے ایک دعویٰ کرتا ہے جو فی نفسہٖ صحیح ہوتا ہے پھر اس کے ثبوت میں کوئی شے دلیل لاتا ہے۔ بعض جگہ دعویٰ اور دلیل دونوں خیالی ہوتے ہیں، ورنہ یہاں شاعرانہ تخیل زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور اس دور کے آخر تک قائم رہی۔ مثال کے طور پر ابو طالب کلیم ایک جگہ دعویٰ اور دلیل یوں لاتا ہے ؎

مرا مسوز کہ نازت ز کبریا افتد

چوں خس تمام شود شعلہ ہم زپا افتد

(یعنی مجھ کو نہ جلاؤ ورنہ تمہارا غرور خاک میں مل جائے گا۔ خس جب جل چکتا ہے تو شعلہ بھی بجھ جاتا ہے)

دوسری جگہ کہتا ہے ؎

عاجی گر حرف ما نشنود عمر فرو دست   گذشت آں ہم کہ بہ آئینہ برابر نشود

مطلب یہ کہ دشمن اگر بار بار مقابلہ نہ کرے تو اس میں اسی کا فائدہ ہے۔ بدصورت کے حق میں یہی بہتر ہے کہ آئینہ کے سامنے نہ آئے۔

غنی کشمیری ایک لاش سیل آب پر تیرتی دیکھتا ہے۔ اس کا خیال آفریں دماغ اس سے ایک مضمون اخذ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ پہلے مصرعہ میں تو یہ دعویٰ کرتا ہے ؎

خرقِ عادت کے بکار آید دل افسردہ را

یعنی خرقِ عادت چیزیں دکھانے سے کوئی شخص اپنا سکہ اہل دل پر نہیں بٹھا سکتا۔ اس کے لیے خود صاحب دل ہونا ضروری ہے۔

دوسرے مصرعہ میں وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ ؎

کی رود برآب نتواں معتقد شد مردہ را

یعنی مردہ جسم پانی کی سطح پر تیرتا ہے مگر یہ اس کا کوئی اعجاز نہیں اس پر کون ایمان لا سکتا ہے؟

میر حسین دوست سنبھلی تذکرۂ حسینی میں لکھتے ہیں کہ:—

"جب صائب غنی کی ملاقات کے لیے کشمیر آیا تو غنی کا کلام ایک لاکھ اشعار سے زیادہ تھا۔ غنی نے اس کا انتخاب صائب کی خدمت میں پیش کیا جب صائب

نے یہ شعر پڑھا ؎

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہم رنگ زمیں بود گرفتار شدم

تو بے اختیار بول اٹھا۔ کاش ایں ہمہ کہ در تمام عمر خود گفتہ ام با ایں کشمیری می دادم
و ایں یک بیت از وے بمن می گرفتم

مرزا صائب نے غنی کے دو سو شعر انتخاب کرکے ایک بیاض مرتب کی جو خان آرزو کے زمانے تک موجود تھی۔

تذکرہ حسینی ہی میں مذکور ہے کہ ایک روز مرزا صائب غنی سے ملنے آیا ہوا تھا۔ اس کی بیاض غنی کے پاس پڑی تھی۔ ایک وقفہ میں
غنی کی غیر حاضری میں صائب نے وہ بیاض اٹھا کر دیکھنی شروع کی۔ ایک جگہ شعر کا پہلا مصرعہ چاقو سے چھیلا ہوا تھا اور دوسرا مصرعہ اس طرح تھا

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

اس نے غنی سے پوچھا کہ اس کا دوسرا مصرعہ کیا ہونا چاہیے۔ غنی نے برجستہ فرمایا ؎

مگر کہ سوختہ جانے بدست زد دامانت
کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

اس شعر سے یہ مصرعہ بیاض میں لکھ دیا۔ جب مرزا صائب واپس آیا اور مصرعہ دیکھ کر اصل حال سے واقف ہوا تو اس نے کہا کاش یہ صاحب
دیوان یک سو … نکالتے و نغمہ ما غنی از دست …

غنی اگرچہ کشمیر ہی میں پیدا ہوا تھا مگر اس کے دیوان پر اہل زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کا کلام زبان کی خوبی، بندش کی چستی،
محاورات کے درست استعمال اور بے ساختہ پن کی وجہ سے اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز ہے۔ اس کی غزلیں ہموار، متین اور ہر قسم
کے سوقیانہ خیالات اور مبتذل مضامین سے پاک ہیں۔ اس کا فلک پیما تخیل اتنی بلندیوں پر پہنچتا ہے کہ عام شعرا اس کی گرد کو بھی نہیں
پہنچ سکتے۔ صائب اس کی ایک غزل پر غزل لکھتا اور اس کا نام مقطع میں اس طرح لاتا ہے ؎

ایں جواب آں غزل صائب کہ می گوید غنی
یاد ایامے کہ یک شوخ ما سر پرش داشت

مگر یہ غزل غنی کے اپنے مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں۔

غنی کے خواجہ تاش حاجی محمد اسلم سالم جو ملا محسن فانی کے شاگرد تھے عنفوان شباب میں کشمیر سے نکل کر ہندوستان آئے اور عالمگیر
کے بیٹے شاہزادہ اعظم شاہ کے وابستگان دولت میں شریک ہوئے۔ شہزادہ اعظم شاہ فوت ہو گیا تو سالم نے شاہ عالم کی ملازمت
اختیار کر لی جس نے انھیں کشمیر کا وقائع نگار مقرر کر دیا۔ ان کی کلیات غزلیات، رباعیات، مخمسات، قصائد اور مثنویوں پر مشتمل ہے۔

سالم فطرت سے ذوق سلیم اور پُر اضطراب دل لے کر آئے تھے اور ایسے شعر کہتے تھے جو دلوں کو بے قرار و بیتاب
کر دیتے تھے۔ ان کے کلام میں دقت پسندی، سوز و گداز اور درد و اثر کے ساتھ وہ چیز بھی پائی جاتی ہے جسے درس عبرت اور پیغام

محل کہا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

در شباب و شیب چشمِ دل ز غفلت وا نشد　　　گردشِ ایام گوئی جنبشِ گہوارہ بود

یعنی جوانی گئی، بڑھاپا آیا۔ پھر بھی دل کی آنکھ غفلت کی نیند سے بیدار نہ ہوئی۔ یوں کہیے جیسے گردشِ ایام گہوارے کی جنبش تھی جو ہمیں پھر سلا دیتی تھی۔

اجل دیوانہ شیر و عمر مستِ جلوہ، می ترسم
صدائے پائے رہرو شہر را از خواب بردارد

اس شعر میں شاعر موت کو ایک دیوانہ شیر اور انسانی زندگی کو مستِ جلوہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہیں راہرو کے پاؤں کی آواز شیر کو خواب سے بیدار نہ کر دے اور سارا بنا بنایا کھیل درہم برہم ہو جائے۔

کشمیر پھولوں کا گھر ہے اور کشمیری عام طور پر پھولوں کے متوالے ہوتے ہیں۔ چونکہ شاعر کا خمیر بھی کشمیر کی آب و گل سے اٹھایا گیا ہے اس لیے وہ پھولوں کے سایہ سے بھی محبت کرتے ہیں ؎

دلم بہ سایۂ گل می کشد چو گل مستانم
سرشتہ اند بہ آب و ہوائے کشمیرم

غنی کے ہم عصروں میں ایک شاعر محمد اعجاز تھا۔ جس کے شعر کی شہرت ایک طرف گجرات اور دکن اور دوسری طرف شیراز اور اصفہان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا یہ مطلع بہت مشہور ہے ؎

کشیدہ ام ز جنون ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیر مے فروش نماند

اعجاز کے بچپن کا زمانہ تھا۔ ایک دن اسے اپنے والد کے ہمراہ ظفر خاں احسن کی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مرزا صائب نے ایک غزل پڑھی جس کے ایک شعر کا دوسرا مصرع یہ تھا ؎

عیبے بہ عیبِ خود نرسیدن نمی رسد

اعجاز نے بے ساختہ کہا کہ "ایک بار دیگر سے می خواند"۔ مرزا صائب جب اپنے شعر کے اس سقم سے آگاہ ہوئے تو آپ نے اٹھ کر اعجاز کو گلے لگا لیا۔ اعجاز کے دو شعر نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں ؎

در پریشان حالی آخر کارِ من صورت گرفت
بسکہ نو آمد بہ کلکم حسن نامہ تصویر شد

در نامۂ زمانہ بجز حرفِ جنگ نیست　　　گویا کہ از سپاہی لشکر نوشتہ اند

اسی زمانے میں مرزا محسن محمد بیگ رفیع قزوینی ایک خوش گو اور صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ وہ نذر محمد خاں والئے توران کی

ملازمت چھوڑ کر شاہجہان کے عہد میں ... آیا اور کشمیر کی دیوانی پر فائز ہوا۔ بادشاہ اس کے کمال پر فریفتہ تھا اور اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، مگر وہ بار بار رخصت لے کر کشمیر چلا جاتا تھا۔ اسی آمد و شد میں عمر گزر گئی۔ چنانچہ اپنے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے ؎

یک زمان فاصلہ نیست سفرہائے مرا
رفتن و آمدن من بہ نفس می ماند

ایک اور شعر اس کا نہایت عجیب ہے ؎

عمر اگر خوش گزرد زندگی خضر کم است　　　ور بناخوش گزرد نیم نفس بسیار است

ایک ہم عہد کشمیری شاعر نے اس پر اعتراض کیا کہ "ناخوش" نہیں "ناخوشی" ہونا چاہیے۔ چونکہ ناخوشی کے لفظ کے لیے مصرع میں گنجائش نہ تھی، اس لیے رفیع نے "ناخوش" کی جگہ "بہ تلخی" کر دیا۔ اس سے وزن تو درست ہو گیا لیکن شعر کا زور گھٹ گیا۔

اورنگ زیب نے اپنے چھٹے سال جلوس (۱۰۷۴ھ) میں کشمیر کی سیاحت کی۔ عید کا جشن بھی وہیں منایا۔ لیکن کچھ راستے کی تکلیف، انسانوں اور جانوروں کا تلف ہونا، کچھ اپنے وزیر اعظم فاضل خاں کے انتقال کی خبر سن کر اس کا غنچۂ دل چمنستان کشمیر میں ناشگفتہ ہی رہا اور اس نے آئندہ کشمیر جانا ترک کر دیا۔

اسلام خاں جس کا اصل نام ضیاء الدین تھا، اس زمانے میں کشمیر کا صوبہ دار تھا۔ وہ بڑا متقی، علما و فضلا کا قدردان اور خوش گو شاعر تھا۔ یہ شعر اس کے فکر کا نتیجہ ہیں ؎

بے تو شامم تا زما شبخوں می زند　　　مردم چشمم زگریہ غوطہ در خوں می زند
وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش　　　لشکر آہ از دل من خیمہ بیروں می زند

۱۰۸۱ھ میں فاضل خاں کشمیر کی نظامت سے مستعفی ہوا اور ابراہیم خاں تیسری بار اس کی جگہ صوبہ دار مقرر ہو کر کشمیر گیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ رخصت کے وقت خواجہ علی اکبر فارغ نگار موجود تھا۔ اس نے فی البدیہہ یہ کہا ؎

عید رمضان آمد و ماہ رمضان رفت
صد شکر کہ ایں آمد و صد حیف کہ آں رفت

ویسے عالمگیر کے عہد میں چونکہ شعرا کی قدردانی اس وسیع پیمانہ پر نہ ہوتی جس پیمانہ پر جہانگیر و شاہجہان کے عہد میں ہوتی تھی۔ اس لیے بہت کم شاعروں کے نام ملتے ہیں۔ پھر بھی ایک ہندی نژاد بزرگ سید محمد زمان راسخ کو کافی شہرت حاصل تھی جو اس عہد میں کشمیر کے شعراء کے سرخیل تھے۔ ہندوستان کے ممتاز ترین شاعر محمد افضل سرخوش باوجود اپنے علو مرتبت کے ہمیشہ راسخ کو اپنا استاد کہتے تھے۔ ان کے چند شعر نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

ز گلگشت چمن بیروں چو آں سرو خراماں شد　　　کشاد بال بلبل باغ را چاک گریباں شد
خرابی ہائے عاشق بر فروزد رنگ رخسارش　　　پرید نہائے زخم آتشش را باد داماں شد

جہان دیگرم پروانہ را باید کزیں عالم
چو چشم خفتہ بگذشتم بہ بال آرمیدنہا

یاد چشمِ سرمہ آلودش ز خویشم می برد
می کند گرد رم آہو ز خود پنہاں مرا

احمد شاہ ابدالی کے عہد میں ۱۷۵۴ء سے ۱۷۶۲ء تک راجہ سکھ جیون مل کشمیر کا حاکم تھا۔ یہ وجاہت بے تعصب علم دوست اور شعر و شاعری کا قدر دان تھا۔ ہر جمعہ مشاعرہ کرتا اور خود اس میں شریک ہوتا۔ اس نے محمد علی خاں متین، عبدالوہاب شائق، ملا راجح، محمد جان بیگ سامی، ملا محمد توفیق، رحمت اللہ توجہ اور حسن راجہ کو اپنے عہد اور گذشتہ زمانوں کی ایک مکمل تاریخ کشمیر منظوم کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس نے تاریخ کشمیر کے سات حصے کر کے ہر شاعر کو ایک ایک حصہ تقسیم کر دیا اور ایک ایک شعر کے لیے ایک ایک روپیہ انعام کا وعدہ کیا۔ شائق نے ساٹھ ہزار، ملا توفیق نے دو ہزار، سامی نے ایک ہزار بیت ابھی لکھے تھے کہ راجہ سکھ جیون کا آفتاب اقبال گہنا گیا اور یہ بے نظیر تاریخ نامکمل رہ گئی۔

اس نے سرکشی اختیار کی۔ نور الدین بامزئی کو گوشمالی کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے راجہ کو گرفتار کر کے اس کی آنکھیں نکال دیں۔ راجہ خود بھی موزوں طبع تھا۔ اس نے نور الدین بامزئی کے حملہ آور ہونے سے پہلے ایک غزل کہی تھی جو اس واقعہ کی پیشین گوئی ثابت ہوئی ؎

چشم از وضع جہاں پوشیدہ بہ   سر بسر احوال آں نادیدہ بہ
ہر کہ چوں من دانست چار و فرق گل   عاقبت در خاک خود غلطیدہ بہ
چند روزے خود تماشہ کردہ ام   زیں چمن گلہائے عبرت چیدہ بہ
گردی چشمش بہ بد زہرت عوض   زیں سیہ ماہر جہاں ترسیدہ بہ

بوز اگر چشم جہاں بیں تو دہند
چوں گدایاں در بدر گردیدہ بہ

بینائی جاتی رہنے کے بعد دنیا اس کی نظروں میں بالکل اندھیر ہو گئی اور اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار اس طرح کیا ؎

ہر چند گفتم نفس دنی را   باید نہ کردن ناکردنی را
ایں نفس سرکش نشنید از من   تا دید آخر نا دیدنی را

نور الدین نے راجہ کو بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ لیکن اس نے بھی اس کے حال پر کوئی التفات نہ کی بلکہ اس کو ہاتھی کے پاؤں میں کچلوا دیا۔ اس کے انجام کے متعلق کسی نے یہ تاریخ کہی ؎

دو ہزار و یک صد و ہفتاد و پنج
سکھ جیون شد تباہ با مال و گنج

راجہ سکھ جیون مل کے معاصر شعرا میں ملا محمد توفیق صدرہ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس نے دیوان کے علاوہ شبیہی، صراقہ اور بحر طویل وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان اشعار سے اس کے رنگ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

می سزد فتنۂ دوراں شدنت اے کافر
کہ ترا پشتِ بانی است چو کاکل برسر

می شود صد عقده گر یک عقده افتد در دلم
دیده و بغان گردد ان راز میں نہفت دلم

جبیں چنید و دو ابروے تو شدے گل اندام   شاخ بادام و دو بادام و دو برگ بادام

کشمیر سے متعلق شعرا میں نمیدان (وفات ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء) اور مرزا مہدی مجرم (وفات ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء) خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اول الذکر اپنے ساقی نامہ کی وجہ سے مشہور ہے جو اس نے ظہوری کے ساقی نامہ کے جواب میں تصنیف کیا تھا۔ چند شعر یہ ہیں —

ظہوری کہ جامِ نگاہ باده بود   ازیں وصف در رند پیچیده بود
به دور شما جامے ناخن نیست   بده تلخ گر شکر در شیر نیست
از آن جام ازیں تر شدی جرعه کش   تو زاں شدے نبض منصور غش
به جائی کہ چوں ویک لبی لبی زند
تو گوئی کہ منصور انا الحق زند

مہدی مجرم کا رنگِ کلام ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں —

فدا سازم دل و جاں آں جفا ساز ستمگر را   ادا و ناز چشم نیم باز غمزه پرور را
به گلشن چوں روم در خاطرم آید سراپایش   نمی بینم گل و نسرین و شمشاد و صنوبر را

الٰہی ساز روشن از کرم شمع زبانم را
بہ انوار قبولیت منور کن بیانم را
بفکر شعر موئم شد سفید اے خاک بر رویم
ازیں گل پاک کن سرچشمۂ طبع روانم را

بیا مجرم از کرده بیزار شو   زحد رفت خوابت تو بیدار شو

دردا کہ نمی آید از یار خبر چیزے   گفت است بگوشش او اغیار مگر چیزے
دل گوشہ گرفت از غم آمد بر جانش   او نیز برد جانا چوں نیست دگر چیزے
چوں نالہ زباں خیزد ہنگام سحر ہر شب   ہرگز کہ نمی بینم زاں مرغ سحر چیزے
خواہم کہ نویسم کی توصیف جمال او   چیزے بسرشک ترا زخون جگر چیزے

یا بوں کہ گاہے بہ نسیم و زورے بوتر
ہرگز نشد حاصل از عمل ِ [illegible]

ایک دن مرزا جرم پنڈت راج کاک دربار میں بیٹھے تھے۔ راج کاک کشمیر کا نامور علم دوست نہیں تھا شعر گوئی اور [illegible] تخلص حافظ کشمیر میں اس کا دیوان موجود ہے جس میں ہر قسم کے شعر بھی پائے جاتے ہیں ؎

بردانتی زچہرۂ گلگوں نقاب را | بے پردہ [illegible] آفتاب را
وز رخ سیاہ نقش بر آب است [illegible] | چشمے کشا بہ عبرت و بنگر حباب را

مجلس کے سب لوگ چبوترہ پر بیٹھے تھے۔ مرزا کو ہم کو شے پہ جگہ ملی۔ راج کاک نے دیکھ تو کہا مرزا جی آپ نیچے کیوں بیٹھے ہیں اوپر آ جایئے۔ [illegible] نے [illegible] کہا ؎

مجلس شہ [illegible] دریا بود
[illegible]

سب نے [illegible] کے پھول نچھاور کئے۔

جس زمانے میں ادبیات ایران کا آخری نامور شاعر مرزا حبیب اللہ قاآنی شیرازی المتوفی ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء ایران میں اپنا سکہ جما رہا تھا [illegible] ہے ؎

جز من [illegible] از صد سال نیاید کس | صد سال [illegible] ایران را

انہی دنوں کشمیر میں ایک ایسا نامی گرامی شاعر پیدا ہوا جس کی بدیہہ گوئی اور فنی قابلیت کو علامہ مفتی صدر الدین آزردہ، مرزا غالب، مومن [illegible] شعرا نے بھی مانا۔ یہ تھا حسن معری المتوفی ۱۲۹۰ھ جو خود بھی فخر سے کہتا ہے ؎

[illegible] فقیر است امروز
پیش ازیں عہد شنیدم کہ فنی ہم بود است

کشمیر [illegible] کی بہار کو وہ رشک صد جنت اور [illegible] رشک صد بہار سمجھتا تھا چنانچہ کہتا ہے ؎

[illegible] بہار کشمیر است | سوزش لعل و عار کشمیر است
در دماغ [illegible] بہار | از گل [illegible] کشمیر است
رنگ [illegible] طراز خامۂ صنع | حرف نقش و نگار کشمیر است
از سواد و بیاض دیدہ حور | رنگ لیل و نہار کشمیر است
غم صد سالہ راز دل بردن | [illegible] جلوہ کار کشمیر است
شاہد حسن را خط مشکیں | عکسے از سبزہ زار کشمیر است
صبح عشرت کہ از جہاں رم کرد | بر نسیمے ز شکار کشمیر است

آب تو از بسکہ عیب دو جہاں — ما بزلف و یار کشمیری ست
نکہت بست دل می کند — ورجہان تا دیر کشمیری ست

وصف این سلسلہ میرزا شعرتی
مثل تو بس بر کشمیری ست

ہمے دو اور بعد کی ابتدا سے میں حیدر تھا۔ وہاں دستگیر گجراتی کے شعرائے قدردان او خود بھی ذوق سخن سے مالامال تھے۔ اپنے مکان پر ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوا جس کے نزدیک شاعر مرزا محمد اکبر خاور نے ایک معرکہ خیز غزل پڑھی جس کے مطلع نے ایک کیف پیدا کر دیا ہے۔

خداوندا بسوزان از کرم رندِ شرابی را
مروت نیست در آتش فگندن مرغ آبی را

(اے خدا اپنی کرم نوازی سے کام لے کر رند شرابی کو آتش دوزخ میں نہ جلا۔ پانی میں رہنے والے پرندے کو آگ میں جھونک دینا مروت کے خلاف ہے)

شعرتی نے اسی بحر و وزن میں غزل پڑھا۔ پہلی غزل تو خاور کے مطلع کا صاف جواب تھی۔ چند شعر یہ ہیں:—

بدوزخ چوں سزا ندہد خداوند رند شرابی را — کہ ہر کس می کند بریاں با آتش مرغ آبی را
مروت نیست گفتن با خدا شرط ادب نبود — خطا لازم بود اندیشہائے ناصوابی را

جواب حل معنی را چہ بندد بر سوال اول
کہ نایابت نیست اظہار سخن حاضر جوابی را

(خدا تعالیٰ رند شرابی کو دوزخ میں ڈال کر سزا کیوں نہ دے جبکہ ہر شخص مرغ آبی کو آگ میں ڈال کر بریاں کرتا ہے۔ خدا سے یہ کہنا کہ یہ مروت نہیں، ادب کے خلاف ہے۔ جو خیالات نادرست ہوں ان پر سزا لازم آتی ہے)

اپنے دعوے کے مطابق شعرتی نے اپنی زندگی میں پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے مگر اس کا بہت سا کلام سفر و سیاحت میں ضائع ہو گیا جو کچھ بچا وہ مرآۃ الخیال کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ سوا پانچ سو صفحوں کی کتاب غزلوں، رباعیوں، قصیدوں، مثنویوں، تضمینوں اور تاریخی قطعوں پر مشتمل ہے۔ قصہ چہار درویش بھی نظم کیا ہے جو ساڑھے گیارہ سو شعروں میں پھیلا ہوا ہے۔ مثنوی لعل و گوہر بھی لکھی تھی جو زندگی ہی میں چوری ہو گئی۔

یہ بڑی فروگذاشت ہوگی اگر یہاں کشمیری پنڈتوں کی ان سرگرمیوں کا ذکر نہ کیا جائے جو انھوں نے وادی کے اندر اور باہر رہ کر فارسی زبان اور ادب کے سلسلے میں دکھائیں۔ کیونکہ وہ بڑے فخر کے ساتھ پنڈت نرائن کول عاجز[1]، چندر بھان برہمن، لچھمی رام مسرور، نرائن داس ضمیر، بھوانی داس کاچرو نیکو، راج کول ارمن بیگی وتری، شنکر جیو آخون گرامی، تابہ رام ترکی اور دوسرے قابل ذکر فرزندوں کا نام پیش کر سکتے ہیں جن کا حال تذکرہ بہار گلشن کشمیر میں موجود ہے۔

---

[1] نرائن کول عاجز نے ۱۱۲۲ھ میں عارف خاں حاکم کشمیر کی فرمائش پر تاریخ کشمیر لکھی۔ جس میں واقعات کو دلچسپ کہانی کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

خواجہ پنڈت چندر بھان برہمن علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا شاگرد تھا۔ اس نے شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں ناموری حاصل کی۔ شاہجہان نے اسے اپنا وقائع نویس حضوری مقرر کیا اور اس کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ بادشاہ کے سیر و سفر کا روزنامچہ مرتب کرے۔ اسے ایک ہاتھی دیا گیا تھا جس پر سوار ہو کر وہ شاہجہان کے جلوس میں نکلتا تھا۔ ۹ اپریل ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء کو اسے رائے کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے بعد وہ دارا شکوہ کے ملازمین میں شامل رہا اور آخر اورنگ زیب کے پاس آ کر اس کی تخت نشینی (۱۰۷۵ھ/۱۶۶۵ء) کے کچھ سال بعد فوت ہوا۔

دیوان کے علاوہ منشآت برہمن اور کتاب چہار چمن اس کی یادگار ہیں۔ برہمن کا کلام صوفیانہ ہے۔ اس کے بعض اشعار صائب نے اپنی بیاض میں نقل کئے تھے۔ یہ اس کے کمال کا اعتراف ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین نے ثابت کیا ہے کہ چندر بھان نے ولی دکنی سے پہلے شمالی ہندوستان میں اردو غزل لکھی[1]۔ فارسی مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شہنشاہ زمانہ سجدے ساخت — کہ گوئی بریں طرح نو ناز
زرفعت آسماں یک پایۂ او — مہ و خورشید زیر سایۂ او
رواقش قبلۂ اہل یقین است — تو گوئی مسجد اقصیٰ ہمیں است
فضایش سجدہ گاہ خاص و عام است — ہمانا مسجد بیت الحرام است
فلک گردد بہ گرد آستانش
بود خیل ملائک پاسبانش

آزاد خاں حاکم کشمیر کے عہد میں پنڈت آفتاب بھان ذکا ایک خوش فکر شاعر تھا۔ اس کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

مدعائے ہر دو عالم یافتم — جانِ جاں و ذاتِ آدم یافتم
جانِ جاں را دیدہ ام در جانِ خود — من ہمہ دریا دریں نم یافتم
دیدہ کارم خلد ہم آرام نیست — لامکاں را جائے بے غم یافتم
ہمانِ جانِ خویشتن در خویشتن — از دل و جاں تا گذشتم یافتم
بحر وحدت راز در دل شو ذکا
کوزۂ تن تا شکستم یافتم

پنڈت ست رام بقا یا بقا کہنہ کدل سرینگر کے رہنے والے تھے۔ ساٹھ سال کی عمر پا کر شیخ امام الدین حاکم کشمیر کے عہد میں فوت ہوئے۔ وہ کس خوبصورتی سے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ان دو شعروں سے لگائیے ؎

قسم بجانِ تو ہمہ عمر در نخواہم زیست
طبیب آمد و نبض مرا گرفت و گذاشت

تا پردہ بر فضا و ازاں رو بہ یک طرف — یک سو پرید رنگ ز گل تو بہ یک طرف

---

[1] اسلامک کلچر حیدرآباد دکن بابت اپریل ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۱

پنڈت [illegible] آصف الدولہ کے ابتدائی عہد میں کشمیر سے نقل کر کے [illegible] آباد میں آئے اور سعادت علی خاں کے عہد حکومت میں [illegible] چلے گئے تھے۔ صاحب دیوان تھے جس میں غزلیں اور ایک مرثیہ [illegible] ایک مثنوی اور ایک قصیدہ ہے [illegible] عبداللہ خاں کی شان میں ہیں۔ غزلوں میں عاشقانہ اور رندانہ مضامین زیادہ ہیں۔ [illegible] ایک قسم کا درد بھی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں: ــــ

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]
[illegible]

پنڈت [illegible] کے عہد میں [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ــــ

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

ــــ ــــ

[illegible] [illegible]
[illegible] آیت [illegible] آں [illegible] تو بود

ــــــ

[illegible]
[illegible]

ــــــ

[illegible] [illegible]

ــــــ ــــ

پنڈت [illegible] جنگ نامہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔
وہ [illegible] کے عہد میں فوت ہوا [illegible] جنگ نامہ کا نمونہ اس
مناجات پر ہوتا ہے: ــــ

خدایا [illegible] | نہ [illegible] ہنگامہ سوز [illegible]
[illegible] | [illegible]

زچشمم شب ما گہر ریز بینے　　　چو شبنم نہ کردم سحر خیز بینے
بہ گلزار عمرم بہارے نماند　　　بہ ستم چہرہ زنگار رخسارہ ماند
ہمہ خوش عمر بر باد رفت　　　مرا نو نشہ راہ از یاد رفت
عقوبت مکن، انفعالم بس است　　　مرا طعنۂ آں زمانم بس است
خدایا توئی خلق را چارہ ساز　　　ندارم بہ ناز کسے [illegible]
بہ درگاہ تو ناامیدی کجاست　　　گر امید [illegible]
کرمہا نگر گنہگار را　　　بہ بخشند [illegible]

ز صحرائے فیض در انتظار
بدہ یک دو ساغر کہ جشن است یار

پنڈت [illegible] دس کاچرو، ٹکو اور پنڈت راج کول عرضی بیگی [illegible] فارسی ادب میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان میں ایک افغانوں کی حکومت میں بڑا امیدوار [illegible] فارسی کی درسی کتابوں میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی بحر طویل کا [illegible] نمونہ کے دو شعر یہ ہیں —

ہر پارۂ دل [illegible] یگانہ ہو [illegible]
جشن است [illegible]
نے آشنائے مانند [illegible] باغباں
زیں باغ [illegible] بیگانہ ہو [illegible]

[illegible] ایران کے سیاح کشمیر میں فرحت محسوس کرتے رہے ہیں۔

کشمیر کی فارسی شاعری میں جذبات لطیفہ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ فارسی کے [illegible] اور ایرانیوں کا سا حسن بیان کشمیر کی وادیوں میں آکر [illegible] فارسی کو [illegible] ڈھل جاتی ہے کہ کشمیر میں بھی [illegible] ایرانی شعراء کی [illegible] مناظر نے ان کے دلوں پر نہایت گہرا اثر کیا [illegible] ہو گئی۔

موسم بہار [illegible] زندگی [illegible] خزاں کی [illegible] بالکل [illegible] ہو جاتا ہے۔ لیکن بہار شروع ہوتے ہی [illegible] دنوں میں [illegible] نئی امنگیں [illegible] اور یہ مضمون پیدا کرتا ہے۔

[illegible] بہار
خوش [illegible] بخود [illegible]

غنی ایک خوبصورت پھول دیکھتا ہے [illegible] بلند پرواز [illegible] کے ساتھ اس کے سامنے آتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ پھول کی رعنائی ہے [illegible] بہت [illegible] اس کی بلند پروازی رک جائے۔ غنی اس خیال کو [illegible] الفاظ میں پیش کرتا ہے —

[illegible]
[illegible]

بعض [illegible] فارسی شاعروں [illegible] غالب کی [illegible] نہیں [illegible] مگر ابھی غنی [illegible] ہے [illegible] نہیں [illegible] بات [illegible] کوئی ایسی بات نہیں [illegible] ہے کہ [illegible] غنی [illegible] —

[illegible]
[illegible]

کشمیر کی فارسی شاعری میں ایسی [illegible] ہے جو [illegible] تنقید کے معیار پر پورا اترتا ہے جس میں خلوص اور تاثیر ہے [illegible] اپنے دل کی بات [illegible] کشمیر کی شاعری ان خیالات کا ایک زبردست [illegible] آنکھوں سے دیکھتے اور دل سے محسوس کرتے ہیں وہ ایرانی شاعروں میں کشمیر کے دلفریب حسن کو کچھ ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے بھی تمام [illegible] رہ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں علم الاخلاق کی تعلیم، فلسفہ [illegible] مذہبی مسائل کی تفسیر، حسن و عشق کی داستان ہجر و وصال کے قصے، تمثیل نگاری اور منظر آرائی بھی [illegible] حقیقت میں کشمیر [illegible] جہاں بیٹھ کر زندگی اور موت کے فلسفے پر بہترین طریقے سے غور کیا جا سکتا ہے [illegible] اور پوری توجہ کے ساتھ عبادت الٰہی میں مستغرق رہ سکتا ہے۔ غنی [illegible] ایک [illegible] ہے تو اسے قوت تخیل کی بدولت زاہد کی ہر حرکت [illegible] نظر آتی ہے خاص کر اس کا [illegible] اس کی شاعری [illegible] پیش کرتا ہے اور وہ کہتا ہے —

[illegible] زیارت گاہ [illegible]   [illegible] گذشت

ایک کشمیری اور غیر کشمیری شاعر میں [illegible] یہ ہے کہ کشمیری شاعر تمام [illegible] اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کی ترجمانی کرتا ہے۔ برخلاف اس کے غیر کشمیری شاعر [illegible] باتوں پر یقین [illegible] داستانیں گھڑ لیتا ہے۔ مگر —

[illegible] بود مانند دیدہ

مثال کے طور پر کشمیر [illegible] سرو کا [illegible] موسم میں [illegible] لال سرخ ہو کر اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے آگ کے انگارے دہک رہے ہوں۔ سرو کے درخت کو [illegible] تشبیہ دی جاتی ہے۔ بلبل کا گھونسلہ [illegible] سے مشابہت رکھتا ہے۔ غنی ان تمام چیزوں سے ایک اچھوتا مضمون اخذ کرتا ہے —

تا کند در یوزۂ آتش بہ گلشن از [illegible]   [illegible] ہست سر از آشیان بلبلاں

یعنی سرو کے درخت پر بلبل کا گھونسلہ گویا بھیک کا پیالہ ہے جو چنار سے آگ مانگنے کے لیے اونچا کر دیا گیا ہے۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ زبردست زیردست کو ستاتا ہے لیکن ظلم و ستم کے باوجود جو سکون خاطر اور اطمینان قلب کمزور کو نصیب ہوتا ہے۔ اس سے زبردست کا دل ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ غنی پن چکی دیکھ کر کہتا ہے ؎

زبردست اضطراب و زیردست آسودگی دارد
دو شاہد بر کلام من دو سنگ آسیا باشند

یعنی زبردست ہمیشہ مضطرب اور کمزور ہمیشہ مطمئن رہتا ہے۔ میرے اس دعوے پر چکی کے دونوں پاٹ گواہ ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ کشمیری شعراء کے تمام نظریے اور استدلال منطقیانہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی بعض تمثیلات محض شاعرانہ اور خیالی ہوں جنہیں اصلیت سے کوئی واسطہ نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی کشش ضرور رکھتی ہیں کہ سننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا ہے اور دیر تک مزے لیتا رہتا ہے۔

غرض زبان کی شستگی و شیرینی، اداے بیان میں جدت و دلنشینی، ترجمانیٔ جذبات کی نزاکت و لطافت، خیالات کی طرفگی و بلندی، نئے نئے مضامین کی تلاش میں موزونی، استعارات و تشبیہات کی برجستگی و ندرت اور اس قسم کے تمام دیگر محاسن جو کسی فارغ البال اور خوش حال ملک کی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں کشمیر کی فارسی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور غنی، سلیم، محسن فانی اور مرزا مجرم کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیا ان شعرا کی عظمت و فضیلت کو تسلیم کرتی اور شاہان وقت ان پر انعام و اکرام کا مینہ برسا کر اپنی معارف پروری اور جوہر شناسی کا ثبوت دیتے تھے۔ مگر افسوس کہ وہ زمانہ خواب و خیال ہو گیا۔ آج ان کی علمی یادگاروں کو پوچھنے والا کوئی نہیں ملتا۔ ان کے گرانمایہ ادبی شاہکار لوگوں کی بے توجہی اور سرد مہری کا شکار ہو کر کیڑے مکوڑوں کی غذا بن رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب یہ گوہر ابن شب چراغ ہمیشہ کے لیے ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے اور کوئی ان کا سراغ تک نہ لگا سکے گا۔ کاش کشمیر کے علم دوست حضرات اب بھی اپنے جواہرات کی قدر کریں۔ اپنے بزرگوں کی نادر و نایاب کتابوں کو جہاں بھی ہوں گوشہ گمنامی سے نکال کر ان کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کریں اور انھیں تباہ و برباد ہونے سے بچا کر ثواب اٹھائیں اور آیندہ نسلوں کو بھی استفادہ کا موقع دیں ؎

بیکار پڑا ہے ترا سامان تجلی
لے وادی ایمن کوئی موسیٰ نہیں اٹھا

لوگوں کا عام بگڑا ہوا مذاق دیکھ کر اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے ڈر تو لگتا ہے مگر خیال ہے کہ شاید کوئی ایسا صاحب نظر جوہری پیدا ہو جائے جو ان منتشر مگر قیمتی اور شاہوار موتیوں کو جن سے دوسری قومیں دولت سرمدی حاصل کرتی ہیں اور انھیں محفوظ رکھنا اپنے لیے سرمایہ حیات سمجھتی ہیں خاک سے اٹھا کر لڑیوں میں پروتے اور اپنے طرۂ افتخار کی زینت بنالے۔

تاریخ گوئی کے متنازعہ مسائل

(مخمص تسلیم کی روشنی میں)

کسری منہاس

منشی امیر اللہ تسلیم مصحفی کے شاگرد شیخ علی بخش بیمار کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت بیمار وہی بزرگ ہیں جن کو نواب محمد سعید خان والیٔ رامپور نے "بوستانِ خیال" کے اردو ترجمہ کا کام سپرد کیا تھا اور انھوں نے اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ بھی کیا تھا کئی دیوان انھوں نے یادگار چھوڑے۔ فن اور متعلقاتِ فن سے باخبر تھے۔ حضرت تسلیم نے انہی فاضل ادیب سے تقریباً بیس برس کی عمر تک اکتسابِ علم و فن کیا اور اپنی محنت اور ذہانت سے اساتذۂ وقت میں شمار ہونے لگے۔

تسلیم کے شعری سرمایہ میں چھ مثنویاں ہیں۔ نولکشور پریس لکھنؤ سے طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی غزلوں کا دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ البتہ فنِ تاریخ گوئی سے متعلق ان کی دو کتابیں "مخمص تسلیم" اور "مدد تاریخ" "آیۂ اعظم" پریس مراد آباد سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تسلیم تحقیق و جستجو کے دلدادہ تھے۔ فارسی، عربی کی قدیم شعری روایات سے انھیں پوری واقفیت حاصل تھی۔ ان کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ نظم ہو یا نثر دونوں میں ان کا قلم رکتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ علم و ادب کے تقریباً ہر شعبہ سے باخبر تھے لیکن تاریخ گوئی کا خاص ملکہ ان میں ودیعت تھا اور اسی خاص جوہر کی وجہ سے دنیائے ادب میں ان کا نام آج تک زندہ ہے اور ہر دور کا مورخ ان کے اس کارنامے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

"مخمص تسلیم" ان کی گہری واقفیت اور زندگی بھر کی ادبی ریاضت کا ثمرہ ہے جس میں انھوں نے تاریخ گوئی کے جملہ قواعد سے بحث کی ہے۔ اس فن کے تمام مختلف فیہ مسائل کو علمی و عملی دونوں نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ علمی بحث کے ساتھ ساتھ اساتذۂ متقدمین کے نظائر بھی پیش کیے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

تسلیم نے مخمص تسلیم (۱۳۰۰ ہجری میں) ختم کی۔ چنانچہ مخمص کے صفحہ چھ پر فرماتے ہیں: "چوں آغازِ کتاب لباسِ خاتمہ پوشید مخمص تسلیم نام دادم" مخمص تسلیم اس کا تاریخی نام ہے۔ یہ کتاب ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئی۔ حضرت جلال نے سالِ اشاعت تحریر فرمایا ہے

جلال از سالِ طبعش دے خبر داد
کتابِ بے بدل بے مثل و نادر (۱۳۱۴ھ)

مخمص سے پہلے تاریخ گوئی کے موضوع پر دو کتابیں چھپ چکی تھیں۔ پہلی کتاب خیابانِ تاریخ جو سید محمد علی جویا مرادآبادی کی تصنیف تھی

یہ کتاب ۱۲۹۲ھ میں طبع ہوئی۔ دوسری کتاب "افادۂ تاریخ" جس کے مؤلف ملک کے باکمال استاد میر ضامن علی جلال لکھنوی تھے۔ یہ کتاب ۱۳۱۲ھ میں طبع ہوئی۔ حضرت جلال کے افادۂ تاریخ کو کافی شہرت حاصل ہے کیونکہ تاریخ گوئی کے فن پر اور کوئی مستند رسالہ دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ مرحبیے جوتی ی وشنی دونوں کے بیچ ہی طبع زاد مادہ تھا۔ خیابان تاریخ میں فن تاریخ گوئی کے قواعد کے علاوہ حضرت جوہا نے اپنی کہی ہوئی اچھی اچھی تاریخوں سے مثالیں دے کر روشناس کرایا ہے۔ ان کے تلاش کیے ہوئے مادے بڑی محنت کے اور رسالہ ہی مادے کی تلاش میں انھوں نے اصل واقعہ سے مضمون سے مطابق بہترین الفاظ کی جستجو بھی فرمائی ہے اس لیے ان کی ہر کاوش موجب صد آفریں ہے اور اسی محنت سے ان کے مذاق صحیح کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۴۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ہمزہ کے اعداد کے متعلق جو شق بے اختیار کیا گیا ہے اس پر آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ محض چونکہ ان دونوں کتابوں کے بعد طبع ہوئی اس لیے حضرت تسلیم نے ان تمام مختلف فیہ مسائل سے بحث کی ہے جو ان کتابوں میں ان کے زیر غور آئے۔

قواعد تاریخ گوئی میں مختلف فیہ مسائل کی بحث بڑی اہم ہے کیونکہ یہ ایک بنیادی بحث ہے اس لیے ملحض میں حضرت تسلیم نے اس کے مدلل اور دلکش انداز میں اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ تاریخ گوئی کے ان کٹھن راستوں پر ایک قابل اعتماد راہ نما کی طرح قیادت فرمائی ہے۔ فنی پہلوؤں کو بڑی جانکاہی سے اجاگر کیا ہے۔ اپنے موقف کی توضیح ہی نہیں کی بلکہ فیصلہ کن نتائج سے روشناس بھی کرایا ہے جس سے ان کی ریاضت محنت اور ادبی صنعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں ذیل کے پیچیدہ اور مختلف فیہ مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔

(۱) الف ممدودہ

"الف ممدودہ در جمیع لغات و قواعد فارسی در بیان حروف تہجی فصل الف ممدودہ و الف مقصورہ موجود نگر ہمزہ نبودند۔ بعض کاتبان عیار الف ممدودہ را دو الف قرار دادہ اند و دو عدد گرفتہ اند و نیز مذہب اہل لغت ہمیں است ... الف ممدودہ بخواندن دراز باشد چون الف آمدن و آموختن و آمیختن ہرگاہ یائے زائدہ و نون نفی و میم نہی قبل صیغہ ماضی و مضارع و امر و نہی در آید متحرک اند (یا) بدل شود و ساکن بحال خویش ماند چنانچہ بیامد و بیاورد و بیاموخت ہم چنیں دیگر مشتقات اصل این۔ آمد۔ آورد۔ آموخت۔ آمیخت بود۔ کوکب کاشانی و فقیہ اصفہانی بر آن مستند الف ممدودہ کہ حکم دو الف دارد در اول کلمات می آید چنانچہ آہنگ و آونگ و آباد و آزاد و آغاز آمدند"

(ملخص تسلیم صفحہ ۳۴-۳۵)

اس بحث کے دوران میں اکثر اساتذہ کی کہی ہوئی تاریخوں سے استناد کیا ہے۔

بہر تاریخ قرآں کرد رقم کلک حکیم

مہد خورشید سر منزل بلقیس آمد (۱۰۴۳ھ)

شیخ نظام الدین مصنف مجمع الصنائع نے اپنے والد محمد صادق کا تاریخی مصرع قصیدۂ تاریخی "ہر نفس آرام جان" سے لیا ہے جس سے ایک ہزار چھپن سال پیدا ہوتے ہیں۔ الف ممدودہ کے دو عدد لیے ہیں۔

بجد و جہد رامش آرام جاں یافت (۱۰۵۶ھ)

ملک الشعراء ذہینی کہ اکابر شعرائے یزد سے تھا۔ مثنوی نرگس زار میں بمقام نعت لفظ "آل احمد" کو دو الف سے لکھا ہے۔

بدیں منادی ... نسبت گوہر — بنویسم تا بدم نامہ پیمبر
محمد رحمت اللعالمین است — شفیع جملہ ... ان ... است
محمد بالیقیں زاں نور ایماں است — خدا دانی ازو روشن ایماں است
عدو نامہ بر باب عرفاں — رہبر حب محمد ہست ایماں
نبی امی امین محمد — بحق اعلیٰ المطلق آل احمد
۹۲ ۹۲ ۸۵ ۸۵

مذکورہ تاریخوں میں احمد کو (اآحمد) آرام کو (اآرام) آل کو (اآل) دو الف سے کتابت کیا ہے اور الف ممدودہ کے دو الف محسوب ہوئے ہیں۔

حضرت تسلیم نے چند ایسی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں الف ممدودہ کا ایک عدد لیا ہے۔ ؎

تاریخ آں مقارنہ کردم سوال گفت
ماہ از سبب ... پابوس آفتاب
۹۵۰ (ملا محتشم)

یہاں آفتاب میں الف ممدودہ کا ایک عدد لیا گیا ہے۔

؎ زہے دو شاہ جہاں پادشاہ ملک آرای
ہزار آمد ز ... عماں (شیخ ...)

اس کے متعلق تسلیم فرماتے ہیں:۔

”عدد آرائی و آرائیات ... قاعدہ ... است۔“ (ملخص صفحہ ۳۷)

حضرت تسلیم کے نزدیک الف ممدودہ کے دو عدد لینا تاریخ گوئی کے قواعد کے عین مطابق ہے جنھوں نے الف ممدودہ کا ایک عدد لیا ہے حضرت تسلیم نے انھیں نہایت سخت الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

”الف ممدودہ دو الف است ... در ہر صورت لفظی دو عدد شمار باید۔ آنانچہ ... بلکہ اہل ... ہزار کار قول یک صادق باور نکردند۔ ... این است کہ عامہ ... ناآشنائے قواعد فن تاریخ گوئی ... امتیاز الف ممدودہ ... رہ و راہ یافتہ ... نرفتند بلکہ خویش ... خود گرفتار۔“ (ملخص ۳۷)

صاحب غرائب الجمل فرماتے ہیں:۔

”صاحب ملخص تسلیم کا اصرار ہے کہ الف ممدودہ کے عدد دو ہی محسوب ہوں اور مرزا محمد جعفر اوج نے بھی اپنی تالیف ”ارمغان“ میں انھی کے ساتھ اتفاق فرمایا ہے۔“ (غرائب صفحہ ۴۸)

دوسری جگہ پھر فرماتے ہیں:۔

”صاحب ملخص تسلیم نے اپنی رائے کے خلاف عمل کرنے والے استادوں کو بہت برا بھلا کہا ہے اور سخت سست

الفاظ میں ان کو یاد کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ ہماری تاریخوں میں الف ممدودہ کے دو عدد محسوب ہو سکتے ہیں۔

(غرائب الجمل صفحہ ۸۵)

ملفوظ تسلیم کے مذکورہ اقتباسات اور علامہ عزیز جنگ ولا صاحب غرائب الجمل کی رائے کی روشنی میں حضرت تسلیم کا مشرب واضح ہے وہ الف ممدودہ کے دو عدد لینے کے حق میں ہیں اور جن مؤرخین نے الف ممدودہ کا ایک عدد لیا ہے وہ ان کے نزدیک قابل گرفت ہیں۔

الف ممدودہ کتابت میں ایک الف سے مکتوب ہوتا ہے اس لیے اس کا ایک ہی عدد لینا چاہیئے۔ حضرت جلال لکھنوی کا بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت امیر مینائی لکھنوی مرحوم نے بھی امیر اللغات میں ایسے الف کا ایک ہی عدد لینے کی تلقین کی ہے۔ مد ہمزہ اور الف خفی آواز الف کی علامتیں ہیں۔ حروف ابجد جو تعداد میں اٹھائیس ہیں ان میں ان کا شمار نہیں اس لیے مؤرخین نے ان کا کبھی کوئی عدد نہیں لیا۔

تاریخ گوئی میں مکتوبی حروف کے عدد لیے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ غیر ملفوظ ہی کیوں نہ ہوں مثلاً خوش میں واؤ معدولہ غیر ملفوظ ہے لیکن مؤرخ اس کے چھ عدد لیں گے۔ مدرّج میں رے مشدد ہے۔ دو دفعہ بولی جاتی ہے لیکن عدد ایک ہی رے کے شمار میں آئیں گے۔ اب اور آب ہم عدد ہیں۔ اگر مد کا ایک عدد لینا درست ہے تو حرکات ثلاثہ اور جزم نے آخر کیا قصور کیا ہے کہ ان کو غیر محسوب چھوڑا جاتا ہے۔ جمہور مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ الف ممدودہ کا ایک ہی عدد لینا چاہیئے۔ اہل لغات فن تاریخ متفق ہیں اور الف ممدودہ کے دو عدد لینے کا رواج اب نہیں رہا۔

(۲) تائے مدورہ

تاریخ گوئی میں مختلف فیہ مسائل میں دوسرا امر تائے مدورہ کے اعداد کی بحث کا ہے۔ تائے مدورہ کے عدد اساتذہ نے کبھی چار سو لیے ہیں اور کبھی پانچ۔ اس بحث میں حضرت تسلیم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اظہار خیال کیا ہے جس کے اہم حصے ہم ذیل میں فارسی سے ترجمہ کر کے پیش کرتے ہیں:۔

"تائے فوقانی عربی میں آٹھ معنوں میں آتی ہے جن میں سے دو کے متعلق تحریر ہے۔ ایک تائے تانیث جو اواخر اسما میں آتی ہے خواہ منصرف ہو یا غیر منصرف اور بحالت وقف میں ہا پڑھی جاتی ہے جیسے ضاربۃٌ۔ مضروبۃٌ۔ روضۃٌ۔ دوحۃٌ۔ فاسقۃٌ۔ مستورۃٌ۔ دوم تائے وحدت جیسے تمرۃٌ (ایک چھوہارا) حمامۃٌ (ایک کبوتر)"

تائے مصدری بعض مصادر کے آخر میں آتی ہے جیسے رحمت۔ نعمت۔ عشرت۔ قناعت (از ہفت قلزم) صاحب غیاث لکھتے ہیں: "تائے مصدریہ ضاربۃٌ۔ مضروبۃٌ۔ رحمۃٌ۔ قناعت و غفلت۔ واضح ہو کہ عربی میں رسم الخط تائے فوقانی کی تین قسمیں ہیں۔ اول تائے دراز جو جمع میں بعد الف کے آتی ہے جیسے کائنات۔ آیات۔ صفات۔ کرامات اور بعض اسما میں بھی دراز ہوتی ہے جیسے تائے تبت اور دست بہ فتح سین مہملہ بہ معنی دشت۔ جبرت کہ آخر افعال عربی میں آتی ہے وہ بھی دراز ہوتی ہے جیسے ضَرَبت۔ قالت۔ کَتَبتُ۔ فَعَلت۔ دوم تائے مدور مفرد وہ پانچ حرف کے بعد آتی ہے۔ دال مہملہ۔ ذال معجمہ۔ رائے مہملہ۔ زائے معجمہ۔ واو۔ جیسے اعادۃٌ۔ اعاذۃٌ۔ ادارۃٌ۔ اجازۃٌ۔ اخوۃٌ۔ سوم تائے دامن دار جیسے اباجنۃ۔ اعالتۃ۔ اجانتۃ۔ ان احادیث میں بھی تائے دامن دار ہے۔ لیس الخبر کالمعاینۃ۔ الحرب خدعۃ۔ المسلم مرآۃ المسلم۔ اتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔ ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا۔ السفر قطعۃ من العذاب۔ صاحب ہفت قلزم فرماتے ہیں کہ تائے دولت۔ سعادت۔ رفعت۔ شوکت۔ حشمت۔ شجاعت۔ عترت کو فارسی میں دراز لکھتے ہیں اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کی تا کو مدور جو کہ بعض میں

ۃ سے مراد لی جاتی ہے جیسے حلاوت وحلاوہ ۔ رحمت ورحمہ ۔ جنت وجنہ ۔ دولت ودولہ ۔

مرزا قطب الدین مائل کی تاریخ محمد عاکف نے جعل جنتہ مثواہ (۱۱۰۸) سے نکالی ہے ۔ سرخوش نے اپنے تذکرہ ضمیر حال میں لکھا ہے ۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے تذکرہ خزانۂ عامرہ میں اس تاریخ پر اعتراض کیا ہے کہ مورخ نے تائے جنتہ کو باملائے عربی (ۃ) کی شکل میں لکھا ہے اور بجائے پانچ سو کے چار سو عدد محسوب کیے ہیں ۔ شیر خان مصنف تذکرہ مراۃ الخیال نے تائے مراۃ کو ہ رکھا ہے اور چار سو عدد محسوب کیے ہیں ۔

این چنین نازے کہ مراۃ الخیالش خواندہ اند — داد از حسن معانی یک جہان حسن کمال
صورت تاریخ انجامش نواں سہلے بدید — گر تامل بر رہ بر وارد ز مراۃ الخیال

(۱۱۰۲)

"مراۃ الخیال" کے ۱۳۱۳ عدد ہوتے ہیں ۔ "بر رہ" کے ۲۱۱ عدد نکالنے سے سال مطلوبہ (۱۱۰۲) حاصل کیا ہے ۔

فائق نے مسجد نواب آصف الدولہ کی تاریخ کہی ۔

فائق دوگانہ کرد بمحراب او ادا
تاریخ گفت خضر کہ "قد قامت الصلوٰۃ"

۱۲۰۲

خواجہ معین الدین چشتیؒ کی تاریخ وفات ۔

سال نقل معین دین ز فلک
"زبدۃ الصالحین" بگفت ملک

۶۳۳ (ناظم تبریزی)

مولانا عبدالباسط امیٹھوی کی ایک تاریخ ہے ۔

گفت از خداش با احباب
اسکن انت و زوجک الجنۃ (۱۱۰۸)

آل محمد مارہروی نے تاریخ مسجد فتح محمد خان میں تائے مدور کے چار سو شمار کیے ہیں ۔

تاریخہ سئلت من العقل فی السحر
من ہاتف سمعت فقد قامت الصلوٰۃ

۱۲۸۴

اس تاریخ کا مادہ وہی ہے جو فائق نے تلاش کیا ۔ صرف سنہ تاریخ زیادہ کر دیا اور "واؤ" کے درمیان الف غلط ہے ۔"

حضرت تسلیم نے مولانا امام بخش صہبائی کا ایک طویل خط بھی اس بحث کے ضمن میں نقل فرمایا ہے ۔ چونکہ خط بہت طویل ہے اس لیے اصل خط کی عبارت کو نظر انداز کرتا ہوں البتہ اس خط کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ۃ اسلوب عربی میں ہے تو اس کے چار سو عدد لیے

جائیں گے اور اگر اسلوبِ فارسی میں ہے تو اس کے پانچ عدد شمار میں آئیں گے۔

مولانا صہبائی کے مذکورہ قولِ فیصل پر حضرت جلال تحریر فرماتے ہیں :۔

"مولانا صہبائی نے تائے مدورہ کے چار سیکڑے اور پانچ احاد لینے کے جھگڑے میں ایک محاکمہ فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مدورہ موقوفہ کے تو پانچ عدد لیے جائیں اور موصولہ کے چار سیکڑے۔ مثلاً بربِ الکعبۃ کی ت کے تو پانچ احاد لیے جائیں اور کعبۃ اللہ کی ت کے چار سیکڑے۔ مؤلف ہیچمدان (جلال) کہتا ہے کہ واہ واہ سبحان اللہ کیا خوب فیصلہ کیا ہے جس نے قاعدۂ تاریخ ہی کو برہم کردیا یعنی صورتِ کتابت کو کچھ دخل ہی تاریخ میں نہ رہا۔ محض تلفظ پر کہ جس کا اعتبار مطلق تاریخ میں نہیں ہے، دار و مدار رکھا گیا یعنی بربِ الکعبۃ میں جو در حالتِ وقف "تے" غیر ملفوظ ہوتی ہے اس کے پانچ لیے جائیں اور کعبۃ اللہ میں در حالتِ وصل جو "تے" ملفوظ ہوتی ہے اس کے چار سو۔ اس فیصلے کو ان کے معتقدین ہی تسلیم فرمائیں تو فرمائیں دوسرا کیونکر مان لے کہ قاعدۂ تاریخ ہی مٹا جاتا ہے۔"

(افادۂ تاریخ صفحہ ۲۵ - ۲۶)

حیدر آباد دکن میں ذکی مرحوم لکھنوی اور حقی مغفور دکنی میں تائے لفظ صلوٰۃ کے اعداد پر ایک طویل بحث ہوئی تھی۔ ذکی مرحوم کے نزدیک تائے مدورہ صلوٰۃ کے پانچ عدد اور حقی مغفور کے نزدیک تائے مدورہ صلوٰۃ کے چار صد عدد درست تھے۔ استادان جلّ سے استصواب ہوا۔ مولوی حبیب اللہ ذکا اس بحث کا فیصلہ یوں فرماتے ہیں ؎

من بریشم - من بریشم - من بریں   خان معنی آنچہ مے گوید بجاست

در حضورِ حقی نواں گفتن ذکا   آخر لفظ صلوٰۃ البتہ تاست

مختلف اساتذہ نے تائے مدورہ کی بحث میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تسلیم صہبائی کے ہم نوا ہیں۔ جلال امیر و تسلیم کے ہم مشرب ہیں۔ مولانا صفی لکھنوی سے میں نے تائے مدورہ کے اعداد کے متعلق استفسار کیا تھا چونکہ ان کا خط مدلل ہے اور ساتھ ہی اس بحث پر ایک آخری تحقیق ہے اس لیے میں ذیل میں بجنسہ نقل کرتا ہوں :۔

"ابجد نہایت مختلف اٹھائیس حروف، زبان عربی میں ہیں جو حروفِ تہجی کہلاتے ہیں۔ ان میں اکثر ہم شکل ہیں جن کو حروفِ متشابہ کہتے ہیں۔ ان کی آواز کا فرق نقطوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک نقطہ دار اور دوسرے بے نقطہ۔ نقطہ دار میں بھی بعض حرفوں کے اوپر اور بعض کے نیچے نقطے دیے جاتے ہیں اور اس کے بعد مابہ الامتیاز نقطوں کی تعداد ہوتی ہے اور یہ تعداد تین نقطوں سے نہیں بڑھتی۔ ان اٹھائیس حرفوں کی بحساب ابجد ایک سے لے کر ہزار تک تعداد مقرر ہے اور فنِ تاریخ گوئی میں انہی حرفوں کے اعداد جوڑے جاتے ہیں چنانچہ تائے قرشت جس کو تائے مثناۃ فوقانیہ یعنی اوپر کے دو نقطوں والی تے بھی کہتے ہیں، اس کے عدد چار سو اور ہائے ہوز جو حرفِ بے نقطہ ہے عربی رسم الخط میں کئی طرح سے لکھی جاتی ہے اس کے پانچ عدد مقرر ہیں۔ عربی رسم الخط میں تائے مثناۃ فوقانیہ یعنی تائے قرشت کو کبھی مدورہ (ۃ) کبھی نقطہ ہیں یا تہ ہائے مختفی کی شکل میں لکھتے ہیں جیسے فطرۃ۔ روضۃ۔ ساعۃ۔ ایسی حالت میں (ت) اور (ہ) ہم شکل ہو جاتی ہیں۔ صرف اوپر کے نقطوں سے دونوں کی آواز میں فرق پیدا

ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کے عدد قرار پا سکتے ہیں لہٰذا ة ، مدوریا اواخر الفاظ میں تائے موقوفہ جب ہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے یعنی لفظوں کے لکھی جانے اس وقت یہ سمجھا جائے گا کہ یہ تا نہیں ہے بلکہ ہائے ہوز مستعمل ہوگئی ہے یعنی اپنا چولا بدل کر ہائے ہوز کا چولا اختیار کر لیا ہے اور اس حالت میں اس کے اعداد وہی ہوں گے جو ہائے ہوز کے ہیں جیسے ہوز لفظ کے آخر میں لفظ داراد متحرک ہو کر "ت" کی آواز دے رہی ہے اس کے عدد بھی وہی ہوں گے "ت" کے یعنی چار سو کیونکہ حروف متشابہ ہیں آواز دل اور ادا کا فرق لفظوں ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اندریں صورت مراۃ الغیب میں تائے مدور کے پانچ عدد شمار کیے جائیں! مجھے اس سے اتفاق نہیں ۔ جب تک ت ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو اس کے عدد چار سو بحساب جمل لیے جائیں گے۔ آپ نے جو تین صورتیں اپنے خط میں لکھی ہیں ان میں سے تیسری صورت سے مجھے اتفاق نہیں یعنی تول ة کے عدد حالت وقف میں پانچ اور بحالت حرکت خواہ اس کی کتابت بہ شکل ہائے ہوز ہی ہو چار سو لیے جائیں گے اس لیے واقعۃ الموت میں قاف کے بعد جو ة ہے اس کے چار سو عدد لیے گئے ۔ وہ صحیح ہے مگر کل نفس میں چونکہ لام ایک ہی ہے اس کے تیس ہی لیے جائیں گے۔ حرف مشدد کے دوہرے عدد لینا قطعاً خلاف قاعدہ ہے اور اسی طرح اس ہمزہ کے جو لباس یا میں ہے یا کے عدد چھوڑ دینا بھی درست نہیں۔ بہرحال تاریخ غلط ہے۔ علامت مشدد ایک ہی حرف کے سکون و حرکت کی علامت ہے۔"

حضرت تسلیم کی اس طویل بحث سے عیاں ہوتا ہے کہ تائے مدورہ جب حالت وقف میں ہو تو اس کے پانچ عدد شمار ہوں گے اور غیر وقف کی صورت میں تائے مبسوط کی طرح چار سو عدد محسوب ہوں گے اور جن اساتذہ سلف نے ان کے مسلک کے خلاف عمل کیا ہے تسلیم کے نزدیک وہ غیر مستند ہیں حالانکہ ان کا علمی و ادبی پایہ تسلیم سے بدرجہا بلند ہے۔

(۳) ہمزہ اور یائے تحتانی

تاریخ گوئی کے متنازعہ مسائل میں ہمزہ اور یائے تحتانی کے اعداد کی بحث بھی بڑی جھگڑے والی ہے۔ ہمزہ بہ شکل (ء) حروف ابجد میں سے کوئی حرف نہیں۔ تاریخ میں مکتوبی حروف کے عدد لیے جاتے ہیں ملفوظی کا شمار نہیں ہوتا۔ ہمزہ مندرجہ ذیل صورتوں میں لکھا جاتا ہے:۔

ا۔ اگر ہمزہ لفظ کے شروع میں آئے

ہمزہ شروع الفاظ میں الف کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے اُسماء ۔ اِکرم ۔
اسی طرح اگر ہمزہ لفظ کے پہلے حرف کے ساتھ ملا ہوا ہو گا تب بھی الف کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے بأجل اور لأفضل البتہ لئلا اور لئن میں کثرت استعمال کی وجہ سے ایسا نہیں ہے۔

۲۔ اگر ہمزہ لفظ کے درمیان آئے

درمیان آنے والا ہمزہ اگر ساکن ہو تو اپنے سے پہلے حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا مثلاً بأس۔ بؤس۔ جئس ۔
اگر ہمزہ متوسط متحرک ہو تو اپنی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا خواہ اس کا ماقبل ساکن ہو یا متحرک جیسے لؤم اور رؤف یئاس مسائل۔ مسألۃ۔

البتہ اگر ہمزہ متوسط متحرک سے ماقبل ایسا حرف ہو جس پر ضمہ (پیش) یا کسرہ (زیر) ہو تو اپنے ماقبل حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا مثلاً سُؤال۔ رِئاس۔ مُؤنث۔

اگر ہمزہ الف اور یا کے درمیان واقع ہو تو جائز ہے کہ اسے خاص ہمزہ کی صورت میں یا ئی کی شکل میں لکھا جائے۔ لقاءی اور لقائی۔ راءی یا رائی۔

اگر ہمزہ ادر ی کے علاوہ دوسرے حروف ضمائر کے درمیان آئے تو اگر وہ مکسورہ یا مضمومہ ہوگا تو اپنی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا اور اگر مفتوحہ ہوگا تو خاص ہمزہ کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے بقاؤُہٗ۔ بقائِہٖ بقاءَہٗ۔

۳۔ اگر ہمزہ آخر میں آئے

اگر ہمزہ آخر میں آئے اور اس کا ماقبل ساکن ہو تو علامت قطع کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے جزءٌ۔ شیءٌ۔

اگر ماقبل متحرک ہو تو اپنے پہلے حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا جیسے ھَیُؤ۔ لکَاَ۔ ظمِئ۔

اگر لفظ کا آخری حرف ہمزہ ہو اور اس کے ساتھ تائے تانیث مل ہوئی ہو تو اگر ہمزہ سے ماقبل حرف صحیح ساکن ہو (یعنی الف واو۔ یا میں سے نہ ہو) تو الف کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے نشأۃ اور اگر ماقبل حرف صحیح متحرک ہے تو اس حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا جیسے فِئَۃٌ اور لُؤلُؤۃ۔

اگر ہمزہ سے ماقبل ی ہو تو ہمزہ ی کی صورت میں لکھا جائے گا جیسے خطیئۃٌ۔ بریئۃٌ۔ لیکن اگر ماقبل الف یا واو ہو تو ہمزہ کی اصل صورت ہی میں لکھا جائے گا جیسے براءۃٌ۔ صلاءۃٌ اور مروءۃٌ اور سوءۃٌ۔

ملخص میں ہمزہ اور یائے تحتانی پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے جس کے پڑھنے سے حضرت تسلیم کی تحقیق المحنت اور بحثہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے ہماری کتاب میں یہ باب نظر و تلاش کے اعتبار سے ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس موضوع پر چند اہم نکات اور ان پر ان کے محاکمے کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ ہمزہ بہ شکل (ء) حروف ابجد میں سے کوئی حرف نہیں۔ یہ آواز الف متحرک کی علامت ہے جب واو یا ی یا (ہائے مختفی) پر واقع ہوتا ہے تو اس حرف میں الف متحرک کی آواز پیدا کر دیتا ہے۔ فن کتابت میں ہمزہ کی ہستی رسم الخط کے طور پر سر عین کی شکل میں واقع ہوتی ہے۔

۲۔ ا احباءِ سخن چو کرد یحییٰ جاں داد (۱۰۶۴)

اس مصرع تاریخ میں احیا کے الف کے بعد جو ہمزہ واقع ہوا ہے مورخ نے اس کا کوئی عدد نہیں لیا لیکن ان کو (احیاءِ سخن) کی ترکیب (احیائے سخن) یائے مجہول سے لکھنا چاہئے تھی کیونکہ اگر اس تاریخ کو فارسی کے قواعد کے مطابق لکھا جاتا تو دس عدد سالِ مطلوبہ سے زیادہ ہو جاتے تھے اس لیے عربی طرز کتابت اختیار کی گئی جو معیوب ہے اور قابل تقلید نہیں۔

۲ حرفِ مدرا ساخت مدغم پیرِ عقل آنگاہ گفت
نحو جائز کرد ایں جا التقاءِ ساکنین ۱۰۹۸ + ۱ = ۱۰۹۹

یہاں بھی فارسی رسم الخط سے چشم پوشی کی گئی ہے اور تاریخ درست نہیں۔

"ہمزہ کہ بعد الف می آید عوض آں یائے تحتانی می نگارند۔ قاعدہ عربی در فارسی جاری کردن خود را عاری کردن است۔ طبع حق پسند چہ گونہ خواہد پذیرفت" (ملخص صفحہ ۵۱)

چنانچہ باقر گیلانی کی تاریخ ہے ؎

مل جائے دوسرا امام المتقین (۱۰۶۸)
مخدوم جہاں سید المرسلین (۱۰۶۸)

۳۔ یورثہا من یشاء (۱۱۲۴)

ہمزہ بعد الف کوئی چیز نہیں اور اسی قاعدے کے تحت ہمزہ کو تنوین کو بھی سمجھنا چاہیے۔ "یورثہا من یشاء" میں ہمزہ کا ایک عدد محسوب ہوا ہے۔ اس کے متعلق علامہ سید رضا بلگرامی قواعد العروض میں فرماتے ہیں کہ "یہ مادۂ تاریخی ہے اور ہمزہ کو بضرورت علامہ واسطی نے اعداد میں شمار کر لیا اگرچہ خالی از تعدی نہیں"

حضرت احسن مارہروی نے بھی طوفانِ نوح کی تاریخ اشاعت میں ہمزہ کا ایک عدد لیا ہے ؎

کشتیِ مطبع رواں ہے مبدءِ طوفانِ نوح (۱۳۴۰)

اسی طرح انھوں نے حضرت داغ کے خطوط کا نام تاریخی "انشائے داغ" (۱۳۵۸) رکھا ہے۔ یہاں بھی ہمزہ کا ایک عدد لیا ہے۔ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں اور قابلِ سند نہیں البتہ "مبدء طوفان" کو اگر انھوں نے "مبداءِ طوفان" الف کے ساتھ ثابت کیا ہے تو ایک عدد کے شمار کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے۔ "انشائے داغ" کے لیے قواعد تاریخ گوئی میں ایک عدد لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

۴۔ ہمزہ کبھی واؤ پر مکتوب ہوتا ہے مثلاً آؤ۔ جاؤ۔ کیکاؤس۔ رؤف۔ لکھنؤ وغیرہ۔ ایسا ہمزہ غیر محسوب ہوتا ہے۔

مصحفی	سودا کی قرآں سخن دلفریب او	(۱۱۹۵)
رشک	دارالشعر گوئی الٰہی لکھنؤ ہے	(۱۲۵۴)
صفی	قرباں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے	(۱۳۵۸)
نوح	ہاتفِ غیب نے کہا آؤ جلالِ امیر داغ	(۱۳۲۷)
سرور	گفتہ ام شمع حق علاؤ الدین	(۷۲۰)

ام التواریخ از حسین علی فرحت جو ہم عدد الفاظ کی ایک عمدہ ڈکشنری ہے۔ اس میں (آؤ) کے (۱۷) عدد محسوب کیے گئے ہیں۔ آؤ کے ہمزے کو ایک تحتانی کے برابر شمار کرنے کی یہ مثال قابلِ سند نہیں۔ اسی طرح ایسے ہمزے کا ایک عدد لینا بھی درست نہیں اور یہ خیال کہ ہمزہ جب یائے معروف پر واقع ہوتا ہے تو اس کے اعداد میں ایک تحتانی ہو کر محسوب ہوتا ہے اس لیے جب بھی ہمزہ واؤ پر واقع ہو تو اس کے بھی عدد لینا چاہیے۔ قواعد تاریخ گوئی کے خلاف ہے۔ واؤ کا ہمزہ غیر محسوب ہوتا ہے۔ اس کے کبھی عدد نہ لینا چاہیے۔ یہی ثقاتِ فنِ تاریخ کا آخری فیصلہ ہے۔

۵۔ ہائے مختفی کا ہمزہ ہمیشہ غیر محسوب ہوتا ہے۔ یہ ہمزہ کبھی حالتِ اضافت میں آتا ہے مثلاً گلشنۂ باس۔ بستۂ الفت۔ کبھی بجائے یکہ مثلاً شکستۂ۔ ساختۂ۔ کبھی خطاب کی صورت میں آتا ہے۔ آمدۂ۔ رفتۂ۔ ایسا ہمزہ شمار سے باہر ہے مثلاً

جلیل	کہ این چہ چشمۂ آبِ حیات است	(۱۳۳۷)
صفی	ہست ہیں چشمۂ آبِ حیات	(۱۳۴۰)
نفیس	خانۂ ماتم حسینؑ یہ ہے	(۱۲۹۵)

۶۔ یائے معروف اور ہمزہ

صاحب جلیلاں توانذکا نے یائے معروف کے ہمزہ کا کبھی عدد نہیں لیا۔

مثلاً	اب صفائی ہوئی مضمون سے کم	(۱۲۸۹)
	ہائے قاضی کو قضا آئی آج	(۱۸۶۹)

ان دونوں مصرعوں میں صفائی۔ ہوئی۔ آئی میں ہمزہ یائے تحتانی کی شکل میں آیا ہے لیکن جناب جتیا نے اسے غیر محسوب رکھا ہے یہ ہمزہ یائے ہوتا یہ ہے یعنی ایسی (ی) جو دو ساکنوں میں ربط پیدا کرنے کی غرض سے لائی جاسکے اور دوسری (ی) جو دائرے کی شکل میں ہے، یائے معروف ساکن ہے۔ بلحاظ قاعدہ دونوں کے عدد محسوب ہونا چاہیے تھے اس لیے آئی۔ لائی۔ کھائی۔ پائی۔ ہوئی۔ سوئی۔ کھوئی۔ بینائی۔ کہربائی۔ ہرجائی وغیرہ میں (ئی) کے بیس عدد محسوب کرنا چاہیے۔ ایک ی شمار کرنا اور دوسری ی کو چھوڑ دینا درست نہیں۔ نئی اور گئی میں بھی اس کے عدد محسوب ہوں گے۔ گئی کے ۴۰ اور نئی کے ۷۰ عدد ہمیشہ محسوب کرنا چاہیے۔ گئی کے ۳۰ اور نئی کے ۶۰ عدد شمار کرنا درست نہیں۔

یائے تحتانی جیسے آئی میں صیغہ کی علامت ہے یا کسی لفظ کا جزو ہو مثلاً آئندہ، دائم یا مصادر باب تفعل سے ہو جیسے تیسیر، تائید، تزئین، آئین یا نسبتی جیسے دریائی۔ صحرائی۔ یا خطابی جیسے گلروئی، سمن بوئی۔ یا مصدری جیسے گدائی۔ دارائی وغیرہ۔ ان صورتوں میں (ئی) کے بیس عدد لیے جائیں گے کیونکہ تلفظ اور کتابت دونوں میں اس کا اظہار ہے اور اسی طرح یائے تحتانی مصائب۔ قائل۔ مائل۔ حائل۔ سائل۔ جائزہ۔ فائز۔ کائنات۔ خائف۔ لطائف۔ دائرہ۔ مائدہ۔ فوائد۔ قرائن۔ عجائب۔ غرائب وغیرہ میں اس کے دس عدد شمار میں آئیں گے۔

تسلیم ایک جگہ اسمٰعیل حسین منیر لکھنوی کی تاریخ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بعض مؤرخ مصلحت سے تاریخ کہتے ہیں جیسے منیر نے لفظ "آئی" کو اپنی یادگار بنایا ہے ؎

تاریخ اس عطیہ کی ہیں نے کہی منیر	
انگشتری زمرد یا کیسہ زر آئی آج	(۱۲۸۲)

یہاں "آئی" کے گیارہ عدد لیے ہیں۔

؎	بھیجی کمالِ شکوہ شہانہ سے آئی	(۱۲۸۲)

یہاں "آئی" کے اکیس عدد شمار میں آتے ہیں۔

پہلی تاریخ میں "آئی" بروزنِ "فاع" ہے اور دوسرے مصرع میں "آئی" بروزنِ "فعلن" ہے شاید اس وجہ سے گیارہ اور اکیس عدد محسوب ہوئے ہیں کیونکہ اساتذہ میں یہ رواج چلا آرہا ہے اور اسی کو مصلحتاً قاعدہ بنا لیا گیا۔ اگرچہ قواعد اس کی اجازت نہیں دیتے۔

تسلیم سہسوانی نے اگرچہ "ئی" کے بیس عدد لینے کا حکم فرمایا ہے لیکن عمداً تاریخ میں انھوں نے بھی اس پر عمل نہیں کیا ہے مثلاً

"آتی آتی ہے کے ۱۵" یا "آتی ہے کے ۱۲ عدد لیے ہیں اور اپنے بنائے ہوئے تاریخ گوئی کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع کی گئی ہے اس لیے یہ تحریف کاتب یا مصحح کی اس میں دخل معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کتاب ان کی زندگی میں طبع ہوتی تو ضرور اس قسم کے تسامح سے پاک ہوتی۔

ے ۔ یائے مجہول ہمزہ دار

اہلِ ایران بعض اسما و امر کے آخر الف ہو ان میں ایک یائے مجہول بڑھا دیتے ہیں مثلاً سرا سے سرائے، کشا سے کشائے۔ "سرا" سرائیدن مصدر سے اور کشا کشیدن مصدر سے امر کے صیغے ہیں۔ ان پر یائے زائدہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح پا سے پائے اور گدا سے گدائے۔ یہاں اسمائے پا اور گدا پر یائے زائدہ ہے۔

جو عربی الفاظ کے آخر ہمزہ ہوتا ہے اسے حذف کر دیتے ہیں جیسے سودا، صہبا وغیرہ مرثیت کے صیغے ہیں ان کو بغیر ہمزہ لکھتے اور بولتے ہیں اور جب یائے زائدہ اس پر بڑھاتے ہیں تو ہمزہ کو حذف کر دیتے ہیں مثلاً صہبا سے صہبائے۔ شعرا سے شعرائے۔ راستے راستے وغیرہ۔ پھر اگر ایسی یائے زائدہ پر جائے وحدت یا تنکیر وغیرہ لانا ہوتی ہے تو یائے زائدہ کو بصورت ہمزہ اور یائے ثانی کو بصورت یائے مجہول لکھتے ہیں جیسے "منتہائے رازم" "جنگ آزمائے" وغیرہ۔

مذکورہ مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فارسی زبان کے قواعد میں یائے مجہول بلا اشباع و بہ اشباع دونوں طرح سے آتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں یائے مذکور پر رسم الخط میں شوشہ بحالت اشباع نہیں لگایا جاتا بلکہ یائے مجہول اشباعی و غیر اشباعی ایک ہی طرح سے لکھی جاتی ہے۔ اشباعی حالت میں فقط اسے کھینچ کر پڑھتے ہیں۔ یائے مجہول بلا اشباع و بہ اشباع کو ذیل کی مثالوں سے سمجھئے۔ یہ دونوں تاریخیں منیر شکوہ آبادی کی ہیں ؎

۱ منیر از بہرِ تاریخش نوشتم
زیارت گاہ نقشِ پائے مسعود (۱۲۸۷)

یہاں پائے میں یائے مجہول بغیر اشباع کے ہے اور بروزن فاع ہے۔ اس کے دس عدد لیے گئے ہیں

۲ زخمۂ دانش نزد اسئے دل محبب (۱۲۷۷)

یہاں فزائے میں یائے مجہول اشباع سے ہے اور "فزائے" "فعولن" کے وزن پر ہے۔ اس کے بھی دس ہی عدد محسوب ہوتے ہیں۔ فن تاریخ میں یائے مجہول بلا اشباع اور بہ اشباع دونوں کے عدد یکساں ہوتے ہیں۔

منشی محمد حیات بخش فرحت سیتاپوری مرحوم کی ایک تاریخ ہے ؏

رفت از سرائے فانی بعالمِ بقا (۱۳۴۶)

یہاں بھی "سرائے" کے یائے مجہول کے دس عدد لیے گئے ہیں۔

لیکن اُردو میں یائے مجہول ہمزہ دار کے اعداد میں اختلاف ہے مثلاً پائے بروزن فعلن ہو تو اس کے ۲۲ عدد دینا چاہیے اور اگر بروزنِ فاع ہو تو ۱۲۔

مثلاً استاذی حضرت جلیل مرحوم کی ایک تاریخ ہے ؎

گھڑی تو ملا بجن سونے کے اپنے شاہ سے پاشے (۱۹۱۲)

پاشے بر وزن فعلن ہے اور اس کے ۲۲۳ عدد لیے گئے ہیں اور یائے مجہول کو شوشے سے لکھا گیا ہے۔

حضرت فصیح الملک مغفور کی ایک تاریخ ہے ؎

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی قصرِ عالی پائے جنت میں امیر (۱۳۱۸)

یہاں پائے بر وزن فاع ہے اور اس کے ۱۲ عدد محسوب کیے گئے ہیں اور یائے مجہول شوشے سے نہیں لکھی گئی۔ لیے۔ کیے۔ گئے۔ نئے وغیرہ میں دو "ی" محسوب ہوں گی۔ لکھیے "اٹھیے۔ بیٹھیے۔ دیکھیے۔ بھیجیے۔ پڑھیے وغیرہ میں بھی دو "ی" کے عدد لیے جائیں گے آپ نے فرمایا ہے میں کیونکہ تین تحتانیاں ہیں اس لیے تین یا کے تیس عدد شمار میں آئیں گے مثلاً

وقف شاگرد امیر لکھنوی	ع	قطرہ بھی تو جناب امیراں کو بھیجیے	(۱۳۵۵)
صفی لکھنوی	ع	قبر ہے آہ اس جگہ پر فاتحہ پڑھ دیجیے	(۱۳۵۲)
داغ دہلوی	ع	ہمکنڈ سے سے آ گئے اب حضور	(۱۳۰۷)
صفی	ع	ہے شاہ کربلا کا عزا خانہ آئیے	(۱۳۶۰)

آئیے میں تینوں تحتانیاں مکتوب ہیں اس لیے تینوں کے عدد محسوب ہوں گے۔

تسلیم کے نزدیک یہ امر مسلمہ ہے کہ آئے۔ پائے۔ روئے کی یائے مجہول کے بیس عدد محسوب کرنا چاہیئے اور حضرت جلال لکھنوی یائے مجہول کے دس عدد شمار کرنے کے حق میں ہیں۔ مؤرخ ایسی "ے" کے دونوں طرح سے دس اور بیس عدد لیتے آئے ہیں اور دونوں اپنے مشرب کے جواز میں پختہ دلائل رکھتے ہیں۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس کی اس مقالے میں گنجائش نہیں۔

جگر مرادآبادی

مالک رام

جن زمانے میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے دفتر شملے جایا کرتے تھے، یہاں کی "بزم ادب" ہر سال اچھے بڑے پیمانے پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا کرتی تھی۔ اس بزم کے کرتا دھرتا بیشتر سرکاری ملازم تھے۔ یوں معلوم ہوتا کہ جب ان حضرات کے دماغ دفتری مسلوں کی خشکی اور یبوست سے ماؤف اور بیکار ہو جاتے تو یہ اسے شعر و سخن کی رنگینی سے تازگی بخشنے کی کوشش کرتے تھے۔ ماشاءاللہ خود بزم کے اراکین میں شاعروں کی کمی نہیں تھی، لیکن مشاعرے کو موقر اور وقیع بنانے کے لیے ہر سال باہر سے بھی دو چار نامی اور مشہور اساتذہ کو دعوت دی جاتی تھی۔

اتفاق سے ۱۹۳۶ء کے مشاعرے کے موقع پر میں شملے میں تھا۔ مشاعرہ ستمبر کے آخری اتوار کے دن ہوا تھا۔ اس سے پہلے دن سہ پہر کے وقت میں اور جلیل قدوائی اور بدرالدین صاحب بورڈ بازار کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں چوڑا میدان میں ایک صاحب رکشا پر آتے ہوئے مل گئے۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے رکشا ٹھہرا لی اور بڑھ کے جلیل صاحب سے بڑے تپاک سے بغل گیر ہو گئے۔ جلیل نے میرا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ آپ جگر مرادآبادی ہیں اور خصوصی دعوت پر مشاعرے میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ شعلۂ طور کے ساتھ محمد ادیاما کی بنائی ہوئی جو تصویر[1] چھپی ہے، بالکل وہی

---

[1] یہ تصویر ادیاما مرحوم کا شاہکار ہے، بلکہ بہت حد تک ان کی عام شہرت اسی کی مرہونِ منت ہے۔ اس سے متعلق ایک لطیفہ یاد آگیا۔

ہمارے ایک دوست تھے، حمید خان۔ انھیں بھی تصویر کشی سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے ادیاما کی اس تصویر کی نقل تیار کی اور ایسی عمدہ کہ بالکل مشابہ۔ اس پر انھوں نے خود جگر سے ان کا ایک فارسی شعر لکھوایا اور دستخط لیے۔ جب میں نے یہ تصویر ان کے یہاں دیکھی، تو میری نیت خراب ہو گئی۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ انھوں نے میرا شوق دیکھ کے خود ہی اسے میرے حوالے کر دیا یا میں نے ہی کچھ حیلہ بہانہ کر کے یہ ان سے ہتھیا لی۔ بہرحال تصویر میرے قبضے میں آ گئی۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے کتب خانے کے ساتھ میں اسے اپنے عزیز دوست ملک احمد حسین مرحوم (ایڈیٹر "دورِ جدید") کے پاس چھوڑ آیا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ جب احمد حسن نے اسے دیکھا تو پوچھا: کیوں بھائی، واقعی یہ جگر صاحب کی ٹھیک شبیہ ہے۔ میں نے کہا: واہ صاحب، یہ آپ نے کیا کہا! اصل تو یہ تصویر ہے، جگر صاحب تو اسے دیکھ کر بنائے گئے ہیں یعنی یہ اصل ہے اور جگر صاحب نقل۔ پس یہ سوال تو ہو سکتا ہے کہ کیا جگر اس تصویر کے مطابق ہیں یا نہیں، لیکن آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ تصویر جگر کی ہے یا نہیں۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

افسوس کہ میرے قیمتی کتب خانے کے ساتھ یہ تصویر بھی لاہور کے ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو گئی۔ م۔ ر۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

ناک نقشہ! لیکن چونکہ اس میں محض خطوط ہیں، اس لیے اُس سے اصلیت پورے طور پر واضح نہیں ہوتی۔ میانہ قد؛ خاصا سانولا رنگ؛ چپٹی ناک؛ چھوٹی چھوٹی نیم وا آنکھیں اور ان میں سرخی کی جھلک؛ ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا؛ ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی جس میں چاول کم اور دال زیادہ تھی؛ سر پر لمبے لمبے بے ترتیب پٹھے، جو ٹوپی سے باہر نکلے پڑتے تھے؛ گلے میں سیاہ رنگ کی شیروانی اور نیچے چوڑی دار چست پاجامہ؛ سر پر سلیٹی رنگ کی بالوں والی اونچی باڑ کی ٹوپی اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا پمپ پہنے تھے۔ طبیعت میں حد درجہ بے چینی اور وحشت۔ حالانکہ وہ صرف چند منٹ کے لیے رکے لیکن اس دوران میں بھی انھوں نے جو باتیں کیں، کچھ عجیب اکھڑی اکھڑی سی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، گویا اپنے سایے سے بھڑک رہے ہوں۔ یہ تھے جگر صاحب!

اگلے دن مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔ خدا بخشے منتظمین کو، ان کی خوش انتظامی کے صدقے، یہ دس کی جگہ گیارہ بجے شروع ہوا تھا۔ تاجور تھے، جن سے پہلے کی ملاقات تھی۔ حسرت موہانی اور روش صدیقی سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ حسرت سے میرا تعارف تاجور مرحوم اور جلیل نے کرایا؛ اور دونوں نے مبالغے سے کام لیا۔ سائل صاحب دہلی سے تشریف لائے تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں بھی پہلے سے نیاز حاصل تھا۔ انھوں نے بعض پرانی غزلیں سنائی تھیں۔ زبان کے پہلو سے واقعی ان کا جواب نہیں تھا۔ احسان دانش نے اپنی نظم "مزدور کی عید" سنائی تھی۔ حسب معمول انھوں نے پاٹ دار آواز میں ترنم سے پڑھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس کے بعض مقامات ایسے دردناک تھے کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ حسرت نے مشاعرے میں چار غزلیں سنائیں۔ ہر ایک میں غالباً چھ چھ یا سات سات شعر تھے اور سب تازہ کلام۔ یہ کاغذ کے چند پرزوں پر لکھی تھیں۔ مشاعرہ ختم ہونے پر یہ کاغذ انھوں نے مجھے دے دیے تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ ناک میں تو وہ بولتے ہی تھے، اس پر ستم یہ ہوا کہ گلے میں کسی خرابی کی وجہ سے آواز اتنی نیچی تھی کہ شاید پاس بیٹھے ہوئے کسی شخص کے پلے کچھ پڑا ہو۔ اور پھر انھوں نے شعر کاہے کو پڑھے، گھاس کاٹ کے رکھ دی؛ نظم اور نثر میں کوئی امتیاز ہی نہیں رہا۔ کوئی اور ہوتا، تو ہُوٹ ہو جاتا اور بدتمیز بے فکرے اسے زبردستی بٹھا دیتے۔ لیکن ان کی بزرگی اور شاعرانہ عظمت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سب ادب کے مارے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے پڑھنے کے وقت ایک لطیفہ بھی ہوا۔

پہلی ہی غزل تھی۔ انھوں نے مطلع پڑھا۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے داد دی اور اسے پھر پڑھنے کی فرمائش کی۔ حسرت نے مطلع دوبارہ پڑھ دیا۔ حسن مطلع پڑھا؛ انھوں نے پھر داد دی اور مکرر پڑھنے کی درخواست کی۔ اب کے حسرت نے ناک کی پھننگی پر آئی ہوئی عینک کے اوپر سے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور شعر پھر پڑھ دیا۔ تیسرے شعر پر ان کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب کی جو شامت آئی، تو انھوں نے یکبارگی "واہ" کہہ کے ہاتھ اٹھایا اور پھر "ارشاد ہو" کا نعرہ لگایا۔ اب حسرت کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے دیکھا بھی نہیں اور "کوئی ضرورت نہیں" کہہ کے اگلا شعر پڑھ دیا۔ اس کے بعد کسی کو مکرر کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

جگر صاحب نے بعض پرانی غزلوں کے علاوہ ایک غیر مکمل تازہ غزل کے چند شعر سنائے تھے، جس کا یہ بے پناہ مطلع آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے ؎

آ کہ تجھ بن اس طرح، اے دوست! گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں، کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جگر کو پڑھتے سنا۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں ترنم سے کلام سنایا۔ (اب بھی وہی انداز ہے، لیکن

عمر کے ساتھ اتنا موثر نہیں رہا)۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ جی یہاں بند ہو گیا۔ میں نے اپنی عمر میں دو ہی ایسے شاعر دیکھے، جنھیں سن کے بڑے بڑے ثقہ اور تقدس مآب "ڈاڑھی بردار" مولویوں تک کو وجد آ گیا۔ ایک حفیظ جالندھری اور دوسرے جگر مراد آبادی۔

(۲)

میں ۱۹۳۶ء کے جاڑوں میں دلی آ گیا۔ یہاں میں نے ایک مختصر سا مکان قرول باغ میں، اجمل خاں روڈ پر لے لیا۔ جن لوگوں نے آج سے ربع صدی پہلے کا قرول باغ نہیں دیکھا اور اب اس کی فلک بوس عمارتیں، اس کی موجودہ چہل پہل اور گہما گہمی ہے، وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس زمانے میں یہاں کیا خاک اڑتی تھی۔ بلا مبالغہ، اجمل خاں روڈ، غالب کی "صحرا و دراں" معلوم ہوتی تھی۔ اس سڑک پر بھی گنتی کے چند مکان تھے، اس کے ایک سرے پر جامعہ ملیہ کے دفتر اور اس کے عملے فعلے کے سکونتی مکان تھے اور دوسرے سرے پر طبیہ کالج کی عمارت۔ کوئی فرلانگ بھر کی دوری پر گندہ نالہ تھا، جو یوں سمجھئے کہ تہذیب و تمدن کی آخری سرحد تھی۔ اس کے اس پار خانہ بدوش، بنجڑوں اور بازیگروں کے پھوس کے چھپر اور جھونپڑیاں تھیں اور یہ واقعہ ہے کہ لوگ اکا دکا، رات کی تاریکی تو درکنار، سورج کی روشنی میں بھی اس علاقے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہاں دن دہاڑے مسافر لٹ جاتے، بلکہ بعض اوقات قتل تک کے واقعات ہو جاتے تھے۔

خیر، چونکہ میں کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھا "جہاں کوئی نہ ہو"، اس لیے میں نے سوچا کہ اس سے بہتر اور کونسا مقام ہوگا، اور مکان اسی اجمل خاں روڈ پر لے لیا۔

میں یہاں روزانہ صبح کے وقت ایک صاحب کو تیز تیز قدم جامعہ کی طرف جاتے دیکھتا، گندمی رنگ، متوسط قد، دوہرا جسم، گول آفتابی چہرا، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، اونچی چوڑی پیشانی، بھرواں سیاہ ڈاڑھی اور مونچھیں، نیچے علی گڑھ فیشن کا پاجامہ، اوپر شیروانی اور سر پہ گاندھی ٹوپی۔ وہ جب بھی ملے، منہ میں گلوری اور بغل میں پاندان دبائے ہوئے۔ کئی مرتبہ جی میں آئی کہ آدمی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں، ان سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہیے۔ یوں بھی پڑوس کا معاملہ ہے، آخر بالکل الگ تھلگ رہ کے تو زندگی کے دن کٹنے سے رہے۔ لیکن وہی میری فطری کم آمیزی ہمیشہ مانع آئی۔ جرأت نہ پڑی کہ بڑھ کے خود اپنا تعارف کرا دوں۔ آخر، خدا معلوم کیسے، خود انھیں خیال آیا، ایک دن آمنے سامنے آتے ہوئے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔ رک گئے، علیک سلیک ہوئی، پوچھا: آپ یہاں نئے آئے ہیں، کوئی تکلیف تو نہیں۔ معلوم ہوا ان کا نام ہے محمود علی خاں۔ یہ وہی محمود علی خاں (جامعی) ہیں، جنھوں نے ہمارے ہاں سو شعروں کی جدت یا بدعت شروع کی۔ میر کے سو شعر، غالب کے سو شعر، مومن کے سو شعر ——— غرض اس طرح انھوں نے نئے پرانے شاعروں کے کوئی دس پندرہ کتابچے شائع کیے تھے۔ اس کے بعد یار لوگ اسے لے اُڑے۔ جس نے دیکھا کہ پورا دیوان چھپنا مشکل ہے۔ کون اسے چھاپے گا اور کون پڑھے گا، اس نے اپنا تعارف کرانے کے لیے یہ کم خرچ بالا نشیں نسخہ استعمال کیا اور اپنے سو شعر چھپوا کے دوستوں میں تقسیم کر دیے تاکہ سند رہیں۔ یوں چھپنے کی ہوس بھی پوری ہو گئی اور سستے بھی چھوٹے۔ چنانچہ باز کے سو شعر، گاہری کے سو شعر، اور جانے کس کس کے سو شعر چھپ چکے ہیں۔ لیکن محمود صاحب نے اس کے علاوہ متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ چونکہ انھیں انگریزی اور اردو دونوں پر پوری قدرت حاصل ہے اور آدمی بے حد محنتی ہیں، اس لیے وہ ترجمے میں بھی ہمیشہ کامیاب رہے۔

غرض، اس کے بعد ان سے تعلقات بہت گہرے اور مخلصانہ ہو گئے۔

ایک دن شام کے وقت ان کا آدمی آیا کہ "خانصاحب" بلاتے ہیں۔ میں پہنچا، تو دیکھا کہ جگر صاحب تشریف فرما ہیں، محمود صاحب

کو معلوم نہیں تھا کہ میں ان سے شملے میں مل چکا ہوں۔ جگر صاحب اور محمود صاحب کے بہت پرانے مراسم تھے، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اگر محمود اور حلیم قدوائی نہ ہوتے، تو غالباً اُن کا کلام کبھی شائع ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی، تو کم از کم اس کی یہ ضخامت نہ ہوتی۔ جگر جس طرح کے لاابالی اور بے پروا شخص ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے کبھی باقاعدگی سے اپنا کلام ایک جگہ جمع نہیں کیا۔ وہ تو خوش قسمتی سے ان دونوں صاحبوں نے شروع سے اس کی حفاظت کا اہتمام کیا، ورنہ خدا معلوم کس قدر ضائع ہو گیا ہوتا۔ چنانچہ جیسا کہ شعلۂ طور کے دیباچے میں جگر نے اعتراف کیا ہے، انھی دونوں کی بیاضوں سے یہ دیوان مرتب ہوا تھا۔

(۴)

جگر صاحب یہاں کوئی دس بارہ دن رہے اور اس کے بعد اگلے برس کے دوران میں بھی جب میرا قیام قرول باغ ہی میں تھا، اکثر یہاں آتے رہے۔ ان ایام میں مجھے انھیں اچھی طرح قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور رفتہ رفتہ ہمارے آپس کے تعلقات بہت دوستانہ اور عزیزانہ ہو گئے۔

وہ اس زمانے میں پیتے تھے اور بے حساب؛ اور ستم بالائے ستم کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جوش بھی پیتے تھے؛ لیکن ان کا یہ اصول ہے جس سے انھوں نے کبھی انحراف نہیں کیا کہ وہ دن میں ہرگز نہیں پییں گے۔ صرف مغرب کے وقت، وہ بھی دو تین جام۔ اگر کبھی مخلص دوست احباب کا مجمع ہوا، تو ایک آدھ زیادہ سہی۔ اختر شیرانی اور مجاز نے بھی کبھی کسی پابندی کی پروا نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قبل از وقت چل بسے۔ جگر کا بھی یہی حال تھا۔ ایک تو جب مل گئی، اور دوسرے جتنی چاہا، پی لی۔ پھر اس کا بھی خیال نہیں کہ کس قسم کی ہے ——— اچھی یا بری، بس شراب ہو۔ وہ تو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انھیں توبہ کی توفیق دے دی کہ انھوں نے اسے ترک کر دیا، ورنہ جو حشر ان کا ہوتا، ظاہر ہے۔ اور اب جو ان کی صحت اتنی خراب رہتی ہے، تو اس کی اصل وجہ بھی یہی اوائل عمر کی نامراد شراب نوشی اور دوسری بد اعتدالیاں ہیں۔

ایک دن سرِ شام پینے بیٹھے اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں نصف بوتل کے قریب پی گئے۔ آدھی رات کے بعد کہنے لگے: چلو، جوش کے ہاں چلیں (جو وہیں قرول باغ میں تھوڑی دور رہتے تھے)۔ ہم نے بہت کہا کہ وہ سو چکے ہوں گے، اب اس وقت آدھی رات گئے انھیں دق کرنا مناسب نہیں ہوگا، لیکن انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی، بلکہ ہمارے منع کرنے پر بگڑ گئے۔ آخر سب نے عافیت اسی میں دیکھی کہ جس طرح یہ کہتے ہیں، اسی طرح کیا جائے۔ چنانچہ آگے آگے جگر اور انھیں سہارا دیتے ہوئے محمود صاحب اور ان کے پیچھے پیچھے ہم چھ سات آدمی جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے۔ سردیوں کی ڈھلتی رات اور اس زمانے کا قرول باغ، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسا ہُو کا عالم ہوگا۔ وہ تو خیر گزری کہ کوئی پولیس کا سپاہی راستے میں نہیں مل گیا؛ ورنہ وہ یقیناً یہی خیال کرتا کہ یہ مسٹنڈے شراب پی کر کہیں کوئی واردات کرنے جا رہے ہیں یا کم از کم آوارہ گرد ہیں اور ہمیں جوش کے مکان کی بجائے تھانے پہنچا دیتا۔ اب ایک لطیفہ ہوا۔ جگر صاحب چند قدم چلیں اور سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر تقریر کرنا شروع کر دیں۔ اس پر کتوں اور سؤروں نے (جن کی اس زمانے میں یہاں بڑی کثرت تھی) اِدھر اُدھر سے نکل کر بھونکنا اور چیخنا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ اس پر ہم سب بلطائف الحیل انھیں آگے چلنے کی ترغیب دیتے۔ قصہ کوتاہ، خدا خدا کرکے وہ تین چار سو گز کا فاصلہ کوئی آدھ پون گھنٹے میں طے ہوا اور ہم لوگ چندے جوش صاحب کے مکان کے بیرونی برآمدے میں داخل ہوئے۔ یہاں پہنچتے ہی جگر نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ہڑبڑا کے آواز آئی: "کون؟" انھوں نے جواب دیا: "جگر"۔ "کون؟"۔ "ارے، ایک مرتبہ جو کہا ہے، جگر! دروازہ کھولو۔" "بھائی، ہم سو رہے ہیں؛ صبح کے وقت آنا۔" "سو رہے ہیں"! آئے بڑے سونے والے۔ ارے، ہم، ہم یہاں سردی میں باہر کھڑے

میں اور تم سوئے پڑے ہو۔ جلد دروازہ کھولو۔ یہ محمود بھی ہمارے ساتھ ہے۔" اس پر جوش غریب ہڑبڑا کر اٹھے اور انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے اگلے دن مجھ سے کہا کہ میں دروازہ یوں تھوڑی کھولنے والا تھا۔ لیکن جب جگر نے محمود کا نام لیا۔ تو میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ ورنہ محمود یوں رات کے اس وقت قطعاً نہ آتے۔ یہ اس لیے کہ محمود صاحب پیتے نہیں اور جوش صاحب کو معلوم تھا کہ وہ سنجیدہ آدمی ہیں۔

دروازے کا کھلنا تھا کہ جگر صاحب ڈبک کے کمرے میں داخل ہوئے اور اوپر کی گرم چادر پھینک انتہا ہے سے جوش کے لحاف میں گھس بیٹھے؛ جیسے وہ بہت سے اسی کی تلاش میں بھاگتے آئے ہوں۔ اور کہنے لگے: "محمود، اب کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں یہیں سوؤں گا۔ آپ بھی تشریف لے جائیے۔ میں صبح کے وقت ناشتے کے بعد آجاؤں گا۔" جوش بیچارے حیران، پریشان کہ یہ بلائے بے درماں کہاں سے نازل ہو گئی۔ وہ کہتے ہی رہے کہ "نہیں جگر صاحب! آپ جائیے محمود صاحب کے ساتھ۔" لیکن توبہ کیجیے! یہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ادھر ہم سب کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ آخر ہم نے دونوں دوستوں کو آپس میں راز و نیاز کرنے کے لیے شب بخیر کہا اور واپس چلے آئے۔

کبھی یہ بھی نہیں ہوا کہ جگر نشے کی حالت میں بالکل حواس کھو بیٹھے ہوں۔ بہکی بہکی باتیں وہ ضرور کرنے لگتے تھے۔ ابھی ایک موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں کہ یک لخت اس سے گریز کر کے کسی دوسرے مضمون پر بات چیت کرنے لگیں گے، حالانکہ دونوں میں آپس میں قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سننے والا ہکا بکا ان کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہے کہ یا الٰہی! یہ کیا! ابھی دو منٹ پہلے تو یہ غزل کی حمایت میں دلائل بیان کر رہے تھے اور اب عینک کے تالوں کی چھپان اور ان کی مختلف قسموں پر تقریر فرمانے لگے ہیں۔ لیکن ان کی بلا سے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان کا دماغ بیک وقت مختلف موضوعات کی جولان گاہ بنا رہتا ہے۔ اب اس دنگل میں کسی خاص وقت جس موضوع کا غلبہ ہو گیا، زبان پر اس کی بات آگئی۔ لیکن وہ ذہنی کشمکش بدستور جاری رہتی ہے۔ پھر اگر بیچ موضوع کی بات چیت کے دوران میں، اس دوسرے مضمون کا پلڑا بھاری ہو گیا، تو پہلا چیت ہو جائے گا اور یہ بے اختیار اسے چھوڑ کر دوسرے سے متعلق باتیں کرنے لگیں گے۔ سامع کو اس سے حیرت ہو، تو ہوا کرے؛ ان کے لیے یہ بالکل قدرتی اور معمولی اسلوب گفتگو ہے۔ اور یہ بات سرخوشی کے عالم ہی سے مخصوص نہیں تھی، وہ ہوش کے وقت بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

بہرحال واہی تباہی بکنا یا گالی دینا کبھی ان کا شعار نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ حقیقت میں ان کا مزاج دینی تھا اور اسے اصغر گونڈوی مرحوم سے انھیں خاص عقیدت رہی ہے، بلکہ یہ ان کے ہم زلف بھی تھے۔ اصغر جس پایے کے انسان تھے، ان کا ہر ایک ملنے والا اس کا معترف ہے۔ اصغر کی طرح جگر بھی حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے بیعت تھے۔ یہی سبب ہے کہ لاکھ بے عملی بلکہ بد عملی کے باوجود اساسی طور پر ان کی روح کبھی ان آلائشوں سے ملوث نہیں ہونے پائی۔ انھوں نے فسق و فجور میں کبھی لذت محسوس نہیں کی۔ جو کچھ سرزد ہوا، اضطراری طور پر۔ وہ ہوش کی حالت میں ہمیشہ پشیمان ہوتے اور ندامت محسوس کرتے اور اس سے باز رہنے کے منصوبے باندھتے؛ لیکن چونکہ کثرتِ شراب نوشی سے قوتِ ارادی حد درجہ کمزور ہو چکی تھی، اس لیے اس عزم میں کامیاب نہ ہو پاتے۔ اس میں بہت حد تک قصور ان لوگوں کا بھی ہے، جو ان کے ارد گرد ہوا کرتے تھے۔ یہ اصحاب اپنے آپ کو ان کا بڑا دوست اور خیر خواہ کہتے تھے، لیکن تھے وہ دراصل ان کے دشمن۔ جگر صاحب کہیں گئے ہیں، تو یہ حواری خود صاحبِ خانہ سے فرمائش کر کے بوتل منگوا لیں گے اور جام بھر کے جگر کے آگے رکھ دیں گے۔ اب یہ بیچارے کیا کریں! اگر کسی شخص کی اصلاح منظور ہو، تو سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اسے آزمائش میں نہ ڈالا جائے، تاکہ بتدریج اس کی قوتِ ارادی عود کر آئے اور

مفترقہ اتنی مضبوط ہو جائے کہ وہ غوغائے نمائش کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اگر آپ قدم قدم پر اس کا امتحان کرنے لگیں، اس کے چاروں طرف اس کی لغزش کے ساز و سامان جمع کر دیں اور پھر اس سے کہیں کہ ہم چاہتے ہیں، آپ اس بُری علت سے نجات حاصل کر لیں، تو یہ خیال خام ہے ؎

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن، ہشیار باش

اگر اس غریب میں ان آلودگیوں سے دامن جھٹک کر الگ ہو جانے کی قوت ہوتی، تو وہ ان حالوں پہنچتا ہی کیوں!

ان کی قوتِ ارادی کے فقدان پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جس طرح وہ اپنے آپ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، اسی طرح کسی کی دل شکنی بھی ان سے محال ہے۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ایک دن خاصی رات گئے ان کی ڈاڑھ میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت جو چھوٹا موٹا گھریلو علاج ممکن تھا، کیا گیا۔ لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ رات انھوں نے بہت بے چینی سے کاٹی۔ اگلی صبح ان کی جو شامت آئے، تو مختصر سا ناشتہ کر کے یہ اکیلے طبیہ کالج چلے گئے کہ وہاں کسی حکیم صاحب سے دکھا کے دوائی لے آئیں۔ وہاں جو پہنچے، تو لڑکوں نے پہچان لیا۔ اب کیا تھا، وہ انھیں گھیر گھار کے کالج کے ہال میں لے گئے اور دو گھنٹے تک ان سے کلام سنتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاج تو خیر کیا ہوتا، جب یہ وہاں سے لوٹے ہیں، تو ان کی مظلوم صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ نہ صرف دانت کا درد بدستور موجود تھا، بلکہ اس پہ دردِ سر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ گئے سے منہ زور سے پچھوانے، نماز گلے پڑی۔ میں نے پوچھا کہ آخر آپ نے یہ کیوں کیا، انکار کر دیا ہوتا۔ تو رونی صورت بنا کے کہنے لگے: بھائی، میں کیا کرتا، وہ طالب علم اتنی محبت سے اصرار کر رہے تھے، کہ مجھ میں انکار کی ہمت نہ رہی۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔

جگر صاحب کے ساتھ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شخص رہتا ہے۔ سفر ہو یا حضر، انھیں کسی بھروسے کے آدمی کی ضرورت ہوتی، جو ان کے روزمرہ کے معاملات کی نگرانی کر سکے، ان کی ضروریات کا خیال رکھے، روپے پیسے کا حساب رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مزاج میں سکون اور اطمینان نہیں؛ بات جلد بھول جاتے ہیں؛ انتظامی صلاحیت شروع میں شاید کچھ رہی ہو، اب وہ بھی نہیں۔ اس لیے اگر دیکھ بھال کے لیے کوئی جو کس آدمی ان کے ساتھ نہ رہے، تو خدا جانے، کیا ہو جائے۔ اب اگر یہ آدمی مخلص اور دردمند اور بے غرض دوست ہوا، تو اس سے انھیں بے حد آرام ملتا ہے، اور کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اوقات آدمی کے انتخاب میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کا حادثہ چند برس ادھر پیش آیا۔ یہ صاحب مستعد تو بہت تھے، لیکن ہتھے چڑھ رہے آج یہ چیز غائب کر دی، کل وہ۔ جگر کے دوستوں نے انھیں بہت متنبہ کیا کہ یہ آدمی اعتماد کے قابل نہیں، لیکن انھوں نے کسی کی بات پہ کان نہ دھرا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اور تو اور، جگر صاحب کو بھی ان کی کارگزاریوں کا یقین آ گیا۔ کوئی اور ہوتا، تو اس کے بعد انھیں ایک لمحہ بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہ کرتا۔ لیکن اس کے باوجود کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس قماش کے بزرگ ہیں، یہ ان سے معذرت کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ ایک دن یہ غسل خانے جانے والے تھے، چاہتے تھے کہ کلائی کی گھڑی اتار کر باہر بیٹھنے کے کمرے میں رکھ جائیں۔ لیکن یہاں وہ ذات شریف موجود تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ گھڑی ان کی غیر حاضری میں غائب ہو جائے گی۔ اب یہ تذبذب میں کہ کریں تو کیا۔ گھڑی کو غسل خانے میں اندر لے جا نہیں سکتے اور باہر چھوڑ جانے میں جو خطرہ ہے، وہ سامنے موجود ہے۔ آخر جب مزید انتظار ناممکن ہو گیا، تو جھنجھلا کے گھڑی ان صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا: اچھا، تو یہ بھی آپ لے لیجئے۔ اور خود غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

میں سمجھتا ہوں، اگر پیٹ پالنے کی مجبوری نہ ہوتی یا بعض دوسری ذمہ داریاں ان کے سر پر نہ ہوتیں، تو یہ کبھی کوئی کام نہ کرتے۔ ان کی ہستی کا خمیر جن اجزا سے اٹھایا گیا ہے، اس میں کاہلی و سستی کچھ ضرورت سے زیادہ مقدار میں پڑ گئی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں تک شعر کا تعلق ہے، وہ دائمی روح القدس کے شاگرد ہیں۔ لیکن جہاں دنیا کا معاملہ ہے، بالکل کوڑ دن ہیں۔ وہ ہفتوں اور مہینوں کبھی تنکا اٹھا کے نہیں توڑیں گے۔ اس پر ایک بات یاد آ گئی۔

(۴)

۱۹۳۴ء میں جگر صاحب بھوپال گئے۔ محمود صاحب ان دنوں وہیں ملازم تھے۔ یہ گرمی اور برسات کے کوئی چھ مہینے ان کے پاس ٹھہرے۔ شہر کے کئی صاحب ذوق حضرات روزانہ شام کو اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر محمود صاحب کے مکان پر جمع ہوتے اور جگر صاحب کی صحبت کا لطف اٹھاتے۔ ادبی گپ اور لطیفہ بازی ہوتی۔ شعر و شاعری کا دور چلتا اور بالعموم یہ پرلطف اجتماع رات کے نو بجے سے لے کر صبح کے دو دو تین تین بجے تک رہتے۔ اب ظاہر ہے یہ چند ایک دن کی بات تو تھی نہیں۔ روزانہ پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تک تمام آداب و تکلفات کے ساتھ ایک جگہ بیٹھے رہنا ہفت خواں سے کم نہیں تھا، بالخصوص جب کہ ان میں بعض اصحاب اچھے خاصے سن رسیدہ تھے۔ کسی بے فکرے کو سوجھی کہ ایک ایسی انجمن بنائی جائے۔ جس میں ادب آداب کے سب قیود اٹھا دیئے جائیں تاکہ سب احباب آزادی اور بے تکلفی سے اپنا وقت گزار سکیں۔ سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔

انجمن کا بنیادی اصول یہ قرار پایا کہ آج کل دنیا میں حقیقی بے چینی ہے، اس کی علتِ غائی سرعتِ رفتار ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ پرانے زمانے میں لوگ بالعموم پیدل جاتے آتے تھے، تو سب طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ شروع میں سواری کا رواج صرف معذوروں اور بیماروں کے لیے تھا۔ اس کے بعد ان چیزوں کا غلط استعمال ہونے لگا، اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ان غریبوں کو تو کوئی پوچھتا تک نہیں اور ہر طرح سے چاق چوبند اور ہٹے کٹے لوگ گاڑیوں اور موٹروں اور ہوائی جہازوں میں اڑے پھرتے ہیں۔ اس برق رفتاری نے دنیا میں جنگ و جدال اور ہلاکت و تباہی آسان کر دی ہے، کیونکہ جب تک یہ سریع سامانِ نقل و حرکت معرضِ وجود میں نہیں آئے تھے، جنگ شاذ و نادر ہی ہوتی تھی، اور اگر کارِ قضا کبھی ہو بھی گئی، تو اس کی تباہ کاری کا میدان بہت محدود رہتا تھا۔ چونکہ فوج، سامانِ جنگ، اسلحہ، رسد وغیرہ کی نقل و حمل میں بڑی دشواریاں تھیں، اس لیے اگر ملکوں میں آپس میں کوئی اختلاف پیدا بھی ہو جاتا، تو وہ ان مشکلات کے پیشِ نظر حتی الوسع بات بڑھانے سے اجتناب کرتے اور ایک دوسرے سے مصالحانہ گفتگو کر کے فیصلہ کر لیتے تھے۔ جنگ صرف اس وقت ہوتی، جب اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا تھا۔ پھر چونکہ مسافت طے کرنے میں لامحالہ کافی وقت لگتا تھا، اس لیے حملہ آور فوج کے منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے دوسرا ملک بھی کم و بیش تیار ہو جاتا۔ یوں فریقین کی طاقت یکساں ہو جانے سے کسی ملک کو خاص نقصان نہ رہتا اور صلح صفائی پر خاتمہ ہو جاتا۔

لیکن اب کیا ہے؟ فاصلے کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہی۔ صبح کا ناشتہ دلی میں کرو، تو ہوائی جہاز میں بیٹھ کے دوپہر کا کھانا تہران میں کھاؤ۔ اسی طرح لڑائی بھی آسان ہو گئی ہے۔ ابھی الٹی میٹم دیا اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد غنیم کے ملک پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس سے بڑی تباہی آتی ہے۔ شہر اور بستیاں پل بھر میں ویران ہو جاتی ہیں۔ بے گناہ اور ناکردہ کار لوگ گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ سارا عذاب ہم پر اسی سرعتِ رفتار کی بدولت نازل ہوا ہے۔ جب تک دنیا کاہلی جیسی نعمتِ خداوندی کی قدر کرتی رہی، سب کی زندگی عیش و عشرت اور آرام و آسائش سے معمور تھی۔ جب لوگوں نے کفرانِ نعمت کیا، تو بے چینی اور پریشانی کا شکار ہو گئے۔ اب بنی نوعِ انسان کو کامل

ہلاکت سے بچانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اسے کاہلی جیسی نعمتِ الٰہی کی طرف واپس بلایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے امن پسند لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سکون اور کاہلی کی تبلیغ کریں تاکہ مخلوقِ خدا سرعتِ رفتار کے ہاتھوں لائی ہوئی مصیبت سے نجات پا سکے۔

جب اس اصول پر سب کا اتفاق ہو گیا، تو چند "امن پسند باشندگانِ بھوپال" نے یہ اقدام کیا کہ ایک "انجمن الکہلا" (فضلاء کے وزن پر کاہل کی جمع کہلا) کی بنیاد رکھی اور باقی دنیا کے امن پسندوں کو دعوت دی کہ وہ بھی ہر جگہ اسی طرح کی انجمنیں قائم کر کے اس مقصدِ اعلیٰ کے حصول میں تعاون کریں۔ بھوپال کی صدر انجمن کا دفتر (دارالکہلا) محمود صاحب کے سکونتی مکان کا وہی کمرہ قرار پایا، جہاں جگر مقیم تھے۔ فرش پر بھوپال کی خاص موٹی دری تھی اور اس پر ایک دبیز گدہ ڈال دیا گیا تھا جس پر سفید براق چاندنی بچھی رہتی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انجمن میں داخلہ آسان تھا اور ہمہ شما سب اس کے رکن بن گئے تھے۔ بلکہ اگر کوئی شخص رکنیت کی درخواست کرتا، تو انجمن کے عظیم الشان مقاصد پر ایمان اور ان کے مطابق عمل کرنے کی خواہش اور قابلیت معلوم کرنے کے لیے اس کی کاہلی کا امتحان لیا جاتا۔ اگر وہ اس امتحان میں پورا اترتا، تو اسے بطور رکن قبول کر لیا جاتا۔ داخلے کی فیس ایک تکیہ تھی۔ جس دن کوئی شخص رکن منتخب ہو جاتا، وہ گھر سے ایک تکیہ لے آتا اور اسے "دارالکہلا" میں ڈال دیتا۔

انجمن کے صرف چار عہدیدار تھے۔ جناب جگر، صدر: یہ "صدر الکہلا" تھے۔ نائب صدر جناب حسرت لکھنوی تھے۔ انھیں "نائب الکہلا" کہتے تھے۔ ان حضرات کو صدر اور نائب صدر اس لیے نہیں چنا گیا تھا کہ یہ بہت اچھے شاعر تھے بلکہ انھوں نے اپنی غیر معمولی "کاہلانہ" صلاحیتوں سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں اور اس عہدے کی کڑی ذمہ داریوں کو سرانجام دینے کے پوری طرح قابل ہیں۔ تیسرا عہدہ "ناظم الکہلا" کا تھا۔ اس پر محمود صاحب کا تقرر ہوا تھا۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ "دارالکہلا" میں ہر طرح کا انتظام کریں، اجلاس کے لیے مطلوبہ اشیا مہیا کریں، روزانہ کارروائی کا پروگرام بنائیں وغیرہ۔ چوتھے "نقیب الکہلا" کہلاتے، جنھیں آپ سارجنٹ ایٹ آرمز (SEARGENT AT ARMS) کہہ سکتے ہیں۔ اس عہدے پر جناب عزم بنارسی فائز تھے۔ ان کا فرض تھا کہ یہ صدر انجمن کے مختلف احکام بلند آواز سے حاضرین تک پہنچایا کریں۔ چونکہ یہ بڑے لمبے تڑنگے اور بلند آواز تھے، اس لیے یہ عہدۂ جلیلہ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان عہدہ داروں کے علاوہ اکیس ارکان تھے، جن میں بھوپال کے بعض مشہور اور معزز اصحاب وقت شامل تھے۔ مثلاً میاں محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ، سید علی اکبر صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ صحت عامہ و تعلیمات، جناب احمد اللہ خاں شائق سپرنٹنڈنٹ جیل، واصف فوائجی، استاد ذکی بھوپالی، فکرتی بھوپالی، سروش بھوپالی، باسط بھوپالی، شعری بھوپالی وغیرہ۔ ایک اور بات۔ ہر ایک رکن کو اس کی کسی ذاتی خصوصیت کی بنا پر خاص خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا اور اجلاس میں وہ اسی نام سے مخاطب کیے جاتے تھے۔ مثلاً جناب مہدی صاحب اپنی بزرگی اور مشفقانہ رویے کی وجہ سے "ابو الکہلا" کہلاتے تھے۔ فکرتی صاحب کی چونکہ تھوڑی سی مگر نمایاں توند تھی، اس لیے انھیں "قبۃ الکہلا" کا خطاب دیا گیا۔ سید علی اکبر چونکہ دراز قد تھے، اس لیے "طویل الکہلا" کہلاتے۔ ایک صاحب کا ناک نقشا خوبصورت اور رنگ بھی سانولا سلونا تھا، یہ "ملیح الکہلا" تھے؛ اور ان کے مقابلے میں ایک دوسرے صاحب اپنے سفید شلجمی رنگ کی وجہ سے "صبیح الکہلا"۔ ایک صاحب چائے میں شکر بہت پیتے تھے، بلکہ داؤ لگے، تو دوسروں کی آنکھ بچا کر ایک آدھ چمچہ یوں بھی منہ میں ڈال لیتے تھے۔ اس لیے انھیں "لذت الکہلا" کا خطاب عطا ہوا۔ پھر چونکہ پورا خطاب زبان سے ادا کرنا بھی کاہلی کے خلاف سمجھا گیا، اس لیے تخفیف کر کے یہ حضرات محض "صدرل" "قندل" وغیرہ ہو کے رہ گئے۔

انجمن کے اجلاس شام کے نو بجے سے صبح کے تین بجے تک ہوتے تھے۔ "اجلاس" اس حالت کا نام تھا کہ ارکین عظام اپنے اپنے تکیے پر سر رکھے لیٹے رہتے ہیں۔ کاہلی کے معنی خوابِ غفلت کے نہیں تھے۔ اس لیے اجلاس کے دوران میں سونا ممنوع تھا۔ اگر اجلاس ہو رہا ہو، تو کوئی لیٹ سکتا تھا یا پھر کھڑا ہو سکتا تھا؛ بیٹھنا سخت ترین جرم سمجھا جاتا تھا، کیونکہ یہ فعل کاہلی کے سراسر منافی تھا۔ اگر کوئی صاحب اس جرم کے مرتکب ہوتے، تو انھیں یہ سزا دی جاتی کہ وہ تمام دوسرے ارکین کی خدمت بجالائیں مثلاً پانی پلانا، پان کھلانا، اگالدان اٹھا کے دینا، چلم بھرنا وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی "کاہل" اجلاس کے دوران میں "دارالکھلا" میں تشریف لاتے۔ تو چونکہ بیٹھنا ممنوع تھا اس لیے وہ کھڑے کھڑے جسم کو تستے اور دھم سے اپنے تکیے پر گر پڑتے۔

روزانہ کاہلی کے عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے۔ ایک دن "دارالکھلا" لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ کسی "کاہل" کا ہاتھ جو لگا تو چلم ان کے اوپر الٹ گئی۔ لیکن مجال ہے جو انھوں نے کسی تشویش یا بدحواسی کا اظہار کیا ہو۔ بس ایک کروٹ لی، انگارے ان کی چھاتی پر سے نیچے گر گئے اور وہ اسی طرح اطمینان سے لیٹے رہے۔ لیکن جب "صدر ل" نے دیکھا کہ اس طرح فرش میں آگ لگ جانے کا خطرہ ہے، تو انھوں نے اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس پر لوگ اٹھ دوڑے اور انگارے اٹھا کے بجھا دیے گئے۔

اجلاس میں وہ سب کچھ ہو سکتا تھا، جو تفریح کی ذیل میں آتا، بشرطیکہ اس سے کاہلی کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ اور شعر و شاعری تو روزانہ ہوتی تھی۔ چونکہ لیٹے لیٹے شعر پڑھنا اور داد دینا مشکل تھا، اس لیے جب شعر کی ترنگ اٹھتی، تو کوئی رکن یہ تجویز پیش کر دیتا کہ اب تھوڑی دیر کے لیے شعر و شاعری کا دور ہو جائے، تو "صدر ل" اجلاس ملتوی کر دیتے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ اب لوگ اٹھ کے بیٹھ سکتے ہیں۔ ماشاء اللہ سب ارکین سخنور یا کم از کم سخن سنج تو تھے ہی، ایک دوسرے سے مقابلے کے جوش میں طبیعت پر خوب زور دے دے کر شعر کہتے۔ ہر ایک شخص روزانہ اپنا تازہ کلام پیش کرتا۔ یہ فضا جگر صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے چمکانے بلکہ ابھارنے میں بھی بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان کی بعض مشہور اور بلند پایہ غزلیں اسی "دارالکھلا" کے دور میں کہی گئی تھیں۔ مثلاً حسبِ ذیل غزلیں اسی زمانے کی یادگار ہیں:۔

۱۔ جو اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
۲۔ نظر ملا کے، مرے پاس آ کے لوٹ لیا
۳۔ ہجومِ تجلی سے معمور ہو کر
۴۔ عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ
۵۔ حسنِ معنی کی قسم، جلوۂ صورت کی قسم!
۶۔ دل حریفِ حال دے حال نہیں
۷۔ غمِ عاشقی کا صلا چاہتا ہوں
۸۔ محبت میں یہ کیا ستم دیکھتے ہیں!
۹۔ جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے
۱۰۔ سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے
۱۱۔ تڑپ کر دل انھیں تڑپا رہا ہے

۲۱۔ وال کو جب دل سے راہ ہوتی ہے۔

وغیرہ

بھوپال میں برسات کے موسم میں بارش بہت شدید ہوتی ہے۔ یہاں کا سالانہ اوسط غالباً (۶۰) انچ ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب موسلا دھار بارش گھنٹوں رہتی اور گھر سے باہر پاؤں رکھنا محال ہوتا، سب کے سب "کاہل" وقت کی پوری پابندی سے بلا ناغہ دارالکاہلا میں جمع ہوتے۔ ادھر نو بجنے کے قریب ہوئے کہ ہر ایک پانی میں شرابور چلا آ رہا ہے۔ اب یہ "ناظم" کا فرض تھا کہ ان کے گیلے کپڑے اتروائے اور ان کی جگہ خشک کپڑے مہیا کرے۔

یوں چھ مہینے تک ہر رات تین تین بجے تک کی غیر حاضری سے ان لوگوں کے گھروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جو اصحاب متاہل تھے، ان میں سے بعض کی بیویوں نے تو یہ باور کرنے سے انکار کر دیا کہ جگر کوئی شاعر ہے، جس کے پاس یہ حضرات جا کے بیٹھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہو نہ ہو، یہ کوئی طوائف ہے، جس کے کوٹھے پر جا کے تم لوگ روزانہ رنگ رلیاں کرتے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد اصحاب کو جگر کو ساتھ لے جا کے ان کی طلعتِ زیبا اپنی بیویوں کو دکھانا پڑی، تاکہ ان کا اطمینان ہو جائے۔

شہر کے لوگ جگر کو دعوتوں میں بلاتے تھے۔ اس سے نہ صرف انہی کا وقت ضائع ہوتا، بلکہ ان کی غیر حاضری سے انجمن کی معمولی سرگرمیوں میں بھی بہت کمی بلکہ بے لطفی ہو جاتی تھی۔ کاہلوں کو یہ کسی عنوان منظور نہیں تھا۔ اس لیے غور و خوض کے بعد اس کا سدِّ باب یوں کیا گیا کہ انجمن نے یہ قرارداد منظور کی کہ چونکہ دعوتوں سے عام طور پر کاہلی کے جذبے کو نقصان پہنچتا ہے، جس کی قربانی کسی صورت گوارا نہیں کی جا سکتی، اس لیے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ اگر کوئی صاحب "صدر سل" کو چائے یا کھانے کی دعوت دیں، تو ان کے ساتھ بقیہ سب اراکین کو بھی مدعو کریں۔ یہی نہیں، بلکہ رات کے کھانے کی صورت میں، اس دن، رات کا "اجلاس" بھی نو سے تین بجے تک میزبان صاحب ہی کے مکان پر منعقد ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہ صرف ان اصحاب کے اکل و شرب کا انتظام کریں بلکہ ان کے بیٹھنے اور رات بھر بیٹھنے کے لیے اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی خالی کر دیں۔ بے شک، اس پابندی سے دعوتوں میں بہت کمی ہو گئی، لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی منچلا یہ تمام شرائط قبول کر کے دعوت کر ہی دیتا تھا۔

جب رات کے تین بجے اجلاس ختم ہوتا، تو اس سے پہلے بے دودھ کی چائے کا دور چلتا، جو پیالیوں کی بجائے فنجانوں میں پی جاتی تھی۔

اس انجمن کا ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا تھا، جو یقیناً اب بھی اکثر "کاہلوں" کے پاس موجود ہو گا۔

اس انجمن کو درہم برہم ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ جو نیک مقاصد سامنے رکھ کے یہ بنائی گئی تھی، افسوس، وہ تو پورے نہ ہوئے۔ دنیا کی اور بے شمار عمدہ تحریکیں بھی ناکام رہی ہیں اور سچ پوچھیے تو اس دنیا نے ازل سے نیکیوں کی قدر کہاں کی ہے۔ اس لیے محض اس ایک انجمن کا ماتم بے کار ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج بھی کوئی اس طرح کی انجمن یا جماعت قائم ہو جس کا طرۂ امتیاز "کاہلی" قرار پائے، تو اسے جگر صاحب سے زیادہ فعال صدر میسر نہیں آ سکتا۔ سچ ہے، یہ خدا کی دین ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

(۵)

جگر کا تعلق ایک علمی خاندان سے ہے۔ بزرگوں کا وطن دراصل دلی تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع، شاہجہان کے استاد تھے۔ جانے کس بات پر عتابِ شاہی نازل ہوا اور وہ ترکِ وطن کر کے مراد آباد میں آ مقیم ہوئے۔ جگر کو شاعری گویا ورثے میں ملی۔ دادا حافظ محمد نور شاعر تھے۔ وزیر تخلص تھا۔ والد مرحوم مولوی بزرگ علی بھی شاعر تھے۔ نظر تخلص کرتے اور ناسخ کے شاگرد رشید وزیر لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ خود جگر نے ابتدا میں چندے منشی حیات بخش رسا کو کلام دکھایا، لیکن پھر داغ سے رجوع کیا، جو رسا کے بھی استاد تھے۔ داغ کی وفات (۱۹۰۵ء) کے بعد کچھ دن منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی اصلاح لی۔

جگر کی ایک خصوصیت قابل تعریف ہے۔ انھوں نے غزل کے سوائے کچھ نہیں کہا؛ بلکہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ کچھ اور کہتے، تو اس میں اس حد تک کامیاب بھی نہ ہوتے۔ چونکہ ان کی افتادِ طبع بھی غزل کے مناسبِ حال، اس لیے ان کا کسی اور صنفِ سخن پر توجہ کرنا گویا اپنی صلاحیتوں کے غلط استعمال کے مترادف ہوتا۔ ان کا اپنے آپ کو غزل سے مخصوص کر لینا ان کے لیے بھی اچھا رہا اور غزل کے لیے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو میں غزل اتنی ہی پرانی ہے، جتنی خود یہ زبان۔ بظاہر اب اس میں کوئی جدت اور تازگی ممکن نہیں، کیونکہ کون سا ایسا مضمون یا موضوع ہے، جسے متقدمین بیان نہ کر گئے ہوں۔ پس اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جگر کا کلام بھی وہی پرانے رنگ کی چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا اسلوب اور لب و لہجہ اور کس بل خاص ان کی اپنی چیز ہے۔ اور چونکہ زمانے کا مذاق بدل گیا ہے، خود غزل کی ہیئت زبان اور اس کے موضوع بلکہ مقصد تک سے متعلق نئے نئے تجربے ہونے لگے ہیں، اس لیے اب یہ توقع کرنا کہ پھر کوئی جگر کا سا غزل گو شاعر پیدا ہوگا، امید موہوم سے زیادہ نہیں۔

ان کے کلام میں دو مختلف رنگوں کا امتزاج ہے۔ جرأت اور داغ کی مادیت بھی ہے اور مومن کی معنویت بھی۔ جگر کا مزاج ان تینوں سے ملتا جلتا ہے۔ جرأت اور داغ نے عشقِ جسمانی کی جو تصویریں اپنے کلام میں پیش کی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان کے ہاں کوئی پیچیدگی نہیں۔ وہی روزمرہ کی باتیں ہیں، جو آئے دن ہم میں سے ہر ایک کے تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ جگر نے ان دونوں پر یقیناً ترقی کی ہے؛ ایسی کہ بسا اوقات پڑھنے والے کا ذہن شعر کی مادیت کا پوری طرح احاطہ بھی نہیں کر پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ان دونوں کی سی صاف عریانی نہیں، بلکہ وہ اکثر اپنا مدعا ایسا پردے اور رمز سے بیان کر جاتے ہیں کہ انسان پر اس کی عارضی ہیجانیت اور پیش پا افتادگی تک گراں نہیں گزرتی اور وہ اس پر خاص توجہ دیے بغیر آگے گزر جاتا ہے۔

مومن کے ہاں حسن و عشق کی تصویریں زیادہ گہرے رنگ میں ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کے اختیار میں نہیں۔ ان کے کلام سے پوری طرح لذت یاب ہونے کے لیے لازم ہے کہ نہ صرف قاری کے ذہن کی تربیت ایک خاص فکری ماحول میں ہوئی ہو، بلکہ اس نے "فسق و فجور" کا کچھ نظری یا عملی تجربہ بھی کیا ہو۔ مومن نے زمانۂ ہجر و وصال کی مختلف وارداتوں اور لاگ اور لگاوٹ کی گوناگوں کیفیتوں کا جو نفسیاتی نقشہ پیش کیا ہے، اس کا جواب نہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ہاں ایک خاص طرح کا لفظی اشکال ہے اور اس کا تعلق فی الاصل بیشتر ان کے لہجے سے ہے، جس سے بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے وہ ان مضامین کے ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں، جو مومن کا طرۂ امتیاز ہیں۔ نہ صرف یہی، بلکہ ان کے ہاں لفظی اشکال نام کو نہیں، اس لیے ان کی بات فوراً ہر ایک کی سمجھ میں بھی

آ جاتی ہے۔

شراب کے مضامین جنھیں خمریات کا نام دیا گیا ہے، جیسے کچھ ان کے کلام میں بیان ہوئے ہیں، آپ کو اردو میں بہت کم کسی اور شاعر کے ہاں ملیں گے۔ ریاض خیر آبادی کی خمریات مشہور ہیں۔ لوگ داغ کی بھی اس باب میں تعریف کرتے ہیں، حالانکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ ریاض اور داغ دونوں کے ہاں صد درجہ سطحیت ہے۔ میں ان دونوں کی قادر الکلامی کا انکار نہیں کر رہا ہوں۔ دونوں استاد ہیں؛ اور زبان کی رنگینی اور شوخی میں تو ان کا جواب نہیں۔ لیکن یہاں گفتگو خمریات سے ہے۔ فقرہ چست کر دینا یا پھبتی کہہ لینا اور بات ہے، اور سرخوشی کے عالم میں اپنے اندرونی احساسات و دلی تاثرات کا بیان الگ چیز ہے۔ وہ کیفیت اور سرور جو صرف ایک رند میکش ہی محسوس کر سکتا ہے، نہ ریاض کے بس کی بات ہے، نہ داغ کی؛ کیونکہ کبھی ایک قطرہ بھی ان دونوں کے حلق سے نیچے نہیں گزرا۔ اس پہلو سے جو مزہ جگر اور جوش کے کلام میں ہے، وہ آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ غالب بھی شاذ و نادر جب کبھی اس طرح کے مضامین لکھتا ہے، تو ڈوب کر۔ اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ بھی سنی سنائی باتیں نہیں لکھتا، بلکہ ذاتی واردات بیان کرتا ہے۔

بے شک یہ ضروری نہیں کہ انسان جو لذت محسوس کرے، اسے ہمیشہ بیان کر لینے پر بھی قادر ہو۔ کئی لطیف جذبات اور احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ زبان ان کے کامل اظہار سے قاصر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ کو عجزِ بیان کی مثالیں شراب پینے والوں کے ہاں بھی مل جائیں گی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو گا کہ انسان نے کسی کیفیت کا مزہ سرے سے کبھی تجربہ کیا ہی نہ ہو اور وہ اسے کماحقہٗ بیان کر سکے۔

میں نے بارہا جگر کو شعر کہتے بلکہ پوری پوری غزل کہتے دیکھا ہے۔ آپ نے وہ داغ کا شعر بیچنے کا لطیفہ تو ضرور سنا ہو گا؛ جگر کو بھی اس طرح کا تجربہ نہیں ہوا۔ احباب کا مجمع ہے، مجلس جمی ہوئی ہے، لطیفے اور ہنسی مذاق کی گفتگو ہے، فقرے بازی اور گپ شپ ہو رہی ہے کہ کسی نے کہا: "جگر صاحب، اس مصرع پر مصرع یا اس شعر پر شعر تو کہیئے۔" اگر ان کی طبیعت کسی وجہ سے بالکل ہی غیر حاضر نہیں، تو انھیں گرہ لگانے یا شعر کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہو گا اور اگر مجمع واقعی معقول لوگوں کا ہوا، تو وہ غزل بھی پوری کر دیں گے۔

انھیں درست مشورہ تک قبول کر لینے میں بھی عذر نہیں ہوتا۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے ؎

"عرضِ غم نہ کر، اے دل!" دیکھ، ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ اُونہہ کر کے، سُن لیا جواب اُن کا!

پہلے مصرعِ ثانی میں "اونہہ کہہ کر" تھا۔ ایک دن وہ یہ غزل سنا رہے تھے، تو میں نے ان سے کہا کہ اس کی جگہ "اونہہ کر کے" بنا دیجیے۔ کہنے لگے: وجہ؟ میں نے جواب دیا کہ "اونہہ" کوئی مستقل کلمہ نہیں، جس کے لیے "کہنا" کہا جائے، بلکہ یہ ایک آواز ہے، اس کے لیے "کرنا" ہی مناسب ہے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اس کے بعد جوش سے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ جوش نے میری تائید کی، اس پر انھوں نے "اونہہ کر کے" بنا دیا۔

اسی طرح ایک اور موقع پر (شعر مجھے اس وقت یاد نہیں) میرے کہنے پر انھوں نے "اچھلنا" کی جگہ "ابھرنا" بنا دیا۔ اس سے خودستائی مقصود نہیں، بلکہ مدعا یہ ہے کہ باوجود صفِ اول کے غزل گو اور شاعر ہونے کے ان میں وہ غلط پندار نہیں، جو ہمارے بعض "اساتذہ" کا نمایاں شعار رہا ہے۔

(۶)

میں ۱۹۴۳ء کے اواخر میں دلی سے اور اس کے بعد ملک ہی سے باہر چلا گیا اور ایک لمبے عرصے تک باہر رہا۔ اس زمانے میں جگر سے براہِ راست تعلقات بالکل منقطع ہو گئے (یوں بھی وہ خط و کتابت کے زیادہ عادی نہیں)۔ البتہ سنتا رہا کہ اب بفضلہٖ انھوں نے شراب سے توبہ کر لی ہے، حج بھی کر آئے ہیں، اور بہت متانت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۱ء کے آغاز میں اچانک مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں متعدد اور احباب کے محمود صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے: جگر آج کل یہیں کراچی میں ہیں۔ میں نے کہا: چلو، ان سے ملیں۔ شام کا وقت تھا کہ ہم دونوں ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ زینے پر چڑھتے ہوئے میں نے محمود صاحب سے کہا کہ آپ میرا نام نہ لیجیے گا، دیکھیں، پہچانتے ہیں یا نہیں۔ اوپر پہنچے، تو دیکھا کہ جگر صاحب کرسی پر براجمان ہیں اور ارد گرد حسبِ معمول آٹھ دس آدمی کرسیوں اور مونڈھوں اور تخت پر بیٹھے ہیں۔ بجلی کی روشنی اچھی خاصی تیز تھی۔ محمود صاحب سے علیک سلیک ہوئی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ سر کو کوئی (۲۰، ۲۵ درجے) دہنی جانب جھکا کر چندھیائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پیشانی کے بل کہہ رہے تھے کہ حافظے کے ننھے اور شکستہ تار تیزی سے جمع ہو رہے ہیں۔ بارے، دیر نہیں لگی۔ "ارے، مالک رام ہیں!" کہہ کے کھڑے ہو گئے۔ تپاک سے معانقہ کیا اور پوچھا: "بھائی، بہت دن کے بعد ملے۔ کہو، کیسے ہو؟" میں نے کہا: صاحب، داد دیتا ہوں آپ کے حافظے کی کہ چودہ پندرہ برس کے بعد یوں آسانی سے پہچان لیا، حالانکہ وہ عالم اور تھا اور اب اور ہے۔" کہنے لگے: "اس میں کسی حد تک آپ بھی معاون ثابت ہوئے۔ آخر انسان کی شخصیت اتنی جاندار تو ہو اور وہ اتنا پائیدار اثر تو چھوڑ جائے کہ دوسرا شخص چاہے بھی، تو اسے بھلا نہ سکے۔" چونکہ میں جانتا ہوں کہ جگر تملق کے روادار نہیں اور لوگوں کی بے جا مدح ان کا شعار نہیں، اس لیے ان کی اس بات سے مجھے خوشی محسوس ہوئی۔

جگر کی شخصیت بڑی پیاری اور دل آویز ہے۔ دل کے صاف، زبان کے کھرے، وہ کسی کے برے میں نہیں۔ میں نے کبھی کسی کی غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی۔ صرف یہی نہیں، وہ دوسرے کے صریح نقص کی جگہ بھی اس کی خوبیوں کا بیان کریں گے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ دوسرے کے نقص کی ایسی توجیہ کرتے ہیں کہ وہ نقص ظاہر میں کم دکھائی دینے لگتا ہے۔ مثلاً ہمارے ایک شاعر دوست عقیدے کے لحاظ سے دہریے ہیں۔ وہ پوری بے باکی سے جا بیجا اپنے اس عقیدے کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور انھوں نے نظم و نثر میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ جگر سے ان سے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا: کاش ، ان کی زندگی کا کم از کم یہ پہلو ہی درست ہوتا۔ کہنے لگے: بھائی، دلوں کے بھید جاننے والا تو خدا ہے، لیکن جس تندی اور شدت سے وہ اپنے الحاد کا اظہار کرتے ہیں، اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں چور ہے اور وہ واقعی ایسے نہیں۔ تم جانتے ہو بعض طبیعتیں کسی کے سامنے بھی سر جھکانے میں عار محسوس کرتی ہیں۔ کسے باشد، ان کے لیے کسی کی اطاعت قبول کرنا ہتک کے ہم معنی ہے۔ وہ جدی پٹھان ہیں، اور ان کے باپ دادا کی سرکشی اور شوریدہ پشتی کے واقعات تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ پس وہ خدائی تسلیم کرنے میں بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں، حالانکہ دل سے وہ ملحد نہیں۔

اس بات کو جانے دیجیے کہ ان کی تاویل درست ہے یا نہیں ــــ بلکہ اصلیت یہ ہے کہ غلط ہے، کیونکہ میں یقین سے جانتا ہوں کہ ان کا استدلال مضبوط نہیں اور وہ صاحب بھی واقعی ملحد ہیں اور اس کے اعلان میں فخر کرتے ہیں ــــ لیکن ان کے اس قول سے خود جگر کی سیرت اور کردار کا جو رخ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ کتنا دلکش ہے۔

اسمائے حسنیٰ میں ستار اور غفار بھی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ انسان کا مطمحِ نظر یہی ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو خدائی رنگ میں رنگ لے۔ (وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً) ، تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان دونوں خدائی صفات کو بھی اپنی زندگی کا جزو بنانے کی کوشش کرے۔ اگر ہم دوسروں کے عیوب کی بجائے ان کی خوبیوں پر نظر رکھیں، تو یہ دنیا کتنی حسین ہو جائے۔

بے عیب ذات خدا کی ہے۔ جگر صاحب میں بھی کمزوریاں ہیں لیکن ان کی خوبیوں کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں اور یہ تو خدائی کلام ہے کہ نیکیاں بدیوں کو محو کر دیتی ہیں۔ پس میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص جگر کا دشمن ہو سکتا ہے۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ کوئی شخص انہیں جتنا بھی قریب سے دیکھے گا، اتنا ہی زیادہ وہ ان سے محبت کرے گا ؎

میر! مل مل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے!
اس خرابے میں، مری جان! تم آباد رہو

صوفی تبسم

وفا سناتی ہے دل کے قصے کبھی زباں سے کبھی نظر سے
جو بات لب تک نہ آسکی تھی نظر نے آخر کہی نظر سے

یہ کس نے چھیڑ سازِ دل پہ میرے نئی امنگوں کے راگ چھیڑے
یہ کس نے پھر ایک بار دیکھا مجھے محبت بھری نظر سے

جو کچھ ترے دل کی ہو تمنا، وہی مرے دل کی آرزو ہے
جہاں کی ہر شے کو دیکھتی ہیں مری نگاہیں مری نظر سے

تری محبت نے مجھ کو ہر بار اک نئی زندگی عطا کی
کہ دل نے ہر بار تجھ کو دیکھا، نئی تمنا نئی نظر سے

نہ جانے کتنی جدائیوں کے اٹھائے صدمے دلِ حزیں نے
نہ جانے کتنی قیامتیں تھیں گذر گئیں جو مری نظر سے

صوفی تبسم

یہ صحنِ چمن یہ آشیانے
تعمیرِ قفس کے ہیں بہانے

اک بات نظر نے کی نظر سے
اس بات کے بن گئے فسانے

جھکتا ہی نہیں کہیں سرِ شوق
سنسان پڑے ہیں آستانے

تھی رسمِ وفا کبھی جہاں میں
اس بات کو آج کون مانے

پل بھر کے لیے جدا ہوئے ہم
پل بھر میں گذر گئے زمانے

اشکوں میں چمک کہاں سے آئے
داغوں کے شرر ہوئے پرانے

احمد ندیم قاسمی

نارسائی کی قسم، اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

سب حجاباتِ نظر، دل کے نہ کھلنے تک تھے
درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

یاد آجاتا ہے اب تو شبِ تنہائی پر
تیرا غم، میری محبت کو کہاں لے آیا

میں تری بزم سے اُٹھ کر بھی تری بزم میں ہوں
میں نے جب خود کو گنوایا تو تجھے اپنایا

رات کا شکر کر اے دوست کہ دن ڈھلتے ہی
تیرے پیکر سے لپٹ آئے گا تیرا سایا

ابر کے چاک سے جب رات ستارے جھانکے
اے مرے بھولنے والے تو بہت یاد آیا

اشک آنکھوں میں جب آئے تو چمک اٹھیں صدیاں
یوں کہ جس دور کو دیکھا اُسے گریاں پایا

جب بھی دیکھوں کوئی شہ پارۂ فن، سوچتا ہوں
کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں سنبھلے
ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اُکسایا

خشک شاخوں پہ لہو کے یہ نگینے کیا ہیں؟
زندگی ہے اگر اک پیڑ کی ڈھلتی چھایا

اب ہے محتاج بس اک حرفِ تسلی کا، ندیم
میں نے جس دل کے لیے ایک جہاں ٹھکرایا

فضل کریم فضلی

زندگی میں خوشی بھی ہے غم بھی / زندگی زخم بھی ہے مرہم بھی

پھول بھی زندگی ہے شبنم بھی / جشن بھی ہو رہا ہے ماتم بھی

سازگار آگیا ہمیں غم بھی / ہاں عجب چیز واقعی ہم بھی

مجھ کو بخشی اسی نے تشنہ لبی / وہ کہ ہے مے بھی جام بھی جم بھی

نام تیرا کہ اک طلسم بھی ہے / ہے یہی نام اسم اعظم بھی

ذکر اتنا ترا کیا ہم نے / قابل ذکر ہو گئے ہم بھی

جب تمہی تم تھے یا ہمیں ہم تھے / ہم پہ گذرے ہیں ایسے عالم بھی

ہے وہ قامت دلیل خود اس کی / اک قیامت ہے قدِ آدم بھی

سنتے ہیں ہم سے دور بھی وہ نہیں / چل کے دیکھیں تو دو قدم ہم بھی

مستقل برہمی بجا، لیکن / لوگ مل بیٹھتے ہیں باہم بھی

بات ہی اور ہے خوشی کی، مگر / دولتِ لازوال ہے غم بھی

قحط اتنا ہے باکمالوں کا / سمجھے جاتے ہیں مغتنم ہم بھی

کیا مزا بزمِ غیر کا فضلی
ہم نے مانا ہوئے مکرّم بھی

قطعات

اختر انصاری

یہ جہاں

زندگانی لبِ انفاس پہ اک نالہ ہے
ستمِ دہر نے گوندھا ہے وہ مالا ہے
ہم کو تسلیم ترا آبلۂ دل اختر
یہ جہاں خود بھی تو اک ٹیس بھرا چھالا ہے

لمحۂ آسودہ

صبحِ نوروز مری عید نہیں ہو سکتی
حورِ جنت مری اُمید نہیں ہو سکتی
میرے اک لمحۂ آسودہ کی قیمت اختر
عشرتِ ہستیِ جاوید نہیں ہو سکتی

یہی کیا کم ہے

وجہِ ناز نہ اپنی الم خوردہ ہنسی کیا کم ہے
مایۂ فخر یہ شبنم دیدہ خوشی کیا کم ہے
تیری بدخوئی و بیہودہ سری کے باوصف
جی لیے اتنے دن اے چرخ! یہی کیا کم ہے!

تضییعِ جمال

زندگی فرد کی شہ پارۂ فن ہے اُس کا
کون ہے ہم میں جو صانع نہیں فنکار نہیں
لیکن افسوس یہ ہے، روحِ جمالِ ہستی
پھر بھی شرمندۂ گلکاریِ اظہار نہیں

جنسِ نایاب

عمر بھر جینے کی تہمت بھی اُٹھے گی یارب
اور پھر حشر کی زحمت بھی اُٹھے گی یارب
لیکن اپنا یہ جنوں، ہائے یہ جنسِ نایاب
کبھی اس جنس کی قیمت بھی اُٹھے گی یارب

میری طرح

قتیل شفائی

اے مرے دشمنِ جاں

میں تجھے اور تو کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن

کاش تقدیر کبھی تجھ کو دکھائے وہ دن

جب مہذب سی طوائف کوئی

اپنے پیشے کی مذمت کرکے

تجھ سے اظہارِ محبت کرکے

تیرے اعصاب پہ نشے کی طرح چھا جائے

اور تجھے

اُس کی محبت کا یقیں آجائے

اے مرے دشمنِ جاں

عدم

یہی پردۂ آبِ انگور کیا ہے
نہ معلوم ساقی کو منظور کیا ہے

نگاہوں کا دھوکا کہ دل کا شرارا
ذرا دیکھنا یہ سرِ طور کیا ہے

نہیں فاصلے کی کوئی جب حقیقت
یہ نزدیک کیا چیز ہے۔ دُور کیا ہے

ہر اک شے نے مٹنا ہے جب لامحالہ
تو پھر زخم کیا شے ہے۔ ناسور کیا ہے

پیالہ ہے جب خود بھی اک ظرفِ فرضی
تو پھر مے کے چندان سے معمور کیا ہے

نظامِ دو عالم ہے جب اتفاقی
تو پھر قاعدہ کیا ہے۔ دستور کیا ہے

میں یہ سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں
یہ مختار کیا ہے، یہ مجبور کیا ہے

مرا دل بھی گم ہے بڑی مدتوں سے
تری زلف میں چشمِ بد دور کیا ہے

نہ دیکھا ہو جس نے تری کاکلوں کو
اُسے کیا خبر عالمِ نور کیا ہے

مرے دل کا چھوٹا سا ناقص پیالہ
اگر یہ تہی ہے۔ تو بھرپور کیا ہے

بتوں کا کرم بھی نہیں کم عدم پر
خدا کے کرم کا تو مذکور کیا ہے

شعلۂ آواز

جگن ناتھ آزاد

میلوں کی مسافت سے جو آئی تری آواز　　اللہ رے آواز کا شوقِ پرِ پرواز
شاید یہ مرے دردِ محبت کا ہے اعجاز

حیرت میں ہوں یہ ساز کی اک لے تھی کہ خود ساز　　ممکن ہو تو حیرت پہ مری کھول دے یہ راز
تو دور کہ نزدیک تھی اے جلوہ گہِ ناز

کانوں میں ابھی گونج رہی ہے وہی آواز　　معصومیتِ قلب و نظر کی جو ہے غماز
کیا فکر کا اسلوب تھا کیا بات کا انداز

لہجہ بھی وہی بات کا اندازِ بیاں بھی　　الفاظ میں پنہاں تھا وہی کیفِ رواں بھی
آزاد! نہیں "بھی تو وہی تھی وہی ہاں بھی

میزانِ محبت میں سے تول گئی ہے　　اس طرح مرے دل کی گرہ کھول گئی ہے
گفتار کہ احساس میں رس گھول گئی ہے

کہسار سے گزری چمنستان سے گزری　　گلزار، بیابان، خیابان سے گزری
ہر راہ میں اک ناز سے اک آن سے گزری

اس طرح سے پھر منزلِ مقصود تک آئی　　خود صاحبِ آواز کی تصویر دکھائی
اللہ رے یہ میرے مقدر کی رسائی

آواز تھی یا طور کے شعلے کی لپک تھی　　یا دل کے بیابان میں یادوں کی مہک تھی
ظلمات میں اک لمحے کو بجلی کی چمک تھی

اے دیکھنے والو! یہ ذرا راز تو دیکھو　　اک نطقِ دلآویز کا اعجاز تو دیکھو
"شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو"

میکش اکبرآبادی [1]

سحر چمن میں گلوں کی ہنسی بھی کام آئی
مگر نسیم کی آشفتگی بھی کام آئی

وفا سے رہا ہے زرا حسن بے رخی اس میں
ہمارے دل کی فسردہ کلی بھی کام آئی

وہ حسن دیکھ لیا تجھ میں جو نہ تھا تجھ میں
مری نگاہ کی ناآگہی بھی کام آئی

بسا دیئے مری بے منزلی نے ویرانے
جنابِ خضر مری گمرہی بھی کام آئی

جنوں سہی یہ مرا ترکِ آرزو لیکن
مرے جنوں میں تری بے رخی بھی کام آئی

رہِ غلط پہ قدم رکھ کے لوٹ آیا ہوں
کبھی کبھی مری کم ہمتی بھی کام آئی

وہاں ملے وہ جہاں کا مجھے گماں بھی نہ تھا
مرا جنوں مری آوارگی بھی کام آئی

مری طلب سے زیادہ ملا مجھے میکش
وہم سوال مری خامشی بھی کام آئی

شاد عارفی

اُن کے ڈر سے کہ جنھیں فرصتِ نظارہ ہے
صحنِ گلشن کے عوض ہم کو قفس پیارا ہے

انقلابوں نے جنھیں خاک پہ دے مارا ہے
اُن شگوفوں کی "فغاں" نکہتِ آوارہ[1] ہے

پھر قیاسات کچھ حالات ہوا کرتے ہیں
آپ کو "آج" مبارک ہمیں "کل" پیارا ہے

آپ کو "مالکِ مختار" جو سمجھیں اُن سے
یہ نہ کہیے کہ وطن آپ کا گہوارا ہے

اُن کو ذرّوں سے بہرحال نپٹنا ہوگا
کہکشاں جن کی نظر میں دلِ صد پارہ ہے

ترکِ سنگِ درِ محبوب کی باتیں نہ کرو
آج تک ہم نے کوئی قول نہیں ہارا ہے

"التفاتِ غلط انداز" نے چلتے چلتے
تیر تاکا ہے کہیں اور کہیں مارا ہے

آشیانوں کی تباہی۔ سے مگر قطعِ نظر
جو بھی گلشن کو سنوارے وہ چمن آرا ہے

آج ہر خار کی حالت ہے اُس انساں کی طرح
دیکھ کر جس کو کہیں لوگ کہ "بے چارہ ہے"

تیرے گیسو کے مہکتے ہوئے سائے کی قسم
"جامِ گلنار" دہکتا ہوا انگارہ ہے

وہ مرے طنز سے مانوس نہ ہوں گے اے شادؔ
"آئنہ" ہر حبشی کے لیے۔ ناکارہ ہے

---

[1] اب میں یہ تغیرِ قافیہ اضافت کے بعد درست سمجھتا ہوں۔ آپ نہ سمجھیں۔

غلام ربانی تاباںؔ

عشق میں بیگانۂ جذب و اثر ہو جائیے
کم سے کم اپنی نظر میں معتبر ہو جائیے

توڑ دیجے بندشِ صحن و روش مثلِ صبا
شوق کہتا ہے سراپا بال و پر ہو جائیے

جادۂ غم میں کسی کا نقشِ پا بن جائیے
اس قدر مٹیے چراغِ رہگزر ہو جائیے

عقل والوں کی ہنسی کا اس سے بہتر کیا جواب
دربدر ہو جائیے آوارہ تر ہو جائیے

ہائے دل مانگے ہے پھر عہدِ تغافل کے مزے
پھر بھلا دیجے ہمیں پھر بے خبر ہو جائیے

حضرتِ تاباںؔ تماشے کی ہوس کے باوجود
محفلِ خوباں میں محتاطِ نظر ہو جائیے

شبِ آہنگ

منظور حسین شور

ہے تڑپتا یہ کہکشان و نجوم
چاک ہے جبرئیل کا دامن
آسماں پر ہے گردِ انجم و ماہ
ابنِ آدم کی روح کا ہے سکوں
دوشِ فطرت پہ ہے جزیرۂ ماہ
بامِ گردوں پہ چاند کی ہے کمند
انجم و کہکشاں کے دامن پر
عکسِ مہتاب میں ہے یوں جیسے
کس کو معلوم بحر و بر کا سکوت
لوٹ کر آ رہے ہیں پھر دن رات
چاند کے نقرہ پوش سائے میں
جیسے رستے ہیں لے کے میرا نام
آج اے دوست میرے اشکوں میں
میرا نالہ بھی تیری رسوائی
دل دھڑکتا ہے رات یوں جیسے

یہ مہ و سال کا سکوتِ دراز
یا دریچہ ہے قصرِ ماہ کا باز
یا بھٹکتی ہے وقت کی آواز
یا خلا میں ہے ابر کی پرواز
یا سلگتا ہے خیمۂ شب باز
یا مرے فکرِ شعر کا انداز
ہے شبِ غم نگاہ سجدہ طراز
پڑھ رہا ہو امامِ شہر نماز
کتنے طوفانوں کا ہے محرمِ راز
خامشی چھیڑتی ہے وقت کا ساز
کوئی راہی ہے یوں نوا پرداز
نے صدا دے رہے کوئی دمساز
کاش ڈھل جائے تیرے غم کا گداز
میرا نغمہ بھی درد کا غماز
آئینہ توڑتا ہو آئینہ ساز

کس نداند کجا است ایں مطرب
”سخت نزدیک می رسد آواز“

عبدالمجید حیرت

وہ جسے دیدہ وری کہتے ہیں
ہم اُسے بے بصری کہتے ہیں

نام اس کا ہے اگر باخبری
پھر کسے بے خبری کہتے ہیں

یہ اگر لطف و کرم ہے تو کسے
جور و بیدادگری کہتے ہیں

کیا اِسی کارِ نظر بندی کو
حسن کی جلوہ گری کہتے ہیں

گل کے اوراق پہ کانٹوں کا گماں
کیا اسے خوش نظری کہتے ہیں

بہرِ بیمار دوا ہے، نہ دعا
کیا اسے چارہ گری کہتے ہیں

کم کسی کو یہ خبر ہے کہ کسے
رنج بے بال و پری کہتے ہیں

یاس و حرماں کو بہ الفاظِ دگر
آہ کی بے اثری کہتے ہیں

نام ہے وہ بھی جگرداری کا
ہم جسے بے جگری کہتے ہیں

آپ خود بھی تو گل اندا موں کو
حور کہتے ہیں، پری کہتے ہیں

فصلِ گل ہی تو ہے وہ، ہم جس کو
موسمِ جامہ دری کہتے ہیں

عشق میں عین ہنرمندی ہے
سب جسے بے ہنری کہتے ہیں

مفت کی دردسری کو ہم بھی
مفت کی دردسری کہتے ہیں

آپ سے ہم سے بنی ہے، نہ بنے
آپ خشکی کو تری کہتے ہیں

کیا کوئی بات کبھی اہلِ جنوں
از رہِ ناموری کہتے ہیں

ہم پہ یہ بھی ہے اک الزام کہ ہم
داستاں درد بھری کہتے ہیں

کوئی خوش ہو کہ خفا ہو حیرت
ہم تو ہر بات کھری کہتے ہیں

رفعت سلطان

سوئے منزل نہ جو رواں ہوں گے
صورتِ گردِ کارواں ہوں گے

لب اگر خوگرِ فغاں ہوں گے
داغِ دل اور بھی عیاں ہوں گے

دو گھڑی ہنس کے بات کر ہم سے
پھر خدا جانے ہم کہاں ہوں گے

گلستاں میں بہار آنے دے
ڈالی ڈالی پہ آشیاں ہوں گے

آہ وہ فاصلے جو قرب پہ بھی
میرے اور اُن کے درمیاں ہوں گے

حسن جب تک نہ جلوہ گر ہوگا
دونوں عالم دھواں دھواں ہوں گے

چھڑ گیا پھر ترے شباب کا ذکر
دل کے ارمان پھر جواں ہوں گے

آپ کہتے ہیں تو یقیں ہے مجھے
آپ بھی میرے قدرداں ہوں گے

ہم نہ ہوں گے مگر ہمارے بعد
اشک اُس آنکھ سے رواں ہوں گے

وجہِ بربادیٔ دل رفعتؔ
آپ جیسے ہی قدرداں ہوں گے

رازِ یزدانی

سوچیے ہم سے تغافل بھی بجا ہے کہ نہیں
کہ یہی مقصدِ اربابِ وفا ہے کہ نہیں

زیست میں لمحۂ اندوہ جفا ہے کہ نہیں
اے محبت کوئی تیری بھی خطا ہے کہ نہیں

پست کر دیتے ہیں موجوں کو اُبھرنے والے
ڈوبنا خود نہ اُبھرنے کی سزا ہے کہ نہیں

چھاؤں میں پھولوں کی آنکھیں تو لگی جاتی ہیں،
کون دیکھے یہ چمن جاگ چکا ہے کہ نہیں

ہاں مرے عشق نے سوچے تھے بڑے ہنگامے
تو نے چھپ چھپ کے سہارا ابھی دیا ہے کہ نہیں

کیا غلط عشق کو ہے جرمِ وفا کا اقرار
حسن پر زحمتِ بیداد وجفا ہے کہ نہیں

تجھ کو بیداریٔ گلشن کی قسم ہے کہ بہار
ذہنِ انساں بھی کہیں جاگ رہا ہے کہ نہیں

سب میں شاہد کے بھلانے کا بہانہ کر کے
میں نے ہر وقت ترا نام لیا ہے کہ نہیں

کس کو جینے سے ہے فرصت جو یہ سوچے کہ مجھے
کوئی کام اور بھی جینے کے سوا ہے کہ نہیں

شکر یہ آپ کے احسانِ جفا کا لیکن
یہ کرم فتنۂ آغازِ جفا ہے کہ نہیں

ہے ابھی فیصلہ باقی کہ دلوں پر اب تک
آپ سے کوئی ستم ہو بھی سکا ہے کہ نہیں

رازؔ پھولوں پہ بہاروں کا کرم ہے لیکن
یوں بھی کلیوں کا جگر چاک ہوا ہے کہ نہیں

جمیل ملک

جو دیکھیے تو ہمیں زندگی نے کیا نہ دیا
بس ایک خاطرِ تنہا کو آسرا نہ دیا

یہ رختِ جاں کہ ازل سے اٹھائے پھرتے ہو
اگر گراں ہے تو کیوں راہ میں لٹا نہ دیا

ہر ایک بولتی صورت کو غور سے دیکھا
مگر کسی نے ترے شہر کا پتا نہ دیا

جہانِ شوق میں ہم سربلند ہو جاتے
غضب کیا کہ ہمیں بزم سے اٹھا نہ دیا

نگاہِ حسن کے ترکش سے کتنے تیر چلے!
کوئی بھی زخم مگر زخمِ عشق سا نہ دیا

ہنسی ہنسی میں ستم گر نے جان بھی لے لی
صلہ وفا کا دیا یوں کہ خوں بہا نہ دیا

کوثر نیازی

کیا عذر ہے جو شمعیں بجھنے گئیں، کیا غم ہے جو تارے ڈوب گئے
فرقت کی اندھیری راتوں میں پلکوں پہ چراغاں ہوتا ہے

اک پھول چمن میں بلبل سے یہ رازِ محبت کہتا تھا
شبنم کے ترشح سے ٹھنڈا کب سینۂ سوزاں ہوتا ہے

اے اہلِ جنوں! مژدہ ہو تمھیں امید تمھاری بر آئی
پھر فصلِ بہاراں آتی ہے۔ پھر وا درِ زنداں ہوتا ہے

اللہ رے یہ ناوک فگنی، الزام بھی جس کا دے نہ سکیں
جو تیرِ نظر آتا ہے ادھر، پیوستِ رگِ جاں ہوتا ہے

بارش کے برستے قطروں میں بجلی کے چمکنے کا منظر
روتا ہوں تصور میں لیکن اک چہرۂ خنداں ہوتا ہے

موجوں میں تلاطم ہو نہ اگر محبوب کنارہ ہو کیوں کر
ساحل کے پرستارو ساحل پروردۂ طوفاں ہوتا ہے

ہو لاکھ ہجومِ رنج و الم ہم فکرِ سخن کر لیتے ہیں
جب سازِ دل و جاں پر کوئی چھیڑے سے غزل خواں ہوتا ہے

شفقت کاظمی

ہر گھڑی کربِ مسلسل میں کٹی جاتی ہے
زندگی اپنے گناہوں کی سزا پاتی ہے

یاد آؤں کہ نہ آؤں میری قسمت لیکن
اُن سے اُمیدِ ملاقات چلی جاتی ہے

یوں مرے بعد ہے دنیا پہ اُداسی طاری
جیسے دنیا مرے حالات کا غم کھاتی ہے

جب بھی آتا ہے تصور ترے افسانوں کا
ایک فریاد مرے منہ سے نکل جاتی ہے

خوش رہو دشتِ تمنا کی ہواؤ کہ مجھے
تم سے بچھڑے ہوئے یاروں کی مہک آتی ہے

زندگی میں کئی ایسے بھی ملے تھے ساتھی
روح اب جن کے تصور سے بھی گھبراتی ہے

غور کرتا ہوں جو شفقت کبھی تنہائی میں
اپنے حالات پہ تا دیر ہنسی آتی ہے

کس راہ پہ ہیں رواں دواں ہم
جائیں گے خبر نہیں کہاں ہم

اک بار فریب کھا گئے تھے
اب تک ہیں کسی سے بدگماں ہم

یوں تیری نگاہ سے گرے ہیں
گویا تھے متاعِ رائگاں ہم

رستوں کی خبر نہ منزلوں کی
کیا جانئے آ گئے کہاں ہم

دل میں تھیں کچھ ایسی حسرتیں بھی
تجھ سے جو نہ کر سکے بیاں ہم

گزری ہے قفس میں عمر لیکن
بھولے نہیں یادِ آشیاں ہم

ہر حال خوشی اُنہی کی چاہی
کرتے رہے پاسِ دوستاں ہم

پیش آئے نجانے کیا سفر میں
گھر سے تو چلے ہیں شادماں ہم

اک منزلِ بے نشاں کی دھن میں
شفقت نہ پھرے کہاں کہاں ہم

بشیر بدر

رات اک خواب ہم نے دیکھا ہے
پھول کی پنکھڑی کو چوما ہے

دل کی بستی بھی شہرِ دلی ہے
جو بھی گذرا ہے اُس نے لوٹا ہے

روشنی روپ بدلا کرتی ہے
چھپ گیا چاند، درد چمکا ہے

کیا ہنسوں اک ذرا سی آہٹ پر
دردِ خوابیدہ جاگ پڑتا ہے

خندۂ گل فریب ہے گل کا
رات بھر چپکے چپکے رویا ہے

ہم تو کچھ دیر ہنس بھی لیتے ہیں
دل ہمیشہ اُداس رہتا ہے

وہ سرِ طور ہو کہ صبحِ ازل
میں نے پہلے بھی تم کو دیکھا ہے

اب بجز تری یاد کے اے دوست
اس خرابہ میں کون آتا ہے

پیسہ ہاتھوں کی میل ہے بابا
زندگی چار دن کا میلہ ہے

کوئی مطلب ضرور ہوگا میاں
یوں کوئی کب کسی سے ملتا ہے

گیسو کھولے ہے رات کی رانی
ہر نفس چاندنی کا مہکا ہے

چاندنی کیوں بہت اُداس نہ ہو
چاند کا چہرہ اُترا اُترا ہے

تم اگر مل بھی جاؤ تو بھی ہمیں
حشر تک انتظار کرنا ہے

اپنی بس ایک ہی تمنا تھی
پوچھتے وہ کہ کیا تمنا ہے

ایک شب کے گنہگار رہو
صبح تک ہم کو لوٹ جانا ہے

کتنی گمبھیر ہو گئی ہے رات
بدر دیکھو با کہ تارا ٹوٹا ہے

خراب آباد

وارث کرمانی

میں نے با دیدۂ تر
ایک دن اُس گلِ رعنا سے کہا
جب یہ ثابت ہے کہ اس نرگسِ شہلا کے سوا
کوئی زمزم کوئی تسنیم نہیں
جب یہ ظاہر ہے کہ اس عارضِ رنگیں کے سوا
اس خرابے میں کوئی چیز نہیں وجہِ سکوں
ایک بازارِ قیامت ہے جہاں
سر چھپانے کو زمیں ہے نہ زماں
سینے بڑھتے ہوئے ادراک کے صحراؤں میں
رینگتی پھرتی ہے کیڑوں کی طرح نسلِ بشر
کوئی منزل ہے نہ منزل کا نشاں

جب یہ عالم ہے تو اے جانِ جہاں
کیوں نہ دنیا کو ترے گیسوئے پرخم کر دوں
اور اس حسن کی رنگین بہاروں میں رہوں
یہ جو پیشانیٔ سیمیں پہ ہے نازک سی شکن
یہ شکن نظمِ دو عالم تہ و بالا کر دے
ان نگاہوں کے اشاروں پہ بصد عجز و نیاز
فاتحِ سلطنتِ روم و فرنگ
دل و جاں پیشکش وعدۂ فردا کر دے

اس حسیں جنبشِ لب پر بخدا شیخِ زماں
چاک کرتا ہوا دستارِ فضیلت آئے
اور غرقِ مے و مینا کر دے
آہ یہ شوخیٔ رفتار یہ ایں قامتِ ناز
قبر سے رقص کناں حافظِ شیراز اُٹھے
نذرِ قدموں پہ سمرقند و بخارا کر دے
دیکھ اسے پیکرِ ناز
کب سے بے خواب امیدوں کی برات
خیمہ زن ہے لب و عارض کے قریب
ہرزہ ہے مصلحت و دانش و دیں
جھوٹ ہے زہد و عبادت کا طلسم
پاکیٔ دامن و تقدیس حیا کچھ بھی نہیں
علم و آگاہی و ایمان و وفا کچھ بھی نہیں
خیر و شر کچھ بھی نہیں سہو و خطا کچھ بھی نہیں
اس زمانے میں کوئی شے بخدا کچھ بھی نہیں
اب تو اذنِ نگہِ ناز ملے
شوق کو رخصتِ پرواز ملے
یہ گراں باریٔ آداب ہٹے

عشق ستم پیشہ

زبیر رضوی

وہ اک کلی
جو ابھی بہاروں کی پالکی میں دُلہن بنی مسکرا رہی تھی
خیال کی وادیوں میں خوابوں کے ہاتھ تھامے ٹہل رہی تھی
سہیلیوں کا شریر بچپن کوئی کہانی سُنا رہا تھا
دراز پلکوں کی چلمنوں میں حیا کھڑی مسکرا رہی تھی

وہ اک کلی
کہ کھُلا نہ بندِ قبا کی تنگی کا حال جس پر
سرِ گلستاں گلوں کی شادابیاں کھڑی تھیں سوال بن کر
وہ ایک شیشہ کہ جس میں اُترا کوئی نہ عکسِ نگار اب تک
وہ ایک نغمہ ملا نہ جس کو کسی مغنی کا پیار اب تک

سنا ہے اک شب
وفا کی بستی کا ایک بدنام شاہزادہ
حریمِ گلشن میں آگیا تھا
سحر ہوئی تو چمن میں ہر سُو
کلی کی رسوائیوں کے چرچے
کلی کے بندِ قبا کے ٹکڑے
پڑے ہوئے جا بجا ملے تھے . . .

محورِ بہارِ کائنات

ادیب سہیل

وہ شب کہ جس میں چاند بے نقاب تھا
شعاعِ حسن پر عجیب عالمِ شباب تھا
لپٹ رہی تھی شاخِ گل سے سرخوشی میں چاندنی
تمہارے ہونٹ پر مچل رہی تھی گیت کی کلی
ہمارے پردۂ ستار کی صدا تھی مدھ بھری
نہ جانے تا بہ کے رہی یہ نغمگی، یہ زندگی، یہ دلبری —
رُکا طلسمِ نغمگی کا سلسلہ!
تمہارا پھول سا بدن کھلا ہوا تھا شوق میں ہماری شاخِ دست پر
نفس نفس رچی ہوئی تھی بوئے خود سپردگی
تمہارا ہات میرے ہات میں تھا یوں پڑا ہوا
کہ آ گیا تھا محورِ بہارِ کائنات آج آپ ہی گرفت میں

یہ شب کہ جس میں چاند ہے نہ پھول ہے
تمام منظرِ حسیں پہ تیرگی کی دھول ہے
نہ جانے کس نگر میں جا چھپی ہے دل کی چاندنی
متاعِ غیر ہو گئی ہے جیسے اپنی سرخوشی
نہ تان کی ہے روشنی نہ نغمگی کے پھول ہیں
اُگے ہوئے قدم قدم پہ درد کے ببول ہیں
اُجاڑ شاخِ دست ہے
ہے سوزشِ نہاں سے اب سماں سماں، دھواں دھواں
وہ ہات جس کی اب مجھے تلاش ہے
بسی ہوئی خیال میں ہنوز جس کی باس ہے
نہ دور ہے نہ پاس ہے
مگر حصول کی ابھی تو دل کو اپنے آس ہے
وہی وہی جو محورِ بہارِ کائنات ہے

دو ہمسائیاں (۲)

راجہ مہدی علی خاں

شکیلہ — تمہارے بچے، ہماری بلّی کی دُم پکڑتے ہیں، ان کو روکو
تمہارے مرغے ہماری چھت پر اذان دیتے ہیں، ان کو ٹوکو

عقیلہ — تمہارا بکرا ہمارے آنگن میں آ گھسا تھا، ہلا کے داڑھی
دو ہتّڑوں سے اسے بھگایا، وہ جا رہا تھا اُٹھا کے سلپی

شکیلہ — تمہاری بچی ہماری نانی کو "پوپلی" کہہ کے بھاگ جائے
تمہارا بچہ ہمارے نانا کو "غنڈہ" کہہ کہہ کے منہ چڑائے

عقیلہ — تمہارا کُتّا، کچن میں گھُس کے ہمارا سب دودھ پی گیا ہے
جوانی پیٹے کو کیا کہوں میں ابھی ابھی کھا کے گھی گیا ہے

شکیلہ — میں جانتی ہوں کہ میرے کُتّے کو اس پہ تو نے بھی کیا سزا دی
زباں سنبھال اپنی۔ ورنہ جھاپڑیں تجھ کو دوں گی حرامزادی

عقیلہ — حرامزادی تو وہ تھی جس داشتہ نے تجھ کو جنم دیا تھا
کلال زادی تھی، مال زادی تھی، جس نے رشتہ ترا لیا تھا

شکیلہ — تیرا حسیں باپ تیری اماں کو ناگپور سے بھگا کے لایا
گیا جو پکڑا تو میرا سسرا ہی کل مونہے کو چھڑا کے لایا

عقیلہ تمہارا سسرا؟ وہی جو بھیڑیں کسی زمانے میں ہانکتا تھا
ہماری اماں کو روز چھپ چھپ کے اپنی کھڑکی سے جھانکتا تھا

شکیلہ تمہارا شوہر بھی چھپ کے کھڑکی سے روز بندی کو جھانکتا ہے
وہ روز کھڑکی کے پاس ہی کیوں بٹن قمیصوں میں ٹانکتا ہے؟
بڑے مزے کے کل ہی لکھے جو اُس نے وہ عشقیہ خط ہیں پورے گیارہ
دکھاؤں گی سب کو آج یہ خط۔ پڑھے گا ان کو محلہ سارا

عقیلہ اری بہن.... آپا.... کیا یہ سچ ہے؟.... مری خطائیں معاف کردو
بہن بہن سے لڑی تو کیا ہے۔ جو دل میں ہے میل صاف کردو
میں کتنی باتیں سُنا رہی تھی۔ زبان خاموش تھی تمہاری
قسم خدا کی، بتاؤں کیسے؟ ہو تم مجھے جان و دل سے پیاری
تم اپنے گھر میں مجھے بُلانا۔ میں چھپ کے دیکھوں گی سب نظارہ
جو وہ اشارے کریں گے تم کو۔ ہوا کروں گی میں عشق سارا
ابھی میں آتی ہوں میری پیاری رومال میں باندھ لوں مٹھائی
ذرا مجھے بھی وہ خط پڑھانا کہ جن میں الفت گئی جتائی
تمہارا کتا اِدھر جو آئے نہ روکوں معصوم جانور ہے
وہاں جو کھائے، یہاں بھی کھائے کہ یہ بھی آخر اسی کا گھر ہے
تمہارا بکرا ہمیں ہنساتا ہے گھر میں آ کے۔ ہلا کے داڑھی
میں پیار سے روک دوں گی اُس کو اگر وہ میری اُٹھائے ساڑھی

سپنوں کے دیس میں

ڈاکٹر اختر اورینوی

میں ایک کہانی کہنے لگا ہوں۔ کہانی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کہانی سکت سے اپنے آپ اور اپنے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یا کم از کم مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھندلے نقش صاف ہو رہے ہیں، لکیریں اُبھر رہی ہیں، ہیولے صورتیں اختیار کر رہے ہیں اور صورتیں جہت در جہت ناچتی ہوئی کیفیتوں اور معنوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ یہ رقص دیر تک ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کیف و معنی کو محسوس کرنے اور سمجھنے والی حالت بھی مدغم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ شاید کہانی کا یہی نقطۂ انجام ہوتا ہے۔ لیکن کہانی پھر بھی لمبی معلوم ہوتی ہے۔ حلقۂ دامِ خیال کی ان گنت آنکھیں خوابِ عدم سے بیدار ہونے لگتی ہیں اور تماشائے عالم کرتی رہتی ہیں۔ عدم خواب تھا یا یہ زندگی خواب ہے، کون جانے!

سونا سنسار۔ جاگتا پاک پروردگار۔ زمان و مکان کی حدوں سے آزاد خلا میں ایک بسیط و عظیم دماغ نے اپنی بیکراں بیداری میں تنوع پیدا کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ خلا، جو لامحدود روشنی سے پُر تھا، اندھیرے سے بھر گیا۔ ہر سو خواب چھا گیا۔ خواب جو لامحدود کو محدود دائرہ میں لاتا ہے۔ خواب جو دریائے رواں کو کوزہ میں بند کر دیتا ہے۔ خواب جو ازل و ابد کو ایک لمحے میں تبدیل کرنے پر قادر ہے۔

عالمِ خواب میں سکون مطلق تھا۔ شدہ شدہ سکون میں تناؤ پیدا ہوا۔ ایسی کیفیت تھی۔ جیسے سکون ذہن پہ تنا ہوا ہو۔ بے جھول، صاف، بے شکن۔ تکمیلِ سکون اپنی انتہا پر پہنچ کر ڈھول کی جھلی کی طرح تناؤ کی شدت سے پھٹ سا گیا۔ خلا میں لہریں پیدا ہوئیں۔ لامکان اِن خوابناک لہروں سے بھر گیا۔ لامتناہی لہریں، پیچیدہ لہریں، متصادم لہریں۔ اندھیرے میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ عظیم خواب کے دھندلکے میں کائناتیں رقص کرنے لگیں۔ بسیط خواب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کچھ روشن اور نیم روشن دائرے بنے۔ عظیم و لامحدود دماغ کی خوابناک فضا میں کچھ دائرے شعلہ بداماں ہو کر بھڑکے اور خفا ہو گئے۔ کچھ کجلا گئے اور عالم عالم میں روشنیوں کے ساتھ ملی جلی کجلاہٹیں بھی پھیل گئیں۔

اب اتوٹ سپنے کی کہانی کون کہے۔ سپنے تو سپنے ہی ہیں۔ اُن کا اور نہ چھور۔ اس دنیا میں انوکھی ہوتی ہے۔ سپنے میں کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ سپنا ہے اور عام طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ سپنا سچ مچ کی دنیا معلوم ہوتا ہے۔ میں سپنے کے ایک سنسار کی کہانی کہتا ہوں جو محض ایک سنسار جو بیکراں سپنے میں ایک حقیر نقطے سے بھی حقیر تر ہے۔ مگر ہندو اور برہما کی حقیقت کوئی نہیں پا سکا۔ نارائن کے سپنے کے ایک نقطہ پر کیا گذری۔ سنیئے!

سپنے کا ایک نقطہ ابھرنے لگا۔ اُبھر کر پھیل گیا۔ بالائی جانب سے ایک عریض پردہ سا لہراتا ہوا گرا۔ پھر یہ وہ ساکن ہو گیا۔ اِس پر

گول گول لکیریں، زاویے، دائرے، مثلث، مربعے، قوسیں، بیضوی دائرے، متوازی خطوط پھیلاتی رہیں۔ ان گنت قاشیں آہستہ آہستہ رونما ہونے لگیں۔ یہ سادی قاشیں بنتی بگڑتی، ایک دوسری میں خلط ملط ہوتی رہیں۔ بہتے بہتے با ضابطہ اجسام، شکلیں اور صورتیں پردے پر منقوش ہو گئیں۔ سپنے کا پردہ بڑا گنجلک اور آباد ہو گیا۔ اچانک نقوش خواب میں جنبش پیدا ہوئی۔ صورتیں اور اجسام آنکھیں جھپکاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں تہ داری، وجاہت اور ابعاد ظاہر ہونے۔ سپنے کے پتلے طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگے۔ پہلے تو ایسا ہوا کہ پتلوں کی حرکت کسی ڈور کے سہارے ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بعد ازاں پتلوں کی آنکھوں میں گہری چمک سی رونما ہوئی، بڑی پُر معنی چمک۔ پتلے ایک دوسرے کی آنکھوں کے شیشے میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ اندر کی دنیا عجیب و غریب تھی۔ پیچیدہ، پاتال تک گہری، لامتناہی۔ اس داخلی دنیا کو دیکھ دیکھ کر پتلوں کا سر چکرا گیا اور وہ بے خودی میں ناچنے لگے۔ ناچتے ناچتے سارے ڈور ٹوٹ گئے۔ سب پتلے اوندھے سیدھے گر پڑے اور آپس میں گڈ مڈ ہو گئے۔ پھر وہ اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ اٹھ بیٹھے، کچھ اٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے۔ انھیں ایسا لگا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر بڑی گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ اس گھبراہٹ سے انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک جیتے جاگتے وجود ہیں۔ گھبراہٹ کے ساتھ آزادی کا احساس بھی تھا۔ پتلوں کی داخلی دنیا اضطراب، اذیت اور لذت سے بھر گئی۔ اس خلفشار اور کشاکش سے ایک اور حیرت خیز کیفیت سر اٹھانے لگی۔ خواب کے پتلے سوچنے لگے۔ عجیب تجربہ تھا۔ اذیت خیز مگر لذت بخش۔ کچھ پتلے اس درد آگیں بوجھ سے ٹیڑھے ہو گئے، سوچنے کا بوجھ، فکر کا وزن۔ یہ پتلے بڑے معصوم اور بے ضرر نظر آنے لگے۔ ذہن رفتہ رفتہ ان کی صورتیں مسخ ہونے لگیں اور بے فکرے پتلے دوسری ہیئتوں اور شکلوں کے ان گنت پتلوں میں جا شامل ہوئے۔ طاقتور پتلے ابھرنے لگے، بڑھنے لگے، پھیلنے لگے۔ مگر اشک و آہ کی وادی میں تبسم و خندہ کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے، سورج کی مشعل سے کھیلتے ہوئے، روشنیاں پھیلاتے ہوئے یہ پتلے آزادانہ آگے بڑھنے لگے۔ پُر خطر منزلیں آئیں تو ان کی ٹولیاں بنتے اور جماعتیں بن گئیں۔ پتلوں کا کارواں گرتا پڑتا آگے بڑھتا رہا۔ کبھی یہ پتلے اٹوٹ معلوم ہوتے اور کبھی ہر پتلا یکسر آزاد و خود کار محسوس ہوتا۔ اس سفر میں ایک ایک پتلے کے اندر کیفیات، واردات، محسوسات اور تخیلات کی تہ بہ تہ شکنیں پیدا ہوئیں۔ بے نام تجربے۔ نام تو بہت بعد میں رکھے گئے۔ پتلوں کی حرکت و سکون، اعمال و افعال دائرۂ تعینات کے اندر آنے لگے۔ ایک سنسنی خیز بات یہ ہوئی کہ پتلے جوڑا جوڑا ہو گئے۔ جوڑوں میں ایک مضبوط و تنومند اور دوسرا نازک و لطیف۔ ان جوڑوں میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش تھی۔ مقناطیسیت، برقیت۔ پتلوں کے جوڑے ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ یہ چمٹتے، الجھتے، ایک دوسرے کو بھینچتے، ایک دوسرے میں سماتے، چھپیاں بدلتے اور بے آہنگ حرکتیں کرتے۔ دو طرح کے پتلے تو پہلے بھی تھے۔ ان میں اتصال و انفصال بھی ہوتا ہی رہتا تھا۔ ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی تھی۔ لیکن ان کے الگ الگ جوڑے نہیں بنتے تھے۔ اور اب جوڑے بن گئے اور ان جوڑوں کے وصال سے اور پتلے پیدا ہونے اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔ ننھے ننھے پتلے، پیارے پیارے پتلے۔ بدلے ہوئے حالات نے بدلے ہوئے مزاج پیدا کر دیئے۔

پتلوں میں سورج تو اسی وقت چمک گئی تھی جب پتلے اٹھ بیٹھے تھے۔ اور اس لا منتہی فضا کی لغزش و افتاد، مقابلہ و تعاون نے پتلوں کی روحوں کو اور بالیدہ و پیچیدہ بنا دیا۔ روح کے ہر پیچ میں نت نئے تجربوں کے عکس مرتسم ہوتے جاتے تھے اور ان سے روحوں کی تہ داری بڑھتی جاتی تھی۔ نئے تجربوں کی آزادی نے پتلوں میں بڑا اپنا پن پیدا کر دیا۔ ہر پتلا ایک فرد بن گیا۔ پہلے وہ محض ایک وجود تھا۔ پتلوں سے جب جوڑے بنے اور ان جوڑوں سے جب خاندان پیدا ہوئے تو پتلوں کی انفرادیت اور بڑھ گئی۔ ان کے وجدان و ذوق کی یک گونہ یکسانیت کے باوجود ان کے احساسات و جذبات کے محور بدل گئے۔ ان کے ارادوں اور عزائم کی منزلیں بدل گئیں۔ ان کے تخیل اور فکر کی دنیا میں نیرنگ ساماں ہو گئیں۔

ـــــــ اور جب منفرد پتلوں کے دماغ بے کراں تجربوں کی بجلی سے بھر گئے تو بولی پیدا ہوئی۔ ایک معجزہ ظاہر ہوا۔ یہ پتلے، یہ

افراد فرداً فرداً ہوتے ہوئے بھی خاندانوں، ٹولیوں، جتھوں، قبیلوں اور جماعتوں میں منظم ہوتے رہے۔ بولیاں زبانیں بن گئیں۔ پتلوں نے خوش ہو کر اپنے اور ماحول کی ہر شے کے نام رکھ لیے۔ ان کے ذہن پختہ ہونے اور دماغ پرواز کرنے لگے۔ خواب کے پتلے ایک نئے عالم اظہار میں داخل ہو گئے۔ حیرت فزا طلسمی عالم در عالم۔ لب اور زبان رکھتے ہوئے بھی گونگے ہوتے ہیں اور کان والے بھی بہرے۔ ایسے گونگے کہانی نہیں کہتے۔ ایسے کہانی نہیں سنتے۔ مگر پتلے بولنے لگے۔ مفہوم و معنی پیدا ہوئے۔ افکار پیکر الفاظ میں ڈھل گئے۔ یہ نہ ہوتا تو آپ یہ کہانی نہ سن پاتے۔ لفظ قوت ہے۔ بیان الوہیت ہے۔ برہما نے اپنے سپنے کی مالا پہن لی۔ مالا کا ہر موتی ایک شبد تھا۔ موتیوں کے ہار سے کتھائیں بن گئیں۔ وید مالا کی جھنکار، سپنوں کا بولتا ہوا سنسار!

خدا کے خواب کا اور نہ چھور۔ وہ تو ازلی اور ابدی۔ اس کے خواب پر بھی ازل و ابد کا پرتو۔ حق و حقیقت ایک ہے۔ خواب تعبیریں ان گنت۔ برہما کے سپنے کے ایک بندو کی کہانی ہے۔ بندو ایک عظیم دائرہ بن گیا۔ دائرہ ایک سنسار۔ دائرہ کے پتلوں نے سنسار کے کونے کونے کے نام رکھ دیئے۔ ہر کونے کے ہر نقش کے نام رکھ دیئے۔ ذرے ذرے نامدار ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی تابدار ہو گئے۔ خواب کے پتلوں نے اپنی ایک کائنات گھڑ لی۔ سورج، چاند اور تاروں سے اسے سجایا۔ شمع بنایا۔ زمانہ کو ڈور میں باندھا۔ پتلوں کا کاروان چاند تاروں کے ساتھ، مہر و مہ سیاروں کے ساتھ زمان و مکاں میں سفر کرتا ہی گیا۔ بندو ناچتا رہا۔ بندو پر پتلے ناچتے رہے۔ ساری کائنات ناچتی رہی ——— پتلوں نے بندو پر بہتیری کہانیوں کے چتر بنائے۔ پھر ان افسانوں کو جیتا جاگتا بنا دیا۔ پتلوں نے بہت بہروپ بھرے۔ بہت سے منچ سجائے۔ بہت سے ناٹک کھیلے۔ ہر پتلے کا اپنا اپنا کام۔ اور کام کے معنی نام رکھے گئے۔ کوئی بھلا کام، کوئی برا کام۔ پتلوں میں اچھے برے کی تمیز ابھری۔ نیک و بد، خوبصورت اور بدصورت کا امتیاز پیدا ہوا۔ محبت و نفرت نے بڑی پیچ دار شکلیں اختیار کیں۔ پتلوں کے وجود میں گتھیاں پڑیں۔ گرہیں ابھریں۔ انفرادیت شخصیت بن گئی۔ پتلوں کے روپ انوپ تو تھے ہی، اب ان کی شخصیتیں انیلی انیلی، نرالی نرالی ہو گئیں۔ اور اب پتلے سوچتے سوچتے نئے سنساروں کے سپنے بھی دیکھنے لگے۔ خواب در خواب!

عظیم خواب ان اجزائے خواب یعنی پتلوں کو حقیقت ہی معلوم ہونے لگا۔ خود ان کے دماغ میں ان گنت ننھے ننھے سپنے جنم لینے لگے اور حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ سماجیں بنیں۔ تمدن رچے گئے۔ تہذیبیں سانس لینے لگیں۔ پل پل کی تاریخ بن گئی اور تاریخ پھلی پھیلی!

ہمالہ نے برف آلود ٹھنڈے کہرے سے جھانک کر دیکھا۔ سندھو لہرا رہا تھا۔ برہم پترا بل پہ بل کھا رہا تھا۔ گنگا، جمنا، نربدا، تاپتی، کرشنا اور کاویری تھرک رہی تھیں، ناچ رہی تھیں۔ وندھیا اور ستپورا ہمک رہے تھے۔ سندر بن گا رہا تھا۔ نلگری منجیرا بجا رہا تھا۔ اور نیلے سمندروں میں نہائے ہوئے بادل مستی میں اپنے لٹ بکھرائے ڈھول بجا رہے تھے۔ اس سنگیت سبھا کو ہمالہ نے اپنا سن سفید سر اور پر شکن پیشانی جھکا کر دیکھا۔ اس نے دیکھا، پورب دکھن کے ناپوؤں سے چوڑی ناک، چوڑے جبڑے اور چوڑے چہرے والے پتلے ایراوتی اور برہم پترا کے ساتھ ناچتے گاتے ہوئے اس کی شرن میں آ گئے۔ ان کا رنگ تانبا جیسا تھا۔ پھر پچھم دیس سے کالے کالے پتلے، ابھرے ناک نقشے والے پتلے رقص کرتے، دھومیں مچاتے آئے اور اس کے دامن سے لے کر نلگری اور نیلے سمندر تک چھا گئے۔ لوہے جیسے نیلے اور تانبے جیسے پتلے آپس میں ٹکرائے۔ اس ٹکر سے آگ پیدا ہوئی۔ شعلے بلند ہوئے اور ہمالہ کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ پتلے پگھلنے لگے۔ پگھل کر گھل مل گئے اور پھر مجسم ہو کر ناچنے گانے لگے۔ اپنی سنگیت سے سمے کو راگ کے تاروں میں باندھنے اور تاریخ کے گھروندے بنانے لگے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا جیسے بہتیرے گھروندے بنا ڈالے۔ ہمالہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھم سے اور پتلے آئے۔ گورے گورے پتلے، روپا چاندی جیسے پتلے۔ تیکھے تیکھے، کٹیلے کٹیلے پتلے۔ تیر کمان سنبھالے ہوئے، گھوڑوں پر سوار۔ طوفان کی طرح آئے۔ بادل کی طرح گرجے۔ بجلی کی طرح کوندے۔ کالے، اٹھیلے اور بھولے

ٹیلوں پر ٹوٹ پڑے۔ اسی سمے پورب اتر سے بھی حملہ ہوا۔ چپٹی ناک، چھوٹی آنکھوں اور پیتل جیسے رنگ والے ٹیلوں نے بارہ سنگھوں اور ٹٹوؤں پر سوار ہو کر دھاوا کیا۔ سندھو میں سیلاب آیا۔ برہم پترا میں طوفان۔ گورے اور پیلے ٹیلوں نے کالے ٹیلوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔

گورے ٹیلوں میں ایک بہت ہی جیالا ٹیلا تھا۔ اس کا نام اندرا تھا۔ وہ بڑا ہی تیلا اور چونچال تھا۔ سیر و شکار میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ کالے ٹیلوں کا جیتا جیتا خون بہا کر اسے سرور حاصل ہوتا۔ آگ کے شعلوں کے سامنے برق رفتار گھوڑوں کی قربانی اور گائے کے جوان بچھڑوں کے گوشت بھنے ہوئے ٹکڑوں کا بھننا اندر کو مرغوب تھا۔ خون اور گوشت کی بو سے اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے تھے۔ اس نے گورے ٹیلوں کو بہت بڑے جتھے میں منظم کیا اور کالے ٹیلوں اور ان کے کھلونوں کا شکار کھیلنے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کالے ٹیلوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ وہ ہماد اور دند صبا جیسی ترائیوں میں گاؤں کو اپنے خون آشام تیروں کا نشانہ بناتا رہا اور اس نے اپنی اولاد کو بھی یہی وصیت کی۔ مگر کالے ٹیلے ان گنت تھے۔ گوروں سے بہت زیادہ۔ صدیاں بیت گئیں۔ مگر گوروں اور کالوں کی جنگ ختم نہ ہوئی۔ آخر ش ایک بڑا گیانی گورا ٹیلا آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں نہ تیر تھے، نہ تلوار تھی۔ اس نے قانون بنائے۔ ودھان پیش کیا۔ اس گیانی کا نام منو تھا۔ اس سے پہلے پانچیں اور پانچیں بھی بڑے گیانی گزر چکے تھے۔ لیکن انھوں نے شبدوں کے موتی بکھیرے تھے۔ ان کی مالا گوندھی تھی۔ شبد بڑے شکتی وان۔ انھیں منو نے گیان، ودیا اور دیا کی زنجیر میں باندھ دیا۔ مگر منو نے کالے ٹیلوں کے دل چھید دیئے اور ان کے ذہنوں، خیالوں، ارمانوں اور امنگوں کو قانون کی کڑی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ منو کا یہ اندر کے تیر سے زیادہ مہلک و جان سوز نکلا۔ کالے ٹیلے روندے گئے، کچلے گئے، مٹی میں ملائے گئے، جلتے رہے۔ مگر مقابلہ کے میدان سے بھاگ گئے۔ منو کا جادو چل گیا۔ اور کالے ٹیلے گورے ٹیلوں کے داس بن کر کراہتے رہے۔ منو نے کہا: کالے اسی قابل ہیں۔ پہلے جنم کے پاپ کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ کرموں کا پھل۔ شودر کو سیوا۔ برہمن کو گیان۔

———— اور دھرتی کانپتی رہی۔ جمنا روتی رہی۔ گنگا آنسو بہاتی رہی۔ پھر سپنے کے ایک دوسرے سنسار سے مدھر بانسری کی لے ابھری۔ ہوا یہ کہ برہما اپنے خواب کے اس بھیانک حصے سے گھبرا اٹھا۔ اس نے ایک کالے کنھیا کو اتنی شکتی دے دی کہ وہ اپنے نغمے کی آنچ سے سخت دلوں کو گداز بنا دے اور کالوں کا درجہ گوروں کے برابر کر دے۔ "برائی سے لڑو خواہ تمہارا مخالف کالا ہو یا گورا۔ حق و صداقت کے سوا سب کچھ ہیچ ہے" شیام مرلی والے کی لے پر روح کی رادھائیں ناچیں۔ گوپال کے ساتھ گوپیاں رقص کرتی رہیں۔ پاپ مٹتا رہا۔ جمنا آنند سے بہتی رہی۔

مگر ہائے رے برہما کا خواب۔ بھگوان ہمیشہ بے چین ہی رہا۔ جب سے ٹیلوں میں جان آئی۔ برہما کی نیند زیادہ تر کابوس ہی بنتی رہی۔ کون جانے اس خواب کا انت کیا ہے، بھید کیا ہے! اور پھر ایسا ہوا کہ اندھیرے نے اجالے کو شکست دے دی۔ ہمالہ نے دیکھا۔ چوگرد اندھیرا گھٹا ٹوپ ہی پاپ تھا۔ نیکی منیروں میں روپوش تھی۔ راون کا راج تھا۔ دس سروں والا۔ نہایت ہی عقل مند برہمن دانشور۔ دس گنا بدھی مان بیس ہاتھوں والا طاقتور پہلوان۔ عاقل مگر ظالم۔ دانا لیکن دشٹ۔ سیتائیں دکھی تھیں۔ کالے ٹیلے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان جیسے اور ٹیلے غلام بنا لیے گئے تھے۔ سیتا کے آنسوؤں نے رگھو بنس کے سپوتوں کو غیرت دلائی۔ رام جہاد کے لیے نکلے۔ برہمن کے خلاف یدھ۔ کالے ٹیلوں نے ان کی مدد کی۔ کالے ٹیلے مہابیر تھے۔ ان کے دل اجلے تھے۔ رام کی نگاہ نے انھیں اور اجلا بنا دیا۔ راون پاپی برہمن اور اس کا سارا پاپ نذر آتش کر دیا گیا۔ نیکی منیروں کی پناہ گاہ سے نکل آئی۔ اور میدان عمل میں چھا گئی۔ ہمالہ نے سنا ——— راجہ رام کی جے! مہاتما کی جے! رام راج کی جے!

——— اور پھر ایک بار اندھیرا چھا گیا۔ چینے لے اندھیرے اجالے! تار پیرو دو رنگ! اور پھر ہوا کہ لوگوں نے سونے کے بت بنائے اور سونے کو ہی دیوتا بنا لیا۔ پتلوں کی روحیں سونے سے مرجھا دی گئیں۔ پریم کے سوتے سوکھ گئے۔ سونے میں جکڑی ہوئی روحوں کو عیش و عشرت کے دیوتا کے سامنے سجدے کرنے پڑے۔ ہر طرف ظلم تھا، ہر سو لوٹ کھسوٹ۔ روحیں سونے کی قید میں گھٹتی رہیں اور بدن موٹے ہوتے رہے۔ موٹے پتلوں نے دبلے پتلوں کو کھانا شروع کیا اور خواب موٹے ہوتے گئے۔ اچانک ہمالہ کی ایک وادی میں سونے سے مرجھی ہوئی ایک روح مضطرب ہو اٹھی۔ روح کی آنچ سے سونا پگھلنے لگا۔ سنہرے خول کی پرتیں گرنے لگیں۔ روح آزاد ہوئی۔ اس مہاآتما نے طلائی زنجیروں کو کاٹا اور زریں دیواروں کو ڈھا دیا۔ عظیم روح نے خواب کے پردوں کو اٹھا کر ماورائے خواب دیکھا۔ جہاں دکھ نہ تھے، بڑھاپا نہ تھا، موت نہ تھی۔ جہاں زندگی کا خواب نہ تھا، عدم کی حقیقت تھی۔ نروان تھا، پرما نند تھا۔

لیکن جب عظیم روح اس سراپا بدھ ہستی کو چھوڑ کر چلی گئی تو لوگوں نے رفتہ رفتہ خواب کی حقیقت کو بھلا دیا اور غفلت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے صدیوں چھائے رہے۔ لوگوں نے بدھ کو بھگوان بنا لیا اور اس کج فہمی کے نتیجے میں ظلم اور خون آشامی ہر طرف چھا گئی۔ اور ہمالہ نئی صبح کے پرکاش کے انتظار میں کھڑا رہا۔ ساکت۔ صامت۔ چشم براہ!

اور ہی خواب کے اصول چھاؤں کی ایک اور کہانی سنئے۔ یہ قصہ در قصہ ہے۔ قصوں کے لچھے۔ خواب کی کہانی مربوط نہیں ہوتی۔ خواب منظم نہیں ہوتے۔ خواب اور زندگی میں تنظیم و ربط نہیں۔ تراشیدگی نہیں۔ تعبیری ہم آہنگی نہیں۔ بس موج در موج کہانیاں ہی کہانیاں۔ ازل و ابد کی مرتعش لہریں۔ نشیب و فراز۔ ظلمت اور روشنی، زوال و عروج، موت و حیات!

ہمالہ نے اپنے عقب میں جھانک کر دیکھا۔

لق و دق کہستان، صحرا، ریگستان، میدان، سبزہ زار، کاہستان و کشت زار، برفستان تک پھیلے ہوئے تھے۔ 'سین' و 'طاسین' کی دنیا، اندار دنیا۔ ہمالہ کو سکتہ سا لگ گیا۔ صرف ناک کی سیدھ میں دیکھنا کتنا پُر فریب ہوتا ہے۔ ہمالہ نے سمجھا کہ وہ تو صرف ایک بلند مینار مشاہدہ ہے۔ عالم تو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ وہ دانشور کتنے جاہل تھے جنھوں نے گنگ و جمن سے آگے نہیں دیکھا اور کنوئیں کو سمندر سمجھ لیا۔ برہما کا خواب جہاں گیر ہی نہیں، کائنات گیر ہے اور کائنات اوگنت۔ ح

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہمالہ نے دیکھا کہ عالم شمالی بھی پتلوں سے بھرا ہوا ہے۔ زرد، پیلے اور سرخ و سفید پتلے۔ ڈھال کی طرح چپٹے چہروں والے پتلے اور تلوار کی طرح تراشیدہ اور کٹیلے پتلے۔ ان کی دیش میں بھی رست و خیز اور لغزش و انتشار کے ہنگامے برپا تھے۔ وہاں بھی شائستہ و ناشائستہ کی جنگیں تھیں۔ وہاں بھی خون بہتے تھے۔ مگر وہاں بھی کوئی ذوالقرنین امن و سلامتی کے لیے مضبوط ظاہری و باطنی سد بناتا تھا۔ ہمالہ نے دیوار چین کو مڑ کر دیکھا اور اسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ہمالہ نے تاؤ اور کنفیوشس کے نغمے بھی سنے اور اس نے محسوس کیا کہ کرشن کی بانسری ہر جگہ بجتی ہے۔ رام راکشس سے ہر جگہ لڑتا ہے۔

چین کے پیلے پتلے شہد کی مکھیوں سے زیادہ محنتی اور ذہین نکلے۔ انھوں نے نئی نئی ایجادیں کیں اور تہذیب و تمدن کو کاغذ کی ایجاد سے پر لگا دیئے۔

ہمالہ نے دیکھا۔ چینی تہذیب پورب، پچھم، اتر، دکھن تمام پھیل گئی۔ اس سے سورج کا گھر پوربی ٹاپو جاپان بھی اجالا ہوا اور کبھی

مالا ساگر تک کے سب دیپ بھی روشن ہونے لگے۔ تبت اور منگولیا بھی شناسا ہونے لگے۔ روشنی کوریا، جاپان پہنچی۔ ایران و توران کے علاوہ ہندوستان نے بھی حکمت چین سے گیان سیکھا۔ گیان اور عرفان! برہما کے سینوں کے گوہر کو دھند سے احسن کی خود بینی! نقاب کے اندر اپنی آئینہ داری آپ کرتی! سینے کے حجاب کبھی اپنے آپ سے بھی چھپ کر آرائش جمال کے لیے دزدیدہ نگاہی!

—— اور جاپان نے بھی ہند سے گیان سیکھا۔ جاپان کا دل بھی بڑا ہے اور دماغ بھی عظیم۔ جاپان نے بودھ کے پرکاش کو اپنے سینہ میں سمیٹ لیا اور اس کے ایک خاقان نے ملک کی سرحدوں سے باہر جھانکا اور دیکھا کہ برہما کے خواب کی پہنائی زمان و مکان کی حدبندیوں سے آگے ہے۔ جاپان سے آگے بھی ایک بڑا جہان ہے، 'طاسین' ——— یعنی عالم غرب، جہاں روما الکبریٰ کی عظیم تہذیب تھی۔

ہمالہ دنیا کا بلند ترین بیدار مشاہدہ۔ ہمالہ نے جاپان اور روما کی تہذیبوں سے پہلے بھی حیرت خانۂ ہستی کو دیکھا تھا۔ اس نے بابل و مصر کی سحر سامانیوں کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ برہما کے خواب کے کئی پتلے اتنے چھوٹے اتنے چھوٹے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ساری کائنات سمجھ لیا۔ اتنا سر اٹھایا کہ سارا خواب ایاں پر نقش فنا ہونے کے باوجود خود کو برہما ہی سمجھ بیٹھے۔ نمرود و فراعنہ۔ برہما تو سندرتا ہے، روشنی ہے، حسن کامل ہے اور حمد کامل کا مستحق۔ وہ تو دمیا حسن و حمد ہے۔ لیکن اس کے خواب کے پتلے عجیب و غریب ہیں۔ نفسی پیچیدگیوں میں مبتلا وہ ذہنی گتھیاں سلجھاتے، جذباتی عقدے حل کرتے اور احساسات و حواس کی گرہیں کھولتے رہتے ہیں۔ وہ خود مخلوقاتِ خواب ہیں اور تعبیرِ خواب میں مشغول بھی۔ کہانیاں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں، علوم و فنون اسی ڈھنگ سے جنم لیتے ہیں۔

ہمالہ نے دیکھا —— نمرود محض نفسِ امارہ کی ایک سرکش لہر تھا اور ابراہیم نفسِ مطمئنہ کا مظہر، برہما کا اوتار۔ ابراہیم نے دجلہ و فرات کی وادی میں ابھرنے والے قبیلوں کے نفسِ لوامہ کو بیدار کر کے انھیں آزادی اور حریت کی راہ دکھانی چاہی۔ ابراہیم بہت ہی پیارا، بہت پیار کرنے والا، نہایت مخلص، بڑا ذہین اور مستقل مزاج تھا۔

ابراہیم کی جائے کتھا یہ۔ وہ سندرتا اور سچائی کا کھوجی تھا۔ اس کے دیس والے چاند تاروں اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔ مگر اس کی نظر ستاروں سے آگے دیکھتی تھی۔ آئینہ کو نہیں محبوب کو دیکھتی تھی۔ ٹمٹماتے ہوئے تاروں نے اسے اشارے کیے۔ وہ پیارے پیارے، اور اچھے اور چمکیلے تھے۔ ابراہیم نے محسوس کیا کہ یہ بھولوں کا دل موہ لیں گے۔ مگر اس کی ذہانت نے پایا کہ ان کی روشنی کامل نہیں۔ چاند نے جب اپنی جوت جگائی تو تارے ماند پڑ گئے۔ چاندنی کا جادو چل گیا۔ ابراہیم کے ذہن نے سوچا کہ یہ بھی حسن بے پایاں کہاں۔ وہ فریب ہے اور حسین فریب چل جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسی ڈھلتے ہوئے چاند کے جمال کو لوگ حقیقتِ منتظر سمجھ بیٹھیں۔ لیکن چاند کی چاندنی بھی ماند پڑ گئی اور اس کی تنک تابی نے مہرِ درخشاں کا پیام دیا۔ آفتاب نکلا اور باآب و تاب نکلا۔ اس کی جولانیاں خیرہ کن تھی۔ حرارت و حیات کا منبع سورج! ابراہیم کے فکر نے پرواز کی۔ اسے خیال آیا کہ نارسا ذہن چڑھتے ہوئے سورج کے سامنے جبیں نوائیں گے۔ اس نے سوچا کہ شکر ہے سورج ڈوبتا بھی ہے اور جو حاضر و ناظر نہیں، جو مجبورِ زوال ہے، وہ سرچشمۂ قوت و حیات کس طرح ہو سکتا ہے۔ ابراہیم کے ذہنِ رسا، فکرِ بلند اور نگاہِ دوربین نے نور الانوار کو حجاباتِ نور کے اندر دیکھ لیا اور اس کی روح رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔

ابراہیم ایک دانشور تھا۔ وہ ذوقِ سلیم اور مذاقِ لطیف رکھنے والا بھی تھا۔ اس کی حکیمانہ باتوں میں مزاح و طنز کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اس کا گھر صنم سازوں کا خانوادہ تھا۔ اس نے بکری کے دیوتا دیکھے اور ہنس پڑا۔ ایک دن اس نے چند چھوٹے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ دنیا کی دوکان میں خلفشار مچا۔ دیوتا کو کس نے توڑا؟ ابراہیم خاموش تھا۔ لوگوں نے کہا۔ اسی نے بت شکنی کی ہوگی۔ اسی کے ایسے لچھن ہیں۔ گھر کے بزرگوں نے

ڈانٹ کر پوچھا، ابراہیم نے ہنس کر جواب دیا۔ بڑے بت سے پوچھو نا، اسی دیوتا نے چھوٹے دیوتاؤں کو بھسم کر دیا ہوگا! سب لاجواب ہو گئے۔ گونگے اور بےبس دیوتاؤں کی کثرت کتنی مضحکہ خیز چیز ہے!

پہلے ابراہیم کا دماغ جاگا تھا۔ پھر اُس کا دل بیدار ہوا۔ اور اس تیسری کتھا میں اس کے ہردے کی جاگ کی کہانی ہے۔

—— اور ابراہیم نے اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہا۔ وہ حیات و موت کے راز جانتا تھا۔ وہ ابدی زندگی کی ہیٹکری حقیقت سے واقف تھا۔ لیکن حقائق جب تک واردات نہ بن جائیں بےجان رہتے ہیں۔ ابراہیمؑ کی آتما نے پرماتما سے پوچھا۔ "پرماتما! تو نے سرشٹی کو رچا۔ تو خالقِ اکبر ہے۔ بتا! موت کے بعد تو کس طرح زندگی کو عطا فرمائے گا؟" پرماتما نے جواب دیا۔ "میں پرماتما ہوں۔ آتما اور پرماتما کے درمیان پریم کا بندھن ہے۔ پریم کی ڈور میں بندھی ہوئی ساری روحیں میری طرف کھنچی آئیں گی اور مجھ میں حیاتِ تازہ پائیں گی۔" ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ چند پرندے پالے۔ انھیں کھلائے پلائے، سدھائے اور اُن سے پیار کرے۔ جب پرندے اُس سے ہل مل گئے تو حکم ہوا کہ انھیں دور دور پہاڑوں پر چگنے کے لیے چھوڑ آؤ۔ ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ پھر حکم ہوا کہ انھیں پکار کر آواز دو۔ پرندے بیتابانہ اُس کی آواز سن کر دوڑے ہوئے آئے۔ اور ابراہیم کے دل کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ اس کے ہردے میں یہ بات گھر کر گئی کہ اس دنیا میں مردہ روحیں محبت سے ہی نئی زندگی پا سکتی ہیں اور اُس عالم میں بھی یہی محبت کی بجلی انھیں جی اٹھنے کے قابل بنا دے گی۔ عشق حیاتِ عالم ہے۔ محبت روحِ کائنات ہے۔

اور اب ابراہیم کی چوتھی کتھا شروع ہوتی ہے۔ ابراہیم حنیف کا دل گہوارۂ محبت بن گیا تھا۔ مگر —— ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ علم بھی آگ ہے اور جہالت بھی آگ۔ محبت بھی آگ ہے اور نفرت بھی آگ۔ علم اور عشق آتشِ روشن ہیں اور جہل و نفرت آتشِ تاریک۔ آگ آگ کو جلا نہیں سکتی۔ مگر روشن آگ تاریک آگ کی ظلمتوں کو دور کر سکتی ہے۔ ابراہیم کے دل میں شعلۂ عشق بھڑک رہا تھا۔ جاہلوں نے اسے اپنی مخالفت اور نفرت کی سیاہ آگ میں جلانا چاہا۔ مگر ابراہیم کو یہ کالی ناگن ڈس نہ سکی۔ آگ ٹھنڈی ہو گئی اور ابراہیم کے لیے سلامتی ہی سلامتی تھی۔ محبت سلامتی ہے! محبت امن ہے! محبت حیات ہے!

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اور مہاتما نے دیکھا: نسلِ ابراہیمی نیل کے ساحل سے لے کر تابہ فرات پھیل گئی اور پھیلتی ہی چلی گئی۔

آلِ ابراہیم! —— جیسے سمندر کی لہریں! ——
آلِ ابراہیم! —— جیسے ریگستان کے ذرّے! ——
آلِ ابراہیم! —— جیسے آکاش کے تارے! ——

اور مہاتما نے دیکھا: ابراہیم کی مشعل جلتی ہی رہی۔ اندھیرے شکست کھاتے ہی رہے۔ محبت مُردوں کو زندہ کرتی ہی رہی۔ ابراہیم کی محبت یوسف کے حسن میں چمکی اور اس نے مصر کو نظام دیا۔ ابراہیم کا عشق موسیٰ کے یدِ بیضا میں تاباں ہوا اور ساحر اہرام سجدہ ریز ہو گئے۔ ابوالہول سکتہ میں آ گیا۔ مصر کے پتلے ابدیت کی تلاش میں اپنی لاشوں کو حنوط شدہ بناتے رہے۔ لیکن اُن کی روحیں اہرام کے ظالمانہ بوجھ تلے سسکتی ہی رہیں۔ موسیٰ نے کہا: حیات اہرامِ مصری میں نہیں، زندگی سحرِ سامری میں نہیں، ضربِ عشق میں ہے یدِ بیضا میں ہے۔ موسیٰ نے عشق کی آگ کو

مہر خود روشن دیکھا اور اس کے جلوؤں سے اپنے دل کو معمور کر لیا۔ اُس نے اسی آگ سے ایک مردہ قوم کو زندہ کر دیا اور اہرامِ مصر کی بلندیاں غرقِ نیل ہو گئیں۔

——— اور ہمالہ نے دیکھا، ابدیت حنوط شدہ لاشوں میں نہیں، سقراط کے زہر پینے میں ہے۔ حسن صداقت ہے، محبت حقیقت ہے۔ محبت نہ آگ میں جلتی ہے، نہ زہر سے مرتی ہے۔ محبت، حسن اور صداقت ابدی ہیں۔ خواب کے پیکر فانی ہیں۔ حقیقت اور ابدیت ہمالہ کے لئے خواب ہے۔ یہ تو عشق کی جرأتِ رندانہ ہے جو سارے پردے اٹھا کر، برہما کے خواب میں رخنے ڈال کر ہمالہ نے خوابِ ابدیت کو جھانک کر دیکھ لیتی ہے۔ ابراہیم، موسیٰ، سقراط، کرشن، رام اور بودھ نے برہما کے خواب کے گورکھ دھندے سے آگے برہما کے چہرے کو دیکھ لیا اور وہیں ابدیت تھی۔ حسن تھا، عشق تھا۔ مگر ابھی برہما کے خواب کا ارتقاء باقی تھا۔ وہ دور بھی آیا جب خواب کے ایک پتلے نے برہما کے دل میں جگہ پالی۔ آہ! یہ برہما کے خواب کی پُر پیچ راہیں! اس مقام عروج کے پہلے بھی صلیب اور بعد بھی صلیب! خواب کے پتلوں کا راستہ پُرخار و پُرخون ہے۔ برہما خود تو کامل ہے۔ لیکن وہ ناتمامی کے خواب دیکھتا رہتا ہے، اور فارغ ہو کر وہ ناتمامی کو مٹانے کے لیے آرزو مندانہ طور پر سعیٔ پیہم بھی کرتا رہتا ہے۔ وہ خاکی پتلوں کی بندگی کے درد و جگر کا درماں بھی پیدا کرتا ہے اور کبھی دردِ لادوا بھی بخشتا ہے۔ وہ خواب دیکھ کر ہی اہرمن تخریب کرتا ہے۔ اور پھر اہرمن شکاری بھی خالق کے قادر ہونے کا احساس و اظہار اسی طرح ہوتا ہے۔ ناکامل کو کامل بنانے اور شیطان کو شکست دینے میں اُسے لذت ملتی ہے۔ مگر حقیقت تو صرف یزداں کی ہے۔ حسرتیں تو اُس کی خواب ہی میں پوری ہوتی ہیں۔ آرزومندانہ خواب! جاگتے ہوئے تو اُسے شعورِ کمال اور کمالِ شعور حاصل ہوتا ہے۔ یزداں اپنے اوپر خواب طاری کرتا ہے۔ وہ روزہ رکھ لیتا ہے تاکہ انتظار کر کے اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک نئے پہلو سے اظہار کرے۔ خواب میں اس کی حسرتیں جاگتی اور پوری ہوتی ہیں۔ وہ پتلوں کی تکمیل کے لیے کڑھتا ہے اور کس حسرت سے کہتا ہے۔

تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے؟ بیداری میں برہما ہمالہ کے لئے حسرت و ارمان ہے۔ احد ہے، صمد ہے۔ اُس کے جلوۂ احدیت کی کسے تاب ہے! نہ کائنات کو، نہ فطرت کو، نہ حیات کو ——!

——— اور ہمالہ نے دیکھا:

موسیٰ نے غلام بنی اسرائیل کو ظالم فرعون کے پنجہ سے نجات دلائی۔ سمندر شق ہوا اور موسیٰ کی بھیڑیں سلامت نکل گئیں۔ مگر فرعون اور اُس کے لشکر کو بحرِ احمر نے نگل لیا۔ وہ صحراؤں میں تعمیرِ ملت کرتا رہا اور یونانی، رومی، مصری، آشوری، بابلی، کلدانی، سیدی اور ایرانی دستِ قدرت کی اعجوبہ کاریاں حیرت سے دیکھتے رہے۔ اور موسیٰ نے کہا۔ قیدار کے خیموں میں بھی زندگی دوڑے گی، صحرائے عرب میں بھی قیامت آئے گی اور میرے بھائیوں میں سے خدا مجھ سا ایک نبی برپا کرے گا۔ خدا فاران سے طلوع ہوا اور شعیر پہ چمکا۔ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور ایک آتشیں شریعت لایا۔ اور موسیٰ کے بعد سے خلیفہ یوشع بن نون کو یہوواہ نے ارضِ موعود عطا کر دیا۔ کیونکہ وہ اسرائیلؑ اور ابراہیمؑ کا خدا تھا۔ اس کے عہد میں داؤدؑ نے نغمے گائے ———

زمین رب العزت کی ہے اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُسی کا ہے۔ ساری دنیا اور اُس کے تمام باشندے اُسی کے ہیں۔ ...... اے پھاٹکو کھل جاؤ اور اے ابدی دروازو وا ہو جاؤ۔ وہ صاحبِ جلال و جبروت بادشاہ آ رہا ہے۔ یہ ملکِ ذوالجلال کون ہے؟ رب العزت، قوی و عزیز، جنگ میں غالب، رب الافواج!

اور داؤد کے بیٹے سلیمانؑ نے میراثِ داؤدؑ کو مستحکم بنایا اور یروشلم میں ہیکل تعمیر کیا۔ اس نے حسنِ منتظر، محبوبِ خدا کو کشف میں دیکھا اور اس کی نعت میں نغمۂ نغمات پیش کیا ———

میرے محبوب تو سراپا حسن ہے ، بہار دلکش ! ایک محفوظ باغ ، ایک مستور چشمہ صافی ، ایک مختوم فوارہ !

میرا محبوب سرخ و سفید ہے وہ دس ہزار اصحاب کے درمیان سربلند ہے ۔

اس کے لب جو دہن شیریں ہیں ، محبت آمیز سراپا حسن و توصیف یہی میرا محبوب ہے ، یہی میرا دوست ہے ۔ اے یروشلم کی بیٹیو !

— — اور پھر خطاکاروں اور فاسقوں نے یروشلم کے تقدس کو اپنے عناد نے اعمال سے گرد آلود کر دیا ۔ ارض موعود ، نبیوں کی پاک سرزمین ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ، یروشلم اور صیہون کا شہر برباد ہوا ، یہوواہ کے باغ ہائے زیتون و انار کنج ویران ہو گئے ، صیہون کی پہاڑیاں سخت اور چٹیل ہو گئیں ۔

اور اسرائیل انبیاء نے فریاد کی ، خدا نے کہا

یسعیاہ نبی نے کشف میں دیکھا :

بیل بھی اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا بھی اپنے آقا کو جانتا ہے ۔ مگر بنی اسرائیل نہیں شناخت کرتے ۔ انھوں نے رب العالمین کو بھلا دیا اور اس کے نصب و جوڑ کا پایا ۔ یہوواہ نے اپنی محبوب قوم کو ایک انگوری باغ دیا اور اسے ثمر در بلندی پر قائم کیا ۔ اسے دیواروں سے محفوظ بنایا گیا ۔ اس میں اعلیٰ قسم کے انگوری بیلیں لگائی گئیں اور نفیس انگوری شراب نچوڑنے کی بھٹی تعمیر کی گئی ۔ توقع تھی کہ اس باغ میں اعلیٰ درجہ کے انگور پھلیں گے ۔ لیکن اس میں جنگلی کھٹے انگور لگنے لگے ۔ آخر اس باغ سے حفاظت کی جھاڑیاں کاٹ دی گئیں اور چار دیواری کی دیواریں ڈھا دی گئیں ۔ جانوروں نے بیلیں چبا لیں اور کیاریوں کو روند دیا ۔ باغ ویران ہو گیا ۔ اس میں خار دار جھاڑیاں اور کانٹے اُگنے لگے ۔ یہوواہ نے بادلوں کو حکم دیا کہ اس باغ پر آب نہ برسیں اور ہوا نے یوں سیاہ فواج کا انگوری باغ کیا تھا ۔ خاندانِ اسرائیل ۔ اور یہوداہ کے لوگ اس کے پودے تھے ۔ اور ان پودوں نے ناحق بغاوت کی ، قوانین کو توڑا ۔ سبت کے دن کا احترام نہ کیا ، توبہ کی اور پھر اسے فراموش کر دیا ۔ یہاں تک کہ یہوواہ کا جلال ظاہر ہوا اور اس نے بنی اسرائیل کو عاشوریوں کا تسلط بنا دیا ۔ بے انصاف خیالی بنیادوں کا انجام ، محتاجوں کو رد کرنے والے ، غریبوں کا حق تلف کرنے والے ، بیواؤں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنانے والے ، اور یتیموں کو لوٹنے والے ۔ عاشوری ، خدا کے غضب کی لاٹھی ، اس کی ناراضگی کا ڈنڈا !

لیکن عاشور سے بچے کھچے لوگ معاف کر دیئے گئے ۔ ان کی اصلاح ہو گئی اور ان میں منصف ، ذہین ، دور بین اور خدا ترس فرمانروا پیدا ہوئے ۔ یہوواہ تعریف کا مستحق ہے ، وہی نغمہ مسرت ہے ، وہی راہِ نجات ہے ! عاشوری طاقت توڑ دی گئی ، مگر اسرائیل پھر بگڑ گئے ۔

اے باب یروشلم زاری کر ، اے شہر رو ! اے فلسطین تو برباد ہو گیا !

کبھی عاشوریوں اور مصریوں میں جنگ ہوئی اور کبھی صلح ۔ فلسطین مرکزی حیثیت سے پھلا پھولا اور پھر اپنی خطاؤں کی آگ میں آپ جل گیا ۔

ہم آلہ نے سنا !

یسعیاہ اور یرمیاہ نے اسرائیل ، یہوداہ اور صیہون کو نصیحتیں کیں ۔ ان نبیوں نے یروشلم کو ڈرایا ، مگر متکبر گردنیں نہیں جھکیں ، سخت دل نہیں پگھلے ۔ یہوواہ نے کہا :

میں تمہیں اس سرزمین سے نکال باہر کروں گا ۔ اور بیگانہ علاقوں میں تم غلامانہ زندگی بسر کرو گے ۔ بھیڑیے آئیں گے اور تمہیں پکڑ لے جائیں گے ، شکاری حملہ آور ہوں گے اور تمہیں نشانہ بنائیں گے ۔ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی ۔

میں نے زمین و آسمان بنائے ہیں ۔ میں سارے آدمیوں اور تمام مخلوقات کا خالق ہوں ۔ میں اپنی قدرت کاملہ اور وسیع اختیار کے تحت جسے چاہتا ہوں سرزمین کا وارث بناتا ہوں ۔ اور اب میں نے ارض فلسطین اور بہت سارے ملک بخت نصر شاہ بابل کو عطا کر دیئے ۔ بادشاہوں اور قوموں

کو اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ آلِ اسرائیل اسیر کیے جائیں گے اور بابل کی غلامی کریں گے تا آنکہ ستر سالہ مدت پوری ہو جائے گی اور بعد میں ان کی ستمگاری کی طرف متوجہ ہوں گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ یہودیوں کا بادشاہ زیدکیاہ اپنی تمام قوم کے ساتھ مغلوب ہوا اور پابہ زنجیر بابل کو لے جایا گیا۔ یہود نے اخوت، مساوات اور آزادی کی تعلیم کو بھلا دیا۔ اپنے بھائی، اپنے ہمسایہ اور یہوواہ کے کمزور غریب و محتاج بندوں کا حق ادا نہ کیا۔ یہوواہ کا غضب بھڑکا اور اب اس نے ظالم، دغاباز اور قحط کو آزادی سے دی کہ وہ اسرائیل کی فربہ بھیڑوں کو تباہ و برباد کر دیں۔

بخت نصر نے ایک خواب دیکھا اور اُسے بھول گیا۔ اُس نے اپنے وزیر دانا کو بلایا اور اُسے حکم دیا کہ مملکت کے سارے کاہنوں، رمالوں، ساحروں، نجومیوں، فلسفیوں، مذہبی پیشواؤں اور عالموں کو بلاؤ۔ اگر وہ بھولا ہوا خواب یاد نہ دلا سکیں اور اُس کی تعبیر نہ سنائیں تو سب کے سر قلم کر دو۔ مملکت بھر میں سنسنی اور خوف پھیل گیا۔ لوگ دانیال کے پاس آئے اور یہ وحشت ناک خبر سنائی۔ دانیال بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے تعبیرِ خواب کے لیے وقت مانگا۔ سارے عقلا اپنے عجز کا اعلان اور اپنی بے بسی کا اعتراف کر چکے تھے۔ بادشاہ نے دانیال کو مہلت دے دی۔

دانیال اپنے گھر واپس لوٹا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ ماجرا کہہ سنایا۔ ان سبھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خدائے ارض و سما کے آگے سجدہ ریز ہو کر دعائیں اور التجائیں کریں گے تا کہ وہ علیم و قدیر اس بھید سے انھیں آشنا کر دے اور ان سب کی جانیں بچ جائیں۔ آخرش اللہ تعالیٰ نے دانیال پر اس راز کو منکشف کر دیا۔ اُس نے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و توصیف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر دانیال بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کی:

"اے شہنشاہ! جس بھید کا پتہ عقلا نہ پا سکے اس بھید سے خداوندِ عرش نے مجھے آگاہ کر دیا ہے تاکہ میں عالی جاہ کے حضور خواب اور تعبیرِ خواب دونوں بیان کر دوں۔ وہی صاحبِ عرش و کرسی علام الغیوب ہے۔ وہی اپنے بندوں پر رازہائے سربستہ کا انکشاف فرماتا ہے۔"

"اے شہنشاہ! حضورِ والا نے خواب میں ایک عظیم الجثہ مجسمہ دیکھا۔ بڑا بھاری اور مہیب ہیکل حضور کے سامنے استادہ نظر آیا۔ اس کا سر خالص سونے کا تھا۔ سینہ اور بازو چاندی کے تھے۔ پیٹ اور جانگھ پیتل کے۔ ٹانگیں لوہے کی اور پاؤں لوہا اور مٹی کے آمیزہ سے بنے تھے۔ حضورِ عالی اسے دیکھتے رہے تاآنکہ ایک پتھر بغیر کسی ہاتھ کی مدد کے پہاڑوں سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا اور بت کے پاؤں پر دے مارا گیا۔ پاؤں چکنا چور ہو گئے۔ پھر سارا بت ریزہ ریزہ کر دیا گیا اور بھس بنا کر اڑا دیا گیا اور جس پتھر نے مجسمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا وہ بہت بڑا پہاڑ بن گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام روئے زمین پر وہ پھیل گیا ہے۔

یہ تو جنابِ والا کا خواب ہوا اور اب میں اس کی تعبیر عرض کرتا ہوں ——

اے بادشاہ! آپ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں۔ خدائے عرش نے حضورِ عالی کو سلطنتِ عظیمہ، اقتدارِ اعلیٰ اور قوت و جبروت کی نعمتیں بخشی ہیں۔ حضورِ والا اس شہنشاہیتِ عظمیٰ کے فرماں روا ہیں۔ حضورِ عالی کے بعد اور حکومتیں ہوں گی، جن کی مثال چاندی کی ہے۔ وہ حضورِ والا کی سلطنت سے فروتر ہوں گی۔ بعد ازاں تیسری حکومت پیتل کی مانند ہو گی۔ چوتھی لوہے کی طرح مضبوط ہو گی۔ وہ دوسروں کو توڑے گی اور جب خود ٹوٹے گی تو اپنا ہاتھ آپ مجروح کرے گی۔ اور پانچویں حکومت آئے گی۔ یہ بٹی ہوئی ہو گی۔ کچھ کمزور کچھ مضبوط، منظم و مربوط نہ ہو گی۔ اس دورِ آخر میں غیب کا ہاتھ ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالے گا اور اسے مستحکم و طاقتور بنائے گا۔ وہ ساری حکومتوں کا خاتمہ کرنے والی حکومت ہو گی اور زمانۂ دراز تک قائم رہے گی۔ خدائے ذوالجلال نے بادشاہ کو مستقبل کی خبر دی

اور بخت نصر کو بتایا ہے کہ سلطنت بابل کا خاتمہ ہو گا۔ یہی تیرے خواب کی سچی تعبیر ہے۔"

بادشاہ نے اقرار کیا کہ یہی خواب دیکھا تھا اور کہا بے شک تیرا خدا رب الارباب اور ملک الملوک ہے۔ وہ علام الغیوب اور کاشف الحقائق ہے۔"

بخت نصر دانیال پر مہربان رہا۔ اس نے خدا کے پیغمبر کی قدر کی تو خدا نے اس پر رحم کیا۔ ایسا ہوا کہ اس سے سلطنت چھن گئی مگر خدائے غالب نے بخت نصر کو پھر تاج و تخت واپس دے دیے اور دانیال نے ایک اور رویا دیکھی۔

دانیال نے دیکھا کہ وہ دریائے اولائی کے کنارے پر ہے۔ سامنے ایک دو سینگوں والا مینڈھا کھڑا ہے۔ سینگ بہت بڑے بڑے ہیں۔ لیکن ایک نسبتاً چھوٹا ہے۔ پہلے چھوٹا سینگ سامنے آتا ہے پھر بڑا سینگ۔ مینڈھا مغرب، شمال اور جنوب کی طرف سر مارتا ہے۔ کوئی جانور اس کے مقابلے کی تاب نہیں لاتا۔ کسی کو اس سے نجات نہیں ملتی۔ وہ اپنی من مانی کرتا جاتا ہے اور بڑا بنتا جاتا ہے۔ اچانک ایک بکرا مغرب سے آنکلا اور تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ اس کی آنکھوں کے بیچ میں ایک بڑا سا سینگ نمایاں تھا۔ بکرا مینڈھے پر غضب ناک ہو کر حملہ آور ہوا۔ اس نے مینڈھے کے دونوں سینگ توڑ دیے۔ اسے زمین پر دے مارا اور پاؤں سے خوب روندا۔ پس بکرا بہت عظیم الشان بن گیا۔ اور ابھی وہ طاقتور تھا ہی کہ اس کا سینگ ٹوٹ گیا۔ پھر چار اور سینگ نکل آئے۔ ان میں سے ایک سینگ کے اندر ایک اور چھوٹا سا سینگ پھوٹا اور بہت بڑا ہوتا گیا۔ یہ جنوب کی جانب، مشرق کی جانب اور "ارضِ نشاط خیز" کی طرف بڑھتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ بہت عظیم الشان بن گیا اور آسمان تک جا پہنچا۔ یہاں تک کہ اس نے چند مخلوقاتِ سماوی اور چند تاروں کو زمین پر گرا لیا اور انھیں پاؤں تلے روندا۔ اس نے اپنی کبریائی کا دعویٰ کیا اور آسمانی بادشاہت کے شہزادے پر حملہ آور ہوا، عبادات کو بند کیا اور مقدس مقامات کو مٹایا۔ اس کے اندر عالم افواج کی طاقت تھی۔ دانیال کو پھر مکاشفہ ہوا۔ اس نے مقدس ارواح کی باتیں سنیں اور اسے خواب کی تعبیر بتائی گئی۔

اسے معلوم ہوا کہ آخری زمانہ کے اس فتنۂ عظیم سے مکمل رستگاری دو ہزار تین سو سال کے بعد ہو گی۔ جبرئیل نے بتایا کہ مینڈھے اور اس کے دو سینگوں سے مراد ہے مدیا اور فارس کے بادشاہ اور بکرے سے مراد ہے یونان کے بادشاہ۔ دونوں آنکھوں کے درمیان والے طاقتور سینگ کا مطلب یہ ہے کہ یونان کا پہلا شہنشاہ عظیم طاقتوں والا ہو گا۔ چار سینگوں کی تعبیر ہے چار سلطنتیں جو یونانی تہذیب کی پروردہ ہوں گی، مگر پہلی شہنشاہیت سے کمزور ہوں گی۔ اور مغربی یونانی تہذیب کے دورِ آخر میں دجل و ظلم کی انتہا ہو گی اور ان میں ایک مہیب بادشاہ پیدا ہو گا۔ اس کے تاریک عقائد ہوں گے۔ وہ قوت و جبروت کا مالک ہو گا۔ تخریب کا دیوتا بن جائے گا۔ مضبوطوں اور مذہبی لوگوں سے دشمنی کرے گا۔ اس کے نظام کی ترقی سے صنعت و حرفت کو بڑا فروغ حاصل ہو گا۔ وہ امن کا نام لے کر لوگوں کو تباہ کرے گا۔ اور روحانی شہزادۂ شہزادگان کے خلاف کھڑا ہو گا۔ آخرش کرامات کے ذریعہ وہ توڑا جائے گا۔

دانیال کو شمال اور جنوب کے مختلف بادشاہوں اور سلطنتوں کے درمیان جنگوں کا ایک سلسلہ کشف کے ذریعہ دکھایا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ سلسلہ آخری زمانہ تک پہنچتا چلا جائے گا۔ تاآنکہ شمال کی سلطنت میں ایک آمرِ مطلق رونما ہو گا۔ وہ ساری پرستیدہ ہستیوں سے اپنے کو بلند و بالا قرار دے گا اور رب الارباب کے خلاف حیرت ناک باتیں کرے گا۔ وہ اپنے آبائی مذہب کا انکار کر دے گا اور کسی ماورائی طاقت کا قائل نہ ہو گا۔ لیکن اپنی مملکت میں وہ طاقت کے دیوتا کی عبادت کرے گا۔ اور بالکل نئے تصورات کی پوجا میں لگ جائے گا۔ قوت و جبروت، چاندی اور سونا اور مادی لذات کو اپنا معبود بنائے گا۔ وہ منفعت کے لیے زمینوں کی تقسیم کرے گا اور بہتیری قوموں پر جابرانہ حکومت کرے گا۔

جنوب کے بادشاہ سے اس کی لڑائی ہوگی اور اہلِ جنوب پر وہ طوفان کی طرح چھا جائے گا اور ارضِ مقدس تک جا پہنچے گا۔ مصر کے خزائن پر بھی اُسے قدرت حاصل ہوگی۔ اچانک شمال اور مشرق سے اُس کے لیے بُری خبریں آئیں گی اور اُسے اپنے علاقہ کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ آخرالامر وہ تباہ کر دیا جائے گا اور بے یار و مددگار اپنے بُرے انجام کو پہنچے گا۔

خواب کے پتلے بھی خواب دیکھتے ہیں۔ یہ سارے سپنے برہما کے من کی موجیں ہیں۔ یہی من موجی سپنے حقیقت کا روپ دھارتے رہتے ہیں۔ سپنے بھی اُسی کے، سپنوں کا دیس بھی اُسی کا، سپنوں کے پتلے بھی اسی کے اور تعبیریں بھی اُسی کی ——!

ہمارے نے دیکھا! آخرش میدیا اور فارس کا بادشاہ خورس اعظم ذوالقرنین یعنی دو سینگوں والا مینڈھا بنا اور اُس نے مشرق و مغرب میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اُس کے ہاتھوں بابل کی سلطنت برباد ہوئی اور آلِ اسرائیل اسیری سے آزاد ہوئے اور یروشلم پھر آباد ہوا۔ فارس کی طاقت کو سکندر یونانی نے پاش پاش کر دیا۔ بکرے نے مینڈھے کو مار گرایا۔ سکندر، یونان کے مرکزی سینگ نے دارا کی طاقت توڑی مگر ایامِ شباب میں ہی اُکھڑ گیا۔

ہمارے نے دیکھا:

ستر سال کے بعد آلِ اسرائیل کو بابل کی قید سے رستگاری حاصل ہوئی اور یہوداہ یروشلم میں واپس آیا۔ دخترانِ صیہون نے خوشیاں منائیں اور رقص کناں ہوئیں۔ ذکریا اور یحییٰ نبی کے دعاؤں کے سایہ میں بنی اسرائیل پھر پروان چڑھنے لگے۔ کچھ دنوں بعد یہودیوں نے پھر شریعت کی بے حرمتی کی۔ علمائے یہود بہی بگڑ گئے۔ وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے اور ان کے ہاتھوں قوانینِ توریت کی مٹی پلید ہوئی۔ آخرش یہوداہ نے اُن کو بھی رسوا اور خادم بنا دیا۔ رومی شہنشاہوں نے انھیں کچلا اور اُن کی فوجوں نے انھیں پاؤں تلے روندا۔ بنی اسرائیل اپنے گھر میں اسیر ہو گئے۔ غلامی اُن کی قسمت میں لکھ دی گئی۔ خدا کی رحمت جوش میں آئی اور آلِ اسرائیل کی حیاتِ ملی کی شام کے وقت اچانک روشنی ہوئی اور صدق و محبت کا ستارہ طلوع ہوا۔ رومی بادشاہ ہیرودؔ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اور اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ یہودیوں کا بادشاہ پیدا ہوا۔ بپتسمہ دینے والے جوہن نے اعلانِ عام کیا کہ آسمانی بادشاہت قریب ہے۔ توبہ کرو تاکہ بخشے جاؤ۔ صحرا بہ صحرا اس مردِ خدا نے منادی کی اور شہزادۂ امن کے لیے راستے صاف کیے۔ عیسیٰ مسیح کا نزول ہوا۔ آسمانوں کے دروازے کھل گئے اور روحِ سماوی فاختہ کی شکل میں اس پر نازل ہوئی۔ خدا کے اس پیارے نے یہودیوں کو درسِ محبت اور دعوتِ اخلاص دی۔ اُس نے فقیہوں اور فریسیوں کو ظاہر داری و مکاری سے روکا اور صدوقیوں اور رئیسوں کو مادہ پرستی اور سنگدلی پر ٹوکا۔ اُس نے بتایا کہ انسان روٹی کے سہارے نہیں بلکہ محض خدا کے فضل سے جیتا ہے۔

عیسیٰ نے کہا:

برکت والے ہیں عاجزی کرنے والے کیونکہ وہی زمین کے اصلی وارث ہیں ——————

—— برکت والے ہیں رحم دل کہ اُن پر بھی رحم کیا جائے گا ——————

برکت نازل ہوئی مخلصوں پر کہ وہی خدا کا دیدار کریں گے ——————

صاحبِ برکت ہیں اہلِ صلح کہ وہی خدا کی اولاد کہلائیں گے ——————

برکت والے ہیں وہ جنھیں صداقت کی خاطر ظلم و ستم سہنا پڑے کہ وہی آسمانی بادشاہت میں داخل ہوں گے۔

اے مظلومو! تم زمین کا نمک ہو۔ دیکھو اپنے مزے اور مزاج کو قائم رکھو۔ تم اگر بدمزہ ہوتے تو تمہاری بے نمکی بھلا کون

دور کرے گا۔

تم سامنے جہان کی روشنی ہو، اپنے نور کو مینار روشنی کی طرح سربلند و بالا رکھو!
اے لوگو تم کامل بنو جیسے تمہارا آسمانی باپ کامل ہے۔
کل فردوس یروشلم نے اس کی نرمی دی، بڑے درخت نے زہر کا پھل دیا۔

بدنصیب یہودیوں نے یسوع کو پتھر سے توڑا اور امن و محبت کی روح کو سولی پر چڑھوا دیا۔ کون گنہگار تھا۔ رومی گورنر پانٹس پائلاطس یا تعصب والے سنگ دل القلب یہودی علما و فقہا؟

زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ روح حضرت صلیب پر سے پکاری: ایلی! ایلی! لما سبقتنی؟ اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا؟ آدمی کی پیشانی پر شکن پڑ گئیں، ہمالہ کی بلندیاں لرزیں۔

خدا نے اپنے پیارے بیٹے کو نہیں چھوڑا۔ مگر اسے آزمائش کا تلخ پیالہ پینا پڑا۔ اس کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور وہ پھر لوٹ گیا۔ حواریوں سے جھیل گلیلی کے کنارے ملا۔ بعض نے اس کی حیات نو پر شک کیا۔ عیسیٰ نے انھیں نصیحت کی اور کہا:

ساری قدرت مالک میرے ہاتھ میں ہے۔ اسی نے مجھے زمین و آسمان کی طاقتیں بخشی ہیں۔ سخت دلی اور بے یقینی کی عادتیں ترک کرو اور جا کر قوموں کو تعلیم دو اور ان سے بیعت برکت کے دروازے کھلے۔ بعد ازاں وہ بادلوں میں غائب ہو گیا۔

یہودیوں پر خدا کا غضب بھڑکا اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ انگوری باغ کے مالک نے یہ امانت ان سے چھین لی اور اس باغ کی نعمت دوسرے مالیوں کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ انجیر کا درخت بے ثمر کاٹا گیا۔ فلسطین برباد ہوا اور رومیوں نے بدخصال غلاموں کو سارے عالم میں رسوا ہونے کے لیے بکھیر دیا۔ دانی ایل کی پیشینگوئی کا ایک حصہ پورا ہوا اور وعدۂ آخر تک کے لیے اسرائیل کی سلطنت نابود ہو گئی۔

ہمالہ کی بلند چوٹیوں نے ابن آدم کی بے قرار دعاؤں کی گونج سنی تھی۔ وہ اپنے آسمانی باپ سے رو رو کر دعائیں کرتا تھا۔ چشموں کے کنارے، خاموش وادیوں میں، بلند پہاڑوں پر، مقام بہ مقام، گام بہ گام۔ دل طوطا انھیں دعاؤں کی آواز بازگشت سن کر اپنے آقا کی تلاش میں دیار ہند میں آیا۔

آسمانی باپ نے ابن آدم کو برکتوں پر برکتیں دیں۔ مشرق و مغرب میں اس کی امت پر روحانی اور مادی نعمتیں نازل کیں۔ اصحاب کہف اور راہبان زنجیر بھوکے شیروں کے سامنے ڈالے گئے۔ ریچھوں نے انھیں پھاڑ کھایا۔ سیافوں نے تالیاں بجانے گئے درندہ صفت رومی تماشائیوں کے سامنے ان کا خون بہایا۔ ان کی تکا بوٹی کی۔ مگر وہ کانٹوں کا تاج پہنے، اے مصلوب بندۂ خدا کی سچائی کا اور آسمانی باپ کے وجود کا برملا اقرار و اعلان کرتے رہے۔ وفاداروں نے انعام وفا پایا۔

بھگوان کی لیلا عجیب! اس کے نیارے نرالے! ایشیا کے ایک شہید نے اپنے خون سے یورپ کی آتما کو سینچا۔ لیکن زمانہ نے دیکھا کہ عیسیٰ کو بالآخر کے مندر میں بٹھا دیا گیا۔ صلیب کا خون سوکھ گیا اور وہ محض ایک چوب خشک ہو کر رہ گئی۔ پھر چاندی اور سونے کی صلیبیں گڑھی گئیں۔ مگر خون کا بدل کچھ نہیں۔ خون بے بہا ہے۔ خون زندگی ہے۔ خون الوہیت کے چہرے کا غازہ ہے۔ ہر شخص کو اپنی صلیب آپ اٹھانی پڑتی ہے۔ اپنا خون آپ بہانا پڑتا ہے۔ روحانیت بھی قربانی چاہتی ہے۔

پولوسؔ رسول نے کہا تھا: میں جانتا ہوں میرے چلے جانے کے بعد درندہ بھیڑیے تمہیں چیر پھاڑ کر کھائیں گے اور گلّہ پر تباہی آئے گی نیز تمہارے اندر بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو گمراہی کی ساحرانہ باتوں سے شاگردوں کے دل موہ لیں گے اور انھیں اپنا پیرو بنا لیں گے۔ پس ہوشیار رہو!

ہمالہ نے دیکھا: سارے سنسار پر گہرا اندھیرا چھا گیا۔ خود ہمالہ طبق در طبق گھپ اندھکار میں لپٹ گیا۔ ایک اتھاہ رات ٹوٹ پڑی۔ ستارے بے نور ہو گئے۔ چاند کالی ٹکیہ کی طرح کالا پڑ گیا۔ سورج طلوع ہوتا تھا مگر روشنی نہ تھی۔ آکاش اور دھرتی ایک ننھی سی کرن کے لیے بھی ترس رہے تھے۔

ابراہیم کی دعائیں ایک تابان صبحِ نو کے لیے تاریک فضاؤں میں لرزاں تھیں۔ کرشن کی بانسری کے بول نیا اوتار لینے کے لیے اندھیرے میں لرز رہے تھے۔ طور اور ہمالہ اور ہندی بلند چوٹیاں نئے سورج کی کرنوں کا صندل ملنے کے لیے بے قرار تھیں۔ موسیٰ کی تمنائیں ایک آتشیں شریعت کے فروغ کے لیے دیدۂ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھیں۔ عیسیٰ کے انگوری باغ کا مالک بنی اسرائیل کے بھائیوں کے نخلستانوں میں ظاہر ہونے والا تھا ـــــ ابن آدم ایک طویل سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ملازمین کے سپرد مکان کی حفاظت کر دی تھی اور ہر شخص کو اس کے کام سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے چوکیداروں کو حکم دیا تھا کہ نگہبانی کرتے رہیں۔

پس تم سب نگہدار رہو۔ تمہیں کیا معلوم مکان کا مالک کب آ جائے، سرِ شام، یا آدھی رات کو، مرغ کے بانگ دینے کے وقت یا علی الصباح۔ ہوشیار رہو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں سوتا ہوا غافل پائے۔

لیکن اس روزِ سعید، اس مبارک گھڑی کی خبر کسی کو بھی نہ تھی۔ نہ کسی آدم زاد کو اور نہ فرشتوں کو۔ خود ابن آدم بھی بے خبر تھا۔ صرف ایک آسمانی باپ اس راز سے آگاہ تھا۔

اس نے ارضِ بطحا میں ظہور کیا۔ وہ شعیر سے طلوع ہوا اور کوہ فاران پر چمکا۔ دس ہزار قدوسی اس کے جلو میں تھے اور وہ تخت نشین ہوا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک کتابِ عظیم تھی۔ سات مہروں سے سربہ مہر۔ اس کا ہاتھ یدِ بیضائے کلیم سے زیادہ روشن تھا۔ اس میں سات ستارے تابندہ تھے۔ اس کی آواز میں پُرشوکت آبشاروں کا نغمہ تھا۔ اس کی تلوار تیغِ دودم تھی۔ یہ تیز و براں دودھاری تلوار باطل کو پاش پاش کیے دیتی تھی۔ اس کا چہرہ آفتابِ عالمتاب کی طرح درخشندہ تھا۔ اس سراجِ منیر کی پیشوائی کے لیے سات سنہری شمعیں روشن تھیں۔ شمعوں کے اس جھرمٹ میں ایک مردِ خدا ابن آدم کے مماثل کھڑا تھا۔ بُردبار مثیلِ ابن آدم نے بڑھ کر اس پُرجلال صاحبِ تخت و نگین کے دستِ رحمت سے کتابِ مبین کی نعمت پائی۔ فرشتوں نے کنواریوں کے گیت گائے اور انھیں ابن آدم کی تحسین کی: اے آسمانی روح تو اس کتابِ عظیم کی حامل برحق ہے اور تجھ سے ہی ساتوں مہریں کھلیں گی۔ اور ایک مقدس نے پکارا: داؤد کی ذریت میں ایک مردِ کامل اٹھے گا جو سات مہروں کے معارف بیان کیے گا۔ پس تم زاری مت کرو اور خوش ہو جاؤ کہ اب لوگ کتابِ عظیم کے معارف سے محروم نہیں رہیں گے۔ اور سراجِ منیر کی روشنی تا قیامت پھیلتی رہے گی۔ اُسے ملکِ لازوال اور شوکتِ بے مثال دی گئی ہے۔

شہنشاہِ یثرب و بطحا آ گیا۔ خواجۂ بدر و حنین کا پرچم فضاؤں میں لہرایا۔ ماہِ عرب و عجم نے طلوع کیا۔ رحمتِ عالم، فخرِ آدم ظاہر ہوا اور اس کا فیض بے کراں جاری و ساری ہو گیا۔ آسمانی بادشاہت کا استحکام و استقلال منتظر آنکھوں نے دیکھا۔

دس کنواریاں دیا جلانے دولہا کے استقبال کے لیے نکلیں۔ ان میں پانچ عقلمند ثابت ہوئیں اور پانچ بیوقوف۔ جو عقل کی

کواری تھیں انھوں نے تیل ساتھ نہیں رکھا۔ مگر جو ہوشمند تھیں، انھوں نے دیئے کے ساتھ اپنی کپیوں میں تیل بھی لے لیا۔ دولہا کے آنے میں دیر تھی۔ ساری کنواریاں سو پڑ رہیں۔ آدھی رات کو شور اٹھا: دیکھو! دیکھو! دولہا دروازہ تک رہا ہے۔ جاؤ، اس کا سواگت کرو! دسوں کنواریاں جاگ پڑیں اور انھوں نے دیوں کو سنوارا۔ بیوقوفوں نے عقل مندوں سے کہا: ہمیں اپنے تیل میں سے تھوڑا دو، ہمارے دیئے بجھ گئے ہیں۔ خردمندوں نے کہا: نا نا! ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہمارا تیل گھٹ جائے تو؟ جاؤ بازار سے خرید لاؤ۔ وہ ادھر خریدنے گئیں اور ادھر دولہا آگیا۔ جن کے دیئے روشن تھے دولہا کے ساتھ شادی کی تقریب میں شادمان و فرحاں شریک ہوگئیں اور دروازہ بند ہوگیا۔ پیچھے آنے والیاں محروم رہ گئیں۔

جب دولہا تخلیق کا شہکار تھا، تو خلاق اس پر ریجھ گیا۔ فن کار اور فن کا ازلی دائرہ مکمل ہوا۔ دو کمانوں کی قابیں مل گئیں۔ منزل قریب اور حالِ وصل نزدیک تر ہو کر ابدی کشش میں تبدیل ہو گیا۔

نوشاہ شہنشاہ لولاک بنا، امینِ انسانیت، نگینِ نبوت! موسیٰ کے کشوف کی رسائی مقامِ محمدؐ کے حاشیہ تک ہوئی تھی۔ بعد ازاں موسیٰ اور انسانِ کامل میں دورِ فراق شروع ہوا۔ مجمع البحرین پر دونوں علیحدہ ہو گئے۔ مشاہداتِ محمدیہ بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو اور تا قیامت اس کی آبرو!

شہنشاہ لولاک نے انسانیت کے نقش ابھارے، کو نقش کیا، بنیم قوموں کی گرتی ہوئی دیواریں اٹھادیں اور اپنی امت کو شکستہ کشتی پر ظلماتِ حیات پار کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ محمدؐ کا نظامِ اخلاق کامل، نظامِ سیاست کامل، نظامِ اقتصاد کامل۔ اس کا نظامِ روحانی اعلیٰ و ارفع و اکمل۔ محمدؐ یزداں کا نمائندہ ترین شعلہ، یزداں کی کامل ترین تجلی، برہما کا سب سے سندر سپنا!

ہمالہ نے دیکھا: پچھم دیش سے ایک سورج نکلا۔ وہ چاند تاروں کے جھرمٹ میں تھا۔ ہمالہ نے ایسا پرکاش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا پرکاش کبھی نہیں دیکھے گا۔ ہمالہ نے یہ بھی دیکھا کہ سورج کی کرنیں ذروں پر پڑتی تھیں اور وہ سلگ کر جگنو، تارے اور چاند بن جاتے تھے۔ اندھیرے کافور ہوتے جاتے تھے۔ ہر طرف جوت جاگ اٹھی تھی۔

ہمالہ نے دیکھا: شرارِ بولہب شعلہ بن کر اٹھا اور بگولہ بن کر سورج کا مقابلہ کرنے بڑھا۔ شیطان نے انسان کو ابوجہل و ابولہب بنایا۔ ان دونوں اہرمن زادوں نے مکہ اور طائف کی گلیوں میں سورج کو خراماں پایا اور بھڑک اٹھے۔ ابنِ آدم کے دشمن بھی جی اٹھے اور گدھوں کی صورت و سیرت کے ساتھ سورج کی طرف منہ اٹھا کر رینگنے اور خرمستیاں دکھلانے لگے۔ آفتابِ خراماں کی راہ میں کانٹوں کے جنگل بکھیرے گئے مگر اس خورشیدِ درخشاں کے لہرے کچھ تو گلستان بن گئے اور کچھ اس کے آتشِ عریاں سے جھلس کر فنا ہو گئے۔ فرقِ آفتاب پر شر پسند دشمنوں نے اپنے مکر و فریب کی اوجھڑیوں کی کمندیں پھینکیں مگر وہ سب ان کی متکبر گردنوں میں پھانسی کی رسیاں بن گئیں اور نیرِ اعظم کا روئے زیبا تاجِ افتخار سے اور جگمگا اٹھا۔ سورج آکاش پر تھا!

ہمالہ نے دیکھا: فرعون و ہامان کی ممیاں بھی اٹھ بیٹھیں۔ سامری کا سحر بھی جاگا۔ ان سبھوں نے مل کر سورج کو نگلنا چاہا۔ مگر ایک شہابِ ثاقب نے ان سب کو بھسم کر دیا۔

ہمالہ نے دیکھا: نمرود، بخت نصر، ہیرود اور نیرو کی روحیں بھی مہرِ رحمانیت کے گرد ابرِ سیاہ بن کر منڈلانے لگیں۔ لیکن آخرِ کار عنکبوت کی طرح پارہ پارہ ہو کر بکھر گئیں۔ کنس اور کوروؤں کی آتماؤں نے بھی اوتار لیا اور سارے راکشس ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھمسان کا رن پڑا جو دھرتی سے پہلے ہوئے تھے۔ انھوں نے آکاش کے سورج اور تاروں پر تیر پھینکے۔ آکاش

کی کرنوں نے بھی حملہ کیا اور ان پر اپنے بان برسائے اور سارے راکشش دھرتی میں دھنس گئے۔ اب کے پانڈوں نے جیت کر راج گدی چھوڑی نہیں۔ بلکہ ساری پرتھوی پر سورج اور اس کے چاند تاروں نے راج کیا۔ ہزار سال تک اندھیرا پاتال میں منہ چھپاتا پھرا ——— لیکن برہما کے سینے میں اندھیرے نے ہمیشہ اجالے پر حملہ کیا۔ اندھیرے اور اجالے کی لڑائی ازل سے تا ابد جاری رہے گی اور خود برہما ازل اور ابد سے پرے ہے۔ ازل اور ابد برہما کے ان گنت گنوں میں سے دو گن ہیں یا پرماتما برہما کو ناپنے کی ایک چھچلی سی کوشش ہے سپنے کے پتلے حقیقت کے کسی کونے، کسی زاویے، کسی سطح، کسی پرت کو ہی جان سکتے ہیں اور وہ بھی بے حد ادھورے طور پر۔ حقیقت تو صرف برہما کی ہے، اور سب کچھ بے حقیقت، سب کچھ محض خواب و خیال!

برہما اور ہندو کی کہانی میں سب سے اجالے ہندو کی جیوتی پر بھی اندھیارے نے آکرمن کیا۔ پہلی فتح کے ہزار سالہ دور میں بھی دو بار روشنی پر تاریکی نے حملے کئے۔ پہلا حملہ اتر پورب دیش سے ہوا اور دوسرا حملہ اتر پچھم دیش سے۔

ہمالہ نے سنا:

سبا کے بیٹے ان کے اپنے ملک میں ایک بڑی نشانی موجود تھی اور وہ دو باغوں کی صورت میں تھی، جن میں سے ایک دائیں طرف تھا اور ایک بائیں طرف اور ہم نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ اپنے رب کے رزق کو کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ تمہارا شہر ایک خوبصورت شہر ہے اور تمہارا رب بہت بخشنے والا ہے۔ پھر بھی انھوں نے حق سے پیٹھ پھیر لی۔ تب ہم نے ان پر ایسا سیلاب بھیج دیا جو ہر چیز کو تباہ کرتا جاتا تھا اور ہم نے اُن کے اعلیٰ درجہ کے باغوں کی جگہ انھیں دو ایسے باغ دیئے جن کے پھل بدمزہ تھے اور جن میں جھاڑ پایا جاتا تھا یا کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔ یہ سزا ہم نے ان کو ان کی ناشکری کی وجہ سے دی تھی اور ناشکروں کو ہی ہم ایسا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ہمالہ گواہ ہے کہ شجر ابراہیم کی دونوں شاخوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہوا۔ پہلی شاخ کے انجام سے دوسری شاخ نے عبرت نہیں حاصل کی اور اپنے دونوں باغ برباد کر لیے۔

ہمالہ گوش بر آواز تھا:

تم یقیناً اس ملک میں دو بار فساد کرو گے اور یقیناً تم بہت بڑی سرکشی اختیار کرو گے اور جب ان دو میں سے پہلے کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے بعض ایسے بندوں کو تم پر مسلط کر دیا جو سخت جنگجو تھے اور وہ تمہارے گھروں کے اندر جا گھسے اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہنے والا تھا۔

اس کے بعد پھر ہم نے تمہیں دشمن پر حملہ کی طاقت عطا کی اور ہم نے مالوں اور بیٹوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کی۔ اور ہم نے جتھے کے لحاظ سے بھی تمہیں زیادہ کر دیا۔

سنو! اگر تم نیکوکار بنو گے تو نیکوکار بن کر اپنی جانوں کو ہی فائدہ پہنچاؤ گے۔ اور اگر تم بُرے اعمال کرو گے تو بھی اپنی جانوں کے لیے برا کرو گے۔

پھر جب دوسری بار والا وعدہ پورا ہونے کا وقت آ گیا تاکہ دشمن تمہارے معزز لوگوں سے ناپسندیدہ معاملہ کریں اور اسی طرح تمہاری مسجد میں داخل ہوں جس طرح وہ اس میں پہلی بار داخل ہوئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اُسے بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیں

تو یہ بات بھی پوری ہو گئی۔

اب بھی کچھ بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم کرے۔ اور اگر تم پھر اپنے غلط روّیہ کی طرف لوٹے تو ہم بھی اپنی سزا کی طرف لوٹیں گے۔

ہمارے نے یہ بھی سنا کہ دانائے اعظم نے پکار کر کہا کہ "میری امت کے لوگو تم بنی اسرائیل کے قدم بہ قدم چلو گے۔ یقیناً وہ ایک بزرگ رسول کا کلام تھا۔ اور اس سے عجیب کوئی پیشین گوئی میں نے نہیں دیکھی تھی۔ سورج نے کہا تھا کہ ستاروں کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں ملیں گی اور انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ پس یہ پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔

برہما کی بیلا پ اندھیروں نے اپنی یلغار جاری رکھی۔ اجالے اپنے کو تابناک نہیں رکھ سکے تھے۔ زر و جواہر کی جوت تھی مگر دل کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ دل ہی کو حوف کرنے سے خاک کے ذرے ستارے بنتے ہیں۔ تو اہرام و بغداد، قرطبہ و غرناطہ کے روشن محلوں میں اندھیر تھا۔ دل بے الحمرا نہ پڑ سکتے تھے اور باغ واہ یار بے داد تھا۔

ہمارے دیکھا شمال مشرق اور شمال مغرب سے اندھیرے کا طوفان اٹھا اور سورج کی دنیاوی سلطنت کو گھن لگ گیا۔ ستارے سوکھے پھولوں کی طرح جھڑ گئے۔ لیکن پھر پرانی تہذیبوں پر نئے پھول کھلے اور نئی صبح طلوع ہوئی ——— اور ہزار سال بیتنے پر شیطان پورے طور پر آزاد کر دیا گیا۔

ہمارے نے سنا تھا۔

——— اور چاند کو خوف لگے گا۔ سورج اور چاند دونوں کو ایک حالت میں جمع کر دیا جائے گا۔ ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ اور آسمان میں شگاف ہو جائیں گے اور پہاڑ اڑائے جائیں گے۔ نور آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا۔ وحشی اکٹھے کئے جائیں گے۔ دریاؤں کو ملا دیا جائے گا۔ نفوس جمع کئے جائیں گے۔ کتابیں پھیلا دی جائیں گی۔ آسمان کی کھال اتاری جائے گی۔ جہنم کو بھڑکایا جائے گا اور جنت کو قریب کر دیا جائے گا۔ زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال پھینکے گی۔ یاجوج و ماجوج کے لیے دروازہ کھول دیا جائے گا اور وہ پہاڑی سلسلوں، سمندری اور ہوائی لہروں کو پھاندتے ہوئے دنیا میں پھیل جائیں گے۔ اور سچا وعدہ قریب آ جائے گا۔ جب اس کے پورا ہونے کا وقت آئے گا تو اس وقت انہیں ایک دوسرے کے خلاف جوش سے حملہ آور ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور بگل بجایا جائے گا۔ رات اس کی گواہ ہے جب وہ کالی ناگن کی طرح کسمساتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اور صبح تاباں بھی جب وہ ہولے ہولے سانس لینے لگتی ہے۔

ہمارے نے رسول امینؐ کے پیش خدمت عیسیٰؑ، حزقیلؑ اور دانیالؑ کے وعیدوں اور بشارتوں کو بھی سنا تھا:

——— اور جب تم جنگ کی باتیں سنو گے اور جنگ کی افواہیں تمہیں لرزہ براندام کریں گی۔ اس وقت تم مت گھبرانا کیونکہ ان امور کا برپا ہونا مقدر ہے۔ قیامت ابھی تم سے دور ہو گی۔ ایک قوم دوسری قوم پر چڑھائی کرے گی اور حکومت دوسری حکومت پر۔ مختلف مقامات پر سخت زلزلے آئیں گے اور قحط پڑیں گے۔ مصائب کی زنجیریں تمہیں جکڑ لیں گی۔ اور یہ درد و غم کا محض آغاز ہو گا۔ سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند ماند پڑ جائے گا۔ اور آسمان کے تارے جھڑ جائیں گے۔ اور آسمانی طاقتوں میں حرکت پیدا ہو گی۔ اور تب لوگ ابن آدم کو بدلیوں کے اندر سے پر جلال و جبروت طلوع ہوتا ہوا دیکھیں گے۔

اور ایک حاملہ عورت سورج کی کرنوں کا لباس، چاندنی کے پاپوش اور ستاروں کا تاج پہنے رونما ہو گی۔ مگر اس بار آور وجود

کو ایک سُرخ اژدھا نگل جانے کے لیے خوفناک طور پر حملہ آور ہوگا۔ یہ ہفت سرہ دس سینگوں والا اژدھا صاحبِ ہفت تاج بھی ہوگا اور یہ اپنی طاقتور دُم سے آسمان دنیا کے ایک تہائی تاروں کو جھاڑ کر زمین پر گرا دے گا۔

لیکن وہ جو قوموں کی رستگاری کے لیے مبعوث ہونے والا ہے اس حاملہ عورت کے بطن سے پیدا ہوگا اور اقوام پر حکومت کرے گا۔ وہ خدائے ذوالجلال کے تخت سے لپٹا ہوا ہوگا۔ آسمان پر فرشتوں اور شیطانی اژدھے کے درمیان جنگ ہوگی۔ فرشتے اُسے زمین پر دے ماریں گے اور پھر ایک پُرشوکت آواز منادی کرے گی کہ اب خدا کی بادشاہت زمین پر بھی قائم ہوگئی اور نجات کے دروازے کھل گئے۔

ـــــــــ اور دانیال نے خواب میں دیکھا :

چوطرفہ ہوائیں چلنے لگیں اور وسیع سمندر میں لہریں اٹھنے لگیں۔ اور چار بڑے بڑے عجیب غریب جانور سمندروں سے نکل کر باہر آئے۔ یہ چاروں مختلف قسم کے تھے۔

پہلا جانور شیر ببر کی طرح تھا اور اس کے عقابی پر لگے ہوئے تھے۔ یہ ساری دنیا پر چھا گیا۔ لیکن انجام کار اس کے شہ پر غیب کی طاقتوں نے توڑ دیئے اور اس کی ہیبت دور ہوئی۔ اس میں آدمیت پیدا ہوئی اور وہ مادیت کو ترک کر کے آسمانی برکتوں کی تلاش میں آدم زاد کی طرح اٹھا۔ آخر کار اُسے قلبِ مومن عطا ہوا۔

اور دیکھنا ایک دوسرا جانور رونما ہوا۔ بالکل ریچھ کی طرح کا۔ وہ محض ایک پہلو سے اٹھا۔ اُس کے منہ میں تین پسلیاں تھیں۔ وہ انھیں دانتوں سے کڑکڑا رہا تھا۔ اور لوگوں نے اس سے کہا : اُٹھ اور خونخوار بن اور بے حد گوشت چبا ڈال!

پھر ایک تیسرا جانور چیتے کی طرح جالاکی سے نکلا۔ اس کی پیٹھ پر چار پر لگے ہوئے تھے۔ اس کے چار سر بھی تھے۔ اور اسے سلطنتِ عظیم بھی بخشی گئی۔

اور آخر الامر ایک چوتھا خوفناک جانور گرجتا ہوا نکلا۔ بڑا مضبوط۔ اس کے لوہے کے بنے ہوئے بڑے بڑے دانت تھے۔ اس نے خوب خوب خونخواری کی۔ وہ مختلف جھنڈوں میں حملہ آور ہوا اور خلقت کو روندتا رہا۔ اس کے دس سینگ تھے۔ ایک چھوٹا سینگ اور تھا جس میں آنکھیں تھیں۔ آدمیوں جیسی آنکھیں اور ایک منہ تھا جو بڑے بول بولتا تھا۔

اُس وقت آسمانی تخت بھی بچھ چکا تھا اور دنیا پر فرشتوں کا نزول شروع ہو گیا تھا۔ حکم و عدل ہو چکا تھا۔ فیصلے کا دن قریب تھا۔ حساب کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔

آخر کار معجزانہ طور پر وہ عجیب الخلقت جانور قتل کر دیا گیا۔ اس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور اُسے آگ میں جھونکا گیا۔ تکبر اور بڑے بول کا نتیجہ!

اور بقیہ جانوروں کا حشر بھی بڑا عبرت ناک ہوا۔ اُن کی سلطنتیں اُن سے چھین لی گئیں۔ مگر انھیں کچھ اور مہلت ملی۔

اور ایک ابن آدم کا مثیل آسمانی ابر پاروں کے ساتھ نازل ہوا۔ وہ قدیم و قدیر طاقت کے آگے جھکا۔ اُسے ملک لازوال اور طاقت باکمال بخشی گئی۔ مختلف نسلیں، قومیں اور زبانیں اس کی سلطنت میں شامل ہو گئیں۔

دانیال کو بتایا گیا تھا کہ یہ چار جانور چار سلطنتیں ہیں۔ اور آج ہم اس کے خواب کے پُتلے یہ سوچ رہے ہیں کہ آئندہ ایام میں ہم نے یہ جانور دیکھے ہیں۔ آمریت کے دسوں سینگ ٹوٹ گئے اور آگ میں آہنی دانت پگھل گئے۔ سمندری شیر ببر کی ہوائی قوت کمزور ہو گئی اور

اب وہ آدمیت کی طرف مائل ہے۔ ابھی دل کا آپریشن ہونا باقی ہے۔ اور اس کی نسل کا چیتا! بے کراں ہوائی طاقت والا صاحب ملک و دولت! اسے ابھی مہلت ملی ہے۔

اور خونخوار ریچھ! خون ریزی کے لیے اُسے بھی مہلت دی گئی ہے۔

خونخوار ریچھ اور خون آشام چار سرہ پردار چیتا دونوں ٹکرائیں گے اور ان کی طاقتیں جیسی قوت وجبروت سے توڑی جائیں گی۔

حزقیل نے خواب دکشوف میں دیکھا تھا کہ یاجوج وماجوج کی خوفناک جنگوں کا آغاز اُس دور سے ہوگا جب بنی اسرائیل ارض مقدس میں جمع کئے جائیں گے۔

——— اے حزقیل پیشگوئی کر اور انہیں بتا کہ خدائے قدیر تمہاری قبریں کھول دے گا اور تم اُن سے نکل کھڑے ہوگے۔ وہ تمہیں سرزمین اسرائیل میں لائے گا، تمام دیار کفر وضلالت سے سمیٹ کر تمہارے اپنے ملک میں اکٹھا کرے گا۔ تم اسرائیل کی پہاڑیوں پر چڑھو گے اور تم جانو گے کہ تمہارا ربّ وا کتنا صاحب طاقت وجبروت ہے۔

——— اور تصدیق کرنے والی کتاب مبین نے بھی یہ عظیم پیش خبری کی کہ اُمّت مرحوم کے دوسرے زوال کے دور میں بنی اسرائیل ارض مقدس میں لائے جائیں گے

——— پھر جب دوسری بار کا وعدہ آپہنچے گا تو ہم تم کو جمع کرکے وہاں لے آئیں گے۔

——— اور ہمارے دیکھا پیشگوئیاں پوری ہوئیں اور خواب حقیقت بن گئے۔

——— اور حزقیل نے ایک عظیم الشان ندا سنی:

اے ابن آدم! یاجوج اور سرزمین ماجوج کے خلاف نبوت کر۔ مسھک اور توبال کے امیر قاہر کے خلاف نبوت کر اور کہہ:

——— خدائے رب العزت فرماتا ہے: ——— سُن اور دیکھ! اے یاجوج! اے مسھک اور توبال کے بڑے حکمران میں تیرا مخالف ہوں۔

اور میں تیرا منہ موڑ دوں گا اور تیرے جبڑوں میں آنکڑے ڈالوں گا۔ اور میں تجھے اور تیری قاہر فوج کو نکال باہر کروں گا۔ تیرے بے پناہ اسلحے، آلات حرب وضرب اور آہنی زرہ بکتر اور دوسرے حفاظتی سامان تیرے کوئی کام نہ آئیں گے۔

ہوشیار رہ! تیرے سازوسامان، تیری دوست قومیں، تیرے حلیف جتھے سب برباد کر دیئے جائیں گے۔

عرصہ دراز کے بعد تو پوچھا جائے گا۔ تو ایک ایسی سرزمین پر حملہ آور ہوگا جو تسلط غیر سے آزاد کی گئی ہوگی اور جہاں مختلف قوموں میں سے جمع کئے ہوئے لوگ آباد ہوں گے۔

تو اسرائیل کی پہاڑیوں پر ٹوٹ پڑے گا۔ تو طوفان کی طرح اٹھے گا۔ تیری حلیف قومیں اور تیری افواج ممالک پر ابر سیاہ کی طرح چھا جائیں گی۔

اور ترشیش وشبا اور ددان کے سوداگر تجھ سے پرسش کریں گے کہ کیا تو مال لوٹنے نکلا ہے۔ کیا تو جتھا جمع کرکے شکار کے منہ سے باہر آیا ہے۔ وہ شیر بچے تجھ سے سوال کریں گے۔

پس اے آدم زاد! یاجوج کے خلاف پیشین گوئی کر! تو اپنے شمالی ملک سے خروج کرے گا اور اپنے جتھے کے ساتھ اسرائیل تک بڑھتا آئے گا۔ تیرا لشکر عظیم وقوی منحوس بادل کی طرح خیمہ زن ہوگا۔ یہ ساری باتیں آخری زمانہ میں رونما ہوں گی۔ اے یاجوج! یہ ظہور اس لیے ہوگا کہ مظاہر دیکھ کر دہریئے بھی مجھ خدائے قادر پر ایمان لائیں۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کا جلال ظاہر ہوگا۔ اور ارض اسرائیل میں سخت زلزلہ آئے گا۔ اُس وقت پانی کی مچھلیاں،

ہوا کے پرندے، میدانوں کے جانور، سطح ارض پر رینگنے والی ساری مخلوق اور روئے زمین پر بسنے والے تمام آدمی خدا کے حضور کانپیں گے۔ پہاڑ گر پڑیں گے اور بلند مقامات دھنس جائیں گے۔ اور ساری دیواریں زمین پر آ رہیں گی۔ اور یاجوج کا زبردست مقابلہ کیا جائے گا۔ سارے عالم سے اُس کے خلاف تلواریں اٹھیں گی۔ قوموں میں خانہ جنگی اور برادر کشی ہو گی۔

اور میں یاجوج اور اُس کے ساتھیوں پر بلائے ناگہانی نازل کروں گا۔ سخت خونریزی ہو گی۔ موسلا دھار پانی برسایا جائے گا۔ بڑے بڑے اولوں کی مار پڑے گی۔ آگ اور انگارے برسیں گے۔

اس طرح بہت سی قومیں مجھے پہچانیں گی اور میری تقدیس کریں گی۔

اور ماجوج پر ایک آگ برسے گی۔ اُن پر بھی جو بے خوف جزیروں میں رہتے ہیں۔ اور وہ بھی خدا شناسی پر مجبور ہوں گے۔

دیکھو اور سُن! وہ انقلاب آیا اور ہمالی بات پوری ہوئی! ——— ہمالیہ لرزا اور کانپ گیا۔ اُس کی وادیوں میں ایک اور آواز گونجی۔ راوی کے کنارے اور ساحلِ گنگ و جمن تھرتھرانے لگے ——— قیامت کے مشابہ ایک زلزلہ آنے والا ہے۔ ہے تم سوا آج تم الگ ہو جاؤ! حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ یہ وہ بشارت ہے جو نبیوں کو ملی تھی۔ اگر چاہوں تو اُس دن خاتمہ!

سپنوں کے دیس میں یاجوج و ماجوج موجیں مارنے لگے۔ کوہ قاف کے دیوزادوں نے آکاش اور پرتھوی پر قبضہ کر لیا۔ سندباد جہازی کے سفر الف لیلوی دنیا سے باہر نکل آئے۔ دجل و فریب کا عفریت اپنی مٹھیوں میں دوزخ و جنت لیے دنیا کو ناپنے نکلا۔ اُس نے ذرّے کو آفتاب سا سامان بنا دیا۔ اہرمن کو مادہ پر قدرت حاصل ہوئی اور دجال نے خدائی کا دعوےٰ کر دیا۔ مگر جوہرِ مادہ تک رسائی مادیت کی شکست بھی تھی۔ مادہ ابدی نہیں، ازلی و ابدی نہیں۔ اصل توانائی ماورائے مادہ ہے اور خود اہرمن کے ہاتھوں مادہ اور مادیت کے لات و منات ٹوٹ گئے۔ عفریتوں نے طلسمی گولے لے کر ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ عالم نو لرزاں تھا اور جھوٹ پا بھی۔ بڑی سخت کشمکش پیدا ہوئی۔ سخت تصادم رونما ہوا۔ بھیانک دھماکے ہوئے۔ کائنات لرزہ براندام ہو گئی۔ خواب کے تنکے فنا ہونے لگے۔ سپنوں کا سنسار تحلیل ہونے لگا۔ شاید بندر اور برہما کی کہانی ختم ہو رہی تھی۔ یہ عظیم دماغ کا ایک لمحہ تھا یا ابدیت کی ایک کڑی؟ کون جانے! عظیم دماغ نکتہ نار عالم سے بیدار ہو رہا تھا۔ برہما کی نیند دھماکوں سے اُچٹ گئی تھی۔ سپنوں کا سنسار چھایا یا خواب کی دنیا مایا! ——— کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اٹھے گا؟ کیا برہما پھر اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا؟

تین، جاپانی کھیل

قرۃ العین حیدر

جاپان کا نوہ ڈرامہ ساری دنیا کے ڈرامیٹک آرٹ سے مختلف اور منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اسے اکثر قدیم یونانی ٹریجڈی سے تشبیہہ دی جاتی ہے مگر نوہ اور یونانی ٹریجڈی میں بھی بہت فرق ہے۔ وہ جاپانی بھکشوؤں نے آٹھویں صدی عیسوی میں "چا، کی رسم" کی اس لیے بنا ڈالی کہ چپ چاپ بیٹھ کر دبان کی خاموش آواز کو سنیں اور حضورِ قلب حاصل کریں۔ اس عجیب و غریب آرٹ فارم کے خالق ہیں۔ آرٹ اہلِ جاپان کے نزدیک مسجد زین ہے۔ اور زین بادھ مت کا وہ مدرسۂ فکر ہے جس میں دھیان ہی سب کچھ ہے (یہ زین یعنی 'دھیان' کا مذہب ہند قدیم میں ظہور میں آیا۔ چین میں اس کی مزید نشوونما ہوئی اور جاپان میں اسے ایک باضابطہ نظامِ زندگی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ زین کے نزدیک جمال کہیں مستور ہے۔ خدا کے قرب کا احساس ہے۔ اصلی جذبہ ہے۔ فطرت اور انسان کا اتحاد ہے وہاں زین موجود ہے۔ اس لحاظ سے ساری جاپانی اور چینی مصوری زین ہے۔ یسوع مسیح میں زین موجود تھا۔ اور ایک ہارٹ میں۔ اور باخ کی موسیقی میں اور ہومر اور چاسر اور شیکسپیئر اور ورڈزورتھ میں۔ ڈون کی خوٹے کے کردار اور ملٹن کے شیطان میں بھی زین مل جاتا ہے "پکڑے جانے کے خوف سے بھاگتا ہوا چور بھی زین ہے۔ چاند کو تکتا ہوا شاعر بھی زین ہے۔ کھانا کھانا پانی پینا ہر شے زین ہے۔ زین کے نزدیک قصائی کی دوکان اور کوڑے کے ڈھیر میں بھی حسن موجود ہے۔ گھوڑے کے زنگ آلود نعل میں بھی بدھ کی فطرت موجود ہے۔ ہر چیز کی قدر و قیمت یکساں ہے کیونکہ ہر چیز کی قدر و قیمت بے حد و حساب ہے۔ اگر آپ یہ بات سمجھ سکتے ہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ اگر نہیں سمجھ سکتے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جاپانی شاعری کی خصوصیت دیکھیے۔ خزاں کا موسم۔ چاندنی۔ پھولوں کا کھلنا۔ جگنو کا پَر۔ جھینگر کی آواز۔ کیچڑ میں پڑے ہوئے خربوزے۔ رپٹتے پر رنگ کا کھنچاؤ۔ ہر شے میں معنی ہیں۔ ہر شے کی قیمت ہے۔ یہ سب چیزیں ذاتِ مطلق کی مظہر ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ بذاتِ خود اہم ہیں۔ زین کی روشنی میں ہم فطرت کے متعلق جاپان کے رویے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

جھینگر، جو گاتے گاتے
ختم ہو گیا

یہ باشو کی مکمل نظم ہے۔ اس طرح "شیکسپیئر پانی میں، دیسٹرمی ہیں، مسز گیرٹ اچار ہیں، بدھ پھول میں اور باشو مینڈک میں تبدیل ہو جاتا ہے" دوئی کی تفریق مٹانا زین ہے۔ اس فلسفے کو HIGELIAN ABSOLUTE بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کلیت پرستی بھی مسئلہ جبریت بھی۔ یہ جبر بھی ہے اور اختیار بھی۔ زین تصوف اور وحدت الوجود سے جداگانہ ہے۔ صوفی حقیقت کو دیکھنے کے لیے مجاز کو بطور ذریعہ استعمال

کرتے ہیں۔ زین محض دوربین سے لگتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔ حقیقت اور عینیت کی تفریق زین کے نقطۂ نظر سے سلسلۂ شر کی بنیاد ہے۔ زین نے لفظوں کا بھی بہت بڑا فلسفہ تیار کیا ہے۔ بدھ ازم کے خیال میں انسانی جسم ایک ایسا مکان ہے جس میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم باتیں کرتے رہتے ہیں اور مکان جلتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر ایک روز جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ "میں پہاڑوں، درختوں، مکانوں اور انسانوں کی سنگت میں بے حس کھڑا تھا پھر میں نے بولنا شروع کیا اور سارا سحر زائل ہو گیا" مہاتما بدھ خاموش تھے لیکن انھوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ کانٹو نے کچھ نہیں سنا۔ لیکن سب کچھ کہہ گیا۔" تشبیہ یا استعارے جب PASSION -- INSPIRED ہوں تب ان چیزوں کی یکسانیت کا اظہار کرتے ہیں جنھیں منطقی ذہن نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ زین ذہن اور روح کی مکمل آزادی ہے۔ تناقض اس فلسفے کی ایک اور خصوصیت ہے۔ زبان دو مختلف معنی بیک وقت بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس لحاظ سے موسیقی میں الفاظ سے زیادہ شکتی ہے کیونکہ دو مختلف نغمے بیک وقت ہارمنی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ زین حیاتِ انسانی کے تناقض حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختلف معانی، اور تشریحات میں الجھ کر حقیقت سے دور جا پڑنے سے بجائے زین کے ذریعے ساری منطق ساری ظاہری استقامت کی فصیلیں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح ہم اس نقطے تک پہنچ جاتے ہیں جو الفاظ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تناقض ذہن کی اس آزادی کا علمبردار ہے کہ آپ جس چیز کو جو قیمت چاہے عطا کیجئے یا نہ کیجئے۔ استغنا اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اہل زین کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کہیں راہ میں مہاتما بدھ یا دھرم سے ملاقات ہو تو انھیں فوراً مار ڈالو۔ اس کے باوجود زین روحانی انا کی نہیں۔ یہ محض خیر و شر سے بالاتر اور اضافیت سے ماورا ہے۔ احمق، بوڑھے اور بچے زین کے لاڈلے ہیں کیونکہ فطرت سے قریب تر ہیں۔ اس مذہب کے نزدیک زندگی نہ فانی ہے نہ لازوال۔ زندگی محض زندگی ہے جس طرح بادلوں کی بجلی محض بادلوں کی بجلی ہے۔ مکمل طور پر مفلس، بچوں کی طرح بھولے اور احمقانہ دل و دماغ کا مالک انسان جو زین تصور ہے۔ نروان وسطے کے کیتھولک صوفیوں کے ذہنی اور روحانی تجربے سے نزدیک تر ہے۔ زین اخلاقی فیصلے بھی صادر نہیں کرتا۔ انفرادی ارتقا اس اسٹیج پر پہنچ کر خدا اور حیاتِ جاوید دونوں غیر ضروری ہو جاتے ہیں (اسی وجہ سے ایک زین پجاری نے ایک جگہ سوال کیا ہے کہ مہاتما بدھ نے ہاتھ میں کنول کا پھول کیوں اٹھایا۔ کوئی پرانا جوتا کیوں نہیں اٹھایا؟)

قصہ مختصر، نوہ اسی جاپانی ذہن کی تخلیق ہے جس نے زین کو قبول کیا۔ اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی مگر چودھویں صدی عیسوی میں نوہ ڈراما پہلی مرتبہ پروہتوں نے تصنیف کیا۔ اور شروع شروع میں ہم عصر مغربی MYSTERY اور MIRACLE تمثیلوں کی طرح یہ کھیل بھی مندروں میں اسٹیج کئے جاتے رہے۔ شنتو مندروں کے مذہبی رقص، درباری رزمیہ رقص اور بدھ مندروں کے منترک پنٹو مائم نے مل جل کر اس فن کو آگے بڑھایا۔ اس وقت تک بدھ مت کے مندروں میں ہندو مذہب اور چینی اثرات کی عملداری تھی۔ اس لیے شروع شروع میں نوہ ڈراما شنتو حلقوں ہی میں محدود رہا۔ شوگن عہد میں (جس میں فیوڈل وار لارڈز شہنشاہ سے سیاسی اور فوجی طاقت چھین کر ملک کے اصل حکمران بن بیٹھے تھے اور بادشاہ محض برائے نام بادشاہت کرتا تھا) نوہ کو عروج ملا۔ یہ بے حد رومانٹک دور تھا۔ سارا ملک طرح طرح کی دلآویز حکایتوں، دلاوری کے قصوں اور افسانوں سے گونج رہا تھا۔ پندرھویں صدی میں نئی بدھ تہذیب نے جو دھیان اور فطرت کے شاعرانہ ادراک پر مبنی تھی، یعنی زین تھی، شنتو مندروں میں پرورش پانے والے نوہ ڈرامے کو ایک اخلاقی مقصد اور ایک نفسیاتی وسعت بخشی۔ اور اسے "ڈراما آف کیریکٹر" بنایا۔ شنتو الوہی رقص، درباری غنائیہ شاعری، دیہاتی لوک گیتی رزمیہ شان و شوکت سبھی چیزیں اس میں شامل ہو گئیں۔"

نوہ کی ساری خوبصورتی اس کے مرتکز ہونے میں ہے۔ ملبوسات، حرکات و سکنات، اشعار، موسیقی، رقص سب مل جل کر دیکھنے والے پر ایک مجموعی تاثر پیدا کرتی ہیں۔ یہ بھی ایک مشرقی خصوصیت ہے۔ مغرب میں آرٹ فارم کو بقول شخصے CONDENSE کر دیا گیا ہے۔ (ایرانی اور مغل مصوری، جاپانی ہیکو نظمیں)

نوہ مصنفوں کا خیال ہے کہ جذبات خیال سے وابستہ ہیں شخصیت سے نہیں۔ انسان کی اندر کی آتما نوہ کا خاص کردار ہے۔ یہ ڈرامے ہزاروں کی تعداد میں لکھے گئے اور آج تک اسی روایتی انداز سے اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ ان کے مصنف بھی، جو زیادہ تر راہب اور پروہت تھے، خالص مشرقی شان سے گمنام مر گئے۔ لیکن ان کی تصانیف پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بڑے بڑے ماہر نفسیات تھے۔ نعت کردار جو تہذیبی کی خصوصیت ہے، نوہ تمثیل میں بے حد ماورائی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ بودھی ستوا، دیو، اہلِ عناصر، جن، پریاں، جانوروں کی روحیں، ارواحِ خبیثہ، سمندروں اور دریاؤں میں رہنے والے اژدھے، دیوتا، چاندنی اور پھولوں اور درختوں کی روحیں، شراب اور آگ میں رہنے والی آتمائیں، خیال کے مضمحل ہوئے، خواب کی پرچھائیاں، ——— یہ سب نوہ کے کردار ہیں۔

نوہ کے شروع میں بعض اکثر اپنا شجرہ نسب سناتا ہے اور عہدِ رفتہ کے ان شہنشاہوں کی قصیدہ خوانی کرتا ہے جن کے درباروں میں اس کے بزرگوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے یہاں کے گائیکوں کے گھرانوں کی طرح نوہ ایکٹر بھی خاندانی اداکار ہوتا ہے۔ ایک غیر ملکی کے لیے ان تمثیلوں کی روح میں اترنا اتنا ہی مشکل ہے جس طرح ہمارے راگ راگنیوں کو سمجھنا ہر غیر ملکی کے بس کی بات نہیں۔

نوہ اسٹیج کرنا اور دیکھنا بڑا دلچسپ مشغلہ تھا، کیونکہ شوگن دربار اس فن کا سرپرست تھا۔ اسی وجہ سے اس کی زبان بھی بے حد پُرتکلف اور نفیس ہے۔ شوگن دور میں ان کی گدی نشینی اور شادی بیاہ کے مواقع پر اور بدھ تہواروں کے زمانے میں نوہ چار چار دن تک مسلسل اسٹیج کئے جاتے تھے۔ پانچویں دن عوام کے لیے اس کے دروازے وا کر دیئے جاتے تھے اور یدو (موجودہ ٹوکیو) کی آٹھ سو آٹھ سڑکوں کے افسر ایک ایک کاغذی قندیل اٹھائے (جس پر اس سڑک کا نام لکھا ہوتا تھا) اپنے محلے والوں کو ساتھ لے کر جلوس کی شکل میں کھیل دیکھنے آتے تھے[1]۔ حقیقت پسند نقالی یا زندگی کی عکاسی کرنے والے تھیٹر کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اسے "عام تھیٹر" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ علامتی اور رمزیہ اسٹیج، اداکار اور آڈینس دونوں کے لیے قابلِ تکریم تھی۔

نوہ شناسوں کے لحاظ سے ایک تمثیل پانچ حصوں میں منقسم ہوتی ہے:

(۱) شوگین ——— یعنی دیوتاؤں کا نوہ

(۲) رزمیہ نوہ ——— کیونکہ دیوتاؤں اور شہنشاہوں نے اپنے تیر و کمان کے ذریعے وطنِ مقدس کو بچایا اور شیاطین کو زیر کر کے امن قائم کیا۔

(۳) عورتوں کا یا رومانی نوہ ——— کیونکہ امن کے زمانے میں محبت کی جا سکتی ہے۔

(۴) مردوں کا نوہ ——— جنگ کے بعد امن اور شان و شوکت حاصل ہوتی ہے۔ مگر وہ چند روزہ اور سخت ناقابلِ اعتبار ہے۔

---

[1] رابرٹ فیولوزا ROBERT FEUOLLOSA.

اور روحانی ہے۔" بدھ جو تھے قسم کے نوہ کے زیادہ تر ہم لہامایدہ پر دھیان کرتے ہیں۔ اس نوع کے نوہ کو موضوع کے اعتبار سے ہنگیراں کہا جاتا ہے اور اسے نمایاں درجہ حاصل ہے۔"

(۵) اخلاقی نوہ

(۶) آخری حصے میں امراء اور اداکاروں کو تہنیت پیش کرنے کے بعد دوبارہ خداؤں کی تقدیس کی جاتی ہے۔

اس طرح نوہ ساری زندگی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ان اقسام میں نمبر ۲ یعنی روحوں کا نوہ نفسیات کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے (میں نے ان ہی میں سے ایک کا ترجمہ کیا ہے)

نوہ اداکاری کے قوانین بے حد کٹھن ہیں جس سے ذرا سا انحراف بھی ممکن نہیں۔ اس اداکاری کے لیے زندگی کی نقالی کے بجائے زندگی کو اندر سے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ نوہ کہاوت ہے کہ دل نوہ کا اصل فارم ہے۔ ماسک اس فن کی خصوصیت ہے اور بذات خود اعلیٰ ترین فن ہے۔ ایک بڑا اداکار ماسک کو زندگی بخش دیتا ہے۔ بوڑھے اور عورتیں ماسک پہنتی ہیں۔ ہیروئن کا رول ہمیشہ مرد ادا کرتا ہے۔ نوہ کے ماسک پر برکیٹ نے یہ غیر معمولی اشعار لکھے ہیں:

میرے سامنے دیوار پر ایک راکشس
کا سنہرا ماسک آویزاں ہے
اس کی کنپٹیوں کی ابھری رگیں دیکھ کر مجھے
خیال آیا۔ بد ہونا خود اپنے لیے
کتنی بڑی اذیت ہے۔
بدی کے پیچھے انسان کو کتنی جان مارنی پڑتی ہے۔

اسٹیج پر صرف ایک پائن کے درخت کی تصویر ہوتی ہے۔ پائن زندگی کے ناقابل تغیر ہونے کی علامت ہے۔ چونکہ ہمیشہ سرسبز رہتا ہے۔ باقی اسٹیج بالکل خالی ہوتا ہے۔ دونوں طرف برآمدے اور سامنے ایک پل ہوتا ہے۔ پردے نہیں ہوتے (نوہ اسٹیج کا تذکرہ میں "ستمبر کا چاند" میں بھی کر چکی ہوں) کھیل عموماً کسی کردار کے سفر پہ جانے سے شروع ہوتا ہے۔ پل پر سے گزرتے ہوئے وہ اناؤنس کرتا ہے کہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ اکثر کردار اپنی علامتی حرکات و سکنات کا مطلب بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ نوہ کے آخری الفاظ اکثر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ عموماً رقص پر کھیل کا اختتام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے پڑھتے وقت ممکن ہے ان تمثیلوں کا خاتمہ ہمیں بے ربط سا معلوم ہو گا۔

نوہ کی وحدت جذبات میں ہے۔ ہم اسے UNITY OF IMAGES وحدت تخیل کہہ سکتے ہیں۔ نوہ خالص روح کی تمثیل ہے۔ اس لیے دوسرے آرٹ فارم سے بلند تر ہے۔ ایک نوہ اداکار کو بڑا فنکار بننے کے لیے ایک پاکباز اور اونچے درجے کا انسان بھی بننا پڑتا ہے۔ اسٹیج پر نوہ دیکھنے کی کیفیت ایسی ہے گویا موسیقی سنی جا رہی ہو۔

مغرب میں تجدید رومانیت اور CELTIC REVIVAL کے ساتھ ساتھ مشرق کو بھی دوبارہ تلاش کیا گیا۔ یہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ جاپانی مصوری اور شاعری نے امپریشنزم اور ایمجسٹ تحریکوں کو متاثر کیا۔ ٹیگور اور ویدانت نے مغربی ادیبوں کو اپنی طرف

[illegible] خصوصاً ییٹس کے یہاں ہم کو اس کی پیچیدگیاں بہت واضح نظر آتی ہیں۔ ییٹس معانی پرست [illegible] کی نئی علامتوں کے ذریعے ترجمانی کرنے میں مصروف تھے۔ اسی زمانے میں امریکی المجبت شاعر ایذرا پاؤنڈ نے [illegible] متعارف کیا۔ ییٹس کے لیے نوہ ڈرامے ہیں وہ سب کچھ تھا جس کی انھیں اور دوسروں کے ایسے تھیٹر والوں کو تلاش تھی کہ علامتوں کی جگہ اس تمثیل میں ممبروں نے سنبھال لی تھی۔ ییٹس نے خواب اور حقیقت کو ماسک میں متحد کیا۔ اور کئی ڈرامے نوہ [illegible] کہلائے۔ ییٹس کی تمنا تھی کہ ڈرامے کو شعر کا درجہ بھی حاصل ہو سکے۔ اپنی ایک تمثیل DANCER PLAYS AT THE HAWK'S WELL کے متعلق انھوں نے لکھا:

"میرا یہ ڈرامہ ایک جاپانی رقاص کی وجہ سے ممکن ہوا جسے میں نے ایک اسٹوڈیو میں ایک ڈرائنگ روم میں اور ایک بعد [illegible] کی لائٹ کی بیناں تخت پہ دیکھا ہے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹیج کی روشنی میں پہلے اس کی وہ المیہ تصویر دیکھی ہے جس نے میرے تخیل کے تار [illegible] اس کا مجھ پر کوئی تھیٹریکل لائٹنگ نہ تھی۔ ایک پل میں وہ ہم سے دور ہوتا چلا گیا اور ایک نیا پر اسرار بہت نازک دنیا میں کھو گیا۔ اس وقت مجھے [illegible] ہوا کہ ہر آرٹ کی عظمت کو اس کی دوری بیچ ہی سے پایا جا سکتا ہے۔ سارا تخیلی آرٹ ایک فاصلے پر رہتا ہے اور جب اس فاصلے کا تعین کر [illegible] جائے تو ایک وصل انداز ہونے والی دنیا سے اسے بچا کر رکھنا بھی اشد ضروری ہے۔ شعر، RITUAL موسیقی، رقص، مدرائیں، [illegible] سات، چہرے کے تاثرات، اسٹیج کی آرائش، سب چیزیں ایسی ہوں جو اس دروازے کو بند رکھنے میں کامیاب رہیں۔ ہمارے تخیل [illegible] سے عاری آرٹ ہماری روز مرہ کی دنیا کی ہو بہو نقل ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن جن فنون لطیفہ سے مجھے دلچسپی ہے۔ وہ اجسام، تشبیہوں، شکلوں، علامتوں کو ہماری دنیا اور ہم سے جدا کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ ہم ذہن کی ان گہرائیوں میں چند لمحے گزار سکیں جو اپنی لطافت اور گمبھیرتا کی وجہ سے اب تک ہماری پہنچ سے باہر تھے ــــــ"

[illegible] نے اَن گنت نوہ تمثیلیں ترجمہ کی ہیں۔ گو ترجمہ در ترجمہ سے بات نہیں بنتی لیکن میں ان ہی میں سے تین تمثیلیں [illegible]۔



نوہ ڈرامے کی سٹیج ، پائین کے درخت کی تصویر کے نیچے کورس کی قطار بیٹھی ہے۔
ماسک پہنے ہوئے ہیروئن داھنے ھاتھ پر ہے



نوہ ڈرامے کا راکھشس
چہرے کا ماسک اور سرخ نقلی بال روائتی ہیں

(۱)

کاکت سُوباتا ـــ سوسن کے پھولوں کی روح

پروہت

کورس

پروہت : میں ایک پروہت، دیس دیس گھومنے والا، میں میاکو بھی گیا اور میں نے سارے مندر اور محلے دو محلے بھی دیکھے۔ اب میں پورب کی اور جاتا ہوں۔ ہر رات میرے لیے نیا بچھونا لاتی ہے۔ اور میرے دل میں پرانا دکھ ہے۔ میں مکاوا آیا ہوں کہ سوسن کی بہار کا نظارہ کروں۔ اب سبزہ میرے سامنے ہے۔ پھولوں کو نزدیک سے دیکھنے کی خاطر میں آگے بڑھتا ہوں۔

وقت تو نہیں ٹھہرتا۔ بہار گزر جاتی ہے۔ جیٹھ مہینہ بھی آن پہنچے گا۔ نئی ٹہنیوں والے درخت اور بے نیاز گھاس اپنا سمے نہیں بھولتی۔ ان کو پروا نہیں۔ لیکن وہ فصل گل میں اپنے رنگ بکھیرنا یاد رکھتے ہیں۔

کاکت سُوباتا : اس ویران دلدل میں تم کیا کرتے ہو بھائی؟

پروہت : میں ایک سیلانی پروہت، اپنے سفر پر جا رہا ہوں ـــ یہ کون جگہ ہے؟

کاکت سوباتا : یا تو سوباتنی مکاوا "آٹھ پل" سوسن کا باغ۔ دنیا کے بہترین پھول تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ اگر تم میں جذبہ ہے تم ان کے گہرے رنگ پہچان پاؤ گے

پروہت : یہ پرانی داستان والی کاکت سوباتا کے سوسن نہیں؟ ان کا قصہ کس نے لکھا تھا؟ تمہیں معلوم ہے؟

کاکت سوباتا : "ای سے مونو گاتاری" میں مرقوم ہے۔ "آٹھ پلے" کے پاس کمودو کے پانیوں کی جھیل میں سوسن کھل کر اپنی پنکھڑیاں بکھیر گئے۔" اور نری ہیرا نے لکھا "یہ پھول اپنا درباری لباس ملک چین سے لائے تھے۔" دور دراز اور دما سے نری ہیرا یہاں آیا تھا۔ یہاں اور اُتر کے آخری کھونٹ تک وہ مارا مارا پھرا۔

کورس : کنارے کے قریب جل گہرا ہے۔ وہ جس نے خود کو مجھ سے باندھ دیا تھا ان گنت بار میرے اور اس جھیل کے پاس آیا۔

کاکت سوباتا : میں بولوں ـــ؟

پروہت : کہو۔

کاکت سوباتا: میں غریب آدمی ہوں۔ پر کیا تم ایسے جھونپڑے میں رات گزاروگے؟

پروہت: یقیناً ــــ

(اب روح اس علاقے کی ایک سادہ سی نوجوان لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور ستون کے پاس سے ہٹ کر تبدیلِ لباس کی غرض سے اسٹیج کے دوسرے سرے پر چلی جاتی ہے۔ اب وہ اپنی اصلی حالت میں یعنی گزرے زمانوں کی اس شاندار خاتون کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جسے نری ہیرا نے چاہا۔ وہ سنہرے اور اودے بیل بوٹوں والی باریک زربفت کے اوپری لبادے کے نیچے تیز نارنجی، سبز اور طلائی کام کی پوشاک میں ملبوس ہے۔ اور ایک شب رنگ ٹوپی سر پر اوڑھ رکھی ہے)

کاکت سوباتا: (اپنی خواصوں سے) یہ ٹوپی ــــ نگار خانۂ چین کی اطلس کا یہ لبادہ ــ

پروہت: یا عجب العجائب۔ اس خستہ حال جھونپڑی۔ اس سنسان کنج میں ایسی عالی مرتبت بی بی ــــ سوکی یوتائی کے عہد کی ٹوپی اوڑھے۔

کاکت سوباتا: یہ لباس چین سے منگوایا گیا تھا۔ وہاں کے لوک گیتوں نے اسے آج تک یاد رکھا ہے۔ یہ تو جاپان کے قدیم شہنشاہ سیوا[1] کی مہارانی کی پوشاک ہے۔ وہ جسے نری ہیرا نے چاہا۔ یہ ٹوپی اس کے ناچ کے لئے تھی۔ میں تو یادوں میں ملبوس ہوں پروہت جی۔

پروہت: اس پوشاک کو الگ رکھ دو۔ بی بی تم کون ہو؟

مہارانی: میں یادوں کا رنگ ہوں۔ اور نری ہیرا خدائے موسیقی کا اوتار تھا۔ اس کے الفاظ، اس کے سروں میں سحر تھا۔ پودے، گھاس، کلیاں، پتے، اس سے دعا مانگتے تھے کہ وہ انہیں نعمتِ نمو عطا کرے۔

پروہت: ایسی دنیا میں جہاں ہر چیز برباد ہو جاتی ہے، ایسی دعا کیا ضرور تھی؟ ذہن سے عاری پودوں کی خاطر میں بودھی ستوا کے قانون کا پرچار کرتا ہوں۔

مہارانی: یہ رقص بدھ کے حضور میں ہماری عبادت تھی۔

پروہت: (موسیقی کی آواز سنتا ہے) یہ یقیناً آتماؤں کی سنگیت ہے۔

مہارانی: اس نے آدمی کا روپ دھارا۔

پروہت: اپنے جگمگاتے شہر سے باہر جا کر وہ دور دور نکل گیا۔

مہارانی: خلق کو ـ ـ ـ

پروہت: اپنی دیا سے بچاتا رہا۔

کورس: دور ــــ اور دور ــــ کتنی دور ــــ میں ناچ کے کپڑے پہنتی ہوں۔

---

[1] نویں صدی عیسوی

مہارانی : غمِ فراق کا لباس۔
اس کہانی کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا کسی نے نہ کرنے والے کو دیکھا۔ نہ کسی نے اس کو پہچانا۔
اگلے وقتوں میں ایک نوجوان ناآسا کی طرف نکال کھینچے گیا۔

کورس : ہمارا خیال ہے وہ سیوا آتنو کا دربار تھا۔ شہنشاہ کے دربار کے ان الفاظ کے ذریعے — "مارچ کے شروع میں جبکہ پہاڑوں پر کہر چھایا ہوتا ہے —" اسے خلعت عطا کر کے کوہ دکا کے تہوار کا خاص پیغامبر بنایا گیا۔

مہارانی : جو غیر معمولی عزت افزائی کی بات تھی۔

کورس : شاہی محل میں ناٹک بہت کم کھیلا جاتا تھا۔ (پہلی مرتبہ ناٹک کھیلا گیا)۔ دنیا کی شان و شوکت چند روزہ ہے — پھول کھلا، مرجھا گیا۔ چنانچہ وہ بھی قسمت آزمانے اور دو تا چلا گیا۔ بادل کی طرح آوارہ۔ برسوں بعد تیسے کی لہروں کو، بلکہ کرائے اس عارضی عیش و عشرت کی یاد آئی۔ موجیں لوٹ کر آتی ہیں۔ پر زمانہ نہیں لوٹتا۔ نری ہیرا — نری ہیرا میری شان و شوکت کبھی واپس نہ آئے گی۔ پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر وہ جوالا مکھی کا دھواں اوپر اٹھتا دیکھا کیا۔

مہارانی : آساما کی چوٹی سے دھواں اب بھی اٹھ رہا ہے۔ نری ہیرا۔ نری ہیرا۔
میری شان و شوکت کبھی واپس نہ آئے گی۔

کورس : وہ سارے بین کرتا رہا۔ اور پھر مکا تدا آن پہنچا جہاں جھیل کنارے سوسن کھلے ہیں۔ موتوکاتری کی حکایت میں اس کے سفر کے قصے طوالی ہیں۔ رنگین آنکھڑیوں کے نیچے ندی بہتی رہتی ہے۔ چاروں طرف یہی روشنی پھیلانے ادا کرتے ہیں۔ خوبصورت عورتوں کی ردھلیں آسمان پر جا رہی ہیں۔ یہاں پاتال میں خزاں کی ہوائیں چلتی ہیں اور جنگلی بطخیں چیختی ہیں — کاری — کاری — ا ہیں جو آوارہ گردوں کا ہمزاد میں ادھر ادھر بھٹکتے لوگوں کو بہلانا چاہتا ہوں۔ چاہے وہ مجھے بانس پاتے جانیں۔ روشنی جو اندھیارے کی سمت نہیں جاتی۔

کورس : (نری ہیرا کا گیت گاتے ہوئے)
چاند وہ چاند نہیں۔ بہار پچھلے زمانوں کی بہار نہیں۔ میرا جسم میرا جسم نہیں۔ خالی ایک بوڑھا ڈھانچہ ہے — نری ہیرا — نری ہیرا
میری شان و شوکت واپس نہ آئے گی۔

کورس : (دوبارہ) — جاننا چاہتے کہ نری ہیرا نے شاہین سیوا آتنو کی ملکہ کے لیے کیا نہیں — ہم کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے۔ اصل شبیہ سائے اور روشنی میں تقسیم ہو جاتی ہے

اور اب میں اپنا پرانا چگہ جگہ کر نیا لبادہ پہن کر رقص شروع کرتی ہوں۔
(ناچ جس کی وہ تشریح کرتی جاتی ہے)
پھولوں پر سے پھسلتی برف — اڑتی تتلی۔

کورس : بید مجنوں کے کنج میں کونل۔ ہوا میں اڑتے سونے کے ڈھیلے۔

روح : کائنات ہوا کا سوسن پیڑ سے بولی جا رہی ہے۔

کورس : پیلے جھنڈے دور دیش آتے ہیں۔

روح : اسی طرح جوانی شروع ہوتی ہے۔

کورس : سوسن کے رنگ والی کاکت سوبانا آیا ہے؟

(سرمئی اور زیتونی حرفوں میں جب کورس شوخ رنگوں والی زنا عمر کو چاروں طرف سے چھپا لیتی ہے) درخت پر کون چلاتا ہے؟

(روح فضا میں غائب ہونا شروع ہوتی ہے)

کاکت سوبانا : یہ روشن دن پکنے پر کا خشک جھلکا ہے۔

کورس : آسیتنیں اس کل یوتوکی برف کی مانند سپید ہیں جو اپریل مہینے میں پنکھڑیاں گراتا ہے۔ دن نکلا۔ وہ اجنبی اپنا دل وا کر دیتا ہے اور اپنے دیاروں سے دور بہتے دریا جاتا ہے۔ روح کا پھول بدھ میں تحلیل ہو گیا۔

---

(۲)

واکی ———— بروہت

شیتے ———— ہیرو کی روح

سوزے ———— لڑکی کی روح (دونوں بوحہ ہوا مر چکے ہیں اور مرنے کے بعد بھی مل نہیں پائے۔ ہیرو نے لڑکی کی بے اعتنائی کے غم میں جان دے دی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد لڑکی نے جفا سے توبہ کی۔ اور اب اس کی روح پشیمان ہے)

کورس۔

واکی : کوہ فشو بوکا نام سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ دوسرے خانہ بدوش بھکشوؤں کی مانند میں بھی اس راستے پر عازم سفر ہوتا ہوں۔ میں ابتک پورب وہیں نہیں گیا۔ پر اب تو یہ ٹھانی ہے کہ دنیا کے چھور تک جاؤں گا۔ اور کاہے نہیں! میری کوئی منزل نہیں۔ دوسروں کا جھنڈا میں نہیں اٹھانا۔ میں تو بادل کی مانند آزاد ہوں۔ اب رات کا پرچم میرے سامنے لہراتا ہے۔ نجانے سمندر کس طرف ہے۔ یا وہ قصبہ کیفو جو سنا ہے سمندر کے کنارے آباد ہے۔

شیتے اور سوزے : ان گنت بار یہ رنگین شاکھا یہاں لائی گئی ہے۔ اس پر لکھے ہوئے لفظ نے ان پہاڑوں پر بکنے والی

گھاس کی اطلس کے نقش و نگار کیسے دلفریب ہیں۔

ننسے سٹے : دوسرے سے ہم لوگ گرو پڑ گئے ہیں۔ ململ کس کی ٹھی میری جان! ہم گھاس کی اس تصویر کے مانند جو اس کھردرے کپڑے پر چھپی ہے۔ یا جھینگر کی طرح جو سمندر کی پودوں میں گھسا چلا آ رہا ہے۔ الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہم کو معلوم نہیں۔ بدکے اس ویرانے کے کن جنگلوں میں ہمارے آنسو کھو گئے ہم نہ جاگے ہیں نہ سوتے ہیں۔ بہار کے مناظر سے ہمیں مطلب ہے سوتے ہیں اس کا خیال کرنا جیسے تھا اخیال نہیں — یہ کون طرح کا خواب ہے؟ ہمارے رلوں میں بہت کچھ ہے۔ اور ہمارے جسم ختم ہو چکے۔ آنسوؤں کی ندی کا پانی بہتا جا رہا ہے۔

کورس : کیفو کا کپڑا ارض میں کم ہے۔ اور پہاڑی دریا کا پاٹ چوڑا جس کے دونوں کناروں پر وہ دونوں الگ الگ کھڑے ہیں۔ جو پیڑ اولین نے بنا تھا بے رنگ ہو چکا۔ ایک ہزار ایک سو راتیں بیکار سے انتظار میں گزریں۔

واکی : (یہ نہیں پہچانتا کہ روحوں سے مخاطب ہے) اس جھیڑ میں دو شہر والے کہاں سے آ گئے؟ عجیب لوگ ہیں دونوں۔ دیکھنے میں میاں بی بی معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں پردل سے بنا ہوا کپڑا ہے۔ لڑکے نے بڑی خوبصورت منقش چھڑی سنبھال رکھی ہے۔ انوکھی سی چیزیں ہیں——

سوسے : یہ کپڑا ہو سو تو کہلاتا ہے اور عرض میں کرگھے کی چوڑائی کے برابر ہے۔

ننسے سٹے : یہ محض ایک معمولی سی رنگین لکڑی ہے۔ مگر یہ مقام انہی دونوں چیزوں کے لیے مشہور ہے۔ تم ہم سے خریدو گے انھیں؟

واکی : میں جانتا ہوں۔ اس علاقے کا کپڑا اور سنہرے روغن کا سامان بہت مشہور ہے۔ معلوم ان کی اتنی شہرت کس وجہ سے ہے؟

سوسے : تم نے آج تک ان کی کہانی نہ سُنی؟ تعجب!

ننسے سٹے : لوگوں کو اپنے جھگڑوں سے ہی فرصت نہیں ان سے یہ توقع کیوں رکھی ہوں کہ وہ تمہاری رسم کہانی بھی جانیں۔

دونوں : تم سنیاس لے چکے ہو اس لیے عین ممکن ہے کہ تم کو ان دونوں چیزوں کی اہمیت کا علم نہ ہو جن پر محبت کے منتر منقش ہیں۔

واکی : یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔

ننسے سٹے : تین سال کے عرصے میں لڑکی کے گھر کے سامنے ایک ہزار رنگین ڈالیوں کا انبار لگ گیا۔ ان کے متعلق تمہارے زمانے میں گیت بھی بنے ہیں۔

سوسے : ایک ہزار——

واحسرتا—— واحسرتا——

لورس : اب شاخِ گل پیش کرنے کی رسم بھلا دی گئی۔ یہ کہانی ایسی ہے کہ سن کر دیونا بھی چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔ ہم گھر لوٹتے ہیں۔ شام کا سورج ڈوب چکا۔

ننسے سٹے : اس علاقے کی رسم ہے کہ خواستگار درختوں کی ڈالیوں کو رنگوں سے سجا کر اپنی مطلوبہ حسیناؤں کی چوکھٹ کے سامنے رکھ آتے ہیں۔

سوروسے: اور وائی جس درپہ دیکھ رہی ہے اس کی ٹوٹی ہوئی شاخ گل اٹھا لیتی ہے۔ ایک دفعہ ایک نوجوان تین سال تک ہر رات اپنا معروضہ لے کر آیا۔ اور پہاڑ کے دامن میں ایک بڑا جھٹریاں پڑی ملیں۔ اس نوجوان کا واقعہ مجھے معلوم ہے اسے ان لکڑیوں سمیت ایک کھوہ میں دفن کر دیا گیا۔

وائی: مجھے اس کھوہ کا راستہ دکھلاؤ گے؟

شے سے: میں تمہیں اس کھوہ کا راستہ دکھلاؤں گا۔

کورس: ہم بیتوں اور بیلوں کو سامنے سے ہٹا کر دن بھر، شام ڈھلے تک چلتے رہے۔ اور کھوہ کے نزدیک اب تک نہیں پہنچے۔ اور پہاڑی پر گھاس کا سبزہ راستے چھپائے۔ ذرا بات سننا۔

کورس: (خود ہی کہسار کی طرف سے جواب دیتا ہے) پگڈنڈی پر کہرہ بکھرا ہوا ہے۔ اگر تم پوچھو گے کہ شبنم کہاں ہے۔ اب اس کا جواب تمہیں کون دے؟
اچھا مت بتاؤ۔ مت بتاؤ۔ چلو آگے چلیں۔

شے سے: خزاں کا موسم سرد ہے۔ اور رات آتی ہے۔

کورس: اور آندھی۔ درختوں کے پتے گر رہے ہیں۔ بارش کی پھوار برس برس جاتی ہے۔ خزاں کے شبنم آلود پتوں میں ہمارے پاؤں اٹک اٹک گئے۔ ابدی سایہ تنہا ہے۔ پہاڑ کی پرچھائیں اکیلی کھڑی ہے۔ پائن کے درختوں پہ عشق پیچاں میں چھپا ہوا الو بولے چلا جا رہا ہے۔ بنفشہ اور گل داؤدی میں گھری ہوئی کھوہ میں لومڑی بولتی ہے۔ دونوں اندر چلے گئے۔

(شے سے اور سوروسے گویا کھوہ میں داخل ہوتے ہیں)

دوسرا حصہ

(وائی گویا سونے کی کوشش کر رہا ہے)

وائی: (بے چینی سے) نیند نہیں آتی۔ اکتوبر کی ہوائیں۔ صنوبر کے درخت۔ رات میں بودھی ستوا کی عبادت کروں گا۔

(گویا پوجا شروع کرتا ہے)

سوروسے: پروہت جی! اب ہم، جو زندگی اور زندگی کے بعد بھی جدا رہے، ملیں گے خودرو گھاس پر، ان پودوں کے اوپر جن میں رہتی ہوں، میں خواب کا پل بناؤں گی۔ پروہت جی۔ مجھے زبردستی رہ جگانا۔ میں نے دیکھا ہے کہ قانون مکمل ہے۔

شے سے: (گویا منظر سے داخل ہے) آپ کی عبادت بہت خوب تھی مہاراج۔ جو دونوں لوک تک گئی اور پرانے بندھن باندھے اب میں پہلی بار رنگ میں ظاہر ہوتا ہوں۔

کورس: تین سال گذر گئے۔ کہانی پرانی ہو گئی۔

شے سے: خواب کے اندر خواب دیکھنے کے سبب ہم واپس آتے ہیں۔

کورس : (دیکھو، کھوہ میں صنوبر کی شاخوں کے نیچے ایک لحظہ کے لیے وہ نمودار ہوئے۔)

شسّے تُے : جنم کی تہہ میں شاہزادوں اور عوام کے درمیان کوئی تخصیص نہیں کی جاتی۔ میری بدقسمتی!

واکی : تعجب! پرانی کھوہ آگ کے شعلے ایسی چمک رہی ہے جیسے کسی کے گھر کا روشن کمرہ! اندر کرگھا لگایا جا رہا ہے اور چادر کی تھیلیاں اکھٹی کی جاتی ہیں۔ پردے اور سامان آرائش لوگوں پرانے عہد کا جان پڑتا ہے۔ یہ کیسا فریب نظر ہے۔ کیسا طلسم؟

سورسے : ہمارے دل تو کرتی برف کے اندھیارے میں چھپے تھے۔ تم جو ابھی دنیا میں موجود ہو، ہمیں ہم سے بہتر معلوم ہونا چاہیے کہ مایا کیا ہے اور حقیقت کیا۔ ہم تو ڈوبنے اور مست جلنے والوں کے بھنور میں رہتے ہیں۔

شسّے تُے : پچھلے زمانے میں مری تیرا نے کہا تھا (اور گزرتے برسوں کے ساتھ وہ بھی غائب ہو گیا) کہ مسافر، یہ تو تم ہی بتلاؤ کہ مایا کتنی ہے اور حقیقت کتنی۔

واکی : یہ خواب ہی سہی، یا نظر کا دھوکہ۔ مگر اس سے پہلے کہ یہ رات بھی گزر جائے میں حد درجہ کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔

شسّے تُے : دیکھو! جس طرح پھول کا سایہ گھاس پر نظر آتا ہے اور چراغ کے بجائے روشنی کے لیے تمہارے پاس صرف چاند ہے۔

سورسے : خزاں کھوہ میں چلی گئی۔ اور اب کرگھا لگا کر خزاں کے پتوں کا ایسا ہلکا کپڑا بُن رہی ہے۔

شسّے تُے : خواہشگار زنانی گل لاکر دروازے پر دستک دیتا ہے۔

سورسے : چلے آئے۔

شسّے تُے : کرگھے کی آواز سے سوار

سورسے : اور کرگھے کی آواز۔

شسّے تُے : جواب میں نہ سنائی دی تھی۔

سورسے : اور ٹڈوں اور سبز جھینگروں اور موسم خزاں کی گرتی پتیوں کی ایسی خوبصورت صدا۔

شسّے تُے : جو تمہیں یہ رات سنائی دیتی رہے۔

سورسے : کری

شسّے تُے : ہتاری

سورسے : چو ——

شسّے تُے : چو ——

کورس : (جھینگروں کی آواز کی نقل کرتے ہوئے)

کری ہتاری —— چو —— چو ——

کری ہتاری —— چو —— چو ——

کھیت کی نئی گھاس سے جھینگر اپنے پھٹے پرانے کپڑے رفو کر رہا ہے۔ سنو —— چو —— یہ سنو —— کرگھے کی آواز ——

چو ——

کورس ؎ : (دعا کر) کپڑے میں گھاس کا کپڑا بنا جاتا ہے۔ کیفو جو جزیرے کا آخری سرا ہے۔ دنیا کا بے مثال شہر کیفو ——

شٹے : یہ بڑی پرانی رسم ہے۔ مگر پردہ بہت تنگ بھی تو ماضی کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔

کورس : یہ بہت ہی پرانا رواج خود ہی آ بنا ہے کہ اگر ہم "سوز نو" بنی ڈالیں اور ایک ہزار ایک سو راتوں تک جادو جگائیں تب بھی ہماری کوئی منت پوری نہ آسکے گی۔ نہ مدھم پڑے گی۔ نہ ختم ہو گی۔

شٹے : آج ہمارا دکھ لبوں میں گایا جاتا ہے۔

کورس : شاید مدھم ہونے سے بھی کچھ تسکین حاصل کر سکیں۔ ہمارا پچھتاوا خواب کی صورت ہی میں کیوں نہ ظاہر ہو؟ وہ نشانیاں جو کہ ہمارا ہے۔ حالانکہ اب ان کی سمت پر بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو گھر میں بیٹھی جھینگر کی طرح کپڑا بنتی ہے۔ رات ہو گئی۔
اس کے دل میں محبت ہے۔ میں یہاں پڑا ہوں۔ ایک جسم۔ جسے کوئی نہیں جانتا۔ کائی میں مدفون لکڑی کی مانند۔ یہی مناسب تھا کہ میں بھول جاتا۔ مگر ہمارا قصہ تو ساری دنیا میں پھیل گیا۔

شٹے : بتاؤ مجھے کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ میری تحریروں کا پلندہ اس کے گھر کے نیچے پڑا ہو گا؟

کورس : سال کا آخری حصہ خزاں نے سرخ کر دیا۔ ہزار راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ میرے آنسوؤں سے بھیگ بھیگ کر میں اور میری آستینیں معدوم ہو چکیں۔ کیا میں اب بھی اندر نہیں آسکتا؟ ہم سب گزر جائیں گے۔ تم اور میری آستینیں اور میرے آنسو۔ اور تم کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ تین برس کب نکل گئے۔

کورس : کیا میں بالآخر دلہن کا کمرہ دیکھ پاؤں گا جسے کسی نے آج تک نہ دیکھا؟

شٹے : آخر کار جوگ کی گھڑی آ گئی۔

کورس : ناچ میں رتھاں آستینیں برف کے گالوں کی طرح درخشاں ہیں۔

شٹے : ناچو

کورس : ناچو اور راگ چھیڑو۔ یہ ناچ نشی کی گی کے لیے ہے۔

شٹے : یہ ناچ شام کے ناکموں اور کپڑا بننے والیوں کے لیے۔

کورس : ناچ کا عکس شراب کے پیالوں میں لرزاں ہے۔

کورس : (دوبارہ) آ رہی —— آ گئی —— صبح ہو گئی! چلو —— چلو —— اس سے پہلے کہ روشنی پھیل جائے۔ (دعا کی سے) ہماری تم سے درخواست ہے:۔ جگانا نہیں یہ دہشت۔ ہم سب مرجھا جائیں گے۔ تم ابھی جگو گے۔ تم سرحدوں پر پھرتے ہو۔ کسی شے کو تمہارا انتظار نہیں۔
یہ سب ختم ہو جائے گا۔ یہاں پر، اس ویرانے کے گھرے میں، اس سنسان کھوہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔
آج کی ہوا صنوبروں میں سرسرا رہی ہے۔ سناٹا ہے۔ کوئی روشنی نہیں۔ کوئی زندگی نہیں۔

———

؎ ANTISTROPHE

ہیرو .... ایک نوجوان زمیندار

لڑکی .... اس کی بیوی

یوگیری .... نہری

لڑکی کی روح

زمیندار : میں کن تنہ کا رہنے والا ہوں ۔ اپنا کھلاتا ہوں ۔ گمنام اور معمولی آدمی ہوں ۔ مقدمے بازیوں کے چکر میں بہت سے دارالسلطنت میں مقیم ہوں ۔ چند روز کے لیے آیا تھا ۔ مگر آج پورے تین سال ہو گئے ۔ اب مجھے گھر کی فکر ستا رہی ہے ۔ میں اپنی نہری کو گاؤں بھیجتا ہوں ۔ ہو ـــ ! یوگیری ! میں بہت پریشان ہوں تم گاؤں چلی جاؤ اور میرے گھر والوں کو مطلع کر دو کہ میں اس سال کے آخر تک لوٹ آؤں گا ۔

یوگیری : بہت اچھا ـــ (روانہ ہوتی ہے) پل پل میں ہمیں دن گھٹتا جا رہا ہے ۔ اپنی سفری پوشاک میں ملبوس میں سورج کے ساتھ ساتھ راستہ طے کر رہی ہوں ۔ مجھے معلوم نہیں سرائیں کہاں ہیں ۔ مجھے معلوم نہیں راہ میں کتنے خواب آتے ہیں ۔ مجھے معلوم نہیں ۔ راستے کے خیمے میں کتنی نیند جمع ہوتی ہے ۔ آخر کار میں گاؤں پہنچ گئی ۔ اب میں آہستہ سے پکارتی ہوں ۔ کوئی ہے ـــ ؟ اندر خبر کر دو کہ یوگیری دوار پر کھڑی ہے ۔ شہر سے آئی ہے ۔

لڑکی : ام ـــ ! اف ـــ ! گھونسلے اداس ہیں ۔ بلبلیاں غمگین ۔ محبت شعار بطخیں افسردہ ۔ وہ جو ایک دوسرے سے بندھے ہوں ۔ ایک دوسرے کی دنیا میں رہتے ہوئے وہی زیادہ دکھی ہوتے ہیں ۔ اے ہری گھاس ! جب بارش تجھ پر برسے تو تو آنسو بہانا نہ بھولنا ۔ میرے آنسو تو خاموشی کی برکھا ہیں ۔ اے دل ـــ اے دل ـــ

نہری : کانوں والو ـــ سن لو ـــ کہ یوگیری آن پہنچی ۔

لڑکی : یوگیری ـــ ؟ مجھے تو نہری کی ضرورت نہیں ۔ اندر آجاؤ ۔ یوگیری ۔ تم ایسی حیران طرح کیوں آئی ہو ۔ آؤ ـــ جم جم آؤ ۔ یوگیری ۔ مجھے بڑی شکایت ہے ۔ تم اتنی بدل گئیں ۔ نہ خط نہ پتر ۔ کبھی ہواؤں کے ذریعے ہی کوئی پیغام بھیجا ہوتا ؟

نہری : میں تو آنا چاہتی تھی پر سرکار نے اجازت نہ دی ۔ تین سال انھوں نے مجھے اس دقیانوسی شہر میں قید رکھا ۔

لڑکی : شہر تم کو نہ بھایا ؟ میں تو وہاں کی بہار کے شگوفوں کو اکثر یاد کرتی تھی ۔ اس کے بعد میرا دل غم کے لبادے میں چھپ گیا ۔

کورس : خزاں کے اختتام پر ، ایک دیہاتی مکان میں ، جہاں گھاس اس طرح مرجھا رہی ہے جیسے انسانوں کی آنکھوں سے روشنی زائل ہوتی ہے ، اسی طرح محبت کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ کل کے لیے وہ کہ ۔ کیا سہارا ڈھونڈے ؟ تین سال ـــ خزاں کا خواب ۔ یہاں تک کہ ان خوابوں کے الم نے اس کے دل میں خزاں کی صدائے بازگشت جگا دی ۔ دن گزر گئے ۔ اگر دنیا میں جھوٹ کا وجود نہ ہوتا تو کوئی مردوں کے قول کا بھروسہ بھی کر لیتا ۔ مرد پر اعتبار کیا ۔ ! مورکھ لڑکی ـــ ! مورکھ لڑکی ـــ !

لڑکی : یہ عجیب سی چیز کیا ہے جس کی شکل آواز کے روپ میں مجھ تک پہنچ رہی ہے؟

مہری : گاؤں کا کوئی جولاہا جو کھٹے پر تانا ریشم کی تہہ پیٹتا ہے۔

لڑکی : ایسے بس — میں تو پرانی عادت کی طرح گھس پیٹ گئی ہوں۔ جب جیجی کا سیلانی شوہر بی بی بچوں کو فراموش کر کے منگولوں کے دیس میں گھومتا پھر رہا تھا تو وہ سب جاڑے کی شفاف ٹھنڈی راتوں کو اپنی اونچی برجی پہ چڑھ کر ریشم کا تختہ پیٹا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کی سرسراہٹ کی آواز جو سینکڑوں کوس دور بھی وہ سوتے میں کروٹ بدل لیتا تھا۔ میں نے بھی اپنے چوبی تختے پہ رنگ برنگے نقش و نگار والے ریشم چھیپے جو الو کے پرندے جھٹ پٹے کی اہٹ تنہائیوں میں سے لے کر آئے تھے کہ میرے جی کو چین ملے۔

مہری : یہ تو غریبوں کا کام ہے۔ جو جولاہوں کو بھی ٹھکانا دیتا ہے۔ آپ کی ایسی اونچے گھرانے کی بٹیا نے دل کے سکھ کی جستجو میں یہ محنت بھی کی۔ لائیے مجھے دیجئے۔ یہ کام میرے ہاتھوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

لڑکی : پیٹے جا — اور زور سے پیٹو — تاکہ ہمارے دل کا سارا غبار نکل جائے۔

مہری : یہ کپڑا کالی کھُردرا ہے۔

کورس : صنوبر کے درختوں کی مدھم آواز جھٹ رات کو مانند کر دے گی۔ کتنی سردی ہے۔

لڑکی : خزاں آ گئی۔ اور نہ تمہاری بیر جائی ہوا کوئی خبر لے کر آئی نہ کہیں سے کوئی پیغام سنایا۔

کورس : تھکن۔ اور رات۔

لڑکی : دور دراز کے گاؤں —

کورس : شاید چاند بھی اندھیرا پڑے اس کے پاس یہ پوچھنے نہیں آئے گا — یہ کس کی رات کی دنیا ہے؟

لڑکی : اے خوشگوار موسم! کہہ کہ وقت بھی خزاں رسیدہ ہے۔ شام ڈھلی جاتی ہے۔

کورس : بارسنگھے کی آواز سے اس کے دل کو دکھ ہوتا ہے۔ ہمیں شاخ کا سرا دکھلائی نہیں دیتا۔ آخری پتہ بغیر کسی گواہ کے گر گیا۔ سائے ہیبت زدہ ہیں۔ چاند اور گھاس نیچے سے چپکے خاموش ہیں۔

لڑکی : میری اندھی روح شبنم آلود پردے کی طرح معلق ہے۔

کورس : اظہار الم کے لیے کیسی راحت ہے یہ! سحر زدہ لمحے۔ کپڑے کا چوکھٹا محل کی چھت پر کھڑا ہے۔ اور شمال کی ہوا اس کا ریشم پھڑپھڑا رہی ہے۔

لڑکی : جولاہے ریشم کو کبھی دھیرے دھیرے پیٹتے ہیں کبھی زور زور سے کیا گاؤں میں بہت سارے جولاہے رہتے ہیں۔

یوگیری : چاند کی ندی مغرب کی سمت بہہ رہی ہے۔

کورس : آوارہ گرد شوہر اُتر کے صوبے میں کہیں پڑا سوتا ہے۔ اور یہاں پورب کے آسمانوں پر پھر ہوا چل رہی ہے۔ اے ہوا — یہ بے چاری جو ریشم پیٹ رہی ہے اس کی آواز بھی اپنے ساتھ لے جا۔

کورس : (باز گرد) ہوا —! باڑ کے کنارے لگے ہوئے صنوبروں سے خبردار رہنا کہیں ان کی سرسراہٹ اس آواز میں مخل نہ ہو جائے۔

ہوشیار! آوارہ گرد طوفانوں کی صداؤں کو بھی نہ بھلانا جو تمہارے پیچھے پیچھے سفر کرتے ہیں۔ اس دکھیاری بچی کے دیوتا کے پاس جاؤ۔ اسے سمجھاؤ — میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ خواب دیکھتا رہے۔

لڑکی : اوئی — اگر یہ ناتا بانا ٹوٹ گیا تو وقت سے تھک کر، میرے پاس کون آئے گا۔ اگر آنا ہے تو ابھی آ کہ وقت باقی ہے۔ دوبارہ رشتے سے لباس مختلف ہو جاتے ہیں۔ محبت تو گرمیوں کی ململ کی طرح کمزور ہے۔ مجھے چاند کے نیچے لیٹنا نہیں آتی۔

کورس : ویسے دیوتاؤں کی محبت بھی ململ کی مانند ناپائیدار ہوتی ہے۔ آسمان کی ندی کی لہروں نے ہمارے وقت کو قینچی کی طرح کاٹ ڈالا۔ کانچ کے پتے پر آنسو جگمگاتے ہیں اور تیز دھارے پر بہتی زندگی کی ہوا — اس میں بھنگ چکی ہے۔ اگر وہ آ گیا تو کیا دیوتاؤں کی آستینوں کو کوئی نقصان پہنچے گا؟

لڑکی : بھادوں کا ساتواں دن ہے۔ راتیں لمبی ہونے والی ہیں۔ یہ اس کو ان دس ہزار آوازوں کی اداسی بھیجوں گی۔ چاند کا رنگ — ہوا کی مہک — کہرہ — لمحہ جب دل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ ریشم بیننے کی صدا۔ رات کے طوفان۔ جھکڑوں میں بلند ہونے والی چیخ۔ جھینگروں کا گیت۔ شبنم گرنے کا احساس۔ سرگوشی کی آہیں — میرا — میرا —

مہری : اب میں کیا کروں؟ شہر سے ایک آدمی خبر لایا ہے کہ مالک اس سال نہ آسکیں گے۔ لگتا ہے شاید —

کورس : دل، جو سوچتا ہے کہ اب نہ سوچے گا، بیٹھ رہا ہے۔ باہر جھینگروں کی آواز ڈوب گئی۔ پھول ہوا میں کھلا پڑا ہے۔ دیکھنے والے دیوانگی کی طرف بڑھ گئے۔ پھول کا دل زندگی کی وحشی ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا سارا رنگ بکھر گیا۔

(لڑکی مر جاتی ہے۔ اس کا شوہر داخل ہوتا ہے)

زمیندار : اس کے غم و غصے نے ہماری تین سالہ جدائی کو ابدی فراق میں تبدیل کر دیا۔

کورس : آٹھ ہزار پرچھائیوں نے ہمیں بتلایا ہے کہ قتل سے پہلے پشیمان کوئی نہیں ہوتا۔

الم — کہ ہم تانت پہ بات کرتے ہیں۔

الم — کہ ہم محض سارنگی اور کمانچے کے ہم زبان ہیں۔

لڑکی کی روح : اوئی — قسمت جو آخرکار تھک گئی اور تین دھاراؤں والی ندی میں جا ڈوبی۔ آلوچے کے پھولوں کی روشنی غائب ہو گئی۔ جو دنیا میں آمد بہار کی اطلاع دیا کرتی تھی۔

کورس : راستے کے اجالے کے لیے اس نے مشعل جلا لی۔

روح : جس کی روشنی میں وہ کبھی نہ ڈوبنے والے چاند کے تلے خزاں کے موسموں کا نظارہ کرے گی۔ اور اس کے باوجود خواہشوں کا شکار کون نہیں بنا؟ خیال کی آگ اور اس کے دھوئیں کے مرغولوں میں بہت رنگ تمناؤں کے انبار میں دب جانا بہت آسان تھا۔ اے دل — تو رنگ برنگے دھاگوں میں الجھ گیا تھا۔ "دکھ" اور "قیمت" ان (دھاگوں) کے نام ہیں۔ اور اس بلی خانے کے دار و غہ اور بے سبب سو کے کوڑوں کی کوئی گنتی نہیں۔ اے دل — تو نے انتہائے کرب کے عالم میں بجتا دے کے ریشم کو چیتا۔

کورس : موہ مایا اور قسمت! اس کے آنسو ریشم کے تختے پہ گرتے ہیں۔ آنسو شعلے میں تبدیل ہو گئے۔ اور دھوئیں نے اس کی چیخوں کو

گھونٹ دیا۔ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ نہ ریشم پینے کی آواز۔ نہ صنوبروں کی سرسراہٹ۔ محض اس المناک سزا کی آواز آ رہی ہے۔ اوی — اوی —! نیند کی رفتار کی طرح آہستہ۔ وقت کے راہوار کی طرح تیز۔ تبدیلی اور گزر جانے کے چھ راستوں کے ذریعے ہم چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ نہ کرم کے نتیجوں سے۔ گو ہم زندگی اور موت میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ بر عورت بھاگ کر ایک ایسی دنیا میں پہنچی جہاں نہ سواد ہے نہ سانس۔

روح : تو تسوگماس بھی اپنی پتیاں ٹیڑھی کر کے پاتال سے اپنی نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔

کورس : او اشتیاق مجسم! تو نے اس شخص کو دونوں لوک میں عزیز رکھا تھا۔ اور امید نے ایک ہزار نسلوں تک پیچھا نہ چھوڑا۔ یہ سب بیکار تھا۔ صنوبروں سے ڈھکی کوہ ماتسو یاما کی چٹانیں وقت کے اختتام پر کھڑی ہیں۔ تمہارے الفاظ بے کار ہیں۔ اوی — اوی — مرد کا دل بس یہی ہے۔

روح : کتنی! تم کو تو میرا کوئی دکھڑا سا خیال بھی نہ آیا۔ تمہارا کوئی خواب مجھ تک نہیں پہنچا۔ شرم —! شرم —!

کورس : وہ "پھول کے دھرم" کا جاپ کر رہی ہے۔ اور اس کی آتما بودھی ستوا میں داخل ہوتی ہے۔ راستہ روشن ہو گیا۔ اس کے مستقل ریشم بننے نے پھول کو وا کر دیا۔ اور وہ رسان سے بودھی ستوا میں شامل ہو گئی۔

لوکی

(انشائیہ)

کرشن چندر

سبزیوں میں مجھے بھنڈی بہت پسند ہے۔ نجانے کس بدذوق نے اس کا نام بھنڈی رکھ دیا ہے۔ حالانکہ اس کا نام سبزا پری ہونا چاہیئے۔ انگریزی میں اگر اسے خاتون کی انگلی کہتے ہیں تو بہت اچھا کہتے ہیں۔ گو خاتونِ مشرق کی انگلیاں بھنڈی سے زیادہ نازک اور مہین ہوتی ہیں۔ مگر انگریز عورت کی مناسبت سے یہ نام بہت ہی موزوں ہے۔ جن لوگوں کو انگریز عورت کی مضبوط انگلیوں کا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ لوگ بھنڈی کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر خاتونِ مشرق اور مغرب کی انگلیوں میں کوئی فرق ہے تو ہمیں اس پر چنداں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ مثل مشہور ہے۔ پانچوں بھنڈیاں برابر نہیں ہوتیں۔

مجھے کریلے بھی پسند ہیں۔ چاہے وہ کڑاہی میں پڑے ہوں۔ یا نیم پر چڑھے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے آج تک کسی کریلے کو نیم پر چڑھتے نہیں دیکھا۔ مگر بزرگوں سے سُنا ضرور ہے۔ بزرگوں سے تو یہ بھی سُنا ہے کہ کسی زمانے میں ٹیڑھی کھیر بھی کھائی جاتی تھی۔ مگر اُس زمانے کے لوگوں کے دانت بہت مضبوط ہوا کرتے تھے۔ آج کل بناسپتی کا زمانہ ہے۔ دندان ساز ٹیڑھی کھیر کھانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ اور نیم چڑھے کریلے کہیں ملتے نہیں۔ البتہ ایسے کریلے ضرور ملتے ہیں۔ جنھیں کھا کر نیم پر چڑھنے کا خیال آتا ہے!

مجھے سرسوں کا ساگ بھی پسند ہے۔ کھیتوں کی کھُلی فضا میں جب نوجوان لڑکیاں سرسوں کا ساگ توڑ کر اپنے دامن میں بھر لیتی ہیں۔ تو سرسوں کا ساگ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہی حال پالک کے ساگ کا ہے۔ یہی حال باتھو کے ساگ کا ہے۔ یہی حال چنے کے ساگ کا ہے۔ یہی حال بروا کے ساگ کا ہے۔ ممکن ہے آپ نے بروا کا ساگ نہ کھایا ہو۔ (میں نے بھی نہیں کھایا) لیکن وہ مثل تو ضرور سُنی ہو گی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! بس اسی سے اندازہ کر لیجئے۔ کتنا عمدہ ساگ ہوگا!

ادھر تُرئی! جسے پنجاب میں توری کہتے ہیں۔ اور برج میں ترئی کہتے ہیں۔ حالانکہ کسی زمانے میں ادھر بھی اسے توری ہی کہتے تھے۔ آج کل بر بنائے مخاصمت نہیں کہتے ہیں۔ مگر اس زمانے میں ضرور کہتے تھے۔ جس زمانے کا یہ گیت ہے "کا نہا۔ آئی توری

گئی ہیں۔"

صاف معلوم ہوتا ہے۔ لونی خوبصورت گوالن ہے اور سر پہ توری کا ٹوکرا اٹھائے کاہن کی گلی میں توری بیچنے آتی ہے۔ "ٹوکا نہا۔ آئی توری گلی میں!" اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی توری کس قدر مرغوب سبزی ہوگی جس کے آتے ہی کاہن گلی میں آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج کل تو خواتین تُرئی یا توری کا نام سنتے گھروں کے دروازے بند کر لیتی ہیں۔ مگر اس زمانے میں یہ بات نہ تھی۔ دراصل ہمارے لوک گیتوں میں ہمارے اسلاف نے جو خوبصورت ہیرا، وہ تہذیب و تمدن کے کیسے کیسے خزانے بند ہیں۔ جن سے اس زمانے کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ مشہور لوک گیت آج بھی دلہن کے وداع ہونے پر گایا جاتا ہے۔ بابل مورا نیہر چھوٹا جائے ...... صرف یہی گیت اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے آریہ لوگ بابل کے رہنے والے تھے۔

میرا جی چاہتا ہے۔ کبھی اسی موضوع پر ایک تھیسس لکھوں۔ مگر چھپے گا کون؟ اس برصغیر میں پہلے ہی سبزیوں اور دانشوروں کی اس قدر زیادتی ہے کہ لوگوں کی ذہنی یا دانش پر مزید بوجھ ڈالنا کسی طرح جائز نہیں معلوم ہوتا!

سبزیوں میں ایک سبزی بینگن بھی ہے۔ بینگن دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو جھاڑی کا بینگن ہوتا ہے۔ دوسرا تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ مگر بھرتا دونوں کا بنتا ہے اور بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آپ تھالی میں نہ ہوں۔ مجھے گرمیوں میں بینگن کا بھرتا اور چکن کا کرتہ دونوں بے حد پسند ہیں۔ حالانکہ چکن کا کرتہ کھایا نہیں جا سکتا۔ مگر مصیبت کے وقت چبایا تو جا سکتا ہے۔ اور چبانا جو ہے وہ گویا کھانے سے پہلے کی ایک منزل ہے۔ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے!

پھر مٹر کی پھلی ہے۔ لوبیے کی پھلی ہے۔ فرنچ بین ہیں جنہیں یار لوگ فرانس بین کہتے ہیں۔ الغرض وہ تمام سبزیاں ہیں جو سبز رنگ رکھنے کی وجہ سے سبزیاں کہلاتی ہیں۔ پھر وہ سبزیاں بھی ہیں جو سبز رنگ نہ ہونے پر بھی سبزیاں کہلاتی ہیں۔ جیسے کدو۔ چقندر۔ ٹماٹر۔ مولی شلجم۔ گاجر۔ آلو۔ گوبھی۔ انڈہ۔ یہ سب اشیائے خوردنی، کچھ لوگوں کے لیے اشیائے خوردنی اور بہت سے لوگوں کے لیے اشیائے ویدنی، سبزی کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ یہ سب مجھے پسند ہیں۔ سوائے ایک لوکی کے ......!!

میں جب تک اپنے ماں باپ کے گھر میں رہا، میں نے لوکی کھائی۔ جب میں کالج کے ہوسٹل میں داخل ہوا۔ جب بھی میں نے لوکی کھائی۔ آج جب کہ میں ایک کرایہ دار مہمان کی حیثیت سے صوفی کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہوں۔ برابر لوکی کھا رہا ہوں۔ ممکن ہے اس سے آپ کے دل میں یہ خیال گزرے کہ شاید مجھے لوکی اس قدر مرغوب ہوگی جبھی تو میں اسے برابر بچپن سے کھاتا چلا آیا ہوں۔ آپ اس خیال کو اپنے دل سے گزر جانے دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ سے بات کروں گا، ممکن ہے میں اس سے پہلے ہی آپ کو قتل کر ڈالوں۔ کیونکہ اگر میں اس دنیا میں کسی سبزی سے نفرت کرتا ہوں۔ تو وہ یہ لوکی ہے۔ لوکی ہے!! سمجھ گئے آپ؟ مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔ کیا آپ اس نفرت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ بچپن ہی سے آپ جس چیز سے نفرت کرتے ہوں، ہر روز تقریباً ہر روز۔ آپ کا سابقہ اسی سے پڑے۔ یہ لوکی کے کوفتے ہیں۔ یہ لوکی کا رائتہ ہے۔ یہ لوکی گوشت ہے۔ یہ لوکی بڑی ہے۔ یہ لوکی ٹماٹر۔ یہ محض لوکی۔ صرف لوکی۔ خالی لوکی۔ بالکل لوکی۔ خالص لوکی۔ نخالص لوکی۔ اور لوکی کے سوا اور کچھ نہیں مگر لوکی...... بچپن سے جوانی تک۔ گھر سے مس صوفی

کے بورڈنگ ہاؤس تک۔ لوکی ..... لوکی ..... لوکی ..... کیا یہ کسی آدمی کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے ..... ؟

اور آخر ہر روز یہ لوکی ہی کیوں کھانے میں ملتی ہے؟ محض اس لیے کہ سستی ہے؟ محض اس لیے کہ یہ پھیکی اور بے مزہ ہے؟ اس دنیا میں ہر سبزی کا ایک مزہ ہوتا ہے۔ ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ اُس کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ کریلے کھائیے۔ صاف معلوم ہوتا ہے آپ کریلے کھا رہے ہیں۔ مولی کھائیے آپ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ چقندر کھا رہے ہیں۔ فرنچ بین کھائیے کبھی انگریزی بین معلوم نہ ہوں گے۔ اگر اچھی طرح سے پکا ہو تو اس کے ذائقے میں ہمیشہ ایک ہلکی سی تلخی باقی رہتی ہے جیسے اس کا ذائقہ آپ پر ہنس رہا ہو۔ مگر یہ تو فرانسیسیوں کا ہمیشہ سے کردار رہا ہے۔ کسی انگریزی بین سے آپ اس قسم کے کردار کی توقع نہیں کر سکتے۔ بہرحال میں زیادہ دیر تک فرنچ بین کی تعریف نہ کروں گا۔ ممکن ہے بہت سے لوگوں کو فرنچ بین پسند نہ ہو۔ اُن لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرنا گویا بھینس کے آگے فرنچ بین بجانا ہے!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دنیا میں ہر سبزی کا ایک ذائقہ ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو اس کم بخت لوکی کا کوئی ذائقہ نہیں ہے۔ اس کا اپنا کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔ کوئی مزہ ہی نہیں ہے۔ عجیب بے رنگ شخصیت ہے اس کی۔ یہ نہ کھٹی ہے۔ نہ میٹھی ہے نمکین ہے نہ تلخ ہے۔ کڑوی ہے نہ کسیلی ہے۔ اس کم بخت کا کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔ مگر جب دیکھئے دسترخوان پہ دھری ہوتی ہے۔ میں ساری زندگی اس کے خلاف لڑتا رہوں گا۔ گھر میں ماں باپ کے ساتھ، ہاسٹل میں باورچی کے ساتھ، بورڈنگ ہاؤس میں مس سوتی کے ساتھ۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ اب تک میں کب کا پاگل ہو کر پاگل خانے چلا گیا ہوتا۔ مگر میں یہی سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ اگر وہاں بھی کھانے کو لوکی ہی ملی تو؟

ابھی اُس روز کا ذکر ہے میں اپنے دوست پرویز کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کے لان میں بیٹھا ہوا لنچ کر رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ چمکیلا دن تھا۔ دھوپ صاف اور کھلی تھی۔ کہیں پر بادلوں کا نشان نہ تھا۔ لان کی سبز مخملیں دوب مدمقابل کسی حسین پیکر کسی دلنواز عربدہ جو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اتنے میں صوفی لنچ لے کر آئی۔ لنچ میں لوکی تھی۔ جب وہ لنچ رکھ کر چلی گئی۔ تو میں چند لمحے تو دم بخود سا رہا۔ آخر میں نے پرویز سے کہا۔

"اس دنیا میں انصاف کہیں نہیں ہے!"

پرویز نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ وہ جس چھاپہ خانہ میں فورمین ہے۔ وہاں جو کہانیوں کا رسالہ چھپتا ہے۔ اُسے میں نے پرویز کی سفارش سے ایک افسانہ بھیجا تھا۔ جو کل ہی واپس آیا تھا۔ ایڈیٹر نے افسانہ واپس کرتے ہوئے لکھا تھا۔ آپ کے افسانے میں ایک غریب گڈریئے اور اس کی بھیڑوں کا ذکر ہے۔ ہمارے پڑھنے والے غریب گڈریوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہ انھیں بھیڑوں کے مونڈے جانے کے طریقوں میں کوئی دلکشی نظر آتی ہے۔ آپ کے افسانے میں کوئی عورت نہیں ہے۔ صرف بھیڑیں ہی بھیڑیں ہیں۔ بہتر ہو گا اگر آپ مقامی رنگ سے احتراز کریں۔ اور اپنے ادب میں ابدیت پیدا کریں۔ علیٰ ھذا القیاس .....

پرویز نے سمجھا میں اُس افسانے کے لوٹائے جانے کے بارے میں شکایت کر رہا ہوں۔ وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر لوکی کا ٹکڑا رکھتے ہوئے بولا "بے چارہ ایڈیٹر ٹھیک تو کہتا ہے۔ اگر تم اپنے افسانے میں بھیڑ کے بجائے عورت رکھ دیتے۔ تو کیا حرج تھا؟"

"تم کیا جانو، افسانہ نگاری کیا ہوتی ہے؟" میں نے چلا کر پرویز سے کہا۔ "تم نوکر ہو۔ تم جس شوق سے لوکی کھاتے ہو۔ اُسی رغبت سے عورت کا ذکر کرتے ہو۔ اُسی انہماک سے بھیڑ کا گوشت کھاتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم بھیڑ اور عورت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ تم قطعاً حساس نہیں ہو!"

"حساس کیا ہوتا ہے!" پرویز ذلیل روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ کر بولا۔

"حساس؟ حساس وہ آدمی ہوتا ہے جو لوکی پسند نہ کرے۔ لیکن لوکی کھانے پر مجبور ہو۔ جو خوبصورت عورتوں پر افسانے لکھنا چاہے۔ لیکن بھیڑوں کے ذکر پر مجبور ہو جائے ...... کیا تم —— کیا تم —— کیا تم دیکھ نہیں سکتے اس وقت میرے سامنے کھانے کی میز پر کیا دھرا ہے؟"

"وہی کچھ ہے۔ جو میں کھا رہا ہوں۔" پرویز بڑے اطمینان سے بولا۔ "لوکی ہے! آخر لوکی میں ایسی کیا برائی ہے؟"

"مجھے اس کے پھیکے پن سے نفرت ہے پرویز! لوکی کھانے سے تو یہ کہیں بہتر ہے۔ کہ آدمی گھاس کھائے۔ دیکھو، اس لان کی ہری ہری گھاس کس قدر عمدہ ہے! میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک بکری ہوتا اور اس گھاس کو کھا جاتا۔ پھر ایک انسان ہوتا اور اس بکری کو کھا جاتا۔ پھر ایک کارخانہ ہوتا اور وہ مجھے کھا جاتا ...... پھر میری ہڈیاں قبر میں سڑتیں اور اُن کے جوڑ جوڑ سے وہی گھاس پھوٹ کر اُگتی اور میری ساری قبر پر ہری ہری گھاس کی صورت میں پھیل جاتی جہاں پھر کوئی بکری آ کر ...... ارے پرویز کتنا خوبصورت ابدی خیال ہے! آج کل مجھے اس قسم کے ابدی خیال بہت ستاتے ہیں۔ لوکی۔ گھاس۔ گوشت۔ بکری۔ کارخانہ۔ قبر۔ موت۔ شاید میں اسی بہانے اپنے ادب میں ابدیت اور ابدیت میں ادب ڈھونڈتا ہوں! عورت کیا ہے؟ مرد کیوں ہے؟ بکری کہاں ہے؟ دشتِ مجنوں کدھر ہے؟ شبِ فراق کیسے کٹی؟ میں بھوکا ہوں! ...... نہیں ...... نہیں ...... بھوک کی بات مت کرو۔ تیسرے درجے کا ادب مت پیدا کرو۔ تم انسان ہو۔ ارے بھوکا تو کتا بھی رہتا ہے۔ پھر انسان اور کتے میں کیا فرق ہوا؟ اس لیے بھوک کی بات مت کرو۔ افلاس کی بات مت کرو۔ غریبی کا ذکر مت کرو۔ یہ سب گندی اور رذیل باتیں ہیں۔ اس سے ڈرائنگ روم کی خوب صورت فضا پراگندہ ہوتی ہے۔ بات کرو شبِ فراق کی۔ رُخِ زیبا کی۔ اُن ظالم فراموش صفت آنکھوں کی۔ گیسوئے لیلائے شب کی، جو گیا ہے۔ مشکبارے، گیسوئے۔ آہوئے لیلائے عشق ...... ہائیں۔ کیا بکواس کرتے ہو۔ اتنی اضافتیں یکدم سے لگا دیں؟ جانتے نہیں ہو۔ اعلیٰ ادب میں صرف دو اضافتیں جائز ہیں۔ زندگی میں چاہے آٹھ بچے ہو جائیں۔ اور نو اضافتیں لگ جائیں۔ مگر اعلیٰ ادب میں دو اضافتیں جائز ہیں۔ اور صرف ایک موضوع۔ عورت! ...."

پرویز میری باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ جب میرے سامنے لوکی آ جاتی ہے۔ میں اسی طرح بہکتا ہوں جیسے لوگ شراب پی کر بہکتے ہیں۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کسی طرح آج تو یہ لوکی کھا لو۔ کل صوفی کی جگہ اُس کی چھوٹی بہن ثریا آ رہی ہے۔ اُس سے ہم نئے مینو کی سفارش کریں گے تمہارے لیے ......"

"اور صوفی کہاں جا رہی ہے ...... ؟" میں نے بدقت تمام لوکی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"صوفی اپنے وطن جا رہی ہے۔ ڈیڑھ ماہ کے لیے ......"

میں نے لوکی کھاتے ہوئے کہا "پرویز۔ اگر کل سے اس بورڈنگ ہاؤس میں مجھے لوکی ملی۔ تو میں یہ بورڈنگ ہاؤس ہی چھوڑ دوں گا۔ میں اپنی جان دے دوں گا۔ خودکشی کر لوں گا۔ مگر ......"

مگر دوسرے روز مجھ سے بورڈنگ ہاؤس چھوڑا نہ گیا۔ حالانکہ دوسرے روز صوفی کی جگہ ثریا آگئی تھی۔ اور ثریا نے بھی لوکی ہی تیار کی تھی۔ گو لوکی وہی تھی۔ مگر لڑکی وہی نہ تھی۔ ثریا بے حد خوبصورت تھی۔ اور جب وہ پلیٹ کی ٹرے اٹھا کر میرے سامنے رکھ رہی تھی۔ تو اُس کی شانوں تک ننگی بانہیں سیب کی سڈول ڈالیوں کی طرح جھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ثریا ایک ایسے ثمردار درخت کی طرح حسین تھی جس پر پہلی بار پھل آئے ہوں۔ میں تو بس اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پرویز نے انتہائی سنجیدہ ہو کر ثریا سے کہا:

"میرا دوست آج سے تمہارا بورڈنگ ہاؤس چھوڑ دے گا!"

"کیوں؟" ثریا نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو میری طرف گھمایا۔

"اسے لوکی پسند نہیں ہے!" پرویز شریر نگاہوں سے اسے تاکتے ہوئے بولا۔

"لوکی پسند نہیں ہے؟" ثریا نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اُسے میرے آدمی ہونے میں شبہ پیدا ہو چلا ہو۔ "لوکی تو میں اس قدر عمدہ پکاتی ہوں۔ اس قدر عمدہ کہ سب تعریف کرتے ہیں۔ آج کی لوکی تو میں نے ٹماٹر کے جوس میں دھیرے دھیرے مدھم مدھم آنچ پر پکائی ہے۔ کھا کر دیکھئے۔ بالکل گوشت کا سا مزا آئے گا۔ کیا واقعی آپ کو لوکی پسند نہیں ہے؟" ثریا نے میری طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ کہ میرا دل وہیں موم بتی کی طرح پگھلنے لگا......

"نہیں...... نہیں...... یہ بات نہیں ہے" میں نے مسکرا کر ثریا سے کہا "مجھے تو دراصل لوکی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ جتنی تمہاری ایسی خوبصورت عورت!"

ثریا ہنسی ... "اونہہ! بھلا عورت اور لوکی میں کیا مشابہت ہے۔ اب تم بہت دور کی بات کرنے لگے ہو مسٹر!"

"گدھا ہے یہ!" پرویز ثریا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے میرا مذاق اڑانے لگا۔

"نہیں ثریا عورت اور لوکی دونوں میں غضب کی مشابہت ہوتی ہے۔ عورت کی طرح لوکی کا سر بھی چھوٹا ہوتا ہے اور دھڑ موٹا ہوتا ہے۔ عورت کی طرح لوکی کی جلد بھی بے حد ملائم اور چکنی ہوتی ہے۔ خوبصورت عورت کی طرح اچھی لوکی کا رنگ بھی زیتونی ہوتا ہے۔ اور جب ہوا کے جھونکے سے ہری ہری بیل پر لوکیاں جھومتی ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شوخ و شنگ لڑکیاں چہل قدمی کرنے کے لیے کہیں جا رہی ہوں!"

ثریا نے خوشی سے تالی بجائی اور میرے قریب میز پر بیٹھ گئی۔ پرویز کا رنگ اُڑ گیا......

میں نے کہا "اچھی لوکی اچھی عورت کی طرح دل کی بڑی نرم ہوتی ہے۔ حسین عورت اور حسین لوکی دونوں کو عمرِ طبعی تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ پہلے ہی سے توڑ لیا جاتا ہے۔ لوکی کوئی کدو اور ٹماٹر کی طرح نہیں ہے کہ جب تک پختہ عمر کو نہ پہنچ جائے بے کار ہے۔ لوکی تو جتنی کم عمر کی ہوگی۔ اتنی مزے کی ہوگی۔ بھلا بڈھی لوکی بھی کسی نے کھائی ہے؟ بڈھی لوکی کی رنگت پیلی پڑ جاتی ہے۔ اس کی کھال سخت اور جھری دار ہو جاتی ہے۔ اندر سے گودا سڑ جاتا ہے۔ بیج کھاری کی بلغم کی طرح اندر ہی اندر کھنکنے لگتے ہیں۔ اُس عمر میں لوگ لوکی کے بیج نکال کر اُس کا جھانواں بناتے ہیں اور اس سے گندے برتن صاف کرواتے ہیں...... بڈھی عورتوں کی طرح......

لیکن جوان لوکی کی گردن ہائے ثریا۔ بالکل تمہاری گردن کی طرح صراحی دار ہوتی ہے اور ... اُس میں ایسی ہلکی ہلکی سی مہک آتی ہے...... جیسے جوانی میں خوبصورت عورت کے بدن سے آتی ہے...... ذرا میرے قریب آؤ......"

"بس...... بس......" ثریا ہنستے ہنستے شرما گئی اور فوراً وہاں سے بھاگ گئی۔

مگر اس دن کے بعد سے ڈیڑھ ماہ تک ثریا نے مجھے لوکی نہیں کھلائی۔ عورت اپنے مقابلے میں کسی دوسرے کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ لوکی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔ میں لوکی کھانے سے بچ گیا۔ آدمی ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے۔ یا عشق کرے یا لوکی کھائے......!!

ڈیڑھ ماہ کے عرصے کے بعد جب سوفی واپس آئی۔ تو میری شادی ثریا سے ہو چکی تھی۔ مگر ہنی مون کے بعد پھر سے ہمارے گھر میں لوکی کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ دو چار روز تو میں نے صبر کیا۔ آخر ایک دن میں نے جھلا کر کہا، "یہ کیا مذاق ہے؟ ہر روز وہی لوکی؟ لوکی؟ کیا لوکی کے سوا اور کوئی سبزی نہیں ہے اس دنیا میں!"

میری آواز سن کر سوفی اور ثریا دونوں کچن سے باہر دوڑیں۔ ایک کے ہاتھ میں چمٹا تھا۔ دوسری کے ہاتھ میں بیلن تھا۔ دونوں نے یکدم غضب ناک ہو کر کہا۔

"کیا ہے! کیوں شور مچا رہے ہو؟"

میں دونوں بہنوں کو دیکھ کر سہم گیا۔

آخر میں نے آہستہ سے اپنی نظریں جھکائیں اور دھیرے سے مسکین لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ اس پلیٹ میں تھوڑی سی لوکی رکھ دو!"

ہینڈ پمپ

خدیجہ مستور

شام ڈھلنے کے قریب تھی۔ ہینڈ پمپ کے قریب منڈیر بنا کر فرش کیا جا رہا تھا۔ سیمنٹ پر ایک دو کرنیاں پھیرنے کی کسر رہ گئی تھی۔ احاطے کی ساری عورتیں کام کاج چھوڑے ٹکٹکی لگائے کھڑی تھیں۔ لونڈے جھک جھک کر ہینڈ پمپ کی ہتھی پکڑنا چاہتے تو چھنی بیگم ہیں ہیں کر کے روک دیتیں۔

"خبردار جو! ابھی ہاتھ لگایا! ابھی کچا ہے، اکھڑ جائے گا، ہاں!"

لونڈے اپنے ہاتھوں کی کھجل مل مل کر رہ جاتے۔

"ارے مائی کوئی بانس ہے جو اکھڑ جائے گا، ہینڈ پمپ ہے ہینڈ پمپ۔" مستری نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"تم اپنا کام کرو جی، منڈیر کچی ہے کہ نہیں؟ پاؤں دھرنے سے اکھڑے گی کہ نہیں؟" چھنی بیگم نے مستری کو قائل کر دیا اور ساتھ ہی اپنے بے قابو بچوں کو روکنے کے لیے چیخنے لگیں۔

"ارے کمبختو! ذرا دیر الگ رہو۔ ایک تو بیچاری نے پانی کا آرام دیا ہے اوپر سے نقصان بھی چاہتے ہو۔ موت آئے، ہاتھ توڑ دوں گی کم بختوں کے۔"

لڑکوں سے نمٹ کر عورتیں چھنی بیگم کی شان میں قصیدے پڑھنے لگیں۔

"چھنی بیگم تو سچ مچ فرشتہ ہیں۔"

"دیکھ لینا، یہ مریں گی تو شہید ہوں گی۔" ایک عورت نے چپکے سے کہا اور مارے خلوص کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اصیل خاندان کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں ورنہ کون اپنی محنت کا پیسہ دوسروں کے آرام پر خرچ کرتا ہے۔"

"احاطے کا مالک تو ایسا کنجوس ہے کہ ایک ہینڈ پمپ لگوا کر نہ دیا۔ کہہ کہہ کر زبان تھک گئی۔ ہمیشہ یہی ٹکا سا جواب دیا کہ سارے لوگ چندہ کر کے لگوا لو۔"

"میں نے کہا ـــــ" ایک عورت کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ مستری اپنا تہبند جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

چھنی بیگم نے جھک جھک کر مستری کے کام کو دیکھا اور پھر ٹینٹے میں کھسے ہوئے بٹوے کو نکال کر دام گننے لگیں۔

"لو میاں یہ چار روپے گن لو۔" چھنی بیگم نے انتہائی سخیوں والے انداز سے روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

"پانچ روپے سے ایک پیسہ کم ہوگا" منی نے چار دس روپے چنی بیگم کی مٹھی میں ٹھونس دیے۔

بڑی دیر تک روپوں کی چھینا جھپٹی ہوتی رہی۔ احاطے کی ساری عورتیں چنی بیگم کی حمایت میں منی کو جلی کٹی سنا رہی تھیں۔

"تو چنی ہم ہینڈ پمپ کے پیسے دے رہے ہیں، ہمیں ایک پیسہ نہیں چاہیے" منی عورتوں سے ہار مانتے ہوئے بڑی بے دردی سے ہینڈ پمپ کی طرف بڑھا۔ روپے کچھ منڈیر پر اس طرح پھینکے کہ نشان پڑ گئے۔

"ارے ظالم! لے اپنا روپیہ" چنی بیگم نے بوکھلا کر جیب سے آخری روپیہ بھی نکال دیا اور پھر بٹوا جھاڑ کر ٹینٹے میں اڑس لیا۔

منی کے جاتے ہی چنی بیگم جھٹ سے ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھ گئیں۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔

"چنی بیگم کی تو نے ہی عزت رکھی ہے، کسی کی محتاج نہ ہوئی۔ قربان جاؤں تیری ذات کے۔"

چنی بیگم نے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر آنسو پونچھ لیے۔ اس وقت پرندے بسیرے کی تلاش میں سرپٹ اڑے چلے جا رہے تھے۔

"چنی بیگم اللہ تم کو جنت میں جگہ دے گا۔ کیسے تیری میری کوٹھیوں کے چکر کاٹتے پھرو ہو، انسانوں کے دھکے کھاتے جب کہیں ایک گھونٹ پانی نصیب ہوتا۔ اتنی اتنی دور سے پانی لانے میں سانس ٹوٹ جاتے۔"

عورتیں پھر قصیدے شروع کر رہی تھیں مگر گہری ہوتی رات نے انھیں خاموش کر دیا۔ وہ سب تو ہنڈیا چولھے کی فکر میں بھاگیں مگر بچے اسی طرح منڈلاتے رہے۔

چنی بیگم نے بچوں کو ڈرانے کے لیے ایک پتلی سی چھڑی اٹھا لی اور ہینڈ پمپ کے پاس کھاٹ ڈال کر بیٹھ گئیں۔ لڑکے تو ویسے بھی کسی کا رعب نہ مانتے، اس کمزور سی چھڑی سے کیا ڈرتے۔ پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ اس وقت وہ اس عجیب و غریب چیز میں ہاتھ نہ لگا رہے تھے۔ یوں ہی ہینڈ پمپ کے پاس کھڑے آپس میں دھکم پیل کرتے رہے۔ چنی بیگم برابر چھڑی ہلاتی رہیں مگر لڑکے بھی اسی وقت سرکے جب بھوک بری طرح ستانے لگی۔

چنی بیگم نے ساری رات آنکھوں میں گزار دی۔ خوشی اور خطرے دونوں ہی نے نیند ہتھیا لی تھی۔ کتا بھی پاس سے گزرتا تو اچھل کر چھڑی والا ہاتھ اونچا کر دیتیں۔ کتے پر بھی شریر لڑکے کا شبہ ہوتا۔ "ارے ہاں کہیں چپکے سے نہانے نہ آ گیا ہو۔ جب تو راس جائے کم بخت کا۔ کہیں منڈیر پر چڑھ کر پیشاب نہ کر دے۔"

چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ کتے کو احاطے سے باہر نکال آئیں مگر ذرا ہی دیر بعد ایک چھوڑ کئی کئی کتے گشت کرنے آ جاتے اس پر غضب یہ کہ ادھر چاند ابھرا اور ان کم بختوں نے منہ اٹھا اٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ چنی بیگم یہ سوچ کر تڑپ اٹھیں کہ ابھی نیا نیا ہینڈ پمپ لگا ہے اور یہ کتے رو رو کر نحوست پھیلا رہے ہیں۔

وہ بڑے جوش سے اٹھیں اور کتوں کی اس قسط کو بھی احاطے سے باہر نکال آئیں۔ تھوڑی دیر تک تو وہ کتوں کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں پھر مطمئن ہو کر اپنی دانائی پر عش عش کرنے لگیں۔

"تو بھلا یہ روپے بھی بیٹھے بیٹھے کھا جاتے تو پھر کیا ہوتا، اس کمبخت نے تو کہیں کا نہیں رکھا۔ کچھ دن بعد لوگ اپاہج سمجھ کر ٹکڑا روٹی ڈالنے لگتے، اب عزت تو رہ گئی، کوئی محتاج تو نہ کہے گا" ——— انھوں نے بڑے فخر سے آسمان کی طرف دیکھا ——— "صدقے جاؤں تیرے مولا، چنی بیگم نے ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی کھائی ہے ——"

چنی بیگم نے تو اس وقت سے اپنی محنت سے پیٹ بھرا سیکھا تھا جب وہ دس گیارہ سال کی تھیں۔ بیوہ اماں حویلی میں کھانا پکاتیں تو چنی بیگم چھوٹے چھوٹے برتن مانجھ دھو کر رکھ دیتیں۔ ان کی اماں کو چنی بیگم سے عشق تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہتیں کہ اگر چنی بیگم نہ ہوتی تو وہ اس بڑھاپے اور گٹھیا کے درد میں ابھو کی مر جاتیں۔

چنی بیگم یوں تو محنت کرتے کرتے ایک دن جوان ہو پڑیں۔ پتہ چلا کر سہلانے خواب دیکھنے کا زمانہ دل کے آس پاس دھڑک رہا ہے۔ انہی دنوں حویلی میں بٹیا بیگم کی شادی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ چائے لے کر کمرے میں گئیں تو بٹیا بیگم اپنے میاں کے زانو پر سر رکھے ٹھنک رہی تھیں۔ چنی بیگم تو دیکھ کر ابھی تک سے مس نہ ہوتیں۔ اس دن چنی بیگم کا جی چاہا کہ وہ کسی کا سہارا لے کر پڑ رہیں، کبھی ٹھنک گئی تھیں۔

ان کی اماں نے گنگھیوں سے دیکھ کر تاڑ لیا کہ چنی بیگم کا جی کام کاج سے اچاٹ ہو رہا ہے۔ انھوں نے دو چار دن دوڑ بھاگ کی اور جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔

سسرال جا کر چنی بیگم کا دل ٹوٹ گیا۔ زانو پر سر رکھنے کی تمنا ایک طرف رہی وہاں تو انھیں پھر تکیہ بھی نہ ملا۔ میاں چنڈو کا شیدائی ملا۔ سارا دن اونگھنا اور پھر اپنی اماں کے پلو کی اوٹ میں چھپ کر مفت کی روٹیاں توڑنا۔

میاں کے لچھن کے طعنے چنی بیگم کو برداشت کرنے پڑتے۔ وہ سارا دن محنت کرتیں، سب کی خدمت ہوتی، پھر بھی جب دو نوالے اٹھانے بیٹھتیں تو ساس نندوں کا کلیجہ جل جاتا۔

"ایسے بڑے بڑے نوالے نگل رہی ہے جیسے اپنے خصم کی کمائی ہو۔"

چنی بیگم سب کچھ سنتیں اور گھٹنوں میں سر دیے کھانا زہر مار کرتی رہتیں۔ چالیس سال کے مرد کی نامردی بار چنی بیگم کے سر تھوپ دی گئیں۔ ان پر کسی کو رحم نہ آیا۔

اماں باوا نے تو کس لاڈ سے چنی بیگم نام رکھا تھا مگر سسرال میں ساس نندوں اور جیٹھانی نے چلبلا... دیا۔ جیٹھانی اپنے بیس سال کے ہیٹے کٹے لونڈے کو گود میں لیے دودھ چٹاتی رہتی۔ پیاس لگتی تو چنی بیگم پر حکم چلاتی۔ کماؤ میاں کی بیوی تھی اس لیے ساس نندوں کی منہ چڑھی تھی۔ چنی بیگم نے کیسا کیسا چاہا کہ ان کا میاں نشہ کرنا چھوڑ دے، اپنے بڑے بھائی کی طرح کام سے لگ جائے مگر میاں ایسی باتیں سنتا تو پنہائی بیزاری سے اونگھنے لگتا۔

چنی بیگم نے ایک بار بہت واسطے دیے تو اس نے دو وقت چنڈو کا ناغہ کر دیا مگر حالت یہ رہی کہ آنکھیں بند کیے غرقِ جاناں میں پڑا رہا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ساس نے جو اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو چنی بیگم کے پیچھے پڑ گئیں۔

"اری منحوس میرے لال کو کھا لے گی، یہ اسے جیتا نہ چھوڑے گی۔" اماں نے کمربند سے چونی کھول کر اپنے لال کو پکڑا دی اور دھکے دے کر باہر بھیج دیا کہ کچھ کھا پی آئے۔

اس دن چنی بیگم آپے سے باہر ہو گئیں۔ ایسی ایسی سنائیں کہ لوگوں نے کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ وہ فریاد کی کہ سننے والوں کے دل دہل گئے۔

ساس نندوں نے جب دیکھا کہ چنی بیگم تو ہاتھوں سے نکل گئیں تو اسی وقت انھیں چوٹی سے پکڑ کر گلی میں پھینک دیا۔ چنی بیگم زبردستی پھر سے گھر میں جا گھسیں اور گھٹنے گھٹنے کوستے دیتی اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچیا اٹھا باہر آ گئیں۔ جب وہ روتی پیٹتی چلیں تو قدم

خود بخود اسی حویلی کی طرف اٹھنے لگے جہاں آٹھ سال تک ان کی اماں کھانا پکاتی رہی تھیں۔

زار و قطار روتی دھونی چنی بیگم حویلی کی دہلیز پر جا بیٹھیں۔ بڑی بیگم نے جو انھیں اس حال میں دیکھا تو مارے وضعداری کے تخت سے اتر کر خود ہی دوڑیں۔

"ہے ہے یہ تو اپنی نصیراں کی بوندیا ہے۔ آخر ہوا کیا؟" بڑی بیگم نے بلک کر پوچھا اور چنی بیگم نے شروع سے آخر تک سارا حال کہہ سنایا۔

بس اسی وقت سے چنی بیگم نے اپنی ماں کی جگہ سنبھال لی۔ باورچی خانے کی الماری میں اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا وغیرہ رکھ کر کام میں جٹ گئیں۔

رات کھانا پکا کر جب چنی بیگم صحن میں آ کر بیٹھیں تو ٹھنڈی ہوا اور کھلی ہوئی چاندنی میں میاں یاد آ گیا۔ ادھر پیٹ میں بھی کوئی ننھی جان کچھ کھدبد سی معلوم ہوئی۔

"اے پلنگ ڈال کر لیٹ رہو چنی بیگم، بھوک لگی ہو تو پہلے ہی کھا لو۔ اس حالت میں بھوک بہت لگتی ہے۔" خاندانی بیگم نے جب پیار سے دو بول کہے تو چنی بیگم خوشی سے نڈھال ہو گئیں۔ انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ محنت کر کے پیٹ بھرنے میں کیسا سکھ نصیب ہوتا ہے۔ میاں کی یاد کو انھوں نے کتے کی طرح دھتکارنے کی کوشش کی۔

"ارے اس رشتے کا کیا، بس منہ دیکھے کی محبت ہوتی ہے۔"

چنی بیگم نے حویلی میں دس سال گزار دیے۔ لڑکا پورے دس سال کا ہو گیا۔ بیگم نے مارے باندھے دس پارے بھی پڑھا دیے۔ چنی بیگم کی اماں کب کی مر گئیں۔ میاں نے دوسری شادی کر لی تھی، ساس کے مرنے کی خبر بھی مل گئی تھی۔ ایک بار میاں کو سڑک پر بھی دیکھا تھا۔ جو سنے جانے کہیں چلے جا رہے تھے۔ چنی بیگم قریب ہی کی دکان پر کھڑی ترکاریاں خرید رہی تھیں۔ کلیجے میں ہوک اٹھی مگر جلد ہی قابو پا لیا۔ پھر بھی گھر آئیں تو لڑکے کو سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہیں۔ بیگم صاحبہ نے بڑی مشکل سے تسلی دے کر چپ کرایا۔

زمانہ کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کے دانت ٹوٹنے لگے۔ چنی بیگم کا لڑکا جوان ہو گیا تھا۔ بڑے سرکار نے اسے اپنی دکان پر نوکر رکھ لیا تھا۔ بیگم صاحب نے ایک اچھے ناک نقشے کی یتیم لڑکی تلاش کر کے لڑکے کا نکاح بھی کرا دیا تھا اور چنی بیگم کا صاف ستھرا چہرہ باورچی خانے کی دھنوائی ہوئی دیواروں کا ایک ٹکڑا معلوم ہونے لگا تھا۔

بہو کے آتے ہی جانے کیوں چنی بیگم کا دل اچاٹ ہو گیا۔ بہو سے کلیوں نفرت ہو گئی۔ بیگم صاحبہ کو جو کام ہوتا بہو کو آواز دیتیں ادھر بہو تھی کہ گھونگھٹ الٹ کر ساس کے کاموں پر پل پڑتی۔ چنی کو نفرت بس اسی وجہ سے تھی، بہو ان کا حق چھین رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اسے شہ دے رہی تھیں۔

چنی بیگم کو ہر وقت یہ خیال ستاتا کہ بہو ذرا ہاتھ بٹا لیتی ہے تو یہی سمجھے گی کہ اپنی محنت کی کمائی کھلا رہی ہے۔

شروع شروع میں تو وہ اسے صرف جھڑکتی رہیں، پھر زبان گالیوں پر کھل گئی۔ بہو کٹورا سی آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھتی اور کونوں میں منہ چھپا چھپا کر روتی ادھر بیگم صاحبہ کا یہ حال کہ ساری توجہ کا مرکز جوان جہان بہو تھی۔ بس منٹوں میں بیگم صاحبہ کے سارے کام کر ڈالتی۔ بیگم صاحبہ کو تو جیسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ گھر میں چنی بیگم بھی ہیں۔ کبھی بھولے سے چنی بیگم کو آواز دے لی تو جلدی سے کہتیں کہ تم نہیں بہو کو بھیجو۔ چنی بیگم انگاروں پر لوٹنے لگتیں۔

انھی دنوں انھوں نے سُنا کہ میاں مر گئے۔ چنی بیگم نے اپنے ہاتھوں میں پڑی ہوئی دونوں موٹی موٹی چوڑیوں کو بٹے سے توڑ دیا۔ اس دن انھوں نے کوئی کام نہ کیا۔ سارا دن کوٹھڑی میں پڑی رہیں۔ جانے کون کون سی حسرت ناک باتیں یاد آتی رہیں۔

بہو کھانا لے کر آئی تو اپنی مصیبتوں کی ساری بھڑاس بہو پر برسا دی۔ اتنی گالیاں دیں کہ بہو کو بیگم صاحب کے پاس بھاگتے بن پڑی۔

بیگم صاحب نے سمجھ لیا کہ چنی بیگم کا دماغ چل گیا ہے۔ انھوں نے بڑے ارمان سے سمجھا بجھا کر صلاح دی کہ اب چنی بیگم اللہ اللہ کریں اور بہو کو خدمت کرنے دیں۔

چنی بیگم کے دل کو دھکا سا لگا مگر انھوں نے سوچا کہ چلو اچھا ہوا جو بات صاف ہو گئی۔

”اللہ کسی کا محتاج نہ کرے بیگم صاحب —“ چنی بیگم نے بھی دو ٹوک بات شروع کر دی — ”کھائیں گے تو اپنی محنت کا ورنہ بھوکے بھلے۔ میں آپ کے کام کی نہیں رہی تو بیشک بہو سے خدمت لیں میں کہیں اور کما کھاؤں گی۔ ابھی تو ہڈیوں میں اتنی طاقت ہے کہ پیس کر کھلا کر کھاؤں۔ لیجئے اب اجازت دیجئے چنی بیگم آپ کو یاد رکھے گی۔“

چنی بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بیگم صاحب ہائیں ہائیں کرتی رہیں مگر وہ اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچہ بغل میں داب باہر نکل کھڑی ہوئیں۔

بہو ننگے پاؤں گلی تک بھاگی۔ بیٹا اسٹیشن تک ساتھ ساتھ گیا مگر چنی بیگم کا دل نہ پسیجا۔ انھیں تو اس شہر تک سے نفرت ہو گئی تھی۔ لاہور جانے والی گاڑی تیار تھی وہ ٹکٹ لے کر بیٹھ گئیں۔

لڑکا برابر منتیں کرتا رہا۔ واسطے دیتا رہا مگر چنی بیگم نے ایک نہ سنی۔ نیفے میں کھسے ہوئے بٹوے کو نکال کر دس کا ایک نوٹ لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”ارے چل۔ بڑا آیا میری فکر کرنے والا۔ بیگم کے کام کی نہیں رہی چار دن میں تیری عورت محتاجی کے طعنے دے دے کر جوتیاں لگانے لگی۔ ان روپوں سے کپڑے بنوا لیجیو۔ لتّے لٹکائے پھر رہا ہے۔ بھلا تیری کمائی میں ایسی برکت کہاں جو تن بھی ڈھانک سکے۔“ لڑکے کے صاف ستھرے ثابت کپڑے انھیں لتّے معلوم ہو رہے تھے مگر لڑکا تو جیسے کچھ دیکھنے اور سوچنے کے موڈ ہی میں نہ تھا۔ بس چنی بیگم کو گاڑی سے اتارنے کی دھن سوار تھی۔

گاڑی چلی تب بھی لڑکا ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ ایک ذرا دیر کے لیے چنی بیگم کو ایسا محسوس ہوا کہ گاڑی کے سارے پہیے ان کے کلیجے پر سے گزر گئے ہیں۔

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ گئی تو لڑکا وہیں سرے پر کھڑا پسینہ پونچھتا رہا۔ چنی بیگم کھڑکی سے سر نکالے اسے دیکھتی رہیں۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے مگر وہ اسی طرح پلیٹ فارم کے سرے کو تکتی رہیں۔

لاہور آ کر کئی دن تک شہر کے اندرونی حصّے میں دھکے کھاتی پھریں۔ گھر گھر جھانکتیں مگر کوئی نوکری کی بات نہ کرتا۔ جس گھر میں جائیں وہاں بیویاں کاموں میں جُٹی نظر آتیں۔ چنی بیگم کا جی جل کر خاک ہو جاتا۔ لو بھلا جب بیبیاں نوکروں کے کام کرنے لگیں تو پھر اس دنیا میں کیا رہ گیا۔ فقیرنیوں جیسے مزاج ہیں یہاں کی بیگموں کے۔ اپنی دلّی کی کیا بات ہے۔

چنی بیگم کئی دن تک اپنی دلّی کی یاد میں پھڑکتی رہیں اور پھر گھومتی گھامتی شہر کے اس حصّے میں آ گئیں جہاں ہر طرف سکون

اور تمام مرغی کا ڈربہ پڑا ہوا تھا۔ کوٹھیوں کے پھاٹک کھلے ہوئے تھے اور کہیں کہیں آیائیں بچوں کو لیے ٹہل رہی تھیں چنی بیگم نے آخر بڑی احتیاط کے ساتھ ایک کوٹھی کے پھاٹک میں قدم رکھ ہی دیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے آیا سے گاڑھی چھاننے لگیں۔ ذرا ہی دیر میں انھیں سب حال چال معلوم ہو گیا "تنخواہیں اچھی ہیں، کام زیادہ نہیں، بالائی آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔ خانساماں سے دوستی گانٹھ لو تو اپنے گھر جیسا کھانے پینے کا مزا آجاتا ہے۔"

چنی بیگم ان باتوں کو سن کر دل ہی دل میں گناہوں کی معافی مانگتی رہیں مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ کسی سے جان پہچان کے بغیر نوکری ملنی بھی تو مشکل تھی۔ آیا نے ان سے وعدہ کر لیا کہ جلد ہی اچھی سی کوٹھی دلا دے گی مگر یہ وعدہ کرتے ہوئے گود میں ننھے سے بچے کو ایک زور کا ٹہوکا لگا بیٹھی۔ بچے نے خواہ مخواہ رونا شروع کر دیا تھا۔

چنی بیگم نے آیا کی گود سے بچے کو چھین لیا۔

"اری آیا ہو کر بیگموں کے بچے پر ہاتھ اٹھاتی ہے، نمک کھا کر یہ نمک حرامی؟"

چنی بیگم بچے کو چپ کراتے کوٹھی کے اندر داخل ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی آرائش میں مصروف تھیں۔ چنی بیگم نے بچے کو ان کی گود میں بٹھا دیا۔

"ایسے زور سے ٹہوکا مارا ہے کہ اب تک کلیجہ کانپ رہا ہے میرا۔ کیا اس بانجھ کے آگے اولاد نہیں ہے؟" چنی بیگم غصے سے بھری ہوئی تھیں۔ بیگم نے انھیں اچھی طرح بٹھا کر حال پوچھا اور جب آیا آئی تو اسی وقت جواب دے کر چنی بیگم کو رکھ لیا۔ چنی بیگم نے لاکھ کہا کہ یہ نوکری نہ کروں گی، کسی کی روزی پر ڈاکہ نہیں ڈالنا ہے مگر بیگم نے ایک نہ سُنی۔

چند ہی دن میں چنی بیگم گھر کی مالکن بن گئیں۔ بیگم صاحبہ ہر بات میں ان سے مشورہ کرتیں۔ بچے اس طرح ہل گئے کہ ایک منٹ کو جان نہ چھوڑتے۔ باورچی خانے کی خبر لیے رہتیں۔ ہر ہفتے نیا خانساماں رکھا جاتا۔ چوری اور بے ایمانی سے چنی بیگم کو دلی بغض تھا۔ جب انسان اپنی محنت سے کما سکتا ہے تو پھر چوری کیوں کرے۔

"بے ایمان آدمی کا مرتے وقت سؤر جیسا منہ ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ بات بڑی بڑی کتابوں میں لکھی ہے۔" یہ چنی بیگم کے زریں اقوال تھے جو ہمیشہ بڑی بڑی کتابوں میں لکھے ہوتے۔

چنی بیگم مہینے کے مہینے اپنے بیٹے کو پانچ روپے کا منی آرڈر کراتیں اور ہر خط میں لکھاتیں کہ کلموہے ٹلتے لگا کر نہ پھر، پرائی کمائی میں ایسی کہاں کی برکت، جتنے کی ضرورت ہو لکھ بھیجیو۔ جواب میں لڑکا ایک ہی رٹ لگائے رکھتا کہ بس تم تو واپس آجاؤ، میں خدمت کروں گا۔

چنی بیگم خط پڑھوا کر ہنستیں۔

"کبھی کچھ بھیج نہ دیا یوں ہی، محتاج بنا کر ایک کونے میں ڈالنے کو بلا رہا ہے، وحشت نیرے کی سسرے۔"

چنی بیگم یہاں بہت خوش تھیں۔ گھر سنبھالنے میں انھیں ذرا بھی دقت نہ ہوتی۔ ہاں شروع شروع میں کوٹھی کے لان کی حفاظت میں بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔ بات یہ تھی کہ اس جگہ کارپوریشن کے نل نہ لگے تھے۔ کوٹھیوں میں یا تو ہینڈ پمپ لگے تھے یا پھر ٹیوب ویل سے پانی کا انتظام تھا۔ کم بخت اِدھر اُدھر کے لوگ سنسان دوپہروں میں لان میں لگے ہوئے ہینڈ پمپوں سے پانی بھر لے جایا کرتے۔ چنی بیگم پھاٹک بند کر لیتیں تو لوگ باہر کھڑے کھٹکھٹایا کرتے۔ دو ایک بار تو پانی لے جانے والوں سے کشتی تک کی نوبت آگئی تھی۔

"تو بھلا کرتی سبیل لگی ہے، بیگم کی اجازت نہیں، کسی نے ہاتھ لگایا تو خیر نہیں۔"

وہ لوگ جو بغیر کسی مزاحمت کے پانی بھرلے جایا کرتے تھے اب انھیں دور دور جانا پڑتا۔ چھنی بیگم کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی انھیں، ادھر سے گزرتے ہوئے چھنی بیگم کو گھنی گھنی گالیاں دیتے۔

"ہونھ!" چھنی بیگم منہ پھیر لیتیں۔ "اپنی ماں بہنوں کو یاد کر رہے ہیں، ہمیں کیا؟"

بیگم صاحبہ ان سے اس قدر خوش رہتیں کہ بس حد تھی، ان کی ایمانداری کی داد دیتے نہ تھکتیں۔ چھنی بیگم کے آنے سے پہلے تو یہ حال تھا کہ ادھر دوپہر ہوئی اور لوگوں نے آکر پانی بھرنا شروع کیا۔ نوکر ان سے دو چار آنے لے کر مزے سے تماشہ دیکھتے۔ بچے لان سے سارے پھول توڑ لے جاتے، پودوں کو روند ڈالتے۔ بیگم صاحبہ تا کو لان میں آتیں تو چیخ چیخ کر برا حال کر لیتیں۔ نوکر گونگے بن کر بیٹھ جاتے۔

کچھ دنوں سے چھنی بیگم پیروں کی ہڈیوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہی تھیں۔ کام کرنے کو جی نہ چاہتا۔ گھڑی بھر کپڑے دھونے بیٹھتیں ذرا گھٹنے جواب دے جاتے۔ بچے کو گود میں لے کر کھڑی ہوتیں تو بس یہی جی چاہتا کہ بیٹھ جاؤں مگر وہ ٹہلے جاتیں۔ ہر کام اسی تندہی سے کرتیں۔ بغیر کام کیے تنخواہ لینا تو انھیں سؤر کھانے کے برابر معلوم ہوتا۔

درد جب ذرا زیادہ بڑھتا تو مارے دکھ کے سہم اٹھتیں۔

"ارے کتنے فرماں کی گور سے اٹھ کر کہاں آ گیا! ناس جائے تیرا۔"

کوس کوس کر تھک گئیں مگر درد کا ناس نہ گیا۔ ہاں درد نے گھٹنوں کا ناس مار دیا۔ کام یوں ہی پڑا رہتا مگر چھنی بیگم سے کچھ نہ ہوتا۔ بچے ان کی گود میں چڑھنے کو بلکتے مگر ان سے اٹھائے نہ جاتے۔ بیگم صاحبہ نے یہ حال دیکھا تو ان کا کلیجہ بھی پھٹ گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب کاہلی سوار ہو رہی ہے۔ حرام کی روٹیاں کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ انھوں نے کچھ کہا تو نہیں مگر چھنی بیگم سے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی۔ بے اعتنائی کے بعد بھی جب چھنی بیگم کام سے جی چراتی رہیں تو بیگم صاحبہ کو بولنا ہی پڑا۔

"میں تو پہلے سے سوچ رہی تھی کہ اب کام چھوڑ دوں۔ بیگم صاحب یہ گھٹنوں کا درد ایسا آن لگا ہے کہ کچھ نہیں کر پاتی۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ چھنی بیگم مفت کا کھا کر خوش ہوتی ہے۔ اس نے تو ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی کھائی ہے۔" چھنی بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اب تک بچوں کی محبت نے روک کے رکھا تھا۔ لیکن اب رخصت کی اجازت دیجئے۔ آپ دوسری عورت کا انتظام کر دیجئے گا۔"

بیگم صاحبہ ہائیں ہائیں کرتی رہیں۔ ایسی نوکرانی کا تو علاج کرانے کو بھی تیار تھیں مگر چھنی بیگم نے ایک نہ سنی۔ دوسری عورت کا انتظام کر دیا۔ خود ہی گھر دکھایا، کام سمجھایا۔ ڈانٹ ڈانٹ کر ہدایتیں دیں۔

"خبردار جو مسٹنڈے پانی بھرنے آئے، خیال رکھیو۔ میرے ہوتے یہ باغیچہ پھولوں سے لدا ہے۔ میرے راج میں کسی نے ایک کٹورا پانی نہیں کھینچا۔"

چھنی بیگم اپنے جہیز کا لوٹا کٹورا اور صندوقچیا اٹھا آنسو پونچھتی گھر سے باہر نکل گئیں۔

ذرا دیر تک تو ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔ پھر اٹھ کر احاطے کے مالک کی کوٹھی پر چلی گئیں۔ مالک سے بات کر کے دو روپے پیشگی کرایہ کے ٹکائے اور کوٹھڑی کا تالا کھول کر سامان رکھ دیا۔ دو ڈھائی سو روپے ان کے پاس تھے۔ وہ برابر سوچ رہی تھیں کہ کسی سیانے سے علاج کرا کے مہینہ پندرہ دن میں ٹھیک ہو جائیں گی۔

احاطے والے تو وہی جانے پہچانے لوگ تھے جو بیگم صاحبہ کی کوٹھی پر پانی بھرنے آتے۔ چنی بیگم کو دیکھ کر سب نے منہ پھیر لیا۔ چنی بیگم آپ ہی سب کی خیریت پوچھتیں، پھر آپ تو سب کے دل صاف ہو گئے۔ "ان بیچاری کا کیا قصور تھا، یہ تو نوکر تھیں۔"

چنی بیگم نے احاطے کے ایک حکیم کا علاج شروع کر دیا۔ بیس پچیس روپے خرچ ہو گئے مگر فائدہ خاک نہ ہوا۔ شہر میں جا کر کسی اچھے سے ڈاکٹر کا علاج کرنے کے پیسے نہ تو، دریہ تھا نہ کوئی سہارا۔ ادھر کم بخت مرض چنی بیگم کو بیمار کھانے پر تلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا کہ لونڈے کو خط لکھ کر بلا لیں پھر فوراً اس خیال کو دھتکار دیتیں۔ بہو کم بخت جوتیاں لگائے گی، محتاجی کی زندگی سے خدا بچائے۔

زیادہ اداس ہوتیں تو کوٹھڑی سے نکل کر گھنے درخت کی چھاؤں تلے آ پڑتیں۔ احاطے کی عورتیں جمع ہو جاتیں اور ان کے دانشمندانہ اقوال پر سر ہلاتی رہتیں۔ چنی بیگم کو دنیا بھر کے معاملات میں دخل تھا۔

دن گزرتے گئے مگر چنی بیگم کے مرض میں افاقہ نہ ہوا۔ ان کے گھٹنے سوج گئے تھے۔ اب تو ان سے اپنی روٹی بھی نہ پکائی جاتی۔ احاطے کی بیوہ شبراتن سے بڑا یارانہ تھا۔ شبراتن کو چار چھ آنے مہینہ دے کر اپنی روٹی پکوا لیتیں۔ وہی چنی بیگم کے لیے ایک بالٹی پانی لا دیتی جس میں کئی کئی دن گزارہ کرتیں۔

بیکاری نے جمع جتھا بھی لگا دی تھی مگر چنی بیگم کو امید تھی کہ وہ اچھی ہو کر اس سے زیادہ کما لیں گی۔ وہ ضرور اچھی ہوں گی۔ آرام کرنے کی خاطر سارا سارا دن دھوپ میں پڑی سوجے ہوئے گھٹنے سینکتی رہتیں۔ مرض کو دور کرنے کے لیے ساری دعائیں پڑھتی رہتیں۔

انہی دنوں انھوں نے سنا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ مسلمان پاکستان آ رہے ہیں۔ دلی لٹ گئی، وہاں کے دو چار آدمی بھی کیمپ سے سیدھے احاطے میں آ پہنچے۔ لڑکے کے لیے پوچھا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنی بیگم کا دل ٹوٹ گیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ بہو نے لڑکے کو پاکستان آنے سے روک لیا ہوگا، ڈرتی ہوگی کہ ساس کو ٹکڑا روٹی نہ دینی پڑ جائے۔ اس خیال کے آتے ہی انھوں نے بہو کو جی بھر کر گالیاں دیں اور گھنٹوں روتی رہیں۔ ایک نامعلوم سا سہارا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ محتاجی کا بھوت ان کے سامنے طرح طرح سے ناچ رہا تھا اور چنی بیگم بڑی بے بسی سے اس خونی رقص کو دیکھنے سے انکار کر رہی تھیں۔ اب تو انھوں نے علاج کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ باقی ماندہ روپوں کے بٹوے کو سینے سے لگائے پھرتیں۔

انہی دنوں احاطے کی آبادی بڑھ گئی۔ کوئی کوٹھڑی خالی نہ دکھائی دیتی۔ لوگ پانی کے لیے دھکے کھاتے پھرتے۔ ایک ایک بالٹی پانی کے لیے دور دور تک جانا پڑتا۔ ایک دن تو چنی بیگم کئی گھنٹے پیاسی پڑی رہیں۔ مئی کا مہینہ تھا، لوگ پانی کی قلت سے بلبلاتے پھرتے، انہی دنوں چنی بیگم کی سمجھ میں یہ ترکیب آئی۔ اپنے ایک معتبر دلی والے سے مشورہ کر کے تیس روپے اس کے ہاتھ میں رکھ دیے کہ پرانا ہی ہینڈ پمپ خرید کر لگوا دے۔ اس کام کے بعد چنی بیگم سجدے میں گر گئیں اور رو رو کر خدا سے دعا کرتی رہیں کہ انھیں ساتھ عزت کے دنیا سے اٹھائیو۔

صبح چھاؤنی کی طرف سے کوچ کا بگل بجنے کی آواز آ رہی تھی اور کہیں قریب کی مسجد میں مؤذن اذان دے رہا تھا۔ چنیا بیگم بڑی سرشاری کے عالم میں اٹھیں اور ہینڈ پمپ کی ہتھی گھمائی۔ سفید موتی سی دھار پکے فرش پر بہ گئی۔ انھوں نے بڑے چاؤ سے کلی کی، منہ دھویا اور خالی پیٹ ہی دو گھونٹ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی لیا۔

بیگم کے ہینڈ پمپ کا پانی بھی اتنا ٹھنڈا نہ تھا — انھوں نے بے حد مسرت سے سوچنا شروع کیا — اور شبراتن جو پانی لاتی تھی وہ تو بالکل اونٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پانی تو اسے کہتے ہیں۔ چنی بیگم نے بڑے غرور سے ہر طرف دیکھا۔ کوٹھڑیوں کے آگے کچھ ہوتے

پلنگوں پر لوگ اب تک سوئے پڑے تھے۔

"یہ کم بختوں کی روزی ہی اسی لیے برکت نہیں ہوتی، اذان کے وقت سوت کی نیند سوتے رہتے ہیں۔" چنی بیگم اپنے بستر پر بیٹھ گئیں۔ صبح آج بھی ہمیشہ کی طرح تھی مگر انھیں تو آج اللہ کا نور برستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

ذرا دیر بعد احاطے والے جاگ پڑے۔ پہلا کام یہی تھا کہ سب بالٹیاں اور گھڑے اٹھائے ہینڈ پمپ کی طرف بھاگے۔ مردوں کو جلدی تھی کہ آج تو وہ نہا دھو کر ہی مزدوری پر جائیں گے، ادھر عورتوں کو ہانڈی چولہے کی فکر، سب ایک دوسرے سے آگے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ٹھہرو بھئی!" چنی بیگم نے پہلی ہی بالٹی کو پکڑ لیا۔ "یہ عمر آگئی، نہ کبھی کسی کا مفت کھایا پیا نہ کھلایا۔ روپیہ مہینہ لگا لو، جتنا پانی چاہو بھرو مگر یہ خیال رہے کہ لونڈے نہیں نہائیں گے ادھر، منڈیر ٹوٹ جائے گی، ہاں۔"

قطار سے آگے بڑھی ہوئی بالٹیاں آپس میں ٹکرا کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

"یہ کیا کہا چنی بیگم؟ ارے کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ ایک روپیہ مہینہ کہاں سے لائیں مزدور آدمی، بھلا کوئی پانی بھی بیچتا ہے؟"

"لو، پانی تو اپنی حکومت تک بیچتی ہے۔ شہر کے اندر سب پانی کا کرایہ دیتے ہیں کہ نہیں۔ یہاں مفت کی بات نہیں چلے گی۔ لگوا لیتے نا تم لوگ اپنا ہینڈ پمپ، ایک ایک روپیہ پیشگی جمع کراؤ سب لوگ۔"

چنی بیگم نے مستری کو روپے دینے کے بعد بٹوا جھاڑ کر رکھا تھا۔ صبح صبح پانی پیا تھا جو خالی معدے کو جیسے کاٹ رہا تھا مگر چنی بیگم محسوس نہ کر رہی تھیں۔ اپنے ہینڈ پمپ کا پانی جو تھا۔ ویسے آج تو انھیں جوڑوں کا درد بھی نہ محسوس ہو رہا تھا۔

صرف چار روپے چنی بیگم کے بستر پر گرے اور چار بالٹیاں پانی سے بھرنے لگیں۔ باقی تمام لوگ احاطے سے باہر سڑک کی طرف چل دیے۔ چنی بیگم نے چاروں روپے بٹوے میں رکھ لیے۔

"ہاں ہاں جاؤ، خوب بھرو پانی۔ اللہ طاقت دے تو میل میل سے لے کر آؤ۔ کوئی خوشامد تھوڑی کرنا ہے کہ ہمارے ہینڈ پمپ سے پانی بھرو۔ اے دیکھو پانی میں خود بھروں گی۔ تم لوگ بالٹی زور سے رکھتے ہو، سیمنٹ اکھڑ جائے گی اور چنی بیگم بھی ہاتھ ہلائے بغیر روٹی کھانے کی نہیں۔"

"آج کل دنیا میں کوئی فرشتہ نہیں، سب شیطان بستے ہیں، پانی بیچے گی بڑی آئی بیگم بن کر۔" عورتیں جب پانی لے کر احاطے میں واپس آ رہی تھیں تو زور زور سے باتیں کر رہی تھیں تاکہ چنی بیگم بھی سن لیں۔

بچے سارا دن ہینڈ پمپ کے گرد منڈلاتے رہے۔ وہ چھپاتے ہوئے جسموں کو کھجا کھجا کر للچائی نظروں سے ایک سا دیکھے جاتے پر چنی بیگم کا پہرہ بڑا کڑا تھا۔

چنی بیگم سارا دن ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھی رہتیں، وہیں کھانا کھاتیں، وہیں پلنگ ڈال کر سوتیں، پھر بھی ہر وقت خطرہ رہتا کہ کہیں کوئی مفت میں پانی نہ بھر لے جائے، کہیں لڑکے نہانا نہ شروع کر دیں۔ وہ تو کہو ہینڈ پمپ پر گھنے درخت کا سایہ تھا ورنہ مئی کی دھوپ میں پگھل کر ہینڈ پمپ کے پانی کی طرح بہ جاتیں۔

چنی بیگم کو چار روپوں نے رنجیدہ کر دیا تھا۔ بھلا اس میں کیا کھائیں گی اور کیا پہنیں گی، کس طرح اس موذی مرض کا علاج کریں گی۔ حکیم الگ اولاد دے رہا تھا کہ گٹھیا کی ایک بڑی اچھی دوا ایجاد کی ہے۔ بس پندرہ روپوں کی ضرورت ہے۔

ہینڈ پمپ لگے بیس پچیس دن ہو گئے۔ چاروں روپے ختم ہو گئے۔ دوسرے دن کھانے کو آٹا بھی نہ تھا۔ چنی بیگم پھر بھی مایوس نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ ضد کر رہے ہیں۔ کچھ دن بعد آپ ہی عقل آ جائے گی، کہاں تک تیری میری کوٹھیوں کے دھکے کھائیں گے۔

آج چنیا بیگم نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو پاس رکھے ہوئے المونیم کے کٹورے میں تازہ ٹھنڈا پانی بھر کر پی لیتیں۔

"آہا! کیسا ٹھنڈا پانی ہے ۔۔۔" وہ لمبی سی ڈکار لیتیں۔ "۔۔۔ اور یہ ہیں ناشکرے کہ ایک روپیہ مہینہ دینے میں جان نکلتی ہے۔"

شام ہوتے ہوتے چنی بیگم بھوک سے نڈھال ہو گئیں پھر بھی چار روپوں کے بدلے میں انھوں نے رات کے نو بجے تک آخری بالٹیاں بھریں۔

رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ صبح جب چاروں گھروں والے پانی بھرانے آئے تو چنی بیگم نے آنکھ بھی نہ کھولی۔ انھوں نے اٹھنا چاہا تو ہلا بھی نہ گیا۔

"آج تم خود بھر لو میاں۔ ایک دن کا پانی میں مفت بھر دوں گی۔" انھوں نے مری سی آواز میں کہا۔

صرف شبراتن کو معلوم تھا کہ روٹی نہ ملنے سے بے حال ہے۔ اس نے لاکھ چاہا کہ چنی بیگم اس کے گھر کی روٹی کھا لیں مگر وہ رحم کی یہ بھیک کس طرح قبول کرتیں۔

ذرا ہی دیر میں احاطے والوں کو معلوم ہو گیا کہ چنی بیگم بھوکی ہیں۔ دو گھر محض اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمدردی کا جامہ پہن کر آ گئے۔ چنی بیگم کو جیسے ہی روپے ملے ان میں ایک دم جان آ گئی، اٹھ کر جلدی جلدی پانی بھرنے لگیں۔
پانی بھر کر شبراتن کو روپے دیے کہ آٹا وغیرہ لے آئے۔

سات روپوں سے آگے نہ بڑھے۔ چنی بیگم کے گھٹنے شروع کر چٹکنے لگے تھے۔ جانے کتنی مدت سے علاج نہ ہوا تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں۔ بس بیٹھے بیٹھے ہی چلاتی رہتیں۔

جون کے آخری دن تھے۔ لونڈے گرمی سے بلبلا کر ہینڈ پمپ پر ہلہ بولتے مگر چنی بیگم کا پہرہ سخت تھا۔ مجال تھی جو ہل جائیں۔ ایسا لگتا کہ سنتری انھیں بھی وہیں گاڑ گیا ہے۔

"اپنے مردودوں اپنی اماں سے کہو کہ روپیہ مہینہ دیں پھر خوب پانی بھر بھر کر نہلاؤں گی۔ ایسا ٹھنڈا مزے دار پانی ہے کیسا میل بھرا ہے جسموں پر۔" چنی بیگم لڑکوں کو پھٹکارتیں مگر ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا یوں ہی کھڑے سانڈ لایا کرتے

آج لڑکوں کا موڈ بہت خطرناک ہو رہا تھا۔ وہ سب لنگوٹیاں کس کر آئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، مائیں اونگھ رہی تھیں، لڑکے ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑے۔

چنی بیگم انھیں دھکے مار مار کر تھک گئیں۔ کشتی تک کی نوبت آ گئی، مائیں کوسنے سن کر دوڑیں، لڑکوں کو ڈانٹا مگر اس طرح جیسے شہ دے رہی ہوں۔ لڑکے ٹھاٹھ سے نہا رہے تھے۔ ایک ہتھی گھماتا اور چار چار پانی کی دھار میں پلے پڑتے۔

"اب لاؤ آنہ آنہ دو، دور سے کھڑی تماشہ کیا دیکھ رہی ہو؟" چنی بیگم کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھیں۔

"ہم کہاں سے لائیں، نہانے والوں سے لو، روک کیوں نہیں لیا؟" لڑکوں کے جسموں سے جنتا میل دھل رہا تھا ماؤں کے سینوں سے غبار چھٹ رہا تھا۔ کب سے نہیں نہلایا تھا کم بختوں کو۔

اس کے بعد تو چنی بیگم کا پہرہ کمزور پڑ گیا۔ لڑکوں کو راہ سوجھ گئی تھی، دوسروں کو بھی راستہ مل گیا تھا۔ لڑکے دوپہروں میں ٹھاٹ سے نہانے اور عورتیں بغیر معاوضے کے زبردستی پانی بھر کر لے جاتیں۔ چنی بیگم چیختی رہتیں، کوستیں، گالیاں بکتیں مگر کچھ نہ کر پاتیں۔ ساروں کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ بس چلتا تو ان پانی چوروں کو زندہ گڑھوا دیتیں۔ یہ سات گھر جو ایک روپیہ دیتے تھے انھوں نے بھی سرکشی کر دی۔ وہ بھی مفت میں پانی لے جاتے۔ جب چنی بیگم کی گالیاں خوفناک ہو جاتیں تو سب اس طرح ہنستے جیسے وہ پاگل ہو گئی ہوں۔

آخر چنی بیگم ہینڈ پمپ کے پاس سے سرک کر اپنی کوٹھڑی میں جا بیٹھیں۔ جو بڑا پیسے سوچ گئے تھے کہ ہینڈ پمپ کی حفاظت کی اجازت بھی نہ دیتے۔ بس وہ اپنی کوٹھڑی میں بیٹھی بیٹھی کنستروں اور بالٹیوں کی بوچھار کرتی رہتیں۔ اتنے کیسی بے دردی سے نہلاتے کنستروں پانی بہا جاتا۔ ہینڈ پمپ کے آس پاس دلدل کی سی حالت ہو گئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر لیتیں آخر کوئی کب تک یہ حالت دیکھتیں مگر یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہتی وہ پھر دروازہ کھول دیتیں اور کوسنے دینے شروع کر دیتیں۔

کل سے انھوں نے کچھ نہ کھایا تھا۔ مارے کمزوری کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ ہینڈ پمپ کی ہتی چلانے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ شبراتن نے کئی چکر لگائے، اپنی روٹی کھلانے کی ضد کی مگر چنی بیگم نہ مانیں۔

"ارے شبراتن یوں محتاجی کی زندگی نہ گزاروں گی، احاطے والوں سے روپے دلوا دو۔"

شبراتن چلی گئی تو لنگتی ہوئی ہینڈ پمپ تک گئیں اور ایک کٹورہ پانی بھر کر پی لیا۔ پھر ایسا چکر آیا کہ وہیں گر پڑیں۔ ذرا دیر بعد ہوش آیا تو اپنی کوٹھڑی میں لیٹی تھیں۔

رات کو احاطے والی دو عورتیں ایک ایک روٹی پر دال چٹنی رکھ کر لے آئیں تو چنی بیگم میں لڑنے کی جان آ گئی۔

"اپنی اماں بہنوں کو دو خیرات، مجھے محتاج سمجھا ہے، لاؤ دام ادا کرو پانی کے، اللہ نے چاہا تو دنیا ہی میں بدلہ ملے گا۔"

عورتیں تخت پر رکھی ہوئی تام چینی کی پلیٹ میں روٹیاں رکھ کر چلی گئیں۔ چنی بیگم بڑی دیر تک چیختی رہیں۔

"ارے کم بختوں لے جاؤ اپنی اماں بہنوں کو ڈال دو یہ روٹیاں۔"

شام ہو گئی، کوٹھڑی میں مچھر بھنبھنانے لگے۔ چنی بیگم مارے نقاہت کے اندر ہی لیٹی رہیں۔ چھاؤنی سے واپسی کے دردناک بگل کی آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ہی ہتی کے چلنے کی کھٹا کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ آج تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ساری دنیا کے لوگ ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑے۔ جانے چنی بیگم میں ایک دم کہاں کی طاقت آ گئی۔ وہ بڑی پھرتی سے ہینڈ پمپ کی طرف جھپٹیں۔

"پانی کا کرایہ دو، یوں کسی نے پانی بھرا تو ہاتھ توڑ دوں گی۔" پورے پورے مرد پانی بھر رہے تھے۔ چنی بیگم سے کسی کی ایک انگلی بھی نہ ٹوٹی۔

"ارے چنی بیگم تم کو کیا، ہم سب تمھاری اس وقت تک خدمت کریں گے جب تک جیو گی۔"

"اپنی اماں بہنوں کی خدمت کرو۔" چنی بیگم نے اپنے حساب گالی دی۔

سب ہنسنے لگے تو وہ خود کو گرتا ہوا محسوس کر کے کوٹھڑی میں آ گئیں۔ کوٹھڑی میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے چراغ جلایا۔ روٹی کی پوٹ کو اٹھا کر دیکھا اور پھر رکھ دیا۔ اپنی پتلی سی کھاٹ کو کھینچ کھینچ کر بڑی محنت سے باہر نکالا اور نیچی نیچی کانپتی بیٹھ گئیں۔

رات بھوک نے تڑپایا تو پاؤں پاؤں تڑکے تڑکے رینگتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں گئیں۔ اللہ مارے چوہے روٹیاں کھینچ لے گئے تھے۔ وہ وہیں بکس پر ٹک گئیں۔

ذرا دیر بعد اللہ رکھے کی بیوی پیتل کی لٹیا میں گرم گرم چائے اور ایک روٹی لیے آئی۔ چنی بیگم نے جلدی سے اپنا کٹورا بڑھا دیا۔

"ارے یہ روز روز آٹا ذرا سا ڈال کر لاتی ہے اور روٹی میں گھی بھی نہیں چپڑا نیک بخت، پانی تو آٹا بھرتی ہے کہ حد نہیں۔ اب ذرا خیال رکھیو ہاں!"

قُفنی

علی عباس حسینی

ہیڈ ماسٹر کے سامنے مقدمہ پیش تھا۔ ماسٹرنی، ان کا بسورتا بھائی مہندر اور ان کے پریشان سراسیمہ ماسٹر صاحب مدعی بن کر آئے تھے۔ مجرم اور مدعا علیہ تھا بورڈنگ کا ایک طالب علم پریش! صرف مدعیان حاضر تھے، مجرم مفرور یا روپوش تھا۔ فیصلے کا یک طرفہ ہونا یقینی تھا۔ ماسٹرنی اور ان کے پتی کے مقابلے میں کسی طالب علم کی کیا بساط! ماسٹرنی کا اشارہ ہی کافی تھا۔ ان سے سب ہی ڈرتے تھے۔ وہ تھیں ماسٹر صاحب کی جابر ملکہ، جب چاہتیں ماسٹر صاحب کا کان پکڑ کر اسکول سے الگ کرا دیتیں اور اسکول کے لیے ماسٹر صاحب کی خدمتیں بڑی قیمتی تھیں۔ سب ہی ان کی عزت کرتے تھے، ساتھی ان کی شرافت و انسانیت کی وجہ سے، لڑکے ان کی لیاقت و قابلیت کے باعث اور ہیڈ ماسٹر ان کی مستعدی اور کام کی لگن کی بدولت۔

لڑکوں کی نظر میں ماسٹر صاحب بس دو کمزوریاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خود ہی قاعدے قانون کے پابند نہ تھے بلکہ لڑکوں سے بھی، ہر قاعدے قانون کی پابندی کراتے تھے اور لڑکوں سے اور پابندی سے ٹھہرا باپ مارے کا بیر۔ طالب علم کی سب سے بڑی چڑ پابندی ہے۔ خواہ وہ اخلاقی پابندی ہو، تعلیمی پابندی ہو یا قاعدے قانون کی ہو۔ وہ ایسی ساری زنجیروں کو توڑنا اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ اس لیے اس عمر کے باوجود جو دنوں میں بڑھی ہوئی لڑکے ماسٹر صاحب کی ان دو قانون کی پابندیوں سے بہت عاجز تھے اور وہ ٹھیٹ خطابات عطا کرنے میں دنیا جہان کے بادشاہوں اور آمروں سے زیادہ فیاض! اس لیے انھوں نے ان کا نام رکھا تھا ماسٹر "قُفُن" اور ان کی بیوی کا ماسٹرنی "قُفنی"!

اس لیے کہ ماسٹر قفن صرف اسکول ہی میں ان سے یہ پابندی نہ کراتے تھے بلکہ بورڈنگ میں یہ عذاب جان ہی ان کے ساتھ لگی رہتی۔ وہ بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ بھی تو تھے۔ پڑھنے لکھنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے ہر بات میں ان کا قاعدہ قانون ہمزاد کی طرح ساتھ رہتا۔ حاضری دینے وقت سارا درجہ تکل جیسا سیدھا نہ رہا، اوپر انھوں نے ڈانٹا "قاعدے سے کھڑے ہو!" کلاس میں کسی نے کمر سیدھی کرنے کی غرض سے ذرا اسے جلیبی بنا لیا، وہ غرّائے: "قاعدے سے بیٹھو!" نوالہ چبانے وقت ذرا چٹخارے لے کر کھایا، چپ چپ کی آواز آئی، وہ گرجے۔ "قاعدے سے کھاؤ!" شام کے وقت دیہاتی ان کے لڑکوں کی طرح بے گھنٹی اور لائٹ کے سائیکل لے کر نکلے، انھوں نے چیں بہ جبیں ہو کر روک دیا: "سائیکل رکھ دو! اس میں گھنٹی نہیں ہے، یہ خلافِ قانون ہے۔ اس میں لیمپ نہیں ہے، یہ خلافِ قانون ہے۔"

مسٹر قفن کی دوسری کمزوری تھیں قفنی یعنی ان کی شریک حیات ماسٹرنی صاحبہ۔ جس قدر وہ موٹے تازے، چوڑے چکلے تھے اتنی ہی وہ چھوٹی ٹھنگنی دبلی پتلی تھیں۔ مزاج تھا کہ تیکھا مرچ، زبان تھی کہ نمک پاش، جو پاس سے گزرا کڑوا ہو گیا، جس سے دو باتیں کیں حلق میں تلخی محسوس کی۔ اس پر یہ گھمنڈ کہ

اگر وہ نہ ہوتیں تو بورڈنگ کا کام دو دن نہ چلتا۔ وہاں کے انتظام کی ساری خوبیاں انہی کے دم سے تھیں۔ بیچارے ماسٹر صاحب تو اتنے سیدھے تھے کہ لونڈے انھیں انگلیوں پر نچاتے۔ بس یہ انہی کی مقابل نظر اور فولادی گرفت تھی کہ ایسے منہ زور بچھڑے بھی سدھ گئے تھے۔ "پتی دیو تو دیوتا ہی ہیں!" اور یہ ماسٹرنی جی ہر ایک سے ارشاد ہوتا تھا! "ہاں اگر کوئی لڑکا ان کے بس کا نہیں تھا تو وہ ہے مہندر!" ماسٹرنی جی کی نظر میں مہندر سے زیادہ نیک، ہوشیار اور اچھا لڑکا نہ اس وقت تک پیدا ہوا تھا اور نہ آئندہ دنیا میں اس کے پیدا ہونے کی امید تھی اور وہ میاں تھے آٹھوں گانٹھ کمیت، ایک تو کریلا اور اب نیم چڑھا بھی۔ بورڈنگ ہاؤس بھر کے لڑکوں پر حکومت جتاتا تھا۔ ماسٹر صاحب کا سالا تھا، جس کی بہن اندرا اس کا بھائی سندر، اس لیے ماسٹر صاحب میں اور نہ لڑکوں میں یہ دم تھا کہ اسے ٹوک سکیں۔ اندر باہر توپیں گرجتیں، مشین گنیں چلتیں، بجلیاں گرتیں، کوندے لپکتے۔ اس لیے وہ بورڈنگ کا سب سے ڈراؤنا ہوا سانڈ تھا۔ جس کو جی چاہا چپت لگا دی، جس کی کتاب کاپی ہوئی لے بھاگا۔ ہر ایک کو ڈانٹتا، گھرکتا، گالی دے دیتا، مار بیٹھتا۔ چغلی کھا کر مار کھلوانا یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لڑکے اس سے ڈرتے تھے، چپراسی اس سے ڈرتے تھے، خود ماسٹر صاحب اس سے ڈرتے تھے۔ بس اگر کوئی اس کی دھونس نہ کھاتا تو وہ تھا ہریش!

جس طرح ایک میان میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو خودسر بادشاہ نہیں رہ سکتے، اسی طرح ایک بورڈنگ میں دو سردار نہیں رہ سکتے۔ دونوں میں جوتم پیزار ضرور رہتی۔ مہندر کو اگر اپنی بہن کی پشت پناہی پر گھمنڈ تھا تو ہریش کو اپنی جسمانی قوت اور اپنے کردار پر۔ مہندر اپنی بہن کا بھائی تھا، ٹھگنا، سوکھا، دبلا پتلا۔ ہریش تھا خوش رو، ہاتھ پاؤں کا مضبوط، اٹھتی جوانی، پندرہ برس کا سن، مگر جب بھی دونوں میں ٹکر ہوتی جیت مہندر ہی کی ہوتی۔ دو دل ایک ہوں تو پہاڑ ڈھا سکتے ہیں، یہاں تو ماسٹرنی اور مہندر کی مجموعی قوت کا صرف ایک نوجوان سے مقابلہ تھا۔ اس لیے ہریش کئی بار ڈانٹیں سن چکا تھا، کئی دفعہ جرمانے دے چکا تھا اور آخر میں یہ نوٹس بھی پا چکا تھا کہ اب کے جو شکایت آئی تو وہ اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ ففتی اس کا خیال آتے ہی دانت پیس کر کہتیں "میں اس پاجی کو اسکول سے نکلوا کر ہی سانس لوں گی!"

آج کچھ ایسا ہی سامان بھی ہو گیا تھا۔ ہریش اسکاؤٹ کے کپڑے پہنے سائیکل لیے باہر جا رہا تھا۔ شہر میں سیلاب کی بدولت سیکڑوں گھر گر رہے تھے۔ اسکول کے اسکاؤٹ بھی لوگوں کو گھروں سے نکالنے اور دوسری جگہ پہنچانے میں مدد دے رہے تھے۔ ہریش کو اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ ایسے میں یہ کون دیکھتا ہے کہ سائیکل میں گھنٹی ہے یا نہیں مگر مہندر کے لیے تو بہانہ مل گیا۔ اس نے سامنے آ کر کہا "یہ کہاں سے چلے بے گھنٹی کی سائیکل؟"

ہریش نے سائیکل پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا "تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے ففتی کی دُم!"

مہندر نے آپے سے باہر ہو کر اس پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہریش نے جھکائی دی اور سائیکل پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری قوت سے لات ماری۔ مہندر اُلٹ گیا۔ پیچھے تھا پیپل کا پار اور اس کے پاس ہی زمین پر پڑا ہوا لوہے کا گولا۔ سر تو پار سے ٹکرایا، ٹانگیں گولے میں اُلجھیں اور وہ زمین پر منہ کے بل آ رہا۔ دانتوں نے ہونٹ کی مزاج پرسی کی، زمین نے گھٹنوں کی تواضع کی اور پار اور گولے نے ٹخنے اور سر کی خبر لی۔ وہ تو "ہائے دیدی! ہائے دیدی!" کہہ کر چیختا رہا اور ہریش سیٹی بجاتا سائیکل تیز چلاتا نو دو گیارہ ہو گیا۔

اسی لیے اس وقت بورڈنگ اور ہیڈ ماسٹر کے دفتر کا درمیانی حصہ رن کی زمین کی طرح جل رہا تھا۔ ففتی مدعیہ نمبر ایک زخمی مہندر کو بطور ثبوت پیش کر کے الٹی میٹم دے رہی تھیں۔ ماسٹر صاحب خاموش تھے مگر ضمیمہ کی طرح وہ بھی مثل میں نتھی تھے۔ ہیڈ ماسٹر کو معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے اور مدعا علیہ کے بیان لینے اور صفائی کے گواہ طلب کرنے کا موقع نہ تھا۔ ففتی اپنی تیز سیٹی کی طرح بجتی آواز میں میز پر ہاتھ پٹک کر کہہ رہی تھیں "یا تو ابھی اسی

ہریش کو اسکول اور بورڈنگ سے نکالیے یا ابھی ابھی ان کا (یہ غلام خاص ماسٹر صاحب کی طرف اشارہ تھا) دونوں عہدوں سے استعفا منظور کیجیے۔

ہیڈ ماسٹر کے پاس اس الٹی میٹم کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ انھوں نے "آرڈر بک" منگائی کہ ہریش کو اسکول سے نکالنے کا حکم لکھ دیں۔

ابھی انھوں نے قلم اٹھایا ہی تھا کہ دفعتاً برساتی میں ایک موٹر آکر رکا۔ حاکم ضلع آگے آگے اور اس کے پیچھے پیچھے کاؤنٹ ماسٹر اور ایک لڑکا ہریش کو سنبھالے ہوئے موٹر سے اترے۔ ہیڈ ماسٹر کرسی چھوڑ کر لپکے۔ "کیا ہوا جناب! آپ نے کیسے زحمت کی؟" انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

مجسٹریٹ نے ہریش کی طرف اشارہ کر کے کہا: "میں آپ کے اس ہونہار شاگرد کو لے کر آیا ہوں! اس بچے نے اپنی جان پر کھیل کر ایک عورت اور اس کی دو بچیوں کو ایک گرتے ہوئے مکان سے نکالا ہے۔ مکان کا اگلا حصہ گر چکا تھا، بقیہ حصے گر رہے تھے۔ یہ تینوں جانیں اندر پھنس گئی تھیں۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اپنے کو ہلاکت میں ڈال کر انھیں بچانے جائے۔ مگر یہ لڑکا اس حالت میں مکان میں گھس گیا اور انھیں نکال لایا۔ خود اس کے پاؤں میں ایک گرتے ہوئے شہتیر سے خراش بھی آگئی اور جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی اور بھی چوٹیں آئی ہیں۔ میں تو اسے اسپتال میں داخل کرنا چاہتا تھا مگر یہ مانا ہی نہیں۔ کہتا ہے میں اپنے بورڈنگ ہی جاؤں گا۔ وہیں مجھے زیادہ آرام ملے گا......"

نقمی جلدی سے بات کاٹ کر بول اٹھیں: "جناب ہم اپنے بورڈنگ میں بچوں کو اس طرح آرام سے رکھتے ہیں کہ وہ اسے گھر سمجھتے ہیں!" اور وہ اس طرح آگے بڑھ آئیں جیسے ہریش کی ساری تعریفیں وصول کرنے کا انھی کو حق ہے۔

کلکٹر نے انھیں معترضانہ نظروں سے دیکھ کر کہا: "اچھا تو یہ آپ ہی کی مادرانہ شفقتوں کا نتیجہ ہے کہ بچے بورڈنگ کو گھر سمجھتے ہیں۔۔۔ میری طرف سے اپنے مامتا بھرے برتاؤ پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔" اور وہ ہریش کی طرف جسے اب آرام کرسی پر لٹا دیا گیا تھا اشارہ کر کے بولے "سمجھیے یہ آپ اپنا بچہ! آپ اس پر جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔"

ہیڈ ماسٹر جب کلکٹر کو رخصت کر کے کمرے میں پلٹے تو انھوں نے دیکھا ماسٹرنی ہریش کے سر پر ہاتھ رکھے بڑی محبت سے پوچھ رہی تھیں: "کہاں چوٹ لگی میرے بچے؟"

ہیڈ ماسٹر نے اپنی میز تک پہنچ کر کھنکار کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا اور "آرڈر بک" کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: "اب کیا حکم لکھوں شریمتی جی؟" اور تعمیل حکم کے لیے قلم بھی اٹھا لیا۔

ماسٹرنی کچھ جواب دینا ہی چاہتی تھیں کہ ویسے ہی ہریش ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ کسمسایا۔ انھوں نے فوراً اس پر جھک کر پوچھا: "کیا بہت تکلیف ہے بیٹے؟"

مہاشے بھلا بہن کی محبت میں اپنے رقیب خاص کی یہ شرکت کیسے دیکھ سکتا تھا؟ وہ ایک طنزیہ قہقہہ لگا کر بولا: "ارے بنا ہوا ہے دیدی! بہروپیا ہے بہروپیا!"

ماسٹرنی کا چہرہ دہکتے لوہے کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ گرجیں: "چپ رہ پاجی کہیں کا! شریر!"

پھر وہ لپکتی ہوئی میز کے قریب آئیں۔ ذرا جھک کر انھوں نے بڑی ہی کڑی نگاہوں سے اپنے پتی دیو کو گھور کر دیکھا اور کہا—

”غیر ہمارے جو آج سے آپ نے مہندر کی صفائی یا طرفداری میں ایک لفظ منہ سے کہا!“

اس کے بعد وہ ہیڈ ماسٹر سے مخاطب ہوئیں: ”یہ کہہ دیجئے کہ ہربنش نے جس طرح اسکول اور بورڈنگ کا نام اونچا کیا ہے اس پر ہمیں بڑا فخر ہے اور میں اُسے اس کارِ نمایاں پر اپنی طرف سے انعام میں ایک تمغہ دوں گی۔“

مہندر کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکی نکل گئی۔ ماسٹر صاحب بیری کے کانٹے تیوروں سے کچھ بڑبڑا کر سمٹ سے گئے۔ ہیڈ ماسٹر مطمئن ہو کر مسکرائے اور ماسٹر جی نے پورے مجمع پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی ـــــ

ہربنش نے پاس کھڑے ہوئے اسکاؤٹ سے آنکھ مار کر آہستہ سے کہا ـــ ”یہ رہی اپنی قسمتی!“

رات، چور اور چاند

(مسلسل)

بلونت سنگھ

پالا سنگھ کے دیکھتے دیکھتے حالات نے ایسا پلٹا کھایا جس کا اسے خواب میں خیال تک نہ تھا۔

سروں کے والدین کو حقائق کا اس قدر شدید احساس ہوا کہ انھوں نے فوراً خاندان کے چند نیک اور معزز بزرگوں کو مشورے کے لیے جمع کیا اور سارے حالات ان کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ اتفاقِ رائے سے یہ طے پایا کہ جلد از جلد لڑکی کی شادی کر دی جائے اور اس دوران میں لڑکی کی کڑی نگرانی کی جائے۔

برخلاف پال سنگھ کے باپ نے تو انکار کر دیا تھا اب سوال یہ تھا کہ شادی کس کے ساتھ کی جائے۔ نرنجن سنگھ اور جنداں کمرے میں بند خفیہ مشورے کرتے اور یہ ایسا معاملہ تھا کہ اور زیادہ تاخیر کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

نرنجن سنگھ نے دبی زبان سے پالی کا ذکر کیا۔

"اب یہ اپنا لڑکا پالی ہے۔ آخر اس کا کیا کیا جائے کہ اوّل تو خاندان ہی نیک نام نہیں۔ خیر اس کو بھی چھوڑو، باپ کے مرنے کے بعد لہنا سنگھ تو بھلے آدمیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ باقی رہا پالی سو اس کی بابت بھی کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی لیکن ہے نکھٹو۔ اتنے دنوں پردیس میں نہ جانے کیا کرتا رہا ہے۔ پلّے پھوٹی کوڑی نہیں، اتنے مہینوں سے یہاں آوارہ گھوم رہا ہے کوئی کاروبار ہی شروع کر دیتا۔ زمین خریدنے کو کہا تھا وہ بھی نہیں خریدی۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ بھی ڈھکوسلا تھا..... اُف کیا مصیبت ہے لڑکیوں کی۔ کس لاڈ پیار سے پالا تھا اسے۔ خیال تھا کسی اچھے گھرانے میں شادی کریں گے جہاں آرام سے زندگی بسر کرے گی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے کہیں نہ کہیں چلتا کر کے اپنی آبرو بچا لیں....."

جنداں بولی۔

"جو ہو سو ہو اب پالی کا نام نہ لو۔ لڑکی پھر گاؤں کی گاؤں ہی میں رہے گی، اگر پھر کوئی بات اٹھی تو کون ذمہ دار ہوگا اور اس کا نتیجہ بھی کیا جانے کیا نکلے۔ اس مردود کا تو اب کہیں پردیس میں منہ کالا کرو۔ تمہارا کیا سب باتیں تو عورتوں کو سہنا پڑتی ہیں۔ دور چلی جائے گی تو جان بھی چھوٹ جائے گی...... پالی پر مجھے بھی شک ہے۔ نہ کوئی کام کرتا ہے نہ اس کی جیب میں پیسہ ہے نہ کوئی ہنر جانتا ہے

یہ تو سوچو کہ وہ روپیہ کیسے کماتے ہیں۔ آپ کہاں سے کھائے گا، لڑکی کو کیا کھلائے گا۔ ابھی تو گھر میں بیٹھا کھا رہا ہے لیکن شادی ہو جانے پر تو یہ بات نہ رہے گی۔ پھر تو بڑے بھائی بھی کہیں گے کہ جاؤ اپنا کماؤ اور کھاؤ۔ اور زمین بھی تو بہت نہیں ان کے پاس۔"

اس پر دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔ پھر جنتاں کو جو خیال آیا تو کہنے لگی۔

"وہ جو تم اس کا ذکر کر رہے تھے نا۔ اس میں کیا ہرج ہے۔ تم اسے چٹھی کیوں نہیں لکھ دیتے۔"

"ہاں خوب یاد دلایا لیکن تمہیں معلوم ہے نا کہ وہ دو سال سے رنڈوا بیٹھا ہے۔"

"کیوں کیا مرچکی ہے پہلی عورت اس کی؟"

"نہیں — ایک بچہ تھا سو مر گیا۔"

"بس تو پھر کیا ہرج ہے؟"

"تو چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ صورت بھی کچھ ایسی ویسی ہی ہے لیکن ایسی بری بھی نہیں۔"

"کماتا تو ہے؟"

"ہاں بابا کماتا ہے، سرکاری نوکری بالکل پکی اور یوں بھی جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ بڑا نیک بڑا گورسکھ ہے۔ ہر روز صبح اٹھ کر پاٹھ کرتا ہے، گوردوارے میں ماتھا ٹیکتا ہے۔ نوجوانوں والی کوئی علت نہیں۔ شراب اور بدمعاش عورتوں سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ یقین جانو سب لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ میں اسے مل چکا ہوں۔ واقعی لوگ جو اس کی تعریف کرتے ہیں وہ جھوٹ نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ پہلی بیوی کو وہ دیوی کی طرح رکھتا تھا۔ کیا مجال جو ایک مرتبہ تو بھی کہا ہو اسے، حالانکہ وہ بڑی لڑاکا تھی۔ دیکھنے والے کہتے کہ اگر کوئی اور مرد ہوتا تو چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کرتا لیکن وہ کہتا میری عورت جھگڑالو ضرور ہے پر دل کی بری نہیں نہ اس میں کوئی اور عیب ہے۔ اس کی محبت میں تو عورت بھی کافی سدھر گئی تھی۔ دراصل بیچارا بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیچارے کو گھر بسانے کی بڑی تمنا ہے۔ اس نے دو ایک مرتبہ اور آدمیوں کی معرفت کہلوایا بھی ہے۔"

"اچھا؟ کب کی بات ہے یہ؟"

"لو اور سنو تمہارے دماغ سے بالکل ہی گوبر بھرا ہے میں نے پچھلے سال تم سے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ میں اپنی چاند سی لڑکی کے لیے بہت ہی خوبصورت اور امیر دولہا لاؤں گی۔ رنڈوے سے لڑکی کی شادی ہرگز ہرگز نہیں کروں گی۔"

"بھئی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ میں پوچھتی ہوں اب اس کی شادی تو نہ ہوئی ہوگی۔"

"کیا جانیے۔"

"اچھا تو ہے بر۔ ہمیں اور کیا چاہیے۔ چالیس برس کی عمر بہت زیادہ تو نہیں نا۔ جب پہلی سے بچہ نہیں نا...... ارے ہاں یاد آ گئی بات، تم نے ذکر کیا تھا مگر مجھے تو زیادہ اعتراض بچے پر تھا۔ اب کہتے ہو کہ وہ مر گیا......"

"ہاں ہاں اب کوئی ہرج نہیں۔ بن بچے کا رنڈوا ابھی تو کنوارا ہی سمجھنا چاہیے۔"

"ہاں اب اس موقعہ اس سے ہو جائے سنجوگ تو ہماری خوش نصیبی سمجھو۔"

"دیکھئے کہیں شادی نہ ہو گئی ہو اس کی۔"

"چٹھی لکھ دو نا کہ اگر شادی نہ ہوئی ہو تو ہمیں وہ فوراً اطلاع دے دے۔"

آپس میں اچھی طرح مشورہ کر لینے کے بعد نرنجن سنگھ نے بکرم سنگھ حوالدار کو چٹھی لکھ دی۔ چار روز بعد جواب آیا تو لفافہ نرنجن سنگھ کے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ اس نے بیوی کو بلایا۔ دونوں اندر والے کمرے میں جا کر اسے کھولا اور جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا تو ان کے چہرے کی سرخی عود کر آئی ——

"لو مبارک ہو کام بن گیا۔"

جنداں کی چھاتی پر سے بھی مانو پتھر کی سل ہٹ گئی۔ ہنس کر بولی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو۔ اچھا ہوا اب آٹھ دس روز تک لڑکی کو رخصت کر کے چین کی سانس لیں گے۔ میں نے تو پہلے ہی منظور کر دیا تھا جو حوالدار سے شادی کر رہے ہیں سرفوں کی۔"

"احمق کہیں کی اگر اس کی شادی پہلے ہی سے کہیں ہو چکی ہوتی تو پھر؟"

جنداں دانت نکال کر بولی۔

"میرا دل جو کہتا تھا کہ ہمارا کام بن کر رہے گا۔ میں گھبرا گئی تھی۔ تو کیا ہوا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا...... خیر اب لڑنے سے کیا فائدہ اب تیاری کی فکر کرو۔"

ان ہی چار دنوں کے اندر ایک طرف تو نرنجن سنگھ اور دوسرے بزرگوں نے اصل واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور دوسری طرف جنداں کی چرب زبانی سے لوگوں کے دل موہ لیے۔ جس ماچھی نے نرنوں اور برفی پال کو ساتھ ساتھ دیکھا تھا اسے بلا کر نہ صرف دھمکیاں دی گئیں بلکہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو کچھ روپے بھی دے کر ان کے منہ بند کر دیے۔ اب ان کا بیان یہ تھا کہ ہم نے اچھی طرح پہچانا نہیں ممکن ہے کوئی اور عورت ہو۔ چونکہ کافی اندھیرا تھا اس لیے غلطی کا امکان بھی تھا۔ ادھر حوالدار بکرم سنگھ کو جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی پیشکش پر کچھ شک گزرا اور اڑتی ہوئی افواہیں بھی پہنچیں لیکن گاؤں کے چند نیک طینت بزرگوں نے بیچ میں پڑ کر سب شکوک رفع دفع کر دیے۔ حوالدار بھی سخت ضرورت مند تھا فطرتاً نیک بھی تھا چنانچہ وہ ان پر ایمان لے آیا۔

جنداں کی یہ خاص خوبی تھی کہ ایک مرتبہ جو سر پر مصیبت آن پڑتی تو پھر وہ حالات کا مقابلہ بڑی جرأت اور خندہ پیشانی سے کرتی تھی۔

گھر میں شادی کی چہل پہل پیدا ہو گئی۔ جنداں نے اپنی گفتار، حرکات اور سکنات سے غیر معمولی بات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہنسی مذاق سے سب کو خوش رکھا اور گاؤں میں اگر کسی عورت کے دل میں میل تھا بھی تو جنداں خاندانی پندار کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے ہر ایک کے گھر میں پہنچی۔ بڑی خوشامد اور محبت سے انھیں اپنانے کی کوشش کی۔ جب شادی سے آٹھ دس روز پہلے رات کو گانا بجانا شروع ہوا تو جنداں سنداں کے ہاں پہنچی۔ جنداں بہت ذہین تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سنداں کے دماغ میں کیا خیالات ہیں اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کس طرح اس کے دل کو رام کیا جا سکتا ہے۔ جنداں کی پیار بھری باتیں سن کر سنداں کا دل پسیج گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ بیچاری کو کیا ہے۔ سر پہ مصیبت پڑی ہے۔ ایسے موقع پر بیر کمانا ٹھیک نہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے جنداں نے پالی کے کندھے پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بیٹا پالی! اب تو بہن کی شادی میں تجھے ضرور مدد کرنی چاہیے۔"

اس وقت جنداں کی صورت اس قدر مظلوم اور معصوم بنی ہوئی تھی کہ پالی انکار نہ کر سکا اور پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ بیچاری جنداں چاچی کو

کیا معلوم کہ ہیں سرنوں کی محبت ہیں نہ پھنسا ہوں۔ ڈوبتے کو تنکے کے سہارے والی بات تھی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اس بہانے سے ان کے وہاں بلاتکلف جانے آنے کا موقع ملتا رہے گا اور عین ممکن ہے اس دوران میں سرنوں سے بات چیت ہو جائے اور اگر اب بھی وہ اس کی جانب توجہ کرے تو پھر اسے جیتنے کے لیے اپنا سینے کی کوئی صورت بھی نکالی جا سکے گی۔

ادھر اس کے ذہن میں یہ خیالات تھے تو ادھر اس کی ماں بڑے اخلاص سے بولی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں آئے گا۔ بچپن سے ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ بھلا اب اس کی شادی میں یہ مدد نہ کرے گا تو اور کون کرے گا؟"

جب رانوں کو بیاہ کے گیت گانے کے لیے بلاوا آیا تو رتن ان اور تاباں جھٹ پٹ چوکے برتن سے فرصت پاکر خراماں خراماں بیاہ والے گھر کو چل دیں۔

پہلی رات کو ہی وہاں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی۔ سرنوں کی سہیلیاں رنگ برنگ کی چندریاں اوڑھے ڈھولک سے کر بیٹھ گئیں۔ ایک لڑکی نے ڈھولک پر بجانے کے لیے ٹھیکرا ہاتھ میں پکڑا تو بڑی بوڑھی عورتیں بولیں۔

"ٹھہر و ٹھہر و لڑکیو! پہلے سہاگ گیت گانے دو ہمیں۔"

لڑکیاں چلا کر بولیں۔

"اچھی بات! کا ؤ ہم ڈھولک بالکل نہیں بجائیں گی۔"

چنانچہ دو چار بوڑھی عورتوں نے جینڈکیوں کی سی ٹرّاتی ہوئی آواز نکال کر سہاگ گیت شروع کیا۔

ہے میرے بابلا میرا کاج رچا

دھرتی را بیاہ سے

میرا کاج رچا

رفتہ رفتہ چند خوش گلو عورتوں اور لڑکیوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں تو خاموش فضا گیت کے درد اور کسک سے تھر تھرانے لگی اس طرح سات سہاگ گیت گائے گئے تو اب لڑکیوں کا ہنگامہ شروع ہوا۔ وہ بھی بس اشارے کی منتظر بیٹھی تھیں فوراً ڈھولک دھمدھمانے اور ٹھیکرا بجانے لگیں۔

بڑی بوڑھیوں نے منہ سے ایسے زور کی سانس چھوڑی جیسے انھوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا ہو۔ چند بول اٹھیں: "ہے بہن جنداں انگیٹھیوں کے اُپلے تو راکھ ہو گئے اب اور ڈال دو اپلے توڑ کر۔"

جنداں تو بات بات پر ہنستی اور سر تسلیم خم کرتی۔ مجال کیا جو کسی کو شکایت کرنے کا موقع دے۔ سبھوں کے دل پر ایسا جادو کر ڈالا تھا اس نے کہ وہ سرنوں کی بابت افواہوں کو بے بنیاد سمجھنے لگیں۔ وہ خود اٹھ کر اُپلے لینے کے لیے پسار سے باہر نکل گئی۔ چند بوڑھیوں نے جو دبی زبان سے سرنوں کا تذکرہ کر رہی تھیں اتفاق رائے سے یہ نتیجہ نکالا کہ کیا جنداں اور کیا سرنوں دونوں بہت ہی نیک ہیں، لوگوں پر بانگروہ کی مار ہو نہ معلوم کیوں جلتے ہیں ان کے گھرانے سے۔

اس بات کی بھنک جنداں کے کان میں بھی جا پڑی۔ اس کا دل مارے خوشی کے ناچ اٹھا اس نے نہ صرف انگیٹھی دہکا دی بلکہ سب عورتوں خصوصاً بوڑھیوں کو ٹانگوں پر ڈالنے کے لیے کمبل اور کھیس بھی دیے۔

لڑکیوں نے ڈھولک اور اس پر ٹھیکری بجا بجا کر چٹکیلے گیت گانے شروع کیے۔

وٹنی جب ندی گوری وے منالے ٹھانیدارا

ایک گیت ختم ہوا تو دوسرا شروع کر دیا گیا۔ شریر لڑکیوں نے گیتوں کی آڑ لے کر اپنے دلوں کی بھڑاس بھی نکالی۔ گاتے گاتے ان کی چندیاں سروں سے کھسک کھسک جاتیں، دانت نکل نکل پڑتے، چھتیاں دھڑک دھڑک جاتیں۔ محبت اور نفرت، شرارت اور چھیڑ چھاڑ غرض ہر قسم کے جذبوں سے فضا گونجتی رہی۔

رات کے بارہ ایک بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر جب محفل برخاست ہوئی تو چنداں نے پاؤ بھر کی بجائے ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ گڑ ہر عورت کی جھولی میں ڈال دیا۔ حاضرین پر بہت خوشگوار اثر ہوا۔ نوجوان لڑکیوں میں بعض ایسی بھی تھیں جنھوں نے سرنوں کی بابت کوئی افواہ نہیں سنی تھی انھوں نے جاتے جاتے سرنوں سے ذو معنی لفظوں کی چٹکیاں لینے سے بھی احتراز نہیں کیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے توں توں ان کے گھر میں پالی کے پھیرے پہلے سے بھی بڑھنے لگے۔ وہ سارے گھر میں بے مہار اونٹ کی طرح گھوما کرتا لیکن بظاہر چنداں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اِدھر اُدھر کے بھاگ دوڑ والے کاموں میں پالی مدد بھی بہت کرتا اور گھر یا گلی میں جب کبھی چنداں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ بڑی شفقت کے ساتھ مادرانہ انداز میں مسکرا دیتی۔ یہاں تک کہ پالی کو یقین سا ہونے لگا کہ اگر چاچی چنداں کو اس کے دل کی کیفیت کا علم ہو جائے تو وہ فوراً موجودہ شادی تڑوا کر اپنی لڑکی کا اس کے ساتھ بیاہ رچا دے۔

پالی کو اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ ایک تو اسے ڈھب سے بات کرنی ہی نہیں آتی تھی۔ اگر اسے تھوڑی بہت عقل ہوتی تو سرنوں ان کے ہاتھ سے جنگلی چڑیا کی مانند پھر سے اُڑ نہ جاتی۔ پھر اسے اس بات کا خیال آیا کہ سرنوں کو اس سے محبت ہی نہیں تھی۔ اس نے گٹھ جوڑ بھی کیا تو کس سے، دیسی ٹپن پرتھی پال سنگھ سے۔ وہ تو صورت ہی سے شہدا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن گاؤں کی ناتجربہ کار لڑکیوں کو اس بات کا علم ہی کہاں ہوتا ہے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ پر جان دیتی ہیں اور آخر کار ساری دنیا کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا نشانہ بن کر بیٹھ رہتی ہیں گھر پر۔ بھابی کی خوش فہمی بھی حماقت بن رہی تھی۔ عین اس کی ناک تلے سرنوں غیر سے پریم کا کھیل کھیلتی رہی لیکن وہ یہی سمجھتی رہی کہ پرتھی پال سنگھ بڑا شریف آدمی ہے اور بیچاری سرنوں بہت ہی بھولی بھالی ہے۔ اسے ان باتوں کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اب کوئی پوچھے کہ کیا ہوئی وہ شرافت ان دونوں کی!.... حقیقت کیسے چالاک نکلے یہ دونوں! سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر محبت کی پینگیں بڑھاتے رہے۔ سرنوں کو تو ناتجربہ کار سمجھ کر معاف کیا جا سکتا ہے لیکن پرتھی پال سنگھ کی حرامزدگی ناقابلِ معافی ہے۔ کس قدر پاجی پن کا ثبوت دیا ہے اس لپھٹین کے بچے نے۔ کوئی کان پکڑ کر پوچھے اس حرامزادے سے کہ جب تجھے اس لڑکی سے کوئی محبت ہی نہیں تو پھر بیچاری کی آبرو کیوں برباد کرتا ہے ——— اس طرح پالی نے اخلاق اور شرافت کا نام لے کر دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں سنا ڈالیں پرتھی پال سنگھ کو۔

ان دنوں سرنوں کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اس نے کسی سے بھی بات کرنا بالکل بند کر دیا تھا۔ نہ اس کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ سب سے زیادہ پریشان کن چیز تھی۔ وہ ہر شے سے الگ تھلگ ہو بیٹھی تھی۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے وہ اوندھے منہ لیٹی رہتی تھی۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے ایک ہوک سی اٹھتی تھی لیکن وہ اسے دبا کر رہ جاتی۔ اس کی سہیلیاں، رشتہ دار حتیٰ کہ والدین اس کے لیے بالکل اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ گھر کی گہما گہمی سے بے پروا الگ تھلگ گوشے میں منہ چھپائے رہتی۔ جب پالی دیکھتا تو اس کی کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ آنکھوں میں ریت کے ذرے محسوس ہونے لگتے۔ حالات کی نئی کروٹ پر وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔ آخر یہ بھی کوئی تک ہے لیکن آخر وہ کر ہی کیا سکتا تھا

عجیب سماج تھا یہ ..... عجیب قوانین تھے اس کے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اور پھر وہ زیادہ دور تک سوچ بھی نہیں سکتا تھا عجیب قسم کی مجبوری اور لاچاری نے اسے بے دست و پا بنا دیا تھا۔ اس نے سرتوں سے بات چیت کرنی چاہی لیکن سب بے سود کیونکہ اوّل تو وہ جواب ہی نہیں دیتی تھی اور اگر مجبور ہو کر جواب دیتی بھی تو بہت مختصر۔ ٹال مٹول۔ اس کی بے رخی دیکھ کر پالی کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ وہ سارا دن گھر میں اِدھر سے اُدھر اس طرح گھومتا رہتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہو یا کوئی شخص راہ گم کر کے ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہو۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا، ہر پل پانی کے بلبلے کے مانند بنتا اور پھر ناپید ہو جاتا تھا۔

پالا سنگھ کو بعض اوقات یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ہر شخص، ہر عورت، ہر لڑکی، ہر بچہ اپنے اپنے کام میں مگن خوش خوش گھوم رہا ہے۔ وہ لمحے جو پالی کے سینے پر چکی کے بوجھ کی مانند روندتے ہوئے گزر رہے تھے وہ ان سب لوگوں پر کچھ بھی اثر نہیں کرتے تھے۔

انسان ایک دوسرے سے کس قدر دور ہے۔

بڑے بڑے چولھے کھد گئے۔ انھیں گوبر اور بھس ملی مٹی سے لیپ دیا گیا۔ بڑے بڑے کندے ان میں ٹھونس کر ان میں آگ بھڑکا دی گئی اور ان پر بھاری بھرکم کڑاہے چڑھا دیے گئے۔ حلوائی بڑے بڑے ہاتھوں سے کھانڈ کا شیرہ پکانے لگے۔ جو کور مٹھائیاں اور نمکین مٹھڑیاں تلی جانے لگیں۔ ان کی خوشبو جو ہوا میں اڑی تو گاؤں کے کالے پیلے کتوں نے بیاہ والے گھر کا رخ کیا اور اسی کے دروازے پر بڑی بے نیازی سے اداس سنیاسیوں کی طرح دھونی رما کر ڈیرے لگا دیے۔

شگن کے روز سرتوں ایک پیڑھی پر بٹھلا دی گئی۔ سسرال سے آیا ہوا لال (ایک پھول دار کپڑا) اس پر اوڑھا دیا گیا۔ سفتو، ہرستاں، پیارو، امبیلو، پرمیو اور اس کی دیگر بے شمار سہیلیوں اور عورتوں نے اسے گھیر لیا۔ شگن یعنی ناریل، کھجوریں، کھانڈ کے مکھانے، کشمش، چھوہارے، بتاشے وغیرہ اس کی جھولی میں ڈال دیے گئے اور پھر سکھیاں مطالبہ کرنے لگیں کہ لاؤ ہمیں دو بتاشے، کشمش۔ سرتوں کو ان رسوم سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے تو وہ ہمجولیوں کی چہلوں سے بے پروا اور ان کے تقاضوں سے بے نیاز چپ چاپ بیٹھی رہی اور اپنی بے کیف آنکھوں سے زمین کی جانب تاکتی رہی اور جب انھوں نے بہت زیادہ پریشان کیا تو انتہائی روکھے پن سے اس نے کشمش، بتاشے جھولی میں سے نکال کر سب میں بانٹ دیے یہاں تک کہ اس کی جھولی خالی ہو گئی۔

سرتوں کے دل کی کیفیت کو سوائے رکھی کے اور کون سمجھ سکتی تھی۔

جب سرتوں پیڑھی سے اُٹھ کر سر نیہوڑائے اندر والے کمرے کی جانب لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بڑھی تو رکھی بھی ساتھ ساتھ ہو لی۔ اس نے سرتوں کا بے حس ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس ہاتھ کی نرمی اور لوچ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اب تو وہ ہاتھ سرد تھا ـــــ محض سرد!

اندر پہنچ کر سرتوں دھڑام سے پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی۔ رکھی سمجھی شاید رونے کو ہے۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑی رہی پھر اس نے اس کے لمبے اور بوجھل بالوں کو ایک جانب ہٹا کر اور اس کے چہرے کا رُخ پھیر کر اپنے سامنے کر لیا لیکن رونا دھرنا کہاں، اس کی آنکھوں میں نام کو بھی آنسو نہیں تھے بلکہ وہ بے غم اور بے کیف سی نظر آتی تھیں۔

رکھی نے اس کے رخسار پر ہلکے سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"سرتوں!"

سرتوں کچھ نہیں بولی اور پھر اس کے تین چار بار بلانے پر بھی جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ سرتوں کے رخسار پر رخسار رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آخر اس کی چلبلی سہیلی کو یہ کیا ہو گیا تھا بچاری پر کیا مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں سرتوں اپنی جان نہ کھو دے۔ وہ جانتی تھی کہ ایک جانب اس کی شادی ایسے انسان سے ہو رہی تھی جو در اصل اس کا اہل نہیں تھا اور دوسری طرف اس کے محبوب نے جس کے نام کی وہ مالا جپتی تھی اسے دھوکا دیا تھا۔ ایسے نازک موقعہ پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، یہ دُکھ کوئی معمولی دُکھ نہیں تھا۔ اس اذیت کو تو کچھ اسی کا دل سمجھ سکتا تھا جس کے دل پر گزر رہی ہو۔

شادی میں دو دن باقی رہ گئے تو سرتوں کو 'مایاں' بٹھا دیا گیا۔ شادی بیاہ کے موقعہ پر سارا گاؤں ہر جھمیلے سے واقف رہتا ہے چنانچہ 'مایاں' والے دن بھی کئی سہیلیاں اور رشتے دار عورتیں آن جمع ہوئیں۔ مالش والے نے کا شرب پیڑا دودھ کی لسّی میں دھو دیا گیا اور پھر لڑکی کے ماموں نے اسے ایک ایک کر کے چوڑا پہنانا شروع کیا۔ سب لوگ بڑے انہماک سے دلھن کو چوڑا چڑھتے دیکھ رہے تھے حالانکہ ابھی سرتوں کے کپڑے جوں کے توں میلے تھے۔ شاید اس نے منہ بھی نہ دھویا ہو، بال تو خیر خشک پڑے تھے۔ کلائیوں تک گوری گوری بانہوں میں سُرخ سُرخ چوڑا چڑھ جانے پر دلھن کی صورت نکھر آتی تھی۔ کئی عورتوں کے منہ سے بے اختیار تعریفی کلمات نکل گئے۔

"ہائے رو ہائے رو چوڑا کیسا اچھا پھب کر آیا ہے......"

یہ باتیں سُن کر بھی سرتوں پھولی نہیں سماتی تھی۔ وہ بیٹی کے دل سے قطعاً بے خبر نہیں تھی لیکن اس بے بس کا زور تھا۔ ہائے کسے معلوم تھا کہ یہ شادی ایسی افراتفری میں ہو گی۔ وہ خود ان چیزوں کے لیے کب تیار تھی لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا تھا۔

سرتوں اور پالی کے لیے اذیت دہ لمحے بھونڈے پن سے گزر رہے تھے یہاں تک کہ شادی کا دن آن پہنچا۔ اس روز دھرم شالہ میں بارات کے اترنے کے انتظامات مکمل کر دیے گئے۔

بیاہ والے گھر میں تقریباً سارا گاؤں جمع تھا۔ اس معاملے میں چندا کو امید سے بڑھ کر کامیابی ہوئی تھی۔ بچے بچے کی زبان پر بارات کا نام تھا۔ بارات کب آئے گی۔ پھر اندازے لگائے جاتے کہ فلاں وقت تک بارات ضرور پہنچ جائے گی۔ بالآخر دن ڈھلے بارات دھرم شالہ میں پہنچ گئی۔ ان کے ناشتے کے لیے بوندی کے بڑے بڑے تھال اور گرم گرم دودھ کے دو بھنے وہیں بھیج دیے گئے۔

باراتیوں کی خاطر و مدارات کرنے میں پالی بھی شامل تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں تیزی و تندی تو نہیں تھی لیکن وہ اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ اس کے دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ شادی ہو جائے گی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آخری وقت پر بھی کوئی ایسی بات پیدا ہو جائے گی کہ یہ شادی رُک جائے گی۔ یہ شادی ہو نہیں سکے گی۔ کس قدر عجیب خیال تھا۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن تھا۔ اس کے ذہن میں تو کوئی ترکیب آتی نہیں تھی۔ جہاں تک سرتوں کا تعلق تھا اسے کسی بات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو جیسے نہ کچھ سنتی تھی، نہ دیکھتی تھی اور نہ کچھ محسوس ہی کرتی تھی جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق ہی نہ ہو۔ جیسے وہ محض ایک بے جان پتھر ہو۔

رات کے وقت باراتیوں کو کھانا کھلانے کے لیے گھر پر آنا تھا۔ گھر کے طویل و عریض صحن میں صفیں بچھا دی گئی تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا اس لیے یہی طے پایا کہ جس قدر جلد ہو سکے باراتیوں کو کھانا کھلا دیا جائے۔

براتیوں کی آمد بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لیے لوگ بے چین ہوتے ہیں۔

بالآخر دھرم شالہ سے بارات چلی۔

جب وہ بیاہ والی گلی میں گھسے تو لوگ اپنے اپنے کچے مکانوں کی چھتوں کی منڈیروں سے انھیں تاکنے لگے۔ جب وہ مکان کے قریب پہنچے تو دیگر آدمیوں کے ساتھ بالی بھی انھیں دیکھنے کے لیے مکان سے باہر آگیا۔

باراتیوں میں لڑکے، جوان اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ گیس کی تیز روشنی میں باجے والوں کے پیتل کے ساز اور وردیاں جگمگا رہی تھیں۔ باراتی پنجابی دستور کے مطابق اچھے اچھے کپڑے پہنے رنگین پگڑیاں باندھے تھے۔ وہ لوگ زیادہ میلے کچیلے کپڑوں میں رہنے کے عادی تھے اس لیے نئے کپڑے پہنے وہ کچھ انوکھے سے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے ہاتھ میں لمبی کرپان تھمی تھی۔ بعض کے پاس موٹر یا ٹرک کے اسٹیرنگ کی نالی کی بنی ہوئی بغیر لائسنس کی دیسی بندوقیں بھی تھیں بعض نے تہمدوں کے اندر دیسی ساخت کے پستول جن میں بارہ بور کے کارتوس ہی چلتے تھے اڑس رکھے تھے۔ ان کے موٹے چمڑے کے بنے ہوئے دیسی جوتے واقعی قابلِ دید تھے۔ سفر کی وجہ سے ان میں سے بیشتر کی چھوٹی بڑی داڑھیاں گرد میں اٹی ہوئی تھیں۔

مکان کے قریب پہنچ کر بینڈ والے تو چپ ہو گئے البتہ تھوڑی سی ڈھیں ڈھیں ٹم ٹم کے بعد ڈھولکی اور چھینے بجنے لگے اور کسی نے مینڈک کی سی ٹرّاتی ہوئی آواز میں گانا شروع کیا۔

ہم گھر ساجن آئے

ساچے میل ملائے

بالی گانے والوں کے بے تحاشا کھلے ہوئے منہ کے دہانے دیکھتا رہا۔ کس قدر بڑا پاکھنڈ تھا۔

ساچے میل ملائے

انھیں یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہونی چاہیئے۔ اُدھر لڑکی کا دل رو رہا تھا، اس بے چاری کے کلیجے پہ چھریاں چل رہی تھیں ادھر یہ مردود ساچے میل ملا رہے تھے۔

بالی کا جی چاہتا تھا کہ لٹھ گھما کر ان سب کے منہ توڑ دے اور انھیں اس گلی سے اُلٹے پاؤں بھگا دے۔

ایک شبد ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا لیکن بالی کا دھیان شبدوں کی جانب نہیں تھا۔ وہ تو محض ان کی ہلتی ہوئی داڑھیوں کو دیکھ دیکھ کر ان سے نفرت کر رہا تھا۔

جب بارات کھانا کھانے کے لیے بیٹھی تو دلھن کے کھانے کی تھالی جس میں دراصل کئی لڑکیوں کے لیے کھانا موجود تھا دولھا کے پاس بھیج دی گئی۔ اس پہ پچیس روپے رکھ کر تھالی واپس لوٹا دی گئی۔ دلھن نے وہ کھانا اپنی سکھیوں میں تقسیم کر دیا۔ سب کے اصرار پر کچھ کھانا خود بھی زہر مار کر لیا۔

ادھر جب کہ باراتی کھانا کھانے میں مصروف تھے لڑکیوں نے گیت گانے شروع کر دیے اُدھر چند سہیلیوں نے سرتوں کو گھیر لیا، مہندی گھول دی گئی اور سکھیوں نے زبردستی اس کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی رچانی چاہی تو معمولی احتجاج کے بعد سرتوں ماتھے پر بازو رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں، انگلیوں کے آگے پیچھے مہندی تھوپ دی اور پھر اس کے پاؤں کے تلووں اور اس کی انگلیوں

پر بھی گاؤں گھاٹی میں منڈی رچادی۔

رات گھسکتی رہی۔

دوسرے روز علے الصبح کھارے بٹھانے کی رسم ادا کی گئی۔ دلہن کو نہانے کی چوکی پر بٹھا کر سہیلیوں اور رشتے دار عورتوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ مٹی کے بڑے برتن میں پیاری پیاری دہی لے کر دلہن کے سر پر ڈالی گئیں۔ اس کام میں ہر ایک نے حصہ لیا۔ یہ کام ہو چکا تو دلہن کو نہلایا گیا اس کے پاؤں کی میل جھانوے سے رگڑ رگڑ کر صاف کی گئی یہاں تک کہ وہ مکھن کے پیڑے کی مانند نکل آئی۔

جب نہا چکی تو اس وقت تک اس چوکی سے نہیں اتر سکتی تھی جب تک کہ اس کا ماموں اس کے ہاتھ میں کچھ رکھے نہ یا اسے گائے بھینس دینی ہی نہ دے۔ یہاں پر خوب لے دے ہوئی بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور دلہن کھارے سے اتر آئی۔

نہانے کے بعد دلہن کو کپڑے پہنائے گئے۔ کپڑوں سے دلہن کا حسن اور نکھر آیا اور پھر جھلمل کرتے زیورات نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دلہن کے حسن میں چار چاند لگ گئے۔ سر پر سونے کا چونک، کنپٹیوں پر توتیڑیاں، ماتھے پر ٹیکا، ناک میں نتھ، گلے میں سونے کا ہار، کلائیوں پر گوکھرو، کانوں میں جھمکے، غرض ہر قسم کے زیورات سے ادھر جب دلہن تیار ہوئی تو ہر ایک کی نگاہ اس پر ٹکی تھی۔

پالی نے سرنوں کو اب دیکھا تو جمال یار کی تاب نہیں لا سکا۔

اس کے بعد دلہن کو کپڑوں میں لپیٹ کر گٹھڑی سا بنا کر گورو گرنتھ صاحب کے روبرو لے گئے جہاں دولہا و دیگر لوگ پہلے سے جمع تھے۔

اب پھر شبد و کیرتن کا دور چلا بالآخر دلہن کا دامن دولہا کے دامن سے باندھ دیا گیا اور اب لڑکی کے رشتے دار گرنتھ صاحب کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ آگے آگے دولہا اور پیچھے پیچھے دلہن گورو گرنتھ صاحب کے چکر کاٹنے لگے۔ گٹھڑی بنی ہوئی دلہن کو چلنے میں کھڑے ہوئے آدمی باری باری سہارا دیتے تھے۔ اس حلقے میں خود پالی بھی کھڑا تھا۔ جب وہ سرنوں کے شانوں کو تھام کر اسے اگلے آدمی تک سہارا دیتا تو سوچتا کہ شاید سرنوں کو اس بات کا احساس ہو کہ یہ ہاتھ میرے ہاتھ ہیں۔ آج وہ سرنوں کو اپنے ہاتھوں سے ایک غیر مرد کے سپرد کر رہا تھا۔

ساری رسوم پوری ہو چکیں تو دلہن کے دولہا کو بھی اس کے سسرال والوں کے ہاں لے جایا گیا۔ وہ شخص میانہ قد اکہرے بدن اور بالکل سیدھی سادی صورت کا مالک تھا لیکن وہ بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ایک گھریلو قسم کا اپنی ذمہ داریاں سمجھنے اور پھر انہیں پورے طور سے نبھانے والا انسان۔

یہ ساری رسوم اور واقعات جو پالا سنگھ کی نظروں سے گزرے تو وہ نڈھال سا ہو گیا اس کا بدن جلنے اور ٹوٹنے لگا۔ وہ بیاہ والے گھر سے جان چھڑا کر اپنے گھر کو چلا آیا۔

دولہا کے ساتھ گاؤں کی لڑکیوں نے خوب ہنسی مذاق کیا۔ وہ سارا دن ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ شام کو رخصتی کے وقت بھائیوں نے بہن کو ڈولی میں بٹھا دیا۔

ڈولی کے اٹھتے وقت عجب دردناک سماں بندھا۔ سرنوں اپنی سہیلیوں کو بے حد محبوب تھی۔ ہر سہیلی اس کے گلے سے لپٹ لپٹ کر روئی تھی خصوصاً رکھی کو سرنوں نے اس قدر بھینچ کر گلے سے لگایا کہ علیحدہ ہونے میں نہ آتی تھی۔

پھر کمبخت یہ گھڑی بھی گزر گئی۔

دلہن پرائے دیس کو روانہ ہو گئی۔

اس گہما گہمی میں پالا سنگھ کی سارے دن کی غیر حاضری کو کسی نے محسوس تک نہیں کیا۔

ڈھول کے چلے جانے کے بعد جنداں سب سے آنکھ بچا کر گھر کے اندر آئی۔ سنسان۔۔۔۔ سنسان، جہاں پہلے اس کی چہیتی بچی کے حسن کی شمع روشن رہتی تھی اب وہاں اجاڑ ٹھٹھا رہا تھا۔

جنداں جیا۔ نے رنگ کی دیواروں کو دیکھ کر بے اختیار پھوٹ پڑی۔ وہ بچوں کے مانند دھاڑیں مار مار کر رونے لگی لیکن شور سے اس کی آواز باہر تک نہیں پہنچی۔

براتیوں کو پکی سڑک تک پہنچنا تھا۔ وہاں سے لاری میں بیٹھ کر شہر اور شہر سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر دولھا کے دیس کو جانا تھا۔

بارات ڈنگا گاؤں سے ایک میل دور نکل آئی تھی۔ رنگین کپڑوں والے آدمی لپکے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

دفعتاً ان سے کچھ فاصلے پر ویرانے میں ایک صورت نمودار ہوئی —— وہ پالا سنگھ تھا۔

وہ اس پگڈنڈی کی جانب دیکھ رہا تھا جدھر سے وہ دل میں امنگوں کی دنیا آباد کیے اپنے گاؤں کو آیا تھا اب اسی راہ سے اس کی امیدوں کا جنازہ بھی منزل کی جانب تیزی سے بڑھا جا رہا تھا۔ ڈولی اٹھائے ہوئے کہاروں کی کالی، پتلی لیکن مضبوط ٹانگیں بڑی پھرتی سے اٹھ رہی تھیں۔

لمحہ بہ لمحہ ڈولی اس کی نظروں میں دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔

ادھر وہ بھوسے کے ڈھیر کے مانند تنہا کھڑا تھا اور دوسری جانب پورا زرد چاند جھاڑیوں کی اوٹ سے طلوع ہو رہا تھا۔

راجکماری پارول

دیویندر ستیارتھی

ریڈیو پر ایک تقریر نشر کی جا رہی تھی ۔۔۔ "لوک کتھا کوئی ایک رات کی بات نہیں، وہ تو صدیوں سے سامنے ہے، وہ تو پارول کی کہانی ہے ۔۔۔ پارول جو کبھی کبھی شہزادے کی دلہن بن جانے پر بھی ٹھکرا دی جاتی تھی تو کبھی پروا سنے سے بیاہ کرنے کی چاہ دل میں لیے ہوئے کسی جگنو کی بیاہتا بن جاتی ہے یا پھر وہ کسی گاؤں کی گلیوں میں کھیلنے والی لڑکی ہے جو سوتیلی ماں کے کھیتوں میں مرجاتی ہے ۔۔۔

ادھر ننھی پارل ضد کرنے لگی" نانی ایک کہانی۔"

دن کا وقت ہوتا تو نانی اماں ٹال جاتیں کہ بیٹی مسافر راستہ بھول جائیں گے۔"

ریڈیو چلتے چلتے بند ہو گیا ۔۔۔ بجلی کی روشنی بھی چلی گئی۔ پارل کی ماں نے دیا جلا کر کھڑکی میں رکھ دیا۔

"میں نے کہا "اماں اب مزا آئے گا ۔۔۔ اب ہماری پارل نانی کی کہانی سنے گی۔"

نانی اماں نے ضد قائم رکھی کہ وہ تو بجلی کی روشنی ہونے پر ہی کہانی سنائیں گی۔

میں نے کہا "نانی اماں کی کہانی تو دیے کی لو میں ہی بھلی لگتی ہے ۔۔۔ بجلی کی روشنی میں تو اس کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔"

ایک چوتھائی صدی سے ایک دو برس اوپر ہو چلا جب میں نے اس عورت کو پہلے پہل دیکھا تھا تب وہ ادھیڑ عمر کی تھی ۔۔۔ میری ساس ۔۔۔ خیر میری ساس تو وہ اب بھی ہے لیکن تب اس کی پیشانی پر جھریاں نہ تھیں ۔۔۔ جیسے کھیت میں ہل چلنے سے لکیریں بنتی چلی جاتی ہیں یا انسان کی پیشانی پر سے کال جھریاں پیدا کر دیتا ہے۔ ان جھریوں کے پیچھے پارل کی نانی اماں کا تجربہ ہے ۔۔۔ پارل اسے نہیں سمجھ پاتی ۔۔۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ بڑھیا بھی سے کی کلاکار کی تعمیر ہے ۔۔۔ کاش میرا دماغ کی مشرقی شاعر کے اس خیال تک جا پہنچی ۔۔۔

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

بظاہر میں نے اتنا ہی کہا ۔۔۔ پل پل بیت رہا ہے ۔۔۔ وہ سب کی تعمیر کر رہا ہے ۔۔۔ وہ ہمارے تجربے کو نت نئے گہرا کر رہا ہے ۔۔۔ وہ ہمارے بھولو کو ڈھال رہا ہے ۔۔۔ وہ اس تعمیر میں تن اور روش کی نقاشی کر رہا ہے۔"

نانی گم سم بیٹھی تھی شاید سوچ رہی تھی کہ دیے کی روشنی بہت کم ہے بجلی کی روشنی کا انتظار تھا۔

بڑی مشکل سے نانی اماں کے لب کھلے اور انھوں نے کہا" کون سی کہانی سنو گی پارل؟" اب پارل کو تو کہانی چاہیے ۔۔۔ راجہ کی

کہانی دوبارہ لے جنگل کی۔۔۔

میں نے کہا: "پارل تو آج وہی کہانی سنے گی۔ گوری چندرمکھی اور بکماسی کی کہانی"

"وہ تو کل آپ نے پوری سنا دی تھی ہوں" نانی اماں نے جواب دیا۔

میں نے زور دے کر کہا کہ "یہ سنے کیا بگڑتا ہے ... " میرا اس جملے تو دبے کی روشنی میں ہی پارل کو نانی اماں کی کہانی سننے کے لیے تیار کر دوں۔

نانی اماں نے ہنس کر میری بات پر پانی پھیر دیا: "میں تو کل کا جھن دبانے ہوئے بھی وہی پرانا بول منہ سے نکالتی ہوں ——— بابا جی چلے بنیس بلا ٹلے"

"نانی سناؤ نا کہانی" پارل نے اپنی ننھی دنیا سر کرنے کے انداز میں کہا۔

میں نے کہا: "چین دیش کا ایک سیانا آدمی کہہ گیا ہے کہ اس سنسار میں ندیاں بہت زیادہ ہیں اور پل کم"

"ہم الجھ کر رہے ہو" پارل کی نانی نے ڈانٹ پلائی۔ "تم یوں ہی بیٹے رہے تو پارل کہانی سن چکی ——— ویسے کہانی تو ندی کی بھی ہو سکتی ہے اور پل کی بھی"

میں نے کہا: "آج تو وہی کہانی سنے گی ہماری پارو ——— اس راجکماری کی کہانی جس کا بیاہ نہ ہو سکا"

"اس کا تو ٹکٹ لگے گا" نانی اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب شروع بھی کرو نا وہ کہانی" پارو کی ماں نے سویٹر بنتے ہوئے کہا۔ "کہانی سنانا تو اتنا کٹھن نہیں جتنا سویٹر بننا"

"نانی اب سناؤ بھی" پارل نے نانی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

دیے کی لو میں نانی اماں کی ناک نہ جانے کیوں اتنی اوپر کو ابھری ہوئی دکھائی دی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جیسے ان کی کلپنا کی سوئی بہت پیچھے گھوم گئی ہو۔

پارل نانی اماں کے قریب ہو گئی جیسے وہ کھڑکی سے نظر آ رہے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنا چاہتی ہو کہ چاند کی ماں ابھی چرخہ کاتتے کاتتے تھک کیوں نہیں گئی۔

نانی اماں کہتی چلی گئیں: "بہت پہلے کی بات ہے ——— بہت دور دیش کی بات ہے ——— وہاں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ جس نے راجکمار کا بیاہ ایک چندرمکھی سے کر دینا طے کیا ——— روپ ایسا جیسے گلاب کی پتی، پتلی پتلی انگلیاں ——— نرم نرم ہاتھ ——— نین سے کنول کے ادھ کھلے ——— من کے بھاؤ نینوں میں جھلکتے رہتے اور راجکمار کو لگتا کہ کہیں دور سے کوئی راگنی سنائی دے رہی ہو۔ ایک دن کیا ہوا جب راجکمار صبح سویرے نیند سے جاگ کر اٹھ بیٹھا تو اس نے دیکھا کہ چندرمکھی کے کنول نینوں میں وہ پہلی سی جوت اجاگر نہیں ہے ——— وید بلائے گئے، سیانے آئے، علاج کیا لیکن راجکماری کے کنول نینوں میں جوت لوٹ کر نہ آئی۔

"جوت کہاں چلی گئی نانی؟" پارل نے تھاپ لگائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آج نیند غائب ہو چکی ہے۔

"پھر کیا ہوتا تھا" نانی اماں کی جھریوں میں جیسے کوئی جوت جگمگا اٹھی۔

"ہاں تو راجہ نے ڈگی بجانے والے کو بھیج کر گاؤں گاؤں منادی کرائی کہ اگر کسی کو آنکھوں کی جوت لوٹانے کا گُر آتا ہو تو وہ آئے اور

یہ کام کر دکھائے اور منہ مانگا انعام پائے۔"

"اور یہ خبر سن کر کوئی نانند راجہ کے دربار میں چلا آیا ہوگا؟" یہ بھی چپ نہ رہ سکا۔

"تم لوگ بیچ میں بولو گے تو میں کہانی بند کر دوں گی۔" نانی اماں نے پھر سے کہانی کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے کہا "ہاں تو منادی سن کر کوئی بنسری والا آیا اور وہ راجکماری کے نین دیکھ کر بولا "یہ تو کوئی روگ نہیں ہے مہاراج ۔۔۔ پہلے جوت ہماری آنکھوں میں آتی ہے اور پھر دور چلی جاتی ہے ۔۔۔ جہاں سے وہ آتی ہے ۔۔۔ یہی سنگیت کا حال ہے وہ بھی جہاں سے آتا ہے وہیں چلا جاتا ہے ۔۔۔ خاموشی سے جنم لیتا ہے سنگیت اور خاموشی میں ہی غائب ہو جاتا ہے ۔ سو مہاراج اب تو ایک ہی اپائے ہے ۔۔۔ پہلے کا رنگ، پریم کی جوت اور آشا کا سنگیت یہ سب جا کر راجکماری کے ان نینوں میں انڈیلئے اور پھر اس کا پرکار دیکھئے۔"

"پھر جوت آگئی نانی؟" پارل مسکرائی "اور پھر راجکماری کا بیاہ ہو گیا ۔۔۔؟"

"واہ میری راجکماری" نانی اماں نے پارل کا منہ چوم لیا "آگے سنو! بنسری والے نے راجکماری کے قریب ہو کر دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کا جتن کیا اور جواب میں راجکماری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھے۔

راجکمار نے بنسری والے کا بازو جھنجھوڑ کر کہا "تیرا مطلب ہے کہ میں اسے پریم نہیں کرتا"۔۔۔ اور پھر بنسری والے کو باہر نکال دیا گیا۔

پھر منتری بولا "راجکمار میں مہاراج سے بینتی کروں اور راجکماری ڈھونڈ کر لاؤں گا" راجکمار کو یہ بات اچھی نہیں لگی اور منتری کو اگلے وقتوں کے کسی سیانے کی بات یاد آئی کہ سب سے مورکھ ہے وہ جو کہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔"

"پھر نانی ۔۔۔؟" صوفے پر بیٹھے بیٹھے پارل نے نانی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پھر دربار میں ایک جوتشی آیا اور راجہ سے کہا ۔۔۔ مہاراج! راجدھانی کی شکل میں بہنے والی ندی کے اس پار رہتا ہے ایک گیانی ۔۔۔ مہاراج اس سے تھوڑا سا امرت مانگ لائیے ۔۔۔ وہ امرت راجکماری کی آنکھوں میں ڈالنے سے پھر وہی جوت لوٹ آئے گی ۔۔۔ اور راجکمار نے منتری کو ساتھ لے کر اس گیانی کی تلاش میں نکل پڑا۔"

رات کی لو ٹمٹا رہی تھی۔ نانی اماں عجیب سی لگتی تھیں جیسے انھیں زندگی کی بلندی کا پوری طرح احساس ہو جیسے ان کا قد پہلے سے اونچا ہو گیا ہو۔ پارل کی ماں کو سویٹر بننے سے فرصت نہ تھی اور پارل تھی کہ نانی اماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی۔

نانی اماں کہتی چلی گئیں "یہ گیانی اور کوئی نہیں تھا ۔۔۔ وہی پرانا بنسری والا ہی تھا جو اپنی بنسری کے جادو سے راجکماری کی سوئی محبت کو جگا کر خود پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب راجکمار کو تو اس بات کا علم نہ تھا۔

راجکمار نے پوچھا "آپ کے برتن میں کیا ہے بھگوان؟"

اور برہم گیانی نے جواب دیا "پریم اور آنند"

راجکمار بولا "میں تو امرت کی چند بوندیں چاہتا ہوں اپنی ہونے والی رانی کی آنکھوں میں ٹپکانے کے لیے"

گیانی بولا "اس امرت کا تو مول دینا ہوگا"

راجکمار نے پوچھا "کیا مول لوگے ۔۔۔؟"

گیانی نے مسکرا کر کہا "ایک بوند پریم کے بدلے دینا ہوگا سنگھاسن ۔۔۔ اور ایک بوند آنند کے بدلے اپنا سارا گھمنڈ"

راجکمار آگ بگولا ہو گیا۔ بولا: "اے وحورت! تو اپنے راجکمار کے جیتے جی راجی تیاگ نہیں کر سکتا—؟"

کہتے کہتے نانی اماں چپ ہو گئیں۔ پارل نے جھٹ کہا: "آگے چلو نانی!"

"راجکمار نے حکم دیا کہ اس بھک منگے گیانی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر جیل میں ڈال دو۔"

"ہوں!" میں نے ہنکارا بھرا۔

پارل بہت قریب آ گئی — جیسے اس نے آج مجھے بھی بچے کے روپ میں دیکھ لیا ہو—

پارل کی ماں نے ہنس کر کہا: "نانی اماں کی کہانی تو سوا لاکھ کی ایک ہی کہانی ہے جیسے یہ ایک ناؤ ہو اور ان گنت صدیوں کے دھارے میں بہتی ہوئی ہم تک آ پہنچی ہو۔"

دیے کی لو میں ماتھے کی جھریوں والی نانی اماں آج روایت اور آج کے سنگم پر ایک مورتی کی طرح بیٹھی تھیں۔ میری کلپنا میں ریڈیو پر سنی ہوئی اس تقریر کی طرف گھوم گئی کہ لوک کتھا کوئی ایک رات کی بات نہیں—

نانی اماں کی شخصیت میرے تن من پر چھائی ہوئی تھی۔ انھیں بھانت بھانت کی کہانیاں یاد تھیں۔ وہ جب بھی کوئی کہانی سناتیں اس میں نئی تعبیر کا رس رچا رہتا۔ کہانی کے آنچل کو وہ جتنا چاہتیں لمبا کرتی جاتیں جیسے وہ اپنے چرخے پر سوت کا لمبا تار نکال رہی ہوں— کہانی ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اسی کی آرتی اتارتیں، اسی کا پانی بھرتیں— ایک کہانی کی لو سے وہ جیسے سو سو دیے جلاتی جاتیں۔

مجھے یاد آیا کہ ریڈیو پر نشر کی ہوئی تقریر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ لوک کتھا تاریخی اوراق کا درجہ رکھتی ہے۔

پارل کی آنکھوں میں نیند کا بوجھ آ چلا تھا۔ وہ صوفے پر لیٹ گئی— شاید اس نے سوچا کہ کہانی ختم ہو گئی— اس نے دوبارہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اب جاگتے رہنا اس کے بس کا روگ نہیں—

بہت جلد پارل سو گئی اور اس کی ماں ہنس کر بولی: "چلو پارل تو سمندر کی آگ بجھانے چلی گئی—" پارل کی نانی اماں نے پوپلے منہ سے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "میں تو آج پوری کہانی سنوں گا۔"

"اے بیٹا مجھے اب ہلکان نہ کرو۔" پارل کی نانی اماں نے ٹالنا چاہا۔

"چلو سنا دو ماں!" پارل کی ماں نے سویٹر بنتے بنتے میری سفارش کی۔

"اچھا تو آج تو بھی پارل ہو گئی۔" نانی اماں ہنس پڑیں۔

میں نے کہا: "تمھاری کہانی کا مول میں ایک کہانی سنا کر چکا دوں گا۔"

"تو پہلے تم سناؤ وہ کہانی — پیچھے سو گئے تو میں کس سے شکایت کروں گی۔"

"تو لو ایک کہانی۔" میں مسکرایا۔

"ہوں!" نانی نے ہنکارا بھرا۔

میں نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ صوفے سے ٹیک لگائی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا—

"یہ کہانی بہت پرانی ہے— کوہ قاف کی کہانی ہے— ایک پری کی کہانی بس یہ سمجھ لو کہ سامنے کوہ قاف کی ایک جھیل ہے—

جھیل کے کنارے کنارے چاروں طرف اونچے پیڑ کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ لٹکنے لٹکنے پیڑ ہیں جن کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں۔ ٹہنیوں نے ایسا جال پھیلا رکھا ہے کہ ان میں سورج کی کرنیں نہیں گزر سکتیں۔ اس جھیل میں ہر سمے تیرتی رہتی ہے ایک ناؤ اور اس ناؤ میں ہر سمے بیٹھی رہتی ہے ایک راجکماری۔ ——— اب یہ سمجھ لو کہ اس گھور اندھیارے میں رہتے رہتے راجکماری اوبھ گئی۔"

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں نے ہنکارا بھرا۔

"ہاں اب تو پارل بن گئی" پارل کی ماں نے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "کیا بُرا ہے اگر نانی اماں پارل بن جائیں ——— نانی اماں کی بھی تو کوئی نانی اماں رہی ہوں گی اور پھر لوک کتھا کوئی ایک رات کی بات تو نہیں ——— سنہری سنہری لوک کتھا ہے ——— سہل رواں اور راگنی سی پیاری پیاری ——— شاید پارل کی نانی اماں کوہ قاف کی اس لوک کتھا کے سات پاتال میں اتر کر کوئی نیا مطلب ڈھونڈ لائیں۔"

"ا[illegible]ے بیٹا! میں تو ان پڑھ ہوں ——— اب اس بڑھاپے میں کیسے اتروں گی اتنا نیچے سات پاتال میں؟"

"یہ تمھیں کہانی نہیں سُنائیں گے۔" پارل کی ماں ہنس پڑی۔ "نانی اماں کی کہانی تو کوئی نانی اماں ہی سُنا سکتی ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے مجھے کوہ قاف کی وہ کہانی نہیں آتی؟" میرا تاؤ میں آ گیا اور میں نے پارل کی ماں کی طرف دیکھ کر کہا: "تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں نے پارل کا نام ایک لوک کتھا سے ہی لیا ہے۔"

"مجھے پارل نام بالکل ناپسند ہے۔" پارل کی ماں جھنجھلا کر بولی۔ "تم نے شروع میں بتا دیا ہوتا کہ پارل کے ساتھ وہ منحوس سی لوک کتھا جڑی ہوئی ہے تو میں ہرگز یہ نام نہ رکھنے دیتی۔ بھلا کوئی بات ہوئی کہ بنگال کی لوک کتھا کی اس لڑکی کا نام پنجاب میں لا کر اتنی پیاری باتیں کرنے والی لڑکی کے ماتھے باندھ دیا جائے۔"

"وہ کون سی کہانی ہے؟" پارل کی نانی اماں نے اچرج سے پوچھا۔

"اب تم فیصلہ کر لو کہ پہلے کوہ قاف کی کہانی سناؤں یا بنگال کی وہ کہانی جس سے پارل کا نام لیا گیا؟"

"پہلے بنگال کی سُناؤ۔" نانی اماں مسکرائیں۔

"وہ کہانی تو بس اتنی سی ہے کہ ایک سوتیلی ماں نے اپنی سوت کی اکلوتی بیٹی اور سات بیٹوں کو مار کر کہیں دور گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ وہ بیٹی ایک پھولدار پودا بن گئی جس پہ پارل کے سفید پھول کھلتے تھے ——— اور سات بھائی چمپا کے سات پودے بن گئے۔ بنگال میں نانی اماں کے منہ سے اکثر وہ بول نکل جاتا ہے ——— سات بھائی چمپا جاگو ——— کینو بون پارل ڈاکو ——— مطلب یہ کہ پہلے پارل آواز دیتی ہے، سات بھائی چمپا جاگو ——— اور اس کے جواب میں سات بھائی چمپا پوچھتے ہیں، کیوں بہن پارل تم ہمیں کاہے کو بلا رہی ہو؟ اب پارل نام مجھے اس لیے اچھا لگا کہ لوک کتھا میں وہ لڑکی مر کر بھی مری نہیں تھی۔"

"میرا بس چلے تو پارل نام بدل ڈالوں۔" پارل کی ماں نے سوتی پارل کا منہ چوم لیا۔ "اتنی پیاری بیٹی اور یہ منحوس سا نام۔" اور اس نے دوبارہ پارل کا منہ چوم لیا۔

نانی اماں ہنس کر بولیں: "سوتے ہوئے کا منہ چومنا بھی کیا۔ منہ چومنے والے کو مزا آئے تو جس کا منہ چوما جائے اس کو بھی لطف حاصل ہو۔ پارل جاگ رہی ہوتی تو میں اس کا منہ چوم لیتی اور اسے پارل پھول والی کہانی سناتی۔"

پارل کی ماں نے ہنس کر کہا: "تب تو کبھی کا یہ نام بدل ڈالتی۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہ کہانی سُنا کر انھوں نے پارل کو بھی راضی کر لیا۔ اب اسے بھی دوسرا نام پسند نہیں۔"

"کہانی کی ایسی ہی بات ہے بیٹی" نانی اماں نے دیے کی ٹمٹماتی لو کے قریب آنکھیں لے جا کر کہا۔ "پارل جس کا روپ ہے وہ سچائی کتنی بڑی ہے — کہانی کی راجکماری مر کر بھی پھولدار پودا بن جاتی ہے۔ اصل بات تو یہی ہے کہ آدمی اپنا روپ پہچان لے — ایک کہانی اور دوسری کہانی۔ بکا ہی پہنچی جیون گنگا — کیوں میں کچھ جھوٹ کہتی ہوں؟ پر بیٹیا میں تو ان پڑھ ہوں۔"

"کچھ بھی ہو — میں تو یہ نام بدل کر چھوڑوں گی۔"

پارل کی ماں نے پارل کی آنکھوں پر جھک کر کہا: "کیسے سو رہی ہے جیسے سچ مچ سپنے میں آگ بجھا رہی ہو۔"

"اب وہ کوہ قاف کی کہانی سناؤ نا بیٹیا" پارل کی نانی اماں مسکرا کر بولیں۔

"ہاں تو گھور اندھیرے میں رہتے رہتے کوہ قاف کی اس جھیل کی وہ راجکماری پارل اوب گئی۔"

"راجکماری پارل!" پارل کی ماں نے چونک کر کہا "اسے بھی تم نے بنگال کی لڑکی کا نام دے ڈالا۔"

"اب سُنو تو" میں نے زور دے کر کہا: "نام تو یہ کیا رکھا ہے؟ ہاں تو کوہ قاف کی اس جھیل کی راجکماری پارل نے ٹمٹماتے ٹمٹماتے پیڑوں کی ٹہنیوں پر چمکنے والے جگنوؤں سے کہا میرے لیے روشنی کی ایک کرن تو لے آؤ۔" جگنوؤں نے یہ بات ان سُنی کر دی۔ راجکماری پارل دوبارہ اپنی بات دہراتے ہوئے بولی: "روشنی کے پہاڑ سے میرے لیے روشنی کی ننھی منی کوئی پیاری سی کرن لیتے آؤ۔" اب کے پھر پارل راجکماری کی التجا گویا پتھر کے ٹکڑے کی طرح جھیل میں ڈوب گئی۔ ایک دن شام اتر آنے پر راجکماری کے پاس پروانوں کی ایک ٹولی آئی۔ راجکماری پارل بولی تم سب سے جو کوئی بھی میرے لیے روشنی کی کرن لیتا آئے گا میں اسی کے ساتھ بیاہ کر لوں گی۔"

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں چپ نہ رہ سکیں۔

"پھر کیا ہونا تھا پروانے چاروں کھونٹ پھیل گئے اور ہر دیے پر جل جل کر راکھ ہونے لگے۔"

"ہوں!" پارل کی ماں بھی ہنکارا بھرے بنا نہ رہ سکی۔

"اچھا تو تم بھی رس لے رہی ہو۔ دن مہینے برس بنتے چلے گئے۔ برس اور صدیاں نہ جانے کتنے جگ بیت گئے — ایک بھی پروانہ راجکماری پارل کی ناؤ کے کسی کونے پر روشنی کی کوئی کرن نہ لا سکا۔"

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"ایک دن ایک جگنو نہ جانے کہاں سے اس جھیل کے کنارے آ پہنچا — راجکماری پارل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا — اس نے پریم بھاؤ سے بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا: "جگ جگ جیو تم جگنو آؤ — واہ میرے پروانے — آخر تم میرے لیے روشنی کی کرن لیتے آئے۔" لیکن جگنو بیچارہ راجکماری پارل کی بات کیا سمجھے وہ اُڑ نہ سکا، اب وہ راجکماری پارل کی بانہوں میں تھا — راجکماری پارل نے اس کے ساتھ بیاہ کر لیا اور زندگی آرام سے گزرنے لگی — ادھر بیچارے پروانوں تک راجکماری پارل اور جگنو کے بیاہ کی خبر کون پہنچانے جاتا۔ پروانہ تو آج بھی دیے کی لو پر جل کر راکھ ہونے کو تیار رہتا ہے — اس کے من میں ایک ہی اُمنگ ہے کہ وہ کسی طرح جیسے کیسے اڑ سکے اور راجکماری کی شرط پوری کر کے اس سے بیاہ کر لے۔"

پارل کی ماں نے ننھی پارل کا سر چوم لیا — دیے کی لو پر پروانے بھسم ہو رہے تھے۔

"یہ کہانی میں نے پہلی بار سنی ہے بیٹا۔" پارل کی نانی اماں کہتی چلی گئیں "کل میں یہ کہانی پارل کو سناؤں گی۔ اچھا تو اب میری کہانی کی طرف آؤ۔ اس بے رحم گیانی کو بیڑیوں اور ہتھکڑیوں سے جکڑ کر اسی روز جیل میں ڈال دیا گیا۔ اگلے روز جب راجکمار جیل دیکھنے گیا تو دیکھا کہ بے رحم گیانی کے جسم کے چیتھڑے پڑے ہیں یا پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ اور دیوار پر یہ سندیسہ لکھا تھا ۔۔۔ "تیرے ظلم کا تیرے پاس یہی جواب ہو سکتا تھا ۔۔۔ تیرے قانون کے بندھن میں جو جیو آزاد تھی سب سے چھوٹ کے جا رہا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟" پارل کی ماں جیسے سچ مچ دوسری بار سہم گئی ہو۔

"پھر کیا ہونا تھا" نانی اماں نے کہانی کو آگے بڑھایا "راجکمار کے غصے کا ٹھکانا نہ تھا۔ محل میں لوٹ کر کہا 'پتھر پڑیں راج محل میں' اور پھر راجکمار ایک سندری چندر مکھی کی تلاش میں کامیاب ہو گیا۔ راجکمار کے بیاہ میں پربھی اور دو کنول جیسی ہوئی چندر مکھی راجکماری ۔۔۔" کہتے کہتے پارل کی نانی اماں چپ ہو گئیں۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑی بیتابی سے پوچھا۔

پارل کی نانی اماں نے بات کا رخ بدل کر کہا "کوہ قاف کی اس جھیل کی وہ راجکماری پارل تو کبھی نہ روتی ہو گی۔"

"وہ کیوں روتی؟" پارل کی ماں بول پڑی "ارے اس کا تو بیاہ ہو گیا ۔۔۔ دیکھو بیاہ تو ایک بار ہی ہوتا ہے۔"

"پھر پروانوں کو اس کے بیاہ کی خبر کیوں نہ ملی؟" پارل کی نانی اماں نے جیسے درد کی ٹیس سہتے ہوئے کہا "پروانے بیچارے تو راجکماری پارل کے بے روشنی کی کرن سے جانے کے جنون میں آج تک جل رہے ہیں۔ جگنوؤں نے پروانوں کو دھوکا دیا ۔۔۔ اس دھوکے کا راجکماری پارل کو پتہ چل گیا ہوتا تو وہ ضرور پروانوں کے سبب رو رو کے اندھی ہو جاتی۔"

"اس کو چھوڑو" میں نے کہا "دونوں کہانیاں الگ الگ ہیں۔"

"میں تو الگ الگ نہیں مانتی" پارل کی نانی اماں نے گمبھیر ہو کر کہا "میں تو سوتیلی ماں کے ہاتھوں مر کر پھول دار پودا بن جانے والی لڑکی کی کہانی کو بھی اسی کہانی کی ایک کڑی سمجھتی ہوں ۔۔۔ میری اس کہانی کی کنول جیسی چندر مکھی راجکماری تو تارے گنتی آنسو بہاتی راجکمار کے بیاہ سے پہلے ہی اندھی ہو گئی۔ بیچاری راجکماری اندھی ہو گئی" پارل کی ماں سوتی پارل پر جھک گئی اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "ان کی عقل نہ جانے کہاں چرنے چلی گئی تھی جب انھوں نے اتنی پیاری لڑکی کا نام پارل رکھ دیا۔"

میں نے کہا "عجب دیا مجھ جانے گا اور یہ مٹی مٹی میں مل جائے گی اس وقت بھی میں کھل رہا ہوں گا ۔۔۔ جیسے بنگال کی لوک کتھا میں پارل راجکماری بار بار کھل اٹھتی ہے۔ پارل راجکماری کی انگلی پکڑ کر میں بہت دور تک چلوں گا ۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ میں چلتا ہی رہوں گا اور میں تو پارل راجکماری کی طرح مر مر کر ۔۔۔۔۔۔"

"ارے بیٹا ایسا بول منہ سے نہیں نکالتے ۔۔۔" نانی اماں نے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "تم جگ جگ جیو ۔۔۔۔۔۔"

اتنے میں بجلی آ گئی اور تھوڑی دیر بعد ریڈیو بجنے لگا۔

پارل راجکماری سوتے سوتے بڑبڑا رہی تھی جیسے سمندر کی آگ بجھانے کے بعد اب مچھلیوں کی راجکماری سے اپنا تعارف کرا رہی ہو۔

———

مومی مورت

صالحہ عابد حسین

دسمبر کی ایک سرد و سیاہ رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تابناک تاروں اور پورن ماشی چاند کے روشن چہرے کو سیاہ بادلوں کی نقاب نے چھپا رکھا تھا۔ کبھی کبھی بجلی زور سے تڑپتی تو اس کی تیز چمک دھرم پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے مسافروں کے سردی اور خوف سے تنے ہوئے چہروں اور ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو نمایاں کر دیتی اور دم بھر میں پھر وہ اسی تاریکی کا جزو بن جاتے ——— دور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکلتی ہوئی دھیمی روشنی کا دھندلا سا عکس البتہ کچھ مسافروں کے ہیولوں کو اجاگر کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی دھیمی کراہ یا بیزار بڑبڑاہٹ اس خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔

زور کا ایک تڑاخا ہوا ——— بجلی کی ایک لہر پتلے لمبے پلیٹ فارم پر بیٹھے لیٹے ٹھٹھرے مسافروں کے طرح طرح کے چہروں کی بلائیں لیتی ہوئی نکل گئی اور ساتھ ہی بادل کی زور کی کڑک نے دلوں کو دہلا دیا ——— کڑک کی آواز میں ملی ہوئی ایک نسوانی چیخ فضا میں گونجی اور کئی مسافروں نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا......... مگر آواز پلیٹ فارم کے آخری کونے سے آتی معلوم ہوتی تھی ——— اس لیے وہ سب سکڑ کر لپٹ کر بیزار ہو کر اونگھنے لگے۔

ایک بڑے سے بکس پر بیٹھا ہوا کوئی مسافر کھڑا ہو گیا ——— دھیمی سی آواز میں اس نے کہا: "خاں صاحب ——— میں ذرا ادھر جا کر دیکھوں کس کی چیخ تھی یہ......؟" اور قدم آگے بڑھ گئے۔

"بی بی جی ——— میں بھی چلتا ہوں" دوسری بھاری آواز نے کہا اور ایک لمبا تڑنگا ہیولا زمین پر سے اٹھ کھڑا ہوا تو ——— ایسا معلوم ہوا جیسے سارے پلیٹ فارم پر چھا گیا ہو...... اور آگے جانے والی کے پیچھے لپکا۔ خاموشی اور اندھیرے میں سبک قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ بوجھل فوجی بوٹوں کی یہ آواز عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

بجلی پھر چمکی ——— اور چند گز پرے زمین پر پڑی ایک گٹھڑی میں سے ایک دردناک کراہ کی آواز پھر سنائی دی "آ ——— ہ ———" عورت لپک کر آگے بڑھی اور گٹھڑی پر جھک کر آہستہ سے بولی "کیوں جی ——— تم کون ہو ——— تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

ایک دلدوز کراہ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

وہ اور جھکی اور منہ سے چادر ہٹانے لگی ——— دور کہیں بجلی کی چمک ہوئی اور اس روشنی میں ایک نوجوان عورت کا چہرہ نظر پڑا جو کرب شرم

اور خوف سے بالکل سفید پڑا ہوا تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ابل کر معلوم ہوتا تھا باہر نکل پڑیں گی ——— بس ایک لمحہ کے لیے یہ شکل نمایاں ہوئی اور پھر تاریکی میں ڈوب گئی۔

وہ اب اکڑوں اس کے پاس بیٹھ گئی اور پھر پوچھا "بہن ——— بہن ——— کچھ تو بولو ——— تمہیں کیا تکلیف ہے ———؟"

اس نے جواب دینا چاہا ——— میں ——— میں ——— آہ ——— مگر بات پوری نہ کر سکی اور ایک کرب کے عالم میں اس کا سارا جسم ٹوٹنے لگا ——— عورت نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس کی مٹھیاں اتنے زور سے بھنچی ہوئی تھیں جیسے ہسٹریا کے شدید دورے میں ——— پتھر کی طرح ایک سخت ہاتھ اس کے نرم و نازک ہاتھ میں تھا ——— اس نے گھبرائی آواز میں پکارا "خانصاحب ——— یہ بیچاری شاید بیہوش ہے ——— ذرا ایک گرم چادر اور میرا کمبل اور ٹارچ تو لے آؤ ——— جلدی ———"

"اور آپ یہاں اکیلی ڈریں گی نہیں؟"

"وقت ضائع مت کرو ——— جلدی جاؤ ———"

وہ اُدھر بھاگا ——— بجلی پھر تڑپی۔ اسٹیشن کی ٹین کی چھت پر اولوں کی ٹپ ٹپ ——— اس کے دل کی ٹک ٹک کا مقابلہ کر رہی تھی ——— اس نے دیکھا کہ مریضہ کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ——— وہ بیہوش نہیں معلوم ہوتی۔

"بہن ——— ذرا سنبھلو ——— مجھے بتاؤ تو تمہیں کیا تکلیف ہے ——— کہیں درد ہے ——— سردی لگ رہی ہے ———؟ بخار ہے ———؟"

"آہ ——— کیا بتاؤں ——— بیگم بہن ——— میرے ——— میرے ——— درد ——— ہو رہا ہے ———"

"کہاں ——— سینے میں؟"

"نہیں ——— پیٹ میں ——— آہ ——— اوہ ———"

"کیا تم بالکل اکیلی ہو بہن ——— کوئی ساتھ نہیں ———؟"

"نہیں میرا ——— کوئی ——— نہیں ——— اس دنیا میں کوئی نہیں ———"

اور درد و کرب کی پھر ایک تیز لہر آئی ——— اس کے ہاتھ جو چند منٹ کے لیے نرم پڑ گئے تھے پھر اکڑنے لگے اور دوسری عورت کی انگلیاں اس کے ہاتھوں کی گرفت میں اس طرح آگئیں جیسے شکنجے میں کس دی جاتی ہیں ——— خود اس کے منہ سے دھیمی سی آہ نکل گئی ——— وہ حیران تھی ——— یہ کیسا درد ہے ——— کیسی تکلیف ہے!!

چند سیکنڈ بعد اس کی انگلیاں مریضہ کی گرفت سے آزاد ہوئیں تو اسے ایسا لگا جیسے دو چار ٹوٹ گئی ہوں ——— مگر اس وقت اپنی انگلیوں کی فکر کا وقت کہاں تھا ——— اس نے دوبارہ پوچھا "بہن میری کچھ نہیں ——— کیسا درد ہے یہ ——— کب سے ہے ———؟" وہ جواب کے لیے اس پر بالکل جھک گئی تھی۔ شرم اور درد اور بے کسی میں ڈوبی ہوئی ایک آواز اس کے کان میں آئی "درد ——— آہ کیا بتاؤں ——— میں ——— مجھے ——— میں ——— بدبخت ——— آہ ——— آپا ——— مجھے ——— درد ——— درد ——— لگے ہیں ———"

ایک منٹ کے لیے اس کا دماغ چکرا گیا ——— "درد لگے ہیں؟ درد لگے ہیں؟ کیا مطلب؟" اور بجلی کی تڑپ کے ساتھ اس کے دماغ میں ادراک کا ایک کوندا لپکا اور ساری حقیقت اس کی سمجھ میں آگئی۔

اسی وقت خانصاحب ٹارچ اور کمبل لے کر پہنچ گئے۔

لپک کر اس نے کمبل لیا اور تڑپتی عورت کو چاروں طرف سے اس میں لپیٹ کر جھک کر اس سے بولی "بہن — گھبراؤ نہیں — اللہ مالک ہے — دیکھو میں ابھی کچھ انتظام کرتی ہوں —"

وہ اپنے سامان کی طرف واپس پلٹی۔ چاروں طرف ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر زیادہ مسافر نہ تھے — اکا دکا آدمی ادھر ادھر بیٹھے یا بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ایک کونے میں اپنے پرانے سے بکس کا سہارا لیے بیٹھے سے برقعہ میں ملفوف اس نے ایک عورت کو اونگھتے ہوئے دیکھا تو لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اس کا شانہ ہلایا "اے بہن ذرا سننا"

گھبرائے لہجے میں چونک کر جواب ملا "کیا ہے بی بی کیوں مجھے سوتے سے جگا رہی ہے — واہ —"

"دیکھنا بہن — وہ ادھر — اس کونے میں — ایک عورت بیچاری بیمار ہے — میں اس کے لیے کچھ انتظام کرنے جا رہی ہوں اتنی دیر تم اس کے پاس جا بیٹھو بہن —" اس نے خوشامد کے ساتھ کہا۔

"اے واہ — میں نا جاؤں — جانے کون ہے کون نہیں — پھر اللہ جانے کون بیماری ہے اسے —"

اس نے جھک کر کان میں کچھ کہا۔ عورت کے لہجے میں فوراً تبدیلی آگئی "ہے ہے — توبہ توبہ — بے چاری — اس کے ساتھ کوئی تو ہوگا نا —؟"

"کوئی بھی نہیں اس کے ساتھ تو۔ اور ابھی بالکل نو عمر ہے مشکل سے ۱۸، ۱۹ برس کی ہوگی —"

"ٹھہر تو — تو —" اور برقعہ سنبھالتی عورت کھڑی ہو گئی "یہ تو بڑا مزے سے سو رہا ہے —" اس نے کوئی دو سوتی میں لپٹے ایک دیہاتی مرد کی طرف عجیب انداز سے دیکھا

"وہ ادھر اس کونے میں چلی جاؤ۔"

برقعہ والی سٹرپ سلیپر گھسیٹتی اس طرف روانہ ہوگئی۔

خانصاحب پیچھے کھڑے غور سے اپنی مالکن کو دیکھ رہے تھے۔ آخر یہ کرنا کیا چاہتی ہے — وہ چند لمحے ماتھے پر ہاتھ رکھے جیسے کچھ سوچتی رہی اور پھر پلٹی "چلو خانصاحب اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں میرے ساتھ —"

"اسٹیشن ماسٹر بڑا کھراب دماگ آدمی ہے بی بی — وہاں جا کر کیا کرنا ہے — ہم دو بار جا کر خوشامد کیا — کہا ہماری بی بی جی سردی میں سکڑ رہا ہے — پر — سالا مانتا ہی نہیں — فسٹ کلاس کا ٹکٹ مانگتا ہے —"

اس نے خان کی بڑبڑاہٹ پر کوئی توجہ نہیں دی اور تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھی جس میں سے روشنی کی ہلکی سی لکیر یوں اس انداز سے نکل رہی تھی جیسے کسی مایوس دل میں آشا کا مدھم سا دیپک ٹمٹما رہا ہو۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

پرانی وضع کی ایک لمبی سی آرام کرسی پر نوجوان اسٹیشن ماسٹر پڑا اونگھ رہا تھا اور برابر کی میز پر ایک اندھی لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔

کسی عورت کی نرم رسیلی التجا آمیز آواز نے جیسے اس کے کانوں میں رس گھول دیا — دل میں گدگدی ہونے لگی — اس وقت — آدھی رات کو یہ کون ہے جو اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ جوش اور مسرت سے کانپتے لہجے میں اس نے کہا

"آئیے ۔۔۔ آئیے ۔۔۔ ضرور آئیے ۔۔۔ دروازہ کھلا ہے۔"

پٹ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر گھسا تو لالٹین کی لو خود بخود بھڑک اٹھی اور اس کی روشنی میں سفید ساڑھی میں ملبوس ایک نازک اندام دلکش صورت عورت کی جھلک اسے ایسی لگی جیسے آسمان سے کوئی اپسرا اتر آئی ہو ۔۔۔ وہ کھڑا ہو گیا "آؤ آؤ ۔۔۔ اندر آجاؤ ۔۔۔ وہاں کیوں کھڑی ہو ۔۔۔ اس آرام کرسی پر لیٹ جاؤ" لہجے میں ایسا گھٹیا اور سستا پن تھا جیسے کسی اور وقت شاید وہ اس کے منہ پر تھوک مارتی ۔۔۔ مگر اس وقت تو اسے کسی بات کا بھی ہوش نہ تھا ۔۔۔ وہ چند قدم آگے بڑھی "دیکھیے باہر سخت سردی اور ہوا ہے ۔۔۔ سب مسافر پریشان ہو رہے ہیں"

"اجی تمہیں اور مسافروں سے کیا مطلب ۔۔۔ تمہارے لیے یہ کمرہ حاضر ہے ۔۔۔" اور عین اسی وقت اس کی نظر دروازے میں کھڑی ایک چھ فٹ کی شکل پر پڑی ۔ ماتھے پر بل آ گئے آواز میں کاروباری کرختگی پیدا ہو گئی ۔

"کیا کام ہے تم لوگوں کو؟" اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو دو بار پہلے بھی اس سے آکر جھگڑ چکا ہے ۔

خان نے کرخت لہجے میں کہا "بابو جی ذرا باہر نکل کر دیکھو کیسی سخت سردی پڑ رہی ہے، ہوا کلیجے کے پار ہوئی جاتی ہے ۔۔۔ اور اب تو اولے بھی گرنے لگے ہیں ۔۔۔ جلدی سے کمرہ کھلواؤ ۔۔۔ نہیں تو پھر ۔۔۔ میں بھی پٹھان کا پوت ہوں"

"کیا بک بک لگائی ہے ۔۔۔ آیا بڑا پٹھان کا پوت ۔۔۔ ویٹنگ روم صرف فرسٹ کلاس پسینجر کے لیے ہے ۔۔۔ ہر ایرے غیرے کے لیے نہیں ۔۔۔" اور وہ پھر اپنی آرام کرسی پر دراز ہو گیا

"سنیے تو سہی ۔۔۔ باہر ایک عورت ۔۔۔" عورت نے اسے نرمی سے مخاطب کیا ۔

"اجی میں کسی عورت وورت کو نہیں جانتا ۔۔۔ قانون تو قانون ہی ہے"

عورت غصے میں دو قدم اور آگے بڑھ گئی "بابو صاحب! قانون آدمی کے لیے بنتا ہے ۔۔۔ آدمی قانون کے لیے نہیں بنا ہے۔ میں اپنے لیے ویٹنگ روم کھلوانا نہیں چاہتی ۔۔۔ بلکہ باہر ایک بے کس عورت سخت بیمار ہے ۔۔۔ سردی اور ہوا میں وہ مر جائے گی ۔۔۔ اس کے لیے کمرے کی اشد ضرورت ہے ۔۔۔"

"اس کا ٹکٹ ....؟"

"اس کا ٹکٹ غالباً تھرڈ کا ہے ۔۔۔ مگر اسے فوراً کسی گرم اور بند جگہ پہنچانا ہے ...."

"ہوں ۔۔۔ پر میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں بھلا؟"

"بابو صاحب ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ عورت ۔۔۔ اس کی حالت بہت خراب ہے ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ...."

"جی ہاں! میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ۔۔۔ وہ بیمار ہے اور مجھے اس کی تیمارداری کرنی چاہیے ۔۔۔" لہجے میں سخت طنز تھا "لیکن آپ بھولتی ہیں کہ میں سرکاری افسر ہوں کسی اسپتال کی نرس نہیں ۔۔۔ میرا فرض صرف اپنی ڈیوٹی ادا کرنا ہے"

"آپ سمجھے نہیں" اس نے اب بھی ہمت نہیں ہاری اور بڑی مشکل سے وہ الفاظ جو کسی طرح اس غیر اور بے غیرت مرد کے سامنے اس سے ادا نہیں ہو رہے تھے ۔۔۔ اس نے کہہ ہی ڈالے "آپ سمجھے تو اس کے بچہ ہونے والا ہے ۔۔۔ درد ۔۔۔ شروع ہو گئے ہیں ۔۔۔"

بابو صاحب کے چوڑے دہانے پر ایک نفرت بھری طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی "ہوں ——بچہ ہونے والا ہے ——درد شروع ہو گئے ——معاف کیجئے یہ زچہ خانہ نہیں اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ ہے"

"اور تم انسان نہیں حیوان ہو ——تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہے ——" غصے میں اس کی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ پلیٹ فارم پر اونگھتے ہوئے کئی مسافر چونک پڑے "بے حس —— بے درد ——ایک بیکس عورت انسان کو جنم دینے کے لیے سرزمین پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی ہے ——ہر طرف سردی ہوا خیمہ زن ہے ——اور تم یہاں کھڑے مجھ سے قانون بگھار رہے ہو ——شرم نہیں آتی تمہیں؟"

بابو صاحب کا چہرہ اتنا سا نکل آیا —— بیچارے نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی عورت کسی مرد کو اس طرح ڈانٹ بھی سکتی ہے ——

"کھولو ابھی ویٹنگ روم ——ورنہ دو جانوں کا خون تم پر ہوگا اور تمہیں جیل پہنچانے کا فرض میں انجام دوں گی ——" اس کی آواز میں تحکم بھی تھا اور رعب بھی!

بابو کا چہرہ پہلے سرخ، پھر سفید اور پھر زرد پڑ گیا۔ ایک لفظ بولے بغیر اس نے میز کی دراز سے ایک موٹی سی زنگ خوردہ چابی نکال کر زور سے پھینکی جو خان کے قدموں میں جا کر گری اور اس نے جھک کر فوراً ہی اسے اٹھا لیا۔

وہ جاتے جاتے پلٹی "شکریہ ——مگر آج کا واقعہ یاد رکھنا بابو سے پہلے انسان بننا سیکھو"

ویٹنگ روم کا دروازہ کھلتے ہی گھٹن، سیلن اور بدبو کا ایک ریلا سا آیا کہ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی —— "خان صاحب تم ذرا جلدی سے یہ میز صاف کر دو اور ایک آدھ کھڑکی ذرا دیر کے لیے کھول دو —— میں اس بیچاری کو لاتی ہوں ——" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے چلی گئی اور خان صاحب نے لال لال آنکھوں سے بابو کو گھورتے ہوئے لالٹین اس کے ہاتھ سے لے لی اور کمرہ کے اندر داخل ہوا، گرد آلود بڑی سی ایک بیضوی میز کمرے کے بیشتر حصہ کو گھیرے ہوئے تھی۔ چاروں طرف چند بید اور لکڑی کی پرانی وضع کی کرسیاں اور بنچیں پڑی تھیں۔

دو تین منٹ بعد دونوں عورتیں مریضہ کو سنبھالے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں ——وہ بڑی شدید تکلیف کے ساتھ گھسٹتی ہوئی آ رہی تھی جیسے اس کی ٹانگوں میں بالکل ہی دم نہ ہو ——

لالٹین کی مدھم روشنی میں بھی اس کا ہر نقش، رعنا حسن نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہا۔ بابو کھڑے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا کہ ایک تیز آواز اس کے کان میں برسے کی طرح چبھی "یہاں کیوں کھڑے ہو باہر جاؤ ——" اور وہ اس تیزی سے باہر کی طرف بھاگا کہ بند دروازے سے زور سے سر ٹکرایا۔ ابھی جھنجھلاہٹ اور کھسیاہٹ سے پنپنے بھی نہ پایا تھا کہ اس "مردمار" عورت کی آواز پھر آئی "خانصاحب! بابو صاحب کے کوارٹر سے پانی گرم کرنے کے لیے انگیٹھی اور کیتلی وغیرہ اور ایک تیز چاقو لے آؤ ——سب کے دام ادا کر دیے جائیں گے ——اور ہاں ——بابو صاحب سے کہو کسی کو بھیج کر قصبہ میں جو بھی ڈاکٹر یا لیڈی ڈاکٹر ہو اسے فوراً بلائیں ——جتنی فیس مانگیں گے ادا کر دی جائے گی ——اور ہاں تم میرا بستر اور بکس یہاں دے جاؤ ——"

لالٹین اندر رہ گئی، دروازہ بند ہو گیا اور وہ بھیگی بلی بنا خان کے ساتھ اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

اس نے کوٹ اتار کر کرسی پر پھینک دیا اور برقعہ پوش عورت سے بولی "ماں جی ——تم بھی اپنا برقعہ اتار ڈالو اور ذرا مجھے سہارا دو

تو میں ان کو بھی پرکھا دوں ـــ

بڑی مشکل سے تڑپتی ہوئی حسینہ کو دونوں نے میز پر لٹایا اور چاروں طرف سے اسے کمبل سے ڈھک دیا۔

اسی وقت خان سلطان سے آیا تو اس نے کہا "خانصاحب! خدا کے لیے جلدی ڈاکٹر بلاؤ ـــ اگر کوئی مل جائے تو ـــ"

"بہت خوب سرکار!" اور بھاری قدم دور جاتے ہوئے سنائی دیے۔

"ارے بیٹی ڈاکٹر مُوا کیا کرے گا ـــ یہ عورتوں کی پردے کی باتیں ہیں۔ اسے اللہ نہ کرے کہ شریف زادیاں ایسے وقت مردوں کے ہاتھ پڑیں۔ مرو موا تو ایسے وقت اگر دیکھ لے تو یہ سمجھو کہ اس . . . . . . "ارے" نے بڑی بی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انھیں روک دیا۔ "ماں جی باتوں کا وقت نہیں . . . . دیکھو . . . . . . دیکھو . . . . اسے کیا ہوا جا رہا ہے"

مریضہ نے پوری قوت سے ایک ہاتھ میں اس کی کلائی بھینچ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے میز کے کنارے کو توڑے ڈال رہی تھی . . . . چہرے کا نچلا حصہ شروع کر کر گویا غبارہ بن گیا تھا۔ کنپٹیاں ایک دوسرے کے اوپر اتنے زور سے جم گئی تھیں جیسے سارا جبڑا اب ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ سیاہ آنکھیں اپنے ابلتے معلوم ہوتا تھا بالکل ہی باہر نکل پڑیں گی۔ ماتھے اور گالوں پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے یوں چمک رہے تھے جیسے برگِ گل پر شبنم کے قطرے کانپ رہے ہوں ـــ ایک گھٹی ہوئی سی آواز اس کے گلے سے نکل رہی تھی۔ ایسی آواز جو اس نے اس سے پہلے کسی اتنے بڑے انسان کے منہ سے نہ سنی تھی ـــ اس کا اپنا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا اور ساری جان سے کھڑی کانپ رہی تھی!

"اے بیٹی! گھبراتی کیوں ہے ـــ بس اب وقت بالکل قریب ہے نا ـــ تو بیٹھ پڑھتے میں بچہ کو سنبھال لوں گی" بڑھیا نے بڑے اطمینان سے اپنے موٹے کھردرے ہاتھوں کو اوپر نچایا جن میں لاتعداد چاندی کے چھلے اور انگوٹھیاں اور کلائیوں میں چوڑیاں بنائے ہوئے تھیں گھیریاں وغیرہ چمک رہی تھیں اور سب پر میل کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔

اس نے گھبرا گھبرا کر دو تین بار اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا ـــ پھر اپنے ہاتھوں کی طرف ـــ "نہ نہ ـــ ماں جی ـــ تم ٹارچ دکھاؤ ـــ بچہ میں سنبھال لوں گی ـــ" اور یہ کہتے کہتے اس نے اپنی کلائی بڑی مشکل سے زچہ کی گرفت سے چھڑائی۔ دو انگوٹھیاں انگلیوں سے اتار کر بڑھیا کے ہاتھ میں دیں اور پھرتی سے غسل خانہ میں جا کر ہاتھ دھونے گئی ـــ پانی بے حد سرد تھا اور خدا جانے کب کا بھرا ہوا تھا مگر یہ سب سوچنے کا وقت کہاں تھا۔ منٹ بھر بعد وہ زچہ کی پائنتی کھڑی تھی اور بڑھیا اس کی انگوٹھیاں اپنی موٹی موٹی انگلیوں میں پھنسائے ٹارچ کو بچوں کی طرح جلا اور بجھا رہی تھی۔

ایک درد و محبت میں ڈوبی ہوئی خفیف آواز جس کو مدھم کرب ناک اذیت نے لوٹ لیا تھا اس کے کان میں آئی "آہ ـــ اوہ ـــ اُف ـــ میری بہن ـــ تم ـــ تم ـــ کیا اسی دنیا کی رہنے والی ہو ـــ نہیں ـــ نہیں تم تو جنت کی حور ہو ـــ فرشتہ ہو ـــ میری مصیبت پر رحم کھا کر خدا نے تمھیں ـــ آہ ـــ اوہ ـــ اُف ـــ" اور پھر وہی درد کا ریلا ـــ وہی چہرہ کا خوفناک پن ـــ وہی ٹھٹھوں کی زبردست گرفت اور گھٹی ہوئی عجیب و غریب آواز ـــ اور اگلے لمحہ اس کے ہاتھوں پر ایک نرم سی لجلجی سی پھسلتی سی چیز پھسل کر آ پڑی اور ملں کی بھیانک چیخوں کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ بچے نے گلا پھاڑ پھاڑ کر بین الاقوامی زبان میں دنیا کو مخاطب کرنا شروع کیا۔ وہ اعلان کر رہا تھا کہ[1]

---

[1] ٹیگور کا ایک قول "ہر نوزائیدہ بچہ دنیا میں یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا ـــ"

خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے —

رات کا اندھیرا چھٹ چکا۔ گھٹا برس کر کھل گئی اور ہوا کی تیزی اور خنکی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا —— نیلے دھندلے آسمان پر بادلوں کے اکا دکا ٹکڑے سفید بادبانی کشتیوں کی طرح ادھر ادھر تیرتے نظر آ رہے تھے۔ مشرق کی سمت افق پر آفتاب کا گول نارنجی چہرہ جھانک رہا تھا۔

دھرم پورا اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں لالٹین آخری بار جھلملا کر بجھ چکی ہے۔ ایک گہرا سناٹا، خاموشی اور دھندلکا کمرے میں چھائی ہوئی ہے۔ میز پر زچہ کمبل میں لپٹی ہوئی بے حس و حرکت لیٹی ہے۔ میز کی داہنی طرف اس کی تیماردار دوست اس پر جھکی ہوئی کھڑی ہے۔ چہرے پر تھکن، بے خوابی اور پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں —— بائیں جانب ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر کانوں پر اسٹیتھسکوپ (STETHOSCOPE) لگائے مریضہ کے دل کا معائنہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر اور تیماردار دونوں کے سر اتنے قریب ہیں کہ سیاہ بال سفید بالوں سے سرگوشی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نے جھٹکا ہوا سر اٹھایا۔ اسٹیتھسکوپ کو احتیاط سے تہ کر کے جیب میں رکھا۔ عین اسی وقت روشن دان سے سورج کی پہلی کرن کمرے میں داخل ہوئی۔ اب ڈاکٹر تیماردار اور مریضہ کے چہروں کو دیکھ سکتا تھا۔

مریضہ اس حالت میں بھی حسن کا ایک کامل نمونہ تھی۔ ہاتھی دانت کا سا بے داغ رنگ، وینس کا سا متناسب جسم، ہرن کی سی حسین آنکھیں، شب سے لمبے سیاہ بال جو بے ترتیبی سے میز پر، ماتھے پر اور سینہ پر بکھرے ہوئے تھے —— موت کا سایہ بھی جو اس کے ہر طرف ناچ رہا تھا اس خداداد حسن کو مٹا نہ سکا تھا۔

چند لمحے کے لیے تیماردار اور ڈاکٹر دونوں ڈوبتے ہوئے پورن ماشی چاند کی اس سندرتا سے مبہوت ہو کر رہ گئے —— نظر اٹھا کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تیماردار لڑکی کا گلابی رنگ رات بھر کی مشقت اور پریشانی نے زرد کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تیز اور ذہین آنکھوں کی چمک میں شب بیداری کی سرخی بھی شامل ہو گئی تھی اور پتلے پتلے گلابی خم دار ہونٹوں پر ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ جھلک رہی تھی کہ وہ محض عادتاً ان ہونٹوں پر کھیل رہی ہے.... مریضہ پر جھکی وہ بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی نازک سی شاخ گل لچک کھا کر جھک آئی ہو۔

ڈاکٹر کے سخت بے رنگ چہرے پر ان دونوں کو دیکھتے دیکھتے نرمی، گھبراہٹ اور شفقت کا ہلکا ہلکا رنگ ابھرنے لگا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا ”بی بی تم نے رات بھر سخت محنت کی ہے —— ذرا دیر بیٹھ کر آرام کر لو —“

”نہیں ڈاکٹر صاحب —— جب تک ان کو ہوش نہ آ جائے —— ڈاکٹر صاحب! کیا ہوش آ جائے گا؟ —— بچ جائے گی یہ بیچاری —— ؟“ اس کی آواز میں سخت بے قراری تھی۔

ڈاکٹر کے چہرے پر مایوسی کا رنگ صاف جھلک رہا تھا ”خدا میں سب قدرت ہے بہن ——!“ اس نے پیشہ ورانہ امید پرور انداز میں جواب دیا۔

”ڈاکٹر صاحب —— کیا —— کیا میری ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے تو —— ان کو —— کوئی نقصان تو نہیں پہنچا —— ؟“ آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

”نہیں نہیں تم نے بڑے سلیقے اور سمجھداری سے کیس کیا —— ورنہ —— بچے کا بچنا محال تھا —— ایسی حالت تھی ماں کی کہ

"دونوں جانوں کا ضرر ــــ ہو جاتا ـــ خدانخواستہ ـــ معلوم ہوتا ہے تمہیں اس کا اچھا تجربہ ہے ــــ"

"نہیں ڈاکٹر میں نے تو آج سے پہلے ـــ کبھی ـــ یہ ـــ کبھی اس قسم کا ـــ کیس دیکھا تک نہ تھا ـــ"

"تعجب ہے ـــ بہرحال تمہاری کامن سنس نے کام دیا ـــ تمہیں غالباً اپنا تجربہ ہوگا ـــ کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

ڈاکٹر کو خواہ مخواہ مریضہ سے زیادہ تیماردار سے دلچسپی ہو گئی تھی ـــ

"نہیں ـــ میرے ـــ جی ـــ میرے تو کوئی بچہ نہیں ـــ" شرم، جھجک اور مایوسی کی کپکپاہٹ آواز میں صاف محسوس ہو جاتی تھی ـــ

"آہ ـــ اوہ ـــ مار ـــ مار ڈالا ـــ میرا دم ـــ میرا دم گھٹا ـــ آہ ـــ میں ـــ میں کہاں ـــ؟" ایک کراہ کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے ہو کر چند لفظ مریضہ کے منہ سے نکلے اور دونوں اس پر جھک گئے۔ "گھبراؤ نہیں تم اسپتال میں ہو بیٹی" ڈاکٹر نے مریضہ کو تسلی دینی چاہی۔

"تو پھر ـــ میرا ـــ میرا ـــ بچہ ـــ!"

"ہاں تمہارے بچہ ہوا ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"زندہ ہے؟" بڑی مشکل سے بیچاری یہ لفظ ادا کر سکی۔

"ہاں ہاں زندہ ہے" ـــ عورت نے کہا اور خوش ہو کر لپک کر کمرے کے آخری سرے کی طرف گئی جہاں ایک بید کی کھاٹ پر اس کی ننھی سی رضائی میں لپٹا ہوا بچہ پڑا تھا۔ بڑھیا اس کھاٹ کے پائے پر سر ٹکائے سو رہی تھی ـــ اس نے آہستہ ـــ بہت ہی آہستہ سے بچے کو سنبھال کر ہاتھوں پر اٹھایا اور اس انداز سے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھی ـــ جیسے کوئی معصوم بچہ شیشے کے کسی نازک سے برتن کو لے کر چلتا ہے ـــ اور دھیرے سے اس نے بچے کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا ـــ

ماں کے بے رنگ چہرے پر مسرت کا ایک ہلکا سا رنگ آیا اور گزر گیا ـــ بے اختیاری میں ایک ہاتھ ذرا سا اٹھا اور گر گیا۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری اور ڈوب گئی ـــ آنکھوں میں چمک آئی اور آنسو بن کر ڈھلک گئی ـــ

اس نے بچے کے منہ سے رضائی ہٹا دی اور اسے ایسا لگا کہ ماں کی آنکھوں میں اس کی ساری روح کھنچ آئی ہو ـــ جس اشتیاق، جس مامتا، جس محبت سے اس ننھی کی ادھ کھلی جھپکی ہوئی سرخ سرخ چیز کو دیکھ رہی تھی اسے دیکھ کر تیماردار ـــ شدت جذبات سے کانپ رہی تھی ـــ آہ ـــ مامتا کی یہ انمول دولت!! اس کی آنکھوں میں آنسوؤں نے سچے موتیوں کی چمک پیدا کر دی تھی۔

ماں چند لمحے بچے پر پیار سے اپنا زرد ہاتھ پھیرتی رہی "لڑکا ہے؟"

"نہیں لڑکی ہے بہن"

"آہ ـــ لڑکی ہے ـــ بدنصیب ماں کی ـــ بدنصیب بیٹی ـــ کاش تو زندہ نہ ہوتی ـــ لڑکی نہ ہوتی ـــ آہ ـــ"

"نہیں بہن کیسی باتیں کر رہی ہو"

ماں خالی خالی نظروں سے کبھی تیماردار کو کبھی بچی کو دیکھتی رہی ـــ اور پھر ـــ بڑی صاف آواز میں جو کسی طرح بھی ایسی کمزور جان مریض کی آواز نہ لگتی تھی بولی "میری بچی ـــ اچھا ہوا کہ تو خوبصورت نہیں ـــ اپنی ماں کے حسن کی لعنت تیرے حصہ میں نہیں آئی ـــ شاید اس کی سی بدقسمتی سے بھی تو بچ جائے ـــ شاید درندے ـــ حیوان ـــ شیطان ـــ تجھے نہ بھنبھوڑیں ـــ شاید تیری بدصورتی تیری محافظ

بن جائے ——آہ ——میری بچی——!"

وہ دونوں حیران و پریشان کھڑے اس کی باتیں سن رہے تھے! یہ ہذیان ہے یا ہوش و خرد کے نکتے؟ اس کا چہرہ اب اور بھی زیادہ زرد ہو چکا تھا جیسے ہلدی کی پوری گرہ پیس کر مل دی گئی ہو اور شفاف ماتھے پر سیاہی آ گئی تھی——

ڈاکٹر نے جھک کر اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں، مایوسی کے ساتھ گردن ہلائی اور جھک کر آہستہ سے بولا "بیٹی! تم اپنا نام——بچی کے باپ کا نام——اس کا کچھ اتہ پتہ——خاندان کا کچھ حال تو بتاؤ"

"آہ——اس کے سب ہیں——اور——پھر——کوئی نہیں——سب——سب——سب اس کی جان کے دشمن ہو جائیں گے——آہ——اس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں" ——شما نے وہ اور کیا کہہ رہی تھی——مگر اب کچھ سنائی نہ دیتا تھا——صرف ہونٹوں کی ہلکی ہلکی حرکت دیکھی جا سکتی تھی!

پھر اس نے اپنا نحیف ہاتھ جانے کیسے گریبان کے اندر ڈالا اور ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دی اور پھر جیسے بہت کوشش سے اس نے اپنا سر بیمار دار کی طرف موڑا۔ "آہ بہن——تم——تم——کتنی——اچھی ہو——میری——بچی——یہ——بچی——چی" الفاظ سے زیادہ اس کی بجھی ہوئی مدھم نظروں نے اپنا مطلب ادا کر دیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بچی کو اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور سسکتی ہوئی بولی "بہن——تمہاری بچی میری بچی ہے——میری جان——"

ماں کے کمان جیسے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ کھل اٹھی جیسے کسی سوکھی شاخ پر اچانک کوئی ننھی سی کلی مسکرا اٹھے یا ڈوبتے سورج پر سے ایک دم بادل ہٹ جائے اور اس کی کوئی کرن دمک اٹھے——پھر اس کی نظریں ڈاکٹر کی طرف مڑیں "ڈاکٹر——یہ——بچی——اس کا حق——شاید——سرپرست——"

مگر پھر کوئی آواز نہ نکلی——پتلیاں پھر گئیں——گردن سخت ہو گئی——ہاتھ میز سے نیچے لٹک گیا۔

میز پر ایک بے جان سوکھی مورت کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

عین اس وقت بچی نے پوری قوت سے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔

———

راج دُلارے

احمد شریف

بڑی صاحب ... دونوں نے بھرے اجلاس میں جعفر سے ... ڈرامے کی ڈائریکشن قبول کر لینے کی استدعا کی تو اس کا جذبۂ شوق یکبارگی انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جلدی سے حامی بھر لے۔ مگر اب وہ دن تو نہیں رہے تھے جب شروع سردیوں میں بھادوں بیت گئے باہر پارسیوں کے تھیٹر ایجنسی سے اکثر پرے جا بیٹھتے اور وہ بغلوں میں ہاتھ دیے بوسیدہ سی دری پر بیٹھا آدھی رات تک ناٹک دیکھتا رہتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مسٹر روپی اور مس ستارہ کے چہرے گھوم گئے جن کو تکتے تکتے اسے یاد بھی نہ رہتا تھا کہ اس کے ابا اپنے کمرے میں کمر پر ہاتھ باندھے اس کے انتظار میں ٹہل رہے ہوں گے۔ ان دنوں جب بیت لگنے سے اس کے جسم پر انگارے دہکنے لگتے تو اس میں بھی وہ لذت محسوس کرتا جیسے ان کے تیور کے تھپڑوں سے کمرے میں بھی ایک ناٹک ہو رہا ہو اور بھرے دربار میں حاکم وقت کے حکم سے اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے پڑ رہے ہوں۔

اب وہ دن بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ فوج کی نوکری اسے انگلی لگائے شہر بہ شہر لیے لیے پھری تھی۔ وضعداری اک عجیب قسم کا رکھ رکھاؤ اس کی شخصیت کا جزو بن چکا تھا اور ایک دم حامی بھر لینے میں اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس طرح کرنے سے اس کی شخصیت بے اثر سی ننگی بچی ہو کر حاضرین کا منہ چڑانے لگے گی۔

اس نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ سب اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے بے دلی سے پتلی زبان ہونٹوں پر پھیر کر انھیں تر کیا۔ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں اس کی لمبی ناک کی پھننگ اور اوپر والے ہونٹ سے نس ہرنے ہونے لگی۔ اس نے کندھے اندر کی طرف سکیڑ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور رک رک کر کہنے لگا۔

"اگر آپ لوگوں کی یہی مرضی ہے تو مجھے منظور ہے مگر اس ڈرامے میں عورت کا پارٹ عورت ہی کرے گی۔"

بڑی کلب والے یہ بات سن کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کسی کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر نہ آئی ——— راولپنڈی جیسے شہر میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا عورتوں کے پارٹ کے لیے لڑکے تک تو ملتے نہیں تھے پھر عورتیں کہاں سے آتیں۔ ایک قمری تھا جو ہر ڈرامے میں برابر لگائے ریشمی دوپٹہ اوڑھے سٹیج پر پہنچ جاتا اور مردانی آواز پہ قابو پاتے پاتے اپنا پارٹ تک بھول جاتا۔

جعفر نے کنکھیوں سے ماحول کا جائزہ لیا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ سب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسے

خاموشی ناگوار گزری۔ اس نے سوچا کہیں بڑی کلب والے اپنی درخواست واپس ہی نہ لے لیں اور اس کے اندر چھپا ہوا فنکار کہیں پھر لمبی تان کر نہ سو جائے ——— وہ شروع ہی سے اس بات کا مخالف تھا کہ مرد زنانہ رول ادا کریں۔ عورتوں کی سی لچک، بانکپن اور نزاکت بھلا مردوں میں کہاں!

اچانک بھاری بھرکم ڈیل ڈول والے شیرازی نے پلکوں کو کئی بار جھپکایا، آنکھیں اس طرح بند کر لیں کہ پانی کے دو موٹے موٹے قطرے گوشوں سے ڈھلک پڑے۔ جعفر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے اپنے دھیان جبڑے کا نچلا حصہ اس طرح کھینچا جیسے گردن کے تنے ہوئے پٹھے کو ہموار کر رہا ہو اور پھر اس نے لگاتار کندھے جھٹکائے اور اس کی کرسی کے پائے کڑکڑی سے فرش پر بجنے لگے۔ وہ جعفر کی طرف جھکا اور کہنے لگا۔

"عورت کا انتظام ہو جائے گا جی ——— آپ ریہرسل شروع کرا دیں۔"

اور پھر ان گلے دل سے جعفر نے ریہرسل شروع کرا دی۔ "نیا مکان" کھیلنے کے لیے شیرازی کئی روز تک کلرک کی بیوی کے مکالمے موٹی اور بے سُری آواز میں بولتا رہا۔ وہ ریہرسل کے لیے آتا تو جعفر اسے تنہا دیکھ کر مرجھا سا جاتا اور اگر کبھی اس سے پوچھتا۔

"وہ عورت کہاں ہے شیرازی؟"

تو شیرازی بڑے اطمینان سے گردن کا کوئی تنا ہوا پٹھا ہموار کر کے کہتا۔

"آپ فکر نہ کریں جعفر صاحب ——— سب انتظام ہو جائے گا۔"

جعفر سوچتا ڈراما اسٹیج ہونے میں دن ہی کتنے ہیں۔ اگر کوئی عورت نہ ملی تو شیرازی چپکے سے کہہ دے گا ——— جعفر صاحب اس قمری سے کام چلائیں، عورت کا انتظام دوسرے ڈرامے کے لیے کر لیں گے۔ ——— مگر اس بات کا اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ شیرازی بڑے کام کا آدمی تھا۔

ڈراما اسٹیج ہونے سے دو روز قبل شیرازی نہ جانے کہاں سے لیلیٰ کو پکڑ لایا۔ ان کے ممبر سے ساتھی کو دیکھ کر جعفر لیلیٰ کے محلِ وقوع کا صحیح اندازہ لگانے میں کامیاب تو ہو گیا مگر وہ اس قابل نہیں تھی کہ کلرک کی اٹھارہ بیس سالہ بیوی بنا کر ذرا اوپر کے لیے گھنگھرو چھنکا کر پٹھان گاہک کا دل لبھا لیتی۔ جعفر نے اس کی بے نور سی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کی طرف دیکھا۔ جب وہ کچھ کہنے کے لیے مڑا تو شیرازی لپک کر اس کے قریب آ گیا اور اس کو ایک طرف لے جا کر آہستہ سے بولا۔

"دو راتوں کے سو روپے مانگتی ہے جعفر صاحب!"

"سو روپے؟"

جعفر نے مڑ کر لیلیٰ کی طرف دیکھا اور اسے خیال آیا وہ سو روپے تو سارے مہینے میں بھی نہیں کماتی ہوگی ——— مگر ڈرامے کے لیے عورت چاہیے تھی اور دو روز بعد ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا، اس نے حامی بھر لی ——— دو روز رات گئے تک ریہرسل ہوتی رہی ———

ڈرامے والے روز لیلیٰ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے گھر ہی سے میک اپ کر کے چلی آئی اور اسٹیج کے ایک طرف بیٹھ کر جعفر کو پُراسرار نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ کانوں تک پھیلائی ہوئی زلفیں اور پیشانی پر بالوں کو رول سے کرل بنائے ہوئے دو چاند اور اس پر اس کی پُراسرار نگاہیں ——— جعفر نے اسے دیکھا تو جل کر رہ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا اسے گرین روم میں لے گیا۔ پہلے تو وہ ہٹپٹائی لیکن پھر جعفر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے بازو پر محسوس کر کے لچک سی گئی۔ اس کے ساتھی حیرانی سے گرین روم کی طرف دیکھتے رہے اور جب

پردہ اٹھا تو وہ لیلیٰ کو ماڈرن لڑکی کے روپ میں دیکھ کر جعفر کی صلاحیتوں کے قائل ہو گئے۔

ڈرامے کے بعد ری یونین سے۔ ان شو کی کامیابی پر جعفر سے زیادہ شیرازی خوش تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو وقت کے تقاضوں کو سمجھتا تھا، جو جدید ڈرامے کی تکنیک اور اسے سٹیج کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھا۔ جعفر کے دائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے ساتھیوں پر ایک نگاہ ڈالی اور جعفر کے قریب ہو کر کہنے لگا۔

"جعفر صاحب! لیلیٰ چلی گئی۔"

"کہاں؟" جعفر نے حیرانی سے پوچھا۔

"لاہور —— فلم ایکٹرس بننے کے لیے۔"

"اچھا!"

شیرازی نے جلدی جلدی کندھے جھٹکائے اور چہرے پر مصنوعی ہنسی لا کر بولا۔

"جانے سے پہلے کہہ رہی تھی —— اگر کوئی چند لمحے میرے قریب گزار لے تو پھر کبھی مجھے بھول نہیں سکتا۔"

جعفر کے لبوں کے کناروں نے پھیل کر اس کی مسکراہٹ کا راز افشا کر دیا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے شو کی کامیابی کا سہرا کسی کے سر باندھنے کی بات نہ جانے کیسے چل نکلی اور کچھ ایسا پیچ پڑا کہ جبار سینے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

"اگر میں اور وجاہت نہ ہوتے تو ہال میں اُلّو بولتے۔"

اس کا لہجہ جارحانہ تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ چپ سے ہو کر رہ گئے۔ جعفر کو احساس تھا کہ ان کی کامیابی میں جبار اور وجاہت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے رقص نے تماشائیوں کا دل لبھایا تھا۔ تحسین و آفرین کے ڈونگرے بھی برسے تھے ان پر مگر اس کے نزدیک جدید ڈرامے میں رقص اور موسیقی کی حیثیت ثانوی تھی۔ اس کے سامنے برطانیہ اور امریکہ کے ڈرامے تھے جن کی اوپیرا اور بیلے سے الگ حیثیت تھی مگر شیرازی نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور جبار کو مخاطب کر کے بولا۔

"اس میں شک نہیں کہ تمہارا رقص اچھا تھا مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم اور وجاہت نہ ہوتے تو شو کامیاب ہی نہ ہوتا۔"

"تو اگلی دفعہ دیکھ لیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر ہمارے بغیر کام چل سکتا ہے تو ہمارا یہاں رہنا فضول ہے۔"

"دیکھو بھئی یہ بات نہیں۔" جعفر نے بیچ بچاؤ کے خیال سے کہا۔

مگر جبار نے اس کی بات کاٹ دی اور کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔ "اجی بس یہی بات ہے —— ہم دیکھ لیں گے جب ہمارے بغیر آپ کا شو کامیاب ہو جائے گا —— آؤ وجاہت ——"

اس سے پہلے کہ کوئی انھیں روکتا وہ اٹھ کر چلے گئے۔ محفل وہاں ہی ہو کر رہ گئی۔ جعفر جانتا تھا کہ جبار اور وجاہت کا ساتھ چھوڑ

جیسے شہر پر سامنے کو مقبول سا نہیں، وہ محض ثابت منا۔ لوگ ابھی تک سٹیج پر ایکٹروں کو بے حیائی سے کہ لیے مشکلات اور ریشمی چہروں کے پیچھے بندھی ہوئی بریسر چھلکانے زیادہ ارتعاش ہونے کے عادی سے گھنگروؤں کے چھناکوں کے ساتھ ذرا سی کمر لچک جاتی تو وہ اپنے جذبات کو آوارگی کے لیے تو تھیٹر ہی ہے —— لیکن جب جبار اور وجاہت دروازے سے باہر نکل گئے تو ظاہر وہ انھیں بھول گیا اور شیرازی فرنانڈیز و فادر امو جیسے مخلص ساتھیوں کو بے تکلفی سے مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔

"تو سالا بھی دیکھو —— باس!"

"اجی اب کیا —— ہمارا ہر قدم ترقی کی طرف ہی اٹھے گا۔"

شیرازی نے بڑے اعتماد سے کہا اور اسی مجلس میں ماڈرن تھیٹر کی بنیاد ڈال کر اگلے شو کے پروگرام کا خاکہ مرتب کر لیا گیا۔ اگر جبار اور وجاہت یوں الگ نہ ہو جاتے تو شاید سب کام تکمیل کے مراحل اتنی سرعت سے طے نہ کرتے۔ مگر اب تو سب پر ایک جنون سوار تھی۔ جنون سا تھا کہ ملک بھر میں ماڈرن تھیٹر کا چرچا ہونے لگے۔ لوگ جب جدید ڈرامے کا ذکر کریں تو ماڈرن تھیٹر کا نام سرفہرست ہو —— اسٹیج بنانے اور شو دینے کے لیے ہال کا مسئلہ درپیش ہوا تو شیرازی نے بڑی معقول رائے دی، کہنے لگا۔

"گرمیاں آ رہی ہیں، کیوں نہ یہ شو مری میں دیا جائے۔ بڑے بڑے امیر لوگ وہاں ہوں گے۔ دوہرا فائدہ ہوگا، معقول آمدن ہوگی اور ماڈرن تھیٹر کا نام بھی روشن ہو جائے گا۔"

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مری میں لگتا زمین، و نتک شو دینے کے لیے ہنگامہ ادھیڑ بنی میں شام سے رات گئے تک ریہرسل شروع ہو گئی۔ ریہرسل کے دوران ہی میں جعفر کو ماڈرن تھیٹر کے لیے اپنے وقف اور اس کے بعد اپنے ہال کا خیال پیدا ہوا۔ پرائی چھت کے نیچے ریہرسل کرتے وہ اس لڑکی کی طرح محسوس کرتا جس پر نہاتے وقت اچانک کسی مرد کی نظر پڑ جائے۔

ریہرسل کے ساتھ ساتھ اس نے وقف کے لیے بھی تگ و دو شروع کر دی۔

انھی دنوں شیرازی ایک شوخ سے لڑکے کو وہاں لایا۔ اس کا نام محسن تھا۔ شیرازی نے تعارف کرایا تو مظفر نے بڑے تپاک سے اور ہستے ہاتھ ملا کر کہا۔

"میرا نام مظفر ہے۔"

اور کرسی چھوڑ کر جگہ اس کے لیے خالی کر دی۔ اس کے چہرے پر شدید سی مسکراہٹ تھی۔ وہ تصور ہی تصور میں محسن کو بریسر پہنے، دوپٹہ اوڑھے سٹیج پر دیکھ رہا تھا اور مطمئن تھا کہ محسن اس رول میں اس سے کچھ زیادہ ہی جچے گا۔

کوہ مری جانے سے تین چار روز قبل ایک شام محسن جعفر کے پاس جا بیٹھا اور بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"جی —— اگر آپ کہیں تو ایک لڑکی کو ساتھ لے چلیں۔"

شیرازی بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں بھنک پڑی تو وہ کھسک کر اور قریب ہو گیا اور جعفر کے کانوں کی سرخ لووں کو نظر انداز کر کے پوچھنے لگا۔

"کون ہے وہ؟"

"ایک اینگلو ہے —— ناچنا بھی جانتی ہے۔"

"مگر نام کیا ہے اس کا؟"
"نصیلا!"

"اچھا —— وہ —— میں جانتا ہوں اسے" پھر جعفر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "جعفر صاحب! بہت خوب! اچھی ہے نصیلا اس کا رقص دیکھ کر لوگ بھوت بن جائیں گے۔ ہجوم کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا"
"مگر وہ جائے گی بھی؟" جعفر نے پوچھا۔
شیرازی نے جلدی سے گردن کا پٹھا ابھار کر اور کہنے لگا۔
"آپ فکر نہ کریں۔ اس کا انتظام میں کر لوں گا۔ کچھ دے دلا دیں گے۔ روپے اور پیسہ کیا مفت میں کر آئے گی"
نصیلا کے ذکر سے ساتھیوں کے کھلے ہوئے چہرے دیکھ کر جعفر انکار نہ کر سکا۔

بڈوانس پارٹی کی طرف سے آل کلچرل کانگریس کا سگنل ملنے پر سب نے بوریا بستر باندھ لیے اور مصلحتاً شو سے ایک روز پہلے مری چل دیے۔ نصیلا مصروفیات کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکی۔ اس نے اگلے روز آنے کا وعدہ کر لیا۔
چلتے وقت سب کے دلوں میں خوشگوار سی ہلچل تھی۔ قمر اور محسن بس میں بیٹھے مل کر ڈوئیٹ گاتے رہے اور جعفر سارا راستہ خاموش بیٹھا باہر کی طرف منہ کیے اونچی نیچی پہاڑیوں کو دیکھتا رہا۔
جعفر کی توقعات کے مطابق مری میں سب کام ابھی تک ادھورے پڑے تھے۔ ہوٹل کا مالک چچا امداد علی کمر پر ہاتھ رکھے ہال میں گھوم رہا تھا۔ شیرازی تماشیر اور فنکار ہتھوڑیاں سنبھالے سٹیج کے تختوں میں کیلیں ٹھونکنے لگے۔ سب اپنے اپنے بستر ایک کونے میں جمع کر کے ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ جب جعفر کو پتہ چلا کہ ہال کا انتظام چچا امداد علی کی وساطت سے ہوا ہے تو اس نے بڑے خلوص سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر آستینیں چڑھا کر سٹیج کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔
رات گئے تک جفاکشی کی کوششوں کے باوجود سٹیج کا پچھلا حصہ کسی ننگے بھوکے فقیر کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھتا رہا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے تختے نہیں تھے اور ہال کی حالت اس کشتی کی طرح تھی جس میں مہمانوں کی اچانک آمد پر دو بالٹیاں پانی ڈال دیا گیا ہو۔ —— ابھی تو دس بارہ آدمیوں کے سونے کے لیے رات کے کر...ے کی فکر دامن گیر تھی۔ چچا امداد علی نے ان کے آرٹسٹوں کے پیشِ نظر کے آسرے پر لنگر کھول رکھا۔ اس کی فیاضی پر سب کا دل چاہا کہ نعرہ لگائیں —— چچا امداد علی زندہ باد —— فنکار اعظم پائندہ باد —— لیکن تھکن کی وجہ سے سب چپ رہے۔ سب نے اپنے اپنے کونوں پر بستر بچھا لیے اور جہاں کسی کے پلنگ کے سامنے لیٹ گیا۔
شیرازی کو اپنے بجائے جعفر کی فکر تھی۔ وہ چاہتا تھا جعفر کے سونے کے لیے کوئی ایسی جگہ مل جائے جس سے اس کی امتیازی حیثیت برقرار رہے۔ اسے نہ جانے کیوں یہ خوف تھا کہ جعفر اگر سب کے ساتھ فرش پر لیٹ گیا تو جدید ڈرامہ کا مستقبل ہی کٹ کر رہ جائے گا۔ اس نے ساتھ والے کمرے میں جعفر کا بستر بلند چارپائی پر بچھا کر اپنا بستر اس کے قریب ہی زمین پر لگا لیا۔ دونوں چپ چاپ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔
شیرازی سر کے نیچے بازو رکھے چت لیٹا روشندان سے آنے والی چاندنی کی پتلی سی لکیر کو دیکھ رہا تھا۔ تھکن کے باوجود اسے نیند

نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اگر شو ناکام رہا تو جعفر کا دل ٹوٹ جائے گا جیتا اور دھیا ہستے ہلیں بجلتے پھر رہے ہیں ... ماڈرن تھیٹر کا نام گمنامی کے اندھیرے میں چھپ جائے گا اور سر پھروں کی یہ منڈلی تتر بتر ہو جائے گی۔

جعفر بیٹھ کر تکیہ پر پلٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ شیرازی کو اس کی بے چینی کا احساس تھا۔ اسے خیال آیا جعفر کو بھی نیند نہیں آ رہی ہو گی کون جانتا تھا آنے والی کل امیدوں کے تاج محل پر کامیابی کا پرچم لہرائے گی یا ناکامی کی وجہ سے ان کے دلوں میں قبرستانوں کی سی ویرانی پھیل جائے گی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے پکارا۔

"جعفر صاحب!"

"ہوں۔"

جعفر نے وہیں پڑے پڑے ہنکارا بھرا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا شو کامیاب رہے گا۔ آپ دو گھنٹے آرام کر لیں۔"

"یہ بات نہیں شیرازی ــــ کھٹمل سونے نہیں دیتے۔"

"میں سمجھا آپ شاید شو کے بارے میں سوچ رہے تھے۔"

دونوں خاموش ہو کر اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے۔

اگلی صبح شیرازی باہر نکلا تو جعفر ٹانگیں پھیلائے برآمدے میں سو رہا تھا۔ اس وقت وہ جدید ڈرامے کے بارے میں کچھ سوچنے کی بجائے صرف مسکرا دیا۔

اس روز سب بے حد مصروف رہے۔ سٹیج کے پچھلے حصے کا خلا پُر کرنے کی کوئی سبیل نہ بن سکی تو وہاں ایک گراؤنڈ کا پردہ لٹکا دیا اور پیٹیوں کے ٹوٹے پھوٹے تختے جن کے کناروں پر کیلیں ابھری ہوئی تھیں وہاں ڈال دیے۔ شیرازی نے چچا امداد علی سے کہہ کر گرین روم کے برابر والا کمرہ جعفر کے لیے حاصل کر لیا اور مزید اطمینان کی خاطر اس کا بستر اٹھا کر وہاں رکھ آیا۔

شام ہوتے ہوتے شکیلا بھی پہنچ گئی۔ محسن دوپہر ہی سے اڈے پر اس کا منتظر تھا۔ وہ شکیلا کا بستر سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانے میں بڑی لذت محسوس کر رہا تھا۔ شیرازی نے اسے دیکھا تو صرف مسکرا دیا۔

شو کا آغاز شکیلا کے ناچ سے ہونا تھا۔ وہ گرین روم میں بیٹھی میک اپ کر رہی تھی۔ سب اس کے پاس ہی جمع تھے۔ محسن آرائش کا سامان اٹھا اٹھا کر دے رہا تھا۔ شکیلا نے سفید ریشمی جالی کا ٹخنوں سے اونچا لہنگا اور آدھی آستین کی چولی پہن رکھی تھی جس کے نیچے سرخ رنگ کی تنگ انگیا اس کی بھرپور چھاتیوں میں دھنسی جا رہی تھی۔ اس کا شہابی بدن ریشمی جالی سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اس نے آرائش سے فارغ ہو کر ڈھیلے لہنگے کو کسنا چاہا تو اچانک ازاربند ٹوٹ گیا اور لہنگا اس کے پیروں میں آ رہا۔ گوری گوری رانوں پر حائل مہین سا پردہ ہٹ جانے سے یکبارگی بجلی سی کوند گئی اور سب کی نگاہیں اس کے بھرے بھرے گداز جسم پر پھسلتی چلی گئیں۔ شیرازی نے مسکرا کر جعفر کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر اونچی نیچی پہاڑیوں پر جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے دیوں کو دیکھ رہا تھا۔ محسن لپک کر لہنگا اٹھانے کے لیے جھکا تو شکیلا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"تھیٹر ورائنڈ بے بی۔"

سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ محسن۔ شرمندہ سا ہو کر سر جھکائے اورنگ کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"اب دیکھیے۔ کیا ہوتا ہے ......"

تاثیر [illegible] کچھ بوڑھے کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ روشنی کا انتظام اس کے ذمہ تھا۔ اس نے اٹھ کر ہال کی بتیاں بجھا دیں اور [illegible] اسٹیج تیز روشنی میں نہا گیا۔ اسٹیج کی طرف سے شہزادہ شہرنی روشنی کی رو میں سر نکال کر تماشائیوں کو جھانکنے لگیں۔ تقبیلا حسن کی انوکھی [illegible] چھم سے اسٹیج پر پہنچ گئی۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا ——— تقبیلا نے تتلی کر کے بل دیا۔ بھرے بھرے کولہوں کو مٹکایا اور گدازچھاتیوں کے [illegible] رنگ برنگی لہروں پر اس طرح نمایاں کیا کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں آگ سی لگ گئی۔

[illegible] کر۔ تقبیلا کا میابی کے نشے میں سرشار بل کھا کر مڑی۔ اچانک اس کا پیر اسٹیج کے پیچھے خلاء کے کنارے پر پڑا ... وہ لڑکھڑائی [illegible] دیکھ پائے وہ پچھاڑ کر آسمانوں سے اترنے والی پری کی طرح اس گڑھے میں جا گری۔ ایک چیخ تالیوں کے شور میں گم ہو کر رہ گئی۔ سب نے مل کر اسے [illegible]۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ جعفر کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے محسن کو دوڑایا۔

"جاؤ تقبیلا کے لیے بستر بچھاؤ۔"

"کہاں ہے؟"

"ارے کہیں بھی بچھاؤ مگر جلدی ——— نہ جانے بیچاری کے کہاں کہاں چوٹیں آئی ہوں گی۔"

[illegible] کراہتے [illegible] پر سنبھالے گرین روم میں لے آئے۔ وہ بدحالی میں ہوتی جا رہی تھی۔ محسن بدحواس سا آیا اور انھیں اپنے [illegible] لے گیا۔ ایک بار پھر گدازنرم جسم کو ہاتھوں نے سنبھال لیا۔ چولی مسک گئی تھی۔ لہنگا الٹ کر سرخ الگیا سے دامن و گریباں [illegible] جعفر تقبیلا کی کمر کے نیچے ہاتھ کا سہارا دیے ہوئے تھا۔ تنگ برآمدے سے گزرے تو اس نے اپنے ہاتھ پر گرم گرم سی نمی محسوس [illegible] نے بڑھ کر چھوٹے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ جعفر کا بستر ایک کونے میں پڑا تھا۔ جلنگی چارپائی پر تقبیلا کا بستر بچھا ہوا تھا۔ تقبیلا کو اس چارپائی [illegible] جعفر نے روشنی میں اپنا ہاتھ دیکھا جو تازہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔

ہال میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ پردہ نہ اٹھنے کی وجہ سے تماشائی شور مچا رہے تھے۔ جعفر بوکھلایا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اس [illegible] پہنچی تو وہ اس سے بولا۔

"شیرازی تم جا کر ڈراما شروع کرا دو۔"

شیرازی ایک نظر تقبیلا پر ڈال کر دروازے کی طرف ہو لیا۔ جعفر پھر تقبیلا کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ چارپائی پر پڑی لمبے لمبے سانس [illegible] شیرازی ابھی دروازے کے قریب ہی تھا کہ جعفر نے اس کے پاس آ کر کہا۔

"شیرازی! تقبیلا کی حالت اچھی نہیں۔ کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ اور تاثیر سے کہتے جاؤ وہ ڈراما شروع کرا دے۔"

شیرازی نے جانے سے پہلے کچھ تامل کیا تو جعفر اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھ کر اس کا شانہ تھپتھپا کر بولا۔

"ڈاکٹر کی فیس کا انتظام ہو جائے گا۔"

شیرازی کے جانے کے بعد وہ دبے پاؤں تقبیلا کی چارپائی کی پٹی پر آ بیٹھا [illegible] سے لپک گئی۔ تقبیلا [illegible] جعفر نے ڈرتے ڈرتے اس کی پیشانی کو چھوا اور آہستہ سے آواز دی [illegible]

"نفیلا!"

"ہوں!"

اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں ہنکارا بھرا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

"بہت چوٹیں آئی ہیں مسٹر جعفر!"

اس نے آنکھیں کھول دیں اور بے بسی سے کراہ کر ایک ٹانگ کو ذرا سا اٹھا کر زخمی ران اسے دکھاتے ہوئے بولی۔

"بہت ٹیسیں اٹھ رہی ہیں یہاں۔"

زخموں کے گرد خون خشک ہو کر جم گیا تھا۔ جعفر کی نگاہیں زخموں سے ذرا اوپر ران کے اس ابھار پر پڑیں جو کسے ہوئے جانگیے کی وجہ سے نمایاں ہو گیا تھا۔ جہاں سرخی اور بھی گمبھیر ہو گئی تھی۔ سڈول ران پر دو چھوٹے چھوٹے زخم جیسے دو انگارے بن کر جعفر کے ذہن میں دہکنے لگے۔ اس کا دل چاہا وہ ان زخموں کو بڑے پیار سے سہلائے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مندمل ہو جائیں اور پھر گوری ران پر ہلکا سا نشان بھی باقی نہ رہے ۔۔۔۔ ان کی نگاہیں ملیں اور نفیلا کی آنکھوں میں ایک شرارہ سا لپکا۔ اس نے مسکرا کر جعفر کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اچھی ہو جاؤں گی۔"

اتنے میں محسن دودھ کا گلاس لیے اندر داخل ہوا۔ جعفر نے نفیلا کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ اس کی آغوش میں نیم دراز ہو کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر دودھ پینے لگی۔ اس کے مرمریں جسم کی گرمی جعفر کے رگ و پے میں دوڑ گئی مگر اس نے نفیلا سے الگ رہنے کے لیے اپنا جسم سکیڑ لیا۔

"میں کل بھی ناچوں گی مسٹر جعفر۔ ماڈرن تھیٹر کے لیے میں جان تک دے سکتی ہوں۔"

نفیلا نے گلاس ہونٹوں سے ہٹا کر کہا۔ جعفر اس کی آنکھوں میں ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ وہ اسے پرے ہٹا کر جلدی سے کھڑا ہو گیا مگر نفیلا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

"رات کو آپ یہیں سو جائیں۔ شاید مجھے آپ کی ضرورت پڑے۔ میری طبیعت اچھی نہیں۔"

جعفر نے ہاتھ چھڑا لیا اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"محسن سو جائے گا تمہارے پاس۔"

"محسن!!"

اس نے پلٹ کر محسن کی طرف دیکھا جو چارپائی کی پائنتی خاموش کھڑا تھا اور مسکرانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسے آپ ہی آپ ممتا جھلکنے لگی اور جعفر یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا ۔۔۔ شاید لڑکیوں کے دلوں میں پیدائش سے بھی پہلے ممتا کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر آیا تو نفیلا نے دروازے ہی سے اسے واپس کر دیا۔ جعفر چپکے سے ڈاکٹر کے ساتھ ہو لیا اور زخموں پر لگانے کے لیے پنسلین مرہم اور پینے کے لیے مکسچر لے آیا۔

اس رات درد کے باوجود نفیلا بار بار دروازے کی طرف دیکھتی رہی لیکن ہر طرف خاموشی چھائی رہی۔ اس کی چارپائی چرچراتی تو

محسن کھانس کر کروٹ بدل لیتا اور پھر لمبی سانس چھوڑ کر گھٹنے پیٹ سے لگا لیتا۔

جعفر کی آنکھ اس وقت کھلی جب کئی موٹی موٹی بوندیں اس کے چہرے پر آ پڑیں۔ اس نے چونک کر سڑک کی طرف دیکھا۔ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ بلبلے بن بن کر ٹوٹ رہے تھے۔ کالے کالے بادل ڈاکخانے کی چھت کی چمنیوں سے بھی نیچے اتر آئے تھے۔

شیرازی ایک طرف بیٹھا چچا امداد علی کے چولہے سے کوئلہ لے کر دانت مانجھ رہا تھا۔ قمر کارنس پر آئینہ رکھے شیو بنا رہا تھا۔ جعفر دیر تک وہیں پڑا بھیگتا رہا۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ بوندوں کے یکبارگی چہرے پر آ گرنے سے اسے بڑا سکون مل رہا تھا۔ کھلی جگہ پر سونے کے باوجود رات بھر وہ انگاروں پر لوٹتا رہا تھا گو بظاہر معلوم ہوتا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور پھر تھیلی کا خیال آتے ہی اتنے اہتمام سے اس کے ناشتے کے بندوبست میں لگ گیا کہ اس کے ساتھی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

ٹین کی چھت پر بوندیں گنگنا رہی تھیں۔ کبھی کبھی بادل اتنے زور سے گرجتا کہ سٹیج کے تختے تک ہل جاتے۔ جعفر نے دن میں کئی بار بڑے خلوص سے دعا مانگی تھی کہ بارش رک جائے مگر بارش کا زور بڑھتا ہی گیا اور اس وقت وہ پردے کے پیچھے کھڑا ذرا سی جھری سے تماشائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انھیں گننے لگا —— ایک، دو، تین —— صرف تین ہی آدمی اگلی صف میں بیٹھے تھے۔ اس نے سارے ہال کا جائزہ لیا۔ کل ستر تماشائی تھے —— اس نے سوچا ان کے ٹکٹوں کے پیسوں سے تو ایک وقت کا کھانا بھی نہیں چل سکتا۔

شیرازی ونگ میں کھڑا کندھے جھٹکا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنے زور سے گردن کا پٹھا ہموار کرتا کہ قمر اسے دیکھ کر گھبرا جاتا۔ جعفر کو اس حالت میں دیکھ کر شیرازی کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آیا اور اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے ونگ میں لے جا کر کہنے لگا۔

"جعفر صاحب! یوں پریشان ہونے سے تو کام نہیں چلے گا۔"

"تماشائیوں کی تعداد تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔"

جعفر نے مایوسی سے کہا۔

"دیکھ رہا ہوں جی۔ کل بھی تو یہی ہال تھا جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے سٹیج پر آ کر ہمیں مبارکباد دی تھی۔ آج بارش کی وجہ سے لوگ نہیں آئے تو نہ سہی۔"

"مگر سارا خرچ کیسے پورا ہو گا؟"

"سب ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ چچا امداد علی سے لے کر جو روپے خرچ کیے تھے ان میں سے تھوڑے سے باقی ہیں۔ وہ کل کی آمدنی میں سے دے دیں گے۔ جو بچے گا اس سے پنڈی پہنچ جائیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ شو شروع کرا دو۔"

شیرازی کچھ دیر وہیں کھڑا کندھوں کا بوجھ اتارتا رہا پھر دوسرے ونگ سے ہوتا ہوا گرین روم میں چلا گیا۔ محسن منہ لٹکائے ایک طرف بیٹھا تھا۔ ڈرامے میں حصہ لینے والے میک اپ میں مشغول تھے۔ شیرازی نے محسن سے پوچھا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"کون؟"

"ارے یہی تمھاری —— نفیلا —— اور کون؟"

بانو کا لہجہ ابھی تک تلخ تھا۔

"وہ نہیں آسکے گی۔"

"کیوں؟"

"اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔"

"اور ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شیرازی نے جھنجھلا کر سر کے بال نوچ لیے اور ایک کرسی پر گر کر بڑبڑانے لگا۔

"سب کا بیڑا آج ہی غرق ہونا تھا۔ سالی نے گرنا ہی تھا تو تیسرے دن گرتی ہوتی —— اور اس کو دیکھو اتنا سا منہ نکالے پھر رہا ہے آتا ہی دیا ہے تو حضور چمکے گا ماڈرن تھیٹر کا نام —— مائی فٹ ——"

اس نے ڈراما شروع کرا دیا اور جعفر کو تلاش کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے کوئی تسلی دے یا شاید وہ خود اس بات کا متمنی تھا کہ کوئی اس کی ڈھارس بندھائے۔ جعفر برآمدے میں کھڑا سر شام پھیلے ہوئے اندھیرے میں سامنے والے مکان کی روشن کھڑکی پر نگاہیں دوڑائے دو سایوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک دوسرے میں پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ شیرازی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو دونوں کی آنکھیں ملیں تو ان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ نفیلا کے کمرے کی طرف ہو لیے۔

نفیلا بخار کی حالت میں بڑبڑا رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ محسن کی حالت بھوکے بلے کی سی تھی جو پانی کی طرف بے چینی سے چکر کاٹ رہا تھا۔ جعفر نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑی ہمدردی سے بولا۔

"فکر نہ کرو۔ نفیلا اچھی ہو جائے گی۔"

محسن اس کی بغل میں سر دے کر سسکیاں لینے لگا۔

جعفر نے آگے بڑھ کر نفیلا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ اس نے گھبرا کر شیرازی کی طرف دیکھا اور شیرازی صرف کندھے جھٹکا کر رہ گیا۔ جعفر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کل صبح نفیلا کو پنڈی بھیج دیں۔"

شیرازی خاموش رہا۔ پھر چپ چاپ کمرے سے نکل کر گرین روم کی طرف چلا گیا۔

بس پنڈی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ نفیلا سیٹ کی پشت پر سر ٹیکے نڈھال سی بیٹھی تھی۔ جعفر اور شیرازی ایک طرف اداس کھڑے تھے اور ان کے قریب محسن ایک بنچ پر بیٹھا حسرت بھری نگاہوں سے نفیلا کے مضمحل اور اداس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جعفر کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ اسے دیکھ کر مغموم ہو گیا۔ اسے خیال آیا —— نہ جانے محسن کے ننھے سے دل میں کیسے کیسے طوفان اٹھ رہے ہوں گے —— اس نے شیرازی کے قریب آ کر کہا۔

"شیرازی!"

"جی!"

"محسن کو کریما کے ساتھ بھیج دو۔"

"محسن کو"

"ہاں — راستے میں اس کا خیال رکھنا۔"

"اچھا!"

حمید کو [illegible] محسن کریما کے ساتھ پنڈی چلا جائے گا۔ وہ جانتا تھا کریما کی عدم موجودگی میں رات بھر محسن کی آنکھوں میں ساون بھادوں [illegible] رہی تھی۔

[illegible] بارش نے سب [illegible] پر پانی پھیر دیا۔ واپسی کے سبب جب بستر سے کندھوں پر سنبھالے اپنے اپنے فن کار مال روڈ سے بس [illegible] طرف گزر رہے تھے تو بارش کا سلسلہ جاری ہو رہا تھا۔ چچا امداد علی ہوٹل کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ ماڈرن تھیٹر کے نام عبراما سدہ بل [illegible] جیب [illegible] لئے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ جانتا تھا ایسے [illegible] نا دہند نہیں ہوتے بل ہاتھ کر زخمی دلوں پر نمک پاشی [illegible] سکے [illegible] کرتے تھے۔

[illegible] آسنے والے حالات نے ستم ظریفی پر [illegible] رہا تھا۔ شاید مدہیں گزر جاتیں اور ماڈرن تھیٹر پر مایوسیوں کے بادل امڈ گھمنڈ کر [illegible] دو بہر دفتر کی بلانے سے سب کے [illegible] شگفتہ ہوتے گئے اور سب نے مل کر افتتاح کا پروگرام [illegible] اور نفر شہر سے ہی چھپے ہوئے دعوتی کارڈ سول اور ملٹری افسروں اور شہر کے باذوق لوگوں میں تقسیم کرتے پھرے۔

ماڈرن تھیٹر کا دفتر نئی نویلی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ فرش پر مانگے کے اعلیٰ قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جدید ڈراما سے [illegible] معلوماتی چارٹ آویزاں تھے۔ چھت کے گوشے سے آتی ہوئی رنگیں جھکیاں کونوں میں پڑی تھیں اور رنگ برنگے کوشن دیواروں کے ساتھ سجائے [illegible] گئے تھے۔ ساتھ والے چھوٹے کمرے میں ناشتہ اور مہمانوں کے لیے نان حطائیاں اور بسکٹ لفافوں میں ڈال رہے تھے اور [illegible] کر بڑے سے دیگچے میں پشاوری قہوہ کے لیے پانی ابل رہا تھا۔ محسن چولھے کے سامنے میٹھا لکڑیاں جھونک رہا تھا۔

[illegible] نیلے رنگ کی [illegible] پہنے، دستانوں کا جوڑا ہاتھ میں لیے اور چسٹر بازو پر ڈالے شانِ بے نیازی سے داخل ہوا۔ اس [illegible] کی سُرخی اور آنکھوں میں چڑھتے سورج کی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر رہا تھا آنا چھوٹا بابا بیتا [illegible] بے حد ناپاک ہو جاتی۔ اس نے اندر آ کر گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ جب اس کی نظر فلوٹ ماسٹر پر پڑی تو [illegible] [illegible] کی طرف دیکھتا رہا۔ فلوٹ [illegible] [illegible] سے جھلملا [illegible] [illegible] اس نے [illegible] کرنے کا دامن کشنوں پر پھیلا [illegible] اور کے [illegible] [illegible]

[illegible] میں پوچھا۔

"کون ہے وہ؟"

"[illegible] بابا ہے اسے بہتر [illegible] سب فلوٹ بھی اچھا بجا لیتا ہے۔"

"[illegible] ٹھیک ہے"

فلوٹ ماسٹر کمیمن تھا۔ وہ ان کی گفتگو سُن کر چپکے سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جعفر کی نظر مٹی میں لتھڑی ہوئی اینٹ پر پڑی جس کو قالین پر رکھ کر فلوٹ ماسٹر بیٹھا ہوا تھا جعفر مسکرا کر اُٹھا اور اینٹ باہر پھینک آیا۔ تاثیر کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو وہ بھنّایا ہوا آیا اور شیرازی کو جعفر سے کمرے میں سے جا کر کہنے لگا۔

"یار یہ جعفر صاحب کی بہت زیادتی ہے۔"

"کیا؟"

"اس نے فلوٹ ماسٹر کو نکال دیا ہے۔ ہارمونیم بجانے والا بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا ہے ــ سارا پروگرام تباہ ہو جائے گا۔"

"تم فکر نہ کرو جان" شیرازی نے اسے پچکارا ــ "ماڈرن تھیٹر کا وقار تو اونچا رہے گا۔"

تاثیر اس کی بات نہ سمجھ کر غصے کی حالت میں وہاں سے ہٹ کر چولہے کے پاس جا کھڑا ہوا اور ہاتھ پھیلا کر آگ سینکنے لگا ــ

پروگرام کے وقت شیرازی نے ہارمونیم سنبھال لیا اور محمود ٹبلے پر ہلکی ہلکی تال دیتا رہا۔ مگر یہ ماحول کی اس رنگ برنگی محفل کو دیکھ کر تاثیر کا غصہ جاتا رہا اور وہ سوچنے لگا ـــ اگر اس محفل میں فلوٹ ماسٹر ہوتا تو اس کی موجودگی ایسی ہی ہوتی جیسے سیمنٹ اور چونے سے بنی ہوئی عمارت کی پیشانی پر لٹکا ہوا کالا ہنڈیا۔

اور جب سیمنٹ فیکٹری واہ سے آفر آئی تو شیرازی اس دوکاندار کی طرح آنکھیں پانی مار کر چوکی پر آ بیٹھا جس کا کاروبار چل نکلا ہو۔ اس کے نزدیک ماڈرن تھیٹر کی کامیابی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس نے فیکٹری والوں کی طرف سے دی گئی رعایات پڑھ کر سنائیں ـــ رات کا کھانا، آنے جانے کے لیے فری بس اور ڈھائی سو روپے نقد ـــ محمود جو ٹھوڑی ہاتھ پر رکھے بیٹھا تھا بڑی سادگی سے بولا۔

"منظور کر لو جی ـــ ڈھائی سو روپے نقد اور روٹی کپڑا مفت ـــ بُرے نہیں۔"

اس وقت پہلی بار لڑکوں نے جعفر کو قہقہہ مار کر ہنستے سُنا۔

"لیکن وہاں ناچ گانے کے بغیر کام نہیں چلے گا۔"

شیرازی نے کندھے جھٹک کر کہا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جعفر گردن جھکائے تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، پھر پوچھنے لگا۔

"وہ کیوں؟"

"وہاں سب مزدور طبقہ ہے۔"

"تو پھر ان کے لیے بھانڈوں کی ٹولی پکڑ کر کہاں سے لائیں؟"

"اب دیکھو ہیں ـــ کوشش کریں تو ناچنے والیوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"وہی ہیں۔"

شیرازی اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا جیسے اس نے ساری تفصیل بتا دی ہو جعفر نے ذرا آگے ہو کر گھٹنے پر ہاتھ رکھا اور رک رک کر پوچھنے لگا۔

"کون ـــ وہ تو نہیں ـــ میری رشک قمر؟"

شیرازی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے"

"نہیں ـــ ان کے لیے ہمارے ہاں جگہ نہیں۔ میں ماڈرن تھیٹر کو قصائی گلی نہیں بنانا چاہتا۔"

جعفر نے سنجیدگی سے کہا۔ کافی دیر تک محفل پر سناٹا چھایا رہا۔ جب خاموشی ناگوار گزرنے لگی تو جعفر نے شیرازی سے کہا۔

"انھیں لکھ دو ہمیں منظور ہے ـــــ ہم ڈرامے کو زندگی کے اتنا قریب لے آئیں گے کہ حقیقت کا گمان ہونے لگے ـــ تم فکر نہ کرو ـــ وہ خوش ہو جائیں گے ـــــ ہمارے ملک کا مزدور بہت سمجھدار ہے۔"

ماڈرن تھیٹر کا دفتر رات گئے تک آباد رہنے لگا۔ پڑوس میں تمباکو کا کاروبار کرنے والے پٹھانوں کے چھوکرے دروازے کی درزوں سے انھیں جھانکتے۔ انھیں مٹکاتے بولتے اور طرح طرح کی حرکتیں کرتے دیکھتے اور پھر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر اس طرح ہنس دیتے جیسے دنیا کے بیوقوفوں کے بادشاہ جمع ہوں۔

واہ جانے میں تھوڑے ہی دن باقی تھے۔ جعفر مثل پیس سے ٹیک لگائے ریہرسل کرنے والوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ اتنے میں شیرازی آیا اور جعفر کے پاس جا کر ایک خط نکال کر اسے دیا۔ جعفر نے خط پڑھا اور اسے ایک طرف ڈال کر مضمحل سا ہو کر مثل پیس پر جھک گیا۔ کافی دیر تک وہ یونہی سر جھکائے کھڑا رہا اور شیرازی دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے لگا کہ اس نے وہ خط لا کر اسے کیوں دیا۔ جعفر نے ایک سانس بھری اور سب سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ڈرامے کی دنیا میں ابھی ہم بہت پیچھے ہیں ـــ فیکٹری والوں کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے ڈرامٹک پارٹی کے بغیر آنے کی ضرورت نہیں۔"

"جبار اور وجاہت بھی اس پروگرام کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔" شیرازی نے وضاحت کی۔ جعفر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اس طرح منہ بنایا جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز اس کے دل کو کھرچ رہی ہو مگر اس نے جلدی ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا اور پیشانی ایک ہاتھ میں تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ ڈرامٹک پارٹی سٹیج اور ڈرامے کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو گئی ـــ انھیں یقین تھا اب واہ فیکٹری لے جانے کے بجائے کوئی بس آ کر ماڈرن تھیٹر کے دروازے پر نہیں رکے گی۔ سب ریہرسل چھوڑ کر سانس روکے جعفر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شیرازی نے زور زور سے کندھے جھٹکائے اور آنکھیں زور سے بند کر کے پانی کے دو قطرے بہا کر آہستہ سے کہا۔

"چچا امداد علی کا بل ابھی باقی ہے۔ کہیں وہ ہمیں نادہندہ ہی نہ سمجھ لے۔"

جعفر نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ سے پیشانی رگڑنے لگا۔ وہ دیر تک تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر بجھے ہوئے انداز میں بولا۔

"جاؤ شیرازی! ان قصائی گلی والیوں کو لے آؤ۔"

"قصائی گلی والیوں کو؟" شیرازی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں شیرازی! عزت کا سوال ہے۔"

شیرازی نے غور سے جعفر کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے شکست خوردہ پورس سکندر کے دربار میں کھڑا ہو۔

مغرب کی ہواؤں میں

عنایت اللہ

آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ زیادہ سویا تھا یا بھونڈے سے ایک خواب کا اثر تھا کہ مزاج اکھڑا اکھڑا سا محسوس ہوا۔ اعصاب بھی ٹھیک حالت سے نکلے۔ میں نے اٹھ کر سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی تو ہوا کے تیز جھونکوں نے میری پیشانی پر پڑے ہوئے بالوں کو ترتیب یا بے ترتیب کر دیا۔ ان مرطوب اور خنک جھونکوں نے جیسے روٹھے ہوئے بچے کو بہلا لیا ہو۔ سمندر دنیا کے رنج و غم دھو ڈالتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں یا آنکھیں قرار پا کے خود ہی بند ہو گئیں۔ نیند اور خواب کے اثر کو سمندری ہوا نے دھو ڈالا۔ کمرے میں چائے کی پیالیوں کی ہلکی سی ٹن ٹن کی لطیف سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے سامنے کلفٹن کا ساحل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بادلوں کے گھنے بادلوں کے سائے تیزی سے سمندر کی سطح پر تیرتے، ریت پر پھیلتے ہوٹل کے اوپر سے گذر رہے تھے۔ لہریں بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ ساحل کو چوم کر موجیں لوٹ رہی تھیں۔ لوٹ رہی تھیں پھر آنے کے لیے۔ سورج سمندر میں ایستادہ چٹانوں پر، بکھری ریت اور پانی کے اس کھیل کو مسکراتی ہوئی الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سورج کی بجھتی ہوئی آخری کرنوں کی زرد روشنی کو میں جسم کے انگ انگ میں محسوس کر رہا تھا۔ اس روشنی میں بھی روح افزا رنگ تھا۔

کمرے میں پیالیوں کا ترنم، "صاحب! چلئے" کے مانوس الفاظ اور بیرے کے کمرے میں سے نکلنے کی آہٹ ذرا سی دیر کے لیے گونج کر خاموش ہو چکی تھی اور میری نگاہیں کلفٹن کے ساحل پر بکھرے ہوئے انسانوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ سامنے والے مزار کے گنبد سے کبوتروں کا غول بے ہنگم پھڑپھڑاہٹ سے اڑا۔ ذرا اوپر اٹھا اور زمین کی طرف آنے لگا۔ میری نگاہوں نے اس غول کے تعاقب میں زمین کی طرف دیکھا۔ کبوتروں نے زمین پر اترنے کے لیے تڑپتے ہوئے پروں کو پھر جنبش دی جیسے ڈر گئے ہوں اور غول پھر ہوا میں بلند ہو گیا لیکن میری نگاہیں زمین سے اٹھ نہ سکیں۔ دو گھوڑے مستانہ خرام جا رہے تھے۔ ایک پر ایک ادھیڑ عمر آدمی سوار تھا۔ سر کے بال سفید، چہرے پر ایک گونہ وقار اور بیٹھنے کے انداز میں بھی جلال تھا۔ دوسرا سوار ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے پتلون پہن رکھی تھی۔ تنگ قمیص اس کے جسم کے نشیب و فراز کو بے نقاب کر رہی تھی۔ بھورے رنگ کے کٹے ہوئے بال مغرب کی خنک ہواؤں سے کھیل رہے تھے۔ سپیدی مائل گلابی چہرے کی گولائی اور مرمریں گردن کا خم عشق و محبت کے بل نکال رہا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر لڑکی کا اٹھتا ہوا جسم جیسے جھیل کی چھوٹی چھوٹی لہروں پر کنول کا پھول تیر رہا ہو۔ گھوڑے میرے ہوٹل سے تھوڑی ہی دور جا رہے تھے۔ میں منظر کی رنگینی میں ضرورت سے زیادہ جذب ہونے لگا تھا کہ کمرے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی جو بڑھتے بڑھتے میرے کندھے پر ایک بے تکلفانہ تھپکی پر آ ختم ہوئی اور ساتھ ہی ایک مانوس سا ہیولا

کہ جس سے میری ہر شام کا آغاز ہوا کرتا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ حفیظ باہر جانے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی سو کر اٹھے ہو . . . ." حفیظ نے بڑے شگفتہ انداز سے کہا . . . . "اور چائے بھی رکھی ہوئی ہے۔"

میں نے حفیظ کو جواب دینے سے پہلے ایک بار پھر باہر دیکھا اور میرا دل بیٹھ سا گیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار حفیظ پر غصہ آیا۔ دونوں گھوڑے مزار کی دوڑ میں عجیب چپکے سے . . . میں نے انہیں غلاموں میں تلاش کیا لیکن وہاں کبوتر اڑ رہے تھے۔ حفیظ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا اور وہ غالباً کمرے میں ادھر ادھر ٹہل بھی رہا تھا۔ میری نگاہوں نے گھوڑوں کو تلاش کر ہی لیا۔ کنول کا پھول بہتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا اور اب سمندر کے ساتھ ساتھ ساحل پر جا رہا تھا۔

"اس طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" حفیظ نے مجھے گم سم دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! وہ . . گھوڑے . . . ."

حفیظ چائے کی پیالی اٹھانے سے پہلے میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس نے ساحل کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر اس قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی جس میں مجھے . . . کا فاتحانہ . . . لہراتا ہوا دکھائی دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے . . . پہلی بار دیکھا ہے۔"

"اور وہ بھی دور سے۔" میں نے کہا۔

"تو کل قریب سے دکھا دوں گا۔"

یہ معلوم کر کے مجھے مسرت سی ہوئی کہ حفیظ ان دونوں کو جانتا ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ راہ و رسم بھی پیدا کر چکا ہے۔

"یہ باپ بیٹی ہیں کون؟" میں نے پوچھا۔

"باپ بیٹی نہیں . . . ." حفیظ نے مجھے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میاں بیوی!"

"میاں بیوی؟" یوں لگا جیسے مغرب کی ہواؤں کی تندی بڑھ گئی ہے اور کمرہ لرز اٹھا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن حفیظ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا یقین کرنا ہی پڑا۔

گھوڑے بہت دور ساحل پر جا رہے تھے۔ کبوتر مزار کے گنبد پر بیٹھ چکے تھے اور میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ رہے تھے۔

"اس لڑکی کی عمر بمشکل بائیس برس ہوگی اور اس کا خاوند نصف صدی سے زیادہ جی چکا ہے . . . ." حفیظ کہہ رہا تھا "وہ میڈیکل سروس کا ریٹائرڈ کرنل ہے۔ آدمی خوب ہے اور لڑکی ذہین ہے۔ بڑی . . . ہے لیکن قدرے ریزرو۔ بہرحال میرے ساتھ خاصی کھل گئی ہے۔"

حفیظ کے "کھل جانے" کی اصطلاح کو میں خوب سمجھتا تھا۔ عجیب زندہ دل انسان تھا۔ طبیعت میں بلا کی شگفتگی اور [illegible] میں جاذبیت۔ چہرہ ہر وقت روح افزا مسکراہٹ کی طرح کھلا رہتا تھا اور پیانو پر اس کی انگلیاں یوں چلتی تھیں جیسے ندی کا پانی چھوٹے چھوٹے پتھروں میں سے گزر رہا ہو۔ کون تھا جو پہلی ہی ملاقات میں حفیظ سے نہ کھل جاتا تھا۔ اس لڑکی کا حفیظ کے ساتھ بے تکلف ہو جانا میرے لیے حیران کن نہ تھا لیکن میں ایک جانے پہچانے خدشے کے خیال سے قدرے پریشان سا ہوا۔ بڑھاپے اور شباب کا یہ ملاپ بجائے خود [illegible] تھا اور ان دونوں کے درمیان حفیظ جیسی منچلی جوانی کے آ جانے میں مجھے معاشرے کی بسا اوقات سنی ہوئی کہانی پھر سنائی دینے لگی۔ یہی غالب

وہی کردار وہی پس منظر جو ایک عمر گذری سنتے چلے آتے ہیں اور شاید سنتے ہی چلے جائیں گے۔

"ارے نہیں یار! ..... "حفیظ نے مجھے تسلی سی دیتے ہوئے کہا: "ایسی کوئی بات نہیں۔ لڑکی اس خاوند پر دل و جان سے فدا ہے۔ یہ نہ سمجھو کر وہ بلاٹ سا ہے۔ یہ تو محض میں ذرا سی چاشنی پیدا کرنے کا بہانہ ہے کہ میں نے لڑکی سے راہ و رسم پیدا کر لی ہے۔ کراچی کی ہنگامہ پرور مردنی میں اور رکھا ہی کیا ہے...... "حفیظ پر شاعرانہ سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ بولا: "ساون کے ان پہلی بادلوں کی چھاؤں میں قہقہے لگاتے ہوئے سمندر کے کنارے روحی کی دلگداز مسکراہٹیں اور شوخیاں...... سبحان اللہ!"

اس کا نام روحی تھا۔

دوسری روز سے ساحل کے ساتھ ساتھ ہر شام چار گھوڑے جا رہے تھے۔ آگے آگے روحی اور حفیظ کا اور پیچھے پیچھے ہمارا کرنل کا۔ حفیظ نے دو گھوڑے ایک اپنے لیے اور ایک میرے لیے پورے ڈیڑھ ماہ کے لیے کرایے پر لے لیے تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی میں نے کرنل اور روحی کے متعلق تمام تر تفصیلات معلوم کر لیں۔ وہ بھی یہاں ہماری طرح چھٹیاں گذارنے آئے ہوئے تھے۔ میں نے جونہی کرنل کو بتایا کہ میں بھی حفیظ کے ساتھ سول ایوی ایشن کا سیکنڈ پائلٹ ہوں تو اس نے بے ساختگی سے پوچھا ـــ "تو پھر آپ فرانس کئی بار گئے ہوں گے؟"

بظاہر یہ عام سا سیدھا سادہ قسم کا سوال معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے کرنل کے چہرے کا جائزہ لیا تو میں نے اس کے تاثر میں نمایاں تبدیلی دیکھی جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ فرانس کے ساتھ کرنل کی گہری وابستگی ہے جسے جذباتی بھی کہا جا سکتا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ کسی حادثے کی تلخ یاد نے انگڑائی لی ہو۔ اس شام بات آئی گئی ہو گئی۔ حفیظ اور روحی واپس آ رہے تھے۔ ہم چاروں اکٹھے واپس لوٹے۔ مزار کے پاس پہنچ کر ہم نے کرنل اور روحی کو الوداعی سلام کہا۔ میں نے ان دونوں کی مسکراہٹوں کو بغور دیکھا۔ کرنل کی مسکراہٹ میں بے ساختگی، محبت اور خلوص کی جھلک نمایاں تھی اور روحی کی مسکراہٹ میں چلبلا پن، لڑکپن اور رسمی قسم کا تصنع تھا لیکن مسکراہٹ حفیظ کے الفاظ میں یقیناً جانفزا تھی۔ روحی کی آنکھوں میں میں نے ایسی چمک دیکھی جس میں شباب کی قیامت خیزیاں بیدار ہونے سے پہلے کی انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ ہم دونوں ان دونوں کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ ذرا دور جا کر روحی نے پیچھے دیکھا اور بازو اوپر کر کے ہاتھ ہلا کر پھر الوداع کہی جس کا جواب حفیظ نے پرجوش طریقے سے بازو ہلا کر دیا۔

"کرنل کچھ کہتا تھا؟" حفیظ نے مجھ سے پوچھا: "یعنی میرے اور روحی کے متعلق؟"

"نہیں تو!" میں نے جواب دیا: "وہ زیادہ دیر اپنے اور میرے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔"

پھر ہر شام ہم چاروں ساحل پر جانے لگے۔ ہم بہت دور تک چلے جایا کرتے تھے۔ ترتیب وہی ہوتی تھی ـــ آگے آگے روحی اور حفیظ اور پیچھے پیچھے کرنل اور میں ـــ

حفیظ اور روحی جس قدر آپس میں گھل مل ہوتے جا رہے تھے میں تقریباً اسی قدر کرنل کی باوقار سنجیدگی اور پرجلال زندہ دلی میں محو ہونے لگ گیا۔ اس کے سفید بالوں، نیلی آنکھوں اور سپیدی مائل گندمی چہرے پر چھائے ہوئے پچاس برسوں کے نقوش میں ایک خاص کشش تھی۔ اس کی باتوں اور لب و لہجے میں زندگی کا رچاؤ ابھی تک جوان تھا۔ لیکن روحی کی موجودگی میں کرنل عمر سے زیادہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ روحی حسین تو تھی ہی لیکن کرنل کے ساتھ تضاد میں وہ بہت ہی حسین اور بچوں کی طرح معصوم دکھائی دیتی تھی۔ کرنل کے ساتھ وہ یوں باتیں کرتی تھی جیسے اسے

معلوم ہی نہیں کہ وہ نوخیز دوشیزہ ہے اور اس کا خاوند جوانی کے برسوں گذر رہے بڑھاپے کی بھینٹ چڑھ چکا ہے یا شاید روحی کو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ وہ اسے بچہ اور ہم عمر سمجھتی تھی۔ بلاشک و شبہ روحی کرنل کو چاہتی تھی۔

بعض اوقات جب وہ حفیظ کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار ہم سے بہت دور آگے نکل جاتی تھی تو مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی تھی —— گھوڑے کو ایڑ لگا کر کرنل کے قریب آ جاتی تھی اور بچوں کی طرح کرنل کے بازو کو کھینچ کر کہتی —— "آپ تو پیچھے ہی دور رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ساتھ رہئے نا!" —— ایسے میں وہ ننھی سی پیاری سی بچی دکھائی دیتی تھی اور کرنل کا پیار سے لبریز انداز —— روحی کا ہاتھ تھام کر یا اس کے بالوں کو سہلا کر کہنا: "تم چلو روحی! ہم آ رہے ہیں۔"

لیکن حفیظ اور روحی کا آپس میں اس قدر گھل مل جانا؟ ...... ایک شام میں نے روحی کو اس طرح کرنل کے بازو کے ساتھ چپکے ہوئے دیکھا تو چاہا کہ انھیں تنہا چھوڑ دوں اور حفیظ سے جا ملوں اور اسے کہوں —— "حفیظ! روحی جوان نہیں وہ بچی ہے۔ جانے کون سی جس کی تشنگی نے اسے کرنل کے بڑھاپے میں لا پھینکا ہے۔ وہ اس مرجھاتے ہوئے پیڑ تلے بیٹھ سستانا چاہتی ہے۔ اگر وہ بچی نہیں تو کرنل بھی بوڑھا نہیں۔ آؤ حفیظ! ہم ان کی دنیا سے نکل چلیں۔ ان دونوں نے اپنی دنیا پیار سے سجا لی ہے۔ کرنل بوڑھا ہی سہی، اس کی روح جوان ہے حفیظ! —— روحی سے بھی جوان —— جسم جوان ہو کر بوڑھا ہوتا ہے۔ یہ جسم کی ٹریجیڈی ہے اور روح بوڑھی ہو کر جوان ہوتی ہے۔ یہ روح کی کامیڈی ہے —— روحی کو کرنل کی روح سے عشق ہو گیا ہے۔ کرنل کی بے خم گردن اور کندھوں کی سیدھائی میں ایک مرد ابھی تک زندہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ جوان ہوتا جا رہا ہے۔ روحی اس میں روح پھونک رہی ہے۔ حفیظ! آؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ......" لیکن حفیظ مجھ سے بیس پچیس قدم دور تھا اور روحی کا گھوڑا مجھے اور کرنل کو اکیلا چھوڑ کر پھر حفیظ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

"روحی نے میری مرجھاتی ہوئی روح کو زندہ کر دیا ہے ......" کرنل نے روحی کی طرف دیکھ کر جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "میرے سینے میں ابھی تک دوسری جنگ عظیم کی توپیں گرج رہی ہیں۔ میرے دماغ میں ابھی تک بمبار جہازوں کے ہیبت ناک غول آباد بستیوں پر بم برسا برسا کر انسانی زندگی کو ملبے، گرد اور سیاہ دھوئیں میں دفن کر رہے ہیں۔ ابھی تک میرے دماغ میں زلزلے بپا کیے ہوئے ہیں۔ میری روح ابھی تک ٹینکوں کی آتش بازی سے لرز رہی ہے۔ میرے اعصاب ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ میں فوج میں ڈاکٹر تھا۔ میں زخمیوں کے کیمپوں اور ہسپتالوں میں شبانہ روز موت کے ساتھ سینہ سپر رہا ہوں۔ میں نے سینکڑوں کو موت کے منہ سے کھینچا ہے لیکن ان میں سے اکثر کا ایک آدھ بازو یا ٹانگ موت کے منہ میں ہی رہ گئی۔ ہزاروں تھے جو میرے سامنے میری ہزار کوششوں کے باوجود مر گئے۔ جنگ ختم ہونے کے پانچ برس بعد تک بھی ذہن اور روح سے خون کے دھبے نہ دھو سکا۔ میری تنہا راتوں میں زخمی کراہتے رہتے تھے۔ جنگ کی ہیبت ناکیاں مجھے جوانی میں ہی بوڑھا کر چکی تھیں اور میں دنیا کی گہما گہمی سے کنارہ کش ہوتا جا رہا تھا۔ میں ملازمت سے ریٹائر ہو گیا اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔ میں نے انسانوں کی خدمت میں دن رات کا چین صرف کر ڈالا۔ میں ہر لمحہ مرض اور موت سے نبرد آزما رہا۔ میں نے ہر لمحہ ہر جگہ سکون تلاش کیا، سکون کہیں نہ ملا۔ توپوں کی گرج اور زخمیوں کی آہ و بکا میرے سینے میں بڑھتی ہی گئی۔ ایک روز روحی میرے پاس سر درد کے علاج کے لیے آئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے تمام درد ختم ہونے لگے ہیں۔ وہ کئی بار میرے پاس آئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آتی رہے۔ وہ آتی رہی اور ایک دن وہ میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ میرے بکھرے ہوئے اعصاب ٹھکانے پر آنے لگے۔ اب یوں لگتا ہے جیسے میں نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ گو اب بھی جنگ کے ہولناک مناظر مجھے کبھی کبھی پریشان کرتے ہیں لیکن

ہیں روحی کی معصومیت کے کارن ہی انسان کی بربریت کو بھول جاتا ہوں۔۔۔۔۔"

پھر کرنل کی باتوں میں بند سب ہو گیا تھا۔ گھوڑے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ ہوائیں بہت تیز چل رہی تھیں۔ روحی اور حفیظ ہم سے بہت دور آگے چلے جا رہے تھے۔ کرنل کا لہجہ کسی حد تک درد آلود تھا اور ہونٹوں پر زیرِ لب تبسم جس میں جانے کتنی ہی لاشوں کی ہچکیاں سوئی ہوئی تھیں۔ کرنل کے لہجے میں درد کی آمیزش زیادہ ہو گئی۔ وہ مجھے جنگ کی ہولناکیوں کے قصے سنا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم پرانی بات ہو گئی ہے اور دنیا اب ایک اور جنگ کی تیاریاں مکمل کر چکی ہے۔ لاشیں گل سڑ گئی ہیں اور ان پر گری ہوئی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں ایک بار پھر گرنے کے لیے۔ جو فوجی اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اب ان کے بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں ایک اور جنگ کی بھینٹ چڑھنے کو۔ مصر اور یونان کے دیوتا پھر زندہ ہو گئے ہیں اور انسانوں کا خون مانگ رہے ہیں۔ کرنل کو معلوم تھا کہ وہ کوئی نئی بات نہیں سنا رہا لیکن اس کے سنانے کا انداز یقیناً نیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے ذہن میں جنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔

ایک طویل روئداد سناتے سناتے اس نے کہا ــــ انسان نے انسان کو کس طرح مارا؟ ہر طریقے سے۔ کس طرح کاٹا؟ قصاب کی طرح۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خود بھی کٹنے والا ہے، وہ کٹنے سے پہلے اپنی موت کا انتقام لے رہا تھا لیکن فرانسیسیوں نے جس طرح جرمنوں کو مارا ۔۔۔۔ "کرنل چپ ہو گیا۔ اس کے جسم نے جھرجھری لی۔

اس نے بتایا کہ فرانس کو جرمنی کے چنگل سے چھڑا کر جب اتحادی فوجیں وہاں پہنچیں تو وہ بھی ایک یونٹ کے ساتھ وہاں گیا۔ فرانس کے باشندوں نے اسے بتایا کہ ــــ جرمن افسر فرانسیسیوں کے ساتھ ان کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے تھے اور وہاں ہر طرح کی عیاشی اور حکومت کرتے تھے۔ فرانسیسیوں نے کئی جرمن افسروں کو قتل کیا اور خود گولی کا نشانہ بن گئے۔ آخر کسی فرانسیسی نے قتل کا عجیب و غریب طریقہ ایجاد کیا۔ وہ اس طرح کہ وہاں اکثر مکانوں کی سیڑھیاں ٹائلوں یا اچھی قسم کے پتھروں یا لکڑی کی بنی ہوتی ہیں۔ اوپر سے پہلی یا دوسری سیڑھی پر صابن مل دیا جاتا تھا اور نیچے ایک آدمی موٹا سا ڈنڈا لے کے چھپ جاتا تھا۔ جب جرمن افسر سیڑھیوں پر چڑھتا یا اترتا تھا تو اس کا پاؤں پھسل جاتا تھا اور وہ بری طرح لڑھکتا ہوا نیچے آ رہتا تھا۔ بیشتر اس کے کہ وہ سنبھل سکے ڈنڈا اس کے سر کے نازک حصے پر پڑتا تھا۔ گرنے والا کچھ تو چوٹ سے اور زیادہ تر اچانک صدمے سے مر جاتا تھا اور فوجی پولیس اسے "سیڑھیوں سے گر کر مرنے" کا حادثہ کہہ کر خاموش ہو جاتی تھی۔ یہ طریقہ سینہ بہ سینہ مقبولِ عام ہو گیا اور کئی قصبوں اور شہروں میں ایسے حادثے ہوئے۔ کسی کو بھی شک نہ ہوا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں جرمن فوجیں پسپا ہو گئیں اور فرانسیسیوں کا راز راز ہی رہا۔

"کسی کو جان سے مارنے کا یہ طریقہ نہایت کامیاب ہے۔۔۔۔" کرنل ذرا سا خاموش رہ کر بولا "آدمی مر جاتا ہے اور کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قتل ہے۔ لیکن یہ بے حد بہیمانہ اور سفاکانہ طریقہ ہے۔ میں نے ہمیشہ جنگ کی بربریت کو بھولنے کی کوشش کی ہے اور بہت کچھ بھول بھی گیا ہوں لیکن اس طریقۂ قتل کو نہیں بھول سکا۔۔۔۔۔۔ سیڑھی پر ذرا سا صابن چپکا دیا۔۔۔۔ اُف خدایا! اور ایک انسان کی زندگی ختم! صابن کے بلبلے کی طرح۔۔۔۔۔" اس پر شاید رقت طاری ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر گم سم رہا۔

روحی اور حفیظ واپس آ رہے تھے۔ میں نے باتوں کا رُخ بدلنا چاہا تا کہ کرنل کی مزاجی کیفیت سنبھل جائے لیکن روحی کو آتا دیکھ کر ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ذرا سا مسکرایا اور کہنے لگا ــــ "میں نے ایک بار روحی کو یہی بات سنائی تو وہ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ مجھے کہنے لگی 'خدا را ایسی ڈراؤنی باتیں مجھے نہ سنایا کریں'۔۔۔۔ بڑی معصوم لڑکی ہے۔ کاش میں اس قدر بوڑھا نہ ہوتا۔ لیکن روحی نے کبھی اس فرق کو محسوس

کھلتی ہوئی مسکراہٹیں، نفاست سے کھنچے ہوئے ابروؤں کی کمانیں، سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو۔ آنکھوں میں دوڑتے ہوئے گلابی ڈورے۔ ڈنر سوٹوں میں سجے ہوئے مردوں کی جچی تلی شائستگی۔ رنگ برنگ کے لباس زیب تن کیے جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں جنھوں نے اپنے جسموں کے بالائی حصے زیادہ سے زیادہ برہنہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رکھی تھی۔ ادھر کسی کے جوڑے میں مہکتا ہوا پھول، ادھر کسی کے ماتھے پر کنڈلی مارے ہوئے زلفوں کی لٹ۔ سورج مکھی کو یوں محسوس ہوا جیسے ماضی ایک سفید جھوٹ ہے اور مستقبل ایک حرفِ باطل۔ دفعتاً نغمۂ ساز کی ایک لہر اٹھی۔ مرد عورتوں کے جوڑے ساز کی سنگت میں لکڑی کے صاف ستھرے فرش پر رقص کرنے لگے۔ پیانو نواز کی انگلیاں کمال پھرتی سے پیانو کے پردوں پر ناچیں۔ کلیرونٹ کی آواز فضا کو چیر کر پیانو کے سُر سے ہمکنار ہوئی۔ ادھر سملز نے معاونت کو چوکس کیا۔ سیکسوفون کی آواز تڑپ کر محفل کی جان بن گئی۔ طبل نواز نے شہ دے کر رقص کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ بھرپور زندگی کے ساغر میں طوفان آ گیا۔ پیٹنٹ کے چمکتے ہوئے سیاہ جوتے اور اونچی ایڑی کی سینڈلیں فرش کے سینے پر تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ کسی نے سورج مکھی کے انگ انگ کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے موت کبھی بھی اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا نہیں سکتی۔ اب وہ سمٹ کر بے مایہ ذرہ نہیں بن سکتی۔ اب اس نے توانائی کا راز پا لیا ہے۔ اب وہ جی سکتی ہے۔ خوش رہ سکتی ہے۔ مسکرا سکتی ہے۔ وہ سوچنے لگی رخشندہ کتنی اچھی ہے۔ اُس نے تو پہلے بھی کئی بار اسے "فلور شو" کی دعوت دی تھی مگر ہر مرتبہ وہ کسی نہ کسی بہانے کی آڑ لے کر کنی کاٹ جاتی۔ لیکن آج شام جیسے وہ زندگی کے ڈھرے سے ہٹ کر چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ کسی اچانک تبدیلی کی راہ تک رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بغیر کسی پس و پیش کے رخشندہ اور آفتاب کے ہمراہ ہو لی۔ تاکہ سفید دیواروں تلے کمرے کی اداس تنہائیوں سے نکل کر زندگی کی رونق اور گہما گہمی کو دیکھ سکے۔ سن سکے۔ محسوس کر سکے۔ آرکیسٹرا ایک دلکش تیز تیکھے انداز میں جھنجھناتا ہوا آہستہ آہستہ ٹوٹتی لہروں کا روپ دھار کر خاموش ہو گیا۔ رقص کرنے والوں کے قدم رک گئے۔ دیکھنے والوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ طبل نواز نے جیب میں سے رومال نکال کر اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ میزوں پر پھر سے جام کھنکنے لگے۔ رخشندہ نے سرخ کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

"سورج مکھی!" رخشندہ بیئر کے دو چار بڑے بڑے گھونٹ اوپر تلے پینے کے بعد بولی۔

"یس ڈارلنگ" سورج مکھی متوجہ ہوئی۔

"آفتاب پاگل ہے۔"

سورج مکھی نے غور سے آفتاب کی طرف دیکھا۔ کھلتا ہوا رنگ۔ گھنگریالے بال۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ وہ نہایت سلیقے سے بیئر پی رہا تھا۔ اس کی نگاہیں میز پر گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ آفتاب کو وہ پہلے بھی دو چار مرتبہ مل چکی تھی۔ یونہی رسمی طور پر۔ سرسری انداز میں۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی" ٹھنڈا اور بے جان فقرہ دہراتے ہوئے۔ لیکن اتنا وہ جانتی تھی کہ آفتاب انگریزی کا پروفیسر ہے۔ ایک مرتبہ اُسے رخشندہ نے بتایا تھا کہ آفتاب نے ہیملٹ کا پورا ڈرامہ حفظ کر رکھا ہے۔ اور ایک دفعہ کلاس میں ہیملٹ کی خود کلامی دہراتے ہوئے اس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اُس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے۔ الفاظ کے سوز و گداز

میں ڈوب کر وہ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک عرصے تک بیمار رہا تھا۔

"سورج مکھی، میں بغیر کسی تمہید کے سارا قصہ چار لفظوں میں سنا دیتی ہوں" رخشندہ نے یہ کہتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "اگر میں آج صبح آفتاب کا دیوان نہ دیکھ لیتی تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس نے تمہاری نیلی آنکھوں، زرد چہرے اور رخسار کے کالے تل پر سینکڑوں اشعار......"

"رخشندہ پلیز!" آفتاب اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب میں کچھ نہیں کہوں گی" رخشندہ چہکارتے ہوئے بولی۔

آفتاب چپ چاپ بیٹھ گیا۔

سورج مکھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ موتیوں کی لڑی ایسے دانت چمکے۔ نیلی جھیلوں میں چھائے ہوئے نشے کے بادل چھٹے۔ ہونٹوں کی سرخ کلیاں کھل کھل گئیں۔

قریب بیٹھے ہوئے افراد گھور گھور کر آفتاب کی طرف دیکھنے لگے۔

یکایک کیبرے شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ برقی قمقموں نے آنکھیں میچ لیں۔ موسیقی کی ہم آہنگی میں ایک نیم برہنہ عورت، تھرکتی، ناچتی، مسکراہٹوں کے پھول برساتی، بیچ میزوں کے پہنچ کر رک گئی۔ فلڈ لائٹ کی زد میں آکر دو تومینیں پارچے جو اس کے بدن پر نہایت بے دلی سے لٹکے ہوئے تھے، جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔ معاً وہ بجلی کی طرح کوندی۔ سپاٹ لائٹ کی سرخی میں اس کے بدن کے تھرتھراتے ہوئے خطوط نے عجب تندی سے للکارا۔ شراب آلود آنکھوں کی پکار گونجی۔ ہونٹوں کے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں نے آواز دی۔ اور پھر آن کی آن میں اس کے مرمریں بدن نے ہوا میں لہریے بنا کر تماشائیوں کا لہو گرما دیا۔ جذبات کی اس ہلچل میں شریک ہو کر سورج مکھی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا دیئے۔ اس سانس بجتے ہوئے اندھیرے میں وہ سوچنے لگی کہ اگر اتفاق سے کسی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو جائے تو ....

وہ رات لاگورسے کی تمام دلفریبیاں اپنے آنچل میں چھپا کر ماضی کے دھندلکے میں گم ہو گئی۔ سورج مکھی کو لمحہ بہ لمحہ احساس ہونے لگا جیسے اب وہ اس دنیا میں تنہا نہیں۔ اس کی ذات پر چھائے ہوئے دوا بتدائی رنگ کسی کو شعر کہنے پر اُکسا سکتے ہیں۔ وہ آمد کا سرچشمہ و منبع بن سکتی ہے۔ اُسے مسٹر ایغونی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ان باتوں کی کوکھ سے لاگورسے کی سنہری لکیریں ابھر کر حال کی پگڈنڈیوں پر پھیل گئیں۔

دوسرے دن وہ خود رخشندہ کو ملنے چلی گئی۔ آفتاب سے مل کر اور بعد میں رخشندہ کی باتیں سن کر اس نے آفتاب کے خیال کو باسی روٹی کا ٹکڑا سمجھ کر اگل دیا۔ وہ سچ مچ پاگل تھا۔ رخشندہ نے اسے بتایا "وہ تم سے کم اور تمہارے نام سے زیادہ پیار کرتا ہے۔" یہ سن کر سورج مکھی کی انا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بچھو نے اُس کے رخسار کے کالے تل پر ڈنک مار دیا ہو۔ جیسے ہوا میں اڑتے ہوئے باز نے غوطہ لگا کر اس کی نیلی آنکھیں نوچ لی ہوں۔ وہ درد سے تلملا اٹھی۔ اُس شام رخشندہ کے ہمراہ کلب میں اس نے جی کھول کر وہسکی پی۔ سگریٹ کے کش لیے۔ پوکر کی ابجد سیکھی۔ مردوں سے کھل کھلا باتیں کیں۔ رخشندہ نے اُسے بتایا "آج ہمارے گھر میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ خون کے دباؤ کی وجہ سے آفتاب کی بری حالت ہو گئی تھی۔

سورج مکھی نے وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر ہمدردی کا ایک رُوکھا جملہ رخشندہ کے منہ پر دے مارا۔ انتڑیوں میں آگ تیزی سے دوڑنے لگی۔ آداب گفتگو بہکنے لگے اور نشست و برخاست کے سلیقوں میں لغزشیں آنے لگیں۔ رخشندہ نے گڈ نائٹ کہہ کر آنکھ ماری اور پھر ہنستے ہوئے ایک ہنس مکھ کی باہوں میں باہیں ڈال کر باہر نکل گئی۔ ایک خوش صورت نوجوان نے سورج مکھی کو لفٹ کی پیش کش کی اور چند لمحوں کے بعد وہ اپنا سر اُس نوجوان کے شانے پر رکھے کار کی اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک سکون سا، ایک تسکین سی نس نس میں سرایت کرنے لگی۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں اُسے رخشندہ کے سہارے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ جھجک، آنکھیں موند کر ایک کونے میں جا بیٹھی۔ اب وہ [illegible]وں سے اس طرح باتیں کرتی جیسے پھل والے سے پوچھ رہی ہو نارنگیاں ترش تو نہیں! جب وہ کسی مرد کے اچھے سِلے ہوئے سوٹ کی تعریف کرتی تو اس انداز سے جیسے کسی نئی کتاب کی خوشنما گیٹ اپ پر اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہو۔ جب اسے محبت کا [illegible]ب محبت سے دینا پڑتا تو اسے ہلکا سا احساس ہوتا جیسے وہ کسی اچھے شعر کی داد دے رہی ہو۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ ماضی کی بہت سی باتوں کو یاد کر کے ہنس پڑتی۔

ان باتوں میں محبت کا تصور بھی شامل تھا۔ اُن دنوں اُس کا خیال تھا کہ راز و نیاز کی باتیں صرف وہاں ہو سکتی ہیں جہاں کوئی دیکھتا ہو نہ سنتا۔ لیکن اب وہ جانتی تھی کہ یہ قرار دادیں کسی وقت اور کسی جگہ ہو سکتی ہیں۔ شاپنگ کرتے وقت، آفس میں ڈکٹیشن لیتے ہوئے، اس وقت جب کوئی اپنے سگریٹ لائٹر سے اس کا سگریٹ سلگا رہا ہو۔ جب کوئی ڈائننگ ہال میں ادب سے کھڑا ہو کر بے بازو کی کرسی کو پشت سے تھامے اور وہ مسکراتے ہوئے شکریہ کہہ کر بیٹھ جائے۔ جب والز کی دھن بج رہی ہو اور کوئی نیا چہرہ ناچ کی مسرت حاصل کرنے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھا دے اور پھر رقص کرتے کرتے یوں محسوس ہونے لگے جیسے اجنبیت کوئی شے نہیں۔ بیگانگی پرانا قصہ ہے۔ زندگی گھل مل جانے میں ہے۔ رنگ و بو کے اس حلقے میں زندگی تیزی سے گردش کرنے لگی۔ ساری اور چولی کے درمیان کمر کا حصہ زیادہ سے زیادہ عریاں نظر آنے لگا۔ سر کے بالوں کو ترشوا کر وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ رگیں کھنچ جاتیں تو وہسکی کی آگ سے آسودگی حاصل کر لیتی۔ وقت رینگنے لگتا تو گھل مل کر لمحات کو بہاراں کر لیتی۔ اور پھر سچ مچ وہ سورج مکھی کا پھول بن گئی۔ جدھر مرد کی جوانی کا سورج طلوع ہوتے دیکھتی بے اختیار اُدھر منہ موڑ لیتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ محسوس کرنے لگی کہ جب عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر کلب، ریسٹوران اور ڈانس فلور پر پہنچ جاتی ہے تو ایک فاتح بن جاتی ہے اور پھر اس کے سامنے ہر جولیس سیزر گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ لیکن ایک دن زندگی کی اس راہ پر تیزی سے چلتے چلتے اُسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو۔ وہ رک کر سوچنے لگی کہ جولیس مات کھا جاتا ہے لیکن پہلی فاتح عورت کو پرے پھینک کر دوسری فاتح عورت کو اپنی مملکت بخش دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں پیدا نہ ہوتا اگر فرم کا منیجر اسے ملازمت سے برطرف کر کے نئی سیکرٹری نہ رکھ لیتا۔ یہ وہی منیجر تھا جس نے اس کی آنکھوں کی رنگین جھیلوں سے متاثر ہو کر دو شعر کہہ ڈالے تھے۔ جس نے اس کے چہرے کی زردی اور کالے تل کی دلکشی بیان کرنے میں عجیب و غریب تشبیہات اور استعارے تراش کر اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا تھا۔ سورج مکھی موقوفی کا نوٹس ہاتھ میں تھامے گردن جھکائے فرم کی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی لیکن دوسرے ہی دن سینہ تان کر ایک نئی فرم کے زینے سے اوپر چڑھ گئی۔ اور کل کے منیجر کی اچانک بے رخی کو بھول کر آج کے منیجر کی من موہ لینے والی باتوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔

اور جب ایک قلیل عرصے کے بعد دوسری فرم کے منیجر نے میکانکی طور پر وہی برتاؤ کیا جو پہلی فرم کے منیجر نے کیا تھا تو اُسے پہلی سی حیرت نہ ہوئی۔

رفتہ رفتہ وہ مرد کو ریاضی کی مشق سمجھ کر ضرب تقسیم کرنے لگی۔ لیکن ایک سنیچر کی شام، اس کے دل کو آناً فاناً تسلیم کرنا پڑا کہ مرد ریاضی کی مشق نہیں، وہ تو سچا موتی ہے جس کی آب سے زندگی کی آب باقی ہے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنے دل کی امانت سونپ سکتا ہے وہ چند ہی لمحوں میں منگنی کی انگوٹھی پہنا سکتا ہے۔ اختر نے یہ سب کچھ بات کی بات میں سورج مکھی کو دے دیا۔ اور جب وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا تو ایک معصوم بچے کی طرح اپنا سر سورج مکھی کے سینے پر رکھ کر آنسو بہانے لگا۔ اور سورج مکھی نے دل کی آواز سن کر خود کو اختر کے سپرد کر دیا۔ وہ سمجھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک سرمائی شام کے اندر اندر کچھ اندھیرا چھا گیا۔ ایک شام کلب میں اختر سورج مکھی کو پہچان بھی نہ سکا۔ اختر کے ساتھ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی انگلی میں بھی ویسی ہی انگوٹھی تھی جیسی اس نے سورج مکھی کو پہنائی تھی۔ بات جب نکلی تو سورج مکھی پر یہ بھید کھلا کہ ایسی انگوٹھیاں تو وہ کئی لڑکیوں کو پہنا چکا ہے۔ اُسی جذبے کے ساتھ اور اُسی ڈرامائی انداز میں۔ سورج مکھی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ وہ تیز تیز قدموں سے بار میں پہنچی اور سرخ گدی والے اونچے اسٹول پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ رم کا بڑا پیگ غٹ غٹ پی کر اس نے کانچ کا خالی گلاس سفید پتھر کے کاؤنٹر پر رکھا اور بلاؤز کے اندر سے رومال نکال کر ہونٹوں کو خشک کرنے لگی۔ رم نے ذرا دیر میں اس کو آسودگی بخشی نہ سکی۔ ادھر سے آتی ہوئی ہیلو کی آواز، ادھر سے بڑھتا ہوا مسکراہٹوں کا بدبودار ماحول سب ورادی سے تھا۔ وہ بار سے نکل کر برآمدے میں چلی گئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کلب کا ہر فرد اس کے منہ پر تھوک رہا ہو۔ برآمدے کی سیڑھیوں سے اُتر کر کچھ دیر وہ لان میں ٹہلتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کلب کے احاطے سے باہر نکل گئی۔

اس رات اس کے خیالوں کی آگ کے شعلے لپک لپک کر اس کے جسم کو چاٹتے رہے۔ اور اس کے گوشت کی سڑاند نے اس کی قوت شامہ کو ادھ موا کر چھوڑا۔

دوسرے دن جب سفید دیواروں والے کمرے کی تنہائی میں اس کے دل، ضمیر اور دماغ نے جولیس سیزر کے تابوت میں کیل گاڑ دیں تو اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک نیزہ ہاتھوں میں لے کر کلب میں چلی جائے اور پھر اس مرد کا سینہ چیر ڈالے جس نے بہروپ بھر کر اسے دھوکا دیا تھا۔ جس نے سچ کے پردے میں ہر مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ پھر اُسے آفتاب کا خیال آیا۔ جس کی محبت کوڑھی تھی۔ جس کا پیار مدقوق تھا۔ جو اس کے عشق میں شعر لکھ سکتا تھا لیکن برملا اظہار محبت کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ جس نے اس دوران اسے کوئی آدھ درجن خط لکھے تھے۔ اس کے ہر خط کی تحریر میں ایک ناقابل بیان درد کی لذت تھی۔ سورج مکھی کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے گھومنے لگے۔ آج بھی آفتاب کے آخری خط کے سیاہ حروف ماضی سے ابھر کر کمرے کی سفید دیواروں پر پھیل پھیل گئے۔ وہ خط پڑھ کر سورج مکھی ماضی کی ردّی کے اُگلے ہوئے ٹکڑے کو پلکوں سے جھاڑ پونچھ کر اپنانے کے لیے بیقرار ہو گئی تھی۔ اس دن زرد سرخ ساڑی پہن کر رخشندہ کے گھر چلی گئی تھی۔ رخشندہ اور گھر کے دیگر افراد کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ آفتاب اپنی لائبریری میں مطالعہ کر رہا تھا۔ سورج مکھی اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ آفتاب کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔

"آفتاب!" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پکارا تھا۔

اُس آواز میں صدیوں کا درد چھپا ہوا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو "میں تھک گئی ہوں۔ میں اب فاتح نہیں بننا چاہتی۔ مجھے قید کر لو تاکہ میں عورت بن جاؤں۔ اس گھناؤنی خاموشی کو توڑ ڈالو تاکہ نئی زندگی کے سوتے پھوٹ پڑیں۔"

آفتاب نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کانپنے لگی تھی۔ اس کی نگاہیں کتاب میں گڑی تھیں۔ سورج مکھی ایک کرب ناک خاموشی کو جوں توں جھیل کر بے نیل مرام گھر لوٹ آئی تھی۔ جھنجھلاہٹ میں اس نے سوچا تھا کہ ایسی بیمار محبت سے تو مرد و بیوی کی محبت کہیں اچھی ہے۔ ایسی تاریک روشنی سے تو روشن تاریکی کہیں بہتر ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا دبا کر دم گھونٹ رکھنا اور دنیا سے الگ تھلگ رہ کر بیکلے بیکلے دل کی بھڑاس کو حروف میں منتقل کرتے رہنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جولیس ہر رنگ میں جولیس ہے۔ وہ ایسے تو بھی اور بہتر ہوتے تو بھی۔ لیکن مر لے لینے والا جولیس ہونے والے جولیس سے زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ پہلے کا نہ ختم ہونے والا چپ سے دوسرے کی وقتی چہچہاہٹ زندگی کے بند حالات کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔

آج ان خیالوں کی دنیا میں بیٹھے ہوئے سورج مکھی نے چاروں طرف دیکھا تو کمرے کی سفید دیواریں نیلی نیلی جھیلوں کو گھورنے لگیں۔ لکڑی کے سنہرے چوکھٹے میں طلوعِ آفتاب کا منظر جھپکی لے کر دھندلا گیا۔ گلدان کے کناروں پر جھکے ہوئے نرگس کے باسی پھول اپنی بے رونق آنکھوں کو بند کر کے ماتم کرنے لگے۔ ملنسری میں رکھے ہوئے سرخ سرخ سیب جھٹ سامنے ہو کر ناچنے لگے۔ پلنگ کی پائنتی چار تہہ کئے کر ترتیب سے رکھی ہوئی سبز ساٹن کی رضائی، سرہانے کی جانب اوپر نیچے دھرے ہوئے سرخ ریشمی تکیئے، میز پر اوندھی پڑی ہوئی سنہری جلد والی کتاب کے بکھرے ہوئے حروف، سب پرچھائیاں بن کر ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ ٹن ٹن کانونٹ کی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹیوں کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ برف سا لباس، سیاہ تسبیح، چھوٹی سی صلیب۔ وہاں سے یہاں تک بکھری ہوئی زندگی کی کلیاں اور کانٹے۔ ایک جولیس میز پر، دوسرا، تیسرا، ہر دیوار کے جیسے فضا میں تیرنے لگے۔ اس کا دل دھائیں دھائیں کرنے لگا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی بے چین انگلیوں نے میز پر سے چاقو اٹھا لیا۔ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی انگلی نے چاقو کھولا۔ آپ ہی آپ سامنے تھا۔ اس کے دانت بھینچ گئے۔ داہنا ہاتھ بلند ہوا۔ اس نے چھری کی نوک ایک سیب میں گاڑ دی۔ دو ٹکڑے کرنے میں سورج مکھی کو ایک عجیب و غریب راحت کا احساس ہوا۔ جیسے اس نے جولیس کے سینے میں خنجر بھونک دیا ہو۔ اور لہو کے گرم گرم قطرے ٹپ ٹپ اس کے پاؤں پر گرے ہوں اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو "میں فاتح ہوں۔ میں ابو ہیرا ہوں۔ میں الفاظ میں قید نہیں رہ سکتی۔ میں باغی ہو کر کتاب کے زنداں سے نکل آئی ہوں۔ میری ایک منزل کا گوارہ ہے۔ میں والز کی دھن پر ناچ سکتی ہوں۔ مجھے اب تم چھوڑ دے گا تو میں دوسرے جولیس کی سلطنت پر قبضہ کروں گی۔" ان آوازوں کا شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا حتیٰ کہ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اس کی ہڈی ہڈی چیخ اٹھی جیسے لوہے کے ہتھوڑے اُس کے جوڑ جوڑ پر دھما دھم برس پڑے ہوں۔ اس نے اپنا داہنا رخسار میز پر رکھ دیا۔ دونوں بازو پھیلا دیئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔

دھپ دھپ کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول لیں۔ دفعتاً کمرہ کی چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو کر تیزی سے چکر کاٹنے لگیں۔ آفتاب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ آج اُس کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ آج اس نے ایسی نگاہ سے دیکھا کہ سورج مکھی دو قدم پرے ہٹ کر سینے کے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

آفتاب بڑھ کر پلنگ پہ چت لیٹ گیا۔

"سورج مکھی آجاؤ میرے قریب" آفتاب نے آہستہ سے کہا اور پھر سبز ساٹن کی رضائی سے ٹانگیں ڈھانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔

سورج مکھی نے حقارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اس کے انگ انگ میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔ کانوں کی لویں گرم انگارے بن گئیں۔ نیلی جھیلوں میں جوالا پھٹ پڑی۔ پہلی فرم کے مینجر نے بھی اسی پلنگ پر یہی الفاظ استعمال کئے تھے۔ اختر کی طلب نے بھی اسی رنگ میں پکارا تھا۔ ہر پولیس نے وہی ناٹک کھیلا تھا۔ تمام بہروپیے مختلف سمتوں سے چل کر اسی مرکز پر پہنچے تھے۔

"سورج مکھی آجاؤ میرے قریب"

سورج مکھی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے وہ میدان کارزار میں محاذ پر ڈٹ گئی ہو۔ اُس کا سینہ تن گیا۔ اس کے اندر سے آواز آئی "میں لالہ رُخ ہوں۔ سورج مکھی مر گئی ہے۔ میں چابی دیا ہوا کھلونا نہیں ہوں۔"

اس کا دماغ کھول اٹھا۔ کنپٹیاں پھڑکنے لگیں۔ رخسار تپ گئے۔ رگ رگ سُلگ اٹھی۔ وہ مجسم شعلہ بن گئی۔ وہ شعلہ ہر چیز کے نقش و نگار کو جلا کر راکھ کرتا ہوا میز کی طرف لپکا۔ اُس نے بغیر سوچے سمجھے سیب میں سے چاقو نکال کر دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور بجلی کی طرح کوند کر اس نے آبدار پھل آفتاب کے سینے میں بھونک دیا۔

سرخ ریشمی تکیہ اور سبز ساٹن کی رضائی سانس لینے لگی۔ کھلے دروازے میں پڑا میلا پردہ لرزنے لگا۔ سورج مکھی نے کوئی چیخ نہ سن کر اپنے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹائے۔ لہو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا تھا۔ سہم کر اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے آبدار پھل برف ایسے گوشت سے نکال کر زرد ٹائیلوں کے فرش پر پھینک دیا۔ اُس نے جھک کر دیکھا۔ پلکوں نے جامد پتلیوں پر سائے کر رکھے تھے۔ آج آفتاب کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ اس کے بے حس ہاتھ پلنگ کی پٹی سے نیچے لٹک رہے تھے۔

لمحات کا قافلہ پلٹ کر پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ ۱

دادُو

صادق حسین

ٹیلوں کے اُس پار ڈھولوں کی دھمادھم گونجی۔ شہنائیوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گاؤں کی عورتیں گھریلو دھندے جہاں کے تہاں چھوڑ، لپک کر چھتوں پر چڑھ گئیں۔

دادُو سینہ تانے بیچ راستے کے کھڑا تھا۔ حسبِ معمول اس کے دائیں ہاتھ میں لٹھ تھا جس پر چڑھے ہوئے پیتل کے کوکے ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاعوں میں چمک رہے تھے۔

بلند قامت۔ گٹھیلا بدن، بڑی بڑی مونچھیں، چہرے پر زخموں کے نشان، دائیں بائیں سے جھانکتے ہوئے صافے کے دو شملے، تنا سینہ، اکڑی گردن میں تعویذ جس پر چاندی کا خول، ململ کا کرتا، شلوار کے پائنچوں پر دوہرا دوہرا بخیہ، یہ سب کچھ تو پوٹھوہار کے علاقے میں دوسرے نوجوانوں میں بھی پایا جاتا تھا، جن کی یاد میں دوشیزائیں ڈھولک پہ رومان پرور گیت گاتی تھیں۔ کھیتوں میں درانتیاں چلاتے چلاتے لمحہ بھر کے لیے ہاتھ روک کر اپنے اپنے ماہیئے کی دو چار باتیں کر کے نئی توانائی حاصل کر لیتی تھیں۔ کنوئیں پر ہمراز سہیلیاں دوسروں کی حدِ سماعت سے بچ کر تصورات کا چاندی سونا سرگوشیاں کر کے آپس میں بانٹ لیتی تھیں۔ ڈھولک پہ، کھیتوں میں، کنوئیں پر جب بات میں بات نکل کر دادُو کے نام تک پہنچ جاتی تو نوجوان لڑکیاں ناک بھوں چڑھا لیتیں۔ گھر گھر عورتوں میں دادُو کا ذکر چھڑتا تو اُسے جھولیاں بھر بھر کے بددعائیں دیتیں۔ چوپال پر بڑے بوڑھوں کی گفتگو میں دادُو کا نام آتا تو کان پکڑ استغفار پڑھتے۔ اور جب مائیں ضدی بچوں کو لوریاں دے دے کر تھک جاتیں تو "وہ دادُو آیا" کہہ کر انہیں ڈراتیں۔ نفرت اور خوف کی یہ لہریں اُس چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر پوٹھوہار کے تمام علاقے میں پھیل گئی تھیں۔ چوری ضلع کے صدر مقام میں ہوتی اور پولیس سب سے پہلے دادُو کے گاؤں کی تلاشی لیتی۔ قتل کی واردات خاص تحصیل میں ہوتی اور تھانے سے دادُو کو بلاوا آ جاتا۔ اسی سبب وہ چھوٹا سا گاؤں بڑا بدنام تھا۔ وہاں کے باشندے دادُو سے اس لیے بھی نالاں تھے کہ وہ ہر بات میں پہل کرتا تھا۔ دیہاتیوں کے دلوں میں خوف تھا اور نفرت بھی۔ خوف کی فولادی انگلیوں نے نفرت کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ چنانچہ دادُو کے منہ پر بات کرنے کے لیے دل گردے کی ضرورت تھی۔ خصوصاً اُس دن تو دادُو کی دھاک بیٹھ گئی تھی جس دن اُس نے پیتل کے چمکتے ہوئے کوکوں والا لٹھ بلند کر کے تحصیلدار کو بھگا دیا تھا۔ یہ بات اور تھی کہ بعد میں اُسے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ لیکن یہ کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا اور پھر جیل کے اندر بھی تو دادُو کا طوطی بولتا تھا۔

آج بھی داؤد نے پہل کی۔ ڈھول کی پہلی ہی دھما دھم سن کر وہ گھر سے باہر نکل آیا اور ایک پہاڑ بن کر بیچ راستے کے کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ گاؤں کے چند بزرگ کچھ نوجوان اور بہت سے بچے اس پہاڑ کے آس پاس جمع ہو گئے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد برات پہاڑ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ دولہا، سہرا باندھے، موتیا کی لڑیوں سے سجی ہوئی بھوری گھوڑی پر سوار تھا۔ اس کے ارد گرد براتی کھڑے تھے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ سناٹا چھا گیا۔

"برات کہاں سے آ رہی ہے؟" داؤد براتیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"شہر سے" جواباً آواز آئی۔

"آپ لوگوں کو آج رات یہاں رکنا پڑے گا" داؤد نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" براتیوں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے پوچھا۔

"ہماری مرضی" داؤد نے یہ کہتے ہوئے لٹھ کو اپنے کاندھوں پر متوازی رکھ کر اس پر دونوں بازو پھیلا دیئے۔

شہری آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

"آپ لوگ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے" پہاڑ کڑک کر بولا۔

ایک سفید ریش دیہاتی لاٹھی ٹیکتا ہوا مجمع میں سے باہر نکلا اور براتیوں سے مخاطب ہو کر بولا "ہمارے بزرگوں کے وقت سے یہ روایت چلی آ رہی ہے۔ آج تک کوئی برات یہاں رکے بغیر آگے نہیں گئی۔"

"ہم وقت پر لڑکی والوں کے ہاں پہنچنا چاہتے ہیں" ایک شہری بولا۔

"ہم نے ہمیشہ اپنی روایتوں پر وقت کو قربان کیا ہے" گاؤں کے ایک نوجوان نے سینہ تان کر کہا۔

"آپ لوگ رکے بغیر چلے گئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی" ایک بڈھے دیہاتی نے قدرے جذباتی ہو کر کہا۔

جب شہریوں نے دیکھا کہ پہاڑ کو ہٹا کر آگے بڑھنا ممکن نہیں تو چار و ناچار انھوں نے دعوت قبول کر لی۔ پھر تو چوپال پر میلہ لگ گیا۔ ادھر بکرا ذبح کر دیا گیا۔ ادھر عورتیں آٹا گوندھنے لگیں۔ چھڑکاؤ ہو گیا۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ چارپائیاں اور کھٹولے بچھ گئے۔ چلم کا دور چلنے لگا۔ چھ سات عورتیں بیک وقت لوہ پر روٹیاں پکانے لگیں۔ کھانے کے بعد مراثیوں نے سوانگ بھرا۔ مارے قہقہوں کے شہری لوٹ پوٹ ہو گئے۔ دوسرے دن گاؤں کے مرد اور بچے براتیوں کے ساتھ چل کر نالی سے پیڑوں تک گئے اور الوداع کہہ کر لوٹ آئے۔ مگر داؤد ایک ٹاہلی کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں گاؤں کی سمت جاتے ہوئے مردوں اور بچوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ قریب قریب ہر ایک نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ داؤد جانتا تھا کہ اس موسم میں جبکہ فصل ربیع کٹ چکتی ہے کسان اپنے پھٹے پرانے کپڑے اتار کر نیا لباس پہنتا ہے۔ گندم بیچ کر قرض ادا کرتا ہے۔ بیٹی کا جہیز تیار کرتا ہے۔ دیوانی مقدمہ کی پیروی میں کسی نامی وکیل کے سامنے روپوں کی ڈھیری لگا دیتا ہے۔ اور اگر روپیہ پیسوں کی جھنکار سن کر بدمست ہو جائے تو اپنے بھائی بند کا سر پھوڑ کر ضابطۂ فوجداری کے جنگل میں پھنس جاتا ہے۔

چند لمحوں میں مرد اور بچے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اب داؤد کے سامنے کچے مکان تھے جن کی دیواریں سانجھی تھیں۔

"کیا بات ہے استاد؟" اس شخص سے دوسرے غنڈے نے پوچھا۔ استاد قدم قدم چلتا ہوا امانت میاں کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"میرے ابا" استاد نے چیخ کر کہا اور پھر دوڑ کر امانت میاں سے لپٹ گیا۔

"کون؟" امانت میاں نے روکھے پن سے دریافت کیا۔

"میں ہوں ظفر۔ آپ کا بیٹا"

"نہیں استاد تمہیں غلطی ہوئی ہے۔ میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔" امانت میاں نے نچلا ہونٹ اوپر کے دانتوں تلے دبا کر کہا اور پھر ظفر کو سامنے سے ہٹا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔



رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

۸۳، ۸۴

اگست ۱۹۶۰ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
ممالک غیر سے ۲۵ روپے

قیمت
موجودہ شمارہ
تین روپے

ادارۂ فروغِ اردو ○ لاہور

اس پرچے کے کسی مضمون، افسانے، نظم یا غزل کے نقل کرنے کی اجازت نہیں

فہرست

طلوع — محمد طفیل

مضامین

نظمیں، غزلیں

دلؔ شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

حامد عزیز مدنی

افسانے

انتقادیہ

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ، لاہور سے شائع کیا

طلوع

اداریہ سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض دوستوں کا نقطۂ نظر یہ بھی ہے۔ ہم نے انتخابی پرچوں کے بارے میں اصولی باتوں کو چھیڑا تو ادارہ کا ایک پرچہ ہاتھ آیا۔ تھا جس میں اس ضمن میں جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا مخاطب کوئی ایک رسالہ نہ تھا۔ بلکہ وہ سارے ہی رسالے تھے جو صرف انتخاب چھاپا کرتے ہیں۔ [illegible] موصوف نے [illegible] نامور [illegible] واضح اشاروں کے [illegible] غریب نقوش کو بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ دیکھیے کیسی زد [illegible] بلی ہمیں سے میاؤں یعنی ایک تو ہماری اجازت کے بغیر چیزیں چھاپیں۔ اُلٹا ڈانٹیں بھی ــــ ہم کسی سے بھی الجھنا نہیں چاہتے۔ نہ ہمیں کسی ایک رسالے سے کوئی پرخاش ہے۔ نہ تو اس بحث کو ذاتی بحث بنانا چاہتے ہیں۔

یاروں نے کیا ہے (مدیران رسائل نے) کہ کسی طرح انتخابی پرچوں کی وبا کو روکا جائے۔ ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ سارے پرچے بند ہو جائیں گے (اس لیے کہ ہم ستے مضامین حاصل کرنے کے لیے ان قدر محنت کرتے ہیں) اور انتخابی پرچے نکالا کریں گے (اس لیے کہ انھوں نے دو روپے کی قینچی خرید لی ہے)

اسی ضمن میں، میں نے بات آدھ بار پہلے بھی لکھا تھا یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنے ساتھ چند دوستوں کو بھی لایا ہوں۔ پہلے آپ اُن کی باتیں سُن لیں۔ میں تو گھر کا آدمی ہوں۔ میری باتیں تو آپ روز سنتے ہیں۔

برادرم۔ سلام مسنون۔ آپ کا ایک خط دس بارہ دن پہلے آیا تھا اور میں عجب چکر میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں؟ اس سے چھوٹنے نہ پایا تھا کہ ایک اور خط آ گیا اور اب پھر دو دن جواب سوچنے ہی میں گزر گئے۔

برادرِ عزیز مجھے اپنی دونوں آنکھیں پیاری ہیں۔ آپ بھی مجھے عزیز ہیں اور شمس صاحب بھی۔ آپ کی شکایت کو رفع کرنے کے لیے میں نے شمس صاحب سے کہہ دیا تھا کہ جو مضمون نقل کریں اس کی اجازت پہلے مضمون نگار سے حاصل کریں۔ دوسری بات یہ کہ نقوش کے تازہ پرچہ سے کوئی مضمون فوراً نقل نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ جس مضمون کا کاپی رائٹ صاحب رسالہ کے پاس ہو اُسے یا تو نقل نہ کریں یا صاحب رسالہ سے اجازت لے کر نقل کریں۔ میری اور آپ کی گفتگو میں یہی باتیں طے ہوئی تھیں۔ شمس صاحب نے ان تمام شرائط کو منظور کر لیا اور ان پر عمل بھی کرنے لگے۔ اب میں اُن سے کیا کہوں؟ میرے خیال میں تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ "نقوش" کا قدر دان تو نقوش ہی خریدے گا۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرے گا کہ نقوش کے اچھے افسانے جب

نقوش میں چھپ کر آ رہی ہے تو پڑھ لے گا۔ نقوش اپنی جگہ پر ایک بھاری پتھر ہے، بلکہ پہاڑ ہے جسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ لہٰذا آپ چشم پوشی سے کام لیجیے ـــــ باقی رہیں تو گلے شکووں کی ہر جگہ باتیں ہیں۔

خاکسار شاہد احمد

فیض صاحب: اس وقت بھی انتخاب ذہن میں ہیں جو بھیجتا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ انتخابی پرچوں کا مسئلہ خالص کاروباری مسئلہ ہے یعنی کاروباری اعتبار سے۔ انھیں یقیناً غیر مستحسن سمجھتا ہوں لیکن اس بارے میں آپ کی رائے زیادہ وقیع ہے۔ فقط

فیض احمد فیض

"انتخابی" رسائل میں ادبی تخلیقات کی بے دریغ اشاعت اب ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ ہر مہینے مختلف معیاری ادبی رسائل کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب چھاپنے والے اصحاب سے پوچھا جائے اگر وہ اپنے اس عمل کا کوئی جواز رکھتے ہیں تو صرف یہ ہے کہ یوں ہمارے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کا ادبی اور جمالیاتی ذوق نکھرتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کے سہارے چلنے والے رسالے اپنے فعل کا یہ جواز پیش کر کے درپردہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تو ایسا کر کے ادیبوں اور شاعروں پر احسان کرتے ہیں اور انھیں ہمارا ممنون ہونا چاہیے اور اس لیے انھیں حرف شکایت زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ ان اصحاب میں سے کسی نے بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کی (اور اگر سوچا ہے تو اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے) کہ اگر پاکستانی فن کاروں کے افسانے اور اشعار بار بار اشاعت کے مستحق ہیں تو ہر اشاعت کے معقول معاوضے کے بھی تو مستحق ہیں۔ دوسروں کو بزعم خود ان کی جیبوں کے بوجھ سے چھٹکارا دلا کر اپنے سرمائے میں اضافہ کرنے والے یہ اصحاب محل کھڑے کر لیں، مگر ہمیشہ جیب کترے ہی کہلائیں گے۔ اگر بعض حضرات کو ڈائجسٹ قسم کے رسالے چھاپنے کا شوق ہے تو انھیں اس حقیقت کو بھی نوٹ کرنا چاہیے کہ ادیب اپنی تخلیق صرف ایک رسالے کو اشاعت کے لیے دیتا ہے اور اس کے بعد سب تخلیقات کو اس توقع کے ساتھ مجموعوں میں جمع کر دیتا ہے کہ ادب کے قارئین انھیں بالضرور خریدیں گے۔ اگر انتخابی رسالے چھاپنے والے اصحاب کو لوگوں کا ادبی ذوق نکھارنے، ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ کرنے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر کرنے کے مقاصد ایسے ہی عزیز ہیں (اور یقیناً یہ بڑے مبارک مقاصد ہیں) تو وہ یوں کریں کہ معیاری ادبی کتابوں کی بیش از بیش خریداری کی ملک گیر تحریک چلائیں۔ اس کام کے لیے وہ رسائل میں سے مضامین اچکنے سے جھجک لینے کے بجائے ہر مہینے نئی ادبی مطبوعات کی ایک جامع اور خوبصورت فہرست شائع کیا کریں۔ یوں وہ ادب اور ادیب کی بے مثال خدمت کریں گے۔ مگر کیا وہ ایسا کر سکیں گے جبکہ اس ماہانہ فہرستِ کتب کو بہت ہی کم لوگ خریدیں گے اور انھیں

---

۱ بھائی شاہد کا ماہنامہ نقوش سے عملاً کوئی تعلق نہیں۔ صرف مدیر نقوش سے دوستی ہے جس کا اظہار اس خط سے بھی ہوتا ہے۔

۲ سنا ہے کہ یہ حضرات دس روپے فی غزل اور بیس روپے فی افسانہ کے حساب سے ادیبوں کو ٹرخا دیتے ہیں۔

بہت ہی کم آمدنی ہوگی۔ ثابت ہوا کہ اصل مقصد نہ ادب کی خدمت ہے اور نہ ادیب کی (اخلاقی) امداد۔ اصل مقصد حصولِ زر ہے۔ اس صورت میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس ہمہ گیر استحصال کو متحد ہو کر روکیں۔ جن ادیبوں اور شاعروں نے ان "انتخابی" رسائل کو اپنی تخلیقات مفت میں چھاپنے کے "دوامی" اجازت نامے دے دیے ہیں وہ یہ اجازت نامے واپس لے لیں اور صرف اس صورت میں اجازت دیں جب یہ رسالے انھیں معقول اور مناسب بلکہ پہلی اشاعت سے دگنا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔ ان ادیبوں اور شاعروں کو اپنی کتابوں کے پانچ دس ہزار مستقل قارئین سے ہاتھ دھونے کی اجرت تو ملنی چاہیے۔

احمد ندیم قاسمی

کیا ہمارے ہاں کوئی صحیح قسم کا ادبی ڈائجسٹ چھپ رہا ہے؟ صحیح قسم کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ کوئی بھی شریفانہ کام ہو اس کے چند آداب ہوتے ہیں۔ اگر یہ آداب ملحوظ نہ رکھے جائیں تو بلیک مارکیٹ، تجارت اور سرقہ بھی فن کہلائے گا۔

ہمارے اکثر انتخابی پرچے انتخاب کے کسی معقول معیار سے محروم ہیں۔ مگر یہ تو اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ ممکن ہے ان کے نزدیک انتخاب کا یہی معیار معقول اور مقبول ہو۔

انتخاب کے معاملے میں نہ تو ادیب کی رائے لی جاتی ہے، نہ اجازت اور نہ معاوضے کی ادائیگی کا مفاد شکن معاملہ سامنے رکھا جاتا ہے۔ ادیب کو تو صرف اس اعلیٰ قسم کی بات سے خوش کر دیا جاتا ہے کہ اس کی تخلیق انتخاب میں آگئی ہے۔ بھلا خوشی سے بڑا معاوضہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ——— انتخابی جریدے ادھر ادیب کو خوشیوں کے معاوضے سے مالا مال کرتے ہیں، ادھر اُن ادبی رسائل کا شکریہ بھی ادا کر دیتے ہیں جن کی چیزوں سے اپنے پرچے کو مالا مال کرتے ہیں۔ شکایت کا کسی کو بھی موقع نہیں دیا جاتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ شکریہ اور خوشیوں کا معاوضہ دونوں بڑے مہنگے پڑ رہے ہیں۔ انتخابی رسائل ان پرچوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں جو ہزاروں دقتوں کے بعد ادیب کو معاوضہ ادا کر کے اپنے آپ کو بناتے سنوارتے ہیں۔ مگر ان کا شمارہ ابھی اپنے قارئین تک ڈھنگ سے پہنچنے بھی نہیں پاتا کہ انتخابی جریدے ان کا نچوڑ حاصل کر کے اسٹال پر پہنچ جاتے ہیں۔ لکھا لکھایا سامان مل گیا، چھاپ کر سستے داموں بیچ ڈالا۔ ادھر قاری کا یہ رویہ کہ انتخاب کا انتظار ہو رہا ہے مہنگے ادبی رسائل کون خریدے۔ روپیہ بارہ آنے خرچ کر کے ملک کے تمام رسائل کے ادب کا نچوڑ پڑھ لیا گیا۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ اس انتخاب میں واقعی نچوڑ ہے یا نہیں۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادبی رسائل کے مالک سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ وہ بھی آسان ترکیب استعمال کریں۔ مجھے ایک اچھے خاصے اشاعتی ادارے کے بارے میں معلوم ہے کہ پہلے اس نے ایک ادبی پرچہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا مگر بعد میں ادبی ڈائجسٹ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل ہمارے ملک کا ماحول ابھی ادبی ڈائجسٹ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ پڑھے لکھے باذوق پاکستانیوں کی تعداد کم ہے۔ اچھے ادبی رسائل بھی دو چار ہی شائع ہوتے ہیں۔ معقول کتابوں کی منڈی بھی محدود ہے۔ اگر ادبی رسائل اور کتب کا حصہ انتخابی جریدے سنبھال لیں تو انجام ظاہر ہے۔

خدیجہ مستور

برادرم طفیل صاحب! اس وقت مسئلہ پیشِ نظر یہ ہے کہ یہ جو "....." اور "....." وغیرہ اردو کے موقت الشیوع رسائل و جرائد میں سے مستقلاً چیزیں لے کر شائع ہو رہے ہیں تو ان کے اس اقدام سے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اور ہم اس سے کن صورتوں میں اور کہاں تک متاثر ہوتے ہیں! ——— میں یہاں دو حیثیتوں سے اظہارِ خیال کروں گا۔ میری پہلی حیثیت ایک مصنف کی ہے۔ ایک ایسے

مصنف کی جو کچھ تجارتی رموز بھی جانتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ایک مصنف رسائل و جرائد میں جو کچھ لکھتا ہے اس نقطۂ نظر سے لکھتا ہے کہ ایک دن اس کی یہی ذہنی کاوشیں جمع ہو کر ایک مستقل صورت یعنی کتابی شکل اختیار کریں گی اور وہ ناشر سے اس کتاب کے عوض ایک معقول معاوضہ حاصل کرنے کا حقدار ہو جائے گا۔ اب اگر کسی مصنف کی تخلیقات کتاب میں تشکیل پذیر ہونے سے پیشتر دو تین مرتبہ منظرِ عام پر آ چکی ہیں تو لازماً اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو جائے گا اور نتیجۃً کتاب زیادہ فروخت نہیں ہو سکے گی جس کا اثر براہِ راست مصنف کی ذات پر پڑے گا۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ مرقومہ بالا پرچوں کی روش تجارتی اعتبار سے بھی مصنف کے لیے نقصان دہ ہے۔

میری دوسری حیثیت ایک ایڈیٹر کی ہے۔ ایک ایسے ایڈیٹر کی جس کی زندگی کے کم و بیش سترہ سال ایک ادبی ماہنامے کے ادارتی فرائض ادا کرتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ادارت کتنی محنت شاقہ کی متقاضی ہے اور مدیر رسالہ کو اپنا رسالہ زندہ رکھنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں کے سامنے جو مضامین نظم و نثر آتے ہیں وہ عموماً اس انداز میں نہیں آتے جس انداز میں مصنفوں نے انھیں لکھا ہے۔ ایڈیٹر بسا اوقات گھنٹوں محنت کر کے ان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ ان کے حصول کی خاطر اہلِ قلم سے طویل مراسلت کرتا ہے، بعض مضامین پر معاوضہ بھی دیتا ہے اور نہ جانے کیا کچھ کرتا ہے۔ تب کہیں جا کے رسالہ چھپ کر قارئین کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ایک ایڈیٹر کے لیے یہ صریحاً ناانصافی نہیں کہ سراسر محنت تو وہ کرے اور فائدہ اس کے اپنے پرچے کی بجائے ان رسالوں کو پہنچ جائے جن کے مدیرانِ کرام وقت کا بہت مختصر سا حصہ صرف کر کے مختلف رسالوں کے منتخب مضامین نظم و نثر پر محض نشان لگا کے کاتبوں کے حوالے کر دیں اور یوں ان کے رسالے اشاعت پذیر ہو کر مارکیٹ کے بیشتر حصے پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے ہیں؟

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جو پرچہ ہر ماہ ہمارے معیاری جریدوں کی نمایاں چیزیں اپنے دامن میں سمیٹتا رہتا ہے اس کا خیر مقدم ان پرچوں کے مقابلے میں زیادہ گرمجوشی سے کیا جاتا ہے اور وہ زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور یہ پہلے پرچوں پر ایک ناقابلِ برداشت ظلم ہے۔

ان زیادتی کرنے والے پرچوں کے خلاف متفقہ طور پر قدم اٹھانا نہایت ضروری ہے اور اس ظلم کے خلاف جو آواز بھی بلند ہو گی اسے اہلِ قلم اور مدیرانِ رسائل و جرائد کی پرجوش تائید حاصل ہو گی۔

میرزا ادیب

اردو میں ڈائجسٹ طرز کے رسائل کا سوال اردو ادب میں ایک لمحۂ فکریہ بن گیا ہے۔ سب سے اوّل ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ بدعت جہاں سے آئی ہے وہاں اُن کا طرزِ عمل کیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جو ڈائجسٹ رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو صرف شائع شدہ کتب اور مضامین کا خلاصہ تیار کرا کر شائع کرتے ہیں۔ کسی بڑے ناول یا مضمون کا خلاصہ یعنی نفسِ مضمون کسی قابل اہلِ قلم سے چند صفحات میں تیار کرایا جاتا ہے اور مرتب کنندہ کو اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس سے اصل کتاب یا مضمون یا افسانہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جن لوگوں کو یہ پسند ہو یا اُن کے مذاق کی چیز معلوم ہو وہ اصل کتاب یا مضمون حاصل کر کے اُس کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے رسائل اور کتب کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دوسری قسم کے وہ ڈائجسٹ رسائل ہیں جو مدیرانِ رسائل سے اجازت حاصل کر کے ان کے حوالے سے مضمون نقل کرتے ہیں۔ پاکستان کے اردو ڈائجسٹ رسائل کتابوں، افسانوں یا مضامین کا خلاصہ تو تیار نہیں کراتے کیونکہ یہ کام تو اصل سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور اس پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ بلکہ وہ دوسرے رسائل کے مضامین کو اکثر بلا اجازت نقل کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی، ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

ہمارے ہاں یہ صورت کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ میرے عزیز دوست اختر شیرانی مرحوم نے اسی قسم کا ایک رسالہ "انتخاب" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو چند مہینے شایع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ اس رسالہ کے تمام مضامین دوسرے رسایل سے نقل کیے جاتے تھے اور کتابت طباعت بہترین ہوتی تھی اور مضامین پر اختر صاحب کے لکھے ہوئے تعارفی نوٹ عالمانہ اور محققانہ ہوتے تھے اس کے باوجود پبلک نے اس رسالہ کو خاص ناپسند کیا تھا۔ بلکہ بعض تو اٹھا کر پھینک دیتے اور کہتے کہ اوہ! اس میں تو تمام مضامین مطبوعہ ہوتے ہیں۔ اُس زمانہ میں مطبوعہ مضمون چھاپنا ایک عیب تھا اور کسی اخبار یا رسالہ کی یہ سب سے بڑی ہتک کی بات تھی کہ وہ کوئی شایع شدہ مضمون نقل کرے۔

میں ۲۸ سال سے نیرنگ خیال کو جاری کیے ہوئے ہوں۔ کچھ عرصہ اور دیکھئے کی واردات لکھوں تو خون جگر اور آنسوؤں اور رنج و غم کی داستان ہوگی۔ ہم لوگ ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ پہلے زمانے میں مضمون دس بیس سو پچاس سے نہیں ملتے تھے۔ اہل قلم معاوضہ لینا گناہ اور جرم سمجھتے تھے۔ وہ اگر لکھتے تھے تو شوق سے اپنے نام کے لیے خدمت فن کے لیے ادب کے لیے عوام کے فائدہ کے لیے اس کے لیے ناشرین کو اہل قلم سے ذاتی دوستانہ تعلقات پیدا کرنے پڑتے تھے۔ اس سلسلہ میں خاکسار نے ہندوستان کے درجنوں سفر کیے۔ دہلی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، کلکتہ، حیدرآباد اور بمبئی تک خاک چھانی۔ ہزاروں روپیہ صرف ہوتا تھا اور اس کا مقصد وحید صرف اہل قلم سے ذاتی تعارف و تعلق پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آج کے معاوضہ سے جو بعض اصحاب حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں اس مد میں اس سے زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی تھی اور اس کے ساتھ زحمت سفر مستزاد۔

ایک واقعہ سنیئے۔ سید امتیاز علی تاج نیرنگ خیال میں لکھا کرتے تھے۔ اُن سے ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اور دقت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ قارئین کرام نہیں کر سکتے۔ یہ اہل قلم جداگانہ مزاج اور انفرادی ساخت رکھتے ہیں۔ امتیاز صاحب سے مجھے ایک افسانہ تین مہینے کی تگ و دو کے بعد ملا۔ یقین کیجئے کہ یہ چیز اٹھائیسویں چکر میں ملی تھی۔ ایک ایڈیٹر[1] اٹھائیس بار کوشش کرنے کے بعد ایک مضمون حاصل کرتا ہے۔ اس میں کتنا وقت اس نے لے دیا اور تانگہ (موٹر) کے اخراجات کیا ہوئے۔ کیونکہ وہاں جب بھی جانا پڑتا، دوری مسافت کی وجہ سے بغیر سواری کے نہ جا سکتا تھا۔ یہ افسانہ نیرنگ خیال میں شایع ہوا تو میرے دوست اختر صاحب نے اسے انتخاب میں نقل کر لیا۔ چند دن بعد وہ میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے انھیں کہا کہ اختر صاحب دو سو روپیہ آپ کے ذمہ ہیں۔ وہ کہنے لگے کیسے! میں نے کہا آپ نے نیرنگ خیال سے جناب تاج صاحب کا جو افسانہ نقل کر لیا ہے اس کا معاوضہ! اختر صاحب نے کہا۔ واہ حضرت! دیکھیے افسانہ نقل کیا اور ٹھاٹ سے نقل کیا اور حوالہ بھی دیا اور نوٹ بھی لکھا۔ کیا آپ نے تاج صاحب کو کچھ معاوضہ دیا تھا؟ میں نے کہا معاوضہ تو نہیں دیا نہ وہ مجھ سے معاوضہ لیتے ہیں لیکن تین ماہ کی کوشش کے بعد اٹھائیسویں پھیرے میں یہ افسانہ ملا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آپ نے اُسے نقل کر کے نیرنگ خیال کی انفرادیت وقار و شہرت کو نقصان پہنچایا۔

حقیقت حال کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد انھوں نے سر جھکا لیا اور کہنے لگے "حکیم صاحب میں نے اس بات کا تو اندازہ ہی نہیں کیا تھا۔ ہماری قینچی بے پناہ ظلم کر رہی ہے اور اس کے ساتھ پبلک بھی پرچے سے نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں تو چھاپہ شدہ (نقل شدہ) مضامین ہوتے ہیں۔ اس مقصد میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ پرچہ تو خود بخود بند ہو جائے گا۔" اور آخر انتخاب بند ہو گیا

---

[1] اس شمارہ میں مجنوں گورکھپوری کا ایک طویل افسانہ "تنہائی" چھپ رہا ہے۔ خود موصوف کا خط پڑھ لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ میں نے ایک افسانہ حاصل کرنے کے لیے کتنے برس صرف کر دیے ہیں۔ (مدیر)

[illegible] علمی معاملات [illegible] کمزور اور ضعیف ہو جانے کی وجہ سے [illegible] اٹھانے کی سکت اور ہمت اپنے میں نہیں پاتا۔

وہ رسائل جو نقل شدہ مضامین کے بل بوتے پر تجارت کرتے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مضامین کا حصول کتنا دشوار اور سنگلاخ مسئلہ ہے اور نقد معاوضہ سے زیادہ اہمیت تعلقات اور مضمون حاصل کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ پھر کسی ایڈیٹر کی قینچی یا لال پنسل کا نشان اُسے اپنے پرچے کی زینت بنائے تو کیا یہ ظلم نہیں ہوگا؟

حکیم یوسف حسن

میرا اندازہ یہ ہے کہ اب تک کسی نے بھی اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر سوچا ہی نہ تھا۔ بظاہر تو یہ سہانا خواب ہے۔ مگر اس کی تعبیر بے حد خوفناک۔

ارادہ نہ تھا کہ اس مسئلے میں احباب کو بھی زحمت دیتا پھر سوچا مشورے کی حد تک حرج ہی کیا ہے۔ اطلاع دی تو وہ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ ساتھ ہو لیے۔ اب میں اس سلسلے کو پوری معقولیت کے ساتھ آگے بڑھاؤں گا۔ پاک و ہند کے سارے ادیب میرے دوست ہیں۔ میرے بھائی ہیں۔ وہ میری بات سمجھیں گے اور ہماری جائز مشکلوں میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

سب سے پہلے تو انتخابی پرچوں پر یہ چوٹ پڑی کہ انھیں مصنفین کو بھی معاوضہ دینا پڑ گیا۔ ورنہ صاحب پہلے کون پوچھنے والا تھا۔ میں نے اس مسئلے کو اٹھایا۔ رائٹرز گلڈ نے غور کیا۔ نتیجہ معاوضے کی حد تک مصنفین کے حق میں نکلا۔

سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ مل جانے پر مصنف کے حقوق کی پوری پوری حفاظت ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا ایک انٹرویو قابل توجہ ہے۔ جو ہفت روزہ نصرت (۲۴ اپریل ۱۹۶۱ء) میں چھپا تھا۔

”دراصل افسانے کے تنزل کا پرابلم اگر دیکھیں تو کسی حد تک ہمارے ناشروں کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانوں کا مجموعہ اب بکتا ہی نہیں لہٰذا اسے شائع کرنا خسارے کا سودا ہے۔ وہ لوگ بھی ایک حد تک سچے ہیں۔ اگر آج ایک افسانہ کسی پرچے میں چھپتا ہے تو دوسرے رسالے اُسے نقل کر کے حسب توفیق استفادہ کر لیتے ہیں۔ پھر رہی سہی کسر ہمارے چند ایک ریڈرز ڈائجسٹ قسم کے پرچے نکال دیتے ہیں۔ میرا اپنا ایک افسانہ ”مول تول“ اب تک چھ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح ایک افسانہ قاری کی ایک بڑی تعداد کی نظر سے گزر جاتا ہے۔ اور جب ایک مصنف کے ایسے ہی افسانے مجموعے کی شکل میں شائع ہوتے ہیں تو قاری انھیں پہلے ہی متعدد بار پڑھ چکا ہوتا ہے چنانچہ وہ مجموعہ خریدنے میں پوری دلچسپی نہیں لیتا۔“

بعض دوست یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا افسانہ پانچ دس پرچوں میں نقل ہو جائے گا تو اس سے ہماری پبلسٹی میں اضافہ ہوگا۔ یہ بات ایک مبتدی کے لیے تو شاید سود مند ہو۔ مگر جس ادیب کا ادب میں کوئی مقام ہے اور اس کی کتابیں بھی چھپتی ہوں۔ اس کے لیے یہ سودا قطعاً سود مند نہیں۔ اس ضمن میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا تجزیہ بہر صورت قابلِ غور ہے۔ اگر انتخابی پرچوں کی روش یہی رہی تو نوبت یہاں تک پہنچنے کا خطرہ ہے کہ ادیب کو اپنی دائمی زندگی برقرار رکھنے کے لیے خود اپنی گرہ سے اپنی کتابیں چھپوانا پڑیں گی۔

رسائل قاری اور مصنف کے درمیان ایک طرح کا رابطہ ہوتے ہیں۔ آج جتنے بھی بڑے بڑے ادیب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل

رسائل ہی میں لکھنا سیکھا۔ کسی نے نیرنگِ خیال میں، کسی نے ادبِ لطیف میں، کسی نے ساقی میں (وغیرہم) رسائل ہی کے ذریعہ ادیب نامور ہوئے۔ اگر نئے اور ذہین قلمکاروں کی ذہنی کاوشوں کو یہ رسالے منظرِ عام پر نہ لاتے تو آج کئی بڑے ادیبوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی بقا اور نشو و نما کے لیے اچھے اچھے ادبی رسالوں کا وجود بے حد ضروری ہے جو اچھے لکھنے والوں کے جوہر دِکھائیں، اور بنا سنوار کے قارئین کے سامنے پیش کریں اور جو بالکل مبتدی ہوں۔ ان کی اس انداز میں تربیت کریں کہ وہ مستقبل کے اچھے ادیب بن سکیں۔ جن پر ادب فخر کرے۔ بے شک ہر نیا ادیب اپنی ہی صلاحیتوں سے چمکتا ہے۔ مگر اس میں مدیرانِ رسائل کی جانفشانی بھی شامل ہوتی ہے۔ میرے نزدیک تو اچھے رسائل نئے ادیبوں کے لیے ٹریننگ اسکول ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ رسائل جو ادب کی ترویج و ترقی کی بنیاد ہیں۔ وہ آج انتخابی پرچوں کے ہاتھوں اپنی آبرو لٹوا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے یہ دوست محض ذاتی تجارت کی خاطر ہر پرچے سے پانچ دس چیزیں اُڑا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو پرچے صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ سخت پریشان ہیں۔ ان کی اشاعت پر یہ پرچے اثر انداز ہو رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ جن کے دم سے اُردو ادب کی ترویج و ترقی کی روایات وابستہ ہیں۔ وہ سب دم توڑ دیں گے۔ آج انتخابی پرچوں کی حوصلہ افزائی کا بالکل یہی مطلب ہے کہ ادب کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا جائے اور شاخوں اور پتوں کی نشو و نما ہی کو ادب کی ترویج و ترقی سمجھ لیا جائے۔

بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ ادارۂ نقوش نے بھی تو تین چار نمبر صرف انتخابات پر مشتمل چھاپے ہیں۔ جی ہاں! یہ جرم سرزد ہو چکا ہے نقوش نے اپنی تیرہ سالہ زندگی میں، صرف چار نمبر (افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر اور آخر میں خود نقوش ہی کا انتخاب ادبِ عالیہ نمبر) ایسے چھاپے ہیں۔ جو لوگ موجودہ انتخابی پرچوں سے اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ بڑے بے درد ہیں۔ اس لیے کہ میں نے ایک ایک نمبر پر برسوں کی محنت کی۔ اگر میں اور مجھ سے پہلے کچھ اور باہمت حضرات ایسا نہ کرتے تو آج نہ کوئی تذکرہ ملتا اور نہ اُردو ادب کی تاریخ ہی کا کوئی سراغ ملتا۔ دوسرے میں نے آج کے پرچوں کو اُٹھا کر لال پنسل سے نشان نہیں لگا دیئے تھے۔ جو کسی پر زد پڑتی۔

آج انتخابی پرچے چھاپنے والے کسی نہ کسی حیثیت میں پہلے نئی چیزیں ہی حاصل کر کے اپنے رسالے چھاپا کرتے تھے۔ وہ کام کٹھن تھا۔ محنت طلب تھا۔ سوجھ بوجھ چاہتا تھا۔ اس لیے یہ لوگ اس امتحان میں پورے نہ اُترے۔ مارکیٹ میں اُن کے پرچوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح جب نقصان ہوا تو انھوں نے تعمیری کام کرنے والے پرچوں پر ہلّہ بول دیا۔ اب اُن کی قینچی ہے اور ہم مدیرانِ رسائل کی محنتوں کا خون!

اس مہم میں مَیں اکیلا نہیں ہوں۔ مدیرانِ رسائل میرے ساتھ ہیں۔ ادیب میرے ساتھ ہیں۔ اس لیے ہم اپنے اُن دوستوں کو ضرور سمجھا سکیں گے۔ جو اس وقت اپنی ذاتی منفعت کی بنا پر علم و ادب کی خدمت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

محمد طفیل

مولانا ابوالکلام کی قدیم تحریریں

قاضی عبدالودود

ہندوستان میں ایک مدت سے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور وہ ان کی نئی اور پرانی تحریریں جمع کر رہے ہیں۔ اس کے ایک رکن نے مولانا کی تحریروں کی ایک فہرست شائع کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین دستیاب شدہ شذرہ ایک رسالہ اعلان الحق سے ہے جو … میں نکلا تھا۔ آزاد کے دو قدیم مضامین جو … میں ہیں، … کیے جاتے ہیں، فہرست نگار … ہو سکا ہے … اس کے تیار کرنے والے ان سے بے خبر ہیں۔ پہلا … اکتوبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا … ۱۹۰۴ء میں نکلا تھا۔ موخرالذکر کے آخر میں باقی آئندہ درج ہے مگر اس کی کوئی دوسری قسط ۱۹۰۴ء کے کسی شمارے میں میری نظر سے نہیں گزری۔

مخزن سے آزاد کا تعلق غالباً … عظیم آبادی … کی بدولت قائم ہوا تھا اور عجب نہیں کہ ۱۹۰۵ء سے پیشتر ان کی کوئی تحریر اس میں شائع ہوئی ہو۔ اس سنہ کے بعد کہ ۱۹۱۰ء تک اس تعلق کے باقی رہنے کا ثبوت موجود ہے۔ آزاد کا جو مضمون منقول ہوگا اس میں نہ استدلال کا زور ہے اور نہ اسلوب بیان کی خوبی۔

فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کا "وکیل" سے تعلق ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا، لیکن جو مضمون "وکیل" سے نقل ہوگا اس کے آخر میں مرقوم ہے "منجملہ دفتر وکیل امرتسر"۔ ممکن ہے یہ عارضی قیام ہو اور وکیل سے مستقل تعلق بعد کو قائم ہوا ہو۔ … مضمون کا اسلوب بیان … ہے مگر اس میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ مضمون جس وقت طبع ہوا تھا آزاد سید احمد خاں کے بڑے مداح تھے۔ … صاحب نے اپنے مضمون (آزاد … اردو ادب) میں اس کا اعتراف کیا ہے مگر ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ ابتدائی زمانے میں بھی آزاد کو سید احمد خاں سے سیاسی اختلاف تھا۔ یہ ہرگز صحیح نہیں۔ خود آزاد کی بعض تحریروں سے کامل ہمنوائی ثابت ہے۔

"اک بتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد"

"نہیں! یہ تم نے کیا کہا؟ اک بت سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد" "جی ہاں، حضرت! کرلیا لندن میں عقد" "آخر کیوں؟ کیوں کرلیا لندن میں عقد؟" "بس یہ نہ پوچھیے" "کیوں؟ کس لیے؟ کیا آپ کو ہندوستان میں … نہیں ملتی تھی کہ آپ کو معشوقانِ یورپ کی تلاش ہوئی؟ کیا آپ کو ہندوستان میں کوئی سیمیں بدن نہیں نظر آتی تھی کہ … والا کر … یورپ کی طرف توجہ

کرنی پڑی۔ یہ جھلا یہ مسلمان کے لیے بہا سا نازیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے خاندان کو چھوڑ کر غیر قوم میں غیر مذہب میں شادیاں کر لیں۔ ان سے تعلق پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہمارا اس زمانے نہیں، علیحدہ رہنا چاہیئے اور دو رہنے کیا آپ کے خیال میں آپ کو اس امر کی اجازت دی گئی ہے کہ آپ جو اس وقت اس قوم سے کوئی بیرونی تعلق پیدا کریں کہ یہ کہ آپ میں آپ میں قدرت نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں، ان کو،

ضائع کر دیں۔ آپ اس پر کیا کہیں گے؟ فرمائیے۔ ابھی بات پوری نہیں ہوئی، آپ کا یہ تاریخ خالی نہیں ہوا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ اس میں اس امر کی طاقت ہو۔ اب بالکل سے خبر ہو اور ہمیں یہ بات دیکھ رہے ہیں کہ ہم اس امر کی حقیقت کو دیکھتے ہیں کہ فاتح قوم سے اپنے ہندو کی طرح بھی گرہیں ایک ایسی جس میں ہم میں احساس پیدا ہو اور وہ ضرورت ہے جو ہماری ترقی میں رکاوٹ قوم کی وجہ ہے، جو اس ترقی سے علاوہ اس کے کہ ان میں اس کا حق دیا جائے اور وہ اپنے حقوق کو جو مسلمانوں کی جانب سے مذہبی اور دیگر امور میں ان سے دور ہیں، سمجھیں۔ یہ اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ اگر قومی تعلق پیدا ہو جائے تو ہمیں ان امور کا بہت اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ میں اسی خیال سے اور اسی وجہ سے بھی اس بات کے سمجھنے میں کہ بیان میں حقہ۔

[illegible] سے جناب! کیا فاتح قوم سے میل جول بڑھانے سے یہ معنی ہیں کہ ان سے یہ تعلق پیدا کیا جائے، کیا مؤرخ [illegible] یہ کہ نہیں ہیں؟ ان الاسباب المحدثہ اربعۃ۔ اشیاء الی لسنۃ والکالمۃ والاکلۃ، المودۃ (الغذا) [illegible] سے سے [illegible] کچھ کہیں داد۔ آپ کا یہ کہنا کہ ان کی وجہ ہماری ترقی کا ذریعہ بنے گی غلط ہے۔ آپ کسی ترقی یافتہ قوم کی مثال نہیں دیں گے کہ جنھوں نے اس کو شش یا فاتح قوم کی وجہ سے ترقی پائی ہو بلکہ جن قوموں میں سلطنت کا خیال قدرت نے پیدا کر دیا ہے انھوں نے خود ترقی کے اسباب پیدا کیے۔ خود مدارس جاری کیے، خود علوم و فنون کی تکمیل کے لیے دارالعلوم قائم کیے، خود دارالمطالعے اسکول کھولے۔ بلا امداد غیر اپنے خیال اور رائے کی مدد سے ہے شک وہ ترقی کر گئے۔ چنانچہ اس کی مثال کے لیے اہل یورپ کافی ہیں۔ ہاں ایسی قوموں میں کو ئی ملک ہمارا وطن ہے اور یہ اس کا فرض ہے مگر اس کے معنی ہرگز نہیں ہیں۔

جو [illegible] (کچھ دیر بعد) "اچھا جناب یہ وجہ سہی لیکن فرمائیے جناب کہ اسلام نے تو اہل کتاب سے بھی اس تعلق کی اجازت دی تھی پھر جناب کیا تنگ کیا ہے؟"

"ہاں ہاں! آپ اب مذہب کے دامنگیر ہوئے ہیں۔ منشا مذہب اسلام نے جس زمانے میں اس امر کی اجازت دی تھی بلا اس کے اس زمانے میں ہمارا دعویٰ نہ تھا۔ علاوہ اس کے مذہب اسلام کی آزادی اپنی یہ شان رکھتی ہے کہ مذہب اسلام انسانی ذوق کے لیے ایک حد تک آزادی دینے والا ہے اور اس میں نہایت قسم کی تعمیل ملحوظ رکھی گئی ہے جس سے اس کی جامعیت اور مانعیت ثابت ہو، اور کئی موافق ہیں جب کہ فی نفسہ اس تعلق کی ضرورت ہو تو اس کتاب سے مذہب کی مانعت نہیں حائل نہ ہو، نہ یہ کہ بلا کسی خیال کے ضرورت کے ہر زمانے میں اس پر زور دیا جائے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں آج کل کی قوم فاتح مفتوح تھی، ہر طرف اسلامی سلطنت چھائی ہوئی تھی اس سبب اس تعلق سے مسلمانوں کو ہرگز ان عورتوں اور رشتوں کا خوف نہ تھا جس قدر کہ آج برعکس حالت پیش ہو جانے سے در پیش ہے۔ جس طرح کہ ہم مفتوح اور یورپین قوم فاتح ہے اسی طرح اس تعلق میں بھی عورت فاتح اور مرد مفتوح رہے گا۔ ایسی حالت میں اندازہ ہو سکتا ہے کہ اولاد پر کس قدر عورت کے اخلاق و عادات اور مذہب کا برا اثر پڑے گا۔

جن میں باتیں مذہب میں ایسی جائز رکھی گئی ہیں، وہ اکثر مواقع کے لحاظ سے مختلف فوائد رکھتی ہیں۔ پس اس سے اس کی بنا پر فوائد ضروریوں سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی"

"لیکن" میں نے کہا "اب ذرا غور فرمائیے کہ اس تعلق کا کیا اثر اولاد پر پڑ سکتا ہے۔ اولاد پر باپ کا اثر زیادہ موثر ہوا کرتا ہے اور میرے نزدیک یہ بات کم علم ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں آپ اگر ایسا واقعہ پیش کر دیں کہ جس سے اس امر کی تصدیق ہو تو بیشک آپ کا فرمانا صحیح قرار دیا جا سکتا ہے ورنہ آپ نے کہا اور میں نے مانا"

"کیا آپ کو نہیں معلوم؟ آپ تو پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے ضرور کسی سکول میں اس سے پہلے لفظ تاریخ (آپ نے) پڑھا ہو گا۔ سنئے میں وہاں کا ایک تاریخی واقعہ جو اسلامی سلطنت میں واقع ہوا ہے بیان کرتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے گا کہ آج کل ہر جگہ سلطنت ہے اور اس زمانے میں اسلامی بادشاہت تھی۔ [illegible] ایسا واقعہ پیش آیا اس واقعے کو مستند کر کے فلورا[1] ناول میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اندلس میں جب عبدالرحمٰن ثانی کی سلطنت تھی اور اس نے عیسائیوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی، ایک عاقل مگر واقعے کے لحاظ سے انوکھا گزرا ہے۔ ایک لڑکی تھی جس کا نام فلورا تھا اور اس کا بھائی زیاد نامی تھا۔ فلورا کا باپ ایک اندلسی متقی مسلمان تھا جس نے ایک عیسائی حسین عورت سے جائز تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اس سے فلورا پیدا ہوئی اور یہ چونکہ باپ مسلمان نے اسلامی نام رکھ کر اسلام میں داخل کر دیا مگر ماں عیسائی عورت نے اپنے طریقے کے موافق بیٹی پالن میں اس کا نام فلورا رکھا۔ باپ وقت گھر میں رہ نہیں سکتا تھا، ماں کا سایہ اس پر ہر وقت رہا کرتا تھا اس سبب ماں نے فلورا کے دل میں عیسائی مذہب کی ایسی اچھی طرح جما دیا۔ ماں مر گئی، باپ مر گیا، بھائی زیاد فقط باقی رہا۔ زیاد نے فلورا کو حاصل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک مسلمان کے سپرد ہو جائے۔ فلورا کو زیاد نے ہر چند سمجھایا کہ مذہب اسلام حق ہے مگر وہ نہ مانی اور بھاگ نکلی۔ معاشے نے طول کھینچا۔ زیاد کے علاوہ عیسائی ان کے ساتھ لگیں اور اس کے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ زیاد نے بھی خوب انتظام کیا مگر بے سود۔ فلورا نکلی اور کہاں کی کہاں پہنچی۔ زیاد اس کی تلاش میں پریشان ہوا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کدھر کدھر کی مٹی اڑائی۔ بالآخر بہت سخت واقعے اس کی بدولت پیش آئے۔ سلطنت کو حیرانی ہوئی، رعایا کو پریشانی، زیاد اور فلورا دونوں برباد ہو گئے اور دیکھنے والے افسوسناک نگاہ سے دیکھتے رہے۔

الغرض باوجودیکہ فاتح قوم مسلمان تھی لیکن پھر بھی اسی تعلق نے کیا کیا گل کھلائے، کتنے خاندان برباد ہوئے، کتنے جان سے گئے، تمام اسلامی اور عیسائی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کس سبب ہوا؟ یہ سب اسی تعلق کی وجہ سے ہوا۔ اسی کم بخت تعلق نے یہ سب کچھ کیا جس کی یہ کچھ آپ تعریف کر رہے ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ آج کل فاتح قوم کا اثر بالکل رہا یا پھیلا ہوا ہے۔ فاتح قوم سے یہ تعلق کیا ایسی نہیں پیدا کرتا کر چکا ہے اور پیدا کرے گا؟"

جواب نہ ملا اور ... (اوپر دیکھ کر) "اچھا آپ تشریف رکھیں، میں ابھی جا کر بیٹھتا ہوں ..." رکھا تو مگر اس کا کیا جواب ہے کہ ہم ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو تعلیم یافتہ عورتوں کی ضرورت ہے، وہ ابھی ہندوستانیوں میں مفقود۔ پھر کیا کیا جائے؟ مجبوراً ہمیں دوسری تعلیم یافتہ معزز قوم (نورا نسیم کے ساتھ) کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ کیا ہم ایسے تعلیم یافتہ، جاہلہ عورتوں کی زبان سے فضول باتیں سن کر بھی بہت برداشت

---

[1] ہسپانوی زبان کا نام فلورا فلورنڈا ہے۔

کی مبالغہ اور بلند پروازی کی آواز [illegible] سنتے تھے۔

[illegible] آپ کا ارشاد ایک پہلو سے عاشے عجیب کہ جناب چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے رام پور کانفرنس کے لیکچر میں [illegible] اس [illegible] نسواں سے یہ اچھا عذر آپ نے پیدا کر لیا ہے اور جب تک تعلیم نسواں کا رواج ہندوستان میں نہ ہو گا اس عذر [illegible] کا آپ کو [illegible] رہے گا لیکن حضرت نہیں اگر آپ محب قوم ہیں تو آپ کو چاہیے کہ آپ تعلیم نسواں کو جاری کرنے کی کوشش کریں اور [illegible] یہ ضرور ہے کہ قوم کو تعلیم پر آمادہ کرے نہ یہ کہ آپ یہ عذر پیش کر کے غیر قوم کی تعلیم یافتہ لیڈیوں [illegible] دنیا کے مزے میں [illegible] زندگی بسر کریں اور اس سے مستغنی ہو جائیں [illegible] ہندوستانیوں نے [illegible] ایسے نکلیں گے جو اپنے اس کیے پر پشیمان ہو رہے ہیں اور اس خرچ اور آزادی کے متحمل نہیں ہو سکتے جو اس سبب سے [illegible] کیا آپ کسی ایک ہندوستانی شخص کے حالات سے بھی واقف نہیں جنھوں نے یہ تعلق پیدا کر کے تقریباً اپنی زندگی تلخ کر لی ہو مگر افسوس ہے کہ اس پر بھی آپ [illegible] ناواقفوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور یورپ کی سفید رو لیڈیوں کو دیکھ کر [illegible] معذور اور مجبور بھی ہیں [illegible] مجبور ہو جاتے ہیں۔ لنڈن میں [illegible] خیال [illegible] ان کا جانا اور وہاں [illegible] حسن کا [illegible] دیکھ کر بے اختیار نہ ہونا مشکل امر ہے۔

ہمارے مکرم دوست سید اکبر حسین صاحب سیشن جج [illegible] ہمارے تعلیم یافتہ گروہ پر سے اس اعتراض کو رفع کرنے کی بڑی کوشش کی ہے اور ایک نہایت عجیب و غریب نظم لکھی ہے۔ اس نظم نے ہم کو بہت ہی لطف حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہم نہیں پسند کرتے کہ اس لطف سے ناظرین [illegible] محروم رہیں [illegible] اس کا پہلا مصرع عنوان پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے [illegible] اعتراض رفع کیا ہے۔ اس کی داد ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

قطعہ

اک [illegible] سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل و قوم
کوئی کہتا ہے کہ ہے یہ بدخصال و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے خود مجبور یہ کرتا ہوں اس پردے کو فاش
ہو گئی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی طرز معاش[1]
جگمگاتے ہوٹلوں میں جا کے نظارے کرو
سوپ و کاری کی طرف راغب ہو چھوڑو دال ماش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ پڑ گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش
دونوں جانب تھا دلوں میں جوشش خون[2] فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

---

[1] کذا

[2] یہاں پر کاغذ پھٹ گیا ہے۔ خون کا حرف ن موجود ہے۔

اس کی چتون سحر، آنکھیں اس کی باتیں دلربا | چال اس کی فتنہ خیز، اس کی نگاہیں برق پاش
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا | دست ساقی کو جھٹکا کر اور بھی کرتا دورباش
بارہا آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال | حضرت سیدؒ سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش
درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای | باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اس نظم میں حضرت اکبر نے جو جو کیفیتیں بیان کی ہیں ان کی وہ اشخاص تصدیق کر سکتے ہیں جو اس کوچے میں قدم رکھ چکے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شبیب کا شعر (کذا) [illegible] جانے والے کے لیے بھی [illegible] سب حال ہے۔ راقم حضرت اکبر [illegible] اور [illegible]۔
بقلم ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی [illegible]۔

ممالک اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات

راز الفت کھل گیا باطن جو تھا ظاہر ہوا!
اب تو ہے سب کی زباں پر جو ہمارے دل میں تھا

سر سید احمد خاں مرحوم کی سب سے بلند قدری قابلیت سے مثل حالی و ماثی اور ان کی اسلامی تحقیقات کی قدر اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جو آواز اب سے تیس یا چالیس برس پہلے اس اسلامی دور کے آخری مجدد کی زبانی سر زمین ہند میں بلند ہوئی تھی آج مصر، اسلامبول اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نکل رہی ہے۔ وہ راگ جو اس زمانے میں ہمارے کانوں کو نہایت ناگوار گزرتا تھا اور جسے ہم اپنے خیال میں بے وقت کی راگنی سمجھ رہے تھے آج ہمارے لئے ایسا کانوں کو نہایت سہانا [illegible] ہو رہا ہے اور ہم ہیں کہ اس راگ پر مست ہوئے جاتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں اسی راگ پر تڑپتا ہوا ہے کہ کچھ کی مخالفت خود ہم نے کی اب تک معلوم ہوتی ہے اور تعجب ہے کہ ایسی صاف اور سیدھی سچی باتیں ہم تعصب اور (کذا) جہالت کے رعب میں کیونکر ہمیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں سیدؒ کی مثال ایک ایسے روشن ضمیر کی سی ہے جو غفلت اور ناواقفی کے زمانے میں ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھ کر اپنی غافل قوم کو ایسی تعلیم دینا شروع کر دے جسے ان کی جہالت اور غفلت سے کوئی نسبت نہ ہو، ان کے کمزور خیالات، ان کی عادت اور غفلت اس تعلیم کے حاصل کرنے کی متحمل نہ ہو۔ وہ اس روشن ضمیر کے روشن خیالات نہ سمجھیں اور اس کی عاقلانہ تعلیم کو دیوانگی سے تعبیر کریں۔ جہالت کا زور ان کی طبیعتوں پر یہاں تک غالب آ جائے کہ وہ اس محب قوم کو دشمن قوم سمجھ کر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں۔ تعصب کا خون ان کی عقل پر یہاں تک مستولی ہو جائے کہ وہ اپنے جان و ایمان کے فدائی کی جان لینے اور اس کے خدمت قومی کے جرم پر طرح طرح کی تکالیف دینے میں اپنی نجات سمجھیں۔ مگر وہ روشن ضمیر مدبر اور محب قوم ان کی ان جاہلانہ حرکتوں کو بچوں کی نادان حرکات سے تشبیہ دے اور ان کی بد مزاجی اور جہالت سے ناواقف سمجھ کر انہیں ایسی قابل سرزنش حرکتوں پر بھی معذور رکھے لیکن یہ پکار پکار کر کہے کہ اس زمانے کو دور سمجھو جب تم میں اپنی برائی بھلائی کی تمیز ہو جائے گی اور تم وہ سمجھو گے جو میں آج کہہ رہا ہوں اور وہ جانو گے جو میں آج جان رہا ہوں۔

---

(۱) سید سے مراد سر سید احمد خان مرحوم

اس وقت جب ہم ان کی تعلیم کی قدر کرتے ہیں اور تعمیرِ ملت، خدمتِ قومی اور محبتِ وطنی یاد آئے گی۔ سرسید نے ہی سب سے پہلے یہ بات کہی کہ اگر بائیبل موجودہ کی عبارت سے علیحدہ کر کے پڑھی جائے تو وہ اختلافات دور ہو جاتے ہیں جو بائیبل کے مطالب اور قرآن مجید میں معلوم ہوتے ہیں۔ جاتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ تثلیث کے مسئلے کو الہامی بائیبل سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ عیسائیوں کا ساختہ پرداختہ مضمون ہے۔ اس دعوے کا ثبوت [illegible] اسلام کی عیسائی علماء سے مناسبت [illegible] سرسید نے اس رسالے میں لکھ کر شائع کی تھیں۔ یہی ضرورت جس نے سرسید کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا تھا ایک مدت کے بعد مصر میں ایک عیسائی عالم نے محسوس کی اور وحدت الادیان کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کی [illegible] غرض یہ تھی کہ اسلام، نصرانیت اور یہودیت پر ظاہر کر کے انھیں توحید فی الادیان پر آمادہ کیا جائے۔ سرسید دنیائے اسلام میں وہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید فلسفے کے مقابلے میں جدید علم کلام کی ضرورت ہے اور قدیم متکلمین کی تصنیفات موجودہ علوم کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں علمائے اسلام نے اس خیال کی بڑی مخالفت کی مگر آگے چل کر زمانے نے ہر ایک کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ خود علماء اس طرف متوجہ ہوئے اور علم کلام کا جدید اسلوب ترتیب دینا اسلام کی اہم خدمت تسلیم کی۔ ندوۃ العلماء کے ابتدائی جلسوں کی رپورٹ سامنے رکھو اور شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور مولوی محمد حسین صاحب الہ آبادی، مولوی محمد ابراہیم صاحب آروی مرحوم کی تقریریں پڑھو اسی ضرورت کا رونا نظر آئے گا جس کے پیش کرنے پر اعتراض علماء نے ایک زمانے میں سرسید کی مخالفت کی تھی۔ ممالک اسلامیہ میں اس ضرورت پر ایک عرصے سے توجہ ہو رہی ہے۔ رسالۃ الحمیدیہ جو اسی موضوع پر ایک عالمانہ رسالہ کی تصنیف ہے ہندوستان میں اچھی طرح شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ الحق العلمی، الاسلام والمدنیہ وغیرہ کئی کتابیں اسی موضوع پر [illegible] شائع ہوئی ہیں [illegible] مصر اور قسطنطنیہ کے اسلامی رسالوں میں [illegible] کثرت سے [illegible] رہتی ہے اور اس پر مبسوط تحریریں لکھی جاتی ہیں۔ المنار [illegible] فاضل دیکھتے ہیں وہ ہمارے قول کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مصر کے مفتی اور جامع ازہر کے شیخ محمد عبدہ دیار مصر میں ایک [illegible] لکھے جاتے ہیں المنار میں آج کل آپ کے درس قرآن کا اقتباس تفسیر القرآن کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے جس میں اسی اصول پر قرآن کی تفسیر کی جاتی ہے جو کبھی ہندوستان میں [illegible] سمجھا گیا تھا۔ حال میں مصر کے ایک روشن خیال عالم محمد فرید وجدی [illegible] اسی موضوع پر ایک مبسوط کتاب ماہوار رسالے کی طرح سلسلہ وار شائع کر رہے ہیں جس کا نام الاسلام فی عصر العلم ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں [illegible] سرسید مرحوم نے ظاہر کیا تھا [illegible] خیال آج کل اسلامی دنیا کا عام [illegible] ہے اور انسان فطرۃً آزاد ہے اور اس کی یہ آزادی کسی خارجی اثر سے زائل نہیں ہو سکتی۔ قدیم فلاسفہ اس فطری آزادی کی تہ کو نہ پہنچ سکے اور دنیا میں غلامی کی خلاف فطرت رسم پیدا ہو گئی۔ افلاطون [illegible] نے انسانی فطرت میں [illegible] دیا اور صرف اہل یونان کو آزادی کا حق قرار دیا۔ اسی طرح یورپ بھی ایک عرصے تک غلامی کا حامی رہا لیکن [illegible] روشن جماعت کی [illegible] غالب آئی تو تمام یورپ نے انسان کو فطرۃً آزاد تسلیم کر لیا اور ایک یورپین کو جس آزادی کا مستحق سمجھا [illegible] ایک حبشی اور سرکیشین کے لیے لازمی قرار دیا لیکن برخلاف اس کے اسلامی دنیا ایک عرصے سے غلامی کو جائز سمجھ رہی ہے اور عام طور پر وہاں اس کا رواج ترقی کر رہا ہے۔ سلطان المعظم کا تمام محل سرکیشین لونڈیوں سے آباد ہے [illegible] کی رونق غلاموں سے ہی جاری ہے۔ یورپ اسلام پر بڑے زور سے معترض ہے کہ اسلام انسان کو اس کی فطری آزادی سے محروم رکھتا ہے اور غلامی کی ناپاک رسم کا حامی ہے۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کا سب سے پہلے اسلامی دنیا میں سرسید کو خیال ہوا اور مرحوم نے [illegible] آن دی لائف آف محمد میں عقلی و نقلی دلائل سے اسلام کو اس رسم کی اعانت سے بری ثابت کیا اور لکھا کہ مسلمانوں کے افعال کا بانی مذہب

با خود مذہب نہ مردہ نہیں ہو سکتا جس طرح موجودہ مسیحی حالت کا یہ جواب وہ نہیں ہے اور یہ اس حکمت ہے ایک مبسوط رسالہ نیچر الاسلام تحریر اس محسنہ کا بالکل نا لکھ کر دیا ہے وہ ضرورت ہے بہت سے ہم بحث کے بعد بعض روشن خیال مسلمانوں نے محسوس کیا ہے پچھلے دنوں جب کہ دنیا میں ایک فرنچ پروفیسر اسلام کو علمی ترقی کے لیے رکاوٹ قرار دے رہا تھا اس دنیا میں آزادی کے حامی مذہب پر حملہ کر رہا تھا ایک مصنف نے اس کا جواب دیا اس کے جواب پر توجہ ہوئی اور اس نے فرنچ میں اکا دمی وہ رسالہ اسلام کی بہتری نا بت کرنے کے لیے شائع کیا ان کی نام لیو سب میں موجود گی اور تمام کر کے اپنا اردو میں ترجمہ کیا ان لکھیے اس رسالے کے بیان بیس لکھے ہیں الاسلام پر مشتمل ہو کر تے ہوئے مصنف کا اسلام پر ایک بہت بڑا احسان ہے مسلمہ کرتا ہے تحقیق اس سے بہتر موجود ہے گئے فہرست ہو نکلی ہے اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام پر حقیقی احسان المؤید کے خطیات اور ترتیب الاسلام نے مصنف نے پیدا کیا تھا اس نے اول اول اس ضروری مسئلے پر روشنی ڈالی گو اصافی طور پر اسی الاسلام کو مصنف ہی نے مکمل کرنے کا حق ہے۔

———

غالب اور حادثۂ اسیری

(ایک معاصر شہادت اور قطعۂ تاریخ)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غالب کے واقعۂ اسیری کے حالات ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ اس زمانے میں ذاتی وجاہت اور وضعداری سب آداب میں کچھ ایسے سمجھے جاتے تھے کہ [illegible] زیادہ سے زیادہ [illegible] اور سیرت میں ایک [illegible] رکھتا اور جیسے رہتے کے انداز کو ترجیح دی جاتی تھی۔ [illegible] معلومات سے کچھ [illegible] ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ [illegible] لغزش سے اس کی عظمت پر حرف [illegible] غالب بھی [illegible] واقعہ کو زندگی بھر [illegible] جہاں تک ہو سکا انھوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ غالب کے اولین سوانح نگار حالی نے بھی، چونکہ [illegible] غالب کی سیرت کے ان پہلوؤں کو تحقیق کی روشنی میں لانا [illegible] کیا [illegible] زیادہ سے زیادہ [illegible] کرنے کی کوشش کی۔

عام شہرت ہے کہ غالب قمار بازی کے الزام میں ایک دفعہ نہیں دو دفعہ ماخوذ ہوئے تھے: پہلا واقعہ ۱۸۴۱ء کا اور دوسرا ۱۸۴۷ء کا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنی کتاب "چراغ دہلی" میں غالب کے حادثۂ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "[illegible]"[1] [illegible] روایت میں [illegible] [illegible] معلومات [illegible] "دہلی اردو اخبار" [illegible] غالب کی گرفتاری کی خبر ۱۵ اگست ۱۸۴۷ء [illegible] چھپی تھی۔[2] یہاں سے اسے سب سے پہلے امداد صابری صاحب نے "تاریخ صحافت اردو" میں نقل کیا۔[3] لیکن انھوں نے غالب کی گرفتاری سے متعلق اس خبر کی اہمیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس کی طرف پہلی بار ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے توجہ دلائی۔[4] غالب زمرہ صاحب سے "ذکر غالب" [illegible]

۱؎ چراغ دہلی، مرزا حیرت دہلوی، ص ۳۲۷

۲؎ دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۷ء، مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی

۳؎ تاریخ صحافت اردو، امداد صابری، دہلی، جنوری ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۰

۴؎ کلاسیکی ادب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۲

میں اس واقعے کا ذکر مالک رام صاحب کے حوالے سے کیا ہے لیکن خود مالک رام صاحب نے دہلی اردو اخبار کی تاریخ ۲۲ اگست لکھی ہے جو غلط ہے۔ غالب کی گرفتاری کی خبر ۱۵ اگست ۱۸۴۷ء کے اردو اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس خبر سے چونکہ آگے چل کر غالب کے دوسرے واقعۂ اسیری سے متعلق بعض اہم نتائج اخذ کرنے میں مدد ملے گی، اس لیے مناسب ہے کہ اسے ایک دفعہ دیکھ لینا ضروری ہے:

> "سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثلاً ہاشم علی خاں وغیرہ کے ... کہتے ہیں کہ مرزا ... بہت عالی خاندان ہیں باعث رعب و دولت مرداں کے یا کسی طرح سے کوئی تھانہ دار درست ... اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانہ دار ... سید اور ... بنا تھا ... مقرر ہوئے ہیں ... بیٹھ جاتا تھا ... مدت کا لوگ ... تعداد ... بہت گرفتاری کی جا رہی ہے بہت ... ہے۔ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ ... شمس الدین قاتل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ[3] میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانہ دار ... ہوں گی ... تھی لیکن ... نے وہاں کو کام فرمایا، سب کو گرفتار کیا، عدالت سے جرمانہ علیٰ قدر ... مرزا نوشہ پر سو روپے ... اگر ... چار مہینے ... مہینے قید ... ان ... کی ... تو ... کام فرمایا ... اس علاقہ میں ... تھانہ دار ... کے ... کچھ تعجب نہیں کہ وقت ... جھوٹ ... کریں اور ... ان کی ... ہو ... تھانہ دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں، ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔"[2]

حیرت ہے کہ اس واقعے کا ذکر کسی دوسرے مورخ نے نہیں کیا۔ نہ ہی غالب نے اپنے اس طرح ماخوذ ہونے کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ یادگارِ غالب بھی اس واقعے سے خالی ہے۔ کیا یہ جانتا ہے کہ خود غالب نے یا ان کے کسی ... جرمانہ کی رقم خود ادا کر دی اور اس طرح وہ قید کی آفت ناگہانی سے بچ گئے۔ دہلی اردو اخبار کے اس بیان پر مندرجہ ذیل نتائج قائم ہوتی ہیں:

۱۔ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا تھا۔

۲۔ اس میں بڑے بڑے نامی قمار باز شریک ہوتے تھے۔

۳۔ نیا تھانہ دار جو قوم سے سید تھا، بہت بے طمع اور ... تھا۔

۴۔ تمام قمار باز گرفتار ہوئے اور عدالت سے علیٰ قدر مراتب جرمانہ ہوا۔

۵۔ مرزا غالب پر سو روپے جرمانہ اور عدمِ ادائیگی کی صورت میں چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔

۶۔ اس خبر میں غالب کے قید ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔

---

[1] ذکرِ غالب، مالک رام (اشاعت سوم) دہلی ۱۹۵۵ء ص ۶۲۔

[2] یہ جملہ غور طلب ہے۔ بظاہر یہاں "قاتل ولیم فریزر" کے قرابت قریبہ کا کوئی محل نہ تھا۔ لیکن اس کے پس منظر میں جو بغض و عناد جھانک رہا ہے وہ خاصا [illegible] ہے۔

[3] دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۷ء محفوظ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔

اس واقعے کے چند برس بعد غالب قمار بازی کی وجہ سے دوسری بار ۱۸۴۷ء میں ماخوذ ہوئے۔ اس دفعہ احباب اعزہ کی سعی و سفارش بے

[illegible] ... واقعہ غالب ... [illegible] ... متعلق غالب کے ایک معاصر شاعر کا بیان ... واقعہ تاریخ

[illegible] ... معلومات ... [illegible] ... تجزیہ کرنے کے لیے اس واقعہ سے متعلق خود غالب سے اور

[illegible] ... ضروری ہے ... ان خبروں کو پیش کیا جاتا ہے جو غالب کے معاصر اخبارات

میں ان کی گرفتاری ... [illegible] ... ہوئی تھیں۔

[illegible] ... اس وقت ... [illegible] ...

[illegible] ... ۳ مئی ۱۸۴۷ء کو شائع ہوئی :

"خبر دہلی ۲۵ مئی کو ... جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو

رہی تھی چنانچہ کوتوال صاحب ... اور جناب مرزا صاحب کو ... اور

قمار بازی کے ... کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب

مجسٹریٹ اس سے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔"[1]

غالب کی گرفتاری کی تاریخ یعنی ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء فقط اسی خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر ان کی گرفتاری کے چند روز بعد شائع

ہوئی ... ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا۔ ظاہر ہے ... انھوں نے حوالات میں گزارا ہوگا۔

اب اس سلسلے کی دوسری خبر ... الاخبار کی ہے۔ اس اخبار میں دہلی ... بادشاہی سے متعلق جو حالات چھپتے تھے ان کا

ترجمہ خواجہ حسن نظامی نے "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں غالب کی گرفتاری کا ذکر ۲۵ جون

۱۸۴۷ء کی خبروں میں یعنی گرفتاری کے پورے ایک ماہ بعد یوں آیا ہے :

"مرزا اسد اللہ خاں بہادر ... غلط اطلاع ... کے باعث قمار بازی کے جرم

میں قید کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی بھیجی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔

یہ معزز ین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی غلط پردازی کا نتیجہ ہے۔

عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے

سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"[2]

۲ جولائی ۱۸۴۷ء کی خبروں میں جہاں اس مقدمے کے فیصلے کا ذکر یوں آیا ہے :

"مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا۔ اس کا فیصلہ

سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا

---

[1] ص ۸۰، شمارہ ۱۰۵۔ بحوالہ "قدیم اخبارات کی کچھ جھلکیاں" امتیاز علی عرشی۔ نوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء

[2] دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی ص ۱۷۱

ہوئی۔ اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جانے کا خطرہ جرمانے کے علاوہ، اگر پچاس روپے زیادہ ادا کئے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ سبب اس بات کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب مدت سے علیل رہتے ہیں اور لئے پرہیزی غذا کھایا کرتے ہیں اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ گمان پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اور یہ بھی بیان ہے کہ اگر سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو یہ صرف سزا موقوف ہو سکے بلکہ یہ الزام بھی جاتا رہے۔ ہم کہتے خداداد جاہ۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس، جس کی عزت و حرمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر نقش ہو رہا ہے، تھوڑی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا خوف یا احتمال ہے۔"[1]

(ج) محسن کریم الدین نے غالب کے واقعۂ اسیری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"ان ایام میں یعنی رمضان ۱۲۶۳ھ کے ایک صدمہ ان پر جانب سرکار سے پڑا جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا . . . ."[2]

(د) حالی نے "یادگار غالب" میں غالب کی گرفتاری کے حالات پوری طرح بیان نہیں کئے۔ مگر ان الفاظ میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے :

"مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور جب وہ کبھی کھیلتے تھے دل لگی کے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔"[3]

(ہ) اس واقعہ سے متعلق کچھ اشارے سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں بھی ملتے ہیں۔ اس میں قلعہ کے بعض حالات وہاں کی ایک قدیم ملازمہ مغلی خانم کی زبانی لکھے گئے ہیں۔ اس کے مطابق مرزا غالب کا مقدمہ کنور وزیر علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب کی سعی اور بہت افسر کے اختیارات خاص کی وجہ سے ہوئی۔ گرفتاری کی وجہ انھوں نے یوں بیان کی ہے :

"دکان کنہ گار میں میں نے سنا کہ محبوب علی خاں خواجہ سرا اور شہر کے کئی اشراف آدمی مل کر رانوں کو جوا کھیلتے تھے اور لاکھ لاکھ روپے کی بازی لگائی جاتی تھی اور جو شخص جیتتا تھا، محبوب خاں اس کی جیت کا روپیہ ٹکیوں میں لدوا کر اس کے گھر

---

[1] دلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی صفحہ ۱۷۴ اور ۱۷۵

[2] کریم الدین، تذکرہ طبقات شعرائے ہند ۱۸۴۷ء، صفحہ ۳۷۸

[3] یادگار غالب، حالی، طبع لاہور، صفحہ ۲۷

مجھ سے بیان کیا تھا، مرزا نوشہ (غالب) کی حیثیت اتنی تھی کہ ان کے نکالنے کی رقم ادا کر دیتا۔

...... سو اسی طرح مرزا صاحب اس مصیبت میں پھنس گئے۔ کوتوال جو مرزا کی گھات

میں لگا ہوا تھا، آخر اس کا داؤ لگ گیا اور اس نے سب کو پکڑ دھکڑ لیا۔

(د) اس سلسلے کا مفصل بیان مرزا ناصر الدین کا ہے۔ جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے غلام رسول مہر کو ایک نوٹ کی صورت میں لکھ کر دیا تھا اور جو ان کی کتاب غالب میں شامل ہے۔ اس کے ضروری حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

"غدر سے پہلے دلی کی رئیسانہ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ فارسی قطعہ اور قلعہ سے پچاس روپے ملتے تھے[2]

چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنا چاہتے تھے اس لئے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے۔

اس زمانے میں دلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں

نے ایک وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے ان میں ایک قمار کا بھی مشغلہ تھا۔

گنجفہ عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور شطرنج کے لئے دیوان خانوں کی محفلیں اس بات کی شہرت

رکھتی تھیں۔ مرزا بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان سے یہاں چاندنی چوک کے بعض

جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ جوا بازی شروع ہو گئی۔ قمار کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جب

تک داؤ پر لگایا جائے کہ مہتمم قمار خانہ کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے۔ جو

بھی جیتے، فی صدی اتنا صاحب مجلس کا ہو گا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں

جمنے لگیں تو وہ صاحب مجلس ہو گئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول

ہونے لگی۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے اس سبب سے اس میں بھی کچھ نہ

کچھ مار ہی لیتے تھے......"

"چونکہ شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہتے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ

رہتی تھی۔ اس سبب سے ان کے خلاف نہ کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا، نہ قانونی اقدام کا اندیشہ

تھا۔ اس میں ایک کوتوال فیض یا نشان مرزا خانی بھی تھے......"

"لیکن غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ

تو شاعر تھا نہ شعر و ادب کا غالب کا قدر شناس ہونا۔ ..... کوتوال تھا۔ اس نے آتے ہی سختی

کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی اور جا سوس لگا دیئے ...... بالآخر ایک دن ایسے

موقعہ پر کہ مجلس قمار گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں، کوتوال پہنچا اور رنگ

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک۔ سید ناصر نذیر فراق دہلوی، طبع دہلی، صفحہ ۳۴، ۳۵۔

[2] مولانا آزاد کا یہ بیان غالب کے دوسرے واقعہ اسیری یعنی ۱۸۴۷ء سے متعلق ہے لیکن اس وقت قلعہ کے پچاس روپے کہاں تھے۔ مولانا سے تسامح ہوا ہے۔ غالب گرفتاری کے تین برس بعد ۱۸۵۰ء میں قلعہ کے ملازم ہوئے (ذکر غالب، مالک رام، ص ۶۷)

دی ۔ اور لوگ تو کچھ زنسے سے نکل بھاگے ۔ صاحب مکان یعنی میرزا صاحب پکڑے گئے ۔"[۱]

۔ ذرا منہ بند بادشاہ دونوں کے بعد غالب کے متعلق شیام لال عاشقی[۲] کا وہ قطعہ تاریخ نقل کیا جاتا ہے جو اس سلسلے میں آج تک پیش نہیں کیا گیا۔ عاشقی چونکہ غالب سے ہم عصر تھے اور دلی ہی میں رہتے تھے۔ غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق اس قطعہ تاریخ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس قطعہ میں عاشقی نے پانچ تاریخیں نکالی ہیں۔ پہلی فصلی، دوسری عیسوی، تیسری اور چوتھی ہجری اور پانچویں بکرمی سنہ کو ظاہر کرتی ہے ملاحظہ ہو:

میرزا نوشہ سے فصلی ہیں تو سب اخبار خواں ہے

اور یوں شہرہ عیسوی لفظوں میں قید بے زباں ہے

حلق غالب نے کیونکر ہوش اور کر بے گھر والی ہر روز

دل بھی مستانی کا ان کے پاس سے بد دالی ہے

رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیونکر ہو

زبان غمخوار ہیں کہہ دوں کیا فیض الحسن حسان ہے

۱۹۰۴ بکرمی

---

[۱] غالب، غلام رسول مہر، ص ۱۸۶۔ [۲] منشی گھنشیام لال عاشقی دہلی کے کائستھ ماتھر تھے۔ ان کے والد رائے چھنی لال شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دیوانی کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ بہادر شاہ کے میر منشی لالہ لال الفت رائے کے بھتیجے تھے۔ یہ خود اکبر شاہ ثانی کے عہد میں مرزا بابر، خلف اکبر شاہ کے ملازم رہے۔ خوشنویسی اور موسیقی سے لگاؤ تھا۔ شاعری میں شاہ نصیر کے تربیت یافتہ تھے اور انھیں کی طرح سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا شعر گوئی کا معراج سمجھتے تھے۔ صنائع بدائع پر جان چھڑکتے تھے اور ساری توجہ چست بندشوں، خوشنما ترکیبوں اور الفاظ کی شعبدہ بازی پر صرف کرتے تھے۔ طبیعت بڑی طرار پائی تھی۔ دو غزلے، سہ غزلے کہنا ان کے لیے آسان تھا، قادر الکلامی کا لوہا منوا لیتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے۔ ان کا انتقال ۷۰ برس کی عمر میں ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ان کے پوتے منشی منوہر لال انجمن شاگرد کے پاس محفوظ تھا، جسے انھوں نے موہن لال ماتھر دہلوی کے مقدمے کے ساتھ کا نسخہ سمجھا دہلی سے شائع کر دیا ہے۔

عاشقی کے نواسے منشی بہاری لال مشتاق غالب کے شاگرد تھے۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی گوری شنکر قیصر بھی صاحب دیوان تھے۔ ان دونوں کے انتخابات دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔

[مقدمہ کلام عاشقی، تلامذۂ غالب صفحہ ۲۵۹، دیباچہ دیوان مشتاق، دیباچہ دیوان قیصر، تذکرہ بہار سخن صفحہ ۲۷۲ نیز سخن شعرا، نساخ ص ۳۲۱]

[illegible] نصف [illegible] عاصی
[illegible] ہوں سے قصہ [illegible] زنداں ہے[1]

جو قطعہ تاریخ ان کے دیوان میں عاصی سے منسوب ہے اس میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ معلوم ہوتی ہیں:

> [illegible] شاعر ہے دہلی، [illegible] ملتفت [illegible] غالب محلہ کوتوال کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی [illegible] قمار بازی ان کو قید کرا [illegible] جو تاریخ نکالی [illegible] برووت گرفتاری کوتوال صاحب رقعہ میں [illegible] ہو گئے اور [illegible] داخل ہوئے اور اندر مکان کے حربات جو تھی با ہمراہی تھا۔ چونکہ باہر کا آدمی تھی [illegible] اندر بہت تعجب تھی اور کلی اعداد میں پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کرا دیا۔ [illegible] ناراض ہوئے۔ اور بعد میں [illegible] کے حامی ہونے کا [illegible] ہو گئی
>
> [illegible] روز مرہ [illegible] صاحب [illegible] قید یا جیل خانہ کو [illegible] کے لئے حضرت کے پاس تک پہنچے [illegible] دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎
>
> جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
> کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں
>
> اُس وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔[2]

غور طلب امور

مندرجہ بالا شہادتوں کی روشنی میں سب سے اہم مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی غالب قمار بازی کے جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے؟ اس بارے میں مختلف بیانات میں گہرا تضاد ہے۔ بیان "ج" میں گرفتاری کے اسباب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لیے یہ [illegible] زیر بحث سے۔ بیان "ب" (حسن الاخبار) اور "د" (یادگارِ غالب) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب جوا نہیں کھیلتے تھے۔ اس کے برعکس بیان "الف"، "د" اور "ز" سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا بنا ہوا تھا اور وہ خود بھی جوا کھیلتے تھے۔ بیان "ہ" ان متضاد بیانوں میں سے کونسا قرینِ صحت ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے ان مختلف بیانات کی صحت اور استناد کا درجہ متعین کرنا ضروری ہے۔

---

[1] کلام عاصی، ص ۲۶۳۔ اس قطعہ تاریخ کے علاوہ عاصی کے دیوان میں مفصل دہلی "قتلِ ولیم فریزر"، شادی حضرت بہادر شاہ ہمراہ زینت محل، وفات [illegible] [illegible] وغیرہ کی تاریخیں بھی ملتی ہیں۔

[2] ایضاً ص ۲۶۳، ۲۶۴

...ں میں ... سا بنا بغیر ... ہے لکھا گیا ہے۔

مرزا ... سب سے پہلے قمار بازی کے معاملے میں حالی کے بیانات کو لیجئے۔ حالی کا بیان تاریخی اعتبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کیونکہ وہ غدر کے بہت بعد زمانے تک ان کی صحبت میں ... یہ بیان ہی نہیں تھی چنانچہ اس معاملے میں ان کی معلومات شخصی نہیں ہیں ... ان کے بیان کی بنا پر ... مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"خواجہ حالی مرحوم نے اس واقعہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ واقعات کے قطعاً خلاف ہے۔ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو صرف مداحی سمجھتے تھے۔ اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔ حیات جاوید میں بھی انھوں نے ہر جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ .... خواجہ صاحب نے اس معاملے کو اس رنگ میں دکھایا ہے کہ گویا کوئی بات نہ تھی۔ بعض جو سرا شطرنج کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام کچھ بازی بھی بدا کرتے تھے۔ کوتوال چونکہ دشمن تھا، اس نے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ حالانکہ اصلیت بالکل اس کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب ... الدین مرحوم (والی لوہارو) کے لفظوں میں مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا۔" [۲]

غالب کے سوانح نگار کی حیثیت سے حالی کی کوتاہیاں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اتنا کہنا ہے کہ اس زمانے میں غالب سے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، حالی نے ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس تساہل کی وجہ سے نہ صرف غالب کے حالات زندگی میں بعض غلطیاں راہ پا گئی ہیں، بلکہ ان کی سیرت و شخصیت کے بعض اہم پہلو بھی تشنہ رہ گئے ہیں۔ [۳]

حالی کی طرح احسن الاخبار نے بھی غالب کی قمار بازی کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ مرزا دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار ہوئے اور جو کچھ ہوا محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے ہوا۔ احسن الاخبار کی یہ شہادت بھی تحقیقی اور تاریخی دونوں اعتبار سے مشکوک ہے۔ یہ اخبار دہلی سے نہیں بمبئی سے نکلتا تھا۔ اس زمانے میں فاصلوں کی دوری اور سفر کی مشکلات کے باعث خبر رسانی واقعات کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہ خبر بھی غالب کی گرفتاری کے ... دن بعد شائع ہوئی۔ اس میں بادشاہ کے سفارشی خط کا بھی ذکر ہے جو ریذیڈنٹ کو لکھا گیا تھا۔ غالب کی گرفتاری احباب و اعزہ کی ... بادشاہ کا خط لکھنا، ریذیڈنٹ کا کورا جواب ... واقعات کا ایک سلسلہ ہے جس کا اثر دہلی کے عوام پر غالب سے ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا ہوگا۔ اور احسن الاخبار کے نامہ نگار کا اس سے

---

[۱] تذکرہ حالی از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی میں لکھا ہے کہ غالب سے حالی کے تعلقات کا آغاز ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے ... اور ان کے بعد شیفتہ کی ملازمت سے پہلے ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو، راقم الحروف کا مضمون "یادگار غالب" ماہنامہ پگڈنڈی، امرتسر، ۱۹۵۰ء

[۲] نقش آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، طبع دہلی صفحہ ۲۶۹، ۲۷۰

[۳] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "یادگار غالب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر حمید قریشی، سویرا لاہور، ۲۲

متاثر ہونا خلاف قیاس نہیں ہے۔ بہرحال وہ غالب کو قطعی بے قصور نہ مانتے ہوئے، ان کی گرفتاری کا باعث "دشمنوں کی غلط اطلاعات" قرار دیتا ہے۔ احسن الاخبار میں اس واقعہ سے متعلق جو دوسری خبر شائع ہوئی ہے، اس میں بھی غالب سے گہری ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کی آخری سطروں میں جو احتجاج کیا گیا ہے، اس میں غالب کی طرفداری کا رنگ نمایاں ہے۔ دوسری خبر میں احسن الاخبار نے غالب کے "جرم" کو قبول تو کر لیا ہے، لیکن وہ اسے "معمولی" قرار دیتا ہے اور ان کی سزا میں رعایت فقط اس بنا پر طلب کرتا ہے کہ وہ ایک "ذی کمال رئیس ہیں، ان کی عزت اور حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے" یہ دلیل بھی بے جا جذبات پر مبنی ہے حالانکہ قانون کے سامنے باکمال اور بے کمال، اور رئیس و مفلس سب کا درجہ برابر ہے۔ بغرض حالی کی طرح احسن الاخبار کے بیان میں بھی غالب سے عقیدت و محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اس میں غالب کے دامن کو قمار بازی سے پاک دکھانے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ جانبداری پر مبنی ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ حالی اور احسن الاخبار کے بیانات تحقیقی اعتبار سے قابل اعتنا نہیں، اب گواہوں کے دوسرے فریق کی طرف آئیے جس نے غالب کو قمار بازی کا مرتکب بتایا ہے۔ اس فریق میں فوائد الناظرین، سراج امیرالدین اور رگھناتھ لال ماحی شامل ہیں۔ فوائد الناظرین وہ پہلا اخبار ہے جس نے غالب کی گرفتاری کی خبر شائع کی۔ گرفتاری کی تاریخ بھی اسی اطلاعی خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر اس زمانے کے حالات کے مطابق تاخیر سے بھی شائع نہیں ہوئی۔ ایڈیٹر یا نامہ نگار نے اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔ اس کی نوعیت محض اطلاعی ہے اور اس میں کسی رنگ آمیزی کو دخل نہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس خبر کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سراج امیرالدین[1] کی زبانی جو روایت نقل کی ہے، اس میں غالب پر صاف الفاظ میں قمار بازی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اس روایت کے قوی نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں:

(۱) غالب کے واقعۂ اسیری کے وقت امیرالدین پیدا ہی نہیں ہوئے تھے[2]۔ اس لیے یہ روایت ہم تک ایک سے زیادہ واسطوں سے پہنچی ہے۔

(۲) غالب کے قید ہونے کے بعد لوہارو خاندان کا طرز عمل نہایت افسوسناک تھا[3]۔ ان حالات میں سراج امیرالدین کا بیان غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] پورا نام، نواب سراج امیرالدین احمد خاں، فرخ مرزا۔ بیٹے تھے نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے جنھیں مرزا صاحب نے اپنا خلیفہ ثانی بنایا تھا۔ وہ نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے بڑے صاحبزادے تھے جن کے والد نواب احمد بخش خاں، غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بھائی تھے۔

[2] "سراج امیرالدین، غالب کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے ہوں گے" "ان کے نام غالب کا خط غالباً ۱۸۶۸ء کا واقعہ ہے" مہر: خطوط غالب صفحہ ۷۷ا،۱۱۱۔ غالب اسیری کے ۲۲ برس بعد تک زندہ رہے۔ اس طرح امیرالدین کی پیدائش تقریباً ۱۸۶۱ء یعنی واقعہ قید کے ۱۳ یا ۱۴ برس بعد ہوئی۔

[3] غلام رسول مہر، غالب، صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸

(۳) خود آزاد کے بیان میں حالی کی تردید کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے، جس کے باعث وہ انتہا پسندی کا شکار ہو سکتے ہیں۔

البتہ اس روایت کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاصرت میں خوبیوں پر تو پردہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن معائب اور کمزوریاں ضرور سامنے آجاتی ہیں۔ ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ذاتی خامیوں اور کمزوریوں کا پردہ اسی وقت چاک ہوا جب کسی مخالف نے اپنے بے باکانہ انداز سے ان کی تشہیر کا سامان کر دیا۔ اس واقعہ کا تعلق بھی چونکہ غالب کی ایک کمزوری سے ہے، اس سے متعلق بزرگ خاندان کے ایک فرد کا بیان مبالغے سے قطع نظر، حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خصوصاً جب غالب کی قماربازی کی تصدیق فوائد الناظرین اور ایک دہلوی معاصر گلشن نام داس عاصی کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام نے "غالب نامہ" میں عاصی کی عبارت کو "قید" کے ذیل میں درج تو کیا ہے لیکن قطعہ تاریخ پیش نہیں کیا۔ اس سے متعلق ان کی رائے یہ ہے:

"منشی بدعاصی، غالب کا درپردہ قدردان اور بہی خواہ نہ تھا۔ چنانچہ قطعہ تاریخ اس نے
لکھا ہے اس سے غالب کی صریح توہین مترشح ہے۔"[1]

بیان مولف "غالب نامہ" غالب پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عاصی کے قطعہ تاریخ سے "غالب کی صریح توہین ہوتی ہے" اس لیے ان کے بیان کو ناقابل اعتنا قرار دے دیا جائے۔ صداقت تلخ ہوتی ہے اور اگر ایک شخص نے غالب کے واقعہ قید سے متعلق بھی باتوں کو صاف صاف بیان کر دیا تو اسے غالب کے قدردانوں اور بہی خواہوں کے زمرے سے خارج کرتے ہوئے اس کے بیان کی اہمیت کو کم کرنا کہاں کا ادبی انصاف ہے؟ یہ قید بجائے خود توہین آمیز تھی، پھر غالب کے کسی قدردان اور بہی خواہ سے یہ توقع کیسی عجیب ہے کہ وہ حرفِ ندامت زبان پر لائے کہ واقعہ قید سے متعلق حقیقتِ حال کا اظہار یا تو کوئی غیر جانبدار فریق کر سکتا ہے یا پھر مخالف و منکر۔ دوسری حالت میں مبالغے کا قوی احتمال ہے۔ ہمارے نزدیک عاصی کو غالب کا مخالف یا بدخواہ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ اپنے بیان میں وہ غالب کو "شاعر بے بدل" کہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دلی میں اس وقت قدردانی کے اعتبار سے شاعروں کے دو خاص گروہ تھے۔ غالب ایک مخصوص حلقے میں پسند کیے جاتے تھے اور عوام زیادہ تر ذوق کے پرستار تھے۔ عاصی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور جب شاہ نصیر سے ذوق کے تعلقات کشیدہ ہوئے تو عاصی بھی ذوق کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ تیلیوں والے معرکہ خیز مشاعرے میں جو قدیم دلی کالج میں منعقد ہوا تھا، عاصی نے ذوق اور ان کے ہواخواہوں کو نیچا دکھانے کی پوری کوشش کی تھی[2]۔ ذوق سے عاصی کی کشیدگی کے پیش نظر

---

[1] غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، طبع لکھنؤ، صفحہ ۱۰۵

[2] محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس معرکے کا ذکر یوں کیا ہے: "جن دنوں شاہ صاحب سے (ذوق کے) معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض پارسا دلی کالج میں مدرس حساب تھے...... انھوں نے مدرسہ میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا...... ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے۔ گڑھ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرے کے دن ۲ بجے (رات) تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر موجود ہوتے تھے۔ سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل ــ قفس کی تیلیاں، جس کی تیلیاں پڑھی۔ دوسرے مشاعرے میں یہی طرح ہو گئی۔ سب غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ مرحوم نے دو غزلہ لکھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ضروری تو نہیں کہ ان کے غالب سے اچھے تعلقات تھے لیکن بغیر کسی ثبوت کے انھیں غالب کا بدخواہ یا مخالف قرار دینا بھی غلط ہوگا۔ ذوق سے ان کی ہنگامہ آرائی اور غالب سے متعلق قطعہ تاریخ میں ان کے لہجے کی حق گوئی سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ وہ اگر غالب کے قدردان نہ تھے تو ان کے مخالف بھی نہ تھے۔ ان حالات میں عاصی کا بیان قطعاً غیر جانبدارانہ قرار پاتا ہے اور ایسے بیان کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت مسلم ہے۔ غرض عاصی اور نواب الناظرین کے بیانات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ غالب قمار بازی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس سے ان کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ ان کی سیرت کا ایک پہلو سامنے آجاتا ہے۔ غالب اپنی ادبی عظمت کی وجہ سے ہمیں محبوب ہیں لیکن کسی محبوب شخصیت کا ہر لحاظ سے مثالی ہونا ضروری نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی انسانی کمزوریاں

(حاشیہ بقیہ)

اور اس پر کچھ تکرار ہوئی۔ اس پر جوش میں آکر فرمایا کہ برس دن تک جو مشاعرہ ہو اس میں سوائے غزل طرحی کے ایک غزل اس زمین میں ہوا کرے چنانچہ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ ایسے معرکوں میں عوام الناس بھی شامل ہوتے تھے۔ تیسرے جلسہ میں جب انھوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں جنھیں شیخ صاحب کے طرف دار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارے سے ہوئیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھ دیا:

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر تکرار زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا زیادہ بے لطفی ہو جائے۔" (آب حیات طبع پانزدہم صفحہ ۴۷۶)

آزاد نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے، وہ منیر کا نہیں، بلکہ گھنشام لال عاصی کا ہے۔ ان کے کلیات میں مع اس شعر کے پوری غزل موجود ہے۔ اس مشاعرے میں چونکہ ذوق کا پلہ نیچا رہا تھا۔ آزاد نے نہ صرف باقی روداد کو حذف کر دیا بلکہ عاصی کے شعر کو بھی منیر کے نام سے لکھ دیا۔ جب لوگوں نے اس غلطی پر اعتراض کیا تو آزاد نے حاشیے میں فقط اتنا لکھا: "بعض بزرگوں سے سنا کہ لالہ گھنشام داس لال عاصی نے پڑھا تھا۔ وہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔" (آب حیات، صفحہ ۴۷۸) واقعہ یہ ہے کہ مشاعرہ میں شاہ نصیر کی غزل پر اعتراضاً ذوق نے اپنے تلمیذ بہادر شاہ ظفر کی غزل میں چند اشعار پڑھے تھے۔ مطلع یہ تھا:

قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
یار کی چلون میں ہوں پائے مگس کی تیلیاں

اس پر آئندہ مشاعرہ معرکے کا قرار پایا۔ عاصی نے اس مشاعرے میں طرحی غزل سے پہلے "چھیڑ کی غزل پڑھی" اس کے آخری دو شعر یوں تھے:

کل شیخ جی ہرن کی طرح چھلے چوکڑی — سیدھی سڑک بھی چل سکے نہ متھرا پہنچ سکے
عاصی وہ تیلیوں کی غزل اب کرو رقم — جس کو نہ سلک گوہر یکتا پہنچ سکے

اس کے بعد عاصی نے ۴۲ اشعار کی بڑی سیر قوافی غزل پیش کی۔ جسے سن کر سامعین نے "ایما نا کہا کہ عاصی کی غزل لاجواب اور قابل تحسین ہے اور ذوق پر فوقیت رکھتی ہے" یہ غزل عاصی کے کلیات میں موجود ہے، اور اس کے بعض قوافی یہ ہیں: عبس، عطرِ جرس، کوہ ہوس، انقباسِ نفس، عاشق بے دسترس، بید قرس، مرس، وس، ترس وغیرہ (کلام عاصی صفحہ ۱۴۴-۱۴۸)

کو سامنے رکھنے کے بعد ہی اس کی عظمت کو صحیح پس منظر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب اپنے معاشرے کے سچے فرد تھے۔ ان میں کم و بیش وہ تمام خوبیاں اور خامیاں تھیں جو اس زمانے کے سماج میں لازمی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود وہ فن کی ان بلندیوں تک پہنچ گئے جہاں اُن کا کلام صحیح معنوں میں حلقۂ شام و سحر سے نکل کر جاوداں ہو چکا ہے۔ حالی کے بیان سے غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق جن امور پر روشنی پڑتی ہے، وہ یہ ہیں :

کوتوال سے دشمنی

واقعہ اسیری کے بارے میں غالب کی تصانیف سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔[1] انھوں نے چوراسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند، قید کی حالت میں لکھا تھا، جسے متفقہ طور پر ان کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے احباب وغیرہ نے اس خیال سے "حبسیہ" کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کیا کہ اس سے غالب کی قید شہرت کے لیے منظرِ عام پر آ جائے گی۔ تو بعد میں متفرق فارسی کلام کے مجموعہ "سبد چیں" میں شائع کر دیا گیا۔[1] اس میں غالب نے اسیری کے حالات و صدمات تو بیان کیے ہیں، لیکن قید کے اسباب و علل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ حبسیہ کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کرنے کے واقعہ سے شبہ ہوتا ہے کہ غالب کے ایسے خطوط کی اشاعت بھی روک لی گئی جن میں قید سے متعلق کوئی بات ہو گی۔ ایسے ہی ایک فارسی خط کے اقتباس کا ترجمہ حالی نے پیش کیا ہے۔ یہ خط اُن کے فارسی خطوط میں شامل نہیں۔ اس میں غالب نے اپنے قید ہونے کی وجہ کوتوال سے دشمنی کو قرار دیا ہے :

> "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔
> باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔
> اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"[2]

مولانا آزاد اس سے متفق فرماتے ہیں :

> "معلوم نہیں شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ
> رہتی تھی۔۔۔۔ انھیں میں ایک کوتوال فضیل کے شاگرد مرزا خانی بھی تھے۔۔۔۔ لیکن
> غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ تو
> شاعر تھا نہ نثر طراز کہ غالب کا قدرشناس ہوتا۔ برا کوتوال تھا!۔۔۔"[3]

---

[1] منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ۱۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں غالب نے لکھا ہے : "سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔"

(اردوی، طبع لاہور، صفحہ ۸۲)

[1] سبد چیں، صفحہ ۴۴–۴۰۔ نیز ملاحظہ ہو "یوسف ہندی قید فرنگ میں" مطبوعہ حیدرآباد

[2] یادگارِ غالب۔ صفحہ ۲۷

[3] نقشِ آزاد، صفحہ ۲۸۱

یہ صحیح ہے کہ جب مرزا خانی دلی میں تھے، غالب کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ لیکن مولانا کا یہ بیان محل نظر ہے کہ نیا کوتوال غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرے سے تبدیل ہو کر آیا۔ غالب اس واقعہ سے چھ برس پہلے ۱۸۴۱ء میں بھی قمار بازی کے الزام میں معتوب ہو چکے تھے اور دہلی اردو اخبار نے صاف الفاظ میں ان کی گرفتاری کو نئے تھانیدار کا کارنامہ قرار دیا تھا۔

"[illegible] حضور سے ان ہوئے نئے تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا، بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمعداری میں بھی بہت گرفتاری جرائم کی کرتا رہا ہے۔"......[1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا خانی کے بعد نیا کوتوال بقول آزاد ۱۸۴۵ء میں نہیں بلکہ ۱۸۴۱ء یا اس سے کچھ پہلے مقرر ہوا۔ دوسرے یہ تھانیدار آگرہ سے تبدیل ہو کر نہیں آیا، بلکہ دہلی میں "مدت کا نوکر" تھا اور "پہلے جمعدار تھا"۔ دہلی اردو اخبار نے اس کا نام درج نہیں کیا۔ فقط یہ لکھا ہے کہ وہ قوم کا سید ہے۔ منشی [illegible] لال عاصی نے کوتوال کا نام اپنے قطعۂ تاریخ اور توضیحی عبارت میں "فیض الحسن خاں" بتایا ہے۔ دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۸۴۵ء کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے:

"[illegible] نے دہلی میں دربار عام کیا تھا اور اس میں غالب کو خلعت [illegible] رقم جواہر اور فیض الحسن کوتوال کو ایک شال دو مال عطا دیا۔"[2]

ظاہر ہے کہ یہ اعزاز فیض الحسن کو حسن خدمت کی بنا پر بخشا گیا اور وہ دربار کے انعقاد (۱۸۴۵) سے قبل دہلی میں اپنی کارگزاریوں کا ثبوت پیش کر چکا ہوگا۔ قیاس ہے کہ غالب کی پہلی گرفتاری بھی اسی کوتوال کے ہاتھوں عمل میں آئی ہوگی اور وہ برسوں غالب کے درپے رہا ہوگا۔ عاصی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی۔ اس عداوت کا ذکر خود غالب کے محولہ بالا خط میں بھی ملتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد اسے نظر انداز کرتے ہوئے گرفتاری کی تمام تر وجہ غالب کی قمار بازی کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قمار بازی شہر کے دوسرے حصوں میں بھی ہوتی تھی اور بقول ان کے:

"شہر کی یہ رسم ہو گئی تھی کہ رئیس زادوں کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انھیں ازراہ تجاہل رئیسانہ تفریحوں میں تصور کیا جاتا تھا۔"[3]

ان حالات میں کوتوال کا فقط غالب کو نشانۂ عتاب بنانا، غالب سے ذاتی عداوت ہی کی بنا پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اور عاصی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

گرفتاری کے حالات

مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

"ایک دن ایسے موقع پر کہ مجلس گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال

---

[1] دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء محزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔ [2] حوالہ ما سبق، نوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء
[3] نقش آزاد، صفحہ ۲۸۱

"پہنچا اور دروازہ پر دستک دی۔ اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے، صاحبِ مکان یعنی میرزا دھر لیے گئے۔"[1]

لیکن عاصی نے گرفتاری کے جو حالات لکھے ہیں، وہ اس سے مختلف ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ گرفتاری کے وقت کوتوال صاحب دفتر میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس طرح دھوکے سے اندر داخل ہو گئے۔ مولانا کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ "اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے، صاحبِ مکان یعنی میرزا دھر لیے گئے۔" اس کے برعکس عاصی لکھتے ہیں کہ "اندر مکان کے ضربِ جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ گو زینے کے اندر بہت بھیڑ بھی تھی اور کچھ امدادی برقنداز پہنچ گئے۔" غرض غالب تنہا گرفتار نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے ساتھ دوسرے قمار باز بھی دھر لیے گئے تھے۔ فوائد الناظرین کی پیش کردہ خبر دالف میں بھی صاف الفاظ میں اس کا ذکر موجود ہے:

"جناب میرزا صاحب کو معہ چند اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے ہیں۔۔۔۔"

متنازعہ فیہ شعر

نظامی بدایونی نے شرح دیوان غالب میں لکھا ہے کہ قید خانے میں غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ ان کو چن رہے تھے کہ ایک رئیس نے جا کر پرسشِ مزاج کی، غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں[2]

اس شعر سے متعلق غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ یہ شعر غالب کا نہیں۔ اس سے قطع نظر شعر کی شانِ نزول قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔۔۔۔۔ بے یاری اور درماندگی کی یہ حالت کیونکر قرینِ قیاس سمجھی جا سکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں اور ایک رئیس ملاقات کے لیے آیا تو وہ جوئیں نکال رہے تھے۔۔۔۔۔ لہٰذا جو صورت اس شعر میں پیش کی گئی ہے وہ ہر اعتبار سے مستبعد ہے۔"[3]

حالانکہ اس شعر میں جو صورت پیش کی گئی ہے، وہ حقیقت ہی پر مبنی ہے۔ بات دراصل غالب کی "بے یاری" اور "درماندگی" کی نہیں، جیل خانے کے کپڑوں کی ہے۔ غالب کو جیل خانے میں آتے ہی اپنا لباس اتار کر جیل خانے کے کپڑے پہننے پڑے ہوں گے۔

---

[1] نقش آزاد، صفحہ ۲۶۲
[2] دیوان غالب مع شرح نظامی، طبع ششم، ص ۲۱۶
[3] ذکر غالب صفحہ ۱۸۴

اُس زمانے میں ہندوستانی جیل خانوں کے کپڑوں کی جو حالت ہوگی، بآسانی قیاس کی جاسکتی ہے۔ مختلف قیدیوں کے استعمال کی وجہ سے، جن میں اکثر غلیظ اور میلے کچیلے رہنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کپڑوں میں جوئیں ہو جاتی ہوں گی۔ مجبوراً وہی کپڑے غالب کو بھی پہننے پڑے ہوں گے۔ چنانچہ اپنے شعر میں غالب نے جو حالت بیان کی ہے، وہ ہرگز مستبعد نہیں اور مہر صاحب کا یہ خیال کہ "یہ شعر غالب کا نہیں" تحقیقی طور پر صحیح نہیں۔ عاصی کے بیان سے بھی یہ شعر غالب ہی کا ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے بالتصریح لکھا ہے:

"ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیانِ جیل خانہ کا ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا:

جس دن سے کہ ہم خستہ زدۂ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

نظامی بدایونی کے ہاں اس شعر کا پہلا مصرع قدرے مختلف ہے۔ (یعنی "غم زدۂ زنجیر بپا" کی جگہ "خستہ گرفتار بلا") لیکن نظامی کی روایت پر عاصی کے بیان کو فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ قدیم تر ہے اور دوسرے یہ بیان غالب کی زندگی میں دہلی میں لکھا گیا۔

قبل از وقت رہائی

سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے غالب کے مقدمے کے جو حالات بیان کئے ہیں، ان میں لکھا ہے کہ ان کی قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب کی اور بڑے افسر کے اختیاراتِ خاص کی وجہ سے ہوئی۔ اُن کے الفاظ ہیں: "مرزا صاحب کو قید میں پڑے چند روز ہوئے تھے، جو ان کی خوش نصیبی سے لاٹ یا ان جیسا کوئی اور بڑا حاکم شاہجہان آباد میں آیا اور مرزا صاحب کے عزیزوں نے اُس سے جا کر مرزا صاحب کی بپتا کہی اور اس نے اپنے اختیار سے مرزا صاحب کو فوراً چھوڑ دیا۔" [1]

مگر غالب کا وہ بیان جو حالی نے نقل کیا ہے، اس کے برعکس ہے:

"سیشن جج، باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا۔ مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی۔ تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا۔" [2]

غالب کے یہ الفاظ کہ "پھر معلوم نہیں، کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا" غور طلب ہیں۔ گویا خود غالب کو اپنی قبل از وقت رہائی کے اسباب کا صحیح علم نہ تھا۔ مجسٹریٹ کو "رحم" آنا بھی معنی خیز ہے۔ حالانکہ مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو پوری طرح آزمایا جاچکا تھا۔ اور بادشاہ سے سفارش کروانے اور صدر میں اپیل کے باوجود قید کی سزا برقرار رہی تھی۔ ایسے حالات میں ملزم کی رہائی محض مجسٹریٹ کے رحم

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک، صفحہ ۳۵

[2] یادگار غالب، صفحہ ۲۷

کی بنا پر عمل میں نہیں آ سکتی۔ مجسٹریٹ نے اگر احکام صدر کو رہائی کی رپورٹ کی ہوگی تو وہ بغیر قانونی حیلے اور دلیل کے نہ ہوگی۔ یہ دلیل کیا ہو سکتی ہے، اس سلسلے میں بھی حالی کا بیان ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ حالی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غالب نے سول سرجن کے پوچھنے پر اپنی ناگفتہ بہ حالت کا سخن گسترانہ اظہار کیا تو "اُسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کروا دیا۔" غرض مسٹر راس[1] نے غالب کی رہائی کی سفارش کر کے اپنا فرض بطریق احسن انجام دیا۔ لیکن اس نیک نہاد شخص نے اپنا احسان جتانے کی کوئی کوشش نہیں کی، ورنہ غالب اپنی رہائی کو مجسٹریٹ کے رحم پر محمول نہ کرتے۔

واقعۂ قید کے ایام میں غالب کی تندرستی خراب رہنے کا ذکر احسن الاخبار میں بھی ملتا ہے:

"مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا اغلبہ جو پانی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے ...... اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔"[2]

ان بیانات کے مدنظر غالب کی قبل از وقت رہائی کا مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا ہے یعنی گرفتاری کے وقت ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ تقریباً نصف سزا کاٹ چکنے کے بعد ان کی تندرستی مزید خراب ہو گئی اور جب مسٹر راس سول سرجن نے ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو وہ رہائی کی رپورٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرض غالب خرابیٔ صحت کی وجہ سے قبل از وقت رہا کر دیئے گئے اور اس میں مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو مطلق کوئی دخل نہ تھا۔

---

[1] احسن الاخبار کے ایک پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر راس جولائی ۱۸۴۷ء میں دہلی میں تھا۔ (نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۸ء)

[2] دہلی کا آخری سانس، صفحہ ۴۷۱

آنکھوں کے مرثیے

محمد علم الدین سالک

انسانی تاریخ میں جن اخلاقی خوبیوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ان میں استقلال اور تحمل اپنی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہیں کہ ان کی بدولت انسان زندگی کے بڑے سے بڑے خطرے میں کود پڑتا ہے۔ اسی بلند مقصد کے لیے وہ اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ مصائب و آلام کی پروا نہیں کرتا، [illegible] خطرناک اور پریشانی سے بے خوف قدم بڑھاتا ہے۔ اور تحمل کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

تیموری خاندان اس لحاظ سے شاہان عالم کی صف میں بہت ممتاز ہے۔ موت سے کھیل جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ وصف ان میں آخر تک قائم رہا۔

تیموریوں کی زندگی کے اس روشن پہلو کے ساتھ ساتھ ایک اور وصف بھی نظر آتا ہے جس نے ان کی زندگی کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ان کی شعر و ادب سے دلچسپی ہے۔ وہ بڑے ادب نواز، شعر دوست، ترقی اور ادیبوں کے محسن ہونے کے علاوہ خود شعر کا صحیح ذوق اور ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ یہ چیز انھیں میراث میں ملی تھی۔ گویا یہ ان کے گوشت پوست کا ایک حصہ تھا۔ وہ شعر کہتے، شعر سنتے اور شعر کا مزہ لیتے۔ مگر کیا مجال کہ ان کے شاہانہ مشاغل میں کسی قسم کا فرق آتے۔ ان کا ایک [illegible] تھا جس پر وہ بڑی سختی سے کاربند ہوتے تھے۔

ادب اور شعر دربار، زندگی کے [illegible] تھے اس لیے بھی انھیں شعر سے لگاؤ پیدا کرنا لازمی تھا۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ہر بادشاہ ولی کشور کشا ادب نوازی کرتا، اچھے شعر کی داد دیتا، شعر کی خامیوں پر اعتراض کر ٹوکتا اور وقت بے وقت خود بھی شعر کہتا۔ ان کی زندگی میں بعض نہایت خطرناک مراحل پیدا ہوئے جہاں انھیں جان سے کھیلنا پڑا مگر انھوں نے ایسے موقعوں پر بھی شعر اور ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور زندگی کی ان خوبیوں کو شعر و ادب میں سمو کر ایسا گلدستہ تیار کیا جس سے شعر و ادب کی دنیا اب تک مہک رہی ہے۔

ہندوستان میں آل تیمور کا سلسلہ بابر سے شروع ہوتا اور بہادر شاہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ہر شہزادہ اور ہر بادشاہ اس خوبی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ بابر دنیا کی عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ہے۔ پروفیسر [illegible] کے قول کے مطابق "وہ اپنے زمانے میں مشرق و مغرب کی وہ شخصیت ہے جو [illegible] خود مغرب سے زیادہ شائستہ، مہذب اور [illegible] تھی۔ بلکہ اس کا دربار اور اس کی ذات ثقافت کا زبردست مرکز تھی اور اس کی بدولت ثقافت اور فنون لطیفہ کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔"

بابر دلیر اور جری سپاہی، تجربہ کار جرنیل اور اولوالعزم سردار تھا جس پر ادنیٰ سپاہی سے لے کر اعلیٰ سردار تک جان چھڑکتا اور اس کے ساتھ مرنا اور جینا فخر سمجھتا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اولوالعزمی، استقلال اور تحمل کا شاہکار ہے۔ اس کی زندگی کی یہ داستان بڑی دلکش

سب ہو۔ اس کا ایک ایک واقعہ نہ صرف عبرت و بصیرت کا مرقع ہے بلکہ بڑا دلکش اور دلآویز بھی ہے۔ اس نے بادشاہت اور جلا وطنی دونوں حیثیتوں سے اپنے آپ کو استقلال کا پیکر متحرک ثابت کیا۔ بڑے سے بڑے ہلاکت آفریں اور تباہ کن مواقع پر اس نے خوش خوئی، خندہ پیشانی اور خوش مزاجی کو قائم رکھا۔ مایوسی اور یاس کا سایہ تک نہ پڑنے دیا۔ وہ عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے تب بھی وہ انتہائی بشاش اور بشاش ہے اور اگر وہ دشمنوں سے شکست کھا کر سر چھپانے کے لیے جگہ تلاش کرتا ہے تب بھی اس کا چہرہ دلی مسرت کی غمازی کرتا ہے — جہاں موقع ملتا ہے دوستوں کے ساتھ جشن منانا، کسی چشمے کے پاس سبزہ کے فرش مخمل پر بیٹھ کر شعر خوانی کرنا، مرغابیوں کی تلاش اڑانا، دوستوں سے خوش گپیاں کرنا، لطیف مزاح سے خود بھی لطف اندوز ہوتا اور دوسروں کو بھی اپنی خوشی میں شامل کرتا ہے۔ فرصت پاتا ہے تو زبان واقعات کو ہلکے پھلکے انداز میں قلمبند کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا ورثہ (بابرنامہ) چھوڑ گیا ہے جو اب بھی اتنا ہی دلچسپ اور دلکش ہے جتنا آج سے صدیوں پہلے تھا۔

کامران

بابر کی زندگی کا یہ پہلو صحیح تفصیل چاہتا ہے۔ ہم اس کی اولاد میں سے اس کے بیٹے کامران کی زندگی سے اسی قسم کا ایک پہلو پیش کرتے ہیں جس میں بابر کے کردار کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ کامران بابر کا دوسرا بیٹا اور ہمایوں کا چھوٹا بھائی تھا۔ بابر نے اپنی سرپرستی میں اسے تعلیم و تربیت دی۔ وہ بڑا ذہین، ہوشیار اور عزم و ہمت کا مالک تھا۔ بادشاہی سے اس نے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ہمایوں کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کیں۔ اور وہ ایک مدت تک ہمایوں کے خلاف برسرپیکار رہا حتیٰ کہ آخر میں وہ اپنے بھائی سے شکست کھا کر اسلام شاہ سوری کے ہاں چلا گیا۔ اسے امید تھی کہ اسلام شاہ ہمایوں کے خلاف اس کی مدد کرے گا اور وہ کابل کا علاقہ دوبارہ ہمایوں سے چھین سکے گا مگر واقعات نے بہت جلد اس پر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اسلام شاہ اس کی مدد کرنا تو درکنار اس کی زندگی کے درپے ہے چنانچہ وہ اس کے ہاں سے بھاگا اور آدم خاں گکھڑ کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔

اب کامران نے گکھڑ سردار کو ہمایوں کے خلاف اکسایا مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے ہمایوں کے خلاف لڑنے کے لیے اس سے مدد چاہی مگر اس کی یہ امید بھی بر نہ آئی۔ آدم خاں اسے ٹال مٹول سے ٹالتا رہا۔ ادھر وہ ہمایوں سے صلح صفائی کے بارے میں خط و کتابت کرتا رہا۔ چنانچہ دونوں کا آپس میں معاہدہ ہو گیا۔ کامران کو بھی اس کا علم ہوا۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر آدم خاں کے سپاہی اور دوسرے نوکر سائے کی طرح اس پر مسلط رہتے تھے گویا وہ ان کی حراست میں تھا جہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ ناچار اس نے ان کے ساتھ بسر اوقات کرنی شروع کی۔

ہمایوں سارے حالات سے باخبر تھا۔ وہ کامران کی طرف توجہ دینے سے پہلے کابل کا نظم و نسق درست کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کی مہم کے لیے تیار ہونا چاہتا تھا جب وہ ان حالات سے عہدہ برآ ہو گیا اور مہم کے لیے تیاری کر لی تو اس نے لشکر کے قاضی اور قاضی جاندار کو سلطان آدم گکھڑ کے پاس روانہ کیا کہ وہ مرزا کامران کو ان کے حوالے کر دے تاکہ وہ مرزا کامران کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائیں مگر ان کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اور مرزا کامران نے ہمایوں کی اطاعت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

کامران کو چند سرداروں کی حراست میں ہمایوں کے کیمپ میں لایا گیا۔ ہمایوں کی دلی خواہش تھی کہ وہ کامران پر کسی قسم کی سختی نہ

کرے اور اگر میرزا اطاعت قبول کرے تو اسے ایک بہت بڑی جاگیر بخش دے۔ لیکن امیروں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے۔ وہ وفد کی صورت میں ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہمایوں سے کہا کہ کامران نے بڑے بڑے جرم کیے ہیں۔ اسے بڑی سے بڑی سزا ملنی چاہیے۔ وہ اس کا مستحق ہے۔ حق اور انصاف اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ بادشاہ نے ان کی باتیں سنیں اور وقتی طور پر انھیں ٹال دیا۔ وہ برابر کامران کے بارے میں مراحم خسروانہ سے کام لیتا رہا۔ اس کی حرکات سے چشم پوشی کرتا رہا اور موقع بے موقع لطف و کرم سے پیش آتا رہا۔ امرا نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر حالات ایسے ہی رہے تو دوبارہ فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ شور و شر پیدا ہوگا۔ جنگ و جدال کی آگ بھڑک اٹھے گی۔

اب وہ ایک مصمم ارادے کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض داشت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رافت و عاطفت بادشاہی و فطرت عالی اور عطوفت و الا کا تقاضا یہی ہے کہ بڑے سے بڑے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔ مگر دور اندیشی اور عاقبت بینی کا تقاضا ہے کہ سینہ فگار و مردم آزار بدعہد اور قاتل کو اس کے اعمال کی سزا ضرور دی جائے تاکہ اس کی طبعی شر پسندی سے خلق خدا محفوظ رہے اور ان کی عافیت پر کسی قسم کی آفت نہ آئے۔ دور اندیشی اور دور رسی یہ ہے کہ ایک آدمی کی آسائش کو خلق خدا کی آسائش پر ترجیح نہ دی جائے۔ شکستہ دل اور آزردہ حال لوگوں کے اطمینان کے لیے ایک ظالم کو مٹا دینا ہی عدالت ہے۔ خاص کر جب ایسا کرنے سے ہزارہا کام خود بخود درجۂ اصلاح ہو جائیں گے۔ اس صورت حال میں رحم سے کام لینا عین بے انصافی ہوگی۔ میرزا کامران نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے بھائی چارے کو بالائے طاق رکھا۔ قدم قدم پر کفران نعمت کیا اور ہر موقع پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ اس کے کردہ گناہوں کا اب شمار و خیال نہیں کیا جا سکتا۔ معاملہ اب رحم کی حد سے گزر چکا ہے۔ اس کو ملک عدم کا مسافر بنائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہزارہا قسم کی بلاؤں سے نجات پائے اور اس کا نامۂ اعمال بھی زیادہ سیاہ نہ ہو۔ ایک مدت مدید گزر چکی ہے کہ اس شر پسند و فتنہ سرشت کے اثر سے رعایا کا مال و اسباب غارت ہوا۔ جانیں تلف ہوئیں، عزت و ناموس لٹا۔ اس لیے اب وقت ہے کہ اس موذی کے ہاتھوں سے خلق کو نجات دلائی جائے۔

ہمایوں بڑا عالی فطرت تھا۔ اس نے بڑے ٹھنڈے دل سے امیروں کی معروضات سنیں۔ وہ ابھی اس معاملے میں کسی قسم کا اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ایسے بشر کو اللہ تعالیٰ نے باقی رکھا ہے تو کسی خاص غرض اور مصلحت کے لیے ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی وصیت اچھی طرح یاد تھی اس لیے وہ کامران کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ امرا نے یہ دیکھ کر پھر جرأت سے کام لیا اور کہا کہ اس سفاک اور بے باک کی وجہ سے طرح طرح کے فتنے پیدا ہوئے۔ ناحق خون ریزی ہوئی۔ ہمیں بڑے بڑے صدمے اٹھانے پڑے۔ چنانچہ امرا اور علما کی ایک جماعت نے اس بارے میں ایک محضر تیار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے یہی محضر میرزا کامران کے پاس بھیج دیا۔ جب اس نے اسے مطالعہ کیا تو یہ لکھا کہ جن لوگوں نے میرے قتل پر فتویٰ دیا ہے انھیں لوگوں کی بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔

ہمایوں عجب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ کامران کو ظاہری بصارت سے محروم کر دیا جائے۔ اس طرح ایک اٹھتا ہوا فتنہ دب گیا۔ امیروں کی تسلی ہو گئی۔ علما اس کامیابی پر بڑے نازاں تھے کہ اب فتنہ و فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

کامران کی بصارت زائل کرنے سے ہمایوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ بادشاہت کے لیے اس کی ساری سرگرمیاں ختم ہو جائیں کیونکہ اندھا بادشاہ نہیں ہو سکتا اور اگر وہ کبھی تخت و تاج کا دعویٰ بھی کرے تو اسے عوام کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں اکثر شہزادوں کو

اندھا کرنے کے واقعات بکثرت ملتے ہیں ۔

اس فیصلے کا اعلان ہوا۔ بادشاہ نے پانچ آدمی اس کام کے لیے نامزد کیے ۔ ان میں ایک جوہر آفتابچی بھی تھا جوہر آفتابچی نے ہمایوں کے زمانہ حکومت کی یادداشتیں تذکرۃ الواقعات کی صورت میں مرتب کی ہیں۔ چونکہ وہ اس مہم میں خود بھی شریک تھا ۔ اس واسطے اس نے یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم اسی سے لے کر اس واقعہ کو یہاں درج کرتے ہیں ۔

رمضان ۹۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ عصر کی نماز کا وقت تھا جوہر کامران کے خیمے میں آیا ۔ میرزا کامران نے اس سے مصلیٰ طلب کیا۔ جوہر نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میرزا نے اسی مصلیٰ پر مغرب کی نماز بھی پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے جوہر سے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے۔ تم کتنے عرصہ سے بادشاہ کی خدمت میں ہو؟ اس نے جواب دیا۔ میرا نام جوہر ہے اور میں انیس برس سے بادشاہ کا نوکر ہوں ۔ کامران نے کہا تم تو پرانے قدیمی نوکر ہو۔ کبھی تم نے مرزا عسکری کی نوکری بھی کی ہے؟ جوہر نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد میرزا نے کہا کہ مجھ سے رمضان کے چھ روزے قضا ہو گئے ہیں۔ کیا تو میرے عوض روزے رکھے گا؟ جوہر نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ آپ کو خود قضا روزے رکھنے کے لیے وقت مل جائے گا۔ آپ ایسی بے دلی کی باتیں کیوں کرتے ہیں، دل کو مضبوط رکھیں، حوصلہ نہ ہاریں۔ پھر کامران نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ میری گردن ماریں گے؟ جوہر نے جواب دیا :

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

البتہ میں اپنی عقل سے یہ جانتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے بازو کو اپنے ہاتھ سے نہیں توڑتا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں ہمایوں بادشاہ بڑا بامروت ہے۔

یہ رات اسی قسم کی باتوں میں بسر ہو گئی۔ دوسرے دن بادشاہ نے حکم دیا کہ میرزا کی آنکھوں میں نشتر لگایا جائے۔ جب نوکروں کے پاس یہ حکم پہنچا تو سوال پیدا ہوا کہ یہ دردناک خدمت کون انجام دے۔ کوئی بھی یہ کام کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ سلطان علی بخشی نے علی دوست اشیک آقاسی سے کہا کہ تو نشتر لگا۔ علی دوست نے اسے جواب دیا کہ تیری احتیاط کی حالت تو یہ ہے کہ تو اگر کسی کو ایک شاہرخی دے سکتا بھی دیتا ہے تو پہلے بادشاہ سے پوچھ لیتا ہے۔ میں تیرے کہنے سے یہ کام کیوں کروں، بادشاہ نے اگر پوچھا کہ تم نے میرے بھائی کو کس کے حکم سے اندھا کیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ سلطان علی بخشی نے بھی جوہر سے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔

جوہر نے یہ دیکھ کر کہا۔ آؤ۔ بادشاہ کے پاس چلیں۔ اس سے پوچھ آئیں۔ چنانچہ جوہر، علی دوست، سلطان علی بخشی، غلام علی شش انگشت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علی دوست نے ترکی میں کہا۔ کوئی آدمی نشتر لگانا نہیں چاہتا۔ بادشاہ بہت برافروختہ ہوا۔ اسے ترکی میں جواب دیا۔ اگر کوئی اور یہ کام نہیں کرتا تو تجھے کیا ہوا ہے۔ تو خود کیوں نہیں کرتا۔

بادشاہ کا یہ حکم سن کر علی دوست میرزا کامران کے پاس آیا اور عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں یہ بات اپنی طرف سے کہوں تو اللہ تعالیٰ میری زبان گدی سے کھینچ لے۔ یہ بادشاہ کا حکم ہے ہم مجبور ہیں کہ اسے مانیں اور تمہاری آنکھوں میں نشتر لگائیں ۔

میرزا کامران نے بڑے تحمل سے جواب دیا ۔ مجھے مار ہی کیوں نہیں ڈالتے۔ علی دوست نے کہا کہ بادشاہ کے حکم کے بغیر آپ کو کون مار سکتا ہے۔ اس کے بعد میرزا کامران بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ نشتر لگوانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کی چال میں بڑا وقار تھا۔ اس کی نقل و حرکت میں طمانیت پائی جاتی تھی۔ وہ خیمے کے باہر آیا۔ علی دوست کے ہاتھ میں رومال تھا، اس نے اس کا گیند بنایا۔ میرزا زمین پر لیٹ گیا۔ گیند اس کے گلے میں ٹھونس دیا گیا۔ چار آدمیوں نے میرزا کے بازو اور ٹانگیں سنبھالیں، دو آدمیوں نے آنکھوں میں نشتر لگانا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں

میں کہ وہیں پیاس، تشنہ لبکی، ہم شکستنی، میرزا نے اس تمام مشکل کو بڑے تحمل سے برداشت کیا۔ اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔ البتہ وہ شخص جو اس کے زانو پر بیٹھا ہوا تھا اس نے جب اس کے ٹھنڈے کو ذرا آہستہ سے دبایا تو میرزا نے فقط اتنا کہا میں یہ جانتا ہوں کہ حقیقت تمھارا کام پوری طرح ہو جائے گا تم مجھے یہیں چھوڑ دو گے۔ پھر ایک مجبور انسان پر یہ دباؤ اور تشدد کیوں؟ اس سارے عرصے میں اس نے اس بات کے سوا کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا۔ مگر جب اس کی آنکھوں میں لیموں نچوڑ کر نمک چھڑکا گیا تو وہ شدت درد سے تڑپ اٹھا اور بے اختیار ہو کر بولا :۔

"یا الٰہی۔ یا الٰہی۔ میں نے اس دنیا میں جتنے بُرے کام کئے تھے۔ ان کا خمیازہ میں نے اسی دنیا میں بھگت لیا ہے۔ اب عاقبت میں مجھ پر رحم کرنا"

مآثر رحیمی سے بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اس موقع پر کامران نے ایک شعر بھی کہا جس کے لفظ میشنہ سے اس کے اندھا ہونے کی تاریخ ۹۶۰ھ نکلتی ہے۔ یہ شعر نظر سے نہیں گزرا البتہ ایک اور شاعر نے اس واقعہ کی تاریخ "چشم پوشید ز بیداد سپہر" سے نکالی ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو میرزا کو گھوڑے پر سوار کیا گیا۔ وہ شاہی لشکر کے عقب میں روانہ ہوا۔ تھوڑی دور جا کر لشکر نے پڑاؤ کیا۔ میرزا کامران کے لیے جو جگہ مقرر کی گئی تھی وہ ذرا زیادہ گرم تھی۔ چنانچہ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے میرزا قاسم کے خیمے میں اتارا گیا۔ اس وقت کامران بہت بے چین تھا۔ ہوا ابھی گرم تھی اور ویسے بھی میرزا کے زخم تازہ تھے۔ جوہر میرزا کی بے کلی نہ دیکھ سکا۔ وہ اپنے ڈیرے پر آیا اور وہاں تمام ہو کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ کی نظر اس پر پڑی۔ اس سے سارا ماجرا دریافت کیا جسے سن کر ہمایوں پر رقت طاری ہو گئی۔

میرزا کامران نے اسی روز منعم خاں کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ کسی طرح بیگ ملوک کو اس کی خدمت کے لیے بھیج دے۔ یہ خوش رو میرزا کامران کا خاص آدمی تھا اور اس پر میرزا کی خاص توجہ تھی۔ جب وہ آیا تو میرزا نے بیگ ملوک کا ہاتھ اپنی اندھی آنکھوں پر رکھ کر کہا ؎

ہر چند کہ چشم سر رخت پردہ کشیدہ است

بینا ست بیننے کہ بسے روئے تو دیدہ است

(اگر میری ظاہری آنکھیں جاتی رہی ہیں مگر ابھی بصیرت کی وہ آنکھ باقی ہے جس نے بارہا تیرا چہرہ دیکھا ہے)

دریائے اٹک کے کنارے تک کامران بادشاہ کے ساتھ رہا اور جب وہ وہاں سے کابل کے لیے واپس ہوا تو میرزا نے منعم خاں کو بلا کر کہا۔ تم جانتے ہو کہ میں کابل میں کس شان و شوکت کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے وہاں بادشاہی کی ہے اور وہاں کے لوگوں کو میرا جاہ و جلال یاد ہے۔ اب میں اس آنکھوں کو لے کر وہاں جاؤں اور وہاں کے لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں۔ مجھے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت دلوا دو۔

منعم خاں نے ہمایوں سے سارا ماجرا بیان کیا اور میرزا کامران کی درخواست دہرائی۔ ہمایوں اپنے بھائی کی حالت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے۔ حجاز میں اس کا گزر کیسے ہو گا۔ اس لیے وہ اجازت دینے میں متامل تھا۔ وہ دن بھر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخر امیروں کی سفارش پر اس نے میرزا کو اجازت دے دی۔

کامران نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس سے ملنے کی درخواست کی۔ ہمایوں اس سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود میرزا کے پاس آئے گا بشرطیکہ وہ اس ملاقات کے موقعہ پر جزع فزع نہ کرے۔ میرزا نے یہ شرط مان لی۔ ہمایوں اسے ملنے کے لیے اس کے خیمے میں آیا۔ میرزا مراسم تعظیم و تکریم بجا لایا۔ اور یہ شعر پڑھے ؎

نہ قدر شوکت سلطان نہ گشت ہیچ کم
ز التفات بہ مہمان سرائے دہقانی
کلاہ گوشہ دہقاں بہ آفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش انگند چوں تو سلطانی

ـــ لمحوں کی خاموشی کے بعد میرزا نے یہ عرض کیا ـــ

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است　　　گر ناوک جفاست وگر خنجر ستم

یہ اشعار جن کا لفظ لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا اس حالت کے دل سے نکلے جو نہایت دکھی اور رنجیدہ تھا۔ آخر جب اسے سکون حاصل ہوا تو اس نے اتنا کہا۔ خدا گواہ ہے میں نے اپنی خوشی سے یہ کام نہیں کیا بلکہ بد نیت حریف ... کاش مجھ سے پہلے تم میرا یہ حال کرتے۔

میرزا کامران جب تک بولتا رہا حقارت کا جذبہ دیانتداری سے بولا۔ ... یہ وہ آدمی ہیں جو اسے حاضرین کے نام بتاتے گئے۔ ان سے ملا۔ دوستو! تم سب گواہ رہو کہ میں اپنے آپ کو بے گناہ خیال کرتا تھا اس وقت جب کہ جہاں پناہ یہاں تشریف فرما ہیں میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں پورے یقین کے ساتھ مانتا ہوں کہ میں ہلاک ہونے کے قابل تھا مگر بادشاہ نے میری جان بخشی کی اور اس کے سب حجاز مقدس جانے کی اجازت بھی دی۔ اس احسان کے شکریہ کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ اس نے میری بدی اور بد عہدی پر قلم عفو پھیرا۔

اس کے بعد کامران نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی سفارش کی۔ بادشاہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ میرے اپنے بچے ہیں میں ان سے بہت سلوک کروں گا۔

اس کے بعد میرزا کو رخصت کیا اور اس کے نوکروں میں سے جو اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے انھیں بھی اجازت دی مگر خود غرض دنیا میں وفا نایاب ہے ... کے جتنے ساتھیوں اور نوکروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا البتہ اس کی بیوی ماہ چوچک بیگم ارغون نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ... رشتہ داروں کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اور جب وہ شوہر کے ساتھ سوار ہوئی تو اس کا باپ شاہ حسن ارغون راستہ روکنے کے لیے وہاں پہنچا مگر وفا پرست ماہ چوچک نے باپ کو جواب دیا "تم نے مجھے خاوند کے سپرد اس وقت کیا جب وہ بادشاہ تھا۔ اب تم مجھے اس سے اس لیے جدا کرنا چاہتے ہو کہ وہ نابینا، بے یار و مددگار ہے۔ ادبار اور نکبت کی گھڑی میں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ پہلے شاید اسے میری ضرورت نہ ہو۔ لیکن اب اسے قدم قدم پر میری ضرورت ہے۔ اس حالت میں میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔" باپ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے شوہر پرستی اور وفا کی بیٹی کی تعریف کی اور اسے رخصت کیا۔

کامران تین حج کرنے کے بعد ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۹۶۴ھ کو فوت ہوا۔ ملا قاسم کاہی نے تاریخ وفات کے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ لکھا ـــ

کامران آن کہ پادشاہی را　　　کس نہ بود است ہمچو او درخورد
شد ز کابل بہ مکہ در آخر　　　جان بحق داد و تن بہ خاک سپرد
گفت تاریخ او چنیں کاہی
پادشاہ کامران بہ مکہ بمرد

و شیخ نامی شاعر نے بھی کامران کی تاریخ وفات کہی ہے ـــ

شندہ کامران خسرو نامدار　　　کہ از سلطنت سر بہ کیواں رساند
مجاور شد اندر حرم چار سال　　　بکلی و از قید عالم رہاند
زبعد وفات رخ مہر زمین　　　باحرام رخ جاں بجاناں نشاند
چو در خواب دیدش و آمد شبے　　　عنایت نمودہ بروئے خویش خواند

بگفت او بہ پرسند از فوت ما
بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند
۹۶۴ھ

(بدایونی ص ۱۲۳)

ابوالقاسم شوکتی

کامران کا بیٹا ابوالقاسم شوکتی بھی شاعر، ادیب اور استقلال کا پیکر تھا۔ اکبر نے جب اتگہ خیل کے نرغے میں پھنس کر بیرم خاں کے ہاتھ سے اختیارات چھیننے چاہے اور آگرہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوا تو ماہم انگہ نے اس خوف سے کہ کہیں بیرم خاں اسے اکبر کے خلاف تخت پر نہ بٹھا دے۔ ابوالقاسم کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور ۹۷۲ھ میں جب خان زماں علی قلی خاں سیستانی اور اس کے بھائی بہادر خاں سیستانی نے جون پور میں علم بغاوت بلند کیا اور اس کے اگلے ہی سال اکبر کے سوتیلے بھائی میرزا حکیم نے بھی سرکشی شروع کی تو اکبر کو ابوالقاسم کی طرف سے پھر خدشہ پیدا ہوا۔ اس نے امیروں کے مشورہ سے اس خار کو ہمیشہ کے لیے راستہ سے دور کرنے کا حکم دیا۔ امیر کے کچھواہہ راجپوتوں میں سے غالباً راجہ بھگوان داس نے گوالیار جا کر اسے ٹھکانے لگایا۔ جب جلاد اس کا سر قلم کرنے لگا تو اس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

فلک بہ کشتن من این قدر شتاب مکن
چو خواہم از ستم تو مرد اضطراب مکن

ایک خانہ زاد شاعر نے اس کی بڑی عجیب و غریب تاریخ کہی ہے۔

نہال بوستان کامرانی　　　فتاد از صرصر غم ناگہانی
ابوالقاسم کہ گشتند ایکشتن او　　　بسان غنچہ خون جاں جہانی
رقم زد وحشی تاریخ قتلش　　　نماند از کامراں نام و نشانی
۹۷۲ھ

ایک اور شاعر نے اس کی تاریخ یوں کہی ہے ؎

خسرو دیگر خاں ابوالقاسم　　　آنکہ مہ از رخش منور شد
رفت و از رفتنش دل خلقاں　　　پارہ پارہ چو دُرِ احمر شد
سال تاریخش از خرد جستم　　　خردم سوئے باغ رہبر شد

بلبل ناگہاں با فغاں گفت
آہ کہ آں مہ شہید اکبر شد

شہریار

جہانگیر کے آخری ایام حکومت تھے۔ اس کی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ جانشینی کے لیے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ تھا اس لیے سلطنت کے خیرخواہوں کو فکر لاحق تھی۔ جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا خسرو مر چکا تھا۔ پرویز بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ میدان میں دو امیدوار موجود تھے۔ شاہجہان اور شہریار ——— شہریار اگرچہ دربار میں ہر دلعزیز نہ تھا مگر نورجہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن سے تھی اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس لیے نورجہاں کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان کا تاج اسی کے سر پہ رکھا جائے۔ شاہجہاں آصف خاں کی لڑکی ارجمند بانو سے بیاہا ہوا تھا اور اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتا تھا جو ایک اچھے بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ وہ مدبر، جفاکش، رعیت نواز اور معارف پرور ہونے کے علاوہ ایک اچھا سپاہی اور بڑے درجے کا سپہ سالار بھی تھا۔ وہ درباریوں میں ہر دلعزیز تھا۔ نورجہاں نے ہرچند کوشش کی کہ وہ اہل دربار اور رعایا کی نظروں سے گر جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ نورجہاں کی دراندازیوں سے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ ہوا اور کھلے بندوں شاہی افواج سے لڑا۔ بعض امیروں نے بادشاہ کے حکم سے اس کا مقابلہ بھی کیا مگر شاہجہان سے جو عقیدت انھیں تھی وہ بدستور قائم رہی۔ اس میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی رعایا اور دربار کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔

شہریار نہ تو رعایا میں ہر دلعزیز تھا نہ درباری طبقہ اسے پسند کرتا تھا۔ وہ ناشدنی کے لقب سے مشہور تھا اور بعض اوقات ایسی حرکتیں بھی کر جاتا تھا جو شاہی وقار کے منافی ہوتی تھیں۔ امرا کا ایک طبقہ محض نورجہاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی وفاداری کا زبانی زبانی دم بھرتا تھا۔

سنہ ۱۰۳۷ھ کی بہار کا موسم تھا کہ جہانگیر عازم کشمیر ہوا۔ اس کے ساتھ نورجہاں، آصف خاں، شہریار اور مرحوم شہزادہ خسرو کا بیٹا داور بخش عرف میرزا بلاقی بھی تھا۔ شاہجہان دکن میں تھا۔ جہانگیر کھوئی ہوئی صحت کی تلاش میں کشمیر پہنچا مگر جنت ارضی کی آب و ہوا اس کی صحت کی بحالی میں کسی طرح بھی مفید ثابت نہ ہوئی۔ وہ دمہ کا مریض تھا۔ مرض نے یہاں پہنچ کر شدت اختیار کر لی۔ نقاہت بڑھتی گئی۔ جسمانی کمزوری نے ڈیرے ڈال دیئے۔ بھوک ختم ہو گئی اور خیرخواہان سلطنت کو بادشاہ کا انجام سامنے نظر آنے لگا۔ اب بادشاہ گھوڑے کی بجائے پالکی میں سوار ہو کر باہر نکلتا۔

انہی ایام میں شہریار پر داء الثعلب کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے سر، داڑھی، مونچھوں، بھوؤں اور پلکوں کے بال گر گئے۔ اطبا نے اس کا علاج بڑی احتیاط سے کیا مگر اسے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ کشمیر جیسے سرد مقام کو چھوڑ کر میدانی علاقے میں چلا جائے چنانچہ وہ لاہور چلا آیا۔

شہریار کے کشمیر سے چلے آنے کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ بھی لاہور کے ارادے سے چل کھڑا ہوا۔ جب وہ بہرام گلہ کے مقام پر پہنچا تو اسے شکار کی سوجھی۔ یہ اس کی پرانی شکارگاہ تھی اور وہ کشمیر سے آتے جاتے یہاں شکار کھیلا کرتا تھا۔ یہاں ایک حادثہ کی بنا پر اس کی صحت اور بھی بگڑ گئی۔ اس نے اس مقام کو خیرباد کہا اور دوسرے دن تھنہ پہنچا۔ یہاں سے چل کر وہ راجوری آیا جہاں سے وہ چنگس میں خیمہ زن ہوا۔ یہاں اس کی حالت بے حد نازک ہو گئی۔ رات بڑی بے قراری سے گزری۔ ۲۷ صفر سنہ ۱۰۳۷ھ مطابق ۸/۷ اکتوبر سنہ ۱۶۲۷ء کو اس نے اپنی جان

جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

بادشاہ کی وفات نے ایک دفعہ پھر جانشینی کے جھگڑے کو تازہ کر دیا۔ اب ہر جانب سے کوشش شروع ہوئی۔ نور جہاں نے امرا کو طلب کیا۔ انھیں اس معاملے کی اطلاع دی۔ مگر آصف خاں نے اندر ہی اندر کچھ ایسی چال چلی کہ بہت کم امرا نور جہاں تک پہنچے۔ اس نے اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کی کہ نور جہاں کی نقل و حرکت ایک لحاظ سے محدود کر دی گئی۔ آصف خاں نے اپنے ایک وفادار ہرکارے بنارسی نامی کو اپنی انگوٹھی دے کر شاہ جہان کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ فوراً آگرہ پہنچ کر ہندوستان کے تخت پر قبضہ کرے۔ درمیانی وقفے کے لیے اس نے خسرو کے بیٹے داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

داور بخش کو یقین نہ آتا تھا کہ آصف خاں شاہ جہاں کو چھوڑ کر اس کا ساتھ دے گا۔ مگر جہاندیدہ آصف خاں نے اسے اس طرح سبز باغ دکھائے اور قسمیں کھائیں کہ اپنی وفا کا یقین دلا دیا کہ داور بخش قربانی کا بکرا بننے پر راضی ہو گیا۔ ارادت خاں نے بھی آصف خاں کے ساتھ مل کر نئے شاہ کو مبارک باد دی۔ چنانچہ جمعہ کے دن اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس طرح داور بخش پورے طور پر آصف خاں کے شکنجہ میں آگیا۔

شاہ جہاں کے چاروں بیٹے نور جہاں کی حراست میں تھے۔ کیونکہ جب شاہ جہان اور جہانگیر کے درمیان صلح صفائی ہوئی تھی تو اسے اپنی وفا کا یقین دلانے کے لیے اپنے چاروں بیٹے یرغمال کے طور پر بادشاہ کے پاس چھوڑنے پڑے تھے۔ آصف خاں جانتا تھا کہ اگر یہ شہزادے اسی طرح نور جہاں کے پاس رہے تو وہ انھیں کسی وقت نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس لیے انھیں اس کے شکنجے سے نکالنا بڑا ضروری ہے۔ چنانچہ امرا کو توڑ کر ساتھ ملا کر اس نے چاروں شہزادوں کو نور جہاں کے پنجے سے چھڑا لیا۔

یہ سب کچھ کئی دنوں میں ہوا۔ ان حالات سے نپٹنے کے بعد دوسرے دن آصف خاں بھمبر پہنچا جہاں بادشاہ کی تجہیز و تکفین کی رسوم ادا ہوئیں۔ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ نعش تابوت میں رکھ کر لاہور روانہ کی گئی تاکہ اسے باغ دلکشا میں دفن کیا جائے۔ یہ باغ نور جہاں کا تھا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ اسے وہاں دفن کیا جائے چنانچہ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی۔

شہریار لاہور میں تھا۔ نور جہاں نے کسی نہ کسی طرح اسے سب واقعات کی اطلاع پہنچائی۔ حالانکہ آصف خاں نے یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ نور جہاں کا تعلق بیرونی دنیا سے ٹوٹ جائے تاکہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ اس سے شہریار اور اس کے ساتھی بالکل بے خبر رہیں اور وہ چپ چاپ لاہور پر قبضہ کر لے۔ مگر نور جہاں نے اس معاملے میں اسے شکست دی۔ اس نے نہ صرف شہریار کو ساری اطلاعات بھجوائیں بلکہ اسے حکم دیا کہ وہ جس قدر فوج اکٹھی کر سکے کرے۔ فوراً راوی پار کر کے اس تک پہنچے۔ شاہی فوج کم ہے وہ بڑی آسانی سے اس پر قابو پا سکتا ہے۔

شہریار اس پیغام سے گھبرا سا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر لاڈلی بیگم نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے جرأت دلا کر مجبور کیا کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرے۔ اس نے شاہی خزانہ اور قلعہ لاہور پر قبضہ کیا۔ اور ایک ہفتے کے اندر اندر ستر لاکھ روپیہ سپاہیوں اور سرداروں میں بانٹ دیا۔ اس طرح اپنے گرد بہت بڑی فوج جمع کر لی۔ دولت کی اس بے پناہ بارش نے شاہی خاندان کے بعض افراد کو بھی شہریار کے جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ ان میں شہزادہ دانیال کا بیٹا بایسنغر بھی تھا۔

شہریار اپنا لاؤ لشکر لے کر لاہور سے باہر نکلا۔ دریائے راوی عبور کیا اور مورچے سنبھال لیے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو تین

ہزار سپاہی تھے۔ باقی فوج اس نے شہزادہ بایسنغر کے سپرد کی کہ وہ آگے بڑھ کر آصف خاں کی پیش قدمی کو روکے۔

آصف خاں کو ایک ایک منٹ کی خبر مل رہی تھی۔ وہ نئے شہنشاہ کو ہمراہ لے کر بڑی سرعت سے لاہور کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ نورجہاں اس کی فوج سے ایک دن کے فاصلے پر پیچھے رہے۔

بایسنغر کے ساتھ زیادہ تر ناتجربہ کار سپاہی تھے۔ وہ آصف خاں کے ایک حملے کی بھی تاب نہ لا سکے۔ اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے شہریار کو جب اس کا علم ہوا تو وہ لاہور میں قلعہ بند ہوگیا۔ آصف خاں نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ ——— محاصرہ کی سختی کو دیکھ کر اکثر امیروں نے خفیہ خفیہ آصف خاں سے ساز باز شروع کی اور ایک ہی دن میں حالات یکسر بدل گئے۔

آصف خاں قلعہ میں داخل ہوا۔ شہریار اپنے ساتھیوں کی بے وفائی سے اتنا سراسیمہ اور پریشان ہوا کہ وہ قلعہ سے بھاگنے کی بجائے زنان خانے میں جا چھپا۔ جہاں سے اسے گرفتار کر لیا گیا اور چند دن کے بعد اس کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ سبحان رائے بھنڈاری کا بیان ہے کہ جب اس کی آنکھوں کی پتلیاں کاٹی جا رہی تھیں اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس نے اپنے اندھا ہونے کی تاریخ یوں منظوم کی ؎

ز نرگس گلاب ار چہ نتواں کشید — کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من — بگو "کہ رشید دیدۂ آفتاب"

۱۰۳۷ھ

استقلال کی یہ عظیم الشان مثال ہے۔ شہریار کو مورخ ناشدنی کہتے ہیں یعنی وہ نالائق اور ناکارہ تھا مگر جب اس پر مصیبت پڑی تو اس نے اپنے خاندان کی روایت کو قائم رکھا اور خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو منظوم کر کے ہمیشہ کے لیے جریدۂ روزگار پر ثبت کر دیا۔ سچ ہے ہر قسم کی مصیبتوں سے انسانیت نکھرتی ہے اور دوسروں کے لیے عبرت اندوزی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔

شاہ عالم ثانی

خاندان تیموریہ میں آنکھیں نکالنے اور اس مصیبت کے وقت استقلال اور تحمل کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑنے کی چوتھی زبردست مثال شاہ عالم کی ہے۔

شہزادہ عالی گوہر جو بعد میں شاہ عالم کے لقب سے تیموری شوکت و جلال کے مزار کا مجاور رہا۔ تاریخ ہندوستان میں کچھ ایسی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اسی کی بادشاہت کے بارے میں کسی ظریف کا مقولہ ہے کہ "بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ وہ رحم دل، متحمل مزاج اور صاحب وجاہت تھا۔ مصیبت کے وقت خاص طور پر استقلال کا مظاہرہ کرتا۔ مگر جرأت، مردی اور شجاعت سے عاری تھا جن کی ان حالات میں سخت ضرورت تھی۔ رحم اور مروت کی یہ حالت تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی بے وفائی اور دغا کا اظہار کرتا، جب وہ اس کے سامنے آتا تو اس کی آنکھیں خود بخود جھک جاتیں اور وہ اس کے تمام گناہوں پر خط تنسیخ کھینچ دیتا۔ اس کے بعد وہ اس کے بارے میں سب کچھ بھول جاتا جس کی وجہ سے سلطنت کا نظم و نسق بگڑتا ہی چلا گیا۔ شاہ عالم بڑا شاکر و صابر تھا۔ ہر حال میں راضی برضا رہتا۔ مصائب و آلام کے طوفانوں میں وہ کبھی حوصلہ نہ ہارتا۔ ہمیشہ ہمت بلند رکھتا۔

شاہ عالم اپنے باپ عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ وہ دہلی سے دور بہار میں قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ وہیں اس کی بادشاہت کا اعلان ہوا۔ آخر میں بکسر کی جنگ کے بعد اس کا مستقل قیام الٰہ آباد میں ہوگیا۔ وہ شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کے درمیان

گھرا ہوا تھا۔ وہ اسے جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔ دہلی میں نجیب الدولہ امیر الامرا اور شہزادہ جواں بخت بادشاہ کے نائب تھے۔ نجیب الدولہ نے سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی کوشش کی مگر حالات ایسے بگڑ چکے تھے کہ اس کا سنبھلنا ناممکن تھا۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد شمال کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جاٹ آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں لوٹ کھسوٹ مچا رہے تھے شجاع الدولہ اپنی سلطنت کی وسعت میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس کا لقب نواب وزیر تھا۔ مگر اسے دہلی سے کسی قسم کا لگاؤ نہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ دہلی کی سلطنت مٹ رہی ہے وہ صوبہ اودھ کو ایک سلطنت کی صورت دے کر رہے گا۔

ان حوصلہ شکن حالات میں نجیب الدولہ نے آٹھ برس تک بڑی بیدار مغزی، دلیری اور شجاعت سے شمالی ہندوستان میں امن و امان قائم رکھا۔ اس کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ ہندوستان گیری کا خواب دیکھنے لگے۔ دکن پر تاخت و تاراج کے بعد انہوں نے شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ نجیب الدولہ نے یہ دیکھ کر کہ دہلی کے حالات ابتر ہیں مسلمان امیر اور دربار کے بڑے بڑے سردار خود غرضی کا شکار ہو کر ایک دوسرے کی گردن کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں ان ناساز گار حالات میں مرہٹوں کا مقابلہ تو کیا ہو سکے گا، بلکہ مغل سلطنت کا بچنا بھی مشکل ہے۔ اس نے مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی۔ حکومت دہلی نے پیشوا کو نائب منیر ہند بنا کر وسیع اختیارات سونپ دیئے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ شاہ عالم جو الہ آباد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظر بند کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں دہلی لایا جائے اور اس کی سرپرستی میں ملک کے امن و امان کے لیے کوشش کی جائے۔ چنانچہ مرہٹے اس پر متفق ہو گئے۔

شاہ عالم سے اس سلسلے میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ وہ بھی دہلی آنا چاہتا تھا چنانچہ مرہٹہ سرداروں کے قول و قسم سے مطمئن ہو کر عازم دہلی ہوا اور بارہ سال کی جلا وطنی کے بعد ۱۷۷۲ء کے آغاز میں دہلی پہنچا۔ بڑے زور شور سے اس کا استقبال ہوا۔ اب نجیب الدولہ مر چکا تھا۔ نجف خاں دہلی کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ضابطہ خاں اپنے باپ نجیب الدولہ کا عہدہ لینا چاہتا تھا۔ تکوجی ہلکر اپنے اندر اس کا بڑا سرپرست تھا۔ ہلکر کا اثر دربار میں بھی تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی مگر حالات نے ضابطہ خاں کا ساتھ نہ دیا۔ وہ کبھی تو امیر الامرا ہوتا کبھی فقط ایک معمولی سردار بن کر رہ جاتا۔

دہلی کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی تھی، بڑی بڑی مہمات کے لیے روپیہ درکار تھا۔ مگر یہاں خزانہ خالی تھا۔ بادشاہ بالکل کنگال تھا یہاں تک کہ جب ۱۷۷۸ء میں اس کی والدہ لال کنور فوت ہوئی تو شاہ عالم کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ وہ اس کا مقبرہ بنوا سکے۔ ان حالات میں نجف خاں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ سلطنت کے ہر حریف سے لڑا۔ مگر جہاں گھر کے اندر دشمن موجود ہوں وہاں ایک آدمی کی کوشش سے کیا ہو سکتا ہے۔ شاہ عالم ان حالات کو خوب سمجھتا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ نجف خاں کے مرنے کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ مرہٹوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ جسے ہر صاحب بصیرت بڑے خوف و ہراس سے دیکھتا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تھا۔ مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

یہ دیکھ کر غلام قادر روہیلہ جو ضابطہ خاں کا بیٹا تھا، غدار منصور علی خاں خواجہ سرا کی وساطت سے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ اس کے ساتھ مغل فوج کا سردار اسماعیل بیگ بھی تھا۔ یہ دونوں مادھو جی سندھیا کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، سندھیا کا اقتدار دربار پر چھایا ہوا تھا۔ بادشاہ ایک طرف سندھیا سے امداد طلب کر رہا تھا، دوسری طرف وہ غلام قادر روہیلہ اور اسمٰعیل بیگ کو بھی ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ سندھیا کی فوجیں ادھر ادھر منتشر تھیں۔ بیگم سمرو جو اس وقت دہلی میں تھی اور جس کے ہوتے ہوئے خطرات لال قلعہ سے دور ہی دور رہتے تھے، حالات سے مایوس ہو کر اپنی ریاست سردھنا میں چلی گئی، اس نے یہ بھی کہا کہ مادھو جی سندھیا متھرا میں ہوتے ہوئے دہلی کی مہم میں کیوں شریک نہیں ہوتا اور بادشاہ کی امداد کے لیے خود کیوں نہیں آتا۔ سوال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔

بیگم شمرو کے جانے کے بعد نجف بہت بہادر گوسائیں بادشاہ کے ساتھ رہ گیا تھا۔ وہ پوری ہمت اور جرأت سے بادشاہ کے مخالفوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مگر مسلمان سرداروں نے اسے دھمکیاں دے دے کر بادشاہ سے علیحدہ کر دیا۔ اس میں سب سے زیادہ کام منصور علی خان خواجہ سرا نے کیا۔

جب اسمٰعیل بیگ اور غلام قادر بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو کورنش اور تسلیمات کے بعد دونوں نے عرض کیا کہ ہم دونوں جو کام کر رہے ہیں وہ جہاں پناہ کی خیر خواہی کے لیے ہے۔ بادشاہ سب کچھ سمجھتا تھا اور اپنی مجبوری اور معذوری سے بھی واقف تھا۔ مگر اس نے دونوں کو خلعت عطا کئے۔ غلام قادر کی امیرالامرائی کا اعلان کیا۔ مادھو جی سندھیا اپنے عہدے سے موقوف کیا گیا اور اسمٰعیل بیگ تمام افواج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔

غلام قادر روہیلہ نے کچھ دنوں بعد بادشاہ سے کہا کہ ہماری سپاہ کا ارادہ ہے کہ وہ متھرا پر حملہ کر کے مرہٹوں کو شمالی ہندوستان سے بھگا دے۔ مختلف امور پر بات چیت ہوتی رہی۔ ... نے بہ عذر پیش کیا کہ خزانہ خالی ہے فوج کے مصارف کون برداشت کرے گا۔ غلام قادر نے ... کو برا بھلا کہا۔ وہ مارے غصے کے ... ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ شاہ عالم نے ایک خط مادھو جی سندھیا کو لکھا تھا کہ وہ ... کی امداد کے لیے آ جائے۔ یہ خط غلام قادر کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے خط نکالا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے انکار کیا۔ غلام قادر نے اسی وقت حکم دیا کہ شاہی گارد فوراً ہتھیار ڈال دے۔ اس نے شاہ عالم کو تخت سے اتار دیا اور اسے قید کر کے سلیم گڑھ بھجوا دیا۔

اس سے فارغ ہو کر اس نے ایک تیموری شہزادے کو قید سے نکالا اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سب امیروں اور سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

غلام قادر نے تین دن تک بادشاہ کو بے آب و دانہ رکھا۔ اور باقی قلعہ لوٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسمٰعیل بیگ بھی برابر کا شریک تھا۔ اس واسطے پہلے سے ... اور کہا کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے تمہارا فوج میں ہونا ضروری ہے۔ وہ اس چکمے میں آ گیا مگر لشکر میں پہنچ کر اپنی اس حماقت پر بہت پچھتایا۔ اس نے اتنا ضرور کیا کہ شہر کے دروازوں پر ... گارد کو بلا کر کہہ دیا کہ تم ہوشیار رہنا۔ اپنی حفاظت کا بندوبست رکھنا۔ ساتھ ہی اپنے سپاہیوں اور ناظروں کو یہ حکم بھی دیا کہ اگر روہیلے شہر کو لوٹیں تو تم بھی خوب لوٹنا۔

غلام قادر نے سب سے اوّل نئے بادشاہ کو حکم دیا کہ اپنی تمام بیگمات سے زیورات، جواہرات اور قیمتی سامان لے لو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ سامان جمع ہو گیا تو روہیلے نے اس پر قبضہ کر لیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر اس نے شاہ عالم پر دباؤ ڈالا کہ وہ بتلائے اس نے دولت کہاں چھپا رکھی ہے اور کہاں کہاں دفینے موجود ہیں۔ شاہ عالم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اب اس پر سختی شروع ہوئی۔ کوئی ایسا ظلم و ستم نہ تھا جو اس بوڑھے بادشاہ اور اس کی اولاد پر نہ توڑا گیا ہو۔ شروع شروع میں اس نے نئے بادشاہ بیدار بخت سے اسے خوب پٹوایا۔ ۳۰ جولائی ۱۷۸۸ء کو شاہی خاندان کی بیگمات کو پٹوانا شروع کیا۔ ان کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ ان کے گال تھپڑوں سے لال ہو گئے۔ جب ان کو پیٹا جاتا تو سارا محل ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھتا۔

اس دوران میں کبھی کبھی روہیلے کو خیال آتا کہ کہیں اسمٰعیل ان کی مدد کے لیے نہ آ جائے۔ اس لیے اس کا منہ بند کرنے اور اسے روکنے کے لیے اس نے جتنا کچھ کو پانچ لاکھ روپے اس کے پاس بھیج دیئے۔ جس پر اس نے احتجاج کیا۔ چند روز بعد اس نے مزید سات لاکھ روپیہ بھیجا۔

یکم اگست کو پھر بادشاہ پر سختی شروع ہوئی کہ وہ دفینے اور خزانے بتلائے۔ مگر اسے پتہ ہوتا تو وہ بتاتا۔ جب عقوبت حد سے بڑھ گئی تو

بڈھے بادشاہ نے کہا "عالم! خزانہ کہاں ہے؟ کیا میرے پیٹ میں رکھا ہے۔ اگر وہاں ہے تو اسے چیر کر نکال لے" غلام قادر نے کہا۔ وقت آئے گا تو ایسا بھی کیا جائے گا۔

شاہ عالم سے مایوس ہو کر اس نے بڑی بوڑھی بیگمات پر تشدد و تو ڑنا شروع کیا۔ ان سب میں ملکہ زمانی اور ممتاز محل امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ شہر میں رہتی تھیں۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ لوٹ لیا گیا۔ مزید مال و دولت بتانے کے لیے ان پر سختیاں کی گئیں۔

جب روہیلہ سب طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے تخت کو آگ لگا کر سارا سونا اور چاندی اس میں سے نکال لیا۔ محلات کے فرش اکھاڑے۔ اس خیال سے کہ شاید خزانہ ان کے نیچے دفن ہو۔ تین دن تک قلعہ میں یہی کام ہوتا رہا۔

۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو دوبارہ بادشاہ طلب کیا گیا۔ غلام قادر دیوان خاص میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ اس کے حضور میں پیش ہوا۔ غلام قادر روہیلے کے ساتھ یعقوب علی خاں، ورچا، پانچ روہیلے پٹھان اور بھی تھے۔ اس نے بادشاہ سے خزانہ دریافت کیا۔ شاہ عالم نے بڑے تحمل سے جواب دیا کہ اگر مجھے دفینوں کا علم ہوتا تو میں چاندی اور سونے کے ظروف بیچ کر اپنے نوکروں کو تنخواہ کیوں دیتا؟ اگر میرے آبا و اجداد میں سے کسی نے یہاں کوئی خزانہ دفن کیا ہے تو مجھے اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔

غلام قادر نے جھلا کر کہا۔ تو بیکار محض ہے۔ اس دنیا میں تیرا کیا کام۔ تیری آنکھیں نکال لینی چاہئیں۔ شاہ عالم نے کہا "ارے کمبخت! یہ آنکھیں وہ ہیں جو ساٹھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ انھیں نکال کر تجھے کیا ملے گا؟"

یہ سن کر روہیلے نے منہ پھیر لیا اور حکم دیا کہ بادشاہ کے بیٹوں اور پوتوں کو خوب پیٹا جائے چنانچہ نوکروں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ یہ دیکھ کر بوڑھے شاہ عالم نے کہا "میں نے یہ عذاب اور مصیبت دیکھنے کے لیے ان آنکھوں کو باقی رکھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ انھیں فوراً نکال ڈال۔ اب ان کا کیا فائدہ ہے؟"

غلام قادر غصے سے بے قابو ہو کر تخت سے کود پڑا۔ بادشاہ کو فرش پر لٹایا۔ چھاتی پر چڑھا اور اپنے خنجر سے بادشاہ کی ایک آنکھ نکال ڈالی۔ دوسری آنکھ نکالنے کا حکم یعقوب علی خاں کو دیا۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ روہیلے نے تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے دوسرے ساتھی یہ دیکھ کر دہل گئے۔ انھوں نے فوراً بادشاہ کی دوسری آنکھ نکال دی۔

اس کے بعد شاہ عالم کو سلیم گڑھ بھیج دیا گیا۔ اس وقت تمام قلعے کے رہنے والے تصویر غم بنے ہوئے تھے۔ بیگمات اور شہزادیاں ہائے عالم، وائے عالم کہہ کر سر پیٹ رہی تھیں۔ کوئی یہ دردناک واقعہ دیکھ کر بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ کسی پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ کوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ غرضکہ سب پر غم و الم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

جب شاہ عالم کی آنکھیں نکالی جا چکیں تو غلام قادر کو پھر اسمٰعیل بیگ کا خیال آیا چنانچہ اس واقعہ کے دو دن بعد اسے ایک بہت بڑی رقم اور بھیجی۔

شہر والوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ لال قلعہ کی چار دیواری میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ چند روز کے بعد انھیں علم ہوا تو وہ خوف کے مارے شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ۱۴ اگست کو مرہٹوں کی فوج پہنچ گئی۔ انھوں نے لوگوں کو تسلی و تشفی دی اور یقین دلایا کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو گی۔ اب شہر کا کاروبار پھر سے جاری ہوا۔ مرہٹوں نے قلعہ کی ناکہ بندی کی۔ اور غوث گڑھ کو جانے والا راستہ بالکل روک لیا۔

اسمٰعیل بیگ یہ دیکھ کر کہ اب مرہٹے آ گئے ہیں ان کے سردار راناخاں کے پاس پہنچا اور عذرِ معذرت پیش کرنے کے بعد ان سے مل گیا۔ قلعہ کے اندر جو حالات بگڑے۔ روہیلہ سپاہیوں نے لوٹ کھسوٹ سے اپنا حصہ مانگا۔ اس کے ساتھ ہی سامانِ رسد بھی ختم ہو گیا۔ غلام قادر گھبرایا۔ اس نے بارود کو آگ لگائی اور خود میرٹھ بھاگ گیا۔

شاہ عالم نے ان حالات میں جس قدر صبر و استقلال کا ثبوت دیا، اس کا عشر عشیر بھی اگر میدانِ جنگ میں دکھاتا تو اسے یہ بُرا دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس نے اس واقعہ کے بارے میں ایک بڑی دردناک نظم لکھی جس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا شاہ عالم اپنے انصار و اعوان کی طرف فریاد کناں بڑھا بڑھا کر انھیں پکارتا ہے اور اپنی مدد کے لیے بلاتا ہے۔ اس کی یہ درد انگیز شاعری زندہ جادو ثابت ہوئی۔ مرہٹے سب سے پہلے اس کی مدد کو پہنچے اور اسے کنجِ قفس سے نکال کر مسندِ شاہی پر بٹھایا۔ یہ نظم بڑی موثر اور شاہ عالم کی زاری کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما	داد بر باد سر و برگ جہانداریِ ما
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودم	بود در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد	کہ نہ بینیم کہ کند غیر جہانداریِ ما
داد افغان بچہ شوکتِ شاہی برباد	کیست جز ذاتِ خدائے کہ کند یاریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش ایں بود	ہست امید کہ بخشد گنہگاریِ ما
کرد سی سال نظارت کہ مراد او بباد	زود دریافت تلافیِ ستمگاریِ ما
نازنیناں پری چہرہ کہ ہمدم بودند	نیست جز محل مبارک بہ پرستاریِ ما
حق طفلاں کہ ز سی سال فراہم کردند	کردہ تاراج بیک لحظہ سبکساریِ ما
عہد و پیماں بمیاں دادہ شدند و دغا	مغلیاں خوب نمودند وفاداریِ ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ و پروردیم	عاقبت گشت مجوز پئے خونخواریِ ما
قومِ افغاں بشکلِ عجب بازی دادند	لیک گشتند بجز بہ گرفتاریِ ما
آں گدازادۂ شہداں کہ بُد و منع بدو	بانیِ جور و ستم شد بدل افگاریِ ما
گل محمد کہ ز مرداں بشرارت کم نیست	چہ قدر کرد وکالت بہ گرفتاریِ ما
ہم اللہ یار و سلیمان و بدال بیگ لعین	ہر سہ بستند کمر بہرِ دل آزاریِ ما
شاہ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من	زود باشد کہ بیاید بہ مددگاریِ ما
مادھو جی سندھیا فرزندِ جگر بندِ من	ہست مصروفِ تلافیِ ستمگاریِ ما
راجہ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر	حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواریِ ما
حالِ ما گشتہ بتر ہمچو اماماں ز یزید	کرد تقدیرِ ازل روزیِ ما خواریِ ما
بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہمچو مرض	دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما

آہ ازیں دولت داغگویم کہ در سوزیمن ماند   تیغ عجب گر بست بیند مددگاری ما
آفتاب از فلک امروز شب ہی دیدی
باز فردا چہ ببیند دست و سرداری ما

شاہ عالم شاعر تھا۔ فارسی اردو اور ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اس کے ہندی کلام کا مجموعہ نادرات شاہی کے نام سے چھپ چکا ہے اردو اور فارسی کا کلام ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑا ہے۔ اگر وہ چھپ جائے تو اس زمانے کے واقعات و حوادث اور ثقافت و معاشرت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنے کے علاوہ ہم لوگوں کی ادبی تاریخ میں ایک بہت بڑا اضافہ ہوگا جس سے اس خاندان کی ادبی روایات میں ایک تسلسل قائم ہو جائے گا۔

شاہ عالم نے جس طرح زندگی کے دن گزارے شہزادگی سے لے کر بادشاہت تک اس نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے۔ انہوں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اعیان و امراء کی بے کاریاں، جلا وطنی کی مصیبت اور قلعہ میں شاہی اسیر کی حیثیت سے قدم قدم پر انسانی فطرت کے سربستہ رازوں کا منکشف ہونا، مصائب و آلام کا ہجوم کر کے آنا ایسے واقعات ہیں جو شاعر کو حقیقی معنوں میں شاعر بنا دیتے ہیں۔ اس کے کلام میں سوز و گداز اور خلوص پیدا کرتے ہیں اور شعر حقیقی معنوں میں شعر بن جاتا ہے جو زبان سے نکلتے ہی دل میں اتر جاتا ہے۔

شاہ عالم کی آنکھوں کا مرثیہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے جو بڑی مؤثر ہے۔ جس نے اسے پڑھا وہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر شاہ عالم کا اور کوئی کلام باقی نہ رہتا تو فقط یہی نظم اس کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھ سکتی تھی۔ جدید ادب میں جس قسم کی شاعری پر زور دیا جاتا ہے شاہ عالم کی نظم اس کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں نہ مبالغہ ہے نہ تصنع۔ سیدھے سادے واقعات سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ لفظ لفظ میں جادو بھرا ہوا ہے جو سحر حلال بن کر پڑھنے اور سننے والوں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتا ہے۔

مورخوں نے اس دردناک واقعہ کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اسی قسم کا واقعہ ہے جس قسم کے کئی واقعات پہلے ہو چکے ہیں، البتہ ایک بات جو اسے دوسروں سے مختلف بناتی ہے وہ مغل بیگمات کی بے حرمتی اور ایذا رسانی ہے۔ اس سے پہلے تاریخ میں بیگمات کی بے حرمتی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ تیموریوں نے اپنی رعایا نوازی اور عدل گستری کے باعث لوگوں کے دلوں میں خاص عزت و وقار پیدا کر لیا تھا۔ رعایا انھیں بمنزلہ روحانیت اور ماں باپ کے سمجھتی تھی اور وہ رعایا کو بمنزلہ اولاد خیال کرتے تھے۔ بادشاہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ان کی خوشی میں خوش ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی حکومت دلوں پر تھی، لوگ انھیں اپنے سے الگ نہ سمجھتے تھے، وحشی سے وحشی اور مہذب سے مہذب انسان مغل حرم کی دل سے عزت کرتا اور کوئی ایسی حرکت نہ کرتا جس سے ان کے وقار میں فرق آئے یا عزت و آبرو پر حرف آئے۔ چنانچہ ہم ذیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سول افسر کے سفرنامے سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس خیال کی پورے طور پر تائید ہو جاتی ہے۔ اس افسر کا نام تھامس ٹوئننگ (THOMAS TWINING) تھا۔ اس نے اس دلدوز واقعہ کے چھ برس بعد دہلی کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر اس نے نجی طور پر کیا تھا۔ جب وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ بیس کے قریب سپاہی تھے جو اس کی حفاظت اور رہنمائی کر رہے تھے۔ دوران سفر میں جب وہ ... پہنچا تو اسے بتلایا گیا کہ گوجر ڈاکوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں دو ہزار کے قریب آدمی ہیں اس پر چھاپہ مارنے والی ہے۔ تھامس کے قول کے بموجب گوجر بڑے بہادر، خونخوار اور دلیر ڈاکو

تھے۔ یہ خبر سن کر ... نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ پالکی کے نیچے اتار دیے جائیں اور جب ڈاکو نزدیک پہنچیں تو بلند آواز سے کہیں کہ بادشاہ کے حرم کی بی بی ہے۔ اس نعرے نے جادو کا اثر کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے جھک کر پالکی کو سلام کیا اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔

(TRAVEL IN INDIA PAGE 269)

جب ڈاکوؤں ... خونخوار اور سفاک ڈاکوؤں کے دل میں مذہبی بیگمات کی ہر عزت تھی تو مہذب اور متمدن لوگوں کا اندازہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ یہ بات اور قابل ذکر ہے کہ حضور والا پر ... عالم پر سختیاں بڑھتی رہیں ... کی زبان پر یا اللہ کا نام رہتا یا کلمہ شہادت۔ اس نے کسی تقدیر پر بھی شکوہ و شکایت آہ و زاری اور فریاد نہیں کی۔ یہ صبر اور تحمل کی بڑی اچھی مثال ہے۔ مگر اس کے ساتھ اگر اس میں جرأت اور شجاعت کے جوہر بھی ہوتے تو شاید محصوروں کے اجڑے ہوئے گھر پھر سے آباد ہو جاتے اور اس کا خاتمہ اتنی جلدی نہ ہوتا۔

———

اُردو کا ایک اچھوتا ناول "نشتر"

سید مبارز الدین رفعت

ہمارے ایسے بزرگ جنہوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، حکیم محمد علی اور منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کے ناول مزے لے لے کر پڑھے تھے اب آہستہ آہستہ اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نسل کے کسی بزرگ کی موجودگی میں کبھی ناول کا ذکر چھڑ جائے تو بے اختیار ہو کر آپ سے پوچھ بیٹھیں گے "میاں! ناول نشتر بھی پڑھا ہے؟" آپ جواب دیں گے کہ اس نام کا کوئی ناول آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس پر وہ بزرگ حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ ناول نشتر نہیں پڑھا تو آپ نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ ایسے ہی بزرگوں میں ایک ہمارے ادیب شہیر حضرت نیاز فتح پوری بھی ہیں۔ مثنوی زہر عشق کا جو خوبصورت اڈیشن مجنوں گورکھپوری نے شائع کیا تھا اس کے دیباچہ "عذر لنگ" میں فرماتے ہیں: "یوں تو اپنی زندگی میں خدا معلوم کتنی بار رو چکا ہوں لیکن تین اشک باریاں ایسی ہیں جن کی تفصیل مجھے اب بھی یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے۔ سب سے آخر میں اس وقت جب میں نے ایک نظم "جرم وفا" کے عنوان سے لکھی تھی...... اس سے قبل جب ناول نشتر میری نگاہ سے گزرا اور اس سے بھی پہلے عنوان شباب میں اس وقت جب اول اول مثنوی زہر عشق کا مطالعہ میں نے کیا۔"

میں نے آج سے کوئی دس پندرہ سال پہلے یہ ناول پڑھا تھا۔ اب گلبرگہ میں جہاں یہ کتاب لکھی گئی تھی پھر ایک بار یہ کتاب مجھے پڑھنے کے لیے مل گئی۔ اس وقت میرے سامنے نشتر کا وہ اڈیشن ہے جو مطبع نولکشور لکھنؤ سے آٹھویں بار سنہ ۱۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس کتاب کی "دوسری خواندگی" کا نتیجہ ہے۔

ناول نشتر کے مصنف منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کے ساتھ تاریخ ادب اردو نے بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ وہ نشتر کے سوا کئی اور کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب "کائنات" ہے جو اس وقت بہت کمیاب[1] ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "بگلا بھگت"

۱؎ مولانا عبدالماجد دریابادی کے قول کے مطابق اس کتاب کا پہلا اڈیشن مطبع آفتاب ہند محلہ کچہری گھاٹ آگرہ سے سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے اس کا دوسرا اڈیشن گزرا ہے جو محمد شمس الدین خاں اکبرآبادی کے اہتمام سے ان کے مطبع شمس المطابع افضل گنج حیدرآباد دکن سے ۱۳۳۲ف (م ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کے عنوان سے دھوکا ہوتا ہے شاید یہ کتاب طبیات کے موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن اصل میں یہ انسانی زندگی کی رمزی یا تمثالی داستان ہے۔ اس کو پڑھ کر مشہور انگریز مصنف بن ین کی کتاب "پلگرمس پروگریس"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نایاب بھی نہیں غالباً نایید ہے اور اس کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں۔ فشتر کے بعد ان کی سب سے مشہور تصنیف 'حیاتِ شیخ چلّی' ہے۔ اردو کے ابتدائی دور کے اتنے اچھے ناول 'نشتر' اور 'حیاتِ شیخ چلّی' جیسی زعفران زار کتاب کے مصنف ہونے کے باوجود بھی ان کتابوں کے مصنف کو اردو ادب کی تاریخ میں جگہ نہ مل سکی۔ مرزا محمد عسکری نے تاریخ ادبِ اردو میں، عبدالباری آسی نے تذکرۂ خندۂ گل میں اور آغا محمد باقر نے اپنی تاریخ نظم و نثر اردو میں ان کی کتاب 'حیاتِ شیخ چلّی' کا ذکر کیا ہے لیکن اسے ان کے ہم نام اور ہم عصر اڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ اودھ پنچ کے نامور اڈیٹر منشی سجاد حسین نہ تو انجم تخلص کرتے تھے اور نہ وہ کسمنڈوی تھے۔ منشی سجاد حسین نے بھی طلسمی فانوس، حاجی بغلول اور [illegible] جیسے ناول لکھے ہیں۔ غالباً ناول نگاری اور پھر ہم نامی کی وجہ سے سجاد حسین کسمنڈوی کی بعض تصنیفات ان کے مشہور ہم عصر ہم نام سے منسوب ہو گئیں۔

ناول 'نشتر' سے صاحبِ نشتر کے سوانح حیات پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ اس کتاب سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسمنڈہ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ پھر کسی طرح انہیں ریاستِ حیدرآباد میں سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ دفترِ مال میں سررشتہ داری کی خدمت پر مامور رہے اور عرصۂ دراز تک گلبرگہ میں تعینات رہے۔ گلبرگہ ہی میں وہ ۵ رمضان ۱۳۱۱ھ کو نشتر کی تالیف سے فارغ ہوئے۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنے محکمہ کے ایک افسرِ اعلیٰ محمد اکرام الدین خاں کے نام معنون کیا ہے جو پہلے گلبرگہ کے اوّل تعلقدار تھے اور نشتر کی تالیف کے وقت الگندل کی تعلقداری پر بھیجے گئے تھے۔ گلبرگہ کی مشہور "اکرام سرائے" آج بھی اس علم دوست اور قدرشناس زماں عہدہ دار کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اکرام الدین خاں صاحبِ ذوق عہدہ دار تھے۔ منشی سجاد حسین نے یہ کتاب ان کے صاحبِ ذوق ہونے کی وجہ سے ہی ان کے نام معنون کی ہے۔ انتسابی اور رباعی کے تعلق سے "میں یہ پیش کش" کے عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں: "یہ حقیر ترجمہ عالی جناب مولوی محمد اکرام الدین خاں صاحب بہادر اوّل تعلقدار الگندل ریاستِ حضور نظام دکن دام اقبالہٗ کے نام نامی کے ساتھ معنون کیا جاتا ہے۔ جن جناب کی خاص عنایت اور محبت کے صلے میں اور نہ خورسندی کے واسطے بہت ہی ادنیٰ تیجے نام مجھ کو بار ہیں۔"

رسالہ آج کل (دہلی) بابت ۱۵ جون ۱۹۴۹ء میں جناب مبشر علی صدیقی نے "اردو کا ایک گمنام مصنف ــــ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی" کے عنوان کے تحت صاحبِ نشتر پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے لیکن اس کی ادبی قدر و قیمت کے متعلق

(حاشیہ صفحہ سابق) یاد آ جاتی ہے۔ یہ کتاب اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بڑے گہرے مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ مصنف کی دوسری کتابوں سے بالکل ہی الگ ہے۔ اس کتاب میں خالق و مخلوق، خدا اور بندے کے آپس کے تعلقات کی نوعیت، زندگی کی مختلف منزلوں کی کیفیت اور آخر میں روزِ حساب کا نقشہ نیم شاعرانہ، نیم فلسفیانہ اور نیم صوفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) لے اس کتاب کا دوسرا اڈیشن راقم نے دیکھا تھا۔ ۱۹۲۲ء کا چھپا ہوا تھا۔ اس کی ابتدا میں ایک مزاحیہ دیباچہ ہے اور آخر میں خود مصنف کا یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چھپے ہیں قہقہے جو سو خیاباں ہیں ہر طرف ـــ ہے جو بے صوفی الفت و خوندگی خندگی
سالِ تاریخش جو ہے گا ہاتفِ غیبی بگفت ـــ شیخ چلّی آ گئے و نیست میں باسنجیدگی

ناانصافی سے کام لیا۔ منشی سجاد حسین کے حالاتِ زندگی کے لیے صدیقی صاحب نے مجلا اور لوگوں کے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی سے بھی استفسار کیا تھا۔ منشی صاحب سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے انھیں لکھا تھا:۔

"منشی سجاد حسین انجم ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں بیمار پڑے۔ ملازمت سے رخصت لے کر لکھنؤ آئے اور کچھ مہینے بعد انتقال کر گئے۔ میرا اندازہ ہے چھیالیس کے قریب عمر پائی ہوگی۔ میانہ قد و قامت کے آدمی تھے۔ سانولی رنگت، ستواں ناک، ہونٹ پتلے، داڑھی مختصر تھی۔ منڈے ہے نہ کوئی نمایاں مزاج میں نکتہ سنجی تھی۔ مزاجاً زاہدانہ بسر کرتے اور مالی مشکلوں کا سامنا رہا کرتا، باصورت حال ادھر ادھر دیکھ کر بہت خفا ہوتے تھے۔ صورت با وضع قطع سے مذہبیت نہ ظاہر ہوتی تھی مگر تھے مذہبی آدمی۔ نماز روزے کے بہت سختی سے پابند تھے۔ مولانا عبدالوہاب لکھنوی (یعنی علی برادران مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی کے مشہور پیر مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے والد ماجد) سے بیعت تھی اور مرشد سے والہانہ اور گہری عقیدت۔ خدا بخشے۔"

منشی سجاد حسین اودھ پنچ لکھنؤ کے ابتدائی دور کے نامہ نگار بھی رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انجم تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک آدھ غزل نظم اخبار اودھ پنچ میں شائع ہوتی تھی۔ لوگوں کو اپنے اشعار بہت کم سناتے تھے۔ ناول فتنہ میں بھی انھوں نے دو ایک جگہ حسبِ حال اپنے اشعار نقل کر دیے ہیں۔ جرأت اور رنگین کے رنگ کی وہی جوبن اور رانگیا والی شاعری ہے۔ ایک جگہ پوری ایک غزل نقل کر دی ہے۔ اس سے ان کی شاعری کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

بہاروں پر ہے حسنِ زیبا کسی کا	ابھاروں پہ ہے جوبن آیا کسی کا
جو سینے سے ڈھلکا دوپٹہ کسی کا	مسل ڈالا ظالم کلیجہ کسی کا
اسے پیار پامال اس کو کیسے	مچاتے ہے اندھیر سرمہ کسی کا
غضب دختِ رز آج نکھری ہے ساقی	تماشہ ہے ٹوٹے جو تقوی کسی کا
وہ بیٹھ کی تقدیر انگیا کی قسمت	کہ ہاتھ آ گیا جوبن ابھرا کسی کا
سرِ طور کیا خاک بانی ہے موسیٰ	ادھر آ دکھلائیں جلوہ کسی کا
چلو ہم بھی پوچھیں مزاجِ مبارک	سرِ طور انجم ہے جلوہ کسی کا

اپنی غزل نقل کرنے کے بعد خود ہی حاشیے میں یہ لکھ گئے ہیں "ناظرین ہنس پڑیں گے کہ یہ بے وقت کی راگنی کیسی۔ مگر اپنے لختِ جگر سب کو اچھے معلوم ہوتے ہیں، ٹوکنے کی بات نہیں!"

نشترِ منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کی پہلی تصنیف ہے۔ اصل میں یہ سید حسن شاہ نامی لکھنؤ کے کسی صاحب کی خود نوشت داستانِ معاشقہ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ سید حسن شاہ کی اس فارسی تصنیف کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا۔ معلوم نہیں اس فارسی داستان کا قلمی نسخہ کہاں سے منشی صاحب کے ہاتھ لگا تھا۔ اب چونکہ اصل فارسی کتاب ہماری دسترس میں نہیں ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ منشی صاحب نے

کس حد تک اس میں اپنی طرف سے ترک و اضافہ کیا ہے۔ اتنا تو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اکثر اردو اشعار منشی صاحب نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ ناول میں جگہ جگہ منشی صاحب نے مترجم کی حیثیت سے حاشیے بھی لکھے ہیں۔ کہیں لکھا ہے "میں نے اصل فارسی عبارت ہی نقل کر دی ہے ترجمہ میں اس کا لطف کہاں" کہیں لکھا ہے "یہاں حسن شاہ نے بہت سے فارسی شعر لکھے تھے، وہ سب میں نے حذف کر دیئے ہیں" کہیں ہیروئن نے جس لطیف انداز میں ہیرو کو بنایا ہے اس کی داد دی ہے کہیں ہیرو کی حماقت پر طنز کیا ہے۔ ایک حاشیے میں تو یہاں تک لکھا ہے "داستان طراز نے بیان کو بہت سلیقہ سے سنبھالا ہے اور مصنف نے اس زمانے کی تہذیب کا کچھ بیان نہ کیا تھا" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستان کا ڈھانچہ تو منشی صاحب نے سید حسن شاہ سے لیا ہے لیکن اس کو اپنے بلکہ بالکل اپنے انداز میں ڈھال کر بیان کیا ہے، نرا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔

منشی صاحب نے کتاب کی ابتدا میں "التماس مترجم" کے عنوان سے چار صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں: "...... ایک فارسی قصّے کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس کتاب کے متعلق حالات کے واسطے ایک مستقل دیباچہ درکار تھا مگر میں بالفعل اس کو ملتوی کرتا ہوں اور امید ہے کہ اس کے ملاحظہ کی نوبت گوارا کی جائے گی ...... مختصر یہ ہے کہ اصل کتاب سید حسن شاہ کی فارسی ہندی آمیز زبان میں قلمی میرے پاس موجود ہے۔ سال تصنیف ۱۲۰۵ھ اور تاریخ کتابت ۱۲۱۳ھ۔ شریف مصنف نے اسے عشق و محبت کا واقعہ نہایت سادہ الفاظ و عبارت میں لکھا ہے۔ تکلف اور تصنع غالباً بہت ہی کم اور سچا واقعہ ہے اس لیے پڑھنے والے واقعی کلیجہ تھام لیتے ہیں ......"

اٹھارویں صدی کے آخری دن ہیں اور یہی آپ کا ملک ہندوستان جنت نشان ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے تنگ بخت، ایک سو سال کی مسلسل خانہ جنگی، افراتفری، مرہٹوں کی لوٹ مار، گردی اور ابدالی کی مار سے مرکزی حکومت مغلیہ چور چور اور نڈھال ہو کر سسکتی ہوئی اپنی آخری ہچکیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ ملک میں سات سمندر پار سے آئے ہوئے بدیسی صاحبوں کے اقبال کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ شمال میں جنوب میں، مشرق میں مغرب میں ہر سمت انہی کا بول بالا ہے۔ کیا مدراس کیا بنگال، کیا گجرات اور کیا پنجاب ملک کے سبھی حصّے ان کے حلقۂ اقتدار میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ ملک میں جگہ جگہ ان کی فوجی چھاؤنیاں قائم اور ہر جگہ ان کے انتظامی افسر متعین ہوتے جا رہے ہیں۔ ادھر ہم آپس کے بغض و عناد، رشک و حسد، کینہ اور بغض میں مبتلا ایک دوسرے کے سر پھٹول میں مشغول ہیں۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے سلسلے ہیں کہ جاری ہیں۔ صدیوں کی عیاشی نے محنت کوشی کی جگہ سہل جوئی کا انہیں تھما دیا ہے۔ نوابزادوں کے کنبے بیٹھے ہیں، نشہ وستاں چمن گی تو طاؤس و رباب ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا چراغ بجھنے سے پہلے اپنی پوری تابناکی کے ساتھ بھڑک رہا ہے۔ کام و دہن کی حلاوتیں، گوش و بصر کی کھلاوٹیں اور ہر طرح کی حسی لذتوں کے وہ وہ سامان ہو رہے ہیں کہ بس فکر و عمل کی ساری صلاحیتیں ان ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہیں۔ بدیسی نے فکر سیاست سے فراغت دے دی تو ساری سوجھ بوجھ ساری دانائی، فراست صرف ہونے لگی بناؤ میں، سنگھار میں، آداب میں، اطوار میں، اٹھنے میں، بیٹھنے میں، کھانے میں، پینے میں، اوڑھنے میں، بچھونے میں، غرض زندگی کے ہر فعل و عمل میں تکلف ہی تکلف برتنے میں۔ ارباب نشاط کے طائفے کو پروان چڑھنے کے لیے اس سے اچھے مواقع کہاں ملتے ہیں۔ ان دنوں ہندوستان میں اس نے اپنا کاروبار خوب ہی پھیلایا

اور یہ عروج ہی پھلا پھولا

کہتے ہیں جب کسی قوم پر سیاسی حیثیت سے زوال آنے لگتا ہے تو اس کے تمدن میں اتنی ہی نفاست اور تابناکی آنے لگتی ہے۔ تمدن کے انتہائی عروج کے دنوں میں عاشقی بھی ایک آرٹ بن جاتی ہے۔ طوائف ایک تہذیبی ادارہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حال فراعنہ کے عہد، ملسیفیوں اور دیوتاؤں کے یونانِ قدیم اور قیصروں کے رومتہ الکبریٰ کے تمدنی عروج کے دنوں کا تھا۔ یونان کے ماس تھینس اور ہرکلز جیسے نامور فرزند سیس اور اسپاسا نامی طوائفوں کی محبت پر نازاں تھے۔ روم کے حمام وہاں سب ہی تنگے تھے اور ان سے مستقل طور پر قحبہ خانوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ان حماموں میں جانا اور داد عیش دینا تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے دوران میں ہندوستانی طوائفوں نے بھی ناچ گانے، شعر و شاعری، مجلسی آداب، لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار میں وہ کمال دکھایا کہ ہندوستانی امرا انھیں اپنی سرکار سے وابستہ کرنے لگے اور شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و شائستگی، محفل کے اطوار اور گفتگو کے آداب سکھانے کے لیے ان کے پاس بھیجنے لگے۔ ایسی عورتوں کے ڈیرے اور کوٹھے ایک طرح کے کلب تھے جہاں گھڑی دو گھڑی کے لیے بیٹھنا خلاف وضع نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک طرح باوضع، صاحب ذوق اور صاحب مرتبہ ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ یہ عورتیں بڑی نفیس، شائستہ اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ آج کل کی طوائفوں کے کوٹھوں کا ان سے مقابلہ کرنا ان کی توہین ہے۔

مشرقی تہذیب کی ان آخری جھلکیوں میں برائیوں کے ساتھ ساتھ اچھائی کے پہلو بھی آپ کو کافی مل جائیں گے۔ ان ڈیرے دار طوائفوں کا آج کے بازارِ حسن سے مقابلہ کیجئے تو کتنا زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ آج کے بازارِ حسن میں عشوہ طرازی اور ناز آفرینی کی کمی نہیں لیکن اس بازار میں جو جنس نایاب ہو گئی ہے وہ انسانیت اور شرافت ہے۔ کل کے گناہ کے کوچے اور آج کے گناہ کے کوچے میں بس فرق اسی کا دکھائی پڑتا ہے کہ کل کے گناہ کے کوچے کی دکانیں سجانے والیاں لاکھ بہ جائی بیتنے ہوئے بھی وفادار اور جاں نثار تھیں آج جس آسانی کے ساتھ انھیں حاصل کیا جا سکتا ہے اس وقت ان کا حصول اتنا آسان نہ تھا۔ ایک عرصے کے میل جول کے بعد وہ کسی سے تعلق پیدا کرتی تھیں اور اس تعلق کو نباہتی بھی تھیں اور کسی نیک بخت کو توبہ کی توفیق میسر آ جاتی تو یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد اس کی پوری زندگی عفت و پاکبازی کی زندگی ہوتی تھی۔

عصرِ حاضر کے ایک فاضل مؤرخ نے بالکل سچ کہا ہے کہ "۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم و جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جس کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عرصہ تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی، یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانا سماجی نظام اور پرانے نظریاتِ وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر و نظر کے سانچے ہی توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل ڈالتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں صرف ایک سیاسی نظام ہی کا جنازہ نہیں نکلا بلکہ ہندی قرونِ وسطیٰ کا سارا تہذیبی سرمایہ بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔"

ہندی قرونِ وسطیٰ کے سارے تہذیبی سرمایے کا جنازہ نکلنے میں قریب قریب نصف صدی لگی ہے کیونکہ بہادر کے جو بھی

۱۰ – اس انگلستان سے ہندوستان بھیجے جا رہے تھے ان میں ابھی تک اپنی تہذیب کی برتری کا احساس نہیں جاگا اور ہندوستانی تہذیب کے ساتھ منافرت کا برتاؤ شروع نہیں ہوا جو بعد میں سوچی سمجھی پالیسی کے طور پر شروع ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی ان کی آنکھیں مشرقی تمدن کی آخری بھڑک سے کچھ ایسی چکاچوند ہو رہی تھیں کہ انھوں نے اپنی تہذیب، اپنے رہن سہن اور ٹھاٹ باٹ کے طریقے وہاں کے طور طریق سے فروتر جانا۔ وہ ہندوستان کے حاکم اور اونچے طبقے کی جگہ لینے جا رہے تھے اس لیے لازمی طور پر انھوں نے رکھ رکھاؤ اور رہن سہن میں اسی طبقے کی ریس کی اور اسی کو اپنا نمونہ قرار دیا۔ عیش و عشرت کے جو جو ڈھنگ اس زوال پذیر طبقے نے ایجاد کر رکھے تھے ان سب کو ان نئے حاکموں نے اپنایا اور انہی کے انداز میں دادِ عیش دینے میں ان سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ ہمارے اس دور میں جب کہ ہر طرف مغربی تہذیب کی تقلید کا دور دورہ ہے اور علم و ہنر، اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن و عشق اور عیش و عشرت کے معیار ہی بدل گئے ہیں اور تمام رنگینیوں اور عیش پسندیوں میں روز بروز مغربی معیار کے پابند ہوتے جا رہے ہیں یہ بات کچھ تعجب خیز سی معلوم ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں اسی مغربی تہذیب کے نمائندے اپنی تہذیب کو حقیر اور فروتر جان کر اسی مشرقی تہذیب کی پیروی پر فخر کرتے تھے جسے بعد میں ذلیل تر اور پست تر قرار دیا گیا۔

ناول "نشتر" کا قصہ کچھ ایسی ہی فضا میں شروع ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو سید حسن شاہ جو خود اس داستان کے راوی ہیں اپنے آپ کو صحیح النسب سادات سے بتاتے ہیں۔ ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں یتیمی کا داغ اٹھایا۔ نانا نے ان کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت دی۔ سولہ سترہ سال کی عمر تھی۔ اپنے نانا کے توسط سے جنرل کوٹ کے بھانجے مسٹر منگ، ممبر کونسل کیمپ کانپور کے خانگی منشی کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ مسٹر منگ ایک خوش مزاج، عیش پسند اور خوش گزران فوجی افسر تھے۔ میر صاحب کی مستعدی، کارگزاری اور دیانت داری سے وہ بہت خوش ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان کے سارے خانگی کاروبار میر صاحب کی نگرانی میں آ گئے اور وہ انھیں بہت چاہنے لگے۔

میر صاحب کو منگ صاحب کے پاس ملازم ہوئے کوئی تین چار سال ہوتے ہوں گے۔ ایک دن سیر سے ان کی ملاقات کشمیری زنانہ طائفے کے ڈھاڑی محمد اعظم سے ہوئی۔ یہ شخص میر صاحب کے نانا کا شناسا تھا۔ میر صاحب کے نانا کی مزاج پرسی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے میر صاحب سے درخواست کی کہ میں نے ایک گویتی سے سن کر کچھ فارسی غزلیں لکھ لی ہیں، ممنون ہوں گا اگر آپ میرے خیمہ پر چل کر ان کو درست فرما دیں۔ میر صاحب محمد اعظم کے خیمے پر پہنچے تو یہاں پورے طائفے کے اراکین سے ان کا تعارف ہوا۔ ان میں تیرہ چودہ سال کی ایک نہایت درجہ حسین لڑکی بھی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں میر صاحب اپنا نقدِ دل اسے نذر کر بیٹھے طائفے اور خاص کر اس لڑکی کے حالات کی جستجو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس طائفے کا سربراہ کشمیری اعظم جی ہے۔ پہلے تجارت کا پیشہ کرتا تھا۔ اس میں زبردست نقصان ہوا اور دیوالہ نکل گیا تو اس کی داشتہ چنبیلی جان نے جو قوم کی کسبی تھی، ایک طائفہ قائم کر کے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس طائفے میں میرزائی نامی ایک عورت ہے جس کی حیثیت نائکہ کی سی ہے۔ ایک عورت گلبدن ہے اور ایک عورت بی جان ہے ان ہی کی کمائی پر طائفے کا گزر ہے۔ کانپور میں مقیم فوج کے کمانڈنگ آفیسر کلو صاحب کی سرکار میں یہ کشمیری طائفہ ملازم ہے اور وہ جو پندرہ سال کی لڑکی ہے اس کی داستانِ حیات بھی دلچسپ ہے۔ چنبیلی جان کی ایک بیٹی صاحب جان اس کے کسی پہلے شوہر سے تھی۔ صاحب جان کو ایک پٹھان سردار نے نوکر رکھ لیا اور اس کی مرضی کے خلاف اس سے نکاح کر لیا۔ اس سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام خانم جان رکھا گیا۔ چند روز بعد پٹھان سردار مر گیا اور صاحب جان اپنی بچی کو لے کر اپنی ماں کے پاس بھاگ آئی اور کچھ دنوں بعد مر گئی۔ اعظم جی کی خود کوئی

اولاد نہ تھی۔ اس لڑکی کو اس نے اپنی بچی بنا لیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا۔ مرزا قتیل کو بھی اس لڑکی سے بہت محبت ہے اور وہ بھی اسے اپنی بچی کی طرح چاہتی ہے۔ اعظم جی کو اس کا ناچنا گانا پسند نہ تھا لیکن اس کی نانی بچی ناکتخدا تھی، اس نے اعظم جی کی بات نہ مانی اور اس کو رقص و سرود کی تعلیم دلائی، اس کے باوجود اعظم جی کا خیال ہے کہ کسی شریف آدمی سے اس لڑکی کی شادی کر دی جائے۔ کئی انگریزوں نے اس کی خواہش کی لیکن اعظم جی اور مرزا قتیل نے قبول نہ کیا، ابھی تک وہ پاک دامن اور عفت مآب ہی ہے۔

میر صاحب پہلی ہی ملاقات میں اپنا نقد دل ہار چکے تھے کچھ ایسے کھوئے کھوئے اور بہکے بہکے رہنے لگے تھے کہ اور لوگوں نے سمجھا کہ میر صاحب بیٹھے ہی سے دل باختہ ہیں لیکن دل را بہ دل راہ است، خانم جان کم عمر تھی لیکن طوائف زادی تھی۔ اس کے اطراف ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ تیوروں سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ حضرت کا کیا حال ہے۔ سید حسن شاہ خود بھی خوش رو تھے، نوجوان تھے، بیس اکیس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں خانم جان نے بھی میر صاحب کے لیے اپنے دل میں جگہ پائی اور ایک گونہ کشش اس نے بھی میر صاحب کی طرف محسوس کی۔

اب میر صاحب کسی نہ کسی بہانے اعظم جی کے یہاں آنے جانے لگے۔ خانم جان سے ان کی دوسری مڈبھیڑ اس وقت ہوئی جب کہ اعظم جی کے یہاں خانم جان کی سالگرہ کا جشن ہو رہا تھا۔ میر صاحب کو بھی اس جشن میں شرکت پر مجبور کیا گیا۔ کھانے کے بعد میر صاحب نے گانے کی فرمائش کی تو پہلی ہی بار، فارسی ادب میں طاق، خانم جان نے کچھ برمحل شعر گائے، ان میں سے ایک غزل تھی ؂

آنچہ رحمہ از دل بردۂ از ناتبہ فریاد من است | وانکہ زبان آور درخانہ بیت بیاد من است
آں شکارم من کہ ہم لائق بہ کشتن نیستم | شرم می آید مرا زانکس کہ صیاد من است

یہ اشعار سن کر میر صاحب حیران رہ گئے کہ پروردگار کس نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ میں تم پر مرتا ہوں۔ اس کے بعد پھر گانے کا رنگ جما تو میر صاحب کا دل بھر آیا اور کلیجہ امڈنے لگا، بے اختیار آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے اور ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بعد اس سخن سنج اور سخن فہم نے خواجہ حافظ کی یہ غزل چھیڑ دی ؂

یارب آں شمع شب افروز زکاشانۂ کیست | جان ما سوخت بپرسید کہ جانانۂ کیست
حالیا خانہ بر انداز دل و دین من است | تا ہم آغوش کہ می باشد و ہم خانۂ کیست

اس شعر کو مکرر سہ کرر گایا ؂

یارب ایں شاہ وش و ماہ رخ و مہ افروز
در یکتائے کہ و گوہر یک دانۂ کیست

اس غزل سے عالم ہی اور ہو گیا، سب کی حالت متغیر تھی اور وہ ستمگر جس طرح گا رہی تھی ہرگز نہیں اٹھائی تھی اور چند غزلیں گانے کے بعد اس نے یہ شعر گائے ؂

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ | بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ
کجا روم بہ کہ گویم و چہ چارہ کنم | کہ تیر عشق مرا در درون جاں زدۂ

یہ شعر گاتے گاتے کنکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور زیر لب کچھ کہا اور میر صاحب تڑپ کر رہ گئے۔

اس دوسری ملاقات کے بعد میر صاحب کو یقین ہو گیا کہ جس پر وہ فدا ہیں اس کے دل میں بھی ان کے لیے جگہ ضرور ہے۔ میر صاحب کی اس فوکر نثاری پر ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ محمد اعظم نے راستے میں مل کر میر صاحب کو یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ جس انگریز کمانڈنگ آفیسر کی سرکار میں یہ طائفہ ملازم تھا اس کی بدلی کلکتے ہوگئی، اس نے طائفے کو جواب دے دیا۔ سب کم تلاشِ روزگار میں ہیں، جو میر صاحب کے پاس چند روزہ جاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میر صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ بوکھلائے پھرتے تھے کہ اپنے والد مرحوم کی ایک بیاض میں الفی "عمل عقد الطریق" نظر آگیا۔ حساب کیا تو وہی دن عمل کے واسطے معین تھا اس کو نیک شگون سمجھ کر عمل پڑھا گیا۔ روز اسی کد و کاوش میں گزر رہے، چوتھے دن اپنے خدمت گار کو خبر لانے کے لیے محمد اعظم کے پاس بھیجا تو وہ خود ہی سراسیمہ پریشان چلا آیا۔ اب اسے "عمل عقد الطریق" کی برکت کہیے یا بخت و اتفاق، معلوم ہوا کہ اسی رات گلبدن تھانہ خواب کسی انگریز کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہر چند تلاش کیا پتہ نہیں چلا۔ سنتے ہیں کہ خاندانے کا دارومدار اسی کی کمائی پر تھا۔ اب کہاں کا سفر اور کہاں کا قیام۔ اس کے بعد میر صاحب نے کچھ ایسی چال چلی اور کچھ ایسی ترکیبیں بتائیں کہ منگ صاحب جن کے پاس وہ خود منشی تھے اس طائفے کو ملازم رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ امتحان کے طور پر پہلا مجرا ہوا تو آپ بھی اس میں موجود تھے۔ خانم جان سے حافظ کی یہ غزل گانے کی فرمائش کی ؎

حالِ دل با تو گفتنم ہوس است — خبرِ دل شنفتنم ہوس است
طمع خام بیں کہ قصۂ فاش — از رقیباں نہفتنم ہوس است
شبِ قدرے چنیں عزیز و شریف — با تو تا روز خفتنم ہوس است
آں کہ دردانۂ چنیں نازک — در شبِ تار سفتنم ہوس است

خانم جان نے میر صاحب کی فرمائش پر یہ غزل تو گا دی لیکن اس کے بعد حافظ ہی کی ایک غزل خود گا دی ؎

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند — چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند
غنیمتے شمر اے شمع وصل پروانہ — کہ ایں معاملہ تا صبح دم نخواہد ماند
سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ کس ہمیشہ گرفتارِ غم نخواہد ماند

صاحب کو اس طائفے کے مردوں کا گانا اور عورتوں کا رقص و سرود بہت پسند آیا اور وہ ان کی سرکار میں ملازم رکھ لیا گیا۔ جب تک گلبدن اس طائفے میں رہی، اعظم جی اور مرزائی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ خانم جان سے پیشہ کرائیں گے۔ وہ بھاگ گئی تو مجبوراً اس کے سبب راضی ہو گئے۔ میر صاحب نے نوکر رکھانے کو اس طائفے کو منگ صاحب کے پاس نوکر رکھا دیا لیکن دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے کہ اب خانم جان صاحب سے کیسے بچی رہے گی۔ جس دن یہ طائفہ نوکر ہوا اسی رات کو ان حرام خوروں نے معمول کے مطابق خانم جان کو بنا سنوار کر صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ وہ چلی تو گئی لیکن جب صاحب نے دست درازی کا قصد کیا تو اس نے اودھم اور بیداد مچائی اور زار و قطار رونا شروع کیا جس سے صاحب کے آنے کے حواس غائب ہو گئے۔ آدھی رات تک یہی حالت رہی۔ آخر مرزائی کو بلا کر کہا کہ جب یہ بی بی راضی نہ تھی تو کیوں تم نے بھیجا۔ ہم کو زبردستی کے ساتھ ضرورت نہیں اور اس وقت بی جان کو بھیج دو۔ خانم جان کی جگہ بی جان بھیج دی گئی اور خانم جان کی ناموس محفوظ رہی۔

اب یہ طائفہ مستقل طور پر صاحب کے بنگلے کے احاطے ہی میں میر صاحب کی قیام گاہ کے سامنے خیمہ لگا کر رہنے لگا۔ بی جان تو مستقل طور پر صاحب کی داشتہ بن گئیں اور خانم جان بھی گانا سنانے، ناچ دکھانے اور اپنی شوخ و شنگ اداؤں سے صاحب کا دل بہلانے کے لیے نوکر رکھ لی گئیں۔

میر صاحب اور خانم جان دونوں برابر کی آگ میں جل رہے تھے۔ اس قرب مکانی نے طائفے کے باورچی کے کمسن لڑکے رحم اللہ کے ذریعے چپکے چپکے زبانی پیام و سلام اور بعد میں باقاعدہ مکاتبت کی صورت پیدا کر دی۔ خیمہ کی قنات میں ایک سوراخ کر کے تاکا جھانکی اور حسب حال غزل اور سوز دروں کے اشعار سنانے کا موقع بھی فراہم کر لیا گیا۔ جس قسم کے حالات تھے ان میں اس تعلق کا چھپانا ضروری تھا۔ رنگت صاحب آقا تھے اور یہ دونوں ان کی سرکار کے ملازم۔ طائفے والے حرام خور تھے اور بے درد۔ خانم جان نے انتہائی دانائی اور فراست سے یہ ڈھونگ رچایا کہ وہ میر صاحب کو ناپسند کرتی ہے اور ان سے اسے بغض للہی ہے۔ صاحب کی موجودگی میں وہ میر صاحب پر ایسی ایسی چوٹیں کرتی کہ خود صاحب بہادر کو میر صاحب کی طرفداری کرنی پڑتی اور وہ خانم جان سے کہتے کہ ہمارے منشی صاحب بہت نیک آدمی ہیں، پارسا ہیں، ایماندار ہیں، لائق ہیں، قابل ہیں، ان کے ایسے ہی صفات کی وجہ سے ہم ان کا ادب ہی نہیں کرتا بلکہ ان سے ڈرتا ہوں لیکن مجروں میں معاملہ ہی کچھ اور ہوتا۔ میر صاحب کسی درد انگیز غزل کی فرمائش کرتے، وہ خانم جان گا دیتی اور پھر اس کے جواب میں آپ ہی کوئی برمحل غزل چھیڑ دیتی۔ یہ راز و نیاز دونوں میں ہوتے اور اس کی کراماً کاتبین کو بھی خبر نہ ہوتی۔ کبھی کبھار چوٹ کرنے میں رنجش کی نوبت بھی آجاتی۔ نامہ و پیام اور قنات کے پاس کھڑے ہو کر تاکا جھانکی سب بند ہو جاتی لیکن مجرے کی محفلوں میں پھر ایک بار نہ جانِ حبیب کی بہترین غزلیں دونوں کے دلوں کی ترجمانی بنتیں اور پھر دل صاف ہو جاتے۔

ادھر خط و کتابت بھی جاری تھی۔ سید حسن شاہ کے خطوں میں بے تکلفی سے اظہارِ عاشقی اور "تمنائے وصال" کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ خانم جان کے خط جو بڑے سلیقے سے لکھے ہوتے ان میں یہی جواب ہوتا ہے کہ چند روز اور صبر کرو، میں تمہاری ہو چکی لیکن مجھ پر اسی وقت تصرف کر سکو گے جب کہ قانونی طور پر بھی تم مجھے اپنا لو۔ حرام کاری میری فطرت سے دور ہے۔ اگر یہی مقصود ہوتا تو میں کب کی اپنے جسم کا سودا کر چکی ہوتی۔ اسی درمیان میں خانم جان نے سید حسن شاہ کی محبت کا ایک امتحان بھی لے لیا۔ اس کی نانی کی ہم جولی ہم پیشہ ایک ڈیرے دار رنڈی کی اکلوتی حسین و جمیل بیٹی تھی۔ یہ عورت جو بے حساب روپیہ کما چکی تھی چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی کسی مرد شریف سے بیاہ دے۔ خانم جان نے ایک بہانے سے یہ لڑکی میر صاحب کو دکھا دی اور پھر انھیں لکھا کہ چاہو تو اس لڑکی سے تمہارا نکاح کرا دوں۔ میر صاحب نے جب اس سلسلہ میں صاف جواب دے دیا تو تب کہیں جا کر ان کی محبت پر اسے بھروسہ ہوا۔

اتفاق دیکھئے چند ہی دنوں بعد اس لڑکی کی مسّی کی رسم ٹھہر گئی۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے پورا طائفہ تیاری کرنے لگا۔ عین تقریب کے دن خانم جان نے میر صاحب سے کہا کہ آج اپنا بنگلہ خالی رکھو اور چار شخص مل سکیں تو بہتر ورنہ دو ہی آدمی تجویز کر رکھو۔ دن بھر وہ عمدہ جوڑا بناؤ سنگھار اور کنگھی چوٹی میں مصروف رہی لیکن جب چلنے کا وقت آیا تو انگڑائی پر انگڑائی لے، لحاف اوڑھ پلنگ پر لیٹ گئی۔ مرزائی نے پوچھا تو کہا ابھی میرے سر میں شدت کا درد ہونے لگا اور اعضا شکنی سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھم گئے۔ ادھر صاحب تقریب کے پاس سے آدمی پر آدمی آنے لگے۔ مرزائی نے سب کو بھیج دیا، آپ رہ گئی لیکن خانم جان نے چار گھڑی رات گئے ہم قوم کا واسطہ دے کر اسے بھی بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میر صاحب کے بنگلے میں آگئی۔ میر صاحب نے پہلے ہی چار اجنبی

غریب مسلمانوں کو بلوا لیا تھا اور انھیں کھانا کھلا کر ٹھہرا لیا تھا کہ یہاں آج ایک شخص کا نکاح ہے اس سے فراغت کر کے آپ کو رخصت کر دوں گا۔ خانم جان آ گئی تو ان چار آدمیوں کے سامنے تعیین مہر کے بعد میر صاحب نے ایجاب و قبول کے الفاظ کہے اور انھیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔

شب وصال بہ لطف سے گزری۔ ان کا احوال تو سید حسن شاہ کی زبانی سننا اور قدم بقدم پر ترجمہ کے چلتے ہوئے فقرے جو جوانی کی صورت رہی ہیں اصل کتاب ہی میں پڑھنا مناسب ہوگا۔ مختصر یہ کہ میر صاحب کی ہوس رانی نے نیچ مچو نازک اندام خانم جان کو شدت کے بخار میں مبتلا کر دیا اور ہوتے ہوتے بخار کا رہا سہا گیا تھا وہ اصل کی صورت اختیار کر گیا۔ کسی کو شبہ ہوا نہ کسی کے کانوں کان خبر ہوئی میر صاحب اور خانم جان باقاعدہ میاں بیوی بن گئے۔

عشق است و ہزار بدگمانی تو یہ کہاں ممکن تھا کہ رقابت کا لفاظ ہوا کہ شعر و سخن کی دست و گریباں بھی آپس میں شروع ہو گئیں۔ ہر بار نرم جان غیب کی غزلوں ہی کو رجحان دل بنا لیا گیا۔ ادھر سے ایک غزل کی درخواست ادھر اس غزل کا جواب بھی سنا دیا جاتا غرض بڑے حریفانہ راز و نیاز کے معاملات ہونے لگے۔

پوشیدہ رشتہ ازدواج کے باوجود خانم جان کو میر صاحب کے پاس پہنچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ میر صاحب تو تھوڑی بہت آہ و زاری کے بعد جوانی کی نیند کے مزے لیتے لیکن خانم جان اکثر رات کے پاس کھڑی ہو جاتی اور میر صاحب کو بنگلے کے برآمدے میں سوتا ہوا دیکھا کرتی۔ ایک بار بارش ہونے لگی۔ میر صاحب جاگ گئے۔ قنات کی طرف نظر کی تو ایسا معلوم ہوا وہاں کوئی کھڑا ہے۔ آپ کی سمجھ بوجھ کا کیا کہنا! پہلا خیال یہی آیا کہ شاید چور ہے۔ طپنچہ تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر خیال آیا شاید خانم جان ہوں گی، آہستہ سے ایک شعر پڑھا، ادھر سے جواب آیا ؎

واقف نمی شود ز درد دل ناتوان من
اینک بلب رسید ز درد تو جان من

یہ ایک دم دوڑے خانم جان کو گود میں اٹھا لائے، دیکھا سر سے پیر تک بارش میں بھیگ چکی ہے۔ دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ جب نوازشات کرنے کے قابل ہوئی تو اپنا درد دل رو رو کر سنایا۔ مستقبل کے اندیشوں کا ذکر ہوا۔ میر صاحب نے بھی کچھ آہ و زاری کی لیکن پھر کچھ اور ہی مطالبہ کر بیٹھے۔ یہ سنتے ہی وہ نہایت برہم ہو کر بولی اس قدر بے حیائی کیا مزہ رہے معلوم ہوتا ہے کہ تم اسی بات کے طالب ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ میری کاہش جاں اور زوال روح کا باعث ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا اے میری جان! ایں ہمہ خلاصۂ معاملات است۔ اس نے کہا شاید ہو بھی مگر اس طرح اس کے پیچھے گرویدہ اور بندۂ ہوس ہونا از صاحبان لطافت مزاج و خوش طبع بیزار و منش نہایت نازیبا و ناگوار است۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ اپنا تو یہ عقیدہ ہے کہ ؎

گذشتہ خواب و آئندہ خیال است
غنیمت داں ہمی دم را کہ حال است

جواب دیا کہ ہاں ع

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا۔ قریب قریب ایک سال اس طائفے کو منگ صاحب کی خدمت میں بسر ہو چکا تھا۔ خانم جان اور بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خاکہ پوری طرح جمنے نہ پایا تھا کہ یک بیک خبر آئی کہ منگ صاحب کی بدلی کانپور سے کلکتہ ہو گئی۔ منگ صاحب نے طائفے کا حساب کتاب کر کے بی جان، خانم جان اور مرزائی کو انعام اکرام دے کر طائفے کو موقوف کر دیا اور کلکتے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ان دنوں میر صاحب اور خانم جان پر جو کچھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن پر ایسی واردات گزرتی ہو۔ رو رو کر دونوں کا برا حال تھا اور کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہ تھی۔ اعظم جی نے پھر تجویز کی کہ میر صاحب کے پاس جا کر کہنا چاہئے کہ اس سے پہلے بھی بی جان اسی صاحب سے وابستہ رہ چکی تھی۔ خانم جان کا یہ اندیشہ درست تھا کہ یہاں تو وہ منگ صاحب کی شرافت کی وجہ سے بچ گئی، ہر شخص منگ صاحب نہیں ہوتا۔ یہ حرام خور اپنے کسب پر مجبور کر دیں تو کیا ہوگا۔ میر صاحب نے خانم جان کو لے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ وقت پر گھوڑے نہ تھے اور سواری کی عملی صورت بھی نہ نکلی۔ ادھر طائفے نے پیا کر جانے کے لیے کشتی تلاش کرنی شروع کر دی۔ اب میر صاحب نے یہ تدبیر سوچی کہ طائفے کی بڑی کشتی کے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی تیز رفتار کشتی لے کر روانہ ہو جائیں، جیسے ہی موقع ملے، خانم جان بڑی کشتی سے میر صاحب کی کشتی میں منتقل ہو جائیں۔ دریائی سفر میں طائفے کو پیچھا کرنے میں بہت دشواری پیش آئے گی۔ یہ تجویز پکی ہو گئی اور میر صاحب نے ایک کشتی بھی کرایہ پر لے لی۔ آخری بار جو مجرا ہوا اس میں خانم جان نے ایسی ایسی پُر سوز غزلیں گائیں کہ مجلس کی حالت متغیر ہو گئی ؎

ما برفتیم تو دانی و دلِ غمخورِ ما
بخت بد تا بہ کجا می برد آبشخورِ ما

بدعا آمدہ ام ہم بدعا دست برار
کہ وفا با تو قرین باد خدا یاور ما

ہمت کہ ہمہ عالم بسرم جمع شوند
نتواں برد ہوائے تو بروں از سر ما

فلک آوارہ بہر سو کندم می دانی
رشک می آیدش از صحبت جاں پرور ما

گر بپرسد کہ کجا رفت ازیں جا حافظ
گو بزاری نفسے کرد و برفت از بر ما

سب کی حالت قابلِ بیان نہیں، حد یہ کہ ہر موقع پر ضبط و تحمل سے کام لینے والی خانم جان بھی جی کھول کر زار زار روئی اور پھر یہ غزل شروع کی ؎

فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

طائرِ گلشنِ قدسم چہ دہم شرحِ فراق
کہ دریں دامگہِ حادثہ چوں افتادم

من ملک بودم و فردوسِ بریں جایم بود
آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

کوکبِ بخت مرا ہیچ منجم نشناخت
یا رب از مادرِ گیتی بچہ طالع زادم

اس شعر پر سب بے قرار ہو گئے اور بار بار گاتی تھی اور اگلا شعر بھی تکرار کیا ؎

می خورد خونِ دلم مردمکِ چشم سزاست
کہ چرا دل بہ جگر گوشۂ مردم دادم

پھر ایک آہِ سرد کھینچی اور کہا، ہائے میری مٹی خراب ہوئی، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی!

ادھر قسمت کی گردش دیکھیے۔ منگ صاحب نے میر صاحب کو بلا کر کہا کہ پانچ مہینے سے حساب نہیں ہوا ہے اور کوچ عنقریب درپیش ہے اس لیے مہاجنوں کا حکم جلد کر دینا چاہیے۔ حکم تھا کہ مرگِ مفاجات، میر صاحب نے دن رات بیٹھ کر حساب کتاب درست کیا اور کاغذات صاحب کے ملاحظے میں پیش کر دیے۔ جس دن طائفہ چنار گڑھ کے لیے رخصت ہو رہا تھا اس دن صاحب کو کسی بات سے فرصت نہ تھی۔ انھوں نے کاغذات نہ دیکھے اور کہا کل دیکھوں گا۔ یہ سن کر میر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پھر سوچا ایک دو روز میں طائفے کی کشتی زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس میل چلے گی۔ میری کشتی چھوٹی ہے، بڑی کشتی کے چنار گڑھ پہنچتے پہنچتے میں اس کو جا لوں گا۔ قصہ مختصر اسی روز طائفہ رخصت ہوا۔ رخصتی کا منظر روزِ محشر سے کم نہ تھا۔ طائفہ کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو دھاڑیں مار مار کر رو نہ رہا تھا۔ میر صاحب بھی روتے روتے نڈھال تھے لیکن خانم جان کا عجب حال تھا۔ ایک سکوت کے عالم میں تھی۔ نہ آنکھوں میں آنسو تھا نہ لب پر کلام مگر چہرے پر ہوائیاں اڑی تھیں۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا مگر وہ ارادے ضبط، اگر ہونٹ ہل جاتیں تو دانت کاٹ کر پھینک دے۔ اگر زبان سے آہ نکلے تو زبان کھینچ ڈالے۔ پیشانی پر شکن نہ تھی، چہرے پر بل نہیں۔ سب اٹھ کر چلنے لگے تو میر صاحب نے بھی تھوڑی دور تک مشایعت کی۔ آخر مرزائی نے میر صاحب کے ہاتھ چومے اور ہر شخص انتہائی رنج و ملال کے ساتھ میر صاحب سے رخصت ہونے لگا۔ روتے روتے ہر ایک کی ہچکیاں بندھی تھیں۔ کوئی اپنے ہوش میں نہ تھا مگر وہ متحمل مزاج، وہ مستقل طبع، وہ دل کو مسوس کر رہ گئے۔ ادھر خانم جان اسی طرح مبہوت، خود فراموشی کے عالم میں تھی۔ واقعی تھی نہ کوئی لفظ کہتی تھی، ہاں جب سلام کر کے آگے بڑھی تو میر صاحب کے نزدیک سے ہو کے نکلی اور یہ مصرع آہستہ سے پڑھا ع

ما برفتیم تو دانی و دل غم خورِ ما!

اعظم جی کا طائفہ تو کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا لیکن اس کے روانہ ہونے کے چار روز بعد تک بھی حساب فہمی سے میر صاحب کو چھٹکارا نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً صاحب سے آٹھ روز کی مہلت لے کر ان سے چھوٹتے ہی تیز رفتاری سے کشتی میں بیٹھ چنار گڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کڑا مانک پور کے آگے انھیں دورا ملا۔ یہ سیدھے آگے بڑھ گئے اور بہت تیز رفتاری سے الٰہ آباد پہنچ گئے لیکن کہیں بھی اس بڑی کشتی کا پتہ نہ چلا۔ ملاحوں نے کہا کہ چاہے کوئی کشتی کتنی ہی تیز رفتار ہو اتنی مدت میں ہم سے آگے الٰہ آباد نہیں پہنچ سکتی۔ معلوم ہوتا ہے وہ کشتی دورا سے دوسرے رستے پر چلی گئی۔ میر صاحب مایوس اور نامراد لوٹ آئے۔

کانپور آ کر میر صاحب نے باقی حساب تیار کرنا شروع کیا۔ آگے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ چنار گڑھ سے ہونیر صاحب کی چٹھی منگ صاحب کے نام آئی کہ اعظم جی کا طائفہ یہاں پہنچ گیا اور میں نے بی جان کو نوکر رکھ لیا لیکن اعظم جی کی بیٹی خانم جان کو یہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ وہ یہاں آتے ہی بیمار پڑ گئی۔ اس کے علاج کے لیے یہ لوگ اسے لکھنؤ لے گئے ہیں۔ یہ اطلاع پا کر میر صاحب ایک ہرکارے کو لکھنؤ بھیجنا ہی چاہتے تھے کہ صاحب کے نام ایک عرضی اور میر صاحب کے نام ایک خط مرزائی کا پہنچا کہ کانپور سے نکلتے ہی راستے میں خانم جان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ چنار گڑھ پہنچ کر حالت بگڑ گئی۔ علاج کے لیے اسے ہم لکھنؤ لے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے میر صاحب کے نانا نے اس کا علاج کیا تھا اس سے اسے صحت ہوئی تھی۔ اب بھی بار بار وہ یہی کہتی ہے کہ بڑے حکیم صاحب کے علاج سے مجھے صحت ہو جائے گی، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ بڑے حکیم صاحب کو کسی طرح میر صاحب کے ہمراہ لکھنؤ روانہ فرمانے کا انتظام فرمائیں۔ میر صاحب نے اپنے نانا کو لے کر لکھنؤ جانے کی

تیاری شروع کی تو صاحب نے اجازت تو دے دی لیکن حساب فہمی کے بغیر جانے سے منع کیا۔ ادھر وہ دن رات حساب صاف کرنے میں مصروف ہو گئے اور روز بروز دن نکلتے رہے۔ حساب فہمی سے فراغت ہوئی تو نانا صاحب نے احرام سفر باندھتے میں اور کچھ دن نکال دیے۔ مختصر یہ کہ جب وہ لکھنؤ پہنچے ہیں، حد درجہ حساس اور ضابطہ خانم جان فراق کے جان گداز صدمے اٹھا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر چکی تھی۔ یہاں باورچی کے بڑے بیٹے نے میر صاحب کو خانم جان کا وہ خط دیا جو اس نے مرنے سے ایک روز پہلے لکھ کر اسے دیا تھا۔ اس میں شرح فراق کے بعد وصیت کی تھی کہ میری جان تو جیتی نظر نہیں آتی۔ میرے بعد تم میرا غم نہ کرنا اور میرے غم میں اپنے آپ کو ہلاک نہ کرنا۔ پھر اپنی محبت کی سوگند دی تھی کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا کہ اسی میں میری خوشی ہے۔ میر صاحب بہت روئے پیٹے بجھے چلائے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، ناچار کلیجے پر صبر کا پتھر رکھ کر اپنی محبوبہ کی وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی زندگی کے باقی دن گزارنے لگے۔

خلاصہ بہ خلاصہ ہی ہے۔ اس میں اصل کا لطف کہاں، اس کج مج بیانی پر اپنی اندیشہ ہی نہیں یقین ہے کہ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہوگی۔ لیکن اردو ادب کے اس شہ پارے کو متعارف کرانے کی اور کوئی صورت بھی تو اس کج مج بیاں کو نظر نہیں آتی۔

اس ناول میں یوں تو کئی کردار ہیں لیکن اہم کردار تین ہی ہیں، منگت صاحب، میر صاحب اور خانم جان اور ان ہی کے گرد یہ پورا قصہ گھوم رہا ہے۔

سب سے پہلے منگت صاحب ہی کو لیجئے۔ آدمی عیاش بھی اور اوباش بھی لیکن اس کے شریف ہونے میں کیا کلام ہے اور یہ بھی تو دیکھیے کہ اس وقت کی ہماری اونچی سوسائٹی میں یہ عیب عیب کب سمجھا جاتا تھا، یہ تو عین صاحب امارت، مہذب اور شائستہ ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے چھوٹے بڑے سب امیرانہ قسم کے شغلوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بیچارہ تو ان ہی لوگوں کی نقالی کر رہا تھا لیکن اس کی یہ شرافت تو کسی طرح بھلائے نہیں بھولتی کہ خانم جان کے ہر طرح اس کے قبضہ و اختیار میں ہونے پر بھی اس نے زور اور زبردستی کا سلوک اس سے روا نہ رکھا بلکہ اس کے جذبات اور احساسات کا پورا پورا احترام کیا۔ اسے بھی دوسری عورت کے برابر تنخواہ دے کر صرف اس کی شوخ و شنگ اداؤں اور بے نظیر ذہانت و ذکاوت ہی سے جی بہلانے پر اکتفا کیا۔ بعض بدگمان طبائع کی طرح شاید آپ بھی اس واقعہ پر شبہ کا اظہار کریں، اسی لیے منشی سجاد حسین نے بحیثیت مترجم اس واقعہ پر نوٹ لکھنا ضروری سمجھا کہ:۔

> "ایک صاحب نے مجھ سے یہ کتاب لے کے دیکھی، بہت محظوظ ہوئے اور خانم جان
> کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد تعجب سے فرمانے لگے، منگت صاحب نے خانم جان
> کو چھوڑ دیا ہوگا اور وہ عاصمہ رہی ہوگی؟ میں نے کہا، وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں۔"

پھر اسی واقعہ کا مقابلہ ہمارے حاکموں، رئیسوں، فاتحوں اور مجاہدوں کی ہوس رانیوں کی ہولناک داستانوں سے کیجیے۔

دور کیوں جائیے، قریب قریب اسی عہد کی ایک معروف ہستی "مجاہد" اور "رحمۃ اللہ علیہ" اور "آثار الصنادید" کے حاشیہ لکھنے کے ساتھ یاد کی جانے والی ایک تاریخی شخصیت کے طرزِ عمل سے سمجھئے اور اس پر بھی اپنے "مشرقی" اخلاق اور کردار کے مدح خواں رہیے۔ محمد شاہ رنگیلے کی ایک بیٹی تھی حضرت بیگم، حسن و جمال میں ڈھونڈے سے اس کا ثانی نظر نہ آتا تھا۔ اس کی سولہ سال کی عمر تھی کہ عالمگیر ثانی نے ساٹھ سال کی عمر میں اس سے زبردستی شادی کرنی چاہی لیکن اس نے صاف انکار کیا اور زیادہ دق کرنے پر زہر کھا لینے کی دھمکی دی۔ اس پر خفا ہو کر عالمگیر ثانی نے اسے قید خانے میں ڈلوا دیا۔ ابھی وہ قید ہی کی سزا بھگت رہی تھی کہ احمد شاہ ابدالی قہرِ خداوندی کی صورت میں دلی پر نازل ہوا۔ امراء اور عوام کو طرح طرح کی اذیتیں دے دے کر ان کا مال و منال ان سے چھیننے کے سوا ان مجاہد اور غازی صاحب نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی حسین بہو بیٹیاں بھی ان سے چھینیں۔ ان میں حضرت بیگم بھی پکڑی ہوئی آئی۔ ساٹھ سالہ عالمگیر ثانی میں انسانیت کی اتنی خو بو باقی تھی کہ اس نے حضرت بیگم کے انکار پر اسے قید میں ڈلوا دیا لیکن ۶۵ سالہ مجاہد صاحب پر اس کی آہ و زاری کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور آپ نے حضرت بیگم سے نکاح پڑھوا ہی دیا!

اپنے ملازموں سے منگ صاحب کا سلوک بھی مثالی ہے۔ میر صاحب اس کے خانگی تنخواہ یاب ملازم ہیں لیکن وہ ان سے برابری کا سلوک کرتا ہے۔ عشق و طرب کی محفل ہو کہ کاروبار کی مجلس، انھیں ہمیشہ اپنے برابر کرسی دیتا ہے۔ وہ میر صاحب کی شرافت، ایمان داری اور سلیقہ مندی کا معترف اور دل سے ان کا قدر دان ہے۔ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اسے اپنی داشتہ اور ملازم عورتوں کے سامنے یہ کہتے بھی باک نہیں کہ میرے منشی صاحب میرے سچے خیر خواہ ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ لائق ہیں اور معدودِ چند بالغ نظروں میں ہیں۔ میں ان کے ان ہی صفات کی بنا پر ان سے ڈرتا ہوں۔ حالانکہ عام طور پر کم ظرف آدمی اس قسم کی عورتوں کی موجودگی میں اپنے کو ایسے پھیلتے اور پیر پھیلاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ خوش طبعی اور ظرافت منگ صاحب کی طبیعت کا ایک بڑا وصف ہے۔ وہ اپنے ملازمین سے برابری کی چوٹیں اور چہلیں کرتا ہے۔ منگ صاحب کے بعد آنے والے انگریزوں سے اس شریف انگریز کے برتاؤ کا مقابلہ کیجیے جو ہندوستانیوں کو منہ لگانا گوارا نہ کرتے تھے اور ان سے میل جول کو اپنے لیے عار سمجھتے تھے اسی لیے منشی سجاد حسین بحیثیت مترجم ایک فٹ نوٹ میں بے اختیار اس کو خراجِ تحسین ادا کر گئے ہیں :۔

”حسن شاہ اور خانم جان تو صاحب معاملہ تھے مگر صاحب بہادر بڑے مسخرے تھے۔ جہاں دیکھیے ٹھٹھے پڑتے ہیں۔ افسوس اب ایسے انگریز نہیں آتے ورنہ ہم بھی بتا دیتے۔“

منگ صاحب بڑے دل کا آدمی ہے۔ شاہ خرچ ہے، فیاض ہے، وہ روپے پیسے کو عزیز رکھنے والا حریص آدمی نہیں، انسان دوست اور انسانیت نواز آدمی ہے۔

منگ صاحب اس وقت کی سب سے مقبول ہندوستانی زبان اردو میں نہایت روانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہی تھا لیکن اس کے سوا اسے فارسی زبان اور فارسی ادب پر بھی اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔

اب ناول کے ہیرو سید حسن شاہ کو لیجیے۔ سید زادے ہیں، میر صاحب کہلاتے ہیں، اپنے زمانے کے لحاظ سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھیں سچ مچ خانم جان سے محبت ہے لیکن ان کی محبت کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ لاکھ پاکباز سہی، پھر بھی

محبت کے بارے میں ان کا تصور جسمانی اتصال اور مادی وصال سے آگے نہیں بڑھتا۔ انھیں ہوس کار تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ہوس سے ان کی محبت خالی نہیں۔ محبت وہ بے شک کرتے ہیں لیکن بے محابا محبت اور اس راہ میں اپنی متاعِ عقل و دین لٹانے کی لذت سے وہ نا آشنا ہیں۔ بقول علامہ نیاز فتح پوری: —

"فسانہ اور نشتر دونوں کے مطالعے کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ میں اشک باری پر مجبور ہو گیا ہوں بلکہ اس کے ساتھ عقیدت کی بھی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی اور ان کے مصنفوں کو میں نے بہت برا بھلا کہا کیونکہ ان دونوں کے ہیرو قریب قریب ایک ہی قسم کے کردار رکھنے والے ہیں .... ناول نشتر میں جب ہیروئن نے جان دی تو میں واقعی بہت متاثر ہوا لیکن میرا تاثر اس سے زیادہ یہ تھا کہ جب حضرت قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے اور اتفاق سے ان کا جوتا گڑھے میں گر گیا تو ان کو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوئی کہ یہاں سے ننگے پاؤں کیونکر جاؤں گا اور آخر کار ایک مجاہدانہ عزم کے ساتھ انھوں نے جوتا نکال کر اس مہم کو سر کر ہی لیا۔"

سید حسن شاہ معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ ذکاوت اور ذہانت میں وہ خانم جان کے پاؤ پاسنگ بھی نہیں۔ منکاٹ صاحب کی موجودگی میں خانم جان نے جیسی خوب صورت شوخیاں کی ہیں ان کے جواب میں میر صاحب کی بھونڈی حرکتیں دیکھ کر ان کی عقل و دانش پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب میں انھوں نے اپنے وہ خط بھی درج کیے ہیں جو انھوں نے خانم جان کے نام لکھے تھے۔ غالب کی زبان میں یہ خط محمد شاہی رسمِ مکتوب نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ وہی گز گز بھر کے پُرتکلف آداب و القاب اور وہی مقصدِ مکتوب سے دور پُرتصنع مضمون آرائی۔

سید حسن شاہ اور خانم جان کے کردار کا یہ فرق بھی بھلایا نہیں جا سکتا کہ سید حسن شاہ نے سید زادہ ہونے کے باوجود، لاکھ پس و پیش کے ساتھ سہی، اپنی محبوبہ کو صاحب کے نذر کرنے سے دریغ نہیں کیا اور خانم جان نے باوجود طوائف زادی ہونے کے اپنی عزت و آبرو اور اپنی عفت و عصمت کو بچانے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھی!

خانم جان طوائف زادی سہی لیکن عفت و عصمت کے معاملے میں پوری شریف زادی ہے۔ ہرجائی ہونا تو ایک طرف رہا، محبت کے بارے میں اس کا تصور نہایت درجہ اونچا اور پاکیزہ ہے۔ اس کی محبت میں گہرائی ہے، دردمندی ہے، سوز ہے، تڑپ ہے۔ اس کے نزدیک محبت صرف جسمانی اتصال اور مادی وصال کا نام نہیں، روحانی اتحاد اور دلی ملاپ کا نام ہے — سید حسن شاہ کی محبت اور اپنی محبت کے فرق کو وہ بھی محسوس کرتی ہے اور اس پر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہے۔ وہ جتنی صورت شکل کی حسین و جمیل ہے، اتنی ہی ذکی اور ذہین بھی ہے۔ اسی ذکاوت اور ذہانت کا نتیجہ اس کی بے پناہ شوخی اور پُرلطف شرارت ہے۔ وہ بے محابا محبت کرنا بھی جانتی ہے اور حد درجہ ضبط و تحمل سے کام لینا بھی اسے آتا ہے۔ وہ بے انتہا حساس بھی واقع ہوئی ہے اور اسی زود حسی نے آخر کار اس کی جان پر بنا دی۔ طبیعتِ عشق کی خوددار بھی ہے، خانم جان محبت کی آگ میں سراپا جلنے کے باوجود بہت خوددار بھی ہے۔ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی رسوائی ہو۔ حد یہ ہے کہ اسے اپنے محب اور محبوب

کبھی کوئی ایسی حرکت گوارا نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی توہین ہوتی ہو۔

خانم جان شعر و سخن کا بڑا اچھا مذاق رکھتی ہے۔ وہ برمحل اتنے اچھے شعر پڑھتی اور اتنی اچھی غزلیں گاتی ہے کہ اس کے اس پاکیزہ ادبی ذوق پر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ دیوانِ حافظ کی تو وہ گویا حافظ ہے۔ بعض موقعوں پر اس نے اتنی برمحل غزلیں منتخب کی ہیں گویا وہ غزلیں اسی موقع کے لیے لکھی گئی تھیں۔ میر صاحب کے خطوط کے مقابلے میں اس کے خطوط رسمی تکلف سے عاری ہیں۔ ان خطوط کے القاب و آداب مختصر مگر بڑے جاندار ہیں۔ ان میں کسی رسمی تکلف اور رکھ رکھاؤ کے بغیر براہِ راست حرفِ مطلب زبانِ قلم پر آتا ہے۔ خانم جان کے جملوں کے ایک ایک لفظ سے لکھنے والے کا خلوص، اس کے جذبے کی گہرائی اور اس کی دردمندی جھلکی پڑتی ہے۔ القاب کے اختصار اور راست مطلب نگاری کے لحاظ سے غالب کے خطوط سے یہ خط بہت ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خانم جان ہر طرح محبت کرنے اور جان چھڑکنے کے قابل کردار ہے۔ سید حسن شاہ خوش بخت تھے جو ایسی پیاری شخصیت کو چاہتے اور اس سے چاہے جانے کی سعادت سے سرفراز ہوتے۔

اس مضمون کی ابتدا میں صاحبِ "نشتر" پر جناب بشیر علی صدیقی کے مضمون کا ذکر آ چکا ہے۔ اس میں اور سب باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن "نشتر" کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں صدیقی صاحب نے سخت ناانصافی سے کام لیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ "ناول کے موجودہ معیار پر یہ "نشتر" کو نہیں پرکھنا چاہیے بلکہ ایک عشقیہ قصہ سمجھ کر وقت گزاری کے لیے پڑھنا چاہیے۔" آپ اس ناول پر جناب نیاز فتح پوری کی اٹکل بازی دیکھ چکے۔ اب عزیز احمد کی رائے ملاحظہ فرمائیے جو بڑی حد تک اس ناانصافی کی تلافی کر دیتی ہے۔ عزیز احمد اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں:-

> "......نشتر ایک تماش بین کی سرگذشت ہے جو غالباً میر تقی میر کا ہم عصر تھا اور جس نے فارسی میں اپنی حیاتِ معاشقہ کے متعلق یہ بے مثل کتاب لکھی۔ سجاد حسین کسمنڈوی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ معلوم نہیں اصل فارسی کتاب کہیں باقی بھی ہے یا نہیں لیکن اُردو ترجمہ اُردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اور اس صنف کے بہترین مغربی ناولوں کے مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔ نقطۂ نظر تماش بین کا ہے لیکن اپنی نفسیاتِ عشق، اپنے والہانہ جذبے کے بیان میں مصنف نے کمال کر دیا ہے۔ قصہ کی برجستگی و رنگینی "داستانِ غم" سے کم پایہ نہیں۔ تفصیلات ایک ایسی زندگی پر سے پردہ اٹھاتی ہیں جو اگر ناول نہ لکھا جاتا تو شاید ہمیشہ پوشیدہ اور نامعلوم رہتی۔ انگریزی قبضے کے ابتدائی زمانے میں شرفا انگریزوں کی نوکر پیشہ و [illegible] دونوں طبقوں کا ادبی ذوق، حافظ کی غزلوں کا زندگی پر اثر، کوئی اور کتاب اس زمانے کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالتی اور اس پس منظر سے مصنف اور خانم جان کے پاکیزہ اور والہانہ عشق کا جو نقشہ ابھرتا ہے، وہ دنیا کے افسانہ کے چند بہترین نقشوں میں سے ہے۔"

حیدرآباد کے مزاح اور طنز نگار

نصیر الدین ہاشمی

اُردو زبان میں مزاح اور طنز نگاری کا آغاز نظیر اکبر آبادی اور غالب سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اخبار اودھ پنچ کے مضمون نگار اس شعبۂ ادب کے امام نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بعض ہجو گو ایسے گزرے ہیں جن کو اس شعبہ میں منسلک کیا جاسکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں ادب کی اس شاخ نے ترقی کے جو مدارج طے کیے ہیں اس کو مغربی ادب کا رہین منت قرار دینا چاہیے۔

اُردو زبان کے مزاحیہ نگاروں پر تبصرہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اُردو کی عمومی تاریخ سے قطع نظر جس طرح صوبہ وار تاریخیں دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، مدراس میں اُردو، گجرات میں اُردو، بنگال میں اُردو، بہار میں اُردو زبان اور ادب کا ارتقا وغیرہ لکھی گئی ہیں اسی طرح مزاحیہ نگاری کو بھی صوبے کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہیے۔ اس لیے یہاں ہم حیدرآباد (آندھرا) کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

حیدرآباد کی مزاح اور طنز کا آغاز بھی ہجوگوئی سے ہوا ہے۔ قطب شاہی دور سے قطع نظر آصفی دور میں کئی شاعر ہجوگوئی کے لیے مشہور ہیں مگر ہم ان کا تذکرہ نہیں کریں گے کیونکہ ان کا مقصد محض ہجوگوئی تھا طنز اور مزاح نہیں تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آئے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کے متوسل ہو گئے، ماہوار رسالہ دبدبۂ آصفی کے ایڈیٹر رہے۔ حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی چند تصانیف یہاں بھی   ہوئیں اس لیے سرشار کو اس شعبہ کا اولین معمار تسلیم کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

جدید دور کے پیش رو عظمت اللہ خاں مرحوم، مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم ہیں ان کے ساتھ اور بعد کئی اصحاب اس زمرہ میں شامل ہیں۔ ہم ایک کے بعد دیگرے ان کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

(۱) عظمت اللہ خان

عظمت اللہ خان پانچ سال کی عمر میں حیدرآباد آئے۔ یہاں ان کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور مددگار ناظم تعلیمات پر تقرر ہوا اور ۱۳۴۶ھ میں جوانی ہی میں دنیا سے چل بسے۔ جس طرح عظمت اللہ خان جوان تھے اسی طرح ان کے ادبی کارنامے بھی جوان ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ نثر اور نظم دونوں کی خدمت کی۔ مزاحیہ نگاری میں ان کو حیدرآباد کا اولین معمار قرار دینا چاہیے۔ انھوں نے سدا بہار پھول لگائے ہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری کے لیے ہندی بحریں استعمال کر کے ایک جدت پیدا کردی۔

ان میں مزاحیہ مضامین لکھے، ادبی تحقیق فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی مزاحیہ طرز پر مضامین لکھے۔ عظمت اللہ خان کے مضامین سنجیدہ مزاح میں شامل کرنے کے قابل ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ہنسی نہیں آتی بلکہ تبسم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انھوں نے سیاسی، معاشرتی اور معاشی موضوعات کو اپنی مزاحیہ نگاری کا میدان بنایا تھا۔ شستہ، دلکش، شگفتہ انداز میں خیال آرائی کی۔ خان صاحب نے اپنی نثر نگاری سے اردو نثر میں ایک نئی طرز کی بنیاد رکھی اور ایک نئی طرح ڈالی۔ خان صاحب کی مزاحیہ نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "اچھا اب ہم افراتفری کا حلیہ بیان کرتے ہیں بیان تھا۔ خان کی بیوی آئیں۔ ساس سسر ہو کے چوٹ بلا بیٹھیں۔ کیا کریں مجبور تھیں، شوہر کے صاحبزادے اور ساس کی خدمت کرنے کے لیے بیٹے اور بہو کو رو رو کر چھوڑنا پڑا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایسی بہو بیاہ لائیں جو بیٹے کی دلہن کہلائے مگر سسر کے پارلیمنٹ سے کورے رہے مگر یہ مانیں۔ اچھا بیٹے کی شادی کیوں کر نہ کریں۔ اس کے گھر کا آباد ہونا، اس کا سہرا دیکھنا اور پوتے کو گود میں کھلانا بھی سب چاہتی ہیں، بڑی بی کا اب یہی سہارا تھا۔ غرض صبر و شکر کر کے رات کاٹی اور ان بیاہی بیٹیوں اور صاحب خانہ ہی سے حملہ اور مدافعت کا مشورہ کیا۔ صبح میں گھر کا نقشہ روزانہ کے کاروبار کے اصول پر یہیں قدمی شروع کر دی جائے۔"

(۲) مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا صاحب کے خاندان کے افراد دلی سے حیدرآباد میں تھے۔ مرزا صاحب ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے اور اولاً سررشتۂ تعلیمات میں مدرس مقرر ہوئے پھر سررشتۂ عدالت میں تبدیل ہو گئے۔ منصف، مجسٹریٹ، ناظم عدالت، سیشن جج اور انسپکٹنگ افسری کی خدمات نہایت نمایاں انجام دے کر وظیفہ حاصل کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں کئی عدالتی کمیٹیوں میں بھی مامور کیے گئے۔ ملازمت اور رعایت کے بعد سینکڑوں مضامین لکھے جن کے سات مجموعے خود شائع کیے اور شاعری کا ایک مختصر مجموعہ شائع کر دیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اولاً بنات النعش کے نام سے مضمون لکھتے رہے جو ایک تاریخی اور ادبی رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ ان کے قریبی عزیز حیدرآباد سے شائع کرتے تھے۔ اس کے بعد جب رسالہ اردو میں ان کا مضمون مولانا نذیر احمد کے متعلق شائع ہوا تو پھر ان کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔ اردو کا ہر ایک رسالہ ان سے مضامین طلب کرنے لگا۔ مضامین بھی لکھے اور ان کے مجموعے بھی شائع کیے۔

بعض اصحاب مرزا فرحت اللہ بیگ کا مقابلہ رشید احمد صاحب اور پطرس اور عظیم بیگ چغتائی سے کرتے ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ پطرس کی مزاحیہ نگاری میں ذہنیت تو بلند نظر آتی ہے مگر زبان کی سلاست، روانی، شادابی اور فنکاری کے لحاظ سے مرزا صاحب کو ترجیح دینا ناگزیر ہے۔ رشید احمد صاحب کے مضامین میں تصنع اور آورد نظر آتی ہے۔ مرزا صاحب کے تمام مضامین آمد کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں تصنع نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کے مضامین میں متانت، شائستگی اور خوش مذاقی پائی جاتی ہے ان سے انبساط اور ذہنی بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اس میں وہ صراحت کرتے ہیں:-

"مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر بھی ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے، بیان سادہ ہے، تصنع نام کو نہیں، ٹھیٹھ دلّی کی زبان لکھتے ہیں۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔ مرزا صاحب کو فنِ مصوری میں بھی دخل ہے اس لیے ان کی نظر چیزوں کے مختلف پہلوؤں پر کھلے ہوں یا ڈھکے وہیں پڑتی ہے جہاں نکتے کی کوئی بات ہوتی ہے اور جس پر سے عام نظریں سرسری طور سے گزر جاتی ہیں۔ ان کی اسی نظر کی بدولت مضمون میں جان پڑ جاتی ہے اور ان کا قلم خط و خال درست کر کے ایک اور ہی رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اگرچہ اولاً مزاحیہ رنگ میں مضمون نویسی شروع کی مگر بعد میں ادب کا کوئی ایسا موضوع نہیں رہا جس پر انھوں نے اپنے نقش ثبت نہ کیے ہوں۔ سوانح حیات، سفرنامہ، مختصر افسانہ، سماجی اصلاح، سیاسی نظریے اور ادبی تنقید وغیرہ مختلف النوع مضامین پر انھوں نے اپنے خاص انداز میں خامہ فرسائی کی ہے اور بہترین نقش چھوڑے ہیں۔ یوں تو ان کے سیکڑوں مضمون زندگی جاوید کی حیثیت رکھتے ہیں مگر مولانا نذیر احمد کی سوانح حیات اور دہلی کا مشاعرہ، دیوانِ یقین اور دیوانِ نظیر کے مقدمات، پھول والوں کی سیر ایسے مضامین ہیں جن کو اردو ادب میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔

حیدرآباد میں مرزا فرحت اللہ نے اپنی زندگی کے پورے چالیس سال بسر کیے یعنی ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آکر ملازم ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں یہاں سے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ تیس سال سے زیادہ انھوں نے سرکاری ملازمت میں بسر کیے اور وہ بھی عدلیہ ہی میں رہے۔ بیانات لکھتے رہے، وکیلوں کی بحث اور جرح سنتے رہے اور فیصلے کرتے رہے اور اس زمانے میں ادب کی خدمت بھی کرتے رہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مرزا صاحب نہ صرف نثر کے میدان کے شہسوار تھے بلکہ نظم کی فضا میں بھی پرواز کی ہے اور اپنے دیوان کو "میری شاعری" کے عنوان سے شائع فرمایا ہے۔ مرنے سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ایک ادبی ادارہ "اردو مجلس" کے نام سے قائم کیا تھا ہر ماہ ایک مرتبہ اس مجلس کا جلسہ ہوتا اور کوئی صاحب مضمون سناتے اور اس کے بعد شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ یہ مجلس حیدرآباد کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ مرحوم کے بعد بھی یہ ادارہ باقی ہے اور آج تک اردو کی خدمت کر رہا ہے۔

مرزا صاحب کی نثر اور نظم کا نمونہ پیش ہے:-

"مجھ کو مولوی صاحب کی طرزِ تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اوّل تو میرے لیے ابتدا ہی میں خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھسم ٹھس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا۔"

(ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی)

بہ حال تاریخ پیشی آ گئی اور میں کتابوں کا بستہ بغل میں مار ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہنچ گیا۔ پہلی پیشی میرے ہی مقدمہ کی تھی۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس چالیس کتابیں ایک [illegible] [illegible] کھڑی ہیں، ارتی کا سرا مولوی قطمیر صاحب کے ہاتھ میں ہے اور مولوی صاحب [illegible] بول بول کر ایک ایک لا کے [illegible] کر رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس وقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا کیا آپ ان عالمین کے وکیل ہیں؟ انہوں نے کہا "ہاں"۔ میں نے کہا کیا مناسب نہ ہوگا اگر ان [illegible] کو عدالت کے کمرے سے خارج کر دیا جائے [illegible] [illegible] بالکل قانون کے مطابق ہوتا تھا۔"

مرزا صاحب کی مزاحیہ شاعری کا رنگ ملاحظہ ہو:-

جناب شیخ ٹھیک سے پکے جب [illegible] کی جنت کا
[illegible] کو صدمہ ملا ہے کیا انہیں عبادت کا

نماز عصر کا وقفہ ہوا ہے وعظ میں زاہد
چلو بھی آ [illegible] کہ ہے یہ وقت فرصت کا

اگر اس کی خدمت کا [illegible]
جناب شیخ کو بھی [illegible] ہے حوروں کی خدمت کا

[illegible] صاحب کو بلایا تھا کسی نے
[illegible] رکھی ہے [illegible] پروا رہے جنت کا

کلکٹر ہو گئے [illegible] پڑھ کے قسمت سے [illegible]
[illegible] ہے [illegible] کا حجاب [illegible] کا

چلو لیڈر ہی بن کر جیل میں [illegible] بہت کام
[illegible] بند ہے دروازہ جنت کا

ابھی [illegible] سے [illegible] بھی غائب ہیں
غرض [illegible] ہے [illegible] پہ رحمت کا

(۳۴) ناکارہ

محمد شفیع الدین صاحب نام اور ناکارہ تخلص، حیدرآباد کے متوطن۔ نظام کالج میں تعلیم پائی جبکہ اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ خانگی مجبوریوں سے تعلیم کو مکمل نہ کر سکے۔ طالب علمی کے زمانہ سے مضمون نگاری کا شوق رہا۔ اخبار رہبر دکن سے بھی تعلق رہا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "صمدانی" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

ناکارہ صاحب مزاحیہ افسانے، ڈرامے دونوں لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں قہقہہ نہیں ہوتا۔ وہ تبسم آمیز ہوتے ہیں۔ کسی میں طنز ہوتا ہے، کسی کسی کے خاکے ہیں، ایسے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے ہم ہنسنے لگتے ہیں۔ کسی مضمون میں اپنے گرد و پیش کے واقعات اور تجربات کی باتیں اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہیں وہ اپنی ذکاوت اور فراست سے انشا پردازی کو اتنا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد میں غیر معمولی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے مضامین میں طنز اور ظرافت میں خوشگوار ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور کبھی طنز ناگوار اور تلخ ہونے نہیں پاتا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

سب کچھ آپ اور بہت مصنوعی بال لگانے اور ساڑھی اور جمپر پہننے کے بعد میں کتنا حسین معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے آپ پر عاشق ہو جانے کو بے اختیار جی چاہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غلمان حور کے بھیس میں رستہ بھٹک کر خدا کی اس دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد میرے سچ مچ عورت ہونے کے متعلق بالکل مطمئن ہو چکی ہے۔ لیکن پھر بھی کہتے ہیں کہ میں عورت ہوں نہ مرد۔ جس سے دل میں کھٹکا لگ رہا ہے۔ دو ان تماشائیوں کو میری جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان سیاہ کاروں کی زنفیاتی چشمک بازی کی طرف توجہ کریں لیکن میں نے نسائیت کی کیسی ہو بہو نقل اتاری تھی۔"

(تماشے پہ تماشا)

"شام کو وہ لوگ اطمینان کی سانسیں اور مہربان کی دعائیں لیتے ہوئے رخصت ہوئے —
"جناب اس میں شک نہیں کنوارے آئے تھے اور شادی شدہ واپس گئے لیکن مہربانو کو اس کا افسوس تھا اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی کہ اکیلے آئے اور اکیلے ہی گئے .... اور صمدانی نے ہمارے حق میں دعائے خیر کی۔ خدائے پاک دولہا دلہن کو ایک سال تک صبر جمیل عطا فرمائے .... (رس شہاب ثاقب)

(۴) محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد دنیائے اردو میں ایسے مشہور ہوئے کہ کئی اصحاب نے ان کے تخلص کو اختیار کیا اور بعضوں کا نام بھی محمد حسین رہا۔ چنانچہ حیدرآباد کے مولوی محمد حسین آزاد تخلص، اپنی تمام عمر درس و تدریس میں بسر کی۔ سررشتۂ تعلیمات میں ملازم رہے، بعد وظیفہ اسی ناریسی کے مشغلہ میں اب تک مصروف ہیں۔ شاعری میں اکبر کا رنگ اختیار کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے، پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی۔ حضرت امجد نے آپ کی شاعری کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:

"اگر اکبر مرحوم کی شاعری عالم وجود میں نہ آتی تب بھی ہمارے آزاد صاحب اس طرح آزادانہ اور ظریفانہ شعر کہا کرتے۔ ان کی تمام نظمیں ظرافت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔"

حضرت امجد کی یہ صراحت حقیقت پر دال ہے۔ "خیالات آزاد" کے نام سے آزاد صاحب کی نظموں کے دو حصے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بالک لوریاں اور مسدس آزاد بھی آپ کی تصانیف میں شامل ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

سفارش

یہاں سے اپنی گاڑی ہم بچا کر کیسے لے جائیں — جدھر دیکھو ادھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا
لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت — لگا دو زور سے تم اس کے اک کوڑا سفارش کا

سفارش کا سہارا ہے نہ بھولو تم سے یہ کہنا
ہوا ہے یہ جہاں اب کرنے لگا گھوڑا سفارش کا

زمانہ کا سبھی عالم بینت ... نہ نکلے گا
لگاؤ گے نہ تا وقتیکہ تم جوڑا سفارش کا

سفارش سے تو اونچے اونچوں کو بھی دکھایا ہے
بڑا ہی سورما ہے جس نے منہ موڑا سفارش کا

یہ دل کہہ رہا بار بار لکھو بخشش بیاد برگشتر
قیامت میں بھی کام آئے گا ہم نے کب چھوڑا سفارش کا

پیسہ

غضب کا ہے جو بن ملا کا ابھار
اسی نشہ ذرا کے یہ پیسہ برس

یہ سب کچھ ہے اس سے حاصل ہوا
نہیں تجھ کو اس کی ہوش ہے ہوس

تو کس پر نہ اس کا نشہ ہوا
نہ سمجھی کہ تو نفس کی فریاد رس

تو دنیا ہے دل اور وہ لیتی نہیں
کہاں اس کی نظروں میں اب خار و خس

نہ دلدار ہے یہ نہ ہے دل ربا
یہ زردار ہے زر ربا ہے یہ بس

یہ بس ہے نہ بگھلے گی زر کے بغیر
یہ بس ہے نہ ہوگی کبھی ٹس سے مس

(۵) عصمت اللہ بیگ

عصمت اللہ بیگ، مرزا فرحت اللہ بیگ کے رشتہ دار تھے۔ ان کی ہی طرح نظم اور نثر میں مزاح کے گل کھلاتے رہے مگر فرق یہ ہے کہ عصمت اللہ بیگ نے زیادہ تر شاعری میں مزاحیہ نگاری کی ہے، نثر کا حصہ کم ہے اور فرحت اللہ بیگ صاحب نے نثر میں زیادہ مزاحیہ نویسی کی ہے۔

عصمت اللہ بیگ کی پیدائش تو دہلی میں ہوئی مگر کم سنی ہی میں حیدرآباد آگئے اور یہاں تعلیم پائی، ملازمت کی اور ریٹائر ہو کر وظیفہ حاصل کیا۔ انہوں نے مزاحیہ شاعری سے اردو زبان کی خدمت کی۔ نظم کے ساتھ نثر میں بھی مزاحیہ پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے سماجی مسائل کو مزاحیہ رنگ میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ "انواع تبسم" ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اس کے دیباچہ نگار "گوپال راؤ ایکبوٹے" نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

> "عصمت کا انداز بیان بہت ہی دلکش اور ان کا اسلوب کافی شگفتہ ہے۔ وہ انگریزی الفاظ کو بھی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح کہ اشعار کا مزاحیہ رنگ اور زیادہ نکھر جاتا ہے۔ سیاسی موضوعات پر بھی ان کی نظمیں اور غزلیں اسی طنز و ظرافت اور اشاراتی رنگ کی حامل ہیں۔"

عصمت اللہ بیگ صاحب شاعری میں اکبر سے متاثر تھے۔ طنز اور ظرافت سے اصلاح کا کام لیتے تھے۔

تین چیزیں

دنیا میں اگر پوچھو تو ہیں سینکڑوں چیزیں — ہیں بیش بہا اور اہم ان میں مگر تین
ثابت یوں ہوا پہلے تو بڑا سب سے ہے پٹرول — لازم تھے اسی کے لیے آپس میں سلاطین
ڈرتے تھے مسولینی و ہٹلر بھی اسی سے — دبتا ہے کسی سے جو تو اس سے ہے شاہین
پٹرول کے بعد آتی ہے بارود کی باری — ابلیس نے جاری کیے ہیں جس کے فرامین
بچھ جائے سرنگ اس کی تو اڑ جاتے ہیں یکسر — ارض حبش و مصر و خطا و ختن چین
سب سے ہے سوا تیسری دھات جسے کہتے ہیں لوہا — ملتے جلتے ان دونوں سے ہیں اس کے قوانین
بنتے ہیں اسی چیز سے توپ اور رسالے — شمشیر و سنان تیر و تفنگ اور قرابین
تھمتے ہیں کسی سے کہ اگر آ جائیں یہ تینوں — ہے ملک تو کیا چیز وہ دنیا کو بھی لے چھین

صلح پسندی

دشمن کو بنا لیتے ہیں ہم دوست خوشی سے — ہم امن کے طالب ہیں زمانہ میں سبھی سے
اک دور ہیں ہم صلح پسندی ہی میں حضرت — مذہب بھی ہمارا نہیں لڑنا ہے کسی سے

نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

مشاعرہ کرنے میں حکیم جی ملک الشعرا تھے ادھر کسی کی شادی ہوتی ادھر مشاعرہ لے لو کسی کے بچہ ہوا اور مشاعرہ۔ کوئی بیمار رہا مشاعرہ کوئی مرا مشاعرہ غرض کہ مشاعرہ کیا تھا ایک حیلہ تھا۔ پھر خرچ کچھ نہیں۔ تانگے والوں نے قندیلوں میں سے موم بتیاں نکال کر ڈھیر لگا دیں۔ بزاز نے چاندنی کے پاٹ لا بچھا دیے۔ خیمے والوں نے دوپہر سے ڈیرے ڈال دیے۔ پنواڑی نے گلوریوں کے ڈھیر لگا دیے۔ چائے خانہ والوں نے چائے نوشی کا انتظام کر دیا۔ گل فروش نے ہر دم تازہ حقے اور کلیاں فراہم کر دیں۔ حکیم جی نے غزلیں کہہ دیں اور بنا دیں اور یار لوگ اکھاڑے میں جا کودے یہ لو لمبا ایک نہ دو بیاد، مشاعرہ ہوا اور ہنسی خوشی ہوا۔

(حکیم مشتاق علی خان جوہر)

(۶۱) شمشاد

غلام پنجتن صاحب شمشاد تخلص سید سراج الحسن سراج یار جنگ جج ہائیکورٹ حیدرآباد کے بڑے فرزند ہیں۔ علی گڑھ اور یورپ کی تعلیم کے بعد حیدرآباد آ کر سررشتہ عدالت میں ملازم ہوئے اور سیشن جج تک ترقی پائی۔ وظیفہ حاصل کیا۔ حیدرآباد آنے

سے پہلے سیاسی میدان میں بہت حصہ لیا اور حیدرآباد میں اولاً سیاسی مضامین لکھے پھر ملازمت کے دائرہ میں آنے کی وجہ سے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وظیفہ کے بعد پھر سیاسی اور ادبی حیثیت سے میدانِ عمل میں گامزن ہیں۔ اپنے ہمعصروں کے جو حالات لکھے ہیں ان کو حیدرآباد کے بڑے لوگوں کے نام سے ادارہ ادبیاتِ اردو نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں آپ کے نوکِ قلم کی رہینِ منت ہیں۔ ان حالات کو جس دلکش انداز میں لکھا ہے اور کرداروں کی نقاشی جس چابکدستی سے کی ہے۔ غلام پنجتن صاحب جس طرح سیاسی میدان میں نڈر ہیں اسی طرح ادبی میدان میں وہ صحیح تنقید کرتے ہیں۔

آپ کی مزاحیہ شاعری خاص رنگ رکھتی ہے۔ ان پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ نمونہ پیش ہے۔

نہ ہوئی رہن فروشی سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
ہے جو ہڑپ لئے اس کی رتی کیا کم ہے — نو ہزار نہ سہی نغمۂ سرشاری نہ سہی
دل میں ان کے ہے بہت سے کہ بیجا ہے — شوقِ گلچیں کا تسلی نہ سہی
ہے مرآئینہ عیبِ حسن دلبر کا روئے دوست — گر نہیں ہیں برسرِ انشا میں معنی نہ سہی

کیسا درست ہوا ہے بدلا زمانہ — ظلم اب عاشق کیا جبر مجرمانہ
صیاد کا نہ کھٹکا گلچیں کا اب نہ ڈر ہے — کاندھوں پہ آندھیوں کے اپنا ہے آشیانہ
سرکش زباں پر ہیں آزادیوں کے نغمے — اللہ رے نادر مستی گھر میں نہیں ہے دانہ
آواز ان کی دلکش الفاظ ان کے میٹھے — یہ سب درست ہے لیکن مضمون عامیانہ
دورِ جدید آیا وہ دن ہوا ہوئے جب — بلبل کے باپ لے کر پھرتے تھے تازیانہ

چڑھتی ہے بڑھاپے پر ان کے جوانی — عمل بلدی و سلسلہ کا نہ جیابانی
اٹھلاتی کسی کی زباں سیدھی بنیا — تلنگی مرہٹی نہ ہندوستانی
قفس ان کے ہاتھوں میں اور ہم قفس میں — بڑی مہربانی روانی بڑی مہربانی
نیا ہی کہ ساتھی سب ہیں کھل — اناڑی سب ماجھی ہے نیا پرانی
جھکتے ہیں اپنوں سے آنکھیں ملاتے — رقیبوں سے جب چلتی نہیں لن ترانی
وہ ہنسنے لگے سن کے میرا فسانہ — کہی ان کہی ہو گئی سب کہانی

(۷) فضل الرحمٰن

فضل الرحمٰن صاحب حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور اس کی تکمیل پونہ میں کی۔ بی۔ اے آنرز کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اولاً سٹی کالج میں معاشیات کے لکچرار مقرر ہوئے مگر سیاست میں حصہ لینے کے باعث ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔

ایک عرصہ کے بعد اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے جرگے سے پھر ملازمت میں شامل ہو گئے نائب ناظم دفتر معلومات مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ناظم نشرو اور اس کے بعد ناظم تعلیمات مقرر ہوئے اور اسی خدمت سے قبل عمر ۵۵ سالہ وظیفہ حاصل کر لیا۔ فضل الرحمٰن صاحب کے ڈرامے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ اب تک سات ڈرامے شائع ہو چکے ہیں۔ ظاہر و باطن۔ نئی روشنی۔ حشرات الارض۔ آئندہ زمانہ۔ کارخانہ۔ سقراط۔ چنگیز۔ کلام کے دو مجموعے "دھوپ چھاؤں" اور "نقشِ حیات" شائع ہو چکے ہیں بقول ڈاکٹر غلام یزدانی فضل الرحمٰن کو دکن کا میتھیو آرنلڈ کہنا چاہیئے۔ فضل الرحمٰن کے مضامین میں طنز اور خوش مذاقی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے :۔

"بیگم : میں اس سے زیادہ ٹھاٹ باٹ کا سامان خریدتی مگر آپ نے روپے کے لیے ایسا ترسایا کہ میری ہمت نہ پڑ سکی۔

نواب : تمہاری ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں اپنے بڑے سے بڑے عیش کو قربان کر دیتا ہوں۔ وہ کون سی ایسی فرمائش تھی جو میں نے پوری نہیں کی۔

بیگم : میں نے سونے کے پلنگ کی فرمائش کی تھی۔ سونے کے پلنگ پر کمخواب کا بچھونا اور مشجر کے تکیے۔ آپ آخر وقت تک مجھے دم دیتے رہے اور اس کے بعد خرید لائے تو ایک سڑا چاندی کا پلنگ۔

نواب : میں تمہارے حکم کے بموجب سونے کا پلنگ خریدنے کے لیے بازار گیا تھا لیکن کم بخت دکانداروں نے حسبِ معمول ضرورت اور تمہارا شوق دیکھا تو ایک کے چار مانگنے لگے۔ اس پر بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوتا بشرطیکہ میرے پاس کافی روپیہ ہوتا۔

بیگم : اسی لیے میں کہا کرتی تھی دو لاکھ نکال لو۔ ایک لاکھ سے کام نہیں چلے گا مگر آپ جیسے اپنی ضد پر اڑے رہے۔

نواب : ضد مجھے نہیں اس مہاجن کو تھی جس کے پاس جاگیر رہن ہے۔ وہ قرض دینے پر آمادہ ہوتا تو میں دیوانہ تھا جو مفت کی رقم لینے سے انکار کرتا۔ تمہیں معلوم ہے قرض میری آمدنی کا واحد ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک زیادہ قرض کے معنی زیادہ آمدنی کے ہیں۔"

(آئندہ زمانہ)

"میرے فاضل ہمپیشہ اور قابل دوست علامہ احمد، مدیر الامان نے ابھی ابھی جو تحریک صدارت آپ کی خدمت میں پیش فرمائی ہے مجھے اس کی تائید کا فخر حاصل ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اگر کوئی با توقیر شخصیت اس فرض کو انجام دینے کی اہل ہے تو ہمارے مشفق و کرم فرما ہمارے ہر دلعزیز قومی کارکن عالی جناب معلی القاب اعزاز احمد صاحب کی ذات ستودہ صفات ہے (تالیاں) صاحب ممدوح کی شان میں اس ہیچ میرز نے چند ماہ قبل ایک قصیدہ کہا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس نادر موقع سے استفادہ کر کے بعض اشعار سے احباب کی ضیافتِ طبع کا سامان بہم کروں ؎

زمین و آسماں میں شہرہ ہے اعزاز احمد کو
نہ کچھ حد ہے نہ کچھ اندازہ ان کے فیض بے حد کا
بزرگانِ سلف ہیں طفلِ ابجد خواں حضور ان کے
ہوا ہے ان سے روشن نام دنیا میں اب و جد کا"

(۸) جگن ناتھ پرشاد

حیدرآباد کے ایک ممتاز کوایز حکیم ادرصاحب قلم ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں ایک اخبار "رہنمائے دکن" ہفتہ وار شائع کرتے رہے جو گویا اودھ پنچ کا ایک چربہ تھا۔ نظم اور نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے اور ظرافت نگاری کا اچھا سلیقہ ہے بالکل سنجی اور خوش طبعی میں مشہور ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اے شہر اوند نوا ابر رنگ تو تو زمانہ نے کرسائی کر رہے" "واقعی" شہر کا زوال حیدرآباد کی حالت جزار و در مخلوق سارا ہو رہا ہے۔ دولی پرسانی حال نہ رہا غریبوں کا تانہ بکا حال شد و برباد ہوگئیں، متعارض بن گئے۔ بیکس عوام زر معصوم بیچے را۔ دانہ کو ترستے محتاج بن گئے۔ اسے پیدا ہو کا ر وجہاں بگڑ گئے بڑا کیا کم کیا کہ اب اس سال اور ایک دوسری بلا فی۔ آئی۔ الیف۔ اسے فی سکے نام سے حیدرآباد میں نازل ہے۔

یا خدا ادا ہم کو تو سب روشن ہے کہ حیدرآباد کی مخلوق پہلی ہی سے ان بلاؤں طاعون، طیریا، ہیضہ وغیرہ امراض سے فنا ہو رہی ہے۔ اس پر یہ عجوبہ بلا اور ہم پر نازل ہو رہی ہے۔"

(رہنمائے دکن پنچ جلد نمبر ۱)

(۹) تمکین کاظمی

حیدرآباد کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مشرقی تعلیم حاصل کی۔ دفتر مالی و دیوانی میں ملازم تھے اب وظیفہ حاصل کر لیا ہے۔ تمکین صاحب کو تاریخ اور ادبی شعبہ میں خاص دلچسپی ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ "غنچۂ تبسم" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں دکنی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت جاں نثار بوی نے اس مجموعے کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے۔

"تمکین کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور بے ساختہ عبارت کی ملاقت ہے سوائی دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اختلاف شمال اور جنوب کا اختلاف ہے جس کا دور ہونا ممکن نہیں ہے۔"

نمونہ ملاحظہ ہو۔

"یوں تو جیسے طبقے کے لوگ فی زمانہ زندہ ہیں مگر قربان جائیے مولوی صاحب کے کہ اس زمانے کا عالم ہی طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے۔ ایک مولوی صاحب جو نہایت کم سخن اور سنجیدہ ہیں اس قدر مجبور رہیں کہ کوئی ان کے گھر پہ ملنے جائے تو باہر سے ٹالا کر یا بلانے ہی۔ یہ محض اس سبب کہ بیوی صاحبہ باہر کی فرمائش پہ اس قدر رعنا ہوئی ہیں کہ ان لوگ ازکم

دو دو تک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ ایک بزرگ جب تک باہر رہتے ہیں چار چھ ڈبیاں سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں مگر گھر میں کھانا کھانے کے بعد بھی سگریٹ پینے کی مجال نہیں اس لیے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔" (زن مرید)

مرزا صاحب کے پھکڑ پن سے ہماری روح کو فنا ہوتی ہے۔ ہم نے سوچا کہ مرزا صاحب سے نہ ملیں تو پھر قیامت آجائے گی۔ راستہ میں جہاں کہیں ملاقات ہوئی حضرت سلتے سے ٹالیں گے۔ وہ وہ بے تکلفی سے ساتھ ہو گئے کہ سنگ آمد و سخت آمد کہہ کر پہنچ بھی گئے مرزا صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے ایک صاحب کو نوٹ کے کچھ زبانی گر بتا رہے تھے، ایک شخص کو موجود پا کر ہمت ہوئی کہ چلو اس غریب سے مرزا صاحب کو ٹھیک ٹھاک کرنے دو ہم لگتے ہی دو بیٹھ کر جب آ ہی گئے مگر ہمارا بیٹھنا ہی تھا کہ مرزا صاحب نے اپنا تخیل ختم کر دیا اور متوجہ ہو گئے۔ (مرزا صاحب)

(۱۰۱) جلال الدین اشک

مولوی رحیم الدین اعلیٰ طالب ادب و حیدر نواز جنگ کے عزیز ہیں جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کے گریجویٹ ہیں۔ بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی میں کامیابی حاصل کی۔ اپنی علمی ہمہ گیری اور ذہانت کے باعث ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ حیدرآباد کے سررشتہ کروڑگیری (کسٹم) میں ملازم رہے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہاں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی تصانیف "شیطان کا انتقام" اور "رسالہ گل پری" شائع ہو چکی ہیں۔ "سلک گوہر" ڈرامہ ہے۔ "شیطان کا انتقام" میں انہوں نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ ہماری تہذیب شیطان کا انتقام ہے جو انسان سے پوری طرح لیا جا رہا ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو:-

"شیطان کا پہلا حکم یہ تھا کہ جاؤ دنیا میں شاعری کرو مگر دیکھو اپنی شاعری میں عورت اور شراب کے سوا کسی چیز کا ذکر نہ لانا۔ ہاں کبھی کبھی شروع کی خاطر کچھ مرثیے بھی کہہ دینا اور بلبل کی تعریف بھی کر لینا۔ بہت کر چکو تو کچھ نعت بھی لکھ دیا کرو۔ تم جب اپنی شاعری میں عورت کی تعریف کرو گے اور زلف کا وصف سے اس کا سراپا کھینچو گے تو اس کے نتائج خاطر خواہ نکلیں گے۔ بہت سارے نوخیز طالب علم بہت سارے نیم تعلیم یافتہ نیم دماغ تمہاری شاعری سے متاثر ہو کر بہت جلد بلکہ عمر سے قبل ہی کسی نہ کسی فاحشہ کے دام میں گرفتار ہو جائیں گے اور چار چھ مہینے یا شاید سال دو سال تک بڑی پُر کیف لذت بخش زندگی گذاریں گے اس کے بعد؟ ہاں اس کے بعد کیا ہو گا؟ ان کی صورتیں مسخ ہو جائیں گی، ان کے گال پچک

جائیں گے، ان کے سینے سوکھ جائیں گے، دماغ ازکار رفتہ ہو جائیں گے، وہ زندہ رہیں گے
مگر اس طرح کہ دنیا ان کی نظروں میں تاریک ہو جائے گی۔"

(۱۱) یوسف ناظم

سابق حیدرآباد دکن کے مہاراشٹر کے باشندہ۔ جالنہ اور اورنگ آباد میں تعلیم پائی تھی۔ حیدرآباد آکر جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ کچھ زمانہ خدمات پر مامور رہے۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ حاصل ہے۔ طنز اور مزاح پر تحقیقاتی کام بھی کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ مرزا غالب کی حالتِ ضعف کے موضوع سے جو مضمون لکھا ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے:۔

"لیکن صرف بیٹھے رہنا غالب کے بس کا نہ تھا۔ ان کی فطرت کاہلی کچھ اور ہی مانگتی تھی
کچھ دنوں بیٹھے بیٹھے بھی ضعف ہونے لگا اور انھوں نے یہ فرمایا ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

پڑے رہنے میں بھی غالب نے کیا کیا نکتے نکالے ہیں اور یہیں تمام سب جہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ غالب نے بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ قسم کی نفسیاتی شاعری کی ہے۔ غالب نہ پڑے رہنے کے ہی قائل نہ تھے بلکہ اس کا خیال بھی انھیں نفاست اور آرام کا پورا پورا خیال رہتا تھا اور ہمیشہ اپنا بستر اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ جب بھی لیٹنے کا موقع ملے بستر بچھا لیں۔ فرماتے ہیں ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

(۱۲) خواجہ یوسف الدین

حیدرآباد وطن۔ جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ سے بی۔ اے، ایم۔ اے۔ ڈپ لیڈز کی ڈگری پی ایچ کے بعد انگلستان جاکر وہاں سے فارغ ہوئے۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج کے لکچرار اور پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ۵۸ سال کی عمر میں وظیفہ حاصل کیا۔ اب انوارالعلوم کالج میں اپنے اوقاتِ فرصت کو کام میں لاتے ہیں۔ کئی مزاحیہ مضمون لکھے ہیں۔ لیکن شعرائے اردو کے متعلق بہت کام کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"شیخ صاحب نہ صرف اپنے گاؤں اور شہر میں بلکہ دور دور بھی ایک ہوشیار لڑنے والے
سمجھے جاتے تھے۔ لڑنے سے مراد یہاں ہاتھا پائی یا کشتی یا شمشیرزنی نہیں اس لیے کہ
ان چیزوں سے ہمارے شیخ صاحب کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ لڑتے تھے کاغذی

بعد ازاں بورڈ میں انتخاب اور حیرت و خوشی سے کہ کچہری والے ان کو ولایت سمجھتے تھے اور جب یہ
مشہور ہیں پیدا ہوا کہ چپراسیوں اور اہل معاملہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے اپنے کارناموں کو
دو دو منٹ نکال کر بیان کرتے لوگوں نے ان کی ذہانت و ذکاوت کی داد دی۔

۱۳۱) مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ مولوی عزیز مرزا کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ عزیز مرزا صاحب کا نام مسلم لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ حیدرآباد سے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کی سیکریٹری شپ کو منصب لاحا۔

مرزا شکور بیگ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ یہیں ان کی تعلیم ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے۔ ایل ایل بی کی کامیابی حاصل کی اور بعد کا مرا ل ملازمت کا جیشہ اختیار کر لیا۔ اس وقت ورنگل کے شہر میں ایڈووکیٹ ہیں اور آمدعہ یونین کی کانگریس کی جانب سے چنے گئے ہیں۔ شعر و سخن کی شوق ان کی تعلیم کے زمانے سے رہا ہے۔ بہادر وشنا کا موضوع ان کی نظمیں زمانہ تعلیم میں شہرت رکھتی تھیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ممکن نہ ہو تو آنے کا وعدہ نہ کیجئے
ہر بات پہ نہیں کبھی ایسا نہ کیجئے!

کہہ دے پنشن نے خونِ تمنا کی داستاں
پر شکوہ دنیا کے ستم کا نہ کیجئے!

دیں ہم جو استعفیٰ تو دنیا سمجھے مگر
... کے سامنے تمہیں رسوا نہ کیجئے!

ہم مر گئے تو آپ پہ آخر مرے گا کون
کہتے ہیں اب کہ ہم کو ستایا نہ کیجئے

بیزار ہو کے یار نے مرزا سے یہ کہا
یوں آنکھیں چار کر کے تماشا نہ کیجئے

منظور دل کو بھلانا پڑے گا
نئے پر سے پھڑپھڑانا پڑے گا

اگر مرزا کی آہوں میں ہے تاثیر
انھیں چھلکا کے آنا پڑے گا

مرشد ملے، مکان ملے، سیم و زر ملے
سب کچھ ملے خدا کی طرف سے مگر ملے

ہر جس کے دل میں درد وہ انسان نہیں ملا
لیڈر ملے، وکیل ملے، ڈاکٹر ملے

جو اسیرانِ قفس فیصلہ پہ اتراتے ہیں
وہ رہا ہو کے بھی صیاد کے گن گاتے رہا

برسرِ عہدہ تو ان سا کوئی کچھ غلط نہ تھا
بعد پنشن کے یہ عالم کہ نچلے جاتے ہیں

کام کچھ کر کے دکھاتے نہیں مرزا لیکن
صرف تنقید بڑی شان سے فرماتے ہیں

(۱۴) ابراہیم جلیس

حکومت آصفیہ کے علاقہ کرناٹک (گلبرگہ) کے متوطن اور اب پاکستان کے باشندہ ہیں۔ میٹرک تک گلبرگہ میں تعلیم پائی اس کے بعد علی گڈھ گئے مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر حیدرآباد آئے۔ ڈسٹرکٹ کارپوریشن میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک فلم میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ کام کرتے رہے مگر یہاں کی فضا ان کے لئے سازگار نہ ہوئی۔ پھر حیدرآباد واپس ہو گئے اور ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں اخباری دنیا اور پھر فلمی دنیا سے متعلق رہے۔ اپنی مزاحیہ نگاری کے باعث پاکستان میں انھوں نے شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔ زرد چہرے، چور بازار، چالیس کروڑ بھکاری، نکیلا دیس، کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں، دو ملک ایک کہانی، پکاسو نعمی، ریزہ ریزہ، بھوکا ہے بنگال، وغیرہ۔

اس تفصیل کے بعد اب حیدرآباد کی مزاحیہ نگار خواتین کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض حیدرآباد سے پاکستان منتقل ہو چکی ہیں مگر چونکہ ان کے کارنامے ایک عرصے تک حیدرآباد میں وجود میں آئے ہیں، ان کو حیدرآباد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۵) آصف جہاں بیگم بلگرامی

ان کے والد عبدالمجید صاحب بلگرام کے مردم خیز قطعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عرصہ تک صدر مہتمم تعمیرات تھے۔ حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ آصف جہاں کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ اگرچہ مدرسہ میں صرف میٹرک تک تعلیم پائی مگر مطالعہ کی بدولت اچھی قابلیت پیدا کر لی۔ کم عمری سے لکھنے کا شوق تھا اور مزاحیہ رنگ اختیار کیا۔ مضامین کا ایک مجموعہ "گپ خانہ" ان کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد دوسری مصروفیتوں کے باعث لکھنا ترک کر دیا مگر جو کچھ لکھا ہے وہ قابل داد ہے۔ مرحوم مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کی مزاحیہ نگاری کی داد دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "یقین مانئے کہ مضمون واہ واہ ہے۔ مضمون پڑھتا تھا اور دل میں سوچتا تھا کہ یا اللہ اب کیا ہونے والا ہے۔ ہم سمجھے تھے کہ مزاحیہ مضامین لکھنا صرف مردوں ہی کا حصہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ صنف نازک بھی ہماری حصہ دار بن گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم مذاق سے مطلب کسی ہنسی کی بات پر ہنس دینے تھے مگر یہاں ہر فقرہ میں چٹکیاں لی گئی ہیں اور مشکل یہ ہے کہ ہر فقرے پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے۔"

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ آصف جہاں بیگم کا درجہ مزاحیہ نویسی میں کس قدر بلند ہے۔ اب وہ پاکستانی بن گئی ہیں اور وہاں ہی مقیم ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

> "آج۔ اور ۱۶ کا تو نام بھی نہ لیجئے۔ بھتیجے کی قسمت کی مالک ہوتی ہے جتنی خوش نصیب ہوتی ہے اس سے زیادہ میلا چہ کو رکھتی ہے۔ اگر خود کا بچہ بھی ساتھ ہی ہو تو بیگم کے سامنے اپنے بچے کو

> مارتی ہے بچے کے سینے کو پیار کرتی ہے جب بچے کو پیسے پیسے تھک جاتی ہے تو بیگم کے سامنے جا کر اس صفائی کے ساتھ بچے کا ہچکی لیتی ہے کہ بیگم تو بیگم ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور وہ سمجھتی ہیں کہ بچہ ان کے پاس آنے کے لیے رو رہا ہے۔
>
> بچہ زیادہ دق کرتا ہے تو افیون کی گولیاں کھلاتی ہے۔ محلے بھر کی رپورٹر ہوتی ہے جس محلے میں ایک دو انائیں ہوں تو سمجھ لیجئے کہ وہاں کسی اخبار یا پوسٹ کی قطعی ضرورت نہیں جہاں محلے میں کوئی ذرا غیر معمولی بات ہوئی اور اس کا پیٹ پھولنا شروع ہوا۔ یہ بے چاری اس وقت تک کھانا نہیں کھاتیں جب تک کہ تمام محلے میں اس واقعہ کی خبر نہ ہو جائے یہاں تک کہ رشتے داروں میں اشاعت ہوتی ہے محلے کے کس گھر میں کس نے کیا کھایا، کیا کہا، کہاں گیا، کب اس سے شرم کیجئے"
>
> (دُکھ خنداں)

(۱۶) تاج یسین علی خان

حیدرآباد کے ایک صاحب علم اور اصل خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی غیاث الدین المخاطب نواب اظہر جنگ کی دختر ہیں۔ محبوبیہ اسکول میں تعلیم پائی۔ سید یسین علی خان صاحب ... کے انجینئر کی شریک زندگی ہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ یورپ۔ آسٹریلیا اور جرمنی کا سفر کر چکی ہیں۔ شادی سے پہلے بھی مزاحیہ مضامین لکھا کرتی تھیں۔ آسٹریلیا کے سفر کے بعد اپنا سفرنامہ "آسٹریلیا کی جھلک" کے نام سے شائع کیا ہے۔

ان کے مضامین میں تخیل کی بلندی، نظر کی گہرائی اور مزاحیہ نگاری کی پوری قدرت حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے ان کے اس سفرنامہ کے متعلق جو صاحب اپنی تقریظ میں کی ہے وہ یہ ہے۔

> "ان کے سفرنامے کے کچھ حصے ماہنامہ شہاب میں شائع ہو رہے تھے اور میں حیرت اور تعجب کے ساتھ ان کو پڑھتا تھا۔ اس کتابی صورت میں میں نے بڑے شوق سے اس کو پڑھا اور اعتراف کرتا ہوں کہ یہ خاتون ... کی بڑی اچھی قدرت رکھتی ہیں اور اپنے خیال کے اظہار پر خوبی سے قادر ہیں۔ ان کی طبیعت میں ظرافت، شگفتگی اور انبساط کی کمی نہیں اور یہ سب خوبیاں ہی اس درجہ کو نہ پہنچ سکتیں کہ خدا ہوں کی سرحد میں داخل ہوں"

ذہنیت سے تاج یسین علی خان کی مزاحیہ نگاری کا حال منکشف ہو سکتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

> "جب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بچے پیدا کرنے پر تنخواہیں دی جاتی ہیں تو اپنے یہاں کے بچے والوں کی بہت یاد آئی۔ دل میں حساب جوڑتی رہی کہ فلاں کو فی ہفتہ اتنے پونڈ ملتے تھے اگر وہ آسٹریلیا میں ہوتے۔ بہرحال یہاں کی مائیں بھی بچے پیدا کرنے میں ہندوستان کی عورتوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یہاں کی زمین تو ہندوستان کی زمین سے بہت زیادہ زرخیز ہے۔

اپنے خیالات میں علامہ اقبال کا ایک مصرع دہرا رہے تھے گنگنا رہی تھی۔ جیسے انجینئر کریم کی بحث شروع ہوتی کہ اس مصرعے سے ان باتوں کا کیا تعلق۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ اس وقت یہاں کس مناسبت سے تم نے یہ مصرع کہا وغیرہ۔ میں نے کہا آپ اپنے دماغ کی نمو کی مشین کو ان عمومی باتوں سے تکلیف نہ دیں۔ یہ چھوٹے بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔"

"آہستہ پیا کی جھلک۔۔۔"

(۱۷) زینت ساجدہ

حیدرآباد کے ایک مشائخ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ اب پیری مریدی کا سلسلہ ان کے یہاں باقی نہیں رہا۔ قاضی محمود بحری اور شاہ نور اللہ ان کے اجداد میں شامل ہیں۔ زینت ساجدہ نے زنانہ کالج میں جامعہ عثمانیہ کے تحت اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ایم۔ اے ہو کر ملازمت اختیار کی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا کورس بھی ختم کر لیا مگر ہنوز مقالہ پیش نہیں کیا۔
زنانہ کالج میں اردو کی لیکچرار ہیں اور اپنے علمی اور دوسرے فنی کاموں کے باعث مشہور ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ افسانوں کا مجموعہ "جلترنگ" شائع ہو چکا ہے۔ وہ ترقی پسند زمرہ میں شامل ہیں مگر ان کے افسانوں میں عریانی نہیں ہوتی۔ ان کے تنقیدی مضامین بلند معیار کے ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی نقش سے اردو کے معیاری ادیبوں میں اپنا مقام بہت اونچا بنا لیا ہے۔
مزاح نگاری کا بھی سلیقہ ہے، ان کی مزاح نگاری کو خوش مذاقی میں شامل کرنا چاہیے۔ اخبار سیاست میں ان کے کئی مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۸) جیلانی بانو

علامہ حیرت بدایونی کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ علامہ بدایوں سے حیدرآباد آ کر بس گئے تھے۔ جیلانی بانو کی پیدائش حیدرآباد ہی میں ہوئی اور یہیں نشو و نما پائی۔ خانگی تعلیم ہوئی اور رسمی تعلیم سے آپ جامعہ عثمانیہ کے بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہو رہی ہیں۔
اگرچہ جیلانی بانو کو علمی میدان میں آئے صرف چند سال کا عرصہ ہوا ہے مگر اس قلیل عرصہ میں انھوں نے اپنے زورِ قلم کے جو نقش ثبت کر دیے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔
ان کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کے مینار" پاکستان کے بین الاقوامی ادب کے مقابلہ میں درجہ اول کا تمغہ حاصل کر چکا ہے۔
جیلانی بانو کے افسانے پاکستانی رسالوں میں کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کے رسالوں کے علاوہ اخبار سیاست میں بھی ان کے مزاحیہ مضامین شائع ہوتے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ جیلانی بانو نے صرف چند سال میں اردو کی جو خدمت کی ہے اور ادبی میدان میں اپنا جو مقام بنا لیا ہے وہ قابلِ ستائش ہی نہیں بلکہ تعجب خیز ہے۔ توقع ہے کہ اگر آپ اسی طرح اردو کی خدمت کرتی رہیں تو دنیائے اردو میں ان کے کارنامے زندگیٔ جاوید حاصل کریں گے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

"آپ انفلوئنزا میں مبتلا ہیں۔ فلاسفی میں پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے ہیں۔ بیوی سے سخت قسم کی ناچاقی رہتی ہے۔ عنقریب آپ آٹھویں لڑکی کے باپ بننے والے ہیں۔ آپ

جنگ سے متاثر رہ چکے ہیں۔ آپ کی عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ پچھلی زندگی عشق میں ... بجائے گھر کی ... کٹ گئی۔ ڈاکٹر اور دواؤں پر سے آپ کا عقیدہ اٹھ چکا ہے۔

اور آپ بارہا ... کے نام پر ... چکے ہیں تو پہلی بات ... ہے کہ آپ ... کی آواز پر ... ہیں۔ اس کے علاوہ محلے کی کئی لڑکیوں سے عشق کا کاروبار جاری ہے آپ ... بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ ... آپ بے حد ... کرتے ہیں ... دن بھر پلنگ پر بیٹھے ... حل کرتے ہیں۔ آپ ... کا ذوق ... رکھتے ہیں۔ ... آپ کو ... حاصل ہے۔ ... اور غالب آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ... لکھنے کا آپ کو ... ہے۔

وحیدہ نسیم

وحیدہ نام اور نسیم تخلص۔ ان کے اجداد شمالی ہند سے اورنگ آباد آ کر بس گئے۔ نسیم کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی اس کے بعد حیدرآباد آ کر زنانہ کالج میں شریک ہوئیں اور ایم۔ ایس سی میں کامیابی حاصل کی۔ نسیم کے خاندان میں کئی اصحاب شاعر تھے۔ بچپن سے شاعری کا ماحول ملا۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ ہی میں ان کی شاعری مشہور ہو گئی۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے تیار ہو چکے ہیں جن کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً ۱۔ نکہت ... (نظموں کا مجموعہ) ۲۔ ساغر صہبا (غزلوں کا مجموعہ) ۳۔ تبسم حیات (مزاحیہ کلام) ۴۔ گلفشاں (بچوں کی نظمیں) ۵۔ دردِ لادوا (سیاسی نظمیں)

اگرچہ یہ مجموعے ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے مگر ان ہی کا ایک حصہ رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو گیا ہے ۱۹۴۷ء کے بعد نسیم پاکستان چلی گئیں اور اب کراچی کے سنٹرل زنانہ کالج میں لیکچرار ہیں۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے وحیدہ نسیم کی شاعری کا مزاحیہ حصہ ... سے موسوم ہے اس میں بیسیوں نظمیں شامل ہیں ... کلام میں ایک حصہ وہ ہے جو کالج کی تعلیم اور بورڈنگ کے قیام کے زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ ... مزاحیہ کلام ... کا ذریعہ ... سبق آموز بھی ہوتا ہے اس میں ... تخیل کی بلندی اور زبان کی سلاست بھی ہوتی ہے۔

گنتی کی گھنٹی بجی اسے تو قیامت آگئی　　چہرے پہ سب کے یکبارگی ہی متانت آگئی
اب پیاس بھی لگتی نہیں وہ بھوک ساری مر گئی　　سب لڑکیوں پہ اک خموشی کام اپنا کر گئی
معراج کیوں خاموش ہے ... ساری کیا ہوئی　　پھر ... ساری کیا ہوئی
صفیہ ... کیوں نہیں سعیدہ بھی کیوں چہکتی نہیں　　لڑکی ہیں سب ... پہ ہنسی آتی نہیں
گانے کی جو ... بھی کیوں ... بھر گئی　　گویا کہ ... خاموشیوں میں سو گئی
خاموش ہو بیٹھی ہیں کیوں ...　　سنجیدگی کے کیوں ... سے عیاں

دھوبن کی یاد

آتی نہیں ہے اب تک وہ مہرباں ہماری — لگتی ہے یاد میں [illegible] کشمکش زباں ہماری
جلدی سے اب وہ آئیں قسمت کہاں ہماری — ہے در جگہ یہ آنسو دھوبن کہاں ہماری

جائیں گے ہم وہیں جو دھوبن کہاں ہماری

چادر پھٹی ہے میلی بستر پہ کیا بچھائیں — [illegible] میں سب کہ کپڑے سب پھٹ جائیں
بستر کی دیکھ حالت مٹی سے [illegible] بلائیں — تو ہی بتا دے دھوبن کا پیچ کر کہیں جائیں

میلی پڑی ہوئی ہیں سب چادریں ہماری

غصے میں خوب آکے ہم سب پھینکے ہوئے ہیں — دھوبن کے پاس آکے کپڑے گئے ہوئے ہیں
اور اس سے زیادہ جو گھٹے میلے پڑے ہوئے ہیں — باقی یہ ہیں جو بدن پر چڑھے ہوئے ہیں

خالی پڑی ہوئی ہیں الماریاں ہماری

طویل نظم ہے۔

موتی کم سے سے یکائی [illegible] کی طرح — داغ ڈالے [illegible] کی طرح
لیکن اس کی کوان پر ہے تم سے کوئی سوال — آج کیوں روٹی پکانے کا تمہیں آیا خیال
بس جانا کے واسطے تمہارے وقت تھے — تجھ کو کب یہ شعور تھا کہ ان میں تو آتا بھرے
نقص فقط یہ ہے کہ بڑے نہ کہ تمہاری انگلیاں — سجتی ہے [illegible] کس طرح ہم تیری روٹیاں
روٹیوں کو درست نازک وقت نے کر دیا — گرمی آنکھوں کو کبھی تم نے دھوئیں سے بھر لیا
پھول سے ہاتھوں پہ شرم کی تھی اک لہر — آگ کی گرمی سے سب وہ بن گئے [illegible]
مسکراہٹ پھول پر [illegible] — آگ میں ڈالو ان پھولوں کو [illegible]

بس تمہیں ختم کرو [illegible] شاعری کا سلسلہ
ڈر رہی ہوں حسن کا بھی بڑھ نہ جائے حوصلہ

[illegible] سے جو تو نے میرے تنِ ناتواں کو کھجلی — دے دی ہے تو نے یا رب سارے جہاں کو کھجلی
ناخن ہلال بن کر کھجلاتے ہے فلک کو — تارے بھی پھنسیاں سب سے آسماں کو کھجلی
پانی کی بھی سطح پر یہ آبلے سے کب میں — کیا ہو گئی خدایا آبِ رواں کو کھجلی
ممکن نہیں ہے اک جا دستِ زباں کبھو بھی — مطلب ہے یہ ہوتی ہے دورِ زماں کو کھجلی
اک پیڑ کو جو ہر دم کھجلا رہے ہیں پتے — گل پر ہیں داغ لاکھوں سب گلستاں کو کھجلی

بسنت بن کے ہر دم پھیلا ہے روئے گلشن — کھاتا ہے سب سے رو رو بت بوستاں کی کھجلی
کھجلی سے تازہ دم فرصت توڑے نہ پھول کلی — ہے بدنما سے بلبل ہو باغباں کی کھجلی
کوئی اگر یہ پوچھے یہ طلسم کیوں یہی ہے — کہہ دو کہ ہو رہی ہے میری زباں کو کھجلی

تنہا کھا آپ کے ہاں فائدہ بھی کیا ہے
ہو رہی نسیم سارے ہندوستاں کو کھجلی

صفحات گزشتہ میں حیدرآباد کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ ان کی نظم اور نثر کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حیدرآباد کی مزاحیہ نگاروں نے مختلف نوع سے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے اپنے نقش قلم سے تنوع پیدا کیا ہے۔ اگر ایک طرف سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگایا ہے تو دوسری طرف زندگی کی کڑواہٹ کو کہیں پر شکر لگا کر اس کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں قہقہہ کا موقع پیدا کیا تو کہیں تبسم کی دنیا میں پہنچایا ہے۔ غرض کہ انھوں نے اپنے شعور کی قدروں کو کامیابی سے جولانی دی ہے۔ اردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کو ترقی دینے میں ان کے کارنامے پسندیدہ اور بلند معیار کے حامل ہیں اور بعض تو اس صنف کے چوٹی کے ادیبوں میں شامل ہیں اور ان کے کارنامے زندگی جاوید کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

گوئٹے

(پیدائش، خاندان اور شخصیت)

اختر انصاری

[گوئٹے اور اس کی شخصیت کے متعلق یہ مختصر مضمون ٹامس مان کے ایک طویل مقالے کے ابتدائی حصے کا ترجمہ ہے۔ یہ مقالہ ٹامس مان نے گوئٹے کے انتخابات نظم و نثر پر ایک مقدمے کے طور پر لکھا ہے۔ خود ٹامس مان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ موجودہ دور میں جرمنی کا سب سے بڑا مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے لٹریچر کا نوبل پرائز حاصل کیا اور ۱۹۵۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔]

اگست ۱۷۴۹ء کی اٹھائیسویں تاریخ تھی اور دوپہر کا وقت، فرینکفرٹ کے ایک معزز گھرانے میں ایک اٹھارہ سال کی کمسن ماں کی کوکھ سے جاپے کی غیر معمولی تکلیف میں ایک ننھے نے جنم لیا۔ اس کا بدن نیلا ہو رہا تھا اور وہ نیم مردہ تھا۔ گویا اس دنیا کی روشنی سے اس کو کوئی علاقہ نہیں ہے گویا وہ زندگی کی اس شاہراہ پر گامزن ہونے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا جس کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ وہ ایک وسیع و عریض گل پوش، مسرت بھری جدوجہد سے لبریز، انسانی مسرتوں سے بھرپور راہ، جلیلی و مثالی شاہراہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں کے بطن کے بعد وہ براہِ راست زمین کے بطن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کئی منٹ گزر جانے کے بعد بچے کی دادی نے جو پیچھے کھڑی تھی گھبرائی ہوئی ماں سے کہا: "لیزبتھ! بچہ زندہ ہے!" یہ ایک عورت کی آواز تھی جس کی مخاطب ایک دوسری عورت تھی اور بس؟ محض ایک انسانی آواز؟ محض ایک بشارت آمیز گھریلو پیغام؟ تاہم ساری دنیا اور ساری انسانیت کو اس آواز کا مخاطب ہونا چاہیے تھا اور آج بھی پوری دو صدیوں کے بعد اس آواز کی بہجت آفرینی جوں کی توں قائم ہے۔ اسی طرح آئندہ صدیوں تک قائم رہے گی جب تک روئے زمین پر زندگی اور محبت کا وجود باقی ہے، جب تک زندگی خود اپنی چاہت میں ڈوبی ہے، نہ اپنے ملاوت بھرے فرض سے تھکتی ہے اور نہ اپنے وجود سے بیزار ہوتی ہے اس وقت تک ایک عورت کے منہ سے نکلنے والی یہ آواز، یہ سادہ و بے لوث پکار "وہ زندہ ہے" یوں ہی گونجتی رہے گی، یوں ہی موسیقیانہ سنائی دیتی رہے گی۔

وہ بچہ جس نے اس روز تاریکی سے بڑھ کر روشنی میں قدم رکھا، جس کا حلق آواز سے خالی تھا اور جس کا جسم بے روح معلوم ہوتا تھا بڑی لمبی عمر لے کر آیا تھا۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ بے پایاں تحمل کا مالک ہو اور صحیح معنوں میں [illegible] کی طرح زندگی بسر کرے، نشو و نما اور تجدید و احیاء کی عظیم الشان صلاحیتوں کا ثبوت دے، اپنی انسانی تقدیر کو بدرجۂ اتم پورا کرے اور روح کی [illegible]

بغیر کسی شعوری ارادے اور کوشش کے محض اپنے وجود کی بنا پر بے حد و قیاس اثرات پیدا کرنے کا باعث ہوا تھا اس نے لکھا: یہ چیز اس تخلیقی کام سے بالکل علیحدہ ہے جو اس نے مشکوٰۃ مصنف کی حیثیت سے سرانجام کیا۔ یہ اس کی عظیم اور منفرد شخصیت کا کارنامہ ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شخصیت کا لفظ محض ایک مسافی چیز ہے کسی ایسے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جس کے اظہار میں ناطقہ سربگریباں ہے، کسی ایسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے جس کے سوتے ذہنی نہیں بلکہ حیاتی ہیں۔ شخصیت جو ہمہ گیر جاذبیت اور رعب و عالمگیر کشش رکھتی ہے یقیناً ایک مخصوص موروثی اثر، سادہ و نا آسودہ قوتِ حیات کی ساخت و پرداخت ہے۔ وہ بکارت و عناصر اور محاسن و نقائص کا ایک آمیزہ ہے ایک ایسے تناسب کے ساتھ اور ایک ایسے عمل کے ذریعے جو فطرت کے گہرے و دار اسراری رازوں میں سے ایک راز ہے۔

صدیوں کی حرکی زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو نسل و خون کے ایک دھارے کا پتا چلتا ہے جو غیر محسوس طور پر جاری ہے اور کوئی غیر معمولی چیز عموماً نہیں ہے۔ یقیناً مادرِ فطرت کے سامنے کوئی نصب العین نہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ گویا ایک نصب العین ہے یا ایک مخصوص نصب العین! چنانچہ گوئٹے اپنی انوکھی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے:

> "ممکن ہے کہ ایک خاندان غیر متوقع طور پر کسی دیو زاد کو جنم دے یا کسی عفریت کو وجود میں لائے مگر اچھے اور برے انسانوں کی ایک نسل ہی پایانِ کار مسرت یا تباہی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔"

دیو زاد اور عفریت یعنی فوق الفطرت مخلوق۔ اس کے ذہن میں دونوں کا خیال بیک وقت آتا ہے۔ وہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ جس طرح ابداع و وسعت میں ہمیشہ وحشت کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے اسی طرح دیو زاد میں بھی عفریتی انداز کا پایا جانا لازمی ہے۔ یہاں اور سب کی نظر میں وہ اس بات کو یوں ادا کرتا ہے کہ جب خانوادے ایک طویل مدت تک قائم رہتے ہیں تو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے معدوم ہونے سے قبل وہ ایک ایسے شخص کو وجود میں لاتے ہیں جو ایک مجموعہ ہوتا ہے اور ایک مظہر ہوتا ہے اپنے اجداد کے تمام اوصاف کا نیز ان کے ان میلانات کا جو مخفی رہے اور بروئے کار نہ آسکے۔ یہ بات مختصر انداز میں کی گئی ہے لیکن خاص تعین کا رنگ رکھتی ہے۔ انسان اور فطرت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے اپنے فوق الفطرت وجود سے سوچ سمجھ کر استنباط کی گئی ہے لیکن ایسا ہوتا کیونکر ہے؟ امتزاج و انتخاب کا عمل کیونکر آگے بڑھتا ہے؟ نہایت خاموشی کے ساتھ اور بہت ہی دھیمے انداز میں! مختلف قبائل چلتے پھرتے ہیں اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔ کاریگروں، عالموں اور پیشہ ور طبقوں میں آمیزش و اختلاط کے سلسلے قائم ہوتے ہیں۔ قدیم رواج کی پیروی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والا اصولی دستکار اپنے استاد یعنی مستری کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ نوابی محل سرا کی کنیز سرکاری امین یا ناظم سے بیاہی جاتی ہے۔ یہ نسل اور مرتبہ کی حدوں کے درمیان مجانست و مخالطت کا ہوتے ہوئے عمل آگے بڑھتا رہتا ہے اور بظاہر کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا لیکن جب بتدریج اس تعزز و توقیر کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے جو ملکیت، ثقافت، شائستگی اور نجابت سے وابستہ ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر کار ایک سچی عبقریت کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لندھائم خاندان نے ٹیکسٹر خاندان کے ساتھ جو جرمنی کے جنوب سے آکر فرینکفرٹ میں بس گیا تھا سلسلۂ ازدواج قائم کیا اور پھر اسی طرح ٹیکسٹر خاندان نے گوئٹے خاندان کے ساتھ جس کا وطن اصلی شمالی تھرنگین فارسٹ اور ہرز کے پہاڑوں کا درمیانی علاقہ تھا شادی بیاہ کے ناطے جوڑے۔

میرا خیال ہے کہ اس عظیم شاعر کی فطرت کا بہترین حصہ مرتب کرنے اور سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر لندھائم خاندان کا وہ خون ہے

جو قدیم رومن سرحد کے قریب و جوار سے آیا جہاں بحیرۂ روم اور وحشیانہ نسلی رجحانات قدیم الایام سے متحد ہوتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں کی نانی کا دادا تھا جو پیدائش کے لحاظ سے نہ تھا مگر خاندان سے وہ رشتہ دار کے اعتبار سے خالص خاندانی سے تعلق رکھتی تھی اور ایک معصوم سی سادگی شریف النفس بھورے رنگ کی عورت تھی تصویروں اور شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی پیشانی، سر اور بالوں کی بناوٹ، اپنی اطالوی آنکھیں اور اپنی جوبی تمکنت اس نے بیٹے سے ورثے میں پائی اور یقیناً یہی بات اصل تھا اس کے کلاسکی رجحان کا، اس کی ہیئت پرستی اور وضاحت پسندی کا، اس کی تخلیقیت، عروض اور دلکشی کا اور رومن کردار سے اس کی محبت انوکھی کا جو ہمیں نقیبانہ شکل اختیار کرتا ہے اور کبھی پیراہن کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس سب کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہی جرمن کردار اس میں موجود تھا، انداز کا ایک اہم جزو تھا جو اس نے اس عنصر اور مارٹن لوتھر کی نسل سے ورثے میں پایا۔ چنانچہ یہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ شاید ہی کبھی کسی ایسے قدیم جرمن شخص نے اطالوی حسن، لمبی محنت اور لطافت نفیس کو یوں اور یہ کہ جرمنوں کی دونوں ذہنی (لطافت اور رنگینی) کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

جہاں باقی خط و خال سے وہ نمایاں اور جو اس خلفشار اور پرواز کو دیکھتے، وہاں یقیناً کچھ بہت نمایاں نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا دادا فریڈرخ جارج گوئٹے جو درزی تھا جرمنی ہوا، عمر کے ساٹھ سال کی طرح ہر محلے کا کاشتکار بھی تھا۔ اس نے دو مرتبہ شادی کی اور گیارہ بچوں کا باپ بنا جن میں سے اکثر بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ صرف تین بیٹے تھے جو اس کے بعد تک زندہ رہے۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا ایک پاگل تھا اور ۴۳ سال کی عمر میں شدید اختلال حواس کے عالم میں یہاں فوت ہوا۔ شاعر کا باپ یوہان کسپر گیارہ بچوں میں سے ایک تھا جو شاید بہت عمر رسیدہ والدین کی بڑھاپے کی اولاد اس کا وجود اس امر کی جیتی جاگتی شہادت تھی۔ ماہر قانون جس کے پاس معاملات تھے، کا جو اس سے اچھا تھا۔ آزردہ، منقبض اور سخت مزاج کا انسان واقع ہوا تھا۔ ایک عزت دار عزلت گزیں جو کبھی اپنے پیشۂ قانون کے سلسلے میں کوئی کام نہیں کر سکا۔ نوادرات کا جمع کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا جس میں وہ بے حد خلوص کے ساتھ اس کی قابلیت، آتی اور سادہ عادتیں نا قابل برداشت تھیں۔ وہ ایک بد دماغ مزاج تھا جس کے مجموعہ اعمال میں ہوا کا ایک تصور کا بھی آسانی سے اندازہ ہو سکتا تھا۔ البتہ جس کا باپ ساون مجسٹریٹ اور ماں لندن خاندان کی خاتون تھی اور جو ایک خوش مزاج لڑکی تھی، عمر میں اس سے ۲۱ سال کی تھی۔ اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی یعنی شوہر کی عمر سے بالکل نصف۔ اس نے بھی کسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا کیونکہ اسے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ایک خود سر رجعت پسند کی نرس کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ اس شہد کا باپ یوہان وولف گانگ گوئٹے کہتے تھے کہ اپنی جوانی میں وہ بہت زیادہ شادمان و فرحاں رہا ہوگا جیسا کہ وہ بچے اپنی ماں کو کہا کرتا تھا۔ گویا وہ ایک شہد لگا ہوا تھا جو وہ عورتوں کے پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور کبھی کبھی گھلا دیتے۔ بڑے شہروں کے ہنگامے میں چڑھ جاتا تھا۔ گویا وہ ایک مجموعہ تضاد تھا۔ ان حرکتوں کے باوجود اس میں بیٹی کی صلاحیتیں اور غیب بینی کی قوت تھی اور اپنی بڑی سالی میں وہ اسی سال کی عمر میں مرا۔ اس سنجیدگی، متانت، پابندی اور عزم و وقار کا سبب اسے کہ اپنے دورِ شباب کی ہے شغلیوں اور بے راہ روی کا بعد کی عمر ہی میں تلافی کرنی۔ اس نے اپنے آخری سال تک بیتے دار میں ہی ایک خوب انداز اس مریض کی حیثیت سے گزارے۔

اپنی بہن کرنیلیا کی ہوئی البتہ کہ یہاں چھ بچے ہوئے جن میں چار پیدائش کے دو دن بعد ہی عالم ارواح کی جانب منہ موڑ گئے۔ صرف ایک بیٹی اپنے بھائی وولف گانگ کا بچپن کے بعد تک ساتھ رہا۔ یہ ایک بدقسمت آزردہ مزاج لڑکی تھی جو اعصابی اور جذباتی امراض کی شکار تھی۔ وہ منجمد اور رنجیدہ تھی اور جیسا کہ اس نے بھائی نے کہا، بیوی بننے کی بجائے راہبہ بننے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ اس نے شادی کی اور جس کے خیال سے اس کو پہلے ہی سے متنفر کر رکھا تھا، جہاں بچہ ہوئی۔ صرف وہی ایک تھا جو بیمار تھا اور اس کی ہلاکت کے بعد جیسا کہ گوئٹے بھی بہن بھائیوں کی زندگی اسی سے حقیقت میں آ گئی۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ صحت و توانائی جن سے وہ محروم رہے تھے اور جس پر اس نے ایک عجیب جنسی حرص و ہوس کے ساتھ متصرف ہونے کی کوشش کی، اس کے حصے میں بھی نہیں آئی۔

کیا داستانِ حمزہ کی اصل فارسی ہے؟

تراز یزدانی

کہتے ہیں اردو والوں کی یہ عادت ہے یعنی جب کوئی بات منوانی ہو تو سنتے تو وہ کچھ ہوتی ہے عمالاً وہی بات ہے کہ عوام و خواص سے جو اس نے لکھی، پہلے در کیا ہے داستان حمزہ مصاحبِ قرآن فارسی سے ترجمہ ہو کر اردو میں منتقل ہوئی۔ درحقیقت اسی قسم کی غلط فہمیاں ہیں جو اردو کی داستانوں کے متعلق عام ہیں مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی عزیز زندگی کے تین سال داستان پڑھنے اور داستان کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں صرف کروں۔ لیکن اس مدت میں مجھے جو کچھ حاصل ہوا اس کو دیکھتے ہوئے میں بڑی خوشی سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا وقت ضائع نہیں گیا۔ ان ہی حاصل شدہ حقائق میں ایک حقیقت یہ ہے کہ میں اس داستان کو فارسی سے ترجمہ شدہ داستان نہیں سمجھتا۔

اردو میں اس داستان کے فارسی سے ترجمہ ہونے کا ڈھونگ نول کشور پریس نے رچایا۔ کس وجہ سے؟ یہ تو آج معلوم نہیں لیکن حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اردو کے دانشور طبقے نے بغیر کسی تحقیق کے پریس کے اس پروپیگنڈے کو قبول کر لیا ---- میں مانتا ہوں کہ ہر کتاب کے سرورق پر پریس کا یہ پروپیگنڈہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور تقریباً ہر کتاب کے اندر جہاں جہاں موقع ملا ہے اسی پروپیگنڈے کو شد و مد سے دہرایا گیا ہے۔ چنانچہ مترجم لکھنوی طلسم ہوشربا جلد ہفتم ... لکھتے ہیں :

"ملا فیضی صاحب وغیرہ نے جو ہفت دفاتر نوشیروان نامہ وغیرہ تحریر فرمائے"

بہت وہ پروپیگنڈہ جسے دیکھتے دیکھتے انسان کی نگاہ دھندلا جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ یہ ہفت دفاتر فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوئے۔

صندلی نامہ کے مترجم مولوی محمد اسمٰعیل اثر نے تو اس سلسلے میں وہ "تیر بے کمان" چلایا ہے کہ ----

درونِ سینۂ من زخم بے نشاں زدہ

فرماتے ہیں :

"جناب مرحوم (مراد منشی نول کشور سے ہے) نے اس قبیل سے ارشاد فرمایا کہ ہر چند داستان حمزہ صاحبقرآن کے کئی دفتروں کا ترجمہ ہوا ہے اور جلدیں اس کی مطبوع ہو کر منظور نظر ناظرین والا تمکین ہوئی ہیں ...... ایک دفتر کا ترجمہ تجھ سے متعلق کیا جاتا ہے۔ یعنی دفتر صندلی نامہ احقر کے سپرد فرمایا اور شیخ تصدق حسین صاحب سے جن کے اہتمام سے نوشیروان نامہ

کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ ترجمہ ہوئے، اصل دفتر منگا کر عاصی کو رخصت کیا۔"

(صفحہ ۳۰) صندلی نامہ

ظاہر ہے کہ اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے ——— مولوی بھی مطبع کے کارکن تھے۔ کیا اب بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے کہ ان دفتروں کے فارسی مخطوطے صرف نول کشور پریس کو حاصل ہو گئے تھے۔ خواہ وہ قطرات نیساں کی طرح آسمان سے ٹپکے ہوں یا "کنزِ مخفی" کی طرح دفینہ کی صورت میں کسی ویرانے کی کھدائی میں برآمد ہوئے ہوں لیکن اس مرحلہ پر آکر بے اختیارانہ یہ سوال نظر کے سامنے آتا ہے کہ فارسی سے اردو میں ترجمہ ہو جانے کے بعد اصل داستانوں کو اگر ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈال دیا گیا تو وہ پریس کے خزانے کی تحویل میں محفوظ رہے ہوں گے ——— غور کیجئے ایسے فارسی مخطوطے جن سے دنیا بھر کی بڑی بڑی لائبریریاں خالی ہیں، جو نوادر کا درجہ رکھتے ہیں وہ بے شمار کسی کے ہاتھ آ جاتیں تو وہ بغیر کچھ نام کا اعلان کیے ہوئے اگر ان کو حرزِ جان بنا کے تعویذ کی طرح سات غلافوں میں چھپا کے نہ رکھتے۔۔ منشی نول کشور جو صاحبِ نظر، دوربیں، بیدار مغز اور روشن دماغ انسان تھے جنھوں نے اپنی فراست دیانت داری سے "نول کشور پریس" جیسا ادارہ پیدا کیا اور اتنا بڑا ٹرسٹ اپنے پیچھے چھوڑا جو آج بھی ان کے خاندان کے لیے نہ صرف کمائی بلکہ باعثِ فخر ہے لیکن یہ "فارسی مخطوطے" جو کوہ نور ہیروں کے مول ان کو حاصل ہو گئے تھے انھیں "گنجِ شایگاں" یا "گنجِ باد آورد" سمجھ کر محفوظ رکھنے کے بجائے انھوں نے ترجمہ کے بعد ردی میں بیچ دیا ہو، یہ "دیوانے کے خواب" کی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی بات نہیں۔

میری خوش قسمتی "آجکل" راجہ رام کمار بک ڈپو وارث نول کشور کے مشیر ادب امیر حسن صاحب نورانی ہیں جو اسلامیہ کالج لکھنؤ میں شعبہ ادبیات اسلامی کے صدر بھی ہیں اور ماہنامہ "فروغ اردو" بھی آپ ہی کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ میں نے انھیں لکھا اور بوعدہ امداد کے بعد کئی بار درخواست کی کہ پرانے ریکارڈ میں "داستانِ حمزہ" کے فارسی مخطوطے موجود ہوں تو مجھے بتائیں ——— یوں تو اس سلسلہ میں موصوف سے بڑی لمبی خط و کتابت ہوئی اور بہت سی کارآمد باتیں ان سے معلوم ہوئیں لیکن داستان گویوں کے مفصل حالات اور ان مخطوطوں کے متعلق آخر میں انھوں نے جو کچھ مجھے لکھا وہ درج ذیل ہے:۔

"مطلوبہ حالات ان کتابوں میں تو موجود نہیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذریعہ سے کھوج لگا رہا ہوں ——— اصل فارسی داستانوں کا کسی طرح کوئی سراغ نہیں لگتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بنیادی کتاب ضرور تھیں لیکن یہ داستانیں خود مطبع کے ملازم داستان گو روزمرہ سناتے تھے اور کاتب لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کی کوئی اصل بھی محفوظ نہیں رہی (یعنی جو کاتب لکھتے تھے وہ مسودات رہا) ایک چبوترہ پر جو اب بھی بنا ہے یہ لوگ بیٹھتے تھے سامنے کاتب بیٹھتے تھے وہ سنتے اور لکھتے جاتے تھے اس سے زیادہ ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔"

۲۳ اپریل ۵۹ء

داستان گویوں کے جن حالات کا میں خواستگار تھا وہ تو مجھے متعدد یاد دہانیوں کے باوجود آج تک نہیں ملے اور نہ اب کوئی توقع باقی ہے کیونکہ مل سکتے تو مل چکے ہوتے لیکن اس خط نے جو میرے نظریات کے مطابق تھا اور اب تک میرے پاس محفوظ ہے فارسی مخطوطوں کی موجودگی اور ان سے براہِ راست ان داستانوں کے اردو میں ترجمہ ہونے کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ وہ ایک بنیادی کتابوں کی موجودگی سے

مجھے انکار نہیں۔ میرے علم میں ہے کہ شاہان اودھ نے داستانِ حمزہ کو دو بڑی بڑی جلدوں میں لکھوایا تھا۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوشربا جلد ششم کے آخر میں شاہانِ اودھ کی لکھائی ہوئی ان دونوں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

سب سے بڑی اور سب سے زیادہ اندوہناک بات جو فارسی سے ان دفتروں کے براہ راست ترجمہ کے خلاف کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ نوشیرواں نامہ یعنی پہلے دو سے ایرج نامہ یعنی چوتھے دفتر تک جو صاحب ان دفتروں کے مترجم کہے جاتے ہیں یعنی شیخ تصدق حسین وہ داستان گو تو ضرور تھے مگر تھے ناخواندہ یعنی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ دل نواز شیخ صاحب کے زمانہ میں فارسی کا عام گھریلو دستور اور اس کی وہ عام گھریلو فضا تو ہو چکی تھی جس کے ہوتے ہوئے یہ کہا جا سکے کہ داستان جیسی کتاب کے لیے کسی فاضل فارسی جاننے والے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وجہ یہ کہ ایک ناخواندہ شخص فارسی کے عام گھریلو رواج میں تو شاید اس کام کو کر بھی سکتا لیکن اردو میں داستان گوئی کر کے پیٹ بھرنے والے ایک ناخواندہ شخص کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے کہ وہ فارسی سے ترجمہ کر سکے۔

طلسم ہوشربا کے دو لکھنے والے ہیں قمر لکھنوی اور جاہ لکھنوی۔ ان دونوں نے اپنے اپنے مقام پر تسلیم کیا ہے کہ داستان حمزہ اور طلسم ہوشربا دونوں میں خود لکھنؤ کے داستان گویوں نے اضافے کیے ہیں مثلاً جاہ لکھنوی لکھتے ہیں :۔

"یہ بھی واضح ہو کہ صاحب دفتر نے (مراد اصل مصنف سے ہو گی) حال جہانگیر نہیں لکھا ہے بلکہ یہ ٹکڑا اب سے ایک دو سال شیخ تصدق حسین نامی ایک داستان گو جب انھوں نے بیان کیا تھا۔" $(\frac{۴۹۳}{۴})$

گویا طلسم ہوشربا میں جہانگیر بن صاحبقران کی داستان اور طلسم کو کب کے ٹوٹنے کا ماجرا خالص شیخ تصدق حسین کا بڑھایا ہوا ہے۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوشربا کی چھٹی جلد صفحہ ۱۱۸ پر داستانِ حمزہ میں اپنی قطع و برید کے متعلق اور زیادہ واضح اعتراف کیا ہے :۔

"جن صاحبین نے استادانِ قدیم و جدید کو سماعت فرمایا ہے لیکن حقیر کی آبرو بڑھاتے ہیں ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طور سے حقیقت میں دفاتر یعنی نوشیرواں نامہ وغیرہ و طلسم ہوشربا تو نے بیان کیا یہ داستانہائے دل چسپ کبھی نہ سماعت کی تھیں۔"

ابتدائی سطریں پڑھ کر ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ شاید قمر نے طریقہ بیان کی دلکشی کے متعلق کہا ہو لیکن "یہ داستانہائے دلچسپ" جو قمر کی زبان کے علاوہ کبھی سماعت میں نہ آئیں ان سے تو یہی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ قمر نے جہاں موقع پایا کچھ ٹکڑے اپنی طرف سے پیوند کر دیے۔

یہ کیفیت" داستان حمزہ" کی صرف اس عہد سے ہمارے سامنے ہے جب سے اردو میں داستان گوئی کا رواج پڑا۔ اب ذرا ۹۹۸ھ اور ۱۰۲۲ھ سے تیرھویں صدی یعنی تقریباً ۱۲۲۵ھ تک کی اس کیفیت پر غور کیجئے جو فارسی قصہ خوانوں کے عہد میں اس داستان پر گزری ہو گی اس کا ایک اندازہ بوستان خیال سے ہوتا ہے۔ بوستان خیال ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۷۵ھ تک لکھی گئی ہے یعنی داستانِ حمزہ کے ہندوستان میں آنے سے تقریباً سوا صدی کے بعد میر تقی خیال رموز حمزہ کے ساتھ ساتھ کوچک باختر اور بالا باختر کا حوالہ دیتے ہیں —— وجوہ متعلقہ ابصار $(\frac{۶}{۱۰۶})$ گویا اس زمانہ تک نوشیرواں نامہ کوچک باختر اور بالا باختر کے نام بھی مخصوص ہو چکے تھے حالانکہ ابتدائی رموز حمزہ میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں صرف دو نام پائے جاتے ہیں ایرج نامہ اور صندلی نامہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عراق اور ایران کی

رموزِ حمزہ میں اتنی تبدیلیاں اور اضافے نہیں ہوئیں جس قدر ہندوستان کے قصہ خوانوں نے کیں۔

ان تبدیلیوں کا اندازہ رضا لائبریری میں اس داستان کے فارسی مخطوطے دیکھ کر ہوتا ہے جن کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہیں۔

نمبر ۳۰۵۲۔ مجموعہ نوشیرواں نامہ کوچک باختر و بالا باختر و ایرج نامہ مرتبہ میر احمد علی و میر قاسم علی مدت ترتیب ۱۲۹۹ھ تعداد صفحات ۲۰۵۲۔ العقلم رتن لال مصدی نواب احمد علی خان حسب الحکم ... کی ابتدا یوں ہے:۔

"جلد اوّل قصہ سلطان شاہان حلقہ گیر گوش گردن کشان نزلزلہ قاف ثانی سلیمان بزم پیشہ مصاف امیر حمزہ صاحب قران المعروف بہ نوشیرواں نامہ"

اور خاتمہ ان الفاظ پر ہے:۔

"ختم شد نوشیرواں نامہ مع کوچک باختر و بالا باختر و ایرج نامہ و ہفت در بند و غیرہ ہزار شکل چیچ گرداں"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۲۲ھ یا ۹۹۸ھ والے رموزِ حمزہ میں اور طہران کے چھپے ہوئے ۱۲۷۸ھ والے رموزِ حمزہ میں نہ یہ تفصیل ہے نہ طلسم ہزار شکل چیچ گرداں مگر ہندوستان کے ۱۲۷ھ والے مخطوطے میں ہزار شکل اور ہفت در بند و غیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ آخر یہ سب کہاں سے نازل ہوئے اگر فارسی کے قصہ خوانوں نے اصل داستان میں اپنی طرف سے مناسب موقعوں پر اضافے نہیں کیے۔

نمبر ۳۰۵۳ نوشیرواں نامہ .... مرتبہ میر علی حسین اور میر مہدی علی خان تعداد صفحات ۱۰۸۴

نمبر ۳۰۵۴ مجموعہ کوچک باختر و بالا باختر تعداد صفحات ۱۱۳۴

صاف ظاہر ہے کہ ۳۰۵۲ پر نوشیرواں نامہ کوچک باختر، بالا باختر اور ایرج نامہ کا جو مجموعہ تھا اس کے صفحات کی تعداد کل ۲۰۵۲ تھی۔ نمبر ۳۰۵۳ پر صرف نوشیرواں نامہ آیا اور اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۸۴ ہو گئی یعنی صرف نوشیرواں نامہ کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر (۳۲) دو ہزار کے بڑھ گئے۔ یہی حال کوچک باختر اور بالا باختر والے مجموعہ کا ہے کہ ان کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر ۸۲ کے بڑھے ہوئے ہیں۔

یہیں ۳۰۴۸ کے ایرج نامہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں، اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ بارھویں صدی ہجری میں تحریر ہوا ہے اس کے صفحات کی تعداد ۵۰۸ ہے گویا صرف ایرج نامہ کی ضخامت۔

یہ مخطوطے اپنی زبان کے لحاظ سے رموزِ حمزہ تک نہیں پہنچتے بلکہ ان میں ادبی چاشنی نہ ہونے کے برابر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ترتیب دینے والے فارسی کے ادیب نہیں تھے ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فارسی سے جھجکی ہوئی فضا میں کوئی ایسا شخص فارسی لکھتا چلا جاتا ہے اس اپنے زمانے کی عام شہرت کی لسانی بساط سے بلند نہیں بلکہ ۳۰۵۰ پر چیچ گرداں کے نام سے ایک مخطوطہ ہے اس کے ترتیب دینے والے کی فارسی دانی اس مرتبہ کی ہے کہ

(۱) صاحبقراں خواجہ عمرو سے اصرار کر رہے ہیں کہ تم بتاؤ زمرد شاہ لعین تھا کہاں بھاگ گیا اور اگر نہ بتاؤ گے تو جان خود دشما یکے خواہم ساخت (۸۰ سے ۰ اتک کسی صفحہ کی پانچویں سطر)

(۲) صفحہ ۱۳۳ – سابق ازیں دریں مکان کرشاما ندید (کہ تماشائی جمع کرشاما)

(۳) صفحہ ۱۴۶ – پیچاپیش۔ صفحہ ۱۴۳ – مصرعہ دو گھڑی بشنو۔ صفحہ ۱۴۵ – محمود میدکہ کشتی بمعنی غائب شد۔ صفحات ۱۷۱، ۱۴۴ پر دفعتاً اردو لکھنا شروع کر دی ہے۔ مثلاً گفت اے حمزہ صاحبقران مرا ملک صدرتین پروین پرست جو کہ نائب خداوند تہار شکل چیچک گرد ار ہے وہ بھیجا ہے ایلچی دلالت اس نے بھیجا ہے۔

گویا اس مخطوطے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی تو اس دور کے عام دفتری لحاظ سے اختیار کی گئی ہے ورنہ کاتب فارسی سے زیادہ اردو پہ قادر ہے اور جہاں وہ فارسی سے الجھتا ہے بے تکلف اردو شروع کر دیتا ہے لیکن جیسے ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ میں اردو لکھ رہا ہوں اور زمانہ فارسی کا ہے وہ فارسی شروع کر دیتا ہے۔

بہرحال یہ مخطوطے خواہ ان کی ادبی حیثیت کچھ بھی کیوں نہ ہو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ رموزِ حمزہ میں فارسی قصہ خوانوں نے بہت اضافے کیے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے چودھویں صدی کے شروع اور بارھویں صدی ہجری کے اواخر تک قصہ خوانی کا فن جسے اردو میں منتقل ہو جانے کے بعد ہمارے قصہ خوانی کے داستان گوئی کا فن کہا جانے لگا کتاب بہ کتاب نہیں بلکہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے یعنی ہر دور کی کتابوں کا ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں بلکہ ہوا یہ ہے کہ کسی عہد میں کوئی مشہور قصہ خوان پیدا ہوا، اس کے دس بیس شاگرد ہوئے ہر شاگرد اپنے جوہرِ ذاتی کے مطابق قصہ خواں ہو گیا۔ کچھ استادوں نے اپنی طرف سے اصل داستان میں پیوند لگائے کچھ شاگردوں نے استاد ہو کر اپنی شہرت کے بڑھانے کے لیے اور کچھ شاگردوں کے جانشینوں کے ہاتھ میں داستان آئی تو انھوں نے بھی کمی نہیں کی۔ اس عالم میں ذرا اس کا اندازہ بھی کیجیے کہ ہر دور میں صرف ایک ہی قصہ خواں نہ رہا ہوگا یا ایک ہی قصہ خواں کا ایک ہی شاگرد کامل الفن نہ ہوا ہوگا۔ ہر دور میں کئی قصہ خواں ہوں گے، ایک ایک قصہ خواں کے کئی کئی شاگرد اپنے فن میں کامل ہوتے ہوں گے۔ ہر استاد نے دوسرے سے آگے جانے کی کوشش کی ہوگی۔ ہر شاگرد نے اپنے پیر بھائی سے جدا گانہ طرزِ بیان اختیار کرنے کی کوشش کی ہوگی اور داستانِ حمزہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ آگے ہی بڑھتی رہی ہوگی۔

ان حالات میں منشی نولکشور کے اس دور تک جب انھیں اس داستان کو چھپانے کا خیال پیدا ہوا اگر "رموزِ حمزہ" سے آگے بڑھ کر داستانِ حمزہ اپنی مطبوعہ حدود تک آ گئی تھی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اسے ضرور آگے بڑھنا چاہیے تھا۔ یہ ہر عہد کے مشہور قصہ خواں کے ہاتھوں ضرور آگے بڑھی لیکن قصہ خوانی کا فن چونکہ "علومِ سینہ" میں شامل تھا اور ظاہر ہے کہ علمِ سینہ کے متعلق روایت یہی ہے کہ "گنجینہ در سفینہ"۔ اس لیے اس کی کوئی تحریری یادگار کسی عہد میں قائم نہیں ہوتی نہ کبھی یہ موجودہ سلسلے کے ساتھ کتابی صورت میں لکھی گئی ——— اگر ایسا ہوتا اور یہ فارسی میں کبھی سلسلہ وار لکھی جاتی تو اس کے مکمل مخطوطے خواہ بوڈلین لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری میں ہوتے یا نہ ہوتے رضا لائبریری رام پور میں ضرور ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جب روہیل کھنڈ میں روہیلوں کی حکمرانی ادنگنگ تا سنگ سے محدود ہو کر صرف رام پور کی حدود تک رہ گئی اور کمپنی بہادر کی حکومت کی "ناخواستہ سرپرستی" نے "حوصلہ مند اور ہم جو" روہیلوں کی تلواروں کو نیام کر کے گھر کی کھونٹیوں پر لٹکوا دیا تو ان شیرانِ نیستانِ شجاعت نے میدانِ جنگ کی سرفروشیوں کے جذبے کو مہماتِ شعر اور داستانِ جنگ و عشق کی صورت میں ڈھال دیا۔ "پٹھان شاعری کرنے لگے" اور دربار رام پور داستانِ حمزہ صاحبقراں سننے لگا۔ دہلی اور لکھنؤ کے منتخب داستان گو دربارِ رام پور میں جمع ہو گئے چنانچہ بوستانِ خیال کی ژولیدہ بیانی کو رفع کرنے

اور داستانِ حمزہ کو فارسی میں لکھنے اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا خیال نولکشور پریس سے بہت پہلے رامپور میں پیدا ہوا یہ بات بہری نہیں وہ حقیقت ہے جو آج رضا لائبریری میں داستانوں کے اردو اور فارسی مخطوطوں سے ثابت ہوتی ہے۔ آخر کیا بات ہے کہ "رموزِ حمزہ" کے بعد دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں جن میں بانکی پور، پٹنہ، حیدرآباد اور علی گڑھ اور برلن کے کتب خانے بھی ہیں، داستانِ حمزہ کا کوئی باقاعدہ سلسلہ یا بے سلسلہ کوئی کتاب نہیں پائی جاتی اور جو کچھ پایا جاتا ہے رضا لائبریری رامپور میں پایا جاتا ہے۔ اس کام کا سلسلہ وار نہ ہونا اور رامپور میں ہونا یہ بات ثابت کرتا ہے کہ اوّل داستانِ حمزہ کو فارسی میں لکھوانے اور پھر اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کا کام دربارِ رامپور کے پیشِ نظر تھا۔ جس قدر یہ کام بن سکا بننے کی زمانہ نے اجازت دی وہ محفوظ اور موجود ہے اور جو نہ ہو سکا اسے نولکشور پریس لکھنؤ نے خالص تجارتی اصول پر مکمل کر دیا۔

رامپور میں اس کام کے سست رفتاری سے ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس کام کو کر رہے تھے ان کے سامنے کام سے زیادہ اپنی بقا کا بندوبست تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک یہ کام باقی ہے ہماری تنخواہیں اور دربار سے ہماری وابستگی کی بقا ہے اس کے بعد ہم نہیں وقت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اس سبب سے یہ کام سست رفتاری اور بے ترتیبی سے ہوا اور مکمل نہ ہو پایا۔ بہرحال یہ جس قدر مخطوطے رام پور میں ہیں اور کہیں ان کا نہ پایا جانا اس کا مظہر ہے کہ فارسی میں مکمل طور پر داستانِ حمزہ تحریر شدہ صورت میں کہیں نہ تھی۔ اگر کہیں ہوتی تو رامپور پہنچ کر اپنی پوری قیمت وصول کر چکی ہوتی۔ تعجب ہے کہیں نہیں پائی گئی اور قیمت کی زد دائرۂ کشش سے کھینچ کر نہ لا سکی۔ اس لیے کہ کہیں ہوتی تو آتی ——— جس طرح اس عہد کے مشہور داستان گو میر احمد علی مصنف ہوشربا، میر قاسم علی اور بے شمار دوسرے دہلی اور لکھنؤ سے کھنچ کر رامپور آگئے ——— بہرحال یہ کہیں لکھی لکھائی موجود ہوتی تو اپنے قدم سے چل کر رامپور آجاتی۔ اسے آگے تو دربار رامپور نے لکھوانا چاہی۔ لکھی گئی مگر سست رفتاری کے ساتھ اور نامکمل صورت میں ——— عہد نواب احمد سعید خاں سے رامپور کے آخری تاجدار نواب سر محمد رضا علی خاں کے عہد تک، اس کی داستانیں پھر بھی کہی گئیں ——— فی الحال کہنا یہ ہے کہ جن آثار و شواہد اور دلائل کو میں لکھ چکا ہوں ان کی بنا پر اردو میں اشاعت سے پہلے داستانِ حمزہ کا فارسی میں اسی سلسلہ اور اسی تفصیل سے پایا جانا یعنی کتابی صورت میں پایا جانا ثابت نہیں ——— یہ ثابت ہوتا ہے کہ داستانِ حمزہ طلسم ہوشربا کے علاوہ اسی صورت میں داستان گو بیان کرتے تھے نولکشور پریس نے ان داستان گویوں سے سنوا کر اسے اردو میں لکھوایا اور طبع کر کے شائع کر دیا۔

پہلے ۱۹۵۲ء میں

پھر ۱۹۵۴ء میں

نقوش

کے افسانہ نمبر منظرِ عام پر آئے تھے

اب ۱۹۶۰ء میں بھی

ایک غیر فانی افسانوی دستاویز

پیش کی جائے گی

دلؔ شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہانپوری کا وہ غیر مطبوعہ کلام جو مرحوم کے انتقال کے بعد ملا اور جسے اُن کے فرزند شفیق شاہجہانپوری نے ذیل کے نوٹ کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیجا۔

"والد مرحوم کی صحت ۱۹۵۶ء کے آخر سے خراب ہو گئی تھی۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں کولھے کی ہڈی ٹوٹ جانے سے وہ بالکل صاحبِ فراش ہو گئے۔ مگر یہ صبر آزما دور انھوں نے نہایت صبر و شکر کے ساتھ گزارا۔ تقریباً سوا سال وہ بستر پر پڑے رہے۔ اور برابر علمی و ادبی مشاغل جاری رکھے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۵۹ء کی شب ۱۰ بجے فالج کا دورہ پڑا۔ رات بہت اضطراب میں بسر کی اور ایک شعر کہا۔

بہت بے ربطی رودادِ ہستی
سنائی کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

۲۵ دسمبر کی دوپہر تک طبیعت میں سکون رہا مگر رات پھر طبیعت بڑھ گئی۔ بار بار لحاف سے ہاتھ باہر نکالتے تھے۔ آواز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لقوہ کا اثر ہو گیا ہے۔ اسی حالت میں دو مصرعے پڑھے۔

(۱) جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

(۲) اجل اتنی تو مہلت دے کہ اک سجدہ ادا کر لوں۔

۲۶ کی صبح کو پکارا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ قوتِ گویائی ختم ہو چکی تھی۔ ناک سے کچھ خون بھی بہا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہو گیا ہے۔ موت و حیات کی اس کشمکش میں ۱۱ بجے دن کے نہایت سکون کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔ ۷ بجے شام بعد نمازِ مغرب سپردِ خاک کر دیا گیا۔"

○

حسن نے مان لیا قابلِ تعزیر مجھے
نظر آتی ہے محبت کی یہ تقصیر مجھے

کیوں نہ ہو بادۂ پُرجوش کی توقیر مجھے
مل گئی پیرِ خرابات سے تحریر مجھے

جلوۂ حسن کے مفہوم پہ جب غور کیا
ایک دھندلی سی نظر آئی ہے تصویر مجھے

اب مری وحشتِ رسوا کا عجب عالم ہے
کر دیا آپ نے وابستۂ زنجیر مجھے

بے تکلف رخِ زیبا سے اٹھائے وہ نقاب
حسن خود پائے گا اک پیکرِ تصویر مجھے

زندگی اک نئے عالم میں نظر آتی ہے
لے چلی آج کہاں گردشِ تقدیر مجھے

کھو گئی دلکشیٔ حسن مری نظروں میں
جی بہلنے کو ملی آپ کی تصویر مجھے

زلفِ شب گوں رخِ انور کی ستائش کے سوا
کوئی مضمون نہ ملا قابلِ تحریر مجھے

حسنِ دلکش کے تلون پہ نظر جب پہنچی
نہ رہا پھر گلۂ گردشِ تقدیر مجھے

○

ہر سانس ہے شرحِ ناکامی پھر عشق کو رسوا کون کرے
تکمیلِ وفا ہے مٹ جانا، جینے کی تمنا کون کرے

جو غافل تھے ہشیار ہوئے جو سوتے تھے بیدار ہوئے
جس قوم کی فطرت مردہ ہو اس قوم کو زندا کون کرے

ہر صبح کٹی، ہر شام کٹی، بیداد سہی، افتاد سہی
انجامِ محبت جب یہ ہے اس جنس کا سودا کون کرے

حیراں ہیں نگاہیں دل بے خود مجبور ہے حسن بے پروا
اب عرضِ تمنا کس سے ہو اب عرضِ تمنا کون کرے

فطرت ہے ازل سے پابندی کچھ قدر نہیں آزادی کی
نظروں میں ہیں دلکش زنجیریں رُخ جانبِ صحرا کون کرے

○

جہاں تک عشق کی توفیق ہے رنگیں بناتے ہیں
وہ سنتے ہیں ہم ان کو سرگزشتِ دل سناتے ہیں

ادھر حق الیقیں ہے اب وہ آتے اب وہ آتے ہیں
اُدھر اہلِ حرم اس ذہنیت پہ مسکراتے ہیں

شبِ غم اور مجبوری، یہ عالم اور مجبوری
ٹپک پڑتے ہیں آنسو جب وہ ہم کو یاد آتے ہیں

وہیں سے درسِ حسن و عشق کا آغاز ہوتا ہے
جہاں سے واقعاتِ زندگی ہم بھول جاتے ہیں

ہمیں کچھ عشق کے مفہوم پہ ہے تبصرہ کرنا
اک آہِ سرد کو عنوانِ شرحِ غم بناتے ہیں

بہا کر اشکِ خوں کھینچی ہیں جو آئینۂ دل میں
ہم ان موہوم تصویروں کو اب رنگیں بناتے ہیں

شبابِ زندگی، جلووں کا اک معصوم نظارہ
ہمیں اے دل وہ افسانے ابھی تک یاد آتے ہیں

○

بے سود ہے یہ جوشِ گریۂ شمع سحر ہو جانے تک
چھینٹا ترے اشکِ پیہم کا پہنچا نہ کبھی پروانے تک

اے اہلِ نظر میری ہستی سب کچھ تھی کبھی اب کچھ بھی نہیں
زندہ ہوں مگر مہمانِ بقا اک سانس کے آنے جانے تک

ہاں غور سے اک خود دار نظر اپنے ہی گریباں پر ناصح
کیا جانے رہے گا کس حد میں دیوانہ ترے سمجھانے تک

اے خاکِ پریشاں کے ذرّو، آغوش میں تم مجھ کو لے لو
تمکین و خودی کو ٹھکراتا آیا ہوں میں ویرانے تک

آشفتہ نظامِ ہستی ہے کچھ اور نہ برہم ہو جائے
مشاطۂ فطرت کے ہاتھوں گیسوئے بتاں سلجھانے تک

وعدہ ہے مگر کس عالم میں اک شوخ تغافل فطرت کا
جب لیلیٔ شب کے بل کھاتے گیسو اتر آئیں شانے تک

○

اب کوئی غم گسار تمہارا نہیں رہا
دنیا کو اعتبار ہمارا نہیں رہا

اس فرطِ غم میں خون کے آنسو ٹپک پڑے
اب دل بھی راز دار ہمارا نہیں رہا

اس کی حضورِ پیرِ مغاں میں ہے منزلت
جو عہد پائیدار ہمارا نہیں رہا

ہر داغ ابھر کے زخم بنا زخم رشکِ گل
دل مائلِ بہار ہمارا نہیں رہا

یہ ہے مآلِ صحبتِ زاہد جناب دلؔ
رندوں میں اب شمار ہمارا نہیں رہا

حامد عزیز مدنی

اے عروسِ سخن

ہزار درد خریدے ہیں میں نے دل کے لیے
ہزار شیونِ جاں ہے کہ ایک پردۂ ساز
ہزار کاوشِ سخن آشنا کے بعد بھی کچھ
لرز رہی ہے ترے نام سے مری آواز

تجھے خبر ہے مری لے ہے ایک مدت سے
ہجوم گاہ میں مانندِ آتشِ چقماق
اسی خزاں میں جو موجِ نفس کے ساتھ گئی
ملیں گے صوت و صدا کے ہزارہا اوراق

سکونِ ہجر میں بدلی تھی آرزوئے وصال
کہ دستِ شوق سے دامن تھا نارسیدہ بہت
تو ہی تو خلوتی دیر آشنا ——— نکلی
رسومِ پردہ کشائی سے سرکشیدہ بہت

کوئی محل یہ تری برقع افگنی کا نہ تھا
تجھے خبر ہے مرا کارواں ہی راہ میں ہے
یہ نذرِ اوّل و آخر ہے اے عروسِ سخن
رگِ گلو کا لہو تیری بارگاہ میں ہے

معذرت

(معذرت جو بے پشیمانی ہو ہے) تدنی

ہم نے مانا نیا دور ہے ابھی
شبِ تیرہ میں ہیں سینڈکوں کا جلوس

صنعتِ خام کار کے ہاتھوں
عرش کے آئینے میں سب معکوس

ادب و جہد کی زباں ہے اس کے لیے
اجنبی ملک کا کوئی جاسوس

اس کی لکنت ہے آپ اک معترض
اس کی فرہنگ طائرِ محبوس

بدگمانِ محاورات ہے یہ
میوۂ خشک و تر سے ہے مایوس

اس کے شربِ مدام کی خاطر
ہر پیالے میں عکسِ چین و روس

اس کے ارژنگ میں نہیں ملتے
چشمِ آہو و کلغیِ طاؤس

یہ کہ محرومِ دانشِ پیشیں
یہ کہ ناآشنائے گبر و مجوس

لیکن اسے قبلۂ سخن گویاں
خام طبعانِ راہ کا یہ جلوس

کس سے کہیے کہ کس طرف ہے رواں
بات پر بھول راہ نامانوس

ہر نفس اک سکوتِ مرگ اثر
ہر نفس اک صدا ہے قرنا و کوس

ہر ہیولے میں ایک عالمِ جان
ہر تصور میں دامِ محسوس

جن رصدگاہ کے پڑھاتے ہیں
ہندسہ و ہیئت کا نیا قابوس

ہر مساواتِ کیمیائی ہے
سرِ مجلس اشارۂ مانوس

آج جادوگروں کے منتر سے
کوزۂ گل میں بحرِ اقیانوس

فرصتِ یک نفس نہیں ملتی
ایک ہی رٹ ہے کوئی ماگھ نہ پوس

دل میں اُتری ہے موجِ زہر آگیں
سر پہ ٹھہری ہے ساعتِ منحوس

کیا حنا بندیٔ عروسِ خیال
کیا عروسِ خیال کا ملبوس

رشتہ ہائے نظر دھواں ہیں تمام
بجھ گئی شمع سج گئے فانوس

زخم سر سے بدل گئے یہ لوگ
تابِ صد آبگینۂ ناموس

جُرم

کل صبح کی تازہ دم ہوا میں
بازو پہ مرے وہ سو گیا تھا

تالیفِ خیال کر رہی تھی
اسلوبِ بدن کی خوشگواری
کیا کیا تھی نزاکتوں کی ہمراز
چادر تھی کہ نافۂ تتاری
ساحل کے سکوں میں کھو گیا تھا
ٹھہرا ہوا رودِ ہم کناری
کب سے ہے وصال کا یہ انداز
آئینِ وجود و ضربِ کاری
جو ہاتھ اُٹھے حریفِ تعزیر
اس ہاتھ کی ضرور پاسداری
اِنسان کے قدیم جرم ہی نے
رکھ دی تھی بنائے غم گساری

آبادی کے دائرے

اے برادر، راز داں مکّاریٔ تازی کچھ نہ پوچھ
یہ سرِ قرطاس آبادی کے لاکھوں دائرے
کس کے یہ تابوت ہیں کس کی عماری کچھ نہ پوچھ

سرد تاریکی ہیں دھندلے دائرے کھوئے ہوئے
بے نکالی کھیتیاں تکنیک کی ہیں دور تک
بیج چوب و دار کے الفاظ ہیں بوئے ہوئے

دائرے تاریک، خونیں، آتشیں، ژولیدہ مو
آپ خود اپنا غیاب و آپ خود اپنا حضور
جنبشِ پرکار کا دوڑا نہیں جن میں لہو

نیشِ عقرب کی طرح حرص و ہوا کی بے کلی
دل زدوں کے دائرے تیرہ طلب کی بارکیں
رشک کے تاریک کوچے خوف کی اندھی گلی

ذہن کے زینے، پرانی بوتلیں، میراثِ جد
علم کی بے حس کمیں گاہیں جن کی اوٹ سے
کاٹ دی ہے دیمکوں نے زندگی کی تازہ سند

مہ وشانِ نیم رُخ کے دائرے عصیاں کے خواب
آسیا گرداں بتول و مریم تنہا نشیں!
آتشِ خوابِ زلیخا، روزنِ زنداں کے خواب

اک بدن رقاصِ حبشی، آبنوسی اک شجر
طبل کی آواز سے جفتی درندوں کی عیاں
مہ وشانِ نیم عریاں کی بلوتی ہے ـــ کمر

دائرے زرخیز، چٹیل آب و روغن کے حصار
بطنِ معدن آگ دریاؤں کے چہرے آئینے
حلقہ ہائے باد و باراں، کشت و خرمن کے حصار

ٹینک سے دبتے ہوئے بیجوں میں فصلیں بے سبیل
رحم میں تاریخِ انقلابِ جہاں، لب پر سوال
خشک سالی، خشک سالی سے زمیں کے رُخ پہ نیل

سخت تر باکی دھوپ میں ضو فشاں محنت کی آنکھ
سوئیاں میتاب میٹر گنج ہیں محوِ شمار،
پڑھ رہی ہیں ایک تحریرِ رواں محنت کی آنکھ

ساحلوں کا جن ہے خوابیدہ جہازوں کی قطار
پی رہے ہیں رات کی نیلی سیاہی میں لہو
دہ رنگ پٹرول کے چشموں پہ گرگ ریشہ دار

نیم شب دل میں مگر رم خوردہ معیاروں کے کھیل
بازیٔ چوگاں، خداؤں کی بساطِ خاک پر
خون منہ کو لگ گیا ہے ایسے اوتاروں کے کھیل

وقت ہے نقوی مرے ذوقِ جنوں کے رازداں
سر بریدہ جرأتیں، روندی ہوئی لاشوں کے غم
زندگی کی دوڑ میں یک نیزہ خوں کے رازداں

اے برادر یوں نہ جا ان دائروں کے درمیاں
تیرتا ہے اس فضا میں اک تبسم ارواح کا
اس طرف دوزخ کی آبادی کا آتا ہے دھواں

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں
راستہ کھویا ہوا، تاریک جنگل ہے محیط
روشنی آتی نہیں ہے علم سے آگاہ میں

کوئی شاخ آشنا

شہر پر نیلے دھوئیں کی ساری زنجیر ہے
جل رہا ہے سینۂ خورشید میں داغِ غروب
روشنی مجروح طائر کی طرح — دلگیر ہے

کچھ غلامانِ کہن پرچھائیاں حبشی نژاد
کھینچنے نکلے ہیں عصیاں کا سبک رفتار رتھ
وقت کی جنبش بدی کے چاک کو دیتی ہے داد

خواب و بیداری کے تیرہ فاصلوں کے درمیاں
کتنے اندیشوں کی بے حلقہ جبیں کھول کر
ناپتا ہے اس خلا کو ایک وقتِ رائگاں

رات کے ہاتھوں چلے جانے کو ہیں نیلام میں
شہر، بندرگاہ، سیارے، سمندر، روشنی
دور تک بکھری ہوئی اشیا ہیں اک گودام میں

جزر و مد کے بیچ میں ساحل کا ساکت پاؤں ہے
سو رہے ہیں آہنی جہازوں کے قطار اندر قطار
سینۂ قلزم میں گم ہوتی ہوئی اک چھاؤں ہے

روحِ قزاق و سکندر، گفتگو میں محو ہے
ان حریفانِ تلاطم سے کبھی سر ہوتا نہیں
قلزمِ بیتاب کس کی آرزو میں محو ہے

دور تک ہے اس فضا میں خوابِ بیداری کی جھنک
شہر سے گذری ہے آوارہ ہوا ترکش بدوش
جانے کس سینہ میں اترے ظلمتِ شب کا خدنگ

دور تاریکی کی چادر سے شرر اڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریلوے کی ورکشاپ
اک دھویں میں آہنی فیلوں کے دل دھڑکتے ہوئے

اس فضا میں وقت، دورِ ہجر و آغوشِ وصال
اک شجر جو نصف تازہ نصف کرم آلودہ ہے
طالبِ جاں قرب پر پھینکا ہوا دوری کا جال

تیز قندیلوں میں سعیِ زندگی کے زاویے
رہگذر پر سیکڑوں رنگوں کی اک پیکار ہے
خستگی کے زاویے، وابستگی کے زاویے

چشمکِ ادراک کے خوابِ جنوں کے مرحلے
طعنۂ نایافت دیتی ایک روحِ ابر و باد
مرگ کی قوسیں، تغیر کے ہزاروں سلسلے

اس فضا میں وقت۔ روحِ جنبش و جانِ جمود
تتلیوں کے پر، سپہلی روپوں کے نازک جسم میں
استخوانوں سے نپٹتی زندگی کی موجِ دُود

آرزوئے زندگانی، اجتنابِ زندگی
کربِ تولید و فشارِ جانکنی کی ساعتیں
درد کے اعشاریوں میں اک حسابِ زندگی

اے دلِ اے پائمالِ جاناں، اے مری بیتابِ روح
ڈھونڈ تو بھی درد کے تنہا نشیمن کے لیے
کوئی شاخِ آشنا، بے آشیاں بے خواب روح

فراق گورکھپوری

○

یاد آتی ہیں تری رعنائیاں
دل میں پڑتی ہیں کئی پرچھائیاں

جلوے کو تکرار ممکن ہی نہیں
کتنی یکتا ہیں تری یکتائیاں

زندگی گھبرا اٹھوں یوں کٹ گئی
پوچھتے ہو کیا مری تنہائیاں

آفتابوں پر کمندیں ڈال دیں
اُف مری تخئیل کی گیرائیاں

کیا سمجھتا تھا کوئی جانِ بہار
رنگ لائیں گی مری رسوائیاں

دونوں عالم لائیں گی زیرِ نگیں
بے نوائے عشق کی دارائیاں

خالقِ آفاق بھی دیکھا کیا
مُشت مُشتِ خاک کی پیدائیاں

زندگی کے راز مجھ سے جان لے
میری نادانی نہ کُل دانائیاں

خار و خس بھی بن گئے شاخِ نبات
ان نگاہوں کی حیات افزائیاں

ہاں نہ تھا یہ دل جب اک اُجڑا نگر
یاد آتی ہیں وہ بزم آرائیاں

زندگی کو ان نگاہوں کے طفیل
موت کی آنے لگیں انگڑائیاں

عشق کو یارو بُرا کہتے تو ہو
اس میں پاؤ گے کہیں اچھائیاں

عشق کے کچھ جھوٹ ہم سنتے گئے
ہاتھ کچھ آتی گئیں سچائیاں

نہ سُنی میری نہ دنیا کی سُنی
عشق کی اللہ رے خودرائیاں

زیرِ پا بھی دور بھی ہیں منزلیں
دیدنی ہیں عشق کی پسپائیاں

کھنچتی جاتی ہیں دلوں کی شہ رگیں
اُف تری اُٹھتی ہوئی برنائیاں

دیکھ آ سنے آج یادوں کا نگر
ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں

ذرہ ذرہ اس خرابے کا فراق
ہے دو عالم کی لیے پہنائیاں

احمد ندیم قاسمی

○

کتنے نالے تھے جو شرمندۂ تاثیر ہوئے
ریگِ زریں پہ کبھی قصر نہ تعمیر ہوئے

جن کو شاخوں سے اڑا لے گئیں امواجِ صبا
وہی گُل خاکِ چمن کے لیے اکسیر ہوئے

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پو بھی
کبھی دنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہوئے

ہم اصولوں کے حصاروں میں چھپے لاکھ، مگر
اک نگاہِ غلط انداز سے تسخیر ہوئے

وہی آواز کی قوسیں، وہی تانوں کے خطوط
چند نغمے تھے جو مل کر تری تصویر ہوئے

ایک انداز تو ہے بے سر و سامانی کا
ہم تری دھن میں ترے غم سے بغلگیر ہوئے

ایک امیدِ ملاقات نے مرنے نہ دیا
زندگی بھر ترے پیماں ہی عناں گیر ہوئے

تجھ سے مل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی
کچھ نئے خواب ترے خواب کی تعبیر ہوئے

اک خلا طے ہوئی اک اور خلا کی حد پر
اپنے شہپر نہ ہوئے، حلقۂ زنجیر ہوئے

ہم نے لفظوں میں لہو اپنا دمکتا پایا
لوگ وارفتۂ رنگینیٔ تحریر ہوئے

صوفی تبسم

جب اشک تری یاد میں آنکھوں سے ڈھلے ہیں
تاروں کے دیئے صورتِ پروانہ جلے ہیں

کیا جانیئے یہ رند بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
ساقی کی نگاہوں کے اشاروں پہ چلے ہیں

سو بار بسائی ہے شبِ وصل کی جنت
سو بار غمِ ہجر کے شعلوں میں جلے ہیں

ہر آن اُمنگوں کے بدلتے رہے تیور
ہر آن محبت میں نئی راہ چلے ہیں

مہتاب سے چہرے تھے ستاروں کی نگاہیں
ہم لوگ انھی چاند ستاروں میں پلے ہیں

نوچے ہیں کبھی ہم نے حوادث کے گریباں
ناکامیٔ کوشش پہ کبھی ہاتھ ملے ہیں

تاریک فضاؤں کے اُبھرتے رہے طوفاں
پھر بھی تری یادوں کے دیئے خوب جلے ہیں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی بہاریں
اُس گلکدۂ ناز کے سائے کے تلے ہیں

یونہی تو دل آویز نہیں شعرِ تبسم
یہ نقش ترے حسن کے سانچے میں ڈھلے ہیں

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم

جگن ناتھ آزاد

برادرم، آداب!

بُرا نہ مانیں، میں اس قسم کی براہِ راست شاعری کے بڑا خلاف ہوں ایک آدھ چیز پہلے بھی (بادلِ نخواستہ) چھاپ چکا ہوں۔ مزید نہ چھپوائیں۔ آپ اس عمر میں زندہ ہیں۔ میں آج سے بھی پہلے مر چکا ہوں بات یہ ہے کہ میں شاعری اُسے ہی سمجھتا ہوں۔ جو اشاروں اور کنایوں میں ہو۔ میں اشتہار کو پسند نہیں کرتا۔ (مدیر)

(غالباً یہ میرے ہی خط کے جواب میں جناب آزاد نے نظم کہی ہے)

ایک خط کے جواب میں

اے آسمانِ صدق و صفا کے مہِ تمام
اے تیری یاد مرجعِ تکریم و احترام
ہر لفظ تیرا بادۂ اخلاص کا ہے جام
میرے سخن سے آج حزیں ہے تو شادکام
تیری طرف سے گرچہ شکایت کی بات ہے
لیکن مری نظر میں محبت کی بات ہے
ظاہر ہوا ہے یہ ترے تازہ پیام سے
تجھ کو ذرا سا شکوہ ہے میرے کلام سے
چھلکی ہے مے جو میرے تغزل کے جام سے
شاید کہ ہٹ گیا ہوں کچھ اپنے مقام سے
کل تھا جو ذکرِ عظمتِ انساں لیے ہوئے
وہ دل ہے آج کیوں غمِ جاناں لیے ہوئے

اے میرا فخر و ناز ترا حسنِ التفات — مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
محبوب کا ہو غم کہ زمانے کے حادثات — خاموش رہ سکے نہ کبھی دل کے واردات
اک نظم ایک رنگ کی تصویر ہی تو ہے
اک شمع ایک وضع کی تنویر ہی تو ہے

میرے کلام میں ہے اندھیرا بھی نور بھی — راتوں کی تیرگی بھی، سحر کا ظہور بھی
طوفانِ کرب کا بھی، طرب کا وفور بھی — دل صبر و شکر بھی ہے مرا، ناصبور بھی
غم میں بھی ہوں خوشی کے بہانے لیے ہوئے
سینے میں درد لب پہ ترانے لیے ہوئے

مانند جامِ جم ہے مری شاعری کا جام — نغمہ کہیں جنوں کا، خرد کا کہیں پیام
اک رُخ نے ذکرِ صبح تو اک رُخ نے ذکرِ شام — لیکن کہیں نہیں ہے تصنع کا اہتمام
خود فکر لفظ بن کے زباں سے نکل گیا
جو دل میں آگیا وہ تغزل میں ڈھل گیا

میرے کلام میں ہے سیاست کا رنگ بھی — تصویرِ صلح بھی ہے تماشائے جنگ بھی
ہے ولولہ بھی جوشِ جنوں بھی امنگ بھی — تیغ و تفنگ بھی ہے رباب اور چنگ بھی
اس میں ہے خامشی بھی ترنم بھی اس میں ہے
فریاد بھی ہے اس میں تبسم بھی اس میں ہے

گہرائی بحر کی بھی پہاڑوں کا اوج بھی — میرا سخن ہے ساحلِ دریا کی موج بھی
اس میں دکھائی دیتی ہے جوانوں کی فوج بھی — دراج و سار و طوطی و بلبل کے زوج بھی
ساحل کا ہے سکون بھی ندی کا شور بھی
لہروں کے زمزمے بھی بھنور کا ہے زور بھی

محمود کا بیاں بھی ہے ذکرِ ایاز بھی — گویا نیاز بھی ہے مرا شعر ناز بھی
اس میں ہیں زندگی کے مسائل بھی راز بھی — میرے سخن میں سوز بھی ہے اور ساز بھی
محبوب کا الم بھی زمانے کا غم بھی ہے
بے کیفیٔ حیات بھی ہے کیف و کم بھی ہے

شاید کچھ اس میں فلسفۂ زندگی بھی ہو — علم و عمل کے ذکر کی تابندگی بھی ہو
ممکن ہے شمعِ فکر کی رخشندگی بھی ہو — کچھ زیست کی گداز سے پائندگی بھی ہو
شاید نہاں ہو اس میں خموشی بھی ذکر بھی
اقبال کا گداز بھی غالب کی فکر بھی

مانا کہ اپنے دل کے سکوں سے ہوں دور بھی   ہوں فیض یابِ لذتِ کیفِ حضور بھی
ہوں اپنے ہوش میں بھی نشے میں ہوں چور بھی   ہوں صاحبِ جنوں بھی مگر باشعور بھی
دیوانگی کو دل میں جو پالے ہوئے ہوں میں
اس کو بہ فیضِ عقل سنبھالے ہوئے ہوں میں

ضو اس میں عشق کی تو خرد کا ہے نور بھی   اس جام میں ہے علم کی مے کا سرور بھی
جس بزم میں ہے جوشِ جنوں کا وفور بھی   اس میں ضیا طراز ہے شمعِ شعور بھی
دل سرنگوں ہے عقل کے دربار میں کبھی
آوارہ حسن و عشق کے بازار میں کبھی

اس میں ہے سازِ دیر تو سوزِ حرم بھی ہے   یزداں کا ہے جلال، جمالِ صنم بھی ہے
شاہی کی اس میں عظمت و جاہ و حشم بھی ہے   جمہور کا اسی میں پرافشاں علم بھی ہے
دل اپنا ذرّے ذرّے پہ قرباں کیے ہوئے
یہ کائنات کو ہے جلو میں لیے ہوئے

پیغمبروں کا ذکر مری شاعری کی جان   قائم اسی کے دم سے ہے میرے سخن کی آن
کچھ منکروں نے بھی تو دکھائی ہے آن بان   یہ بھی ہیں میری بزمِ تکلّم کے میہمان
ذرّے بھی بزم میں ہیں ستاروں کی ضو بھی ہے
ظلمت کی رَو بھی اور چراغوں کی لَو بھی ہے

تلخابۂ حیات کے ساغر پیے ہوئے   کیا جانے کتنے زخم ہوں دل پر لیے ہوئے
اک ہاتھ اپنا دستِ جنوں میں دیئے ہوئے   اک ہاتھ سے ہوں چاک گریباں سیے ہوئے
ہیں پاؤں خار پر تو نظر پھول پر مری
گل ریز و عطر بیز ہے یوں رہگزر مری

اس شاعری میں فکر کی پیدا جھلک بھی ہے   کیفیتِ حیاتِ بشر کی لہک بھی ہے
درد و گدازِ عشق و جنوں کی کسک بھی ہے   اک گلبدن کے ذکر کی اس میں مہک بھی ہے
حیرت میں ہوں میں اُس کو فقط گلبدن کہوں
یا نو بہارِ نازِ فضائے چمن کہوں

اُس نو بہارِ ناز سے اک دل کی بات تھی   وہ نغمہ جس میں اک مری مشکل کی بات تھی
طوفاں میں گھر کے لذتِ ساحل کی بات تھی   منزل سے دُور راحتِ منزل کی بات تھی
میں بات کر رہا تھا بڑے احترام سے
اپنی نیازمندیٔ دل کے مقام سے

دوشِ ہوا پہ کل جو رواں تھا ادا کلام — شاید تری نگاہ میں تھی وہ شرابِ خام
در اصل میرے خون سے لبریز تھا وہ جام — اس میں سمٹ گئی تھی مری زندگی تمام

میرا لہو تھا وہ جو مرے شیشے کی مے نہ تھی
ہوں معترف کہ وہ ترے پینے کی شے نہ تھی

اس پر بھی اپنے آپ سے کچھ بے خبر ہوں میں — کھلتا نہیں ہے پھول ہوں میں یا ثمر ہوں میں
شبنم ہوں میں کہ اشک ہوں یا گوہرِ یتیم — جلوہ نہاں ہے اور سراپا نظر ہوں میں

کعبے کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے
مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

فضل کریم فضلیؔ

○

آرزوئے دل نہ بڑھنی تھی مگر بڑھتی گئی
مختصر سی بات، قصہ مختصر بڑھتی گئی

ہم نے چاہا تھا انہیں حدِ نظر تک ڈھونڈ آئیں
جس قدر بڑھتے گئے حدِ نظر بڑھتی گئی

ویسے ویسے دل میں پیدا وسوسے ہوتے گئے
جیسے جیسے ان کے آنے کی خبر بڑھتی گئی

اور تو سب نقش دل سے خود بخود مٹتے گئے
ایک ان کی یاد تھی جو عمر بھر بڑھتی گئی

بحرِ عصیاں بڑھتے بڑھتے چشمِ گریاں بن گیا
کیجیے کیا وسعتِ دامانِ تر بڑھتی گئی

ہر دعائے بے اثر کا یہ اثر الٹا ہوا
ہر دعا کے ساتھ امیدِ اثر بڑھتی گئی

راہ بھی پُرپیچ تھی، رہبر بھی ناواقف سے تھے
دُوریٔ منزل، درازیٔ سفر بڑھتی گئی

داخلِ زنداں اسیرانِ وفا ہوتے گئے
اور بھی کچھ رونقِ دیوار و در بڑھتی گئی

زیرِ لب فریاد پر بھی سرگراں صیّاد ہے
اور نصیبِ دشمناں یہ لے اگر بڑھتی گئی؟

جیسے جیسے اہلِ فن پر بندشیں ہوتی گئیں
ویسے ویسے شوخیٔ خونِ جگر بڑھتی گئی

ہے تو فضلیؔ بے ہنر، لیکن اب اس کا کیا علاج
اس کے دم سے دمبدم قدرِ ہنر بڑھتی گئی

عبدالحمید عدمؔ

○

میکدے کا تیز پانی اور ہے
نشۂ عہدِ جوانی اور ہے

آپ کو نیند آئی ہے تو کل سہی
صرف تھوڑی سی کہانی اور ہے

میرے مرنے پر بھی تم راضی نہیں
کیا ابھی کچھ بدگمانی اور ہے

جوئے شیر اور کوہکن جانے بھی دو
اس کے در پردہ کہانی اور ہے

کاٹ ہے تلوار کی بھی کچھ مگر
تیری پلکوں کی روانی اور ہے

توبہ کرتا ہوں تو آتا ہے خیال
ایک جام ارغوانی اور ہے

دشمنوں کے دل تو ٹھنڈے ہو گئے
دوستوں کی مہربانی اور ہے

○

نزاعِ دیر و کعبہ بڑھ گئی ہے
خدا کو مان اب پردہ اٹھا دے

اگر میں بھول سکتا ہوں تو ظالم
خدا کے واسطے مجھ کو بھلا دے

دعائیں دینے والے خیر تیری
مجھے آج ایک جھوٹی بد دعا دے

کوئی برتاؤ تو کر بے مروت
مجھے جرمِ محبت کی سزا دے

مری توبہ کی ساقی لاج رکھ کچھ
میں مانگوں یا نہ مانگوں تو پلا دے

یہ تنہائی کا جلنا بھی عدمؔ کیا
چراغِ زیست کو ہنس کر بجھا دے

عبدالمجید حیرت

○

دنیا میں جہاں بھی جائیے گا
دُکھ، درد ضرور پائیے گا
راحت بھی ضرور پائیے گا
تکلیف اگر اُٹھائیے گا

پھر کون کرے گا دلنوازی
جب آپ ہی دل دُکھائیے گا
ممکن ہو تو غم سے چھوٹنے کی
تدبیر کوئی بتائیے گا

کانٹوں میں کہیں اُلجھ نہ جائے
دامن کو ذرا بچائیے گا
ہوتی ہے ہر ایک بات کی حد
حد سے نہ قدم بڑھائیے گا

دنیا ہی میں جب نہیں رہ تو آخر
کیا حشر میں کام آئیے گا
ہر پھول ہے خندہ زن چمن میں
کیا آپ نہ مسکرائیے گا

ہے آپ کا وہ بھی اِک دعا گو
حیرتؔ کو نہ بھول جائیے گا

معصوم گناہگار

(ایک باغِ حیوانات کو دیکھ کر)

پروفیسر شور

یہ صحرائی کہ سب شہروں میں رسوا جن کی خونخواری
نہ یہ "پاپا"، نہ یہ "ملا"، نہ یہ "راہب" نہ یہ "صوفی"
نہ دامِ معبد و ہیکل، نہ فتراکِ کلیسائی
کسی کوٹھے میں یہ جھوٹی حدیثیں گھڑ نہیں سکتے
نہ عصمت کی کوئی منڈی، نہ دلالوں سے پیسے ہیں
نہ "زرتشتی" نہ "زناری" نہ یہ "بابی" نہ "نصرانی"
نہ سجدوں کے نشانوں سے کوئی مغرور پیشانی
نہ ہونٹوں پر ہنسی جھوٹی، نہ زہر آلودہ دلداری
نہ سکوں کی تلاوت ہے "نہ کفر و دین" کی ذلت
شمار ان کا نہیں زر کے تراشیدہ کمینوں میں
"کلاہِ یار جنگی" ہے نہ "کفشِ آسماں جاہی"
ضمیر و قلب کو "سونے" کی لو پگھلا نہیں سکتی
کسی "پوشاکِ زریں" سے نظر دھوکا نہیں کھاتی

نہ ان کا "فقر" نیلامی، نہ ان کا "دین" بازاری
نہ یہ "نازی" نہ یہ "تازی"، نہ یہ "مصری" نہ یہ "کوفی"
نہ زناروں کے پھندے ہیں نہ تسبیحوں کی گیرائی
کسی منبر کے اوپر یہ درندے چڑھ نہیں سکتے
نہ شامِ ذکر و قوالی نہ چکلوں کے اندھیرے ہیں
نہ سینہ ہے کوئی کالا، نہ ماتھا کوئی نورانی
نہ ہاتھوں پر کسی کے خون سے قشقوں کی تابانی
نہ اخلاقوں کی عیاری، نہ آدابوں کی پُرکاری
نہ یہ "دوشنہ" کے پیغمبر، نہ یہ جاگیر کی اُمت
نہ صبحیں ان کے ہونٹوں پر نہ راتیں ان کے سینوں میں
نہ زنجیروں کی تاریکی، نہ قندیلِ شہنشاہی
ہوائے "بام و در" دشت و جبل تک جا نہیں سکتی
یہاں "سونے" کی تاریکی کہیں پائی نہیں جاتی

یہ "حیواں" جن کا "تخت و تاج" سے کوئی نہیں ناتا
انھیں خود اپنی نسلوں کو نگل جانا نہیں آتا!

اِس بار

سلامؔ مچھلی شہری

مہک دلوں کے چمن زار
جھوم ساز کے تار،
نظر پڑے ہیں "جنونِ خرد" کے پھر آثار ـــــ !

مجھے یقین ہے تیرے جواں شگوفوں پر
مجھے یقیں ہے شگفتہ، جواں نغموں پہ
مجھے یقیں ہے چراغِ سکوں کے جلووں پر
ترے نصیب میں ہے فتح دائمی اِس بار ـــــ !!
عجب فضا ہے، نہ موجِ سکوں نہ طوفاں ہے
جہاں جہاں بھی ہے ملّاح سخت حیراں ہے
اَجَل قریب ہے یا زندگی کا ساماں ہے ؟
یہ کیوں رواں ہیں فلک پر "طیورِ آتش بار" ؟ !
سوال یہ ہے کہ پھولوں میں آگ ہے کہ نہیں
سوال یہ ہے کہ نغموں میں آگ ہے کہ نہیں
زمیں کی شمع کے جلووں میں آگ ہے کہ نہیں
اگر یہ ہے تو ہم اہلِ چمن بھی ہیں تیار
یونہی بڑھائے چلو کاروانِ صبحِ بہار ـــــ ؟ !!

گڑیا رانی

نور بجنوری

تری مانگ میں سرخ چراغ جلے
کوئی دور ہی دور سے ہاتھ ملے

ترے شیش محل کا انوکھا سماں
کہیں ہار سنگھار ہے شعلہ فشاں
کہیں پیار کا چاند سسکتا ہوا
کہیں لعل و گہر کی نشیلی تھکاں
کہیں دھوپ چڑھے کہیں رات ڈھلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

ترے در پہ ہجوم بہاروں کا ہے
تری راہ میں ڈھیر ستاروں کا ہے
ترے ہاتھوں کی مہندی سلگتی ہے کیوں
تری آنکھوں میں باغ چناروں کا ہے
تجھے کس نے لگا لیا بڑھ کے گلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

کوئی بیتے دنوں کی کٹار لیے
ترے ہونٹوں سے چاہ کا زہر پیے
یونہی تیرے گھروندوں میں آگ بھرے
یونہی روپ بدل کے نئے سے نئے
کبھی دور رہے کبھی ساتھ چلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

شفقت کاظمی

○

تیرے ہر جور پہ یاں شکرِ خدا ہے اے دوست
کہ یہی مسلکِ اربابِ وفا ہے اے دوست

ہم کو اس عہدِ وفا سے تھیں امیدیں کتنی
تجھ کو جو عہدِ وفا بھول چکا ہے اے دوست

تیری جانب سے نہ لائی کوئی پیغام کبھی
میری فریاد بھی صحرا کی صدا ہے اے دوست

تیرے آنے کی دوبارہ جو کوئی آس نہیں
کتنی سنسان مرے دل کی فضا ہے اے دوست

تیری یادوں سے بھی تسکینِ تمنا نہ ہوئی
وقت ہم پر کبھی ایسا بھی پڑا ہے اے دوست

کیا عجب ہے کہ تری رنجشِ بیجا کے سبب
تیرے شفقت کو سرِ ترکِ وفا ہے اے دوست

کوثر نیازی

○

باغباں کے طور یہ سمجھا گئے
فصلِ گل میں پھول کیوں مرجھا گئے

اب تو اے ظالم زمانے! رحم کر
اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

اس لیے شاید نہ پوچھا حالِ دل
میری حالت دیکھ کر گھبرا گئے

شغلِ مے بے منتِ موسم رہا
جام کھنکائے تو بادل چھا گئے

ان خنک جلووں میں گرمی تو نہ تھی
کیوں نگاہوں کو پسینے آ گئے

شامِ غم سے پوچھ لیں گے ہم مزاج
آپ کے گیسو اگر لہرا گئے

دشمنوں سے بھی گلہ جاتا رہا
دوست ہم پر وہ کرم فرما گئے

موت ہے اس جرم کی کوثر سزا
ہم فریبِ زندگی کیوں کھا گئے

یوسف جمال انصاری

○

حسن و صہبا سے دل ہوا جو گداز
میں تھا اپنے سے محوِ ناز و نیاز

روح و دل میں ہیں بتکدے کتنے
سوئے کعبہ نہیں مری پرواز

پہلے خود کو تلاش کر لوں میں
کھل ہی جائے گا کائنات کا راز

سفرِ زیست کی نہیں منزل
حدِ آخر بھی نقطۂ آغاز

موت اِک جھٹپٹے کا دریا ہے
زندگی ایک دُور کی آواز

یہ نظارے ہیں یا اشارے ہیں
گلشنِ دہر ہے کہ گلشنِ راز

اے حسیں! بے عمل نہ کہہ مجھکو
اور اگر کھینچ لوں ردائے مجاز

کسریٰ منہاس

○

نیازِ بے اثر کی ناز برداری پہ روتا ہوں
وہ بے ہم ہیں میں انجام پرستاری پہ روتا ہوں

تری خاطر سے واعظ! میں نے توبہ کر تو لی لیکن
درِ میخانہ ٹھکرا کر گنہ گاری پہ روتا ہوں

ہوئی محشر میں سب کے سامنے پرسش گناہوں کی
نگاہِ منفعل میں رحمتِ باری پہ روتا ہوں

ہوئے ہیں خشک آنسو شدّتِ سوزِ محبت سے
وفائے عشق میں آنکھوں کی ناداری پہ روتا ہوں

مجھے بربادیٔ دل کا گلہ تھا عشق سے پہلے
نگاہِ شوخ اب تیری نگوں ساری پہ روتا ہوں

ابھی اک جلوۂ دلکش نگاہوں کے مقابل تھا
کھلی جب آنکھ تو میں اپنی بیداری پہ روتا ہوں

ابھی تک احترامِ عشق سے بیگانہ ہے کوئی
دلِ حسرت زدہ تیری وفاداری پہ روتا ہوں

نظر کے سامنے آ کر نظر سے یوں نہاں رہنا
مذاقِ حسن تیری آشنا داری پہ روتا ہوں

نہ وہ اگلی سی دھڑکن ہے نہ وہ اگلی سی بیتابی
مدد اے درد! دل کی سرد بازاری پہ روتا ہوں

کہنے کی جو باتیں تھیں وہ لب تک آ گئیں کسریٰ!
پشیماں ہو کے اب انجام سے خواری پہ روتا ہوں

جمیل ملک

○

خوشبو نے پیرہن سے سلگتے رہے دماغ
آئی شبِ فراق تو گل ہو گئے چراغ

دل کی لگی بھڑک کے نگاہوں تک آ گئی
پلکوں پہ شامِ وصل جلائے ہیں دل کے داغ

اس چشمِ مے فروش سے ہنگامِ بادہ نوش
پھوٹا وہ سیلِ نور کہ لَو دے اُٹھے ایاغ

آخر کھُلا کہ تو ہے مرے گھر کی روشنی
یوں تو ترے بغیر بھی جلتے رہے چراغ

وہ گل کھِلیں کہ جن کی مہک لازوال ہو
اس ایک دُھن میں ہم نے سجائے ہیں کتنے باغ

جب چشم و دل بجھے تو شبستانِ شوق میں
ہم نے ہتھیلیوں پہ جلائے ہیں شب چراغ

جو وادیٔ جمال میں گُم ہو گئے جمیلؔ
اپنی طلب کے ساتھ ہی اُن کا بھی کچھ سراغ

مظہر امام

○

انکار میں اقرار کی بات آ ہی گئی ہے
باتوں میں غمِ یار کی بات آ ہی گئی ہے

آیا ہے کبھی ذکر اگر دار و رسن کا
گیسو و قدِ یار کی بات آ ہی گئی ہے

آرائشِ عالم پہ کبھی بحث جو چھڑی
اس گیسوئے خمدار کی بات آ ہی گئی ہے

جب سرخیِ گلشن کا کبھی ذکر ہوا ہے
تیرے لب و رخسار کی بات آ ہی گئی ہے

ڈھونڈا ہے اگر زخمِ تمنا نے مداوا
اک نرگسِ بیمار کی بات آ ہی گئی ہے

مل بیٹھے ہیں زنداں میں اگر شام کو احباب
تیرے در و دیوار کی بات آ ہی گئی ہے

بے مہریٔ احباب کا شکوہ جو کیا ہے
دلداریٔ اغیار کی بات آ ہی گئی ہے

چھیڑا ہے کوئی تلخ فسانہ جو کسی نے
شیرینیٔ گفتار کی بات آ ہی گئی ہے

جلیل حشمی

○

ہم زمانے میں محبت کے بھکاری ٹھہرے
دوست ہیں سب کے مگر دشمنِ جاں ہیں اپنے

آج کی رات کہیں شعلۂ گل ہی بھڑکے
جانے کل صبح کہاں ہوں گے ہم اڑتے پتے

جانِ من! اب کے یہ آداب ہیں تیرے کیسے
بانکپن میری غزل کا تری محفل میں لُٹے

وہ صبا ہے تو رہے کس لیے گلشن سے پرے
یہ شبِ گل ہے تو کیوں سیج پہ کانٹوں کی کٹے

کیوں بھرے شہر میں دیوانے ہوئے کس کے لیے
ہم کو معلوم نہیں پوچھئے ان آنکھوں سے

مر چکیں کب کی تمنائیں سسک کر لیکن
دل کی دیوار سے راتوں کو کوئی سر پٹکے

کہیں منزل سے بھٹک جائے نہ دیوانہ کل
جادۂ شہرِ بہاراں میں بچھا دو کانٹے

ڈال دل کھول کے ان ٹوٹے ہوئے شیشوں میں
سنگ آئے ہیں بہت راہ میں ہم پہ پیار سے

یہ تری یاد کا عالم شبِ تنہائی میں
جیسے لہرا کے کرن کالی گھٹا سے چھوٹے

ان بھری راہوں میں سب میرے ہیں پر کس کا ہوں؟
دوں صدا کس کو — لگے کون کلیجے سے مرے

کون اُترے گا مرے دل کے گلستانوں میں
کون گزرے گا مرے جی کے صحراؤں سے

راکھ اس گھر میں وہ اُڑتی ہے کہ جیسے حشمی
طاق میں شمع نہ تھی صحن میں مہتاب نہ تھے

احمد ظفر

○

احمد ظفر کسی پہ بھروسہ نہ کیجیے
کانٹے ملیں تو گل کی تمنا نہ کیجیے

تخلیق کی لگن ہے تو جاں تک گنوائیے
محفل میں دل کی بات کا چرچا نہ کیجیے

اس حسن لازوال کو دیکھیں تو اس طرح
اس حسن لازوال کو رسوا نہ کیجیے

جلتے چراغ کس نے بجھائے ہیں بارہا
یہ سحر ہے تو سحر کی پروا نہ کیجیے

کیا جسم دلنشیں تھا کہ اب مشت خاک ہے
سوچیں ضرور اس قدر سوچا نہ کیجیے

ہم اہل دل ہیں اہل نظر اہل آرزو
محرومیوں کا جال بچھایا نہ کیجیے

لتا منگیشکر

شاعر ندیم

فضا میں گونج رہی ہے دلوں کا درد لیے
ہوا کے دوش پہ لرزاں ہیں حلقہ ہائے نوا
نفس نفس ہے ترنم کی سرخوشی کو فروغ
ترے لبوں سے یہ پھوٹی ہوئی جواں کرنیں
یہ کچھ کچھ ابھرتے ہوئے گل نغمہ

ترے گلو کی ادا تیری نغمگی آواز
بکھر رہے ہیں خلاؤں میں راز شوخیٔ ساز
روش روش ہے نئی کیفیت نیا اعجاز
یہ تیری لے یہ ترا سوز، یہ تری پرواز
جہاں کو بخش رہے ہیں نئے نئے انداز

ہجوم فتنۂ دوراں میساں ہاۓ رُخاں
امید و بیم سے پر داغ بیشمار دماغ
ہزار سلسلہ ہائے ستم جلو میں لیے
کوئی خموش پس پردۂ جفائے رسوم
چراغ رہگزر باد بن گئی ہے حیات

کسی کے حسن کی لغزش کسی نظر کا خمار
فریب کشمکش دہر در پئے آزار
زمانہ درد کے ماروں سے برسر پیکار
خیال تازہ کو سوزش میں دے رہا ہے فشار
ہر ایک سمت اندھیرا ہر ایک سمت غبار

ہر ایک لمحہ بدلتی ہے کروٹیں گیتی
ہر ایک زلف پریشاں ہر اک کلی مایوس
کوئی نہیں ہے مسیحا کوئی نہیں غمخوار
تصورات خوش آیند ایک خواب گراں
ہر ایک رُخ نگہ قہر ہر طرف شورش

ہر ایک لمحہ اجڑتے ہیں مفلسوں کے شباب
ہر ایک سینہ ہے صد چاک ہر جگر ہے کباب
ہر ایک ہاتھ میں نشتر ہر اک دوا زہراب
سرور و مستی و سوز و طرب ہوئے نایاب
ہر اک قدم پہ تلاطم ہر ایک گام سراب

کہاں کہاں نہ ہوئی پست عظمت آدم
کہاں کہاں نہ ستاروں نے ٹھوکریں کھائیں
کہاں کہاں نہ کیے رقص طوق لے لے کر
کہاں کہاں نہ رسن کو گلے لگایا ہے
[illegible]

کہاں کہاں نہ مٹی شوخ زندگی کی لکیر
کہاں کہاں نہ نگوں ہو گیا خط تقدیر
کہاں کہاں نہ بجائی ہے پاؤں کی زنجیر
کہاں کہاں نہ لکھی اپنے خون سے تحریر
[illegible]

کبھی کبھی اسی پُرہول تیرگی میں مگر
ستم کشوں کی تمنا چمک بھی جاتی ہے
کبھی کبھی ترے آہنگِ سادہ کی تاثیر
فریب خوردوں کو طرزِ وفا سکھاتی ہے
کبھی کبھی ترے نغموں کا بوجھ اٹھائے ہوئے
خزاں کو چھیڑتی فصلِ بہار آتی ہے
کبھی کبھی تو سمٹتے ہیں ظلم کے بادل
کبھی کبھی تو فضا گیت گنگناتی ہے
کبھی کبھی تو دلِ غمزدہ بہلتا ہے
کبھی کبھی تو مسرت بھی بار پاتی ہے

یہ زیر و بم یہ تری لَے، ترا فن، ترا لحن
نظامِ کہنہ کو دیتے ہیں ایک شکلِ جمیل
مغنّیہ تری آتش نوائیوں کی قسم
خرامِ نغمہ ترا صلح و آشتی کی دلیل
"اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے میں ایک
ہمارے لیے ہے ترا شعلۂ نوا قندیل"
فسونِ زیست میں ملتا نہیں قرارِ دوام
جنونِ عیش کی ہوتی نہیں کبھی تکمیل
تری صداؤں کے سیلاب میں خرد تج دیں
بس ایک راہ یہی ہے بس اک یہی ہے سبیل

گلوں پہ گرتے ہیں جس طرح قطرۂ شبنم
شراب ناب مچل جائے جیسے در تہِ جام
چٹک کے جیسے کوئی غنچہ روح چونکا دے
رباب چھیڑے کوئی جیسے چاند کے ہنگام
ردائے شب میں کبھی دامنِ سحر میں کبھی
فسردہ ذہن پہ ہوتی ہے بارشِ الہام
تری عطا کا یہ صدقہ ترے کرم کا طفیل
بھلائے بیٹھا ہوں افکار گردشِ ایام
عنایتوں کا تصادم لطافتوں کا خروش
"سلام لکھتا ہے شاعر ترے خلوص کے نام"

سکوتِ رنج و الم کی اداس راہوں میں
جہاں جہاں بھی حوادث سے دل ہوا دو نیم
تھکی ہوئی مری نظریں تھکی رہیں لیکن
"فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم"
ابھی حیاتِ گریزاں کے کام آئے جا
ابھی تو سخت ہیں اوقات مرحلے ہیں عظیم
ابھی رکا تو نہیں ہے سفینۂ غمِ دل
ابھی ہوئی تو نہیں ہے سکون کی تنظیم
یہ آسرا ابھی بڑا آسرا ہے جینے کو
"چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار دیکھے گا"

بیوی کی بغاوت

راجہ مہدی علی خاں

وہ اک آہ بھر کر چھپا آفتاب
نہ میری نگاہوں سے شرمائیے
خیال آرہے ہیں مجھے پے بہ پے
یہ دو گھونٹ کیا میں بھی پی لوں جناب؟
ہوں اولاد میں بھی بڑے باپ کی
کسی دن اجی میں بھی تو پی کے آؤں
جو پی آئی گھر بھر کو پیٹوں گی میں
کسی بات پر ہو گئی گر میں تیز
میں توڑ دوں گی چینی کی سب تھالیاں
پیوں گی میں ہر روز اتنی شراب
جب اس گھر پہ ہوگا فلاکت کا راج
یہ گھر سارا نیلام کر دوں گی میں

تپائی پہ بندی نے رکھ دی شراب
تبسّم بہ لب نوش فرمائیے
بہت ہی مزیدار ہو گی یہ شے
جو پی لوں نہیں کھائیے پیچ و تاب
کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی
ذرا میں بھی گھر بھر میں آفت اٹھاؤں
کبھی آپ کو بھی گھسیٹوں گی میں
تو پھینکوں گی کھانا اُلٹ دوں گی میز
لغت میں نہ ہوں۔ دوں گی وہ گالیاں
کہ اک روز ہوگا یہ خانہ خراب
نہ پھر بھی اتاروں گی مستی کا تاج
شرابی کا ہر کام کر دوں گی میں

بہت کچھ کرے گی کنیز آپ کی
کہ لڑکی ہے یہ بھی بڑے باپ کی

(۲)

اجی میں بھی کھڑکی سے دیکھا کروں
اجی میں بھی آنکھوں کو سینکا کروں؟

پرے پھینک دوں یہ حیا کی نقاب؟
پھروں میں بھی گلیوں میں مے کر شباب؟

میں سائیکل پہ روز گھوما کروں؟
نگاہوں سے چہروں کو چوما کروں

کروں میں بھی سڑکوں پہ آوارگی؟
حسیں مردوؤں سے کروں دل لگی؟

میں مردوں کو آنکھوں پہ آنکھیں لگاؤں؟
کبھی جب وہ منہ سے تو ٹھینگا دکھاؤں؟

کروں اُن پہ بیہودہ فقرے میں چُست!
جو بولیں وہ "پاجی"! میں بولوں "دُرست"!

میں بس میں رکھوں اُن کے پیروں پہ پیر؟
وہ جانے لگیں تو کہوں "شب بخیر!"

جو سینما میں بیٹھے کوئی پاس مرد
چکھاؤں اُسے اپنی چٹکی کا درد

میں سڑکوں پہ چھیڑوں اُنھیں گھانس کر
ملے جو بھی لے جاؤں میں پھانس کر

نہ ہو کا ے پیلے کی کچھ بھی تمیز
کہوں "واہ کیا گھبرا لائی ہیں" "چیز"

چھپیں مجھ سے ڈر کر نقابوں میں مرد
اگر دیکھ لیں مجھ کو ہو جائیں زرد

ہر اک گھر میں جانے ہوں پرچے مرے
سبھی مردوؤں میں ہوں چرچے مرے

میں نام اپنے والد کا روشن کروں؟
میں چھ سات سو عشق کرکے مروں؟

کہ لڑکی ہوں میں بھی بڑے باپ کی
کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی

۳

میں مردوں کے کوٹھوں پہ جایا کروں؟
میں "باہر" بھی دل کو لگایا کروں؟

میں دے جاؤں اس گھر کو تنہائیاں؟
مرے ساتھ ہوں میری ہمسائیاں

لپ اسٹک سے گلنار کرکے یہ لب
چلیں چُہلیں کرتی ہوئی سب کی سب

پھریری ہو اک عطر کی، کان میں
ہو اک جھرجھری سی دل و جان میں

ہو سگرٹ کا ٹن ایک ماچس کے ساتھ
چلیں جھومتی دے کے ہاتھوں میں ہاتھ

دُھواں اپنے منہ سے اُڑاتی ہوئی
بڑھیں آگے اودھم مچاتی ہوئی

جہاں آئے آوازِ چنگ و رباب
رُکیں دیکھ کر بزمِ "رقص و شراب"

گناہوں کی اُن سیڑھیوں پر چڑھیں
ذرا ہچکچائیں پھر آگے بڑھیں

"وہ بیٹھے ہوں سُرمہ لگائے ہوئے
ہوں گالوں میں پوڈر رچائے ہوئے

وہ ہوں جھرّیوں کو چھپائے ہوئے
مگر عطر میں ہوں نہائے ہوئے

کہیں اُٹھ سکے وہ ہم سے آداب عرض!
بجا لائیں زندگی کا ہر ایک فرض

ادا سے گلوری کریں پیش وہ
کریں ہم سے طے پھر "کم و بیش" وہ

چھڑیں جب ستار اور سارنگیاں
نہیں وسکی ہم، کھائیں نارنگیاں

ہر اک سانس اپنی نشے میں ہو غرق
نہ آئے نظر رات اور دن میں فرق

کہیں ہم "ارے مردود گاؤ گاؤ"
کوئی ناچ اچھا سا ہم کو دکھاؤ

حسیں رات میں جب چھڑیں ٹھمریاں
قطاروں میں بیٹھی ہوں ہم "قمریاں"

ہو اک ہاتھ سینے پہ ساتھ آہِ سرد
دکھائیں اُنھیں اپنی "اُلفت کا درد"

وہ گھونگھٹ سے پھینکیں نگاہوں کی چوٹ
تو ہم پھینک دیں اُن پہ سو سو کے نوٹ

وہ ناچیں کمر کو ہلاتے ہوئے
قدم ہوں وہ گھنگھرو بجاتے ہوئے

وہ دیکھیں ہمیں مسکراتے ہوئے
نگاہوں سے اُلفت جتاتے ہوئے

پکاریں یہ ہم واہ کیا تان لی
ہماری تو اللہ قسم جان لی۔

مچل کر کہیں اُن سے بے تاب
"یہ حرکت، یہ مُرکی، یہ توڑے، غضب!

اسی طرح ہم داد دیتے رہیں
حسینوں کی "بیداد" لیتے رہیں

بجیں رات کے دو تو ہم لوٹ آئیں
محبت کے ہم لے کے غم لوٹ آئیں

کہیں آکے سب اپنے شوہر سے ہم
اجی بستروں سے اُٹھو ایک دم

لگی بھوک ہے گرم کھانا کھلاؤ

اِن "تھک گئے پیر اُٹھ کر دباؤ"

موجِ خوں

احمد ندیم قاسمی

شادی کے تین دن بعد راحت علی کو لگا کہ۔ محسوس ہوا کہ اس نے ساجدہ کو اپنی بیوی بنا کر جھک ماری ہے۔ یکایک اس لیے کہ ابھی لمحہ بھر پہلے ساجدہ اس کے ذہن پر آسمان کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے جب گاڑی جہلم کے پل پر سے گزر رہی تھی تو ساجدہ نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اور پل کی گرج کو ایک لمحہ کان دھر کر سننے کے بعد اس نے کہا تھا "ارے! ایسا لگتا ہے کہ پل "جہلم جہلم جہلم" پکار رہا ہے۔" اس پر راحت علی نے کہا تھا "تمہیں اپنے میکے جانے کا کتنا شوق ہے سجو۔ یہ خیال ہے کہ ان دنوں میں بھی تمہارے میکے ہی میں رہوں گا۔ یہ ایسا لگتا ہے۔ کہ تمہارے ماں باپ دو تین دن کے لیے تمہیں مجھ سے چھینے لے رہے ہیں۔ سچ کہتا ہوں سجو میں نے تو ابھی تمہیں جی بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ میرے ہاتھوں کی ہڈیاں تمہارے کنگنوں کی چوٹیں کھانے کے لیے کتنی مدت سے بے قرار ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک جاگتے رہنے کے بعد ابھی آنکھیں سینک ہی رہا تھا کہ تمہارا بھائی تمہیں لینے آ گیا۔ بات سنو۔ یوں کریں کہ جہلم میں اتریں ہی نہیں۔ پنڈی کی طرف بھاگ جائیں۔"

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی۔ وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غرور بھی تھا اور اس شکاری کی سی خود آسودگی بھی، جو ہرن کو جال میں پھنسا دیکھ کر اسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے، ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا "بھاگ تو جائیں پر وہ پہلی طرف کھڑکی کے پاس بھائی جان جو بیٹھے ہیں!"

راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ تو اسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ اجنتا کے غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں۔ ایسا چلبلا چمکتا رنگ کہ اسے دیکھنے کے بعد آدمی کچھ دیکھ ہی نہ سکے۔ سیاہ بھوؤں کے نیچے اتنی بڑی بڑی آنکھیں کہ بچوں کے چہروں پر بھی بڑی معلوم ہوں۔ اتنی لمبی پلکیں کہ اگر قمقمہ اس کے سر پر چمک رہا ہو تو پلکوں کے سائے اس کے سارے چہرے پر چلمن سی کاڑھ دیں۔ پتلی ذرا سی جھکی ہوئی ناک اور اتنے باریک ہونٹ جیسے سرخ ریشم کے ایک تار پر سرخ ریشم کا ایک تار رکھا ہو۔ ننھی سی گول سی ٹھوڑی اور ایسی شفاف گردن کہ پانی کا گھونٹ بھی اترتا دکھائی دے جائے۔ اس کے جسم کی ساری قوسیں اور تمام زاویے ان دیویوں کے سے تھے۔ راحت علی نے جب بھی ان دیویوں کی تصویریں دیکھی تھیں تو صحت اور جوانی سے لبالب بھرے ہوئے ان کے جسموں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ ان مورتیوں کے خالقوں نے ذرا سا مبالغہ ضرور کیا ہے۔ سنگ تراش مصور اور

شاعر، سیدھی سادی صاف نظر آنے والی حقیقت میں فنی حسن صرف یوں پیدا کر سکتے ہیں کہ چلتے چلتے یونہی جیسے رواروی میں ذرا سا مبالغہ برت جائیں۔ مگر ساجدہ کو دیکھ کر ایک پل کے لیے راحت علی کو خیال آیا تھا کہ کیا کبھی کبھی خدا بھی مبالغہ کرتا ہے؟ پھر جب اس نے دیکھا تھا کہ یہ پوری اٹھتی جھینپتی ہنسی اور چہرے پر اترتی ہوئی لٹوں کو جھٹکتی ہوئی ہے۔ تو اس نے سوچا تھا کہ بعض حقیقتیں بھی مبالغے کی حد تک حسین ہو سکتی ہیں۔

راحت علی اپنے ایک دوست عبدالحنان کا شہ بالا بن کر برات کے ساتھ لاہور سے جہلم آیا تھا۔ رات کو جب دلہن کی سہیلیاں عبدالحنان کو کان سے پکڑ کر لے جانے لگیں تو ظاہر ہے کہ راحت علی شہ بالا بھی دولہا کے دفاع کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ دلہن کی حویلی کے صدر دروازے کے قریب یکلخت ایک لڑکی چیخ اٹھی "ہائے ہمارے ساتھ تو یہ کوئی غیر مرد بھی آ رہا ہے!" سب لڑکیاں کھلکھلا کر دروازے کی طرف بھاگیں تو آگے جاتا ہوا عبدالحنان ان کے ریلے میں گر پڑا۔ ایک لڑکی اس کے اوپر سے کودی اور پھر سب لڑکیاں اس پر سے پھاندتی ہوئی گزر گئیں۔ راحت علی نے لپک کر عبدالحنان کو اٹھایا تو سامنے سے لڑکیوں نے دو ٹارچوں کی روشنی ان کے چہروں پر چانٹوں کی طرح دے ماری اور پھر چیخ چیخ کر ہنسنے لگیں اور تالیاں بجاتی ہوئی اندر بھاگ گئیں۔ اوپر ڈیوڑھی کی چھت پر بھی بھگدڑ مچ گئی اور راحت علی نے عبدالحنان کو مشورہ دیا کہ سنہری موقع ہے۔ بھاگ نکلیں۔ عبدالحنان لڑکیوں کی اس بدتہذیبی کی وجہ سے غصے میں تھا۔ کچھ کہے بغیر پلٹا تو سامنے سے اس کے منہ پر ایک اور ٹارچ کا چھپاکا پڑا، اور دونوں دم بخود کھڑے رہ گئے۔ پھر ایک لڑکی یوں خی خی کرنے لگی جیسے دولہا اور شہ بالے کو بیل سمجھ کر اندر حویلی میں ہنکا رہی ہے۔ مجبور ہو کر دونوں حویلی میں آ گئے تو وہاں تیز روشنی نے رات کو دن بنا رکھا تھا۔ راحت علی نے پلٹ کر جب اس لڑکی کی طرف دیکھا جو دونوں کو اندر ہنکا لائی تھی۔ تو ایکدم اس کا جی چاہا اور وہ ڈکرانے لگے "یہ منہ پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو؟" لڑکی رعب سے بولی "آگے چلو"۔ راحت علی نے لڑکی کی آواز پہچان لی۔ یہی تھی جس نے ایک غیر مرد کی موجودگی کا نعرہ مارا تھا۔ اور شاید یہی تھی جس نے منہ کے بل گرے ہوئے دولہا پر سے پھاندنے کی ابتدا کی تھی۔ یہی ساجدہ تھی۔

عورتوں اور لڑکیوں سے ٹھنسے ہوئے ایک کمرے میں جب عبدالحنان اور راحت علی کے سامنے "بیری گھوڑی" لا کر رکھی گئی تو ساجدہ آئی۔ ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور "بیری گھوڑی" میں سجے ہوئے ایک طشت میں سے میوے کے جیسے بھدے سے بت سا اٹھا کر دولہا سے ان کا تعارف کرانے لگی "یہ آپ کے ابا جان ہیں۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی توند سے پہچانیے۔" ساتھ ہی عورتوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے اور کسی نے کہا "یہ ساجدہ کم بخت تو شیطان کی خالہ نکلی!" ساجدہ دولہا سے مخاطب تھی "یہ آپ کی امی جان ہیں۔ دھجیوں کی طرح لٹکتی ہوئی جھریوں سے پہچانیے۔ یہ آپ کے ماموں جان ہیں۔ ہتھیلی پر رکھی ہوئی بیر برابر افیون کی گولی سے پہچانیے۔ اور یہ آپ کے شہ بالا جان ہیں۔ اُلو کی سی صورت سے پہچانیے۔" عورتیں یوں چلا چلا کر ہنس رہی تھیں جیسے رو رہی ہوں۔ اور ساجدہ آخری بت کو راحت علی کے اتنا قریب لے آئی جیسے اس کے منہ میں ٹھونس دے گی۔ بولی "یہ آپ ہیں۔ وہی کچھ ذرا سی ناک ہے کہ نہیں؟ وہی چنے برابر آنکھیں ہیں کہ نہیں؟ وہی چھاج جیسے کان ہیں کہ نہیں؟ وہی غار سا دہانہ ہے کہ نہیں؟" پھر وہ عورتوں کے مجنونانہ قہقہوں کے درمیان اس بت کو راحت علی کے سامنے نچانے لگی "ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟" اور راحت علی ہکا بکا بظاہر اس بت کو دیکھتا رہا مگر دراصل وہ ساجدہ کو دیکھتا رہا جو سنیما کی دھندلکوں سے نکل کر یہاں چلی آئی تھی اور اپنے ساتھ اتنا بے پناہ اتنا ناقابل برداشت اور قدموں تلے سے زمین کو نکال دینے والا حسن بھی لائی تھی کہ حقیقت اور مبالغے کی حدیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔

راحت علی کو عبدالحنان پہلے سے بتا چکا تھا کہ دلہن کی خاص سہیلی کی طرح برسوں کی پرانی رسم کے مطابق دولہا کے شہ بالے کو بھی

حق حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کی آزادی برت سکتا ہے بشرطیکہ بداخلاقی کا مرتکب نہ ہو۔ وہ شاید سے کے اس بات پر ساجدہ کے ہاتھ سے نوچ کر لے جرم کر سکتا ہے مگر وہ اتنا باجی جب صاحب مجبا رہا ہو اور اس کیفیت سے عورتیں ایسی محظوظ ہو رہی تھیں کہ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر راحت علی پر گرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ خود ساجدہ کی یہ حالت تھی کہ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کا کاجل بہہ کر گالوں پر پھیل گیا تھا اور راحت علی کے بٹن کو دیکھ کر اس کا انگوٹھا بٹن کے سوراخ میں پیوست ہو گیا تھا۔

پھر جب بیری کھوڑی میں ملی شکر اُلٹے کٹورے کو سیدھا کرنے کی باری آئی تو ساجدہ نے کٹورے کی طرف بڑھتے ہوئے راحت علی کے ہاتھ کی ہڈیوں پر خوب چٹکیاں لیں کہ ایک انگلی کے سرے سے زور سے مارے کہ کٹورے کو سیدھا کرنا تو ایک طرف رہا راحت علی کو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ عورتیں ہنس رہی ہیں اور راستے میاں مذاق کر رہی ہیں انعام سے نوازی رہیں اور ساجدہ کی چوڑیوں میں زیادہ شدت اور بے رحمی پیدا ہو گئی۔ ایک بار عبدالحنان نے بھی اسے جھٹکے سے کھو کا دیا مگر راحت علی نے اُٹھے ہاتھ پر انگلی کے نکیلے سرے اسی طرح چبھتے رہے اور ان میں سے خون بھی پھوٹ نکلا۔ پھر یکایک راحت علی کو یہ جانے کیا ہوا کہ اس نے ایک دم ساجدہ کی چوڑیوں بھری کلائی دبوچ لی۔ کانچ کی چوڑیاں چھنک کر ٹوٹیں اور ہر طرف سرخ اور سبز کانچ کے ٹکڑے بکھر گئے۔ چند کرچیاں ساجدہ کی جلد میں گھس گئیں اور اس سے جیسے بارش کی پھوار سا اثر ہوا۔ بیری کھوڑی الٹ گئی۔ ان کے گوشوں میں چلتے ہوئے گھی کے حلوے کی خوشبو سی عورتوں کی گودیں جاگری۔ وہ زمیں متحرک کر گئیں اور پھر سب ایکدم خاموش ہو گئیں۔ ساجدہ اور راحت علی کے چہروں پر ایک عجیب سا رنگ آگیا تھا۔ ایک ایسا رنگ جس کا کوئی نام ابھی تک تجویز نہیں ہوا۔ جیسے ہلدی اور خون اور زہر کو آپس میں ملا کر مل دیا جائے۔ عبدالحنان کے پیٹ میں سے ہنسی با آواز آئی کہ اسے پیار کرتے ہو یا پاگل ہوئے ہو؟ مگر راحت علی نے تو جیسے بہری ہو گئی ساجدہ کی کلائی پر سے اپنی گرفت کو ذرا سا بھی ڈھیلا نہ کیا۔ پھر اچانک ساجدہ کی چیخیں رک گئیں اور اس نے بڑی نرمی سے اپنا دوسرا ہاتھ راحت علی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے آہستہ سے، بہت دکھ اور بڑی منت کے ساتھ کہا "خدا کے لئے چھوڑ بھی دیجئے" اور راحت علی نے اس کا ہاتھ فوراً چھوڑ دیا۔ ساجدہ نے اپنے چہرے پر آئی ہوئی لٹوں کو سر کے ایک جھٹکے سے اُٹھا اور اپنی کلائی کے زخموں کو گھورتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ عام سی صورت کی ایک دراز قد اور تنومند لڑکی "م بیری کھوڑی" کے رنگین کاغذوں میں لپٹتے ہوئے کہنے لگی اس طرف سے بولی۔ "بدتمیز۔ وحشی۔ درندہ" پھر ساجدہ کی طرف بڑھی مگر یوں رک گئی جیسے کوئی ضروری بات کہنا بھول گئی ہو۔ بیری اور راحت علی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی "کمینہ!"

"ہائے ندیدہ! کوئی بڑی بی بولی "گالی مت بکو!"

برات جب واپس لاہور پہنچی تو راحت علی ہاتھ دھو کر عبدالحنان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ اپنی بیوی سے کہہ کر ساجدہ کے رشتے کی بات کرنے میں اس کی مدد کرے۔

ایک دن عبدالحنان نے راحت علی کی موجودگی میں مذاق مذاق میں یہ ذکر چھیڑا تو نصیر نے ساجدہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ بولی یہ نہ جانے اس روز اسے کیا ہو گیا تھا ویسے تو وہ ایسی سیدھی سادی ویسے رہنے والی لڑکی ہے کہ مجھ جیسی پرانی اور پکی سہیلی نے بھی اس کی زبان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ بس یہ ڈر لگتا ہے کہ سنا ہے اس روز پہلے تو راحت بھائی جب صاحب بنے کنگن لگاتے رہے مگر اچانک اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔ تو چوڑیوں کی کرچیاں اس کی جلد میں اتر گئیں۔ میں جب ملنے گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر تک نوبت پہنچی ہے اور وہ روزانہ انجکشن کے ٹیکے لے رہی ہے۔ ساجدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رشتہ اسی چوڑی توڑ کی طرف سے آیا ہے۔

تو میں اسے کیسے ملتیں۔ ویسے راحت صاحب ویسے بہت بھلے آدمی ہیں۔"

"میں سمجھا وہ شہری آدمی" راحت علی نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مجھے کیا معلوم کہ یہ بیڑی گھوڑی" کس بلا کا نام ہے۔ اور کھی لگنے کو بے کیسے اُسے مار سنبھالوں۔ حنان نے مجھے ذرا سا بتایا تو تھا مگر مجھے اس انتہا کی خبر نہ تھی۔ اس نے تو میرے ہاتھ کی ہڈیوں پر بھی گولڑ ڈال دیئے تھے۔ اب تک ہاتھ سیدھا نہیں ہوتا خدا کی قسم۔ میں اسی خیال سے چپ چاپ بیٹھا ہوں سہتا رہا کہ شاید مجھے انجان سمجھ کر اسے رحم آجائے۔ پھر جب نہ رہا گیا کہ ہاتھ بالکل بے جان ہوا جاتا ہے تو میں نے بالکل اندھوں کی طرح اس کی کلائی پکڑ لی۔ آپ ہی بتایئے بھابھی میں کیا کرتا؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"جانے مجھے کیا ہو گیا تھا حنان۔" بعد میں اس نے عبدالحنان کو بتایا تھا۔ "وہ تو مجھے خدا کا شکر بجا لانا چاہئے کہ ساجدہ کی کلائی پر ہاتھ پڑنے سے اس کی ہڈی نہ ٹوٹی۔ اس کی ٹوٹیں تو میری آنکھیں کھلیں۔ اگر حوڑ یا ں نہ ٹوٹتیں تو قسم کھا کر کہتا ہوں۔ خدا جانے میں کیا کر بیٹھتا۔ وہ کنگن جیسے ہاتھ پر مارتی تھی اور چوٹ سیدھی ہڈی پر پڑتی تھی۔ اور پھر یہ بھی شکر کرو کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو خدا کی قسم بچوں کی طرح رونے بیٹھ جاتا۔ درد کی وجہ سے نہیں۔ جانے کس وجہ سے۔ بس مجھے رونا آجاتا۔ عورتوں کے سامنے رونا آجاتا۔"

عبدالحنان اور اس کی بیوی جب بھی جہلم گئے۔ ساجدہ کے والدین سے ضرور ملے۔ راحت علی کے خاندان جائیداد اور آمدنی کی تفصیل بھی معلوم کرتے رہتے۔ رضیہ نے حنان کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب ایک بار اس نے ساجدہ سے ہی ذکر چھیڑا تو وہ بالکل گلابی ہو گئی اور چہرہ کی بات نہ رو۔ مجھے بھی وہ کچھ۔ بہت سے بزرگ نہیں ہٹ سکتے۔ راحت علی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے خاندان کا واحد فرد تھا۔ اس لیے آخر میں رضیہ کے کہنے پر اس نے کہیں سے دور رشتے کی ایک خالہ کا بھی سراغ لگا لیا جو عبدالحنان اور رضیہ کے ہمراہ جہلم جا کر بات پکی کر آئی اور تین مہینے بعد کی بات تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

شادی کے دن لڑکیوں نے راحت علی کو خوب بنایا مگر وہ احمقوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جہلم ہی سے اس کے لیے ایک تہ بالا ڈھونڈ نکالا گیا جس نے ساجدہ کی خاص سہیلی زرینہ کے ہاتھوں یا ناں کے ٹھوس کنگن کی تین چار چوٹیں کھانے کے بعد راہِ فرار اختیار کر لی اور لڑکیوں کو لوٹتا رہا۔ ایک کھڑکی میں سے کود گیا۔ راستے میں پکڑ کر لا بٹھایا گیا اور اس کے زخم پر نمک چھڑک کر اس پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس پر وہ کالیوں پر اتر آیا۔ مگر راحت علی مسکراتا رہا اور تنگی تنگی تالیوں بجے کیرت سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار ساجدہ سے تنہائی میں ملے گا تو اس کی کلائی پر سے ٹھوس سونے کے کنگن اتار کر جو اس نے ساجدہ کے لیے بڑے شوق سے بنوائے تھے، پہنا دے گا اور اس کے سامنے جھکا دے گا اور لے گا اور اگر تو جو ذرا بھی کوئی کر دیکھی تو اکڑ کر ذرا اٹھنے لگا ہوں۔ مگر ساجدہ اس کے سامنے بار بار زخمی کلائی کو ہاتھ میں ہاتھ میں لے کر سہتے سیتی ہوئی ابھرتی رہی اور وہ سوچتا رہا کہ وہ اس کی کلائی پر کہاں کہاں پیار کرے گا اور اگر کلائی پر چوڑیاں ہوئیں تو انھیں کتنی نرمی سے ادھر اُدھر ہٹا کر اپنے ہونٹوں کے لیے جگہ بنائے گا۔

شادی کے بعد راحت علی کو ساجدہ کے ساتھ صرف دو دن گزارنے کا موقع ملا مگر ان دو دنوں میں اس کی کیفیت ایسی رہی جیسے وہ اعصاب زدگی کا پرانا مریض ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور ہتھیلیاں اور تلوے ہر وقت پسیجے رہتے تھے۔ عبدالحنان نے اسے سمجھایا بھی کہ دولہاؤں کے یہ تیور نہیں ہوتے مگر راحت علی بولا "میں کیا کروں حنان۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا کہ میں اس لڑکی سے پیار کروں یا اس کی پوجا کروں یا اس سے نفرت کروں۔ وہ جس نے میرے ہاتھ کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں، اب دلہنوں کی

جدائی چاہیے یوں میری پیشانی پڑی ہے کہ جب چاہوں اسے اٹھا کر سینے سے لگا لوں۔ نہ وہ ہاتھ جھٹکتی ہے نہ پاؤں پٹختی ہے۔ بس دو مرحلے باقی ہیں۔ میں اس کے حسن کو ہضم کر لوں اور وہ اپنی حیا کو ہضم کر لے۔ پھر تمہیں یہ بیچ کا دور بن کر بھی دکھا دوں گا۔ دیر سے ہو جاؤں گا۔ مگر سیٹ گاڑیاں بھی تو منزل مقصود پر پہنچ ہی جاتی ہیں۔"

عبدالمنان نے یہ باتیں سن کر ایک بھرپور قہقہہ لگایا تھا اور چلا گیا تھا۔ اسی وقت ساجدہ کا بھائی آ گیا تھا اور اب وہ مکان سے جہلم جا رہے تھے۔ راستے میں وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کر سکے تھے کیونکہ ساجدہ کا بھائی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ بس راحت علی، ساجدہ کو دیکھتا رہا اور ساجدہ ایک رسالے کے پیچھے چھپی لجاتی اور خوش ہوتی رہی۔ پھر جب بھائی تازہ ہوا کی خاطر پرلی طرف کھڑکی کے پاس جا بیٹھا اور گاڑی جہلم کے پل پر سے گزرنے لگی تو ساجدہ نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور پل کی گڑگڑ کو ایک لمحہ کان دھر کر سننے کے بعد اس نے کہا "اب ایسا لگتا ہے کہ پل بھی جہلم جہلم جہلم جہلم پکار رہا ہے۔" اس پر راحت علی نے کہا "تمہیں اپنے میکے جانے کا اشتیاق ہے نا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں میں بھی تمہارے میکے ہی میں رہوں گا پر ایسا لگتا ہے تمہارے ابا وہ دن کے لیے تمہیں مجھ سے چھینے لے رہے ہیں۔ سچ کہتا ہوں میں نے تو ابھی تمہیں جی بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ میرے ہاتھوں کی پوریاں تمہارے کنگنوں کی چوڑیاں کھانے کے لیے کتنی مدت سے کس قدر بے قرار ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک جاگتے رہنے کے بعد ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ تمہارا بھائی تمہیں لینے آ گیا۔ بات سنو۔ یوں کریں کہ جہلم میں اتریں ہی نہیں، پنڈی کی طرف بھاگ جائیں۔"

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غرور بھی تھا اور اس شکاری کی سی خود اعتمادی بھی جو ہرن کو جال میں پھنسا دیکھ کر، اسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔

جہلم میں دو روز کے قیام کے بعد ساجدہ پہلی بار راحت علی سے تنہائی میں ملی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کو تھام کر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ساجدہ نے آتے ہی گلی والا دروازہ بند کر دیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو راحت علی حیرت زدہ سا اٹھنے لگا اور بولا "کیا بات ہے؟"

ساجدہ کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر دھول سا بکھیر کر جم گئی۔ اب راحت علی کے بجائے وہ خود چونک کر جھکی جھکی سی آنے لگی اور بولی "یہ کیوں، کیا بات ہے؟"

راحت علی نے جیسے کچھ لیا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ ساجدہ کچھ اس طرح حیران اور اداس کھڑی رہ گئی جیسے دودھ کا ایک پیالہ کٹورا بھر کے پینے اندر گئی ہو مگر واپس آئی ہو تو معلوم ہوا کہ دودھ میں مکھی ہو۔ پھر وہ بہت دور سے آنے والی آواز میں بولی "میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ امی اور ابا نے اجازت دے دی ہے اور ہم آج شام کی گاڑی سے لاہور جا سکتے ہیں۔"

راحت علی نے اسی طرح ٹہلتے ہوئے اور ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا "رکنا چاہو تو دو چار دن اور رک جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور ساجدہ پر کچھ ایسا گومگو کا عالم طاری ہو گیا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اپنے دولہا کی اس فراخ دلی پر خوش ہو کر اندر بھاگ جائے یا بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے۔ وہ ایک لمحہ دم بخود کھڑی راحت علی کو دیکھتی رہی جیسے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر اسے اکٹھا بہت سا رونا آ گیا اور وہ پلنگ پر دھم سے گر گئی اور راحت علی کے سینے پر سر رکھ کر اور بازو ڈال کر اس کے شانوں پر

کر لو لیکن ابھی نہیں راحت۔ آج ہی بیٹھ گئے اور شام ہی کی گاڑی سے چلیں گے۔"

"بہت اچھا۔ چلو۔" راحت علی ساجدہ کے بازوؤں کا حلقہ توڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "مگر یوں ہوا کہ اگر نہ ہوا تو پھر ٹک کر مر جانا۔"

وہ اسی روز گھر سے چلے آئے۔ پھر کوئی ایک مہینہ بعد جب محلہ میں ساجدہ کی امی اور ابا اور دوسرے گھر والے بیٹھے اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ لڑکیاں بیاہے جانے کے بعد یکایک اپنے بزرگوں کے گھر سے جدا ہو کر یکایک کیسے بھول جاتی ہیں۔ تو یکایک ساجدہ اپنی ماں سے لپٹ کر بچوں کی طرح بلکنے لگی۔ سب لوگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ پھر ساجدہ کے ابا کچھ کہے بغیر باہر چلے گئے کہ راحت علی کو بھی اندر لے آئیں مگر وہاں راحت علی کے بجائے اس کا ملازم ایک بکس لیے کھڑا تھا۔ اس نے سلام کر کے بکس ان کے حوالے کیا اور الٹے پاؤں واپس چلنے کی طرح چل دیا۔

"صاحب نے سلام بولا ہے اور بولا ہے کہ مگر صاحب ابھی یہیں کا مالک ہے اور ہم اس کے ساتھ زور آور ہیں کیسے کر سکتا ہے؟"

ایک وہ ساجدہ کی رشتہ داروں اور سہیلیوں سے بھرا ہوا پورا محلہ امڈ آیا۔ رات گئے تک بات بات پر ناکوں پر انگلیاں رکھی جاتی رہیں۔ دبی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور بھویں اچکا اچکا کر ٹھنڈی سانسیں بھری جاتی رہیں۔ آخر کار ساجدہ کی امی سے بھید کھلا تو ایسا راز پر یوں عام ہوا کہ راحت علی تھوڑا سا پاگل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم خوبصورت تو ہو مگر صرف خوبصورت ہو۔ تمہاری خوبصورتی دیکھنے سے خالی ہے۔

"یہ دیکھنا کیا ہوتا ہے؟" بتانے والی سے کسی نے پوچھا۔

"اور دیکھو بوا! یہ بھی ہوتا ہے۔ یہ یہاں نہیں ہوتا۔ ادھر بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔" پھر اس نے راحت علی کے پاگل پن کی وضاحت جاری رکھی۔ "وہ کہنے لگا ساجدہ بی بی سے کہ میں تمہیں دور سے دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔ میں کہتا تھا تم جیتا جاگتا سانپ ہو، پر تم تو ربڑ کی نکلیں۔"

"ہائے یہ کہا اس نے؟ پر کیا کیا اس نے؟" کسی نے پوچھا۔

بتانے والی بولی۔ "اسے بہی کوئی پاگل ہوں کہ پاگلوں کی باتوں کا مطلب بتاتی پھروں۔ ہاں تو پھر جی بھر لی کہ یہی بھی کہ اس کو غضب ہو گیا۔ کل جب ساجدہ نے سوتے ہوئے راحت علی کو ذرا سا چھو دیا تو اس نے ساجدہ کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا اور بکنے لگا کہ تم صرف خوبصورت ہو۔ تم صرف ایک عام سی عورت ہو۔ شادی سے پہلے میں نے تمہارے حسن کے ہاتھ میں جو تلوار دیکھی تھی وہ کہاں ہے؟ بتاؤ۔ اپنے آپ کو میری نفرت سے بچائے جاؤ۔"

"پاگل ہے۔ صاف پاگل ہے۔" کسی نے کہا۔

"بد تمیز ہے، وحشی ہے، درندہ ہے۔" ارے دہی ساجدہ کے گھٹنے کے پاس بیٹھی ہوئی چلا اٹھی۔ "ہائے۔ خدا کی قسم پروردگار کی۔ گاڑی میں تمہاری جگہ ہوتی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی۔ ساری شیخی ہوا ہو جاتی۔ اس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تو کیا تمہارے ہاتھ پر فالج گر گیا تھا؟ جواب میں تم اسے تھپڑ مارنے کے بجائے رونے لگیں اور چپ چاپ یہاں آ گئیں۔ میں ہوتی تو قسم پروردگار کی۔ اسے دونوں کانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی اور پوچھتی کہ کیوں میاں۔ اب بتاؤ۔ رد اور دکھ کیسے ہوتے ہیں۔" پھر ذرا سا رک کر بولی۔ "کمینہ۔"

دو روز بعد جب سارا گھر صحن میں بیٹھا اس خاندانی المیئے پر بات چیت کر رہا تھا۔ تو ایک راحت علی اندر آیا اور السلام علیکم کہہ کر ایک کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ ہفتوں سے یہیں مقیم ہے اور ابھی کچھ دیر پہلے یونہی ذرا ہوا خوری کو نکل گیا تھا۔ وہ بیٹھا تو بہت سے لوگ اٹھ کر چلے گئے اور سب چہرے [illegible]۔

کم و بیش ایک ہفتے تک راحت علی سب کو یہ یقین دلانے میں مصروف رہا کہ ساجدہ بہت غلط بھی ہے اور اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کا قصہ یہ ہے کہ وہ سینے پر دونوں ہاتھ رکھے گہری نیند سو رہا تھا جب اچانک بڑبڑا کر اٹھا اور اس کا الٹا ہاتھ ساجدہ کے منہ پر جا لگا۔ اگر پلنگ کی دوسری پٹی پر کوئی اور بیٹھا ہوتا تو دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر پڑتا اور اس حادثے میں اس کی نیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سب گھر والے راحت علی کی ان مسلسل وضاحتوں سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور اب تو زرینہ اور دوسری سہیلیاں جب ساجدہ کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر اس کے ساتھ ہمدردی کرتی تھیں تو ساجدہ بھی ہنس دیتی تھی اور کہتی تھی کہ اللہ کرے تمہیں بھی ایسے منہ پر تھپڑ نصیب ہوں کہ سوتے میں گھبرا کر اٹھیں تو بے خیالی میں تمہارے گالوں پر گھونسے دے ماریں۔ سہیلیاں ہنستیں اور راحت علی اپنے کمرے کا گلی میں کھلنے والا دروازہ نیم وا کئے بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا۔ سہیلیاں اب راحت علی کو بھی چھیڑنے لگی تھیں اور زرینہ تو کہیں سے ایک کھلونا بھی لے آئی تھی۔ یہ کھلونا ایک گڈے اور گڑیا پر مشتمل تھا۔ کھلونے میں کوئی کل بھری تھی۔ جب گڈے کو ہتھیلی پر رکھ لیا جاتا تو گڈا اچھلنے لگتا تھا اور ہاتھ بڑھا کر گڑیا کے منہ پر طمانچے مارنے لگتا اور گڑیا دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر اپنے جسم کو یوں جھٹکے دیتی جیسے رو رہی ہو۔ کچھ دیر کے بعد گڈا بیٹھ جاتا اور گڑیا اپنی کمر سیدھی کر لیتی۔ اس پر سارے گھر میں خوب قہقہے پڑتے اور جب ایک روز راحت علی نے زرینہ کے ہاتھ سے یہ کھلونا چھیننا چاہا تو زرینہ کی کلائی کی ایک چوڑی ٹوٹ کر اس کی ہتھیلی میں گھس گئی۔ وہ ہاتھ کو گھٹنوں میں دبا کر بیٹھ گیا تو زرینہ بولی "میں ساجدہ نہیں ہوں مسٹر! میں تو زرینہ ہوں۔ اور میری چوڑیاں تو ان ہاتھوں کو ڈس لیتی ہیں جو انہیں توڑنا چاہتے ہیں۔"

پھر ایک روز جب رات کے گیارہ بجے تک کیرم اور تاش کھیلنے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آ گئے تھے اور ساجدہ کی سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں تو ایک بجے کے قریب بڑے دروازے پر مسلسل دستک ہونے لگی۔ معلوم ہوا زرینہ کی امی اپنے ملازم کے ساتھ زرینہ کو لینے آئی ہیں۔ زرینہ تو یہاں سے کیا ڈیڑھ بجے ہی چلی گئی تھی۔ سب لوگ لپکے۔ اور زرینہ کی ماں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہیں دروازے پر بیٹھ گئیں۔ سارے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ پھر کسی نے آکر اطلاع دی کہ راحت علی بھی اپنے کمرے میں نہیں ہے اور اس کے کمرے کا گلی والا دروازہ بالکل پٹ کھلا ہے۔ ایک لمحے تک سب کھڑے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے اور پھر سب ایک دم راحت علی کے کمرے کی طرف چل گئے۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے مگر پھر ساجدہ نے بے ہوش ہو کر سارا معمہ حل کر دیا۔

فوراً زرینہ کے نوجوان رشتہ دار ایک کار میں ٹھنس ٹھنسا کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور ساجدہ کے ابا نے عبدالحنان کو تار بھیجا کہ فوراً پہنچو۔ مگر جب تک یہ معمہ حل ہوتا، راولپنڈی سے زرینہ کی امی کے نام زرینہ کا خط آ چکا تھا کہ ہم بخیریت ہیں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ ہمیں معاف کر دیجئے۔ چھوٹے غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور بڑے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ ہمیں معافی کی چٹھی لکھ دیں تو ہم دونوں آپ کی قدم بوسی کے لیے فوراً حاضر ہو جائیں گے۔

راحت علی جب ساجدہ کو میکے سے پھر جہلم لایا تھا۔ اور سسرال میں اپنی بہت سی نئی رشتہ داروں اور ساجدہ کی سہیلیوں نے گھر

ہوا صوفے پر جاکر بیٹھا تھا۔ دوبارہ سامنے دیکھا تھا تو یکایک اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے ساجدہ سے شادی کرکے جھک ماری ہے۔

یہ کون ہے؟ اس نے سوچا تھا۔ یہ جو ساجدہ کے بالکل الٹ ہے۔ لیکن پھر بھی خوبصورت ہے جس کی نسوانیت میں مردانہ وجاہت ہے اور جس کا رنگ اتنا میلا ہے کہ اس پر تانبے کا سا دھوکا محسوس ہوتا ہے۔ جس کی آنکھیں صرف اتنی بڑی ہیں کہ اس سے بھی بڑی ہوتیں تو عجیب معلوم ہوتیں۔ یہ بھنویں جنگل کی طرح گھنی ہیں۔ جو سنہری اور بکھری ہوئی بھویں ہیں۔ بلند ہوتی ہوئی سی گولائی ناک ہے لیکن اگر اس پر سے پسینہ پونچھ لیں تو کاغذ کی سی ناک ہوتی تو یوں سے تپ سے کا تاس ماردیتی۔ بھرے بھرے ہونٹ ہیں جن کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہے جیسے بہت سی بار آتو دخوں پر سے بوسے کم کیا ہو۔ ماس سے بھری ہوئی ٹھوڑی ہے۔ گردن میں نیلی نیلی رگیں ہیں اور جسم کے خطوط میں گولائی بھی ہے اور توانائی بھی۔ یعنی ایک ایسا بھرپور پن جس کی وجہ سے سارا جسم نمایاں نظر آتا ہے۔ راحت علی نے سوچا تھا کہ اگر میں مصور ہوتا تو اس لڑکی کی تصویر کھینچ کر اس کے نیچے "موت" لکھ دیتا۔

ایک ساتھ سب نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی طرف راحت علی مسلسل دیکھے جارہا تھا۔ پھر وہ بولی تھی "ہائے دولہا بھائی تو مجھے بالکل ندیدوں کی طرح دیکھے جارہے ہیں۔"

"ہائے زرینہ" کوئی بڑی بی بولی "کالی مت کہو۔"

"کالی مت کہو زری" راحت علی نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "میں تو تمہیں اپنا ایک خیال بتا رہا تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کی ساری عورتیں چاہے وہ ساجدائیں ہوں، چاہے زرینائیں، جب بیوی بن کر مرد کے قریب آتی ہیں تو اپنی شخصیت کے خول میں سے نکل آتی ہیں اور سیدھی سادی عام عورتیں بن جاتی ہیں۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ساری دنیا میں صرف ایک عورت بستی ہے۔ البتہ ہر گھر میں اس کا نام مختلف ہے۔"

"پھر وہی بات!" زرینہ کڑک کر بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ زرینہ کے نام اس کی امی کا خط آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کی طرح انھوں نے بھی یہ کڑوی گولی آنکھیں بند کرکے نگل لی تھی۔ انھیں فوراً جہلم بلا بھیجا تھا اور یہ فرمائش بھی کی تھی کہ آتے ہوئے میرے لیے مری کی تین چار پاسکٹیں بھی لیتی آنا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے" راحت علی نے کہا "کہ تمہاری امی ہم سے نہ صرف خفا نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں۔"

"خوش کیوں نہ ہوں" زرینہ بولی "میں نے انھیں باقاعدہ شادی کے دس ہزار کے خرچے سے بچایا ہے کہ نہیں؟"

دوسرے دن دوپہر کو دونوں جہلم پہنچے تو زرینہ کی ماں دس منٹ تک زرینہ کو سینے سے لگائے روتی رہیں۔ وہاں سے فارغ ہوکر انھوں نے راحت علی کے سر اور پیٹھ پر تین چار بار ہاتھ پھیرا اور اس کا کندھا چوما۔ پلٹ کر وہ زرینہ سے لپٹ گئیں ——— اور راحت علی نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنی سامنے کی جیب میں سے کنگھی نکالی اور بال سنوارنے لگا۔

ایک دم اتنی بہت سی پڑوسنیں قطار اندر قطار صحن میں اُمڈ پڑیں۔ اور زرینہ، اس کی امی اور راحت علی ان میں گھر کے رہ گئے۔ جتنی عورتیں انھیں یوں حسرت سے دیکھے جارہی تھیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا معرکہ سر کرکے لوٹے ہیں۔ اِکا دُکا نوجوان لڑکیوں نے راحت علی سے چھیڑ چھاڑ کی بھی کوشش کی اور بعضوں نے اپنی چوڑیوں بھری کلائیاں بھی اس کے سامنے یہ کہہ کر پھیلا

دیں کہ شائد دولہامیاں کے بت میں اسی بہانے کوئی حرکت پیدا ہو۔ مگر زرینہ ٹھٹھے لگاتی رہی اور راحت علی یوں چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ جیسے اس کے سامنے عورتیں نہیں کھڑی ہیں "بُھری گھوڑی" رکھی ہے۔

اُدھر زرینہ کی امی اپنی ہم سنوں کو بتا رہی تھیں "بہنا۔ بھاگتی سب ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ زرینہ چھپ کر بھاگی تھی اور ساجدہ دن دھاڑے ڈھول بجا کر بھاگی تھی۔ رہا حق مہر تو کل دس ہزار ہی تو ہے۔ بہن کہتی ہوں اس حرفانی کو بلا بھیجو۔ میں ابھی اسی وقت اس کے ہاتھ میں سو سو روپے کے سو نوٹ رکھوا دوں تو زرینہ کی ماں نہیں۔"

راحت علی کے چہرے پر اچانک ایک عجیب سا رنگ آ گیا۔ ایک ایسا رنگ جس کا کوئی نام ابھی تک تجویز نہیں ہوا جیسے مٹی اور ہلدی اور زعفران اور زہر کو آپس میں ملا کر حل کر دیا جائے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سامنے دیکھنے لگا۔ جہاں سب نے پلٹ کر اس طرف دیکھا اور سب کے چہروں پر مٹی اور ہلدی اور زعفران اور زہر کے رنگ بکھر گئے۔ سب نے جیسے کسی غیر شعوری حکم کی تعمیل میں اِدھر اُدھر ہٹ کر راحت علی تک ساجدہ کے لیے راستہ بنا دیا۔

ساجدہ کے ساتھ صرف ایک عورت تھی۔ جو شاید گھر کی ملازمہ تھی۔ ساجدہ نے نقاب اُلٹ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ فق تھا۔ ہونٹ سختی سے بھینچ کر غائب سے ہو گئے تھے اور وہ کچھ یوں ہانپ رہی تھی۔ جیسے سر سے پاؤں تک شدید تشنج میں مبتلا ہے۔

وہ آنکھیں جھپکے اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر، سیدھی راحت علی کی طرف آئی۔ اس کے قریب آ کر رُک گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی اور پھر ایک دم، جیسے کوک بھری مشین کی طرح اس نے دونوں ہاتھوں سے راحت علی کے منہ پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ راحت علی بازو لٹکائے یوں چپ چاپ کھڑا رہا جیسے ساجدہ کی چوڑیوں کے چھناکے سن رہا ہے۔ پھر اچانک اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے ساجدہ کی چوڑیوں بھری کلائی دبوچ لی۔ کانچ کی چوڑیاں چھناک کر ٹوٹیں اور ہر طرف سرخ اور سبز بلور کے ٹکڑے خون اور زہر کے قطروں کی طرح بکھر گئے اور ساجدہ کی کلائی کے خون سے راحت علی کی انگلیاں چپک گئیں۔ ساجدہ دیوانوں کی طرح راحت علی پر جھپٹی اور اس کے ہاتھ میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ اور جب راحت علی کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے خون کی ایک دھار اس کی کہنی تک جا آئی تو زرینہ ہکا بکا عورتوں کو چیرتی ہوئی آئی اور ساجدہ کو کندھے سے جھٹک کر چیخی "یہ کیا بکواس ہے؟"

ساجدہ نے راحت علی کے ہاتھ پر سے ہونٹ ہٹا کر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی کلائی چھڑائی اور اپنے دانتوں پر پھیلا ہوا راحت علی کا خون زرینہ کے منہ پر تھوک دیا۔ زرینہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی اور ساجدہ واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اندر کمرے میں سے زرینہ کی امی سو سو کے سو نوٹ ہاتھ میں لیے ہوئے چیختی چلاتی باہر نکلیں اور پکاریں "یہ لے اپنا دس ہزار کا حق مہر جس کی خاطر تو میری بیٹی سے کو کاٹتی پھر رہی ہے۔ میں تو تجھے تیرے ہوتوں سوتوں سمیت قربان کر ڈالوں اس جوڑے پر سے۔"

ساجدہ نے جس کے ہونٹ راحت علی کے خون سے سرخ ہو رہے تھے ذرا سا رُک کر زرینہ کی امی کی طرف بے پناہ نفرت سے دیکھا اور پھر راستہ بناتی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں سے گزر کر باہر چلی گئی۔

"ابا! یہ لائیے مجھے دے دیجئے" راحت علی نے زرینہ کی امی کی طرف اپنا ہاتھ بلند کیا۔

"یہ لے بیٹا" انھوں نے نوٹوں کا بنڈل اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ روپے آپ نے مجھے دیئے ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بیٹا" وہ بولیں۔

اور راحت علی نے یہ بنڈل روتی ہوئی زرینہ کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا "لو میں نے آپ کی بیٹی کو دے دیئے"

یہ کہہ کر وہ یوں باہر چلا گیا جیسے ذرا سا بھی رُک گیا تو اسے بہت دیر ہو جائے گی۔ زرینہ نے یہ دیکھا تو کھڑی ہو گئی اور آنکھیں پھاڑ کر اسے جاتا دیکھنے لگی اور اس کی امی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئیں۔ مگر راحت علی لپکا چلا گیا۔ وہ باہر سڑک پر آگیا اور بھاگنے لگا۔ دولہا کے تانگے میں ساجدہ کے ابا، اس کا بھائی اور عبدالمنان اس کی طرف آ رہے تھے۔ مگر وہ انھیں نہ دیکھ سکا۔ وہ تو صرف ساجدہ کو دیکھ رہا تھا جس سے اب وہ صرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

سنترے

خواجہ احمد عباس

رات کے اندھیرے سمندر میں ستارے تیر رہے تھے۔

دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹا اور روشنی کی لکیر بناتا ہوا فضا کی تاریک گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

ہوائی جہاز کی کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی آشا نے سوچا۔ ستارہ ٹوٹنا تو بڑا اشگون ہوتا ہے نا۔ نہ جانے آج کیا ہونے والا ہے۔ اور ایک نامعلوم خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ مگر پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا یہ سب واہمہ ہے اگر ہر بار ستارہ ٹوٹنے پر ہوائی جہاز کریش (CRASH) ہو جایا کرے تو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرنا ہی چھوڑ دیں اور پھر اس وقت تو اس سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ساری دنیا میں نہ ہوگی۔ یہ جو گورا چٹا شخص اس کے برابر کی سیٹ پر کمبل اوڑھے سو رہا ہے — بلدیو راج کوہلی —— جس کے ہاتھ میں اس وقت آشا کا ہاتھ ہے اور جس کے ساتھ وہ کل بمبئی سے بوئنگ جیٹ ہوائی جہاز میں ساری دنیا کی سیر کو روانہ ہونے والی ہے۔ یہ رائے بہادر سرجیت کوہلی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ رائے بہادر سرجیت کوہلی آٹھ بڑے ہوٹلوں کے مالک ہیں جو سارے ہندستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دہلی میں راج محل، بمبئی میں کارلٹن، مسوری میں ہمالیہ گرینڈ، نینی تال میں لیک ویو، کلکتہ میں ایورسٹ انڈیا، لکھنؤ میں گومتی پیلس، ناگپور میں ماؤنٹ ہیون، اوٹاکمنڈ میں بلیو ماؤنٹین اور مدراس میں میرینا۔ دل ہی دل میں یہ فہرست دہرا کر وہ آپ ہی آپ مسکرا دی۔ بلدیو کی زبانی اس نے یہ نام اتنی بار سنے تھے کہ اسے حفظ ہو گئے تھے۔ بلدیو کو اپنے باپ کی اس 'ہوٹل امپائر' پر بڑا ناز تھا اور اس نے آشا سے وعدہ لیا تھا کہ جب یہ سلطنت اس کے قبضے میں آئے گی تو وہ دہلی میں ہندستان کا سب سے بڑا، سب سے خوبصورت اور سب سے عالیشان ہوٹل تعمیر کرائے گا اور اس کا نام ہوگا آشا پیلس اور یہ وعدہ یاد کر کے آشا نے ہلکے سے محبت اور تشکر سے بلدیو کا ہاتھ دبا دیا۔ بلدیو کا ہاتھ جو سکن لوشن اور ہینڈ کریم کے استعمال سے نرم رہتا تھا جس پر محنت نے کوئی گٹا نہیں ڈالا تھا جس کی انگلیوں کے ناخن راج محل ہوٹل کی حسین مینی کیورسٹ لڑکیاں بڑے اہتمام سے تراشتی تھیں ان کو نوکیلا بنا کر ان پر نیل پالش لگاتی تھیں۔

بلدیو کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی میں کتنے ہی خوش آئند وعدے تھے۔ بمبئی سے وہ بوئنگ میں قاہرہ جائیں گے وہاں نیل کے کنارے دنیا کے مشہور ہوٹل نائل ہلٹن (NILE HILTON) کے کلوپیٹرا سویٹ میں ٹھہریں گے۔ اونٹ پر بیٹھ کر اہرام مصر کے سامنے تصویر کھنچوائیں گے۔ کیبرے میں نیم برہنہ مصری لڑکیوں کا ناچ دیکھیں گے۔ پھر لندن جائیں گے۔ وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل سیوائے میں ٹھہریں گے۔ بکنگھم پیلس کے سامنے ملکہ کے گارڈز کے ساتھ تصویر کھنچوائیں گے پھر پیرس میں فرانس کے سب سے مہنگے ہوٹل جارج پنجم میں ٹھہریں گے۔

اور پھر نیویارک میں والڈروف اسٹوریا اور پھر شکاگو۔ اور پھر لاس اینجلز (LOS ANGELES) جہاں آشا ہالی وڈ اسٹاروں کے آٹوگراف لے گی اور گریگری پیک (GREGORY PECK) کے ساتھ تصویر کھنچوائے گی جو "آن لوکر" اور "ایوز ویکلی" میں شائع ہوگی اور جسے دیکھ کر اس کی ساری سہیلیاں رشک سے جل مریں گی اور پھر وہ ٹوکیو جائیں گے اور وہاں کے امپیریل ہوٹل میں قیام کریں گے اور پھر ہانگ کانگ اور سنگاپور کے مشہور ہوٹلوں کا معائنہ کرتے ہوئے واپس آجائیں گے۔ "بات یہ ہے ڈارلنگ" بلدیو نے خود ہی آشا کو سمجھایا تھا "ڈیڈی اس سفر پر مجھے بھیج رہے ہیں تاکہ میں دنیا کے سب بڑے بڑے ہوٹلوں کے انتظام کا اچھی طرح سے مطالعہ کر کے ان کے طور طریقوں کو اپنے ہوٹلوں میں رائج کر سکوں۔ ان سب ہوٹلوں کے مالک میرے ڈیڈی کے دوست ہیں جو ہندوستان میں ہمارے مہمان رہ چکے ہیں اس لیے ان میں سے ہر ایک نے بڑے اصرار سے ہمیں مدعو کیا ہے اور چونکہ ہر جگہ میرے لیے دو آدمیوں کا سوئٹ ریزرو کیا گیا ہے اس لیے ڈیڈی نے کہا تم چاہو تو اپنے ساتھ اپنی کسی فرینڈ کو لے جاؤ۔ سو ڈارلنگ ہندوستان واپس آکر ہماری شادی تو ہوگی ہی لیکن پہلے ساری دنیا کا دورہ کر کے ہنی مون منا لیا جائے" اور پھر نقلی امریکن لہجے میں اس نے کہا تھا:

AIN'T THAT GONNA BE WONDERFUL, SWEETIE-PIE?

اور بلدیو کا وہ بچکانہ لہجہ یاد کر کے آشا مسکرا دی۔

ہوائی جہاز میں تقریباً مکمل اندھیرا تھا۔ زیادہ تر مسافر سو رہے تھے۔ سامنے کی سیٹ پر ایک موٹے تازے سیٹھ صاحب بڑے زور سے خراٹے لے رہے تھے جن کی آواز ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ پر بھی حاوی تھی۔ ان کے برابر میں سیٹھانی بچے کو گود میں لیے سو رہی تھی۔ راستے کی دوسری طرف ایک اینگلو انڈین جوڑا ایک ہی کمبل تانے سو رہا تھا۔ ان سے اگلی سیٹ پر ایک کھدر پوش منسٹر اپنی سیٹ کے اوپر لگی ہوئی ننھی سی ریڈنگ لائٹ جلائے ایک امریکن جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ ان کے برابر میں شارک اسکن کا سوٹ پہنے ایک سندھی بیوپاری تھا۔ جو منسٹر صاحب سے کانا پھوسی کرتے کرتے سو گیا تھا۔

آشا نے سوچا یہ نائٹ ایرمیل کا سفر بھی کتنا دلچسپ اور کتنا عجیب ہوتا ہے اور اس اندھیرے ہوائی جہاز میں جو اپنی مستقل رفتاری سے اندھیرے کے سمندر میں تیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کو بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ صرف تین گھنٹے پہلے دہلی کے پالم ایرپورٹ سے نہیں روانہ ہوئی بلکہ عمر بھر سے اسی نائٹ ایرمیل میں سفر کر رہی ہے اور یہ زندگی کا ہوائی جہاز ہمیشہ یونہی اسی لامتناہی فضا میں اڑتا رہے گا۔ بہتا رہے گا کیونکہ وقت کے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ اور یہ تمام مسافر، یہ ساری دنیا ایک عمیق سناٹے میں ڈوب جائیں گے اور کائنات کے نظام میں اتنا فرق بھی نہیں پڑے گا جتنا کروڑوں ستاروں میں سے ایک ستارہ ٹوٹ جانے سے پڑتا ہے۔

اور اسی لمحے میں یکایک ہوائی جہاز کی ساری روشنیاں جل اٹھیں اور کچھ لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے مگر وہ اینگلو انڈین جوڑا اسی طرح کمبل میں لپٹا لپٹایا رہا اور سیٹھ جی بدستور خراٹے لیتے رہے۔ آشا نے دیکھا کہ سیٹھانی بچے کو دودھ پلاتے پلاتے سو گئی تھیں اور بچہ ابھی تک ماں کی چھاتی سے چپٹا ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کھدر پوش منسٹر صاحب نے روشنی ہوتے ہی وہ امریکن جاسوسی ناول جس کے اوپر ایک نقاب پوش پستول باز اور ایک نیم برہنہ مردہ عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی، بند کر کے جلدی سے اپنے کھدر کے تھیلے میں ڈال دیا جس کے دونوں طرف مہاتما گاندھی کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس میں سے پنج سالہ پلان کے بارے میں ایک موٹی سی رپورٹ نکال کر ہاتھ میں لے لی۔

تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت یعنی جب پریس فوٹوگرافر تصویریں لینے آئیں تو کام آئے۔ اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے کے لیے آشا نے دھیرے سے اپنا ہاتھ بلدیو کے ہاتھ سے نکال لیا اندھیرے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اس وقت اسے بلدیو کے ہاتھ کی ملائمت ایسے لگی جیسے مچھلی، مینڈک یا سانپ، کے چکنے جسم کی ملائمت اور بے اختیار اس نے اپنے ہاتھ کا پسینہ کمبل سے رگڑ کر خشک کر دیا۔

لاؤڈ اسپیکر پر ایر ہوسٹس کی آواز سنائی دی جس کا لہجہ اس طرح سدھا ہوا اور جچا تلا تھا جیسے اس کے سانولے چہرے پر مستقل چپکی ہوئی مسکراہٹ۔ "چند منٹ میں ہمارا ودیان ناگپور کے ہوائی اڈے پر دھارے گا۔"

ناگپور!
ناگپور!!
ناگپور!!!

ہزاروں لاکھوں آوازوں کا کورس آشا کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ناگپور! ناگپور!! ناگپور!!! سیکڑوں وائلن ایک ساتھ بیتھوون (BEETHOVEW) کا کوئی نغمہ سنا رہے تھے۔ ردھم تیز سے تیز۔ اور علی اکبر کے سرود کی جھنکار بلندی سے ساری کائنات جھنجھنا رہی تھی۔ مندروں اور گرجوں کے تمام مندروں کی گھنٹیاں ایک وقت بول رہی ہیں اور اس موسیقی کے سمندر میں صرف ایک لہر تھی ایک لے تھی، ایک آہنگ، ایک سُر، ایک تال ——— ناگپور! ناگپور!! ناگپور!!!

اور وہ ہوائی جہاز اب فاصلے کی منزلیں بس طے کر رہا تھا۔ وقت کی حدوں سے اڑتا ہوا ماضی کی طرف جا رہا تھا۔

وہ اب بھی ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوئی تھی۔
وہ ہوائی جہاز اب بھی ناگپور ہی کے ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا۔
مگر وقت اور تھا، دنیا اور تھی۔ وہ خود اس وقت کچھ اور تھی۔

وہ اس دن کتنی خوش تھی۔ جب لڑکی اٹھارہ برس کی ہو اور پھر خوبصورت بھی ہو تو بلاوجہ بھی خوش ہو سکتی ہے مگر اس دن خوش ہونے کی کتنی ہی وجوہات تھیں۔ اس دن اس کا بی۔ اے کا نتیجہ بھی نکلا تھا اور وہ پاس ہو گئی تھی۔ اس دن اسے دلی سے منسٹری آف ایجوکیشن کا خط ملا تھا۔ امریکہ کا اسکالرشپ کے لیے اس نے جو درخواست دی تھی اس کے لیے وہ پہلے سلیکشن میں آ گئی ہے۔ انٹرویو کے لیے دہلی آنا ضروری ہے۔ سرکاری خط حسب معمول دیر سے ملا تھا۔ انٹرویو اگلے دن صبح کے گیارہ بجے تھا اور وقت پر پہنچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ نائٹ ایئر میل سے روانہ ہو جائے۔ اس کے سب گھر والے اسے چھوڑنے ہوائی اڈے پر آئے تھے۔ چلتے چلتے ماں نے ہدایت کی تھی کہ دیکھ راستے میں کوئی انجان آدمی بات چیت کرنے کی کوشش کرے تو اسے جواب نہ دینا ایسے آدمی بہت خطرناک ہوتے ہیں اور دیکھو میں نے مس راما سوامی کو تار دے دیا ہے۔ وہ تجھے لینے پالم آئیں گی یا اپنے کسی نوکر کو بھیجیں گی جب نائٹ ایئر میل کے سب مسافر اکٹھے ہو گئے تو آشا کی ماں نے ایک معمر خاتون سے بیٹی کا تعارف کراتے کہا "بہن یہ میری بچی پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھ رہی ہے کرپا کر کے اس کا خیال رکھئے گا۔" اور آشا کو جھنجھلاہٹ بھی ہوئی کہ ماں مجھے کیا بالکل دودھ پیتی بچی سمجھتی ہیں مگر پھر سفر کے خوش آئند خیال سے وہ مسکرا دی اور بولی "ماں تم بالکل

نہ گھبراؤ میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی مسز نارائن کا پلو نہیں چھوڑوں گی۔"

مسز نارائن کافی مشہور سوشل ورکر تھیں اور مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اکثر انھیں ہوائی جہاز سے سفر کرنا پڑتا تھا اس لیے انھوں نے آشا کو ہدایت کی کہ سیٹ بیلٹ کھولے مگر وہ بھی ان کی طرح کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے اور چند ہی منٹ میں اکثر دوسرے مسافروں کی طرح وہ تو سو گئیں مگر آشا بہت دیر تک یہی سوچتی رہی کہ کرسی اگر گدے دار آرام دہ بھی ہو تو اس پر کیسے سویا جا سکتا ہے اپنے بدن کو بے آرامی سے موڑ توڑ کر اس نے سونے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہیں ہوئی تو وہ چپ چاپ ایئر ہوسٹس کو کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی جو مسافروں کو مٹھائی کی گولیاں، کان بند کرنے کے لیے روئی، سر کے نیچے رکھنے کے لیے تکیے، اوڑھنے کے لیے کمبل اور اطمینان قلب کے لیے اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹیں تقسیم کر رہی تھی۔ پھر روشنیاں گل کر دی گئیں اور نہ جانے کتنی دیر آشا اوھ کھلی آنکھوں سے اپنے مستقبل کے اندھیرے میں جھانکتی رہی جس کے آسمان پر دور بہت دور ستارے جگمگا رہے تھے لیکن ابھی تک اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ان میں اس کی قسمت کا ستارہ کونسا ہے۔

اور پھر ہوائی جہاز نیچے اترنا شروع ہوا اور روشنیاں جل اٹھیں اور ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ یہاں ایک گھنٹے کے لیے ناگپور کے ہوائی اڈے پر رکے گا۔

اس نے مسز نارائن سے کہا "مگر میں تو سمجھی تھی کہ یہ ہوائی جہاز سیدھا دلی جائے گا؟"

"جائے گا مگر ایک گھنٹہ کے بعد۔"

"اور ایک گھنٹہ تک ہم کیا کریں گے؟"

"تم ایئر پورٹ کے ریسٹوران میں جانا وہاں ایئر لائنس کی طرف سے کچھ ناشتہ اور کھانے پینے کو ملے گا۔"

"جی اور آپ؟"

"جی میں تو ناگپور ہی تک آئی ہوں ہماری کانفرنس یہیں ہو رہی ہے۔"

جب تقریباً سب مسافر اتر گئے تو آشا نے ایئر ہوسٹس سے کہا "اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں یہیں ٹھہری رہوں؟"

"نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ ویمان دلی نہیں جائے گا کلکتے جائے گا ادھر سب مسافروں اور سامان کا ادلا بدلی ہوتا ہے۔ تم کو نہیں معلوم؟"

اور پھر اس نے آشا کو بتایا کہ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے چار ہوائی جہاز ناگپور پہنچتے ہیں ایک دلی سے۔ ایک بمبئی سے۔ ایک کلکتہ اور ایک مدراس سے اور سب جگہ کے مسافر یہاں جمع ہوتے ہیں اور پھر جس کو جہاں جہاں جانا ہوتا ہے وہاں جانے والے ہوائی جہاز میں چلا جاتا ہے۔

"مگر یہ سب ناگپور میں کیوں ہوتا ہے؟"

"اس لیے کہ ناگپور ہندستان کے بیچ میں ہے۔ ایئر ہوسٹس نے ہنس کر آشا کو باہر نکالتے ہوئے کہا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ناگپور کے سنگترے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جاؤ ریسٹوران میں آرنج جوس پیو فری۔"

"میڈم چائے یا آرنج جوس؟" ایئرپورٹ ریسٹورنٹ کے بیرے نے پوچھا۔

"آرنج جوس۔" آشا نے ایئرہوسٹس کی بات یاد کر کے کہا۔

"اور صاحب آپ؟"

"جو میڈم کے لیے وہی ہمارے لیے۔ آرنج جوس۔"

"جی!" آشا نے جلدی سے مڑ کر دیکھا کہ ایک نوجوان خاکی سفاری قسم کے شرٹ اور کاڑرائے کی نیلون پہنے دوا یر بیگ ایک مرٹے پورٹ فولیو اور کیمرہ سے لدا پھندا برابر کی کرسی پر جیٹھ رہا ہے۔ پھر اس نے میز پر جھکا ایر بیگ کو کرسی کے کونوں میں لٹکایا اور پورٹ فولیو کو قریب کی خالی پڑی ہوئی کرسی پر رکھ دیا۔

"معاف کیجئے گا۔" اس نے مسکرا کر اپنے پتلے شفاف دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اور اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں آج ہی ولایت سے واپس آیا ہوں۔" آشا کو ماں کی ہدایت یاد آئی کہ خبردار کسی انجانے مرد سے بات چیت نہ کرے مگر یہ اب نہ دین بھی تو عجیب لگتا تھا اور اس کے علاوہ اس لمبے سانولے رنگ کے نوجوان کی بول چال میں اس کی کالی اور چمکیلی آنکھوں میں اور اس کی مسکراہٹ میں ایک ایسا معصوم فقیرانہ انداز تھا جس پر کسی تسخر کا شبہ کرنا مشکل تھا۔ سو آشا نے حیرت سے پوچھا۔

"جی۔ آپ ولایت سے آئے ہیں۔ آج ہی! اتنا سفر کر کے آئے ہیں تھکے نہیں؟ میں تو مدراس سے یہاں تک پہنچتے پہنچتے تھک گئی تھی۔" اور جب وہ یہ کہہ چکی تو اسے خود تعجب ہوا کہ ایک انجان نوجوان سے اتنی بہت سی باتیں اس نے کیسے کر ڈالیں۔

تب اس نوجوان نے اسے بتایا کہ وہ لندن سے سوپر کانسٹیلیشن میں آیا ہے۔ ایسے بڑے ہوائی جہازوں میں کوئی تکان محسوس نہیں ہوتی اور پھر اس نے بتایا کہ وہ دو برس کے لیے انجینئرنگ کی ٹریننگ لینے کے لیے انگلستان بھیجا گیا تھا اور اب اسے دہلی سے بھاکرا ڈیم پر کام کرنے بھیجا جائے گا۔

آشا نے سوچا میں نے اس کا نام بھی تو نہیں پوچھا مگر اتنے میں بیرا واپس آ گیا اور اس نے دو پیشین ٹماٹر سینڈوچ کی اور دو گلاس سکنرے کے رس سے رکھ دیئے۔

"لیجئے۔" نوجوان نے آشا کی طرف ایک گلاس بڑھایا۔ "جلد کر دیکھئے ہندوستانی سنگتروں کا مزہ کیسا ہے؟"

آشا نے ایک گھونٹ لیا اور کہا۔ "کھٹا ہے۔"

نوجوان نے بھی ایک گھونٹ لیا اور کہا۔ "ہوں۔ مگر ٹھنڈا ہے۔"

آشا نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا۔ "اتنا کھٹا بھی نہیں ہے۔"

نوجوان نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا۔ "کھٹ میٹھا کہہ سکتے ہیں۔"

آشا نے تیسرا گھونٹ لے کر کہا۔ "بلکہ خاصا میٹھا ہے۔"

نوجوان نے تیسرا گھونٹ اتنا لمبا لیا کہ گلاس خالی ہو گیا۔ پھر وہ بولا۔ "بوتل کی آرنج اسکواش میں یہ مزہ کہاں۔ بیرا نے ایک گلاس اسی جوس کا لاؤ۔ کہو آپ بھی پئیں گی نا؟"

"ٹھیک ہے۔ بیرا مجھے بھی ایک گلاس اور دو۔"

جب بیرا نئے گلاس لایا تو نوجوان نے آشنا کی طرف اپنا گلاس اٹھا کر کہا۔

"چیرز۔"

"جی!" آشنا نے پوچھا۔

"انگلستان میں جب دو دوست شراب پینے بیٹھتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔"

آشنا نے ڈر کر پوچھا: "آپ شراب بھی پیتے ہیں؟"

"کبھی کبھی!" نوجوان نے جواب دیا۔ "اگر دوست مصر ہوں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اس وقت میں نشے میں نہیں ہوں۔ دوستوں کا جام صحت آرنج جوس سے بھی پیا جا سکتا ہے۔ سو چیرز!"

"درست!" آشنا نے اپنا گلاس حیرت سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ ماں کی ہدایت کے خلاف کیوں اس نوجوان سے بلا تعارف ایسی باتیں کر رہی ہے کہ وہ اتنا بے تکلف ہوا جا رہا ہے۔

"چیرز!"

"چیرز!"

نوجوان نے اپنا جوس کا گلاس آشنا کے گلاس سے ٹکرانے کے بعد ہونٹوں سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے ایک سانس میں پی گیا پھر اس نے خالی گلاس کو میز پر الٹا رکھ دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی صحت، و مسرت کا خواہش مند ہوں!"

آشنا کو ایسا لگا جیسے اسے چیلنج کیا جا رہا ہے سو اس نے بھی گلاس اٹھایا اور ہمت کر کے ایک سانس میں پینے لگی اور نا گپور کے سنگترے کا ٹھنڈا کھٹ میٹھا رس اس کے گلے کو گدگداتا ہوا اس کی رگوں کے ساتھ خون میں سرایت کر گیا اور گلاس کو میز پر الٹا رکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکلا: "ایسے ایسے تو میں ایک سو ایک گلاس پی سکتی ہوں۔"

سب مسافروں کے ساتھ اندھیرے لاؤنج میں بیٹھے وہ دونوں بھی کشمیر کی بہار دیکھ رہے تھے۔ یہ رنگین ڈاکومنٹری فلم بہت ہی حسین تھی اور ان حسین مناظر کو دیکھ کر آشنا سوچ رہی تھی کہ کاش وہ بھی ایک دن کشمیر پہنچ جائے گی . . . .

"دہلی جانے والا ہوائی جہاز تیار ہے کرپا کر کے دہلی جانے والے یاتری . . . ."

ایئر پورٹ اناؤنسر کی آواز لاؤڈ سپیکر پر گونجی نوجوان نے نہ صرف اپنے دو ایئر بیگ اور مونٹاڈ فیل پورٹ فولیو اور کیمرہ بلکہ آشنا کا ایئر بیگ اور مٹھائی کی ٹوکری جو وہ مسز راماسوامی کے لیے لے جا رہی تھی۔ سب سامان اپنے کاندھے پر لاد دا اور دوسرے سب مسافروں کے ساتھ وہ دہلی والے جہاز کی طرف چل پڑے۔

راستے میں آشنا نے کہا: "لائیے یہ ٹوکری میں لے لوں آپ کے پاس پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔ میرا سامان آپ کیوں ڈھوتے ہیں؟"

اور نوجوان نے جواب دیا: "اس لیے کہ مجھے بوجھ اٹھانے کی عادت ہے۔ اور اس کے علاوہ مجھے بعض لوگوں کا سامان ڈھونے میں مزا بھی آتا ہے۔"

ان کو برابر کی سیٹیں مل گئیں۔

ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا: اپنی اپنی پیٹیاں باندھ لیجئے۔

آشا نے نوجوان سے کہا: "آپ کو تو ہوائی سفر کی عادت ہو گئی ہوگی۔ میں پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوں۔"

اور سانولے چہرے پر مسکراتے ہوئے دانت چنبیلی کے پھولوں کی طرح کھل گئے۔ نوجوان نے پوچھا۔

"کیوں ڈر لگ رہا ہے؟"

"کسی قدر۔" آشا نے جواب دیا۔

"آپ تو مدراسی ہو کر اچھی ہندوستانی بولتی ہیں۔"

"میں مدراسی نہیں ہوں گو اس وقت مدراس سے آ رہی ہوں۔ ہم لوگ منگلور کے رہنے والے ہیں۔ کنڑی زبان بولتے ہیں۔"

"تو ہندوستانی کہاں سیکھی؟"

"میرے بابا سکریٹریٹ کی نوکری سے پنشن لینے تک دلی ہی میں رہتے تھے۔ میں نے میٹرک وہیں سے کیا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟"

"بی۔ اے میں نے مدراس یونیورسٹی سے کیا ہے۔ میرے بابا اب وہاں رہتے ہیں۔ میری ماں اسکول میں پڑھاتی ہے۔ پنشن ملا کر گذارہ ہو جاتا ہے۔"

اب ہوائی جہاز ہوا میں تھا۔ ایئر ہوسٹس نے دونوں کو تکئے اور کمبل دیئے۔ پھر وہ دوڑ دوڑ کر مسافروں کو چائے اور کافی وغیرہ دینے لگی۔

نہ جانے کیوں آشا کو اس نوجوان سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بی۔ اے انگریزی سے کر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اس کے بابا اسے آگے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنا چاہتے ہیں لیکن جتنی پنشن اور ماں کو تنخواہ ملتی ہے اس میں گھر کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسکالرشپ مل جائے تو وہ جا سکتی ہے۔

"اسکالرشپ تو آپ کو نہیں ملے گا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہم نہیں چاہتے۔"

"آپ نہیں چاہتے کہ میں آگے پڑھوں، گورنمنٹ کے خرچ پر انگلستان ہو آؤں۔ مگر وجہ؟"

"ہے ایک وجہ۔ مگر ہے راز ہی بیٹے۔"

"آپ بہت مذاق کرتے ہیں۔ آپ کو تو انجینئر کے بجائے ایکٹر ہونا چاہئے تھا۔"

"سچ؟"

"ہاں اور کیا؟" اب وہ بھی مذاق پر اتر آئی تھی۔ "صورت شکل بھی خاصی ہے آپ کی۔"

وہ ہنسنے لگا۔

آشا بولی "آپ کے رہنے والے کہاں کے ہیں؟"

"پیدا تو ہوا تھا میں لاہور میں مگر اب ہم لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔"

"اب آپ کو بھاکڑہ ڈیم جانا پڑے گا۔ کیوں؟"

"ہاں اور کیا۔ وہاں کام کرنے کے لیے ہی تو گورنمنٹ نے دو برس ولایت میں ٹریننگ دلوائی ہے۔ ڈیم کے ساتھ جو بجلی گھر بن رہا ہے اس میں کام کروں گا۔"

"وہاں جنگل میں آپ رہیں گے۔ آپ کا جی نہیں گھبرائے گا؟"

"شاید گھبرائے گا۔ پھر ضرورت پڑی تو دل بہلانے کا کوئی انتظام کیا جائے گا۔"

"آپ کی مسز بھی آپ کے ساتھ جائیں گی؟"

"میری شادی نہیں ہوئی۔"

"اوہ!" اور دفعتاً آشا یہ سوال کر کے جھینپ گئی۔ اور چپ ہو گئی۔ اتنے میں ایئر ہوسٹس نے روشنیاں گل کرنا شروع کر دیں اور نوجوان نے کہا "اچھا بھئی اب سونا چاہیے۔ گڈ نائٹ۔" یہ کہہ کر اس نے سیٹ کے پیچھے سر ٹکائی اور کمبل اوڑھ کر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہی میں سارے ہوائی جہاز میں سناٹا چھا گیا۔ خراٹوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔

آشا نے اندھیرے میں اپنے برابر کی سیٹ سے کہا "یہ تو بتایئے کہ آپ کا نام کیا ہے؟"

مگر نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سو چکا تھا۔ اور آرام سے لیٹا سوتا رہا جب تک ایئر ہوسٹس نے دہلی پہنچنے کا اعلان نہ کر دیا۔

"دیکھیے آپ یہاں ٹھہریے۔" پالم پہ اتر کر نوجوان نے آشا کی چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا "میں گھر ذرا ٹیلیفون کر دوں کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔"

لیکن وہ ابھی ٹیلیفون کی طرف چلا ہی تھا کہ دفعتاً اس کے پورے خاندان نے اسے گھیر لیا اور دور سے اس ملاپ کو دیکھتے ہوئے آشا کو اندازہ ہوا کہ جس نوجوان کی ہمراہی میں وہ ناگپور سے یہاں آئی تھی وہ کس قسم کے خاندان سے تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں جو جیتا جیتا کہہ کر اس سے لپٹ رہی تھیں شلواریں پہنے ہوئے تھیں باپ کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ شریف سیدھے سادے متوسط درجے کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نوجوان ضرور اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف کرائے گا کہ اسے خود مسز راما سوامی کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا۔

"تم آشا ہو۔ آشا شاستری۔" ایک موٹی بڈھی سفید بالوں والی خاتون نے اپنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک میں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا اور جیسے ہی آشا نے سر ہلا کر کہا "ہاں" کر بڑی بی نے اسے گلے سے لپٹا لیا۔ "جیتی رہو بیٹی۔ میں تمھاری ماں کی بچپن کی سہیلی ہوں۔ ہم لوگ بنگلور میں ساتھ اسکول جانے جاتے تھے کیا دن تھے وہ بھی! مگر اب یہاں کھڑی کس کا انتظار کر رہی ہو؟ چلو موٹر باہر کھڑی ہے۔ ڈرائیور تمھارا سامان لے لے گا۔ ارے واہ تم تو اتنی لمبی ہو گئی ہو جیسے بانس۔ میں نے تو جب دیکھا تھا تو تم اتنی سی تھیں

.........وغیرہ وغیرہ، یہاں تک کہ انھوں نے آشا کو تقریباً زبردستی باہر نکال کر جلیل کی موٹر میں سوار کر دیا اور جب موٹر دھول اڑاتی ہوئی روانہ ہو گئی تو آشا کو دل کے ایک جھٹکے کے ساتھ یاد آیا کہ اسے تو اس دلچسپ اور مہذب نوجوان کا نام بھی معلوم نہ ہوا تھا اور نہ اسے آشا کا

اور پھر اس پہلے سفر کے دس دن بعد آشا دوسری بار اسی طرح رات کے دو بجے تانگہ سے ہوائی اڈے پر پہنچی۔

لیکن اس بار اس کا موڈ ہی دوسرا تھا۔ انٹرویو میں وہ فیل ہو گئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اس اخلاص نوجوان کو کوسا تھا جس نے اسے بد دعا دی تھی کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملے گا اور کوسنا چاہیے بھی تھا کیونکہ انٹرویو کے وقت بھی وہ اسی کم بخت کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اسی لیے وہ سوالوں کے جواب دینے میں بار بار گڑبڑا گئی تھی۔ "تم انگریزی سے شاعروں میں کسے پسند کرتی ہو؟" جواب میں اس نے کہہ دیا تھا "جی میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتی" اور جب ایک اور ممتحن نے پوچھا "ہوائی ڈاک کے انتظام میں ناگپور کی کیا اہمیت ہے" تو وہ بول اٹھی "جناب ناگپور ایئرپورٹ ہندوستان کی سب سے اہم ایئرپورٹ ہے۔ آدھی رات کو وہاں چار ہوائی جہاز دلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس سے آتے ہیں۔ وہاں ڈاک اور مسافروں کی ادلا بدلی ہوتی ہے اور دو دو گلاس سنگتروں کا رس پینے کو ملتا ہے وہ بھی فری!"

ایک بار پھر اسی پرانے بیرے نے آکر اس سے پوچھا تھا "میڈم، چائے یا آرینج جوس؟" اور اس نے جواب میں کہا تھا "ہاں آرینج جوس لے آؤ" اس امید میں کہ شاید آج پھر کسی کی آواز آئے گی "جو میڈم کے لیے وہی ہمارے لیے"۔ لیکن آج ایئرپورٹ ریسٹورنٹ فیلو اور کیمرے سے لدا ہوا کوئی مسکراتا ہوا نوجوان نظر نہ آیا۔ برابر کی کرسی پر ایک موٹے مارواڑی سیٹھ تو ضرور تھے جو ہاتھ پھر پھیر کر ڈکاریں لیتے رہے اور اپنی سونے چاندی سے لدی گھونگھٹ والی بیوی سے کہتے رہے "ہوائی جہاز کے سفر میں سوڈا واٹر ڈکاریں خوب ساری آوے ہیں"۔ اور پھر جب بیرے نے گلاس سامنے لا کر رکھا۔ آشا نے اسے منہ سے لگایا تو نہ پہلے جیسی خوشبو آئی نہ ہی وہ کھٹ مٹھا مزا۔ ایسا لگتا تھا کہ سڑے ہوئے سنگتروں کا رس نکالا ہے۔ دو گھونٹ ہی پیئے تھے کہ اسے ابکائی آئی اور وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی باتھ روم کی طرف بھاگی۔

بعد میں اس نے سوچا اپنا سینما ہی دیکھ لوں شاید دل بہل جائے لیکن آج وہ پٹ پردے پر رنگین بھی بے رونق نظر آ رہا تھا۔ پرانی فلم کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری فلم تھا اور جب آشا نے تقسیم اور فسادات کے مارے ہوئے شکستہ قافلوں کے منظر دیکھے جیسے ساری دھرتی پر دکھ اور مایوسی کے بادل چھا گئے ہوں تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایسی ہی مایوسی کا یہی دکھ بھرا سایہ آج خود اس کے اپنے من میں بھی ہے اور وہاں سے اٹھ کر باہر آ کھڑی ہوئی۔ جہاں ایک جوشیلے نوجوانوں سے نوکروں کا ایک گروہ کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ سب سرچ لائٹ کی روشنی میں ہوائی جہازوں میں پیٹرول بھرنے کے منظر کو ایسے انہماک سے دیکھ رہا تھا جیسے چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ کر رہا ہو۔

اور آشا کھڑی کھڑی سوچتی رہی کہ وقت کیسا بے مروت ہے، پلٹ کر آ سکتا ہی نہیں۔ مجھے دیکھ کر کتنے پہلے کیسے دہلی پوسے ایک ہفتہ ٹھہری۔ ہر شام کو کناٹ پلیس کے چکر لگائے۔ ہر روز کے مشہور ریسٹورنٹوں میں کافی پی۔ ہر دوپہر کو آلپس (ALPS) میں آئس کریم (ICE CREAM) کھائی۔ رفیوجی مارکیٹ سے بے ضرورت بے کار چیزیں خریدیں۔ اتوار کے دن پکنک کرنے قطب تک گئی۔ ہر جگہ یہ امید لے کر گئی کہ شاید یہیں وہ کیمرہ نظر آ جائے وہ ہنستے مسکراتے چہرے پر مسکراتے ہوئے دانت ایسے چمکتے ہیں جیسے موتی۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔

آخر کار اناؤنسر کی آواز سنائی دی "جہاز کا رن وے پر مدراس جانے والا دیان تیار ہے......" اور آشا دوسرے مسافروں کے پیچھے پیچھے اپنا ایئر بیگ لادے آہستہ آہستہ چلتی رہی اور ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے من ہی من میں فیصلہ کرتی رہی "میں اس کی یاد کو یہیں ناگپور کے ہوائی اڈے پر چھوڑ جاؤں گی جہاں اسے پایا تھا۔ میں اسے بھول جاؤں گی۔ میں اسے بھول جاؤں گی۔ میں سنتے......"
اور سب مسافر اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے صرف ایک سیٹ خالی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور آشا وہاں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگی تب اس نے دیکھا کہ برابر والی سیٹ پر کوئی جینٹلمین اور اسے غور سے دیکھ رہا ہے اور نہ جانے آشا کو ایسا لگا جیسے جانوری سے کوئی اس کی ناپ تول بلکہ دام تول بھی کر رہا ہو۔ تبھی اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا گورا چٹا اور خاصہ ہٹا کٹا تازہ آدمی ہے ۔۔ جو گلابی شارک اسکن کے سوٹ پہنے ہے۔ نیلی ٹائی کی چوڑی چکلی ٹائی لگائے ہوئے ہے جس پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے جسے دیکھ کر آشا کو ابھی ابکائی آنے لگی جیسے کچھ دیر پہلے ایئر پورٹ ریسٹورنٹ میں سنگتروں کا رس پی کر آئی تھی "اگر آپ چاہیں تو ادھر کھڑکی والی سیٹ پر آجائیے۔" اس شخص نے اپنے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ آشا نے دیکھا کہ اس کے دانت سگریٹ اور شاید شراب کی کثرت سے پیلے اور گندے ہیں۔ اور گو اس نے تیز خوشبو والا سینٹ لگایا ہوا ہے پھر بھی اس کے بدن میں سے سڑے ہوئے سنگتروں کی بو پھوٹ رہی تھی۔

سو آشا نے کہا "جی نہیں شکریہ میں ٹھیک ہوں" اور شارک اسکن سوٹ والے نے اپنا انگریزی رسالے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ آشا نے دیکھا کہ میگزین کا نام ہے GAY NIGHTS اور سرورق پر ہی جو تصویر چھپی تھی اسے دیکھ کر اسے پھر ابکائی آگئی۔

مدراس کے ہوائی اڈے پر ہوائی جہاز اترا تھا کہ آشا نے اپنے ہم سفر کی آنکھیں اپنے چہرے پر اور بدن پر پھرتی محسوس کیں۔ اب تک وہ سوتا آیا تھا لیکن ایئر ہوسٹس کے اعلان کے بعد اس نے انگڑائی لے کر اٹھایا تھا اور اپنے پورٹ فولیو میں سے اس نے یو ڈی کولون (EAU DE COLOGNE) کی بوتل نکالی تھی اور تقریباً چلو بھر خوشبو دار لوشن اپنے چہرے پر پھیر لیا تھا اور پھر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے آشا سے کہا "اس سے میں بالکل فریش ہو جاتا ہوں۔ لیجئے آپ بھی۔"
"جی نہیں شکریہ۔" آشا اس قسم کے آدمی سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

"آپ مدراس ہی میں رہتی ہیں کیا؟"
"جی ہاں"
"تو دلی کیا سیر کرنے گئی تھیں؟"
"جی نہیں ایک اسکالرشپ کے لیے انٹرویو تھا۔"
"خوب تو اسکالرشپ مل گیا؟"
"جی نہیں ملا"
"تو پھر اب کیا ارادہ ہے"

"میں شاید نوکری کروں گی۔"

"ویری گڈ تو یہ لیجئے میرا کارڈ۔ رکھئے شاید کبھی کام آسکے۔" کارڈ پر لکھا تھا۔

مسٹر بلدیو راج کوہلی۔ ریسٹرن ہوٹلز لمیٹڈ۔ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس

دو برس کے بعد آج پھر وہ ناگپور کے ہوائی اڈے پر اتر رہی تھی۔ زندگی میں تیسری بار۔ اس بار وہ مسٹر بلدیو راج کوہلی اس کے ساتھ تھا جس کے بدن سے بھینی بھینی بڑے بڑے سگاروں کی بو آتی تھی۔ دو برس میں کیا کچھ بدل جاتا ہے۔ بدبو خوشبو میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہیرے کی انگوٹھیاں پہننے والا ادھیڑ عمر کا آدمی کو اچھی عادت نوجوان معلوم ہوتا ہے کل تک جو مالک تھا۔ دو دن کا دولہا تھا۔ وہ شادی کی پہلی سے کم سے کم تیرہ سرکاری طور سے منگیتر بن جاتا ہے۔ تو شانے سر جا۔ کاش یہ کمبخت یاد بھی پیچھا چھوڑ دے کتنا اچھا ہوتا اگر وہ اس نائٹ ایئر میل کے بجائے سویرے کے ڈائرکٹ پلین سے چلے ہوتے تاکہ سینے لٹانا پڑے سے تو چھٹکارا ملتا۔

آشا نے اپنے دل کو تسلی دی۔ گھبراتی کیوں ہے تجھے تو خواہ مخواہ احساس جرم ہو رہا ہے۔ آخر تو نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے۔ گھر میں تنگی تھی اور تجھے نوکری کرنا ہی تھی۔ سو تو مسٹر کوہلی جو تیرا وہ کارڈ لے کر ان سے ملنے بمبئی ہوٹل چلی گئی اور انھوں نے رحم کھا کر اسی ہوٹل میں ریسپشنسٹ (RECEPTONIST) کی نوکری دے دی۔ ڈیڑھ سو روپے کا اسٹارٹ دیا۔ تین مہینے کے بعد جب وہ پھر دورے پر مدراس آئے تو تیرے کام سے خوش ہو کر تیری تنخواہ دو سو سے تین سو کر دی پھر تجھے بمبئی سیر کرائی۔ اپنی بیوک کی موٹر میں پونڈ چیری لے گئے۔ مہابلی پورم اور کنیا کماری کے مندر دکھائے۔ یہ مانا کہ دو تین بار بلدیو نے عادت سے مجبور ہو کر دست درازی کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جتنے بھی مالک اور باس ہوتے ہیں۔ جن کے ہاں نوجوان لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ وہ سب ایک آدھ بار ایسی کوشش کرتے ہی ہیں۔ اب ہر لڑکی کے کیرکٹر پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو بیچ دیتی ہے یا اپنی عزت کو برقرار رکھتی ہے۔ تو نے کبھی اپنے آپ کو نہیں بیچا۔ اور کیونکہ تو نے دوسری چھچھوری اور آوارہ لڑکیوں کی طرح تین سو روپے ماہوار اور چند تحفوں کے عوض اپنے بدن کو فروخت نہیں کیا تو وہ جو ہر لڑکی کو ایک کھلونا سمجھتا تھا۔ وہ بھی تیری عزت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مدراس سے اس نے تیرا تبادلہ دہلی میں اپنے ہیڈ آفس میں کر دیا۔ RECIEPTIONIST سے تو پرسنل سکریٹری ہو گئی۔ تجھے راج محل جیسے عالیشان ہوٹل میں رہنے کو کمرہ ملا۔ اپنے ہوٹلوں کے معائنے کے لیے بلدیو سارے ملک کا دورہ کرتا اور ہر جگہ تو ساتھ ہوتی۔ چاہے ہوائی جہاز ہو یا ایئر کنڈیشنڈ ٹرین۔ تنخواہ پانچ سو ہو گئی جس میں سے پورے چار سو تو گھر بھیجتی رہی۔ تب ہی تو تیرے ماں باپ نے بھی اس نوکری کی مخالفت نہیں کی۔ تو نے اپنے میں بھی تو تبدیلی محسوس کی ہو گی؟ وہ دبلی پتلی سانولی سی لمبی چوٹی والی لڑکی کہاں ہے جو دو برس پہلے ہوائی جہاز میں اکیلے سفر کرتے گھبراتی تھی۔ آج تو ایک اسمارٹ فیشن ایبل نوجوان کیریئر وومن ہے۔ تیری تصویریں "السٹریٹڈ ویکلی" اور "کرنٹ" میں چھپتی ہیں۔ بلدیو کے ساتھ بڑے بڑے گھروں میں تجھے ڈنر اور پارٹیوں میں دعوت دی جاتی ہے۔ مانا کہ لوگ تیرے اور بلدیو کے بارے میں سکینڈل کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔

تجھے معلوم ہے کہ تو نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے .... بلکہ

اپنے اثر سے بلدیو کو بہت سی پرانی عادتوں سے بچایا ہے۔ اب اس نے شراب پینی کم کر دی ہے۔ پچاس سگریٹوں کے بجائے صرف

میں سگریٹ روزانہ پیتا ہے۔ اب برجھوکری کے پیچھے وہ نہیں بھاگتا۔ جوا کھیلنا بھی کم کر دیا ہے۔ تب ہی تو خود راۓ بہادر بھی آشا کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ جب ملتے ہیں کہتے ہیں "بھئی آشا نے تو بلدیو کی زندگی ہی بدل دی ہے" اور اب کہ بلدیو نے آشا کو اپنے ساتھ ساری دنیا کے سفر پر چلنے کو کہا ہے تو ظاہر ہے کہ راۓ بہادر نے بیٹے کو شادی کی اجازت بھی دے دی ہوگی۔

ایک بار پھر وہی ناگپور ایرپورٹ۔ گو اب وہ پہلے سے زیادہ شاندار بن گئی تھی۔ مگر ابھی صرف ایک ہی ہوائی جہاز آیا تھا اس لیے زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔

پھر وہی ایرپورٹ ریستوراں۔

پھر وہی بوڑھا بیرا۔

پھر وہی سوال "میڈم چائے یا آرنج جوس؟"

بلدیو نے کہا "آرنج جوس دونوں کے لیے"

آشا نے کہا "نہیں میں چائے لوں گی"

بلدیو نے اصرار کیا "ارے بھئی کوئی وقت ہے چائے پینے کا۔ سنگترے کا رس پیو۔ تمھیں نہیں معلوم ناگپور کے سنگترے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں"

"معلوم ہے" آشا نے کہا۔ اور اس نے سوچا اب میں تمھیں کیسے بتاؤں بلدیو کہ سنگترے کے رس میں میرے لیے کتنی یادوں کا زہر گھلا ہوا ہے۔

اتنے میں بیرے نے دو بھرے ہوئے گلاس سامنے لاکر رکھ دیے۔

بلدیو نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لے کر کہا "واہ واہ کتنا میٹھا ہے۔ میں سوچتا ہوں اپنے ہر ہوٹل کے لیے ہوائی جہاز سے ناگپور کے سنگترے منگوایا کروں تاکہ یہ فریش آرنج جوس ہمارے ہر کسٹمر (CUSTOMER) کو صبح ناشتے پر مل سکے۔ ارے یہ کیا — پیو نہ آشا"

آشا نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔ رس نہ صرف کھٹا تھا بلکہ اس میں ایک عجیب قسم کی کڑواہٹ تھی۔ جیسے نیم کے پتوں کا عرق گھلا ہوا ہو۔ اور اک کسیلاپن تھا جیسا سڑی ہوئی ترکاری میں ہوتا ہے اور ایک عجیب قسم کی بدبو تھی جیسے پھوڑے میں سے رستی ہوئی پیپ میں ہوتی ہے۔ ابکائی آئی اور اسے متلی ہونے لگی۔

اس نے بیرے سے کہا "اسے لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیے"

"تو چائے لاؤں" بیرے نے پوچھا۔

"نہیں۔ صرف سادہ پانی"

اتنے میں کسی دوسرے جہاز کے مسافر آنے شروع ہو گئے اور ریستوراں میں بھیڑ ہو گئی۔

"چلو آشا" بلدیو نے کہا "پورا گھنٹہ گزارنا ہے اور یہاں تو بھیڑ بڑھتی ہی جائے گی۔ چلو نا ہی دیکھیں۔ وہ پہلا نارنگی ڈاکومنٹری

دکھا رہے ہیں کشمیر میں بہار۔"

کشمیر میں بہار! ——— کشمیر میں بہار!

آشا کے دماغ میں جیسے ہزاروں کیڑے سرسرا رہے تھے۔ لاکھوں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کروڑوں بچھو ڈنک مار رہے تھے۔

"بلدیو تم چلو۔ میں ابھی آتی ہوں"

وہ اٹھ پڑی۔ ہاتھ اٹھا کر ایک ناٹے سے قد کے چکنے چپڑے آدمی نے بلدیو کو آواز دی۔

"ارے یار بلدیو۔ کہاں ہو تم؟"

"او ہیلو۔ سمپورن۔ یار خوب ملے۔ میں دہلی سے بمبئی جا رہا ہوں۔ کل صبح سے بوٹنگ سے تازہ ہو جاؤں گا۔ اور تم؟"

"میں کلکتے سے آ رہا ہوں اور مدراس جا رہا ہوں۔ ادھر زندگی میں ایک ٹھیکہ ملنے کی امید ہے۔ ۔۔۔ سناؤ تمہارے بارے میں تو بڑی بڑی خبریں گرم ہیں۔ سنا ہے تمہاری نئی ......"

وہ اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ بلدیو نے کہا "سمپورن ان سے ملو۔ آشا شاستری۔ میری نئی پرسنل سکریٹری۔"

"ہاؤ آر یو مس شاستری!"

اور یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا ہی دیا۔ آشا نے شیک ہینڈ کیا تو اس کا ہاتھ سمپورن کی ہتھیلی کے پسینے سے تربتر ہو گیا اور اسے میز پوش کے پیچھے چپکے سے ہاتھ خشک کرنا پڑا۔

"اچھا تو آشا تم جا رہی ہو تو یہاں بیٹھو میں ذرا دیکھتا ہوں اور سمپورن سے گپ شپ کرتا ہوں۔ چل بھئی سمپورن"

ایک منٹ تو آشا وہیں بیٹھی رہی۔ تیسرا ہوائی جہاز بھی اتر چکا تھا اور اب اس کے مسافر بھی داخل ہو رہے تھے۔ اور ان میں ایک لمبا قد۔ ایک سانولا چہرہ۔ ملٹری وضع کی خاکی قمیص پہ موٹے ٹوئیڈ کا کوٹ اور کارڈرائی پتلون۔ ہاتھ میں ایک بیگ۔ کندھے پہ کیمرہ۔

وہی!

وہی!

وہی!

مگر نہیں آشا نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب اس بڈھے انجینئر کا خیال چھوڑ دو۔ جو نہ جانے بیاکرہ جنگل سے اب کسی جنگل میں خاک چھاننے جا رہا ہوگا۔ تو کل پیرس جا رہی ہے۔ پیرس اور لندن اور نیویارک۔ گریگری پیک کے ساتھ تصویر کھنچوانے۔ تیرا اس سے کیا واسطہ۔ جس کا تو نام بھی نہیں جانتی۔ تیری جگہ اس وقت بلدیو کے پاس ہے۔ جس نے تیرا ایوننگ جیسے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید ہوا ہے۔

اندھیرے لاؤنج میں آخر کار اس نے بلدیو اور سمپورن کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ ان کے پیچھے ایک کرسی خالی تھی وہ چپکے سے وہاں بیٹھ گئی۔

سینما کے پردے پر چنار کے سرخ پتے جھڑ رہے تھے اور کشمیری لوک ترانوں کا ایک درد بھرا لوک گیت سنائی دے رہا تھا۔ بلدیو اور سمپورن کانا پھوسی کر رہے تھے۔

"کیوں یار یہ لونڈیا تو سنا ابھی پھانسی ہے؟ پچھلی دفعہ جب ملا تھا تو وہ بنگالن تھی تیرے پاس۔ مگر سنا ہے تو اس مدراسن کے چکر میں آ گیا ہے۔"

"پھنسی میں کیا؟ نہیں اسے چکر دینے کی فکر میں ہوں یار۔ مگر یہ ذرا پکی ہے۔ سو اسے دنیا گھمانے لے جا رہا ہوں"

"مگر لوگ کہتے ہیں تو اس سے شادی کر رہا ہے۔"

"پاگل ہوا ہے کیا؟ تو نوجوان شاہی ہے اپنی زندگی کا اصول۔ گائے کا دودھ پیو۔ گائے گھر میں نہ باندھو۔ ایسی ایسی تو نہ جانے کتنی آئیں اور گئیں۔"

اور آرتی کو یہ محسوس کر کے کتنا تعجب ہوا کہ یہ سن کر اس کے دل پہ کوئی چوٹ نہیں پڑی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتاً بہت سی زنجیریں جو اسے جکڑے ہوئے تھیں چھن سے زمین پر گر پڑی ہیں۔

سینے کے پردے پر دفعتاً رنگا رنگ پھول کھل آئے تھے۔ شالیمار کے فوارے ناچ رہے تھے۔ ڈل جھیل کی سطح پر شکاروں میں نوجوان جوڑے کلیمٹ سے کن جانے کتنے سیر کر رہے تھے۔ ایک کشتی والے کی بچی مسکرا رہی تھی۔ آبشار کا پانی جھوم رہا تھا۔ کشمیر میں بہار آ گئی تھی۔

"...... لاسٹ کال فار مس شاستری ...... لاسٹ کال فار مس شاستری......"

"بمبئی جانے والا وایاں اب اڑنے کے لیے بالکل تیار ہے۔" اناؤنسر کی آواز ایئرپورٹ کی سنسان بلڈنگ میں گونجتی رہی کیونکہ سب مسافر اپنے اپنے ایروپلین میں جا چکے تھے اور پھر ایک ایک کر کے وہ سب اڑ گئے۔

دہلی جانے والا ہوائی جہاز۔

مدراس جانے والا ہوائی جہاز۔

کلکتے جانے والا ہوائی جہاز۔

بمبئی جانے والا ہوائی جہاز، جس میں ایک سیٹ خالی تھی۔

اور جب سب جہاز اڑ گئے اور ایئرپورٹ کے وسیع میدان میں صرف سرخ اور پیلی اور سبز روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی رہ گئیں۔ تو......

میدان کے ایک اندھیرے کنارے پہ دو مسافر کھڑے رہ گئے جو کہیں نہیں جا رہے تھے۔ جن کی منزل آ گئی تھی۔

"آرتی! کل میں تمھیں بھیلائی لے جاؤں گا۔ پہلے تم دیکھ لو کس ماحول میں مجھے رہنا اور کام کرنا ہے۔ وہاں بڑے شہروں کی چہل پہل نہیں ہے۔ بس فولاد کا کارخانہ ہے اور اس میں کام کرنے والے ہیں......"

"اور تم ہو"

"ہاں میں ہوں مگر ساتھ میں گرمی ہے۔ کارخانے میں کام کرنے والے انجینئروں اور مزدوروں کے لیے خطرہ ہے۔ تنخواہ صرف چار سو روپے ماہوار ہے۔ دو کمروں کا مکان ہے۔"

"اور تم ہو"

"اور یہی ہوں اور محنت ہے اور انقلابیوں کی سمجھ بوجھ اور قابلیت کا امتحان ہے اور مزدوروں کی قوت بازو ہے۔ ان کا خون اور پسینہ ہے اور پانی کی طرح بہتا ہوا فولاد ہے جس میں مستقبل کے سانچے ڈھالے جا رہے ہیں!"

"اور تم ہو....... مگر کم از کم اب تو مجھے اپنا نام بتا دو۔"

"میرا نام نرمل ہے۔ پورا نام نرمل کمار تیواری۔ میرے ماتا پتا اور رشتوں کو تم کسی دن دیکھ چکی ہو، وہ دو برس سے تم سے ملنے کے منتظر ہیں۔"

"میرے منتظر ہیں؟ مگر انہیں کیسے معلوم تھا کہ میں ـــ" اور آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"جیسے یہ معلوم تھا کہ تمہیں سکالرشپ نہیں ملے گا۔"

"تو پھر اب...؟"

"اب ہم کچھ پئیں گے۔"

بیرے ریستوران بندی کر رہے تھے جب یہ دونوں داخل ہوئے۔

بوڑھے بیرے نے حسب معمول پوچھا "چائے یا آرنج جوس؟"

"آرنج جوس" نرمل نے کہا۔

"مگر میم صاحب کو تو آرنج جوس پسند نہیں۔ ابھی واپس کر دیا تھا"

"تم لاؤ تو" نرمل نے اصرار کیا۔ اور بیرا دو گلاس بھر کر لے آیا۔

نرمل نے گلاس اٹھایا۔

آشا نے گلاس اٹھایا۔

نرمل نے آشا کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

آشا نے نرمل کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

نرمل نے اپنا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرایا۔

"چیئرز"

"چیئرز"

"پیو آشا"

نرمل نے گلاس منہ سے لگایا۔ ایک گھونٹ لیا اور ہونٹ چاٹنے لگا

آشا نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک لمحے کے لیے اس کی خوشبو ہی سونگھتی رہی۔ تازہ رس بھرے ناگپور کے سنگترے کی خوشبو جو کسی سینٹ سے کم نہیں ہوتی۔ پھر اس نے بھی ایک گھونٹ لیا اور حیران رہ گئی۔

سنگترے کا عرق ٹھنڈا تھا۔ کھٹ مٹھا تھا۔ ایسا جیسے بچپن میں توڑی ہوئی کچی کیریاں۔ جیسے چرائی ہوئی جامنیں۔ جیسے پہلی ملاقات۔

ایک عجیب دلگداز کھٹاس جو مدتوں چٹخارہ دیتی رہتی ہے۔ اور ساتھ ہی میٹھا بھی۔ رس بھری کھٹاس۔ جیسے کیوڑے میں بسی ہوئی گنڈیریوں میں

مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے دودھ پیتے بچوں کے ہونٹوں میں مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے محبت کے اقرار میں مٹھاس ہوتی ہے۔

نرمل نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

آشا نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

بیرے نے کہا: "اور پئیں گے سرکار؟"

"ضرور" آشا نے کہا: "مجھے تو ایک گلاس اور چاہئے"

بیرے نے جلدی سے انڈیل کر دو اور گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور اپنی بوڑھی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ یہ کیا معجزہ ہے کہ وہی سنگتروں کا رس جسے پی کر یہ لڑکی چند منٹ پہلے قے کر چکی ہے اب کتنے مزے لے کر پی رہی ہے۔

اور نرمل نے آشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ایک نہیں۔ ابھی تو تمھیں پورے ایک سو ایک گلاس پینے پڑیں گے۔"

تنہائی

مجنوں گورکھپوری

"گلستاں" ۔ اسمٰعیل لاج، گورکھپور
یو۔پی (انڈیا)
۵ جون ۱۹۵۸ء

محبی! سلام نیاز،

آپ کے تحمل اور آپ کی وضعداری دونوں کا تہہ دل سے قائل ہوں۔ کاش میرے حالات وہ ہوتے جو کسی زمانہ میں تھے اور جن کی بدولت میرے اندر تخلیقی روانی اور بے پروا نشاط کی فراوانی تھی۔ پھر آپ بھی دیکھتے کہ میں "نقوش" کی خدمت خود آپ کی توقع سے کرتا مگر اب کس منہ سے کچھ کہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ گزشتہ پانچ سال کے اندر مجھ پر کیسے کیسے حالات اور کیسی کیسی وارداتیں گزر گئیں اور اس وقت بھی کس عالم سے گزر رہا ہوں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا بیان نہیں ہو سکتا اور جن کو نہ بیان کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ لیکن یقین رکھئے اس مدت میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ آپ اور "نقوش" نہ یاد آتے ہوں اور میں دونوں سے شرمندہ نہ ہوتا رہا ہوں۔ اب معذرت کا وقت گزر گیا۔ میں آپ سے یہ نہ کہوں گا کہ مجھے معاف کر دیجئے۔ صرف عرض مطالب پر اکتفا کروں گا۔

ادھر "تنہائی" کے کچھ صفحات لکھ لئے ہیں جن کی نقل ہمرشتہ ہے۔ میں چاہتا ہوں چاہے ایک ہی اشاعت میں سب چھاپ دیجئے یا دو قسطوں میں نکالئے۔ اب کم و بیش اتنا ہی اور لکھنا رہ گیا ہے۔ امید ہے آئندہ دو ماہ کے اندر وہ بھی آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ مجھ سے جس قدر بھی مایوس یا برہم ہوں کم ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں بہت جلد مر نہ گیا تو "تنہائی" کو پورا کر کے "نقوش" کی خدمت میں پیش کروں گا، جلد یا دیر کا سوال البتہ ہے۔ اس مسودہ کی رسید سے مطلع کیجئے۔

آپ کا مخلص: مجنوں گورکھپوری

۱؎ مسودہ کے لیے ملاحظہ ہو "نقوش" ماہنامہ فروری، مارچ ۱۹۵۹ء

(۱۴)

شاہدہ ہفتے میں ایک روز مجھ سے ملنے ضرور آتی تھی۔ وہ جس طرح اپنا عہدِ رفاقت نباہ رہی تھی اس کی میں دل سے قائل تھی۔ مجھے اس کی طبیعت اور کردار پر حیرت بھی تھی اور رشک بھی۔ میں کبھی کبھی سوچتی رہ جاتی تھی کہ شاہدہ میں کوئی کمزوری یا نقص بھی ہے۔ قدرتی حسن و صورت شکل، رنگ روپ پر ناز کرنے والی عورتیں اس کے سامنے اپنے جسمانی حسن کا احساس دل میں لاتے ہوئے شرماتی تھیں۔ طباعی و ذہانت میں بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر پاتے تھے۔ عورتیں تو خیر ایک طرف اکثر مرد بھی اس کے چست برجستہ اور بلیغ شائستہ آمیز فقروں کی تاب مشکل ہی سے لا سکتے تھے۔ مزاج میں ایسی مسحور کر دینے والی شگفتگی پائی تھی کہ اداس سے اداس دل لوگوں پر کچھ دیر کے لیے اثر ہو جاتا تھا۔ جس محفل میں پہنچتی تھی چھا جاتی تھی۔ جن لوگوں کو اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کے جاننے کا موقع نہیں ملا ہے وہ ہمیشہ اس کو ایک خوش باش شگفتہ مزاج اور ہنس بول کر زندگی گزار دینے والی عورت سمجھیں گے۔ مگر مجھ سے پوچھیے کہ شاہدہ دراصل کیا تھی۔ ایک طرف تو وہ انتہا ہنس مکھ اور دنیاوی زندگی کے نقطۂ نظر سے بڑی باتدبیر اور خوش سلیقہ عورت تھی، دوسری طرف وہ اپنے دل کی اندرونی تہوں میں دردمندی اور دل سوزی کی نہایت وسیع صلاحیت چھپائے ہوئے تھی جس کو وہ غلط جگہ رائگاں نہ ہونے دیتی تھی بلکہ جو اس کا واقعی حق دار ہوتا تھا اسی پر صرف کرتی تھی۔ مجھ سے زیادہ شاہدہ کے اس چھپے ہوئے حسن کو پرویز کے سوا شاید کسی دوسرے نے نہ دیکھا ہو۔

شاہدہ سے مجھے پرویز کے حرکات و سکنات اور اس کے حال کی جستجو برابر ملتی رہتی تھی مگر خود پرویز نے نہ خط لکھا نہ کبھی خیریت پوچھی اور یہ ایک تیز شبہ میرے دل میں پیدا ہو چلا تھا کہ اس نے اگر مجھے دل سے بھلا نہیں دیا ہے تو کسی وجہ سے نہ ملنے کی قسم ضرور کھا لی ہے اور اس خیال سے روز بروز نہیں لمحہ بہ لمحہ میری زندگی کی سکت زائل ہو رہی تھی۔ میرا جی اپنے معمولی کاموں میں بھی نہیں لگ رہا تھا جن کو بہرحال پورا کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن میں نے شاہدہ سے کہا "شاہدہ! مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ پرویز نے یا تو کسی مصلحت سے مجھے بھلا دیا ہے یا انھوں نے جو رحم و کرم مجھ سے پیدا کی تھی وہ روزِ اوّل ہی سے سست اور عارضی تھی اور مجھے اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیے تھا۔"

"نہیں نہیں" شاہدہ نے ایک تڑپ کے ساتھ جواب دیا۔ "تم نے شاید اپنی تمام شیفتگی کے باوجود پرویز کو بالکل نہیں سمجھا۔ وہ عارضی اور وقتی جذبات اور خیالات کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کی زندگی عارضی مشاغل کے لیے نہیں بنی ہے۔ ہو نہ ہو سبب یہ ہے کہ وہ ذاتی خوشی اور کامرانی کو تمام بندگانِ خدا کی زندگی کے تقاضوں کے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کی ہر مراد اور ہر خوشی کو عامۂ خلائق کی فلاح و بہبود پر قربان کر دیتے ہیں اور اسی کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں......"

"مگر شاہدہ تم کو معلوم نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیسی شدید اور والہانہ محبت کا اظہار کر چکے ہیں۔ مجھے کہنا تو چاہیے مگر میں واقعی یہ سمجھنے لگی تھی کہ ان کی زندگی میں ایک خلا تھا جس کو میں نے بھرا ہے اور اس لیے قدرتاً مجھے امید ہو گئی تھی کہ وہ بھی مجھے اپنے سب تاثرات سمجھ کر اپنی زندگی میں کوئی اہم اور مستقل جگہ دے دیں گے لیکن شاید مجھے دھوکا ہوا۔ میں محبت کی ترسی ہوئی تھی اس لیے پرویز کو محبت کا دیوتا سمجھ کر ان کی پہلی جنبشِ تمنا پر ان کی ہو کر رہ گئی۔ میں ان کی محبت کو ایک آسمانی برکت سمجھے ہوئے تھی اور خیال تھا کہ یہ برکت ہم دونوں کو ان تمام روحانی اذیتوں سے بچا لے گی جن کے ہم شکار ہیں مگر اب تو یہ سب ایک خوابِ بے تعبیر ہے۔ جہاں تک تصور کر پاتی ہوں مجھے اپنی ساری زندگی خالی اور سنسان معلوم ہوتی ہے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ خیر آئندہ جو ہو گا سو ہو گا فی الحال یہیں سے رخصت لے کر بستی سے چلی جاؤں اور پھر یہاں واپس نہ آؤں۔ تم پرویز کی خیرخواہ کی حیثیت سے

نہیں چلے تھوڑی دیر کے لیے ان سے بالکل بے تعلق ہو کر میری دوست کی حیثیت سے مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟"

شاہدہ بڑے غور کے ساتھ میری صورت دیکھتی رہی اور میری بات سنتی رہی۔ اس کے بعد اس نے انتہائی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ایک بڑی گہری تاثیر ٹھنڈی سانس لی اور کہا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں اور تم کو کیسے سمجھاؤں۔ میں تمہارے درد کو محسوس کرتی ہوں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ منظور بھائی کے بارے میں تم کو بہت سے مغالطے ہیں۔ ان کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اس وقت ایک طرف ذاتی کامیابی اور مسرت کا سوال ہے اور دوسری طرف ایک کثیر تعداد ان ستم رسیدوں کی ہے جن کی آسائش اور حاجت روائی کا سنگین مسئلہ درپیش ہے۔ منظور بھائی اسی کشمکش میں کھوئے ہوئے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایسی حالت میں وہ تمام شخصی تعلقات اور پاسداریوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کو کسی حالت میں بھولتے نہیں۔ تم ان سے ابھی اچھی طرح واقف نہیں ہو۔ ایک بار انھوں نے مجھے پرانی روایات اور اساطیر سے متعلق ایک قصہ سنایا تھا۔ یونان میں حافظے کی ایک دیوی تھی جو نیموسنی (MNEMOSYNE) کے نام سے مشہور تھی۔ منظور بھائی بھی حافظے کے دیوتا ہیں۔ جو کچھ انھوں نے ایک مرتبہ دیکھ لیا یا سن لیا اور جو نتیجہ اس کو دیکھنے یا سننے سے ایک مرتبہ انھوں نے نکال لیا یا جو ارادہ کر لیا اس کو عمر بھر بھولتے نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ناموافق حالات و اسباب کی بنا پر وہ اس کو کبھی زبان پر نہ لائیں اور یہاں یہ بھی ممکن ہو کہ وہ اپنے مطالعے اور غور و فکر کی وسعت کی بنا پر جو نتیجے نکالتے ہیں ان کے اندر اقلیدس کی شکلوں کی طرح غلط ہونے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ علم و ادب اور تمدن و معاشرت کے مختلف شعبوں میں ان کا مطالعہ لامحدود ہے اور شاید تم اندازہ نہ کر سکو کہ انھوں نے کتنا نقاد سوچنے اور سمجھنے والا دماغ پایا ہے اور کشور تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ اپنے سینے میں کتنا شعور درد مندی رکھتے ہیں۔ اس کا ایک ادنیٰ مظاہرہ تم روز دیکھتی ہو۔ کوئی عوامی تحریک ہوتی جس کو انھوں نے برحق سمجھا تو کود پڑتے ہیں اور پھر سب سے آگے ہو جاتے ہیں مگر ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن کی طرف عام طور سے ہماری توجہ نہیں جاتی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کیا اتفاق کیا عملی کسی فرد واحد کی شخصیت یا مشکل پر وہ اس طرح تلملا اٹھتے ہیں جیسے ان کا اپنا معاملہ ہو اور کچھ کوئی تدبیر نہ بن پڑتی ہو جس کا وہ ایسی حالت میں اظہار رکھتے ہوں۔ وہ اپنے کو حسرت میں ڈال کر بھی دوسروں کے آڑے وقت کام آنے میں مشہور ہیں۔ ان کا یہ قول یاد رکھو کہ حافظہ نوع انسانی کی سب سے بڑی دولت ہے۔ بارہا ان کی تحریروں اور ان کی گفتگو میں ایسے فقرے آ جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ کاش انسان اپنے مقصد اور ارادے سے جس بات کو چاہتا بھلا سکتا۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ منظور بھائی کی یہ زبردست قوت حافظہ ان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ بہرحال ان باتوں کو ذہن میں رکھو اور منظور بھائی کی سیرت اور شخصیت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔"

شاہدہ ایک محویت کے ساتھ پرویز کی سیرت بیان کر رہی تھی اور میں دم بخود سنتی رہی۔ مجھے ایک بیچارگی کا احساس ہونے لگا جس کا کسی کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے کہا: "شاہدہ! تم پرویز کو مجھ سے زیادہ جانتی ہو اس کا مجھے رشک کے ساتھ اعتراف ہے لیکن میں نے بھی تحریروں میں ان کو دیکھا ہے اور ان کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور اس کم مدت میں میں نے ان کو وہی پایا جو کچھ وہ اپنی تحریروں میں نظر آتے۔ مجھے تمہاری رائے سے حرف بحرف اتفاق ہے مگر یہ وقت سمجھنے سمجھانے کا نہیں ہے۔ اب تو محبت کا دھارا اور دھاروں سے مل کر کچھ ایسا الجھ گیا ہے کہ سلجھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں نے تم سے ایک ذاتی مشکل کے حل کرنے میں مدد مانگی تھی اور تم نے ایک کردار کا پورا نفسیاتی تجزیہ کر کے رکھ دیا مگر خدا کے لیے مجھے یہ بتاؤ کہ میں کروں کیا؟"

شاہدہ نے بڑے پیار اور بڑی غمگساری کے ساتھ کہا: "کشور! اس وقت میرا دماغ خود الجھن میں ہے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ منظور بھائی پھر کب تم سے ملیں گے۔ آج کل تو وہ لوگ بھی مشکل سے دو دو تین تین دن میں ان کی ایک جھلک دیکھ پاتے ہیں سو ہم لوگوں سے بھی کچھ دور رہا کرتے ہیں۔

لیکن آج میں قصد کر کے جا رہی ہوں کہ پہلی ہی ملاقات میں ان کا دامن پکڑلوں گی اور تمہارا جو حال ہے اور تم جو کچھ سوچتی اور محسوس کرتی رہی ہو اس کو واضح اشاروں میں ان سے بیان کر دوں گی۔ مگر چلتے چلتے ایک بار پھر سن لو کہ منظور بھائی دھن کے بڑے پکے آدمی ہیں۔"

(۱۵)

تین دن گزر گئے۔ چوتھے دن شاہدہ خلافِ معمول کچھ دھندلا چہرہ لیے ہوئے بڑے سویرے سویرے میرے پاس آئی اور کہنے لگی: "آج دن کا کھانا اور شام کی چائے تمہارے ساتھ رہے گی۔"

میں اس کے چہرے کا غور سے مطالعہ کرنے لگی لیکن اس کے بشرے سے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ جب چائے سے ہم لوگ فارغ ہو چکے تو میں نے لاپروایانہ لہجے میں پوچھا: "کہو شاہدہ! تمہاری وکالت کا جو عہد کر کے گئی تھیں اس کا کیا حشر ہوا؟"

شاہدہ نے ایک حسرت ناک تامل کے ساتھ جواب دیا: "میں جو وکالت نامہ لے گئی تھی اس پہ مجھے اعتماد تھا کہ کارگر ہوگا لیکن اس درمیان میں شاید نامناسب طور پر ایک ایسا واقعہ پیش آگیا ہے جو مجھے تو ضرور شرمندہ کر رہا ہے، تمہارے اور پرویز کے تعلقات کو بھی بہت نازک اور تکلیف دہ بنانے والا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

شاہدہ نے کہا: "کیا کہوں بڑا غضب ہوا۔ ایسے غضب روز ہی ہوا کرتے ہیں لیکن ان میں کثیر راوی پرویز اور شاہدہ نہیں آتے۔ تم کو یاد ہوگا کہ عبدالرزاق نے رجو تنیا کے باپ پر کتنے ظلم ڈھائے ہیں لیکن سب سے بڑا استبداد انھوں نے یہ کیا کہ رجو تنیا کو پورے ایک دن اور ایک رات اپنے گھر میں بند رکھا اور جس جس طرح سے ہو سکا اس کو بے آبرو کیا۔ لوگوں کی زبان پر یہی ہے لیکن مقدمے کے دوران میں معلوم ہوا کہ تم نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا ہے کہ رجو تنیا کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ منظور بھائی اس کے لیے تم کو مشکل ہی سے معاف کریں گے۔ جس لہجے میں آج وہ ایوب سے اس معاملے کا تذکرہ کر رہے تھے اس سے پایا جاتا تھا کہ وہ بہت آزردہ اور دلگیر ہیں۔"

میں کچھ دیر کے لیے تو سناٹے میں آگئی لیکن دھیرے دھیرے سے جب ساری روداد پر غور کیا تو پرویز اور اس کی جماعت کے خلاف جس کی وہ نمائندگی کر رہے تھے یکایک غصے کا ایک شعلہ میرے اندر بھڑک اٹھا جس کی خود مجھے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہدہ کو تندی کے ساتھ جواب دیا: "آج اپنے منظور بھائی سے کہہ دینا کہ میں اب اپنے گمان سے بہت اونچی ہستی پا رہی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ عبدالرزاق کی بیوی میری ملنے والیوں میں ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کی بیوی نے ایک مرتبہ ڈاکٹری معائنے سے پہلے اس طرف اشارہ کیا تھا لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرا منصبی ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ کسی کو بلا وجہ رسوا کروں یا واقعے کو توڑ مروڑ کر کسی عورت کی بابت کوئی غلط رپورٹ لکھ دوں ——— اور میں نے وہی کیا جو عبدالرزاق کی بیوی سے کہا تھا اور پھر پرویز کس برتے پر کہہ سکتے ہیں کہ میں نے صحیح رپورٹ لکھی یا غلط ان کو کیا معلوم؟ انھوں نے تو ایک مرتبہ بھی آکر اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا ورنہ ممکن تھا کہ میرا ایمان ان کے چلنے سے متزلزل ہو جاتا اور میں غلط رپورٹ لکھ دیتی۔ اب ان سے جا کر میرے پیغام کے طور پر کہہ دو کہ رجو تنیا کے ساتھ جس قسم کی زیادتی وہ سمجھتے ہیں نہیں ہوئی ہے اور اگر میرے معائنے اور اس وقت تک کے وقفے کے اندر کسی دوسرے موقعے پر اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے تو میری رپورٹ صحیح ثابت ہوگی۔ وہ جس سے چاہیں اس کا معائنہ کرالیں۔ آخر میں ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ جس نادار، مفلس اور پامال طبقے کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں اس کا جزو

ایماندار، مخلص اور صاحبِ ہمت نہیں ہے۔ مجھے خود ان پر آزاد زندگی بسر کرنے والوں کے ساتھ کچھ کم ہمدردی نہیں ہے اور میں ان کی جب کبھی ہو سکتا ہے مدد و... پھر مدد کرتی رہتی ہوں۔ تمہارے منظور بھائی میری اس رگ سے واقف ہیں۔ پھر بھی یہ سب کچھ اس شک... نے کیا معنی لکھے؟ تم نے کہا تھا کہ وہ بڑے چھچھورے اور ذہن کے کچے آدمی ہیں۔ مجھے ان کی ان خصوصیات کو تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن ان کی دو خصوصیتیں بہت نمایاں معلوم ہوتی ہیں جن کا تم نے ذکر نہیں کیا۔ اول تو یہ کہ وہ کسی بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اپنے دل میں طرح طرح کے شکوک اور وسوسے پیدا کر لیتے ہیں جن کو وہ غیر مستند ذریعوں سے تقویت دے کر اپنا یقین بنا لیتے ہیں۔

شاہدہ سسکنے کے عالم میں بیٹھی چپ چاپ میری باتیں سنتی رہی اور جب جانے کا وقت آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ سہم سی گئی ہے۔ اٹھتے ہوئے اس نے اپنے کپڑوں کو ... انداز سے برابر کرتے ہوئے صرف یہ کہا، "کشور، میں نے خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ تم شریف بھی ہو۔ تمہارے پرویز جس غیظ و غضب کے بھی مستحق ہوں لیکن بھلا میں نے کیا کیا تھا جو مجھ پر یہ سارا زور لگا دیا۔ پرویز تو سامنے ہیں نہیں لیکن تمہیں کچھ احساس ہے کہ تم نے مجھ سے ایسی ایسی باتیں کی ہیں جس میں پرویز نے ... کیا نہیں۔"

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے لپک کر شاہدہ کو گلے لگا لیا اور کہا، "شاہدہ! پیارے تمہارے ... زبان کبھی کوئی ... حائل نہیں ہو سکتی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جس وقت میں تم سے باتیں کر رہی تھی میرا مخاطب پرویز تھا۔ خواہ مخواہ تم نے ایک ... نکال لیا جس سے تمہارا مقصد صرف مجھ کو قائل اور مجروح کرنا تھا۔ جاؤ اور یہ یاد رکھو کہ اگرچہ تم مجھ کو پرویز کے ذریعہ ملی ہو لیکن اب کوئی طاقت تم کو مجھ سے چھڑا نہیں سکتی۔ یہ بات رونقی رانی کو سناؤں گی اور رونقی رانی بن جائے گی۔"

شاہدہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

(۱۶)

پندرہ روز سے کچھ اوپر ہو گئے اور پرویز کی رفتار و حالت سے میں بالکل بے خبر رہی۔ اس دوران میں شاہدہ بھی نہیں آئی۔ میں ایک شدید کرب و انتشار میں زندگی کی گھڑیاں گزار رہی تھی۔ ہر گھڑی ایک طویل معلوم ہوتی تھی جیسے ... بار بار یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ باوجود اس کے کہ میں نے شاہدہ کو گزشتہ ملاقات میں بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ رخصت کیا تھا شاید وہ ابھی تک میری طرف سے دل میں کچھ کدورت لیے ہوئے ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ تمام قاعدے قانون سے برطرف ہو کر بلا کسی کی اجازت کے بستی چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں جہاں ان دماغی کلفتوں سے لمحہ بھر کے لیے پناہ مل جائے۔

عشق و محبت کی داستانوں سے دنیا کی تواریخ اور افسانے بھرے پڑے ہیں۔ میں جب کبھی کوئی کہانی، رومانی عشق پڑھتی تھی تو مجھے اس کے اندر رموز و کنایات جو کچھ بھی ملتے ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ اگر کسی ایک فرد واحد کی رفاقت نصیب نہ ہو تو ساری زندگی عذاب کیسے ہو جاتی ہے اور محبت کا انجام خودکشی اور موت پر کیوں ہوتا ہے۔ میں محبت کو زندگی کا ایک کھیل سمجھتی تھی اور اس نسبت کی قائل نہ تھی جو بلا لحاظ اس کے کہ محبوب پا لیا ہے یا دور، انسان کے اندر تلخی یا بیدلی پیدا کر دے۔ مگر اب میرا اپنا تجربہ یہ بتا رہا تھا کہ محبت انسان کا روگ بھی ہو سکتی ہے۔ محبت کو کوئی مرجع نہ ملے اور ساری زندگی محبت سے خالی رہ جائے تو یہ محرومی ضرور ہے لیکن کوئی اذیت نہیں ہے۔ لیکن محبوب کو پا کر نہ پانا ایک ایسی مصیبت ہے جس سے بڑی عقوبت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ... بار بار ... رہ کر ... اس طرح

بجا رہنا ایک نامہ میں برداشت آزمائش تھی۔ شاہدہ نے بھی ایسا سکوت اختیار کر لیا تھا جو مجھے بانکپن معلوم ہو رہا تھا اور اب تو گریزِ حبیب بھی جو مجبوری اور بے نیازی کی حالت میں "وصلِ حبیب" کے برابر ہوتا ہے میرے مقدر سے باہر معلوم ہوتا تھا۔

آخر کار مجھ سے زیادہ صبر نہ ہو سکا۔ ایک سنیچر کے دن میں اپنی وضعِ خودداری کو ہاتھ سے دینے کے لیے مجبور ہو گئی۔ شاہدہ اب پرویز سے الگ ہو کر بھی میری دمساز تھی۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی ہستی میں شاہدہ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو مجھ کو سمجھ سکے اور میرے ساتھ پوری ہمدردی کر سکے۔ میں اس کے ظرف اور اس کی کشادہ دلی کی قائل ہو چکی تھی۔ اسی احساس اور اسی اعتماد کی بنا پر میں نے اس کو ایک خط لکھا اور اسی میں پرویز کے نام بھی ایک مختصر سا خط ملفوف کر دیا جس کو میری محبت کا تحفہ کہنا چاہیے:۔

"پیاری شاہدہ!

یوں تو شاید کچھ زیادہ مدت نہیں گزری، مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم سے ملے ہوئے اور پرویز کی صحبت کو ہوئے ایک پوری عمر گزر چکی۔ معلوم نہیں تم اس کو کیا سمجھو گی۔ نہ جانے کیوں مجھے ہول سا ہو رہا ہے۔ میں بھی اپنی عقل و ہوش دانشمند رکھتی تھی مگر اب کس منہ سے یہ دعویٰ کروں۔ اب تو ہر کس و ناکس مجھ سے زیادہ ذی ہوش معلوم ہوتا ہے اور پھر تم تو ہوشمندی اور فراست کی دیوی ہو۔ مجھے تو یہ شکایت کرنے کا حق نہیں ہے کہ اتنے دنوں سے نہ تو تم نے میری خبر لی اور نہ اپنی اور پرویز کی خیریت لکھی لیکن بیانِ واقعہ اور اظہارِ حال کا حق شاہنشاہ سے لے کر ادنیٰ گداگر کو حاصل ہے اور حال یہ ہے کہ زمین اور آسمان اجنبی ہو رہے ہیں اور زندگی کی ایک ایک گھڑی قیامت کی طرح بیگانہ معلوم ہو رہی ہے۔ اگر مصلحت اجازت دے اور وقت نکال سکو تو کچھ دیر کے لیے مل جاؤ یا اپنی مجبوریوں کی تفصیل سے آگاہ کر دو تاکہ مجھے کم سے کم تمہاری طرف سے کوئی بدگمانی نہ رہے۔ ایک رقعہ اسی خط کے ساتھ پرویز کے نام بھی بھیج رہی ہوں ان سے جب اور جہاں ملاقات ہو دے دینا اور کیا لکھوں۔

تمہاری

کشور!"

اور پرویز کے نام رقعہ یہ تھا:۔

"پرویز صاحب!

کسی قسم کی شکایت کرنے کا مجھے حق ہے کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں لیکن حسبِ حال ایک اردو شعر اور کسی فارسی شاعر کا ایک فارسی شعر سنائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اردو شعر یہ ہے:

سو طرح الفت نے مجبور اگر ہونا   تم کچھ نہ مجھے کہتے تو دور اگر ہوتا

اور فارسی شعر جسے شاید زیادہ حسبِ حال ہے ؎

اگرچہ دولتِ وصلت بجز من نہ رسید
ہزار امید ببرم کہ کوشش ما ست است

آپ کی بد نصیب
کشور!"

خط میں نے اسی وقت روانہ کیا تھا۔ شاہدہ نے زبانی کہلوایا کہ جواب اپنے نوکر کے ہاتھ بھجوا دیا جائے گا۔ جانے کے دن سے میں آٹھ بجے رات تک شاہدہ کے ملازم کی راہ دیکھتی رہی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہدہ نے محض مجھ کو ٹالنا چاہا تھا۔ اس کا کوئی جواب نہیں آیا اور میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ طرح طرح کے گمان آتے رہے تھے اور روتے روتے شب ایک ناقابلِ اظہار تشنج سے۔ صبح کی اذان ہوگئی اور پھر کے بعد بھی چار بجے سے پلک نہ لگی۔ میری ماما کو جو بچپن سے مجھے کھلاتی ہے اور ماں کی طرح میرے چہرے کا رنگ دیکھتی رہتی ہے آہٹ مل گئی کہ میں رات بھر جاگتی رہی ہوں اور اب سونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ وہ دبے پاؤں میرے کمرے میں آئی اور آہستہ سے پوچھی "بیٹیا چائے لے آؤں؟"

میں نے لحاف میں منہ لپیٹے ہوئے کہا "ہاں لے آؤ!"

میں عجیب مدہوشی کے عالم میں چائے کے بے کیف گھونٹ حلق کے نیچے اتار رہی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ آخر میں نے کھویا ہی کیا ہے جو اس طرح بے چین ہوں۔ پہلے بھی میری زندگی اجاڑ تھی اب بھی ہے لیکن جیدیل نے جواب دیا کہ نہیں اور اب میں بڑا فرق ہے پہلے زندگی خالی تھی اور اب اس امکان کی ایک جھلک مل گئی ہے کہ زندگی اپنی تکمیل کے بعد کیسی معمور ہو سکتی ہے۔ پرویز میری تخیل کی بھی شبیہ تھا اور وہ ایک جھلک دکھا کر میری زندگی کے حدود سے باہر نکل گیا تھا اور میری محرومیوں کے احساس کو شدت کے ساتھ بیدار کر گیا تھا۔ میں سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ اگر بستی چھوڑ کر چلی جاؤں تو میں اپنی زندگی کے سناٹے کے ساتھ مانوس ہو جاؤں گی اور پرویز کے لیے بھی کوئی آزمائش نہ رہے گی۔ کچھ دنوں سے یہ خیال مجھے بری طرح ستا رہا تھا کہ میرا بستی میں رہنا میرے اور پرویز دونوں کے لیے ایک خطرناک مسئلہ ہے جس کا حل ہونا آسان نہیں اور آج یہ خیال بلیٹیو کی طرح مجھ پر چھایا ہوا تھا۔

چائے کا شغل ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ماما میرے کمرے میں پھر آئی اور مجھے ایک لفافہ دے کر کہا کہ "بیگم آپا کا ملازم آیا ہوا ہے اور جواب مانگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھہر جاؤ میں جواب لکھ رہی ہوں۔"

جلدی جلدی میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دو رقعے تھے۔ پہلا رقعہ شاہدہ کا تھا۔

اچھی کشور!

مجھے تمہارے ساتھ اتنی محبت اور ایسی شدید ہمدردی ہے کہ میں تمہاری ہر بات اور ہر حرکت کو نہ صرف معاف کر سکتی ہوں بلکہ ان کی قدر کرتی ہوں۔ تمہارا خط پرویز کا ضمیر کا ایک پرزہ تھا بڑی شائستگی اور ضبط کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ ایسی ہی شائستگی اور ضبط کو

تیرے اس "سلیقے" کا ہے جس کے بغیر محبت میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے ملنے کے لیے خود بھی کم بے چین نہیں رہی ہوں۔ لیکن میرے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔ تین ہفتہ سے اوپر ہو گئے کہ منظور بھائی بیمار ہیں۔ اپنے مکان میں بےکس و تنہا پڑے ہوئے ہیں۔ ابو نے اور میں نے بہت چاہا کہ ہمارے پاس آ جائیں مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ ٹھاکر ستیہ پرتی لال جو ان کے کانگریسی دور کے پرانے دوست ہیں اور جن کو میں کیا پورا شہر "گھونگا بسنت" سمجھتا ہے ان کا علاج کر رہے ہیں۔ صبح سے شام تک شدید بخار رہتا ہے۔ کسی وقت اترتا نہیں۔ ٹائیفائڈ کے قسم کا مرض ہے لیکن مآل کیا ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے انتہا نزار اور نحیف ہو گئے ہیں۔ میں نے تم کو اطلاع بھیجنا چاہی تو انھوں نے منع کر دیا۔ آج تمھارا رقعہ پا کر مجھے اجازت دی ہے کہ میں تم کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ ان کا بھی ایک پرزہ جو ایک پوری داستان ہے ملفوف کر رہی ہوں۔ اگر تم کسی وقت آج میرے پاس آ سکو تو میں تم کو تمھارے پیر و بزرگ کے پاس لے چلوں ......

باقی ملاقات کے وقت ....

تمھاری معترف

شاہدہ!"

پیر و بزرگ کا رقعہ یہ تھا:-

"ڈیر کشور!

تم نے دو اشعار میں اپنا حال بیان کیا ہے اور خوب بیان کیا ہے۔ میں بھی صرف دو اشعار تم کو سنانا چاہتا ہوں اور پھر فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے کیا سمجھو اور کیا نہ سمجھو اور کیا کرو اور کیا نہ کرو ؎

عجب رودیست دور از یار بودن
صبوری کردن و ناچار بودن

یہ شعر جامی کا ہے اور دوسرا شعر جو میری حالت کی نہایت سچی ترجمانی کرتا ہے یہ شعر خواجہ حسن دہلوی کا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ امیر خسرو کے منظورِ نظر تھے ؎

گفتی کہ چرا جدائی از من
ایں از فلک است از حسن نیست

کشور [illegible] میں سے فارسی اشعار سنا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم جب تک ایرانی تمدن
اور ایرانی شاعروں سے پوری واقفیت اور [illegible] نہ پیدا کر لو گے [illegible] وہ
تمدنی [illegible] نہیں اور ذہنی پاکیزگی [illegible] آئین کی [illegible] ہوگی [illegible]
نہیں ہے۔ ہمارے [illegible] سے فارسی ادب کا [illegible] رہا ہے [illegible]
کہ فارسی سے سب بہرہ [illegible] ہے [illegible]
کہنا [illegible] جانا تھا [illegible] اور کئی
[illegible] ہے [illegible]
زیادہ لکھنے کی [illegible] ہیں۔ میرے متعلق [illegible]
جیسی سمجھتا ہوں [illegible] ایرانی [illegible]
[illegible] کے باوجود [illegible] خیال اور [illegible]
اور میری زندگی میں اب بہت [illegible]

[illegible]

[illegible]

رات، چور اور چاند

بلونت سنگھ

(مسلسل)

چاند چودھویں کا تھا۔

خاصی سردی پڑنے لگی تھی، اس لیے لوگ [illegible] جلدی کھانے پینے سے فراغت کر کے [illegible] جاڑوں میں [illegible] راتوں کو بھی کھیتوں میں کام کرنا ہوتا ہو تو [illegible] اوڑھے [illegible] پر چلتے پھرتے دکھائی [illegible] تھے۔

[illegible] چاندنی رات میں [illegible] سنگھ [illegible] واپس آ رہا تھا۔ [illegible] نہر کے کنارے کنارے چل [illegible] کھیتوں میں سے ہو کر جانا [illegible] راستہ [illegible] لیکن وہ ان پگڈنڈیوں [illegible] سے زیادہ واقف نہیں تھا اس لیے اس نے [illegible] اور ان [illegible] راستے کو ترجیح دی۔

کچھ دور تک نہر کے کنارے کنارے چلنے کے بعد وہ [illegible] راستے [illegible] تھے۔ اس کے دونوں [illegible] اور [illegible] گرد [illegible] تیز [illegible] جنگل [illegible] تھا۔ پیدل اور گھوڑسوار اس کے کنارے کنارے چلا کرتے تھے۔

[illegible] سنگھ نے رک کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ چاندنی رات میں دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ [illegible] کی وجہ سے [illegible] دکھائی [illegible] کہیں کہیں کھیتوں میں کام کرتا ہوا کوئی آدمی یا کوئی [illegible] جاتا تھا۔ خاموش [illegible] بہت دور [illegible] کی [illegible] ہوئی صدائیں سنائی [illegible] چاندنی میں سب سے نمایاں منظر [illegible] راستے کا تھا [illegible] دونوں کناروں پر ایک دوسرے سے [illegible] اور [illegible] کے اونچے اونچے درخت [illegible] دور تک چلے گئے تھے [illegible] دیکھنے والے کو [illegible] معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی [illegible] کی دھندلاہٹ میں گم ہو گیا ہو۔

[illegible] سنگھ [illegible] رنگ [illegible] بدن [illegible] لیکن اس کے بدن میں وہ قوت اور [illegible] تھا جس کی توقع کسی دیہاتی نوجوان سے کی جا سکتی ہے۔

طویل [illegible] چند لمحوں تک [illegible] اس کی نگاہ کے سامنے رہا [illegible] پھر [illegible] گھڑی پر نظر ڈالی، دس بجے تھے۔ وقت کچھ زیادہ

نہیں ہوا تھا لیکن محسوس یوں ہوتا تھا جیسے آدھی رات کا سماں ہو۔ بہرحال اب تو اسے گھر پہنچنے کی فکر تھی چنانچہ وہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا چل کھڑا ہوا۔

بلند و بالا پھیلی پھیلی شاخوں والے درختوں کے نیچے تقریباً مکمل تاریکی طاری تھی۔ کہیں کہیں زمین پر بجریوں کی پھنگلیوں کے قریب روشنی کے سفید دھبے دکھائی دیتے تھے۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سفر طے کرتا گیا۔

چلتے چلتے پھر پال سنگھ خود بخود رک گیا حالانکہ وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا ۔۔۔ لیکن نہ جانے کیوں ۔۔۔ وہ رک گیا۔ چند لمحوں تک رکا رہا ۔۔۔ اور پھر خود بخود ہی سنبھل کر چل دیا۔ ابھی آٹھ دس قدم ہی چلا ہوگا کہ پھر دفعتاً ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھا لیکن درختوں تلے گہری تاریکی تھی اور کہیں کہیں پتوں میں سے چھن کر آنے والی چاندنی کے چھوٹے چھوٹے دھبے دکھائی دیتے تھے آنکھوں کو اور بھی پراسرار معلوم ہونے لگے۔

تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد اس نے پھر قدم بڑھایا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس کے اپنے پاؤں کے علاوہ ان دیکھے پاؤں کی چاپ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ شاید یہ اس کا وہم ہو لیکن اسے وہ اس قدر واضح طور سے سنائی دی تھی ...... مگر یا پھر بھی ...... پھر بھی ...... ممکن ہے اور ہاں ۔۔۔ وہ پھر رک گیا۔ کس قدر واضح آواز تھی لیکن اس کے قدم رکتے ہی ادھر کی آواز بھی بند ہو گئی۔ آخر اس میں کیا راز ہے۔ آواز ضرور ہے لیکن کس کے پاؤں کی آواز ہو سکتی ہے۔ کیا وہاں بھوت پریتوں کا ڈیرہ ہے اور شاید جس وقت وہ اس راستے پر چلا ہے اسی وقت سے یہ ان جانے قدم بھی اس کے ساتھ چل دیے ہوں اور شاید اس نے اسی وجہ سے اس آواز کی جانب دھیان ہی نہیں دیا ...... اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم میں سے جان سی نکل گئی .... لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ پڑھا لکھا انسان تھا وہ اس قسم کے توہمات میں یقین ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ قطعاً مضحکہ خیز بات تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آخر کون ہو سکتا ہے۔ چور ڈاکو لٹیرے؟ ۔۔۔ لیکن اس وقت اس کی جیب میں تھا ہی کیا۔ وہ تو یونہی گھومنے گیا تھا شہر میں۔ دو ایک چھوٹے موٹے کام بھی کرنے تھے۔ آخر وہ بنک سے روپیہ نکلوانے تو گیا نہیں تھا۔ اور اگر بالفرض چور ہی اس کا پیچھا کر رہے ہوں تو پھر انھیں قدم ناپ ناپ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ حملہ کر کے اس سے جو کچھ چاہتے چھین سکتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ اب وہ کافی دیر سے کھڑا تھا لیکن چاپ نہیں کھڑکا تھا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے... ... ہو سکتا ہے اس کے کان بج رہے ہوں کیونکہ دور تک خاموشی طاری تھی ......

ایک مرتبہ پھر وہ چل دیا لیکن پھر وہی بات ...... پھر اجنبی آواز ...... لیکن وہ رکا نہیں ...... اب پھر اجنبی آواز ...... دفعتاً وہ پھر رک گیا اور اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک سایہ تیزی سے لمحہ بھر کے لیے جھلملاتا سا دکھائی دیا۔ یقیناً یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ وہ کوئی لڑکی یا آدمی بڑھا نہیں تھا۔ یہ تو اس کی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ ہو نہ ہو اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔ یہ چور یا لٹیرا نہیں ہے مگر اس معاملے کو اس قدر طول دینے کی ضرورت ہی کیا تھی اور وہ بھوت بھی نہیں تھا۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔

تاریکی میں سایے دکھائی دینا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ وہ عجب ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ کئی قسم کے شکوک دل میں پیدا ہوئے۔ اس نے اس سوال کے ہر پہلو پر غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا شاید وہ سایہ دوبارہ دکھائی دے لیکن نہیں اب کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن کیسا عجیب قسم کا احساس تھا۔ ایک اجنبی جاندار چند قدم کے فاصلے پر کھڑا سانس لے رہا تھا۔

شاید وہ پیچھے نظاروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کی اسی لاٹھی کے سرے پر تیز چھری چمک رہی تھی جس کے ایک ہی بھرپور وار سے انسان کی آنتیں باہر نکل آتیں ......

شاید ... یہ ... وہاں یہ سب ... سب کچھ اس کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہو۔ حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہاں اس کے وہم کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔

یہ سوچ کر دل کی تسلی کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم بقدم آگے بڑھنے لگا۔ کان دھر کر سنا تو بہت قریب سے پیچھے کی جانب اسی طرح کے پاؤں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اس نے گھوم کر دیکھنے کی بجائے آواز اور بھی زیادہ غور سے سننے کی کوشش کی اور اب اسے آواز اس قدر صاف طور سے سنائی دینے لگی جیسے اس کا پیچھا کرنے والے کو اس کی پروا نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ آواز اور بھی قریب سے سنائی دینے لگی۔ قدم بقدم آواز اور اس کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ ایسا کون شخص ہو سکتا ہے جو اس کا پیچھا کر رہا ہے یا واقعی کوئی بھوت ہے جو اسے پریشان کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کس قدر عجیب بات تھی ...... اس نے رفتار اور بھی تیز کر دی ...... پیچھے سے پاؤں کی چاپ کی آوازیں بھی تیز پیدا ہو گئیں۔ اب گھوم کر دیکھنا فضول تھا۔ اب سانس روکنے کا امکان ہی باقی نہیں رہا تھا ...... اس کا پیچھا کرنے والا بہت قریب پہنچ گیا ...... اس نے اپنی پوری طاقت سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ راستے کے نشیب و فراز سے ہوتا ہوا تیزی اور تندی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے اس کے پاؤں تلے پتے چرمرا رہے تھے اور ان کی آوازیں اسی کے قدموں کی آوازوں میں گھل مل کر عجیب قسم کے ایک شور میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔ تاریکی میں اٹکتا اور بھاگتا ہوا اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی جن اس کی گردن دبانے کو چلا آ رہا ہو۔ یہ اس بات کا وہم ہوتا تھا کہ ... اس کا ٹینٹوا دبایا کر رہا۔

دفعتاً اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ کیوں نہ ... جھاڑیوں ... سے ہو لے۔ اب نہر کا پل سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو یاد آیا کہ کھال اچھوتی اور تنگ ہے، کا پل بھی قریب ہی تھا۔ یہاں تک تو وہ صبح کے وقت سیر کرنے چلے آیا کرتے ہیں۔

دفعتاً وہ اچانک کنارے سے چوڑے راستے کی جانب کود پڑا۔ پیچھے سے چھلانگ کودنے کی آواز آئی لیکن اس نے پیچھے کی جانب گھوم کر نہیں دیکھا۔ پھر جب وہ چھلانگ لگا کر دوسرے کنارے پر چڑھا تو پیچھے سے بھی اسی قسم کی آواز سنائی دی۔ سامنے کھال کا چھوٹا سا پل دکھائی دینے لگا۔ وہ پوری قوت سے اس کی جانب دوڑ پڑا۔ اس قدر تیز کہ ہوا کو بھی پیچھے چھوڑ کر نیچے پل کے نیچے پانی کے کٹاؤ ... کی ... حاصل ہوئی۔ اس نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے اپنی ہوئی نظر سے پیچھے کی جانب دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سچ مچ کوئی نہیں تھا ...... لیکن اب وہ اپنے دل کو یہ فریب بھی نہیں دے سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کا وہم تھا بلکہ یہ حقیقت تھی کہ اس کا بڑی تیزی اور تندی سے تعاقب کیا گیا تھا لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ پیچھا کرنے والا کون شخص تھا؟ اس کا پیچھا کرنے سے اس کی غرض کیا تھی۔ کیا وہ اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ یا اس وہم میں تھا کہ اس کی بغل میں نوٹوں کا بنڈل دبا ہوا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اب حویلی کے نزدیک کے سایوں کی تاریکی نہیں تھی بلکہ اجلی فضا اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت اور ان میں سائیں سائیں کرتے ہوئے پودے تا حد نگاہ دکھائی دے رہے تھے۔ اب خوف کی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ بدنام علاقہ تو کھال کے ادھر ہی ہے کہ کسی نے شرارت کرنے کے خیال سے اس کا پیچھا کیا ہو لیکن اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی ہو۔

بہرکیف اب خواہ مخواہ دیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ گاؤں کے ٹیلے کے آثار اب دھندلے نمایاں طور سے دکھائی دینے لگے تھے۔۔۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اس پراسرار واقعہ کا اس کے ذہن پر گہرا اثر ہو رہا تھا۔ لیکن کھلی چاندنی میں ڈر کی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھنے لگا۔

کبھی پگڈنڈیوں اور کبھی کھیتوں کے بیچ سے ہوتا ہوا وہ تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ آگے ایک جوہڑ تھا جو برسات کے دنوں میں پانی جمع ہو جایا کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ پانی کی لاتعداد بوندیں اور مٹی تحلیل ہو جاتا جب گرمی میں پانی خشک ہو جاتا اور اب ایک طویل و عریض گڑھے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بعض گاؤں کی عورتیں یہاں سے مٹی لے جایا کرتی تھیں۔ وہ ٹوکریوں میں مٹی بھر بھر کر گھروں کو لے جاتیں اور وہاں اس میں گوبر اور بھوسہ ملا کر صحن کے فرش اور دیواروں کی لپائی کیا کرتیں۔ جہاں سے کھدائی نہیں ہوتی تھی وہاں زمین پر مویشیوں کے قدموں کے گہرے گہرے نشان پڑ گئے تھے۔ جلد پہنچنے کے خیال سے پرتھی پال سنگھ جوہڑ سے ہو کر چل نکلا۔ ناہموار زمین پر چند قدم ہی چلا ہوگا۔ اس کی نظر اٹھی اور اس نے دیکھا کہ جوہڑ کے کنارے پر۔۔۔

وہاں کوئی اجنبی کھڑا تھا۔

دفعتاً پرتھی پال سنگھ کے قدم رک گئے اور چند لمحوں کے لیے وہ بالکل خالی الذہن ہو کر رہ گیا۔

گھٹنوں سے کچھ اوپر تک پہنچتا ہوا کرتا پہنے، تہبند باندھے اور سر پر صافہ باندھے ہوئے ایک لمبا تڑنگا مضبوط مرد کھڑا تھا۔ وہ شکل صورت سے ساکت تھا۔ ہونٹ بند تھے۔ اس کے لباس کا کوئی رنگ نہیں مل رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کے مانند چمک رہی تھیں۔۔۔

پرتھی پال سنگھ کو نہ جانے کیوں یقین سا تھا کہ اس کا پیچھا کرنے والا یہی شخص تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اس پراسرار واقعہ کے باعث اس کے ہوش قائم نہیں رہے تھے۔

اس وقت پرتھی پال سنگھ نے پہلے تو یہ سوچا کہ پہلو بچا کر چپکے سے نکل جاؤں لیکن پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اجنبی کہہ رہا ہو: "اتنی دیر سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوں اب آنکھ بچا کر کہاں کو چلے۔"

وہ آہستہ آہستہ اجنبی کی جانب بڑھا۔ کھلے میدان اور چاندنی رات میں وہ اتنی جرأت کر سکتا تھا حالانکہ اجنبی کا رویہ بہت مشکوک اور عجیب تھا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر اس پراسرار خاموشی میں کیا راز ہے۔ باوجود اس کے آگے بڑھنے کے اجنبی کی خاموشی بھی تعجب خیز تھی۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اسے کہیں دیکھا ہو۔ کہاں؟

بڑی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر کہا: "میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

اجنبی چپ رہا۔

پرتھی پال سنگھ جوہڑ کے کنارے پر پہنچ گیا۔ وہ حیرت سے اجنبی کے منہ کو تک رہا تھا۔ آخر وہ جواب کیوں نہیں دیتا اور جب وہ اس سے سات آٹھ قدم کے فاصلے پر تھا تو دفعتاً اجنبی نے حرکت کی۔ اس کے دانت چمکے اور چیخ کی آواز کے ساتھ غوک کی ہنکار۔ وہ چوٹی

اور اس کے قدموں کی آہٹ آئی ـــــ اور اس کے بعد پھر خاموشی۔

قدموں کی آہٹ کے بعد پرتھی پال سنگھ اور آگے بڑھا کہ شاید وہ اس کی صورت پہچان سکے۔ دو قدم دور سے رک گیا۔ ہاں وہ اس کی صورت سے واقف تھا لیکن وہ اسے اب بھی نہیں پہچان سکا۔

"میں بالا سنگھ ہوں۔"

پرتھی پال سنگھ کو بھاری بھرکم آواز شناسا سی معلوم ہوئی۔ ابھی تک اسے یہ بات یاد نہیں آئی کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے لیکن نام ـــ بالا سنگھ تو اس نے سن رکھا تھا۔ وہ اس نام کے شخص کے اوصاف سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شخص اچھے کیرکٹر کا آدمی نہیں ہے لٹیرا اور بدمعاش ہے لیکن وہ اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا۔ آخر اسے اس کا کیا حق تھا لیکن شاید اس کا پیچھا کرنے والا کوئی اور ہو۔ کیوں نہ وہ اس سے دریافت ہی کرے۔

"کیا تم ہی میرا پیچھا کر رہے تھے؟"

"ہاں!" برملا جواب ملا۔

پرتھی پال سنگھ کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ تعجب بھی ہوا۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا "کیوں؟"

اس پر بالا سنگھ کا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں اٹھا اور اٹھا ہاتھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹا اور پھر جب پرتھی پال لڑکھڑا کر گرا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی گردن اور رخسار کی رگیں جل اٹھی ہیں اور ایک کان میں بھائیں بھائیں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک مرتبہ ساری دنیا اس کی آنکھوں تلے سے چکر کھا گئی۔ اس کی کس کر بندھی ہوئی پگڑی بل کھاتی ہوئی پرے جا گری۔

پرتھی پال سنگھ کو بے حد طیش آیا۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ آنکھ جھپکتے میں زمین پر سے اٹھا اور چیتے کی سی تیزی کے ساتھ حملہ آور کی جانب بڑھا اور بڑی تندی سے جھپٹ پڑا۔

ان معاملات میں بالا سنگھ کا ہاتھ بہت صاف تھا۔ اس نے اندھا دھند آگے بڑھتے ہوئے دشمن کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ وہ 'حق' کی صدا کے ساتھ آگے کو جھک گیا۔ پھرتی سے ایڑ دے کر گدی پر تھپڑ جو رسید کیا تو پرتھی پال سنگھ لڑکھڑا کر جوہڑ کے بیچ میں پیشانی اور ناک کے بل گرا اور دور تک گھسٹتا ہوا چلا گیا ـــ پیشانی، ناک اور ہونٹ بری طرح چھل گئے۔

بالا سنگھ بھی جوہڑ میں کود پڑا۔ شاید پرتھی پال سنگھ کے جسم میں اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی لیکن نہ معلوم کس جذبے کے تحت وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور سیدھا کھڑا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بالا سنگھ نے اس کے جبڑوں تلے بڑے دھماکے سے گھونسہ جڑ دیا۔ پرتھی پال سنگھ کو محسوس ہوا کہ اس کے مسوڑھوں میں گرم گرم نمکین خون نکل کر اس کے لعاب دہن میں مل رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کے ذہن پر بادل سے چھا رہے ہیں۔

بالا سنگھ نے حضور صاحب (حیدر آباد دکن) کا بنا ہوا نین صفروں والا بھاری بھرکم کڑا آگے بڑھا کر انتہائی نفرت سے ہتھیلی کے نچلے حصے کا ایک جھانپڑ اس کے رخسار پر رسید کیا اور گوشت کی ایک بوٹی کٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ پرتھی پال سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے رخسار پہ دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں گہری چوٹ آئی ہے۔ اس کے حواس قریب قریب مختل ہو چکے تھے اور وہ لڑکھڑا کر اور

بمشکل پالا سنگھ سے زیادہ سے زیادہ پرے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پالا سنگھ نے بھنچے ہوئے دانت پیس کر کہا: "آج مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔"

پرتھی پال سنگھ کی آنکھوں میں وحشت چھائی ہوئی تھی۔ انتہائی خوف کے مارے وہ پیچھے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے چل رہا ہے۔ ادھر پالا سنگھ نے بھی بھاگ کر اسے دبوچ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہو چکا تھا، ادھر پرتھی اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھتا ہوا گاؤں کی جانب بھاگ رہا تھا، ادھر پالا دانت بھینچے اطمینان سے قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

گاؤں کے بالکل قریب پرتھی پال کے چند آدمی کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کا جب یہ حال دیکھا تو انھیں بے حد تعجب ہوا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

پرتھی پال نے خشک گلے سے ہکلا کر کہا: "اس حرامی کے ... بیٹے ... کو مارو ... بدمعاش ... مادر ..."

وہ لوگ آستینیں چڑھا کر اس کی جانب بڑھے تو پالی نے للکارا: "آؤ ... لیکن یہ یاد رکھو میں پالا سنگھ ہوں۔"

حملہ آوروں کے بڑھتے قدم جہاں کے تہاں رک گئے۔

یہ دیکھ کر کہ پرتھی پال ہونکتا ہوا بھاگ نکلا ہے پالا سنگھ دھیمی اور یکسوئی کے ساتھ اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ ان کا مکان گاؤں کے سرے پر ہی تھا۔

بیٹھک میں پرتھی پال سنگھ کا باپ اور دیگر رشتے دار بیٹھے خوش گپیوں میں محو تھے۔ دفعتاً پرتھی پال سنگھ کا خون میں لتھڑا ہوا مسخ چہرہ ان کی طرف بڑھا، پھر پالا سنگھ نے اسے بالوں سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

گھر میں یکدم شور مچ گیا۔

پالا سنگھ کے سر پر تو خون سوار تھا۔ اس نے نہایت بے جگری سے پرتھی پال کو زمین پر گرا لیا اور اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اور قریب تھا کہ وہ اس کا ٹینٹوا اور گردن کی رگیں نکال ڈالے کہ کئی آدمی اکٹھے ہو کر آن پہنچے اور انھوں نے مل ملا کر ڈنڈوں، جوتوں، گھونسوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے بے رحمی سے مار مار کر پالا سنگھ کا کچومر نکال دیا، یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اسے وہاں سے گھسیٹ کر بھوسے کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور یہ طے پایا کہ رات بھیگ جانے پر اس کے جسم کا قیمہ کر کے بڑی نہر میں بہا دیا جائے۔

مردم شماری کمشنر کے نام

فکر تونسوی

عالی جناب مردم شماری کمشنر صاحب!

کل کی ڈاک میں آپ کا ارسال کردہ مردم شماری فارم موصول ہوا اور کورنگ لیٹر بھی۔ [illegible] آپ کے خط [illegible] معلوم ہوتا ہے آپ نے اپنے دستخط [illegible] اس بار آپ کا رویہ [illegible] محنت سے [illegible] مردم شماری کرکے [illegible] بلکہ اس کے [illegible] معاشرے کی [illegible] ہے کہ فارم کا ہر [illegible] تفصیل کے ساتھ [illegible] جائے اور تفصیل [illegible] تاکہ معاشرے کی پوری تصویر [illegible] آپ بندوں کو صرف [illegible] نہیں جاننا چاہتے [illegible] ہیں۔

چونکہ آپ کا مقصد نیک ہے اس لئے [illegible] سے اپنے کوائف [illegible] کر رہا ہوں۔

تاریخ پیدائش

سب سے پہلے آپ نے تاریخ پیدائش پوچھی ہے۔ [illegible] تاریخ پیدائش کا کچھ پتہ نہیں۔ والد صاحب [illegible] عاشق کے [illegible] بعد [illegible] غلط نکلا [illegible] تاریخ پیدائش [illegible] کا مطلب تھا بچہ [illegible] والد صاحب نے [illegible] پانچ [illegible] سکتا تھا۔

جس دن پیدا ہوا تھا اسی دن [illegible] کے جرم میں [illegible] چنانچہ [illegible] سکتی ہے (لیکن ایسا کرنا ایک [illegible] حرکت ہوگی)

نام

آپ نے میرا نام پوچھا ہے۔ خاندانی [illegible] رکھا مگر [illegible] اب کے نواسا

ہوا یوں کہ اس کا نام "گلاب" رکھوں گی۔ چنانچہ فقیرا اور گلاب دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے لیکن اچانک گلاب کا لفظ "گُلی" پر بدلنے لگا اور بعد میں [illegible] ہونے لگا ——— محمود [illegible] گُلی پر [illegible] لکھ دیا گیا [illegible] تھے۔ کالج [illegible] میں چاند سے [illegible] عشق [illegible] شاعری [illegible] اور چاند تخلص اختیار کیا [illegible] دونوں ترک [illegible] چاند تخلص [illegible] پس چاند کے [illegible] اور تخلص دونوں چھوٹ گئے ——— [illegible] مجھے [illegible] کہہ کر پکارتی ہے اور یہ نام بھی مجھے کچھ غلط معلوم نہیں ہوتا۔

[illegible] خدا کے کئی نام ہیں اور [illegible] ہوں میری حالت [illegible] ——

ولدیت

میرے خاندان [illegible] آپ نے والد صاحب کے متعلق پوچھا ہے [illegible] والد صاحب [illegible] اور [illegible] ہاں تھے [illegible] انھیں [illegible] کے بارے [illegible] اصلی نام [illegible] انھیں [illegible] آخری عمر میں [illegible] ہو گئے تھے [illegible] اصلی [illegible] تھے [illegible]۔

فوت ہونے کے بعد جب [illegible] گھر بیٹھے [illegible] انتقال مناسب سمجھا۔ انتقال کے بعد ان کے فرزند [illegible] نے ان کے اصلی نام کا انکشاف کیا۔ لیکن اب [illegible] کا نام [illegible] ہوئے بھی شرم آتی ہے)

آج کل سرکاری کاغذات میں [illegible] والد صاحب کا جو نام لکھوا دیتا ہوں وہ ہے [illegible] لیکن یہ نام ہماری سرکار نے [illegible] کی ضروریات کی خاطر خود ایجاد کیا ہے۔ اس میں والد صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے [illegible]۔

ذات

آپ نے ذات پوچھی ہے [illegible] سنتا ہے آباؤ اجداد راجپوت تھے اور پانچ ہزار برس پہلے راجستھان سے بھاگ کر یہاں آن بسے تھے۔ بھاگنے کی وجہ کوئی نہیں بتاتا [illegible] روایت اور [illegible] سلسلہ [illegible] بھگوان کرشن سے ملتا ہے۔ بھگوان کرشن مکھن کھاتے تھے [illegible] سرکاری کاغذات میں [illegible] راجپوت لکھ دیا [illegible] اگلے زمانے کے راجپوتوں کی بات اور تھی [illegible]

ایک بزرگ کا خیال ہے کہ ہماری اصل [illegible] ہم بھاٹ ہیں بلکہ کشمیری بھٹ [illegible] بزرگ [illegible] بھاٹ [illegible] کہتے ہیں کہ ہم موسیقی اور شاعری میں یکتا تھے اور راجاؤں کے درباروں میں ہماری بڑی قدر و منزلت تھی مگر اس قدر و منزلت کے [illegible] مجھے درباری بھاٹ کے مقابلہ پر راجپوت لفظ زیادہ بہتر لگتا ہے [illegible] صوتی [illegible] کی خاطر [illegible] اپنا مرتبہ گرا دیتا ہے۔

عمر

عمر کے سلسلہ میں [illegible] تاریخ پیدائش [illegible] کے باعث صحیح بتانا ناممکن ہے۔ گزشتہ [illegible] نے بتائی [illegible]

کرتے ہوئے کہا: "عینک کا نمبر بڑھانا پڑے گا معلوم ہوتا ہے عمر چالیس کے پیٹے میں جا پہنچی ہے۔"

پامسٹری کے ایک ماہر نے کہا تھا کہ چالیسویں برس میں پہنچتے ہی تم اچانک مشہور ہو جاؤ گے۔ چنانچہ پرسوں ایک غنڈے نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر مجھے اتنا پیٹا کہ میری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپ گئی اور میں ملک بھر میں مشہور ہو گیا۔

لہذا عمر چالیس ہی سمجھی جائے لیکن ذہنی طور پر بہتر برس کا ہو چکا ہوں جیسے کہ بہت کہتے ہیں۔

شادی شدہ یا کنوارہ

میری شادی کی کیفیت یہ ہے کہ مجھے شادی شدہ ہی سمجھئے کیونکہ بیوی کی موجودگی میں اس کا انکار ممکن نہیں۔ شادی شدگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ میرا زورِ رفتار ٹوٹ چکا ہے مثلاً گذشتہ سال میں نے جیل جانا چاہا کیونکہ اس کے بعد مجھے ایک سیاسی پارٹی کی لیڈری نصیب ہونے کی واضح پیش کش ہو رہی تھی لیکن میرے ایک بچے نے کہا کہ میرے سالانہ امتحانات نزدیک ہیں اس لیے آپ فی الحال جیل مت جائیے امتحانات کے بعد چلے جائیے گا۔ چنانچہ بچے کے مستقبل کی خاطر میں نے اپنا مستقبل خراب کر لیا حالانکہ اس کے باوجود بچہ فیل ہو گیا۔

شادی کے بعد میرا خانہ آباد ہو گیا۔ نہ صرف بیوی سے بلکہ متعدد دوسری چیزوں سے بھی ——— مثلاً بچوں سے، چوہوں سے، کیلنڈروں سے، اچار یا مربوں سے، مہمانوں سے، انگیٹھیوں سے، ساڑھیوں سے اور تصویروں سے اور ان سب کی خاطر نت نئے بلوں سے۔ سوچتا ہوں اگر میری شادی نہ ہوتی تو یہ سب چیزیں کہاں جاتیں؟ کہاں ٹھکانہ ڈھونڈتیں۔ شادی نے مجھے ہر چیز سے ہمدردی کرنا سکھا دیا ہے۔

لیکن کبھی کبھی جب رات گہری ہو جاتی ہے، سارا کنبہ خوابِ استراحت میں محو ہوتا ہے تو میں نیند، پیاری نیند کو آوازیں لگا رہا ہوتا ہوں مگر وہ حسبِ معمول نہیں آتی چنانچہ مجھ پر ایک بار پھر کنوارہ بننے کی دھن سوار ہو جاتی ہے اور میں گوتم بدھ کی طرح سارے کنبہ پر ایک نظر ڈالتا ہوں، سلیپر پہنتا ہوں اور راہِ فرار پر ابھی دو ہی قدم چلتا ہوں کہ بیوی کی آواز آتی ہے "نیند نہیں آ رہی نا ڈارلنگ! یہ سب مچھروں کی کارستانی۔ اس بار آپ کے لیے ایک مچھردانی ضرور لے آؤں گی۔"

میں اسے یہ نہیں بتاتا کہ مجھے تو گرہستی کے مچھر کاٹ رہے ہیں بلکہ چپ چاپ چارپائی پر لیٹ جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ جو بیوی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے اسے چھوڑ دینے سے زیادہ بہتر ہے کہ ایک مچھردانی خرید لائی جائے۔

آمدنی

میری آمدنی کیا ہے؟ ——— اس سلسلہ میں پامسٹری کے ایک عالم کا قول دہرانا مناسب سمجھتا ہوں جس نے کہا تھا تمہاری ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے جوتشی مذکور نے ہاتھ میرا دیکھا، آمدنی کسی اور کی بتا دی ——— جس دن اس نے ایک ہزار ماہانہ آمدنی کی پیش گوئی کی تھی اس دن میں نے فرطِ مسرت سے سیونگز بینک میں سے ایک سو روپیہ نکلوا کر غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلا دیا تھا۔ بس، اس کے بعد تو وہ جوتشی ہاتھ آیا نہ ایک ہزار روپیہ اور سیونگز بینک میں وہ ایک سو روپیہ دوبارہ کبھی جمع نہیں ہو سکا؛ البتہ گذشتہ سال ایک مہینہ ایسا آیا تھا جب مجھے ایک ہزار روپے کی آمدنی ہوئی تھی لیکن بعد میں سرکار نے وہ روپیہ مع سود واپس وصول کر لیا کیونکہ میں نے وہ روپیہ بطور قرض لیا تھا۔

الغرض میری آمدنی اتنی ہی ہے جتنی ہونی چاہیے۔ بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی کہ ایک لالچی آدمی جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتا سونے کی ڈلی بن جاتی حتیٰ کہ پانی بھی سونے کی سل بن گیا ـــــ اس کہانی کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں اگر پانی کو ہاتھ لگاؤں تو وہ پانی ہی رہتا ہے سونے و چاندی نہیں بن جاتا۔ اس کہانی نے میرا اخلاق بلند کر دیا اور میرے اخلاق کی اتنی زیادہ تعریف ہونے لگی کہ میں نے خود بھی اخلاق کی بلندی پر کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ ان کہانیوں کو جس پبلشر نے بھی ہاتھ لگایا سونے کی ڈلیاں بن گئیں لیکن اس کے مقابلہ میں میں نے جس چیز کو بھی ہاتھ لگایا کہانی بن گئی ـــ

روپے کو ہاتھ کی میل سمجھتا ہوں مگر ہاتھ پر بہت کم میل رہتی ہے کیونکہ سلطانِ محنت کا قائل ہوں اور مہینہ کے آخر میں تو ہاتھ اتنا صاف ہو جاتا ہے کہ جرم لینے کو بھی جی چاہتا ہے ـــ میرے ایک بزرگ کی آمدنی لاکھوں روپے ہے مگر اس کے ہاتھ پر میل جمی ہوتی ہے جس سے وقت بے وقت پیپ رستی رہتی ہے ـــ لیکن اس نے اسی ہاتھ سے کئی مذہبی اداروں کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔

مکانیت

مکان کی پوزیشن یہ ہے کہ آباؤ اجداد کے پاس ایک مکان تھا۔ دادا مرحوم نے جب انتقال فرمایا تو یہ قسم کھانے کے بعد ہی انتقال فرمایا کہ ہمارے پاس واقعی ایک مکان تھا) مگر میں نے اسے کبھی اپنا نہیں سمجھا کیونکہ والد صاحب اور چچا جان میں اکثر یہ جھگڑا رہتا تھا کہ مکان کس کا ہے۔ والد صاحب کا یا چچا جان کا ـــ اور جب والد اور چچا بیس سال تک کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو میں وہ مکان چھوڑ کر گھر سے بھاگ گیا اور دوبارہ کبھی قدم نہیں رکھا ـــ

چونکہ خیالات باغیانہ تھے اس لیے تیرہ برس سے سولہ برس کی عمر تک فٹ پاتھوں پر گھومتا رہا۔ بعد میں قدرے خود قدری پیدا ہوئی تو ایک دوست کے موٹر گیراج میں رہنے لگا۔ ایک بار پبلک ویلفیئر کمیٹی نے بے گھر بھکاریوں کے لیے "رین بسیرا" نام سے آشرم تعمیر کرایا تو میں بھی ایک بھکاری کو دوست بنا کر وہاں اٹھ آیا جہاں ایک کمرہ بیس بھکاریوں کی آماجگاہ تھا۔ افسانہ نگاری دیکھ کر سخت غصہ آتا تھا کیونکہ خیالات بدستور باغیانہ تھے لہٰذا ایک دن کمیٹی کے چیئرمین سے جھڑپ ہو گئی اور مجھے امن عامہ میں خلل ڈالنے کے جرم میں آشرم سے نکال دیا گیا۔ اس وقت سے کرایے کے مکانوں میں رہنا شروع کر دیا۔ چالیس برس کی عمر تک یہ جذبہ خود ہی کام کرتا رہا اور کرایے کے بیسیوں مکانات مجھے اپنی پناہ میں لیتے رہے۔ اس دوران میں ایک مکان کو ایسا بھی کرایے پر لیا تھا جس میں پہلے بندر رہتے تھے۔ میرے آنے کے بعد مجھ میں اور بندروں میں مہینہ بھر "سول وار" رہی لیکن بالآخر فریقین میں پرامن سمجھوتہ ہو گیا یعنی یوں کہ بندر صبح شام کھانا ہمارے ہاں تناول فرمانے لگے اور باقی وقت گھر سے باہر گزارنے لگے ـــــ مگر ان میں سے ایک بندر انتہائی سرکش اور کینہ ور تھا۔ آخری وقت تک اس نے "سول وار" جاری رکھی یعنی موقع پاتے ہی ہمارے اکلوتے کمرہ میں گھس آتا اور ہمارے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر بھاگ جاتا۔ رات کو ہمارے برآمدہ میں ہی سویا کرتا تھا ـــــ آخر ایک بار جب اس نے میرے ننھے بیٹے کو کاٹ کھایا تو میں نے وہ مکان چھوڑ دیا۔

آج کل میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ میرا اپنا ہے (کیونکہ باغیانہ خیالات بالآخر تنگ آکر مجھ سے بغاوت کر کے چلے گئے)، ایک کمرہ ہے، ایک باورچی خانہ، ایک ننھا سا باتھ روم اور مختصر سی بالکنی۔ اس سے زیادہ کی نہ ہوس ہے نہ گنجائش۔ بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے دیکھ کر اب نفرت بھی نہیں ہوتی کیونکہ اب عقل مند ہو گیا ہوں۔ ایک بار ایک دوست کے وسیع لان میں بیٹھ کر ایک غزل لکھی تھی۔

احباب نے کہا یہ غزل گھٹیا سی ہے پچھلی بار تم نے جو غزل سنائی تھی وہ نہایت عمدہ تھی۔

میں نے کہا وہ میں نے اپنے ہی مکان پر بیٹھ کر لکھی تھی۔

مجھے خطرہ ہے کہ اگر اخبار والوں کو یہ علم ہو جائے کہ میرے مکان میں جو بھی غزل لکھی جاتی ہے وہ زیادہ بہتر ہوتی ہے تو شاید وہ میرا مکان ہی کرایہ پر لے لیں۔

تعلیم

علم و فضل میں یکتا ہوں۔ مثلاً مجھے یہ علم ہے کہ کتا کاٹیں کاٹیں کیوں کرتا ہے اور زیادہ حسین لڑکیاں زیادہ جاہل کیوں ہوتی ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر ایک روپے کا ایک سیر گڑ آئے تو ایک آنے میں کچھ بھی نہیں آئے گا کیونکہ ایک آنے کا گڑ خریدنے کے پیسے بھی ایک آنہ کا جیب میں ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں چیزوں کا علم رکھتا ہوں مثلاً یہ کہ دو آدمیوں میں لڑائی کروانے کا سب سے آسان طریقہ کونسا ہے۔ جھوٹ بولنے میں حسن ادا کی کتنی اہمیت ہے اور یہ کہ بنیادی طور پر ہر انسان میں بے وقوفی کے جراثیم موجود ہیں۔ ماننے یا نہ ماننے اس کی مرضی۔

بہت دیر بعد یہ علم بھی ہوا کہ علم کا بھی فائدہ ہے اگر اس پر عمل کیا جائے لیکن جب مجھے اس بات کا علم ہوا اس وقت تک میں کافی کاہل ہو چکا تھا لہٰذا میں اس تھیوری پر عمل نہ کر سکا۔ ارادہ ہے کہ اگلے جنم میں احتیاط برتوں گا اور علم کا فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔ (بشرطیکہ کسی مندر کا مہنت بن جاؤں گا)

اولاد

اولاد میں میرے تین بچے ہیں اور ایک بلی۔ بلی کو بیٹی کا درجہ دیتا ہوں اور جلد ہی کوئی اچھا سا خاندانی بلا تلاش کر کے اس کے ہاتھ پیلے کر دوں گا۔

باقی تین بچوں میں دو لڑکیاں ہیں ایک لڑکا۔ جب سے یہ تینوں بچے پیدا ہوئے ہیں میرے گھر میں ہی رہ رہے ہیں۔ اگر گھر سے باہر کبھی جائیں بھی تو شام کو پھر گھر لوٹ آتے ہیں ان کے بوٹ پھٹ جائیں تو مجھ سے نئے بوٹ کا تقاضا کرتے ہیں اور اگر میں خرید کر نہ دوں تو بسورا کرتے ہیں۔ ...... جاؤ، ہم تم سے نہیں بولیں گے۔

اگر بچے اپنے باپ سے نہ بولیں تو محلہ برادری والے اعتراض کرتے ہیں اس لیے میں انھیں بوٹ خرید کر لا دیتا ہوں اور پھر وہ بوٹ پہن کر محلہ بھر کو دکھاتے ہیں اور باپ کی ساکھ جماتے ہیں۔

میں اور میری بیوی دونوں ان کی تربیت میں جی جان سے جٹے رہتے اور وہ ان دو تربیت گاہوں میں دو الگ الگ راستوں بیک وقت تربیت حاصل کر رہے ہیں مثلاً اگر میں ایک بچے سے کہوں کہ محلہ کے بچوں سے مت لڑا کرو تو بیوی اسے کہتی ہے کہ ضرور لڑا کرو ورنہ محلہ کے لڑکے سمجھیں گے بزدل ہے۔ ایک بار میں نے اپنی بیٹی سے کہا، باسی روٹی مت کھایا کرو لیکن شام کو جب لوٹا تو وہ باسی روٹی کھا رہی تھی، میں نے احتجاج کیا تو بیوی کہنے لگی کھانے دو بچی ہے آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔ میں نے ہی اسے کھانے کے لیے کہا ہے اور ہمارے بچے اتنے زیرک ہیں کہ اس دہری تربیت پر ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ چپ چاپ اپنا کام کیے جاتے ہیں۔

ہم دونوں کی محبت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں یعنی وہ صحیح معنوں میں ہمارے فولی کلچر کے نمائندے ہیں۔

مذہب

جناب گنشیام صاحب! آپ نے میرے مذہب کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ میں پیدائش کے وقت ہندو تھا۔ جوانی میں اسلام کی طرف رجوع کیا۔ سکھوں اور مسلمانوں سے [illegible] ہوئے تو سکھ دھرم [illegible] ہو گئی۔ لیکن جب پتا لگا کہ یہ تو ہندو دھرم ہی کی ایک شاخ ہے، چنانچہ اسے بھی ترک کیا۔ پھر یہ مذہب انسانیت کو بھی [illegible] ایک بار [illegible] کا [illegible] مل گیا۔ ہوٹل میں سے گوشت کھاتے ہوئے پکڑا گیا تو میں نے تبلیغ کی ضرورت [illegible] اس مذہب سے بھی چھٹکارا پا لیا۔

آج کل لامذہب ہوں۔ میری طرح [illegible] بھی لامذہب ہے کیونکہ وہ ہندو، سکھ، مسلم، عیسائی جس کے ہاں بھی گئی اسی کے گھر میں [illegible] رہی ہیں۔ [illegible] کا سایہ تھا [illegible] کا سامنا نہیں۔

میرے بچے مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں۔ والد صاحب! ہم [illegible] مذہب والے ہیں۔ اور میں انھیں کہا کرتا ہوں۔ مذہب عشق والے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں لیکن [illegible] سمجھائیں گے تو کسی نہ کسی چیز یا طریقے [illegible] جانور یا [illegible] یا چیز وغیرہ سے عشق کرنے لگیں گے اور یہی ان کا مذہب بن جائے گا [illegible] آزادی کہتے ہیں۔

سیاسی خیالات

آپ کے فارم کے آخری خانہ میں درج ہے کہ میرے سیاسی خیالات کیا ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے اندر سیاسی خیالات پیدا ہو گئے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ میرے اندر سیاسی خیالات آ گئے ہیں تو وہ ہر روز میرے گھر آنے لگے۔ ایک بار میں اپنے گھر میں بیٹھا گلاب کا ایک پھول سونگھ رہا تھا تو ایک صاحب آ گئے اور بولے:

”آپ کے سیاسی خیالات تو بہت اچھے ہیں مگر آپ یہ گلاب کا پھول سونگھ رہے ہیں۔ لوگ اعتراض کریں گے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ آپ نے سیاسی خیالات کا تقاضا ہے کہ جب تک ہر انسان میں پھول سونگھنے کی عادت پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک آپ بھی اس خوشبو سے پرہیز کریں اور قربانی کا ثبوت دیں۔“

”قربانی سے کیا ہوگا؟“

”آپ سیاسی رہنما بن جائیں گے۔“

— آج کل میرے گھر کوئی نہیں آتا اور میں بلا کھٹکے گلاب کی خوشبو سونگھتا ہوں۔ اسی خوشبو کم بخت نے مجھے سیاسی لیڈر نہیں بننے دیا لہٰذا میرے اندر سے سیاسی خیالات نکل گئے اور صرف گلاب کی خوشبو باقی رہ گئی۔

اب سوائے خفیہ پولیس کے میرے سیاسی خیالات سے کوئی آگاہ نہیں، خود میں بھی نہیں۔

مرمر کی ماں

احمد سعید

ننھی سی سبز گلدان میں سفید گلاب کے پھول، وہ بھی اس طرح ترتیب دیے ہوئے جیسے کپڑے پہ کاڑھے گئے ہوں یا ایک ہی ڈیزائن کے مطابق جگہ جگہ ٹانکے گئے ہوں۔ یہ تھیں بیگم ریاض، اور بیگم ریاض کے شوہر ریاض احمد کو بھی وہ بڑی ہی ایسے لگتی جیسے تکیوں کے غلاف اور بیڈ پوش پہ نکالے ہوئے زرد، نارنجی گلاب، امرنیا اور رات کی رانی کی طرح دکھائی دیتی تھی لیکن ریشمی دھاگے کے پھولوں کا اصل پھولوں جیسا کہاں تھا۔ ایک میں تو خوشبو تھی وہ ہوا میں مہک اٹھتے تھے، کھل اٹھتے تھے۔ دوسرے چپ چاپ بے نیاز و حرکت رہتے تھے۔ ریاض احمد ڈپٹی کمشنر کو سہاگ کی رات ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اس رات اس نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے وقت یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ چینی سے بنا نازک سفید مرتبان کو ڈبے میں سے نکال کر انگیٹھی پہ رکھ رہا ہو، اور اسے خطرہ ہو کہ وہ حقیقت کی ٹھیس لگنے پر کہیں ٹوٹ نہ جائے ...... ریاض احمد نے انگلستان میں بی اے کر کے پھر سے اڑتے تھے۔ مغربی تتلیوں کو ایک پھول سے دوسرے کی طرف اڑتے اور ان کا رس چوس کر قریب سے ہی بالکل جا بیٹھتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ شادی کے معاملے میں دیسی عورت کا واقعی دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ چنانچہ جب وہ ملازمت کے سلسلے میں تربیت حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹا تو اس نے پرانی وضع کی دلہن تلاش کروانے میں تین برس صرف کر دیے۔ ایک ایسی عورت جو پردہ نہ کرنے کے باوجود نماز روزہ کی پابند ہو۔ ایک ایسی جو اونچی ہوا لگتے مرجھا جائے اور انگریزی ڈگری ہونے کے باوجود ان دیکھے سات پردوں میں بند ہو۔ ریاض احمد کے یار دوست تو اس کے دقیانوسی خیالات سن کر ہنسا کئے اور اس کے گھر اور خاندان والوں کو بھی اس بات پہ پہلے بڑا اچنبھا ہوا کہ وہ ولایت سے ہو آنے کے باوجود دوسرے لڑکوں کے برعکس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حج کر کے آیا ہو۔

"...... بس فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی داڑھی باہر نہیں اندر اگی ہوئی ہے۔"

"پڑھ لکھ کر گنوایا ہے۔" ریاض کے دوست اسے کہتے۔

"نہ معلوم اسے کیا ہو گیا ہے جو اپنی قیمت وصول نہیں کرتا۔" ریاض کے والدین کہتے۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے بیوی اولاد پیدا کرنے کے لیے چاہیے تھی۔ بچے کے لیے ایک ماں اور اپنے لیے ایک رفیقہ حیات۔ غرض پسند اپنا اپنا ہوتا ہے۔ جب ایسے دو مل جائیں تو سونے پہ سہاگہ! ریاض احمد کی نگاہ انتخاب بھی آخر کہاں جا کر رکی۔ اس کے اپنے ہی ڈسٹرکٹ میں درگاہ والے شاہ شریف کے متولی حضرت پیر جمال کی دختر نیک اختر شیریں جمال۔ ایک ایسی لڑکی نظر آئی جو

شہرت کے آرٹ کے عین مطابق انتہائی خوبصورت تھی۔ اسے وجاہت نے کینرڈ کالج کی ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ تب سے وہ اس پر مر مٹا تھا۔ سفید لباس پہنے، سر پر سفید پھول لگائے گوری چٹی، جگمگ کرتی وہ پاکیزہ حسینہ جس میں کرسچین مکمل اور کامل ہونے کے باوجود راہبہ کی صفات موجود تھیں۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ نن (NUN) کا لبادہ اوڑھ لیتی۔ اس کی ہم جماعت لڑکیاں اسے سنگِ مرمر کا بت کہا کرتی تھیں۔ اسی طرح سڈول اور ٹھنڈا جسم۔ یوں معلوم ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے فرصت کے لمحوں میں بنایا ہو لیکن اس میں روح پھونکنا بھول گیا ہو۔

شیریں کی ہم جماعت لڑکیوں کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو کبھی نہاتے وقت بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر یہ بات سچ تو اس نے بلوغت کے بعد وقت بھی کبھی قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو گزارا کیا تھا کہ نہیں۔ درگاہ شریف کی بیسیوں مربعے زمین کے لیے جہاں بھی کا بندوبست کر گئے اسے سرسبز کرنے کی طرح شیریں جمال کے بیج زمیں روح پھونکنے کے لیے۔ جانے کس نے رشتہ تھی۔ اس کے بعد جب پتا سے سچ کہہ دیجئے ریاض احمد درگاہ کے سارے لوگ گئے۔ چونکہ پیر صاحب شیریں کا اپنے مریدوں میں بڑا ادب تھا۔ وہ کسی بات پر اس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے اور وہ تو ان کے حرم کی خدمت کے پہروں سے نے کے سبب بیتاب رہتے تھے۔ یہ بات عام تھی کہ پیر صاحب بڑی ہوشیاری سے ایک وقت میں صرف چار کو منکوحہ کا درجہ باقیوں کو ملازمہ کا۔ لیکن کسی کو ان کے فرمان اور حرکت پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملتا۔ چنانچہ ان کی بیٹی شیریں کی ریاض احمد ڈپٹی کمشنر سے ہوئی تو پیر صاحب کے مریدوں نے چپکے سے قبول کر لی۔

لیکن دس برس کی رفاقت کے بعد بھی شیریں اور ریاض احمد کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا، گو ان کے گھر میں بچوں کی رنگ برنگی تصاویر رہتا چلا گیا اور بچے کے بغیر ریاض اندر ہی اندر محسوس کرتا جیسے شیریں اب تک کنواری ہو۔ اس رشتہ سے مرمر کے بت کے سنت بھی ار شوہر کے اس احساس محرومی کے باعث ٹھنڈی آہیں نکل جاتیں لیکن نہ معلوم وہ عرش تک کیوں نہ پہنچ پاتیں۔ ملک بھر کے ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج بھی کروا کر دیکھ لیا تھا۔ جو بے اثر ثابت ہوا تھا۔ پیر صاحب نے گنڈہ تعویذ، ٹونے ٹوٹکے کے بیٹی کی گود ہری کرنے کے سب ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن یہ بھی بے سود نکلا۔ سن لوگوں نے یہی کہا کہ جو نہ ہو لڑکی کو انگریزی تعلیم دلوانے برادری کو چھوڑ کر ایک غیر شخص کے ساتھ اس کی شادی کرنے کی ہے۔ یہ خیال سب پیر صاحب کی اس بارے میں کوئی ملی تو انھوں نے شیریں اور ریاض دونوں کو اپنے خرچ پر علاج معالجے کے لیے یورپ اور امریکہ بھیج دیا۔

غیر ممالک کے ڈاکٹروں نے بھی دیسی معالجوں کی طرح جیسے یک زبان ایک ہی رائے دینے کی سازش کر رکھی تھی۔ نے بتایا کہ سن سن کر ان کے کان پک گئے تھے کہ جسمانی لحاظ سے تو وہ دونوں آنکھوں کا ٹھنڈ کیٹ تھے۔ انھوں نے ریاض کو یہ مشورہ دیا کہ بیوی کو مغرب کی دل کھول کر سیر کرائے۔ اس کے مطابق انھوں نے اوپیرا، کنسرٹ، میوزک ہال، حتیٰ کہ نائٹ کلبوں تک کی سیر کرائی۔ وہاں کی بے حجابی اور بے شرمی دیکھ کر شیریں پر مزید جھرجھری سی طاری ہو جاتی۔ شیریں نے کئی بار ریاض کہ وہ کسی مغربی لڑکی سے شادی کر لے، شاید اس کے من کی مراد اس طرح پوری ہو جائے لیکن اگر اس کے باوجود ریاض کی پوری نہ ہوئی تو وہ سنگِ مرمر کی ایک اور مورتی اپنے گھر میں کھڑی کر لے گا۔ وہ جواب دیتا، "اگر قسمت میں ہی اولاد نہیں تو پھر

شکوہ کیوں۔ شاید آج آپ بھی کوئی مصلحت ہو۔" ریاض نے شیریں کو ایک طویل لیکچر پلاتے ہوئے کہا۔ لیکن شیریں کو معلوم تھا کہ ریاض اس وقت دماغ سے سوچ رہا تھا، دل سے نہیں۔

یورپ اور امریکہ سے واپسی پر ریاض تو پھر کام میں محو ہو گیا لیکن اس کی والدہ نے بہو کا علاج اپنے ذمے لے لیا۔

"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ سنا ہے شاہدرہ میں ایک سائیں آیا ہے، وہ لے پالک عورتوں کا علاج کرتا ہے۔ چلو اس کو بھی دکھا لیں" اس نے کہا۔

"...... وہ آئیں تو گاڑی میں چلیں گے۔" شیریں نے ساس کا دل رکھنے کے لیے جواب دیا۔ "اچھی امی! آپ کیسے پیسے کیوں خواہ مخواہ اتنا ہلکان ہوتی ہیں۔ میں نے تو انھیں کہہ دیا ہے کہ...... آپ دوسری شادی کر لیں۔"

"چل پگلی۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ مجھے ریاض نے بتا دیا ہے کہ تم نے اسے اجازت دے دی ہے لیکن یاد رکھو نہ تو وہ ایسا کرے گا، نہ میں ہی اسے ایسا کرنے کی اجازت دوں گی۔"

"لیکن امی!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ہمارا اتنے علاج کیے یہ بھی آزما دیکھو۔ فکر نہ کرو ریاض کچھ نہیں کہے گا۔"

"انھیں بتا دینے سے جانے میں کیا حرج ہے۔ ایسی جگہ پر کوئی مرد بھی تو ساتھ ہونا چاہیے۔"

"...... تمھارے جیسے کیسوں میں سائیں عورت کے ساتھ مرد لانے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں جو تمھارے ساتھ ہوں گی، میں بھلا کوئی ایسی ویسی جگہ تمھیں تھوڑے ہی لے جا رہی ہوں۔"

"آؤ آؤ۔ میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" جب شیریں اور اس کی ساس سائیں فیروز شاہ کے ڈیرے پر پہنچیں تو اس نے انھیں دیکھ کر جواب دیا۔ "فکر نہ کرو۔ خدا تمھاری گود ہری کرے گا۔" نہ صرف اس کے الفاظ سن کر بلکہ اس کی شکل و صورت دیکھ کر دونوں بہو ٹھٹک کر رہ گئیں۔ الفاظ پر اس لیے کہ سائیں کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ اسے بنا پوچھے اپنے ملاقاتیوں کی آمد اور دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ باقی رہی شکل و صورت، اس کے اعتبار سے بھی وہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ سرخ و سفید رنگ جس پر بڑھاپا تو درکنار ادھیڑ عمر کا ثبوت بھی بمشکل ملتا تھا۔ کمان کی طرح سیدھا، چاق و چوبند۔ سر کے بال عنبر و زعفران سفید تھے جو عمر کی غمازی کرتے تھے۔ چہرے بشرے سے عجب طمانیت اور ہمدردی ٹپکتی تھی۔ کجلائی آنکھوں میں سرخ ڈورے، ان میں ایک ناگفتہ بہ خمار، جب وہ جلال میں آتا تو ان میں سے انگارے سے نکلتے۔ سننے میں آیا تھا کہ اگر وہ کسی سے نظریں ملا کر بات کرتا یا نظر اٹھا کر دیکھ بھی لیتا تو اس کا بیڑا ضرور پار ہو جاتا۔

جب شیریں اور اس کی ساس اس کے ہاں پہنچیں تو وہاں سائیں کے پاس اس کے سائلوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مردانہ کیا زنانہ کیا دونوں کمرے بھرے ہوئے تھے۔ آدھ پون گھنٹے میں چند عورتوں کو فارغ کر کے وہ یک لخت اٹھ بیٹھا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو اور لپک کر اندرون خانہ سے تین چار ماہ کا ایک بچہ اٹھا لایا۔ یہ اس کی آخری نوجوان دلہن کے بطن سے تھا۔

"دیکھو خدا کی قدرت! اگر اس کی رحمت شامل حال ہو تو مجھ جیسے اسی برس کے بڈھے کو بھی ایسا بچہ عطا کر دے ...سکے گھر میں کسی شے کی کمی نہیں۔" سائیں نیروز شاہ نے مستورات کو مخاطب کر کے کہا۔ اسے اتنے کم سن بچے کا باپ دیکھ کر ان دو سہری عورتیں ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے لگیں اور ان میں سے بعض کے چہرے زرد ... اور بعض چہرے مسکراہٹ سے ...ل گئے۔ ایک دو نے تو ایک دوسرے کو چٹکی بھی بھر لی اور چند ایک نے اٹھ کر سائیں صاحب کے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے کے لیے بازو آگے کی طرف پھیلا دیے لیکن شیریں کے تو ... ہاتھ پاؤں پھول پھول سے گئے۔

مگر سائیں نے اپنا بچہ نیرو کی ماں کو ہی تھمانا پسند کیا اور شیریں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس کے من کی مراد پوری ہوگی۔ ...کے لیے اسے چودھویں رات کے بارہ اور ایک بجے کے درمیان دریا پر جا کر نہانا ہوگا۔ اس سے پہلے جسم پر اس کی دی ہوئی دوائی ... ہوگی اور دو سفید کبوتر اپنے ہاتھ میں پکڑ کر پانی میں چھوڑنے ہوں گے۔ بس ... سونے سے قبل اس کا دیا ہوا سفوف گرم گرم دودھ کے ساتھ پھانکنا ہوگا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ چودھویں کا چاند پورے جوبن پر تھا۔ دریا کی لہروں پر چاندنی مچل رہی تھی۔ اٹکھیلیاں کرتی ہوائیں بادل کے ننھے ننھے ٹکڑے چاند کے سامنے دامن بچا کر نکل جاتے۔ دریا کے کنارے سرکنڈوں کے پھول مست سادھوؤں کی طرح اپنے ... پھیلا کر لہلہا اٹھتے۔ کنارے سے ہٹ کر ایک دور افتادہ جزیرہ نما خشکی کے ٹکڑے پر ... اندھیرے میں دکھائی دے رہے ..... ان میں ایک مرد تھا اور دوسری عورت۔ مرد عورت کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دو سفید کبوتر پھڑپھڑا رہے تھے۔

عورت سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کی سفید ریشمی ساڑھی ہوا میں یوں لہرا رہی تھی جیسے دو کبوتروں کی طرح اڑ رہی ہو۔ ...عورت نے اپنے سینڈل اتار کر ایک طرف پھینک دیے اور اپنے ننگے پاؤں جزیرے سے ٹکراتی ہوئی لہروں میں ڈال دیے جو ...یوں ملتی آتیں اور واپس پلٹ جاتیں جیسے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں۔

چاندنی میں ریت کے ذرے بھی جگمگا اٹھے۔

مرد نے عورت کے نہانے کے لیے اسے پانی کی دو بالٹیاں دریا سے بھر کر اس کے پاس رکھ دیں۔ اس نے بہتیرا کہا کہ ...یہیں نہا لے۔ پانی پایاب ہے لیکن عورت کنارے کے قریب اس پر رضامند نہ ہوئی۔ اتنے پانی میں تو جانور بھی زندہ نہیں رہ سکتا ...عورت نہ مانی۔

"آپ اس طرف نہ دیکھیں۔"

"بارہ تو بج چکے ہیں۔"

"لیکن یہاں کا منظر ..... کتنا حسین معلوم ہوتا ہے۔"

"شیریں! کیا تم کہہ رہی ہو؟"

"نہیں کچھ تو .....؟"

جب عورت نے ... دیا تو اس کی ریشمی ساڑھی کا پلو اس کے کندھے سے پھسل گیا اور وہ کبوتر کی طرح غٹرغوں کرتے ہوئے

قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دریا کی لہروں پر جلترنگ بج اٹھا ہو۔ اب وہ مرد کے ہاتھوں سے کبوتر لے کر انھیں سینے سے چمٹائے ریت پر لیٹ گئی۔

"سو نہا لیا؟" سرکنڈوں کے پیچھے سے اس کے مرد کی آواز آئی۔

"گھبرائیے نہیں، تھوڑی دیر اور۔"

فضا میں روئی کے گالوں سے زیادہ نرم، چاندنی سے زیادہ سپید پرندے اڑتے، قلقاریاں بھرتے دکھائی دیے۔ انھیں دیکھ کر عورت کا جی چاہا کہ کبوتروں کو بھی یکلخت چھوڑ دے۔ قریب ہی جہانگیر کے مقبرے کے گنبد اور مینار چمکتے دکھائی دیے۔ عورت نے اب کبوتر ایک ٹوکری میں بند کر دیے جس میں وہ انھیں بند کر کے لائے تھے اور جو اس کے شوہر کے پاس پڑی تھی۔

چاندنی میں ایک سیماب وش شعلہ سا یکدم نمودار ہو گیا...... سنگ مرمر کا بت بے نقاب ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر عورت پہلے تو گھبرا سی گئی۔ مرد اسے سرکنڈوں کے پیچھے سے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ سفید گلاب کی بند کلی جس پر سیاہ بھنورا سا بیٹھا تھا کھل ہی اٹھنا چاہتی تھی۔ عورت نے جلدی جلدی اپنے جسم پر ایک دوائی سی مل دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تیزی سے اس کے جسم کے ارد گرد لپٹ لپٹ جاتے اور وہ اور چاندنی اس کے انگ انگ میں مستی سی بھرنے لگے۔ اس سے عورت کا جی چاہا کہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت سے لپٹ جائے پانی اس کے اوپر بہہ جائے۔ اس نے یکدم اٹھ کر اپنے پاس پڑی ٹوکری میں سے کبوتر نکال کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ کبوتروں کو اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے ان کے سامنے کبوتروں کا ایک جوڑا آ گیا ہو۔

جب عورت نے انھیں اپنے سینے سے لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار کیا تو اس کی آنکھیں اپنے آپ مند گئیں۔ اس کے تصور میں سینکڑوں برس پہلے شہزادہ سلیم اور مہرالنسا کی پہلی ملاقات کا منظر گھوم گیا...... جب شہزادے نے اس حسینہ کو کچھ عرصہ کے لیے اپنے دو کبوتر سنبھال کر رکھنے کو کہا اور واپسی پر اس کے ہاتھ خالی پا کر اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح اڑ گئے تھے...... تو ریت پر لیٹی ہوئی سنگ مرمر کی عورت کے ہاتھوں سے دونوں کبوتر پھڑپھڑا کر فضا میں اڑ گئے اور ان کے جسم سے عجیب غائیں غائیں کی آواز پیدا ہوئی۔ عورت چونک کر اٹھ بیٹھی اور کبوتروں کو ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن وہ تو کہیں بادلوں میں جا گھسے تھے شاید۔ وہ بازو پھیلائے انھیں پکڑنے کے لیے جیسے ان کی طرف لپکی لیکن اس کا پاؤں ایک ننھے سے ریتلے گڑھے میں جا پڑا اور وہ ریت پر ہی گر پڑی ۔ چاندنی اب سنگ مرمر کے بت کو پوری طرح اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔

عورت نے یکدم اٹھ کر پانی کی دو تین باٹیوں سے نہا لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گیا ہے۔ اس نے اپنے مرد سے لوٹا پانی کے لیے فرمائش کی اور تھوڑا لگا کر اپنا جسم ریت پر لڑھکا دیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے سے ایک سانولی سی لیکن بڑی لہر اٹھی اور سنگ مرمر کی لہر سے آ کر لپٹ گئی۔

چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ سنگ مرمر کے رگ و ریشے میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

وقت کی کوکھ

نوید انجم

بھابی کے بازو کو تھام کر رو پڑی۔

اس کی آنکھیں ایک دم بھر آئی تھیں۔ رحم اور ہمدردی کی شراب سے بھرے ہوئے پیالوں سے چھلکنے لگی۔ ہائے بھابی ذرا دیکھنا!

بھابی نے مڑ کر دیکھا۔ انار کلی بازار کے بیچ میں ایک ریڑھی کھڑی تھی جس پر پانچ چھ بچے لیٹے ہوئے تھے۔ بھابی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے بچوں میں کوئی جان ہی نہیں۔ بس نچڑے ہوئے اور مرجھائی سی جانیں زندگی کی بھاری راہ میں جانے کیوں سسک رہی تھیں۔ گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے رستے لوتھڑے۔ زندگی زندہ گوشت کے ٹکڑوں کا روپ دھارے گزرتے ہوئے لوگوں سے بھیک کی التجا کر رہی تھی۔

بھابی کا جی بھر آیا۔ "اف خدایا۔ توبہ ہے میری!"

اس نے گھبرا کر ایک نظر بھابی کو دیکھا اور پھر ریڑھی کے پاس کھڑی ہوئی ایک عورت پر اس کی سہمی ہوئی نگاہیں ٹھہر گئیں۔ اس عورت کا بدن مضبوط تھا اور اس میں بڑی حد تک مردانگی جھلکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی کسان عورت ہو جو محنت مشقت کی عادی ہو۔ اس کا قد لمبا اور ناک نقشہ گوارا تھا۔ رعنا نے اس کے چہرے کو یوں دیکھا گویا کوئی تاثر معلوم کرنا چاہتی ہو مگر اس عورت کا چہرہ کسی تاثر سے عاری تھا اور وہ ایک بے جان بت کی مانند آنے جانے والے لوگوں کو ایک نظر دیکھتی۔ وہ لوگ جو ریڑھی پر بچوں کے قریب پڑے ہوئے ایک کشکول میں آنہ دو آنے ڈال کر سسکتی ہوئی زندگی کو دیکھ کر دل ہی دل میں توبہ توبہ کرتے گزر جاتے۔ اور یونہی وہ عورت کبھی کبھار بچوں کی طرف بھی دیکھ لیتی۔ جن کی نگاہوں میں بے پناہ مظلومیت اور بے بسی رچی ہوئی تھی۔

ان سسکتی ہوئی زندگیوں کی ظاہری شکلیں بڑی خوفناک تھیں۔ رعنا کی ہمت نہ ہوئی کہ دوبارہ ان بچوں کی جانب دیکھے۔ چلتے چلتے اس نے بھابی کی طرف دیکھا جو زیر لب توبہ توبہ کر رہی تھی۔ "توبہ ہے بھابی۔ کیا یہ اس عورت کے بچے ہیں؟"

بھابی نے منہ پھیر لیا۔ "چلو۔ چلو رعنا۔" وہ وہاں کھڑا ہونا نہ چاہتی تھی۔

رعنا نے اپنا نازک سا پرس کھولا۔ ایک چونی نکالی کشکول میں پھینکی اور بھابی کا بازو بدحواسی سے تھام کر آگے بڑھ گئی۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بغیر کسی مقصد کے وہ کھڑکی میں کھڑی باہر سڑک کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر پلٹ کر وہ قد آدم آئینے کی طرف آئی اور خود کو دیکھنے لگی۔

اس کا قد درمیانہ تھا، رنگ صاف ـــ کھلتا ہوا گندمی رنگ جو سہیل کو بہت پسند تھا ـــ وہی سہیل جو اس کا محبوب تھا ـــ نہ صرف محبوب بلکہ منگیتر بھی اور اب جلد ہی ہونے والا شوہر ـــ اس کی ناک ستواں تھی جسے کئی بار سہیل نے شرارت سے کھینچا ـــ اور وہ گلاب سے ہونٹ ـــ جنھیں اس نے کئی بار اپنے لبوں سے چھونا چاہا اور وہ ہمیشہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو اس کے لمس سے بچا لیا کرتی ـــ اور پھر اس کی وہ آنکھیں جو وہ شرارت کے طور پر بھر اکثر رعنا کو کس قدر پیاری لگتی تھیں اور وہ تھا بھی تو ٹھیک ہی ـــ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا دی ـــ لیکن دفعتاً جیسے اسے احساس ہوا کہ اس کا قد سمٹ کر رہ گیا، ناک چہرے پر سے غائب ہو گئی اور ہونٹوں کی بجائے ایک سوراخ ـــ گہرا اور تاریک سوراخ اس کی بے بسی پر ہنسنے کے لیے بن گیا ـــ آنکھیں، وہ حسین آنکھیں نہ جانے کہاں گم ہو گئیں اور بے نور سے دو گڑھے ـــ چہرے پر گڑے ہوئے دو پتھروں کی مانند اس کا مذاق اڑانے لگے ـــ اور پھر اسے ایسے لگا جیسے وہ انارکلی بازار میں کھڑی ہوئی ہے جیسی بیران بچوں کے ہمراہ بے بسی کی حالت میں راہ چلتے لوگوں کی ہمدردیا سے لبریز نگاہوں کا نشانہ بن رہی ہو ـــ مارے دہشت کے اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی ـــ اسے احساس ہوا کہ ان لوگوں میں سہیل بھی ہو سکتا ہے اور وہ ـــ وہ رعنا نہیں، ایک سسکتی ہوئی زندگی ہے ـــ اس نے گھبرا کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور سسکیاں لیتی ہوئی مسہری پر گر گئی۔

بھابی اس کی چیخ سن کر بھاگی آئی ـــ اسے یوں روتا دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے تو وہ بڑی حیران ہوئی، پھر اس نے اس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ بڑی شفقت سے پھیرا "کیا بات ہوئی رانی؟ ـــ میری رعنا!"

رعنا ترو تازہ ہو گئی۔ اس طرح سہیل بھی تو اسے منایا کرتا تھا ـــ رانی ـــ رعنا رانی ـــ رانی!

بھابی نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں" ـــ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں ـــ غم آلودہ ـــ بھیگی بھیگی ـــ کتنی پیاری لگ رہی تھیں! بھابی کو وہ بڑی پیاری نظر آئی اور اس کے بازوؤں کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ بولی "اٹھو ـــ اٹھو ـــ" پھر رازداری کے لہجے میں بولی "کہیں سہیل سے تو کوئی بات نہیں ہوئی ـــ؟"

وہ شرما گئی ـــ حیا کی سرخی نے اس کے چہرے کو بہت زیادہ حسین بنا دیا۔ اس نے کہنا چاہا "کیسی بات کرتی ہو بھابی! بھلا ان سے کسی بات پر میں یوں رو سکتی ہوں ـــ" مگر وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کیا میں واقعی سہیل کی کسی بات پر نہیں روئی ـــ اسے کوئی جواب نہ مل سکا اور گھبرا کر اس نے اپنے ذہن سے ایسے الٹ پلٹ سوال نکالنے کی کوشش میں [illegible] "وہ آئے نہیں؟"

جب وہ کچھ نہ سمجھ سکی ہنس دی، پھر بولی "پگلی! ارے ابھی آ جائے گا۔ وہ بھی تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا ـــ"

وہ بری طرح شرمائی تو بھابی نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا۔

شام ہوئی تو وہ آیا ـــ ممی اور ڈیڈی بڑے آزاد خیال واقع ہوئے تھے ـــ بس ذرا سی ضد کر کے رعنا نے بھابی کی مدد سے باغ جناح میں سیر کے لیے جانے کی اجازت لے لی اور سہیل کے ہمراہ باغ میں آ گئی۔ وہ دونوں گلستانِ فاطمہ کے ایک کونے میں جا کر

بیٹھ گئے۔ وہاں بہت سی باتیں انھوں نے کیں۔ جو کالج سے متعلق تھیں پھر ان کی گفتگو کا موضوع بدلنے لگا اور جب پیار کا جذبہ دونوں کے وجود میں تیزی سے سانس بن کر سمانے لگا تو وہ خاموش ہو گئے۔ پیار کی باتیں کرنا اتنا اچھا نہیں ہوتا جتنا اس لیے خاموشی میں ایک دوسرے سے اپنے دل و دماغ کی کیفیتوں کا اظہار کرنا! اور پھر یہ الگ بات ہے کہ سانسیں اور بھیگی بھیگی فضا، خاموشی اور تنہائی ——— بھلا ایسے میں باتوں کی ضرورت ہی کیا تھی ——!

وہ جب واپس گھر آنے لگے تو سہیل کا اس کا ایک دوست راستے میں مل گیا ——— نعیم کے ہاتھوں میں موپساں کے افسانوں کی کتاب دیکھ کر رعنا نے پوچھا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو موپساں کی تخلیقات پسند ہیں۔"

نعیم مسکرا دیا اور رعنا کی طرف کتاب بڑھا کر بولا "میرے خیال میں آپ کو بھی اس سے کچھ دلچسپی ضرور ہے۔"

رعنا مسکرائی۔ سہیل نے کہا "یہ موسم ایسا ہے کہ اس قسم کی کتابیں ہی پڑھی جائیں تو اچھا ہے۔"

رعنا جھینپ گئی اور بات پلٹنے کو بولی۔ "انھیں پتہ ہے سہیل! انارکلی میں ایک عورت ایک ریڑھی میں چار پانچ معذور بچے لیے بھیک مانگتی پھرتی ہے ———!"

نعیم جواب میں کہنے لگا "مس رعنا ——— میں نے اس عورت کو دیکھا ہے ——— کیسی بری حالت ہے بچوں کی ——— دیکھ کر رحم آتا ہے ———!"

سہیل نے پوچھا تو رعنا نے ساری بات کہہ سنائی ——— اور پھر بولی "ان بچوں کو دیکھ کر میرا تو دل دہل گیا اور بے چاری بھابی کی طبیعت خراب ہو گئی ———"

سہیل نے کہا ——— "ہاں ——— یہ ایٹمی دور ہے ——— جانے کتنے اور بچے اس دنیا میں ———"

رعنا کانپ گئی، بات کاٹ کر بولی "سہیل کوئی اور بات کرو ———"

نعیم نے کہا "مس رعنا ——— ایک بات اور سنیے گا ——— یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں موپساں کا ایک افسانہ ہے جس میں ایک ایسا ہی کیریکٹر پیش کیا گیا ہے ——— یہ پڑھ کر دیکھئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں فریب ———"

رعنا کسی اور خیال میں کھو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں دوپہر کے واقعات پھر رہے تھے ——— وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہے اور اس کی شکل بدل گئی ہے ——— ڈر کر اس نے سہیل کا ہاتھ پکڑا اور وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ سہیل نے بڑے پیار سے اسے دلاسا دیا ——— "تم نے خود ہی تو یہ ذکر چھیڑا اور اب خوفزدہ کیوں ہو گئی ہو ———؟"

نعیم کو احساس ہوا کہ اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی ——— معذرت کرتے ہوئے بولا "مجھے اجازت دیجئے ———"

رعنا کا دل چاہا کہ اس سے کتاب لے کر گھر جاتے ہی پڑھے مگر خاموش رہ گئی۔

سہیل اسے گھر تک چھوڑنے آیا ——— وہ کچھ خاموش خاموش تھی۔ کچھ مہمان آئے ہوئے تھے مگر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بھابی اس کے پیچھے پیچھے آئی ——— دیکھا کہ مسہری پر لیٹی ہوئی بکھرے ہوئے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں یوں پھیر رہی ہے جیسے کنگھی کر رہی ہو ——— دوپٹہ مسہری پر آدھا نیچے اور آدھا اوپر کی جانب پردے کی طرح لٹک رہا ہے اور گلے کے بٹن کچھ کھلے کچھ بند۔

وہ ٹھٹک کر رہ گئی ——— "رعنا ——— رعنا!" بھابی نے سرگوشی کی۔

اس نے پلکیں اٹھا کر ایک کروٹ لی اور بھابی کی طرف دیکھنے لگی —"بھابی وہ عورت!"
بھابی نے جلدی سے کہا: "بد نصیب کیا ہو گیا ہے — چھوڑو اس عورت کے ذکر کو"
وہ خاموش ہو گئی۔

شام کو اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا — سڑک کے دونوں کناروں پر بجلی کے کھمبے یوں نظر آنے لگے جیسے ایک لمبی سی لکڑی کا سرا جل رہا ہو — وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر اندھیرے میں یونہی نہ جانے کتنی دیر دیکھتی رہی۔ روشن بلب دیکھ کر اسے محسوس ہوا گویا ایک بم کا گولا ہے جو بھڑک رہا ہے اور بلب کی دھیمی دھیمی روشنی — وہ آگ ہے جو کسی بھی وقت ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر دے گی — پھر یہ تمام دنیا ختم ہو جائے گی — اپنی تمام رنگینیاں اور برائیاں لے کر یہ دنیا ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی ——— وہ اس خیال کے آتے ہی لرز کر رہ گئی۔

پھر وہ پلٹ کر بھابی کے کمرے کی طرف آئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے گھر میں ایک عجیب خاموشی نے اپنا ڈیرہ جما لیا ہے۔ ماحول پر سناٹا مسلط ہو گیا اور تاریکی میں ہر چیز ڈوب گئی ہے — بھابی کا کمرہ بھائیں بھائیں کرتا ہوا جیسے منہ کھولے زندگی کی ہر شے کو نگلنے کے لیے تیار ہے۔

گھبرا کر اس نے دروازہ کھولا اور آہستگی کے ساتھ اندر داخل ہوئی — دروازہ بند کیے بغیر وہ وہیں پٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا بھابی اپنی چارپائی پر اوندھی لیٹی ہوئی ہے اور سرہانے میز پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن ہے۔ ننھے سے لیمپ کی ذرا سی روشنی نے کمرے کی تاریکی میں مل جل کر ایک عجیب سی فضا پیدا کر دی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی اور ہلکی ہلکی تاریکی جانو ساون اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بھابی کے کمرے میں چلا آیا تھا ———

رعنا کو ایسے لگا جیسے وہ ساکت و جامد پتھر کا ایک مجسمہ بن گئی — اس سے اپنا قدم آگے نہ بڑھایا گیا اور فرش نے اس کے پیروں کو جوتیوں سمیت گویا دبوچ لیا! اس کے سینہ کے اتار چڑھاؤ میں تبدیلی سی آ گئی اور دل کی دھڑکن کی آواز اتنی تیز ہو گئی کہ رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کے بدن سے علیحدہ ہو کر گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح چلنے لگا ہو — جلدی سے اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے سنبھالا کہ کہیں وہ واقعی اس کے منہ کے راستے لعاب بن کر ہی نہ باہر آ گرے ——— اور متوحش نظروں سے بھابی کو گھورنے لگی۔
بھابی کے بے حس و حرکت جسم میں حرکت ہوئی اور رعنا کو سسکیوں کی آواز سنائی دی — بھابی بڑی آہستگی کے ساتھ اٹھی اور ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھ گئی — بھابی کے چہرے پر ہلکی سی روشنی پڑی تو رعنا نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھی۔ لال لال انگارہ سی آنکھوں میں آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے گویا اس دہکتی ہوئی آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے جو بھابی کے سراپا میں بھڑک رہی تھی۔
پھر بھابی نے اپنے پلو سے اپنی آنکھوں کے ان قطروں کو پونچھا جو اگر کسی سیپ کے منہ میں گرتے تو موتی بن جاتے اور میز پر پڑی ہوئی اپنے شوہر کی تصویر اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگی ———

رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے دل ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگا ہو ——— اس کے بھائی کی تصویر تصور میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی — پائلٹ کی وردی میں ملبوس اس کا خوبرو بھائی جمیل — ہاں دیکھ لو جمیل اسے دیکھ کر ہنس رہا ہے ——— پگلی! پگلی! تم مجھے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو ——— ارے ——— ارے یہ آنسو کس لیے؟

وہ بے اختیار چلّا اٹھی ——— بھابی نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اور اسے وہاں کھڑا دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے گھبرا گئی پھر وہ سنبھلی اور تصویر بستر پر رکھ کر وہ اس کی طرف آ گئی "رعنا رانی —— کیا ہوا؟"

اس کا دل چاہا بھابی کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر اتنے زور سے جھنجھوڑے کہ وہ خول علیحدہ ہو کر دور جا گرے جس میں اس کی بھابی بند تھی ——— یہ خول کتنا عجیب تھا —— جو اندر سے خالی اور کھوکھلا تھا —— اور اس کے باوجود بجتا نہیں تھا —— مگر رعنا اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکی "بھابی تم روئیں کیوں نہیں —— بھیا جلدی ہی آ جائیں گے!"

بھابی یوں پیچھے کو ایک دو قدم ہٹ گئی جیسے رعنا نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو ——— پھر ایک سانس آہ بن کر اس کے حلق میں سے خود بخود نکل گئی "ہاں —— ہاں! ——— وہ آ جائیں گے ——!"

رعنا نے بات پلٹنے کو کہا "تو بھابی، کیوں نہ کوئی کتاب ہی پڑھیں ——— ممی تو ڈیڈی کے ساتھ آج کسی سے ملنے گئی ہوئی ہیں اور مجھے تنہائی کا احساس ہو رہا ہے ——"

بھابی نے بے دلی سے کہا "نہیں —— ہم تنہا نہیں ہیں ——"

اور رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے غلط نہیں کہا —— وہ تنہا نہیں تھے —— نہیں تھے ——

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے ——— پھر وہ مڑ کر سیڑھیاں اتری اور دروازہ کھول کر اپنے کمرے کی طرف چل دی لیکن ابھی وہ ڈرائنگ روم تک ہی پہنچی تھی کہ اسے افسانوں کی کسی کتاب کو پڑھنے کا خیال آیا اور وہ شیلف میں پڑی ہوئی کتابیں دیکھنے لگی ———

کوئی کتاب اس کے جی کو لگی نہیں ——— اور تنگ آ کر وہ سوچنے لگی کہ کیا کرے ——— پھر اس نے دائیں طرف صوفے کے پاس میز پر پڑے ہوئے فون کو دیکھا —— اس نے سوچا کیوں نہ کسی سہیلی کو فون کر کے کوئی کتاب منگوا لے —— وقت دیکھا تو ابھی رات کے صرف آٹھ بجے تھے —— کوئی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی ——— یہ سوچ کر اس نے ایک نمبر فون کیا مگر اس کی وہ سہیلی کہیں باہر گئی ہوئی تھی ——— ایسے میں اسے سہیل کا خیال آیا۔

"ہیلو!" اس نے فون کیا "بھلا بوجھو تو سہی —— میں کون ہوں؟"

"ارے پہچان لیا —— ہاں —— میں ہی ہوں —— دراصل مجھے کوئی کتاب چاہیے ———" وہ بولی۔

وہ ہنس رہا تھا ——— اسے بھی ہنسی آ گئی "تو بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"تم نے نعیم سے وہ کتاب کیوں نہ لے لی؟"

وہ چونک گئی۔ سہیل سمجھا کہ وہ مورلیپاں کی کتاب پڑھنا چاہتی تھی ——— اور اس کتاب کا خیال آتے ہی اسے وہ عورت یاد آ گئی ——— اور پھر وہ خوفناک بچے —— معذور —— اپاہج بچوں والی عورت! وہ سہم گئی۔ کمرے میں کسی کی آہٹ آئی، پھر جیسے کسی کے سانس لینے کی آواز گونجنے لگی —— اس کے کانوں کے پردوں سے آوازیں ٹکرانے لگیں —— کمرہ جیسے ان اپاہج بچوں سے بھر گیا —— وہ چیخ پڑی "—— نہیں سہیل —— مجھے وہ کتاب نہیں چاہیے ——"

"رعنا ——!" اسے بھابی کی آواز سنائی دی —— اس نے پلٹ کر دیکھا، بھابی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

فون میں سہیل کی آواز آ رہی تھی "تم ڈر گئیں؟ بھئی بڑی ڈرپوک ہو —— بڑی بزدل ہو ——" وہ چھیڑنے لگا۔

اس نے منہ سے آپ ہی آپ نکل گیا۔ "سہیل! مجھے وہی کتاب منگوا دو —— اچھا —— اچھا —— باقی باقی!" پھر اس نے ریسیور ریسٹ کا فون سے علیحدہ کر دیا۔

بھابی کی معنی خیز نظریں دیکھ کر وہ بولی "سہیل نے کہا ہے کہ وہ نعیمہ کو فون کر کے کتاب منگوا تا ہے ——"

بھابی [illegible] پھر کتابوں کو کھولنے لگی —— پھر جیسے خود سے بولی "رعنا تمہارے سہیل بھیا ہیں نا ——"

"ہوں!"

"بڑے شریر ہیں!" وہ خود سے کہہ رہی تھی —— "بہت شریر ——"

"بھابی!" رعنا کچھ [illegible]۔

"تو میں تمہیں بتاؤں ——" وہ پلٹ کر رعنا سے سرگوشی میں بولی "مجھ سے ایک بار کہنے لگے —— اب ہیں باپ بنت ——" وہ خاموش ہو گئی ——

رعنا نے سوچا کہ وہ شرما گئی ہو گی —— مگر نہیں وہ تو بالکل ہی نہ شرمائی تھی —— بس ٹکر ٹکر کتابوں کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے خلاء میں دیکھ رہی ہو ——

کچھ دیر خاموشی رہی —— پھر فون کی گھنٹی بجی، رعنا نے ریسیور اٹھایا —— "ہیلو —— سہیل! —— ہاں رعنا ہوں —— کتاب نہیں ملی؟ نعیمہ کا دوست لے گیا؟ —— وہ لوٹ رہا نہیں —— اچھا کل ملیں گے —— باقی —— باقی ——!"

"بھابی! [illegible] رہی تھی —— اور آج دیکھو رعنا —— وہ مجھے یوں چھوڑ کر اتنی دور چلے گئے ——!"

وہ بھابی کی طرف متوجہ ہوئی "بھیا کی فکر کیوں کرتی ہو —— ابھی انہیں گئے تین چار دن ہی تو ہوئے ہیں —— بھابی!"

بھابی نے رعنا کی طرف دیکھا "رعنا —— کیا تین چار دن کچھ نہیں ہوتے؟ —— آج تو انہیں ادھر میرے پاس ہی ہونا چاہیے تھا —— میں انہیں بتاتی کہ ان کی خواہش پوری ہو ——!" وہ رک گئی۔

رعنا کو کچھ یقین نہ آیا "تو کیا واقعی —— سچ بھابی!"

بھابی نے صوفے پر بازو رکھ دیے اور سر جھکا لیا —— "ہاں! —— میں ماں بننے والی ہوں رعنا —— کاش! میں انہیں بتاتی کہ ان کی یہ خواہش پوری ہونے دیکھ کر میں کتنی خوفزدہ ہوں —— کتنی ڈر گئی ہوں میں ——!"

رعنا جیسے خوشی کے مارے دیوانی ہو گئی "ارے بھابی! ہمیں بتایا تک نہیں —— ارے بھیا کتنے خوش ہوں گے —— وہ تو بس آنے ہی والے ہوں گے!"

"اونہہ!" بھابی نے تلخی سے منہ پھیرا۔ "کاش یہ جنگی مشقیں ختم ہو سکتیں ——!"

رعنا ایک دم جیسے بہت بڑی سیانی عورت کا روپ دھار بیٹھی "امن کے لیے یہ سب چیزیں ضروری ہیں ——"

"امن —— امن" بھابی نے اس کی طرف تیز نظروں سے گھورا —— "دنیا میں کون ہے جو سکون نہیں چاہتا، امن نہیں چاہتا اور پھر —— پھر رعنا تم کیا جانو جب میں سوچتی ہوں کہ وہ پائلٹ ہیں اور خدانخواستہ کسی روز یہ جنگی مشقیں ——"

"بھابی!" اس نے چیخ کر بات کاٹی۔ . . .

دونوں خاموش ہو گئیں ——— رعنا کے دل میں آیا کہ بھابی کو کہے تم کتنی ڈرپوک ہو —— مگر اس کے کانوں میں آنچل کی آواز گونجنے لگی —— "بزدل ۔ بزدل ہو —— ڈرپوک ——!"

پھر رات گئے تک وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں —— رعنا نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح بھابی کے ذہن سے خوف نکال دے —— بھابی پہلے ہی کی طرح کھل کر باتیں کرنے لگی مگر یہ تو اس کی عادت ہی تھی کہ دل کی دل ہی میں رکھتی تھی —— وہی ایک خول —— جو اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا!

صبح سویرے حسب معمول وہ اخبار پڑھنے کے لیے ڈیڈی کے پاس گئی تو انہوں نے بتایا کہ ابھی تک اخبار نہیں لایا۔ ڈیڈی اس کے اخبار پڑھنے کی بڑھتی ہوئی خواہش کو دیکھ کر کچھ متعجب ہوئے۔ وہ بولی: "دراصل ڈیڈی آج کل میں امن عالم کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں بڑی دلچسپی لے رہی ہوں۔"

ڈیڈی ہنسے "لیڈر بننے کا ارادہ تو نہیں؟"

وہ شرما گئی "آپ تو بھی مذاق ہی سمجھتے ہیں۔"

ڈیڈی اس کے طرز عمل سے قدرے حیران ہوئے۔ وہ خود حیران تھی کہ اسے کیا ہو گیا تھا —— شاید بھابی کی ہمراز بن کر اسے بڑی مسرت ہو رہی تھی!

اخبار کا کافی انتظار کیا —— مگر جب آگیا تو اخبار کا خیال ہی چھوڑ دیا —— اپنے کمرے میں جا کر سو رہنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بھابی اخبار لیے اس کے کمرے میں آئی —— "اے رانی —— یہ خبر پڑھی تم نے؟"

"کیا؟"

"وہ جو ہم نے کل عورت دیکھی تھی نا ——"

وہ سہم گئی —— "چھوڑو بھابی ——"

"ارے سنو تو —— اسے گرفتار کر لیا گیا ہے ——"

"وہ کیوں؟" اس نے تعجب سے کہا، پھر بھابی سے اخبار چھین لیا —— اور پڑھنے لگی —— مگر اخبار کے حروف جیسے اس کی نظروں کے سامنے پھیلنے لگے —— اور آنکھوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے معذور منے منے بچے پھرنے لگے ——

بھابی کہہ رہی تھی —— "کہتے ہیں کہ کل شام داتا دربار میں وہ ریڑھی میں بچے لیے بھیک مانگ رہی تھی کہ ایک شخص نے جو کہ بہت امیر تھا وہاں اس کے بچوں پر ترس کھا کر اسے بھیک دی —— اور ——"

رعنا نے اخبار ایک طرف پھینک دیا —— "اور —— اور؟"

"اس شخص کا ایک ہی بچہ تھا ——" بھابی کو واقعات سنانے میں کمال حاصل تھا۔ "اور وہ بچہ دو تین سال ہوئے چھوٹی سی عمر میں اغوا ہو گیا تھا —— اس شخص کو ریڑھی میں پڑے ہوئے ایک معذور بچے پر بار بار بے اختیار پیار آتا —— اور بچے کا نام اس کے ذہن میں گھومنے لگا —— مگر عورت بچے کو کسی اور نام سے بلاتی رہی —— مگر اس آدمی سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنے بچے کا نام لے کر پکارا —— بس بچے نے جھٹ سے پلٹ کر اسے دیکھا —— وہ بچہ بول تو سکتا نہیں تھا —— ہائے بیچارے کی زبان کٹی ہوئی تھی نا ——!"

"ہائیں ۔۔۔" رعنا مارے حیرت کے منہ کھول بیٹھی ۔

بھابی بولی: "سب پولیس کو بلوا کر اس شخص نے اس عورت کو گرفتار کروا دیا ۔۔۔ اس عورت نے اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا ۔۔۔ سنا ہے کتنی ظالم عورت تھی ۔۔۔ لوگوں سے بھیک حاصل کرنے کی خاطر ۔۔۔ اور سنا ہے کہ گیارہ بارہ ہزار روپیہ اس کا بنک میں بھی جمع ہوا ہے ۔"

رعنا بے اختیار بولی: "اللہ کرے ایسی عورت کو سخت ترین سزا ملے ۔"

بھابی بولی: "میں کہتی ہوں ایسی عورتوں کو تو زندہ شیر کے آگے پھینک دینا چاہئے ۔"

اس دن رعنا کا دل بار بار دہلتا رہا ۔۔۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی آنچ آئی کہ آئی مگر خیر گزری ۔۔۔ سارا دن وہ مرجھائی کلی کی مانند پریشان سی رہی۔ پھول سا چہرہ کملایا ہوا اور آنکھیں دہشت زدہ سی حالانکہ بعض اوقات جب اسے یہ خیال آتا کہ وہ ماں بھی بننے والی ہے تو مسرت کی ایک لہر اس کے تن بدن میں دوڑ جاتی مگر پھر وہ جیسے سہم کر رہ جاتی ۔۔۔ اللہ ۔۔۔ توبہ کہیں کوئی عورت آ کر ان کی خوشیاں لوٹ نہ لے ۔۔۔

محسن حسب معمول شام کے وقت آیا اور اس کی طبیعت خراب دیکھ کر وہ بہت گھبرایا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس عورت کے ذکر پر اپنا موڈ خراب کیے بیٹھی ہے تو بڑا ہنسا اور لگا اسے چھیڑنے ۔۔۔ اس کی ان باتوں پر وہ قدرے کھل گئی ۔۔۔ وہ کہنے لگا ۔

"دیکھو ۔۔۔ ایسا ہوتا ہی آیا ہے ۔۔۔ نت نئے روپ نئی داستان ۔۔۔"

رعنا بات کاٹ کر بولی: "رہنے دیجئے اس ذکر کو ۔۔۔"

وہ بولا: "ابھی کل نعیم نے مجھے بتایا کہ موپساں نے افسانہ میں لکھا ہے کہ ایک عورت پیسے کی خاطر اپنی ہی اولاد کو معذور کر کے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ روپے کی مالک بنتی چلی گئی ۔۔۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں یہ عورت دوسروں کے بچوں کو اپنی بھیک کی خاطر ۔۔۔"

وہ چیخی ۔۔۔ "اللہ ۔۔۔ نہیں نہیں بھلا کوئی اپنی اولاد کو کیسے دکھ پہنچا سکتا ہے ۔۔۔"

"پیسہ ۔۔۔ پیسہ سب کچھ ۔۔۔"

رعنا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔۔۔ "بس بس ۔۔۔ اور کچھ نہ کہو ۔۔۔"

آہستگی کے ساتھ اس نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا ۔۔۔ وہ شرما گئی ۔۔۔

اور ٹھیک پچیس روز کے بعد جب اس نے رعنا کا گھونگھٹ اٹھایا اور آنکھوں میں جھانکنا چاہا تو وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر رہ گئی ۔۔۔ سرخ سرخ کپڑوں میں وہ ایک گٹھڑی کی طرح پڑی ہوئی تھی اور وہ سر جھکائے ایک ہاتھ سینے پر رکھے کہنے لگا ۔۔۔ "بی بی آنکھیں کھولو ۔۔۔ میں ہوں تمہارا غلام !"

اور بی بی ہاتھوں میں مہندی رچائے لمبا سا گھونگھٹ نکالے آنکھیں لاج کے مارے بند کیے رہی ۔۔۔ رخصتی کے وقت بھابی نے کیسی شرارت کی تھی ۔۔۔ اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی: "اے رعنا رانی ذرا خیال رکھنا ۔۔۔ اتنی جلدی یہ روگ نہ لگے ۔۔۔ ویسے یہ روگ ہے بڑا پیارا ۔۔۔" وہ سرگوشی کر گئی تھی !

اور پھر جمیل کا مسکراتا ہوا چہرہ رضا کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا ——— وہ تو جیسے ایک نشہ میں کھویا ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ جوانی شراب اور دولت کا نشہ آدمی کو اپنے قابو میں رہنے نہیں دیتا مگر یہ اولاد کا نشہ کیسا زوردار اور دھڑ سے کا ہوتا ہے ——— کچھ جاننے نہ پہچاننے کچھ نہیں!

پھر لوگ انتہا کرتے ہیں جیسے جیل سے اسے انتہا کرنی پڑی ——— رضا کے لیے اس کی آغوش کیسی بےکل تھی کیسی خواب آور تھی جس میں سما کر پھر وہ مستقبل کے خواب دیکھنے لگی۔

دوسرے تیسرے روز وہ گھر گئی تو بھابی نے اسے بتایا کہ آج اخبار میں اسی عورت کے متعلق ایک خبر ہے ———

وہ چونک گئی۔ سنتے ہی اسے بیتابی ہو گئی ———

بھابی ہنسیں ——— تو اور سنو ——— ارے آج اخبار میں آیا ہے کہ پہلے کی تمام خبریں بے بنیاد اور افواہیں تھیں ———

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ لاہور جیسے شہر میں آج بھی لوگ ایسی ایسی عجیب افواہیں اڑاتے ہیں کہ جن کا نہ ہونا ہے نہ پیر!"

وہ کچھ سمجھ نہ سکی "یعنی کیا مطلب ہے؟"

بھابی ہنسنے لگی ——— اسے تو صرف اپنا شوہر یاد ہے تھا ——— ان دنوں جب وہ جنگی مشقوں میں حصہ لینے کے لیے گیا ہوا تھا تو کیسے رو رو کر اکیلے میں جان ہلکان کرتی تھی اور اب دیکھو کس بے پروائی کے ساتھ ہنس رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو بس ایک مذاق تھا ———

رضا کو بھابی پر غصہ آنے لگا ——— ہا ——— ہائے ——— بیچارے معذور بچے ——— جانے ان کا کیا حال ہوا ———

بھابی بولی "ارے تم نے بھلا اخبار کہاں دیکھی ہو گی ——— بچ بچا ایسے موقعوں پر دوسری تیسری باتوں کی کیا ———"

بات کاٹ کر وہ بولی "بھابی بتاؤ بھی نا ———؟"

"بھئی آج خبر میں آیا ہے کہ وہ عورت لائل پور میں زندہ سلامت آزادی کے ساتھ رہ رہی ہے بچے لیے بھیک مانگتی پھر رہی ہے اخبار کے خاص نامہ نگار نے اس سے ملاقات کی اور بچوں کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ میرے ہی بچے ہیں اور اخباروں میں جو خبریں چھپی تھیں انھیں سن کر میں ڈر گئی تھی اور کچھ دیر کے لیے روپوش ہو گئی تھی ——— اور ہاں رضا سائی ——— اس عورت نے کہا ہے کہ وہ مانا کے موسم کے توقع پر بچوں کو لے کر لاہور آئے گی اور پھر ———"

رضا سُن ہو کر رہ گئی ——— پھر بھابی نے کیا کہا اس نے کچھ سنا ہی نہیں ——— تو ہاں اس روز جمیل نے سچ ہی تو کہا تھا کہ یہ اتنی دور سے تو کیا ایک عورت کے بطن سے ——— نہیں ——— نہیں ———

میکے سے وہ واپس آئی تو اداس اداس رہی۔

پھر دن گزرنے لگے ——— پہاڑ کے سے دن ——— وہ زندگی کی ان راہوں پر آ پہنچی تھی جہاں چوراہے تھے ——— زندگی میں سے بہت سی نئی زندگیاں جنم لیتی تھیں ——— نئی راہیں نئے راستے ——— اور وہ درمیان میں کھڑی دل ہی مارے ڈر کے لرز رہی تھی کہ کہیں اس کے قدم سیدھی راہ پر جانے کی بجائے غلط راستے پر نہ پڑ جائیں ——— سڑک کی بجائے پگڈنڈیاں نہ اس کو اپنی جانب نہ کھینچ لیں۔

پھر ماہ گزرنے لگے ——— چاند ہر ماہ اپنی صورت بدلنے لگا ——— اس کا روپ بھی یوں گرگٹ کی مانند رنگ بدلنے لگا کہ سیل

پریشان ہو گیا۔ —— وہ منحوس نظروں سے اردگرد کے لوگوں کو دیکھتی، غیروں اور اجنبی صورتوں کو دیکھ کر گھبرا جاتی اسے یوں لگتا جیسے اس کے وجود میں کسی نے منوں بوجھ بھر دیا ہے اور وہ اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہی نہیں —— کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی روز وہ بیچ چوراہے کے آ گرے اور ٹکڑے ٹکڑے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں — اس کے اعضاء تن کر رہ گئے جیسے اس کے کندھوں، بازوؤں اور ہاتھوں میں پانی سے بھرے ہوئے کچے گھڑے دھرے ہوئے ہیں —— ذرا ہلی نہیں کہ وہ گرے اور پھوٹ —— پھر

صبح سویرے جب ہاکر اخبار کا نعرہ لگاتے ہوئے فرش پر تازہ پرچہ پھینک کر سائیکل پر سوار کوٹھی کے احاطے میں سے نکل جاتا تو وہ سُن سی ہو کر رہ جاتی۔ اخبار کا کاغذ فرش پر گرتے ہی ایک ایسی آواز پیدا کرتا جسے سُن کر اس کے تن بدن میں سے جان نکل سی جاتی۔

اور پھر وہ اپنی ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں بے بسی کے ساتھ اخبار سے ہٹا کر سہیل کی طرف دیکھتی اور سہیل کی شکل بدل کر کچھ اور ہی بن جاتی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی، منہ پر ہاتھ رکھ لیتی اور وہ چیخ جو حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی ہوتی اور بھی گھٹ کر رہ جاتی۔

سہیل ایسے میں اسے دلاسہ دیتا: "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اور وہ حیرت کے ساتھ اسے دیکھتی اور پھر اس کی نگاہیں اپنے سوکھے سوکھے ہاتھوں پر جا ٹھہرتیں اور وہ اپنے بدن کی رگ رگ اور نس نس سے پوچھتی —— "مجھے کیا ہو گیا ہے؟" اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ تب آنسو اس کی پریشان اور غمگین آنکھوں میں سے چھم چھم برستے مینہ کی مانند گرنے لگتے ——

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ داتا کے عرس والے روز بھابی اپنا مٹکے جیسا پیٹ لیے آن موجود ہوئی۔ "چلو گی عرس پر ——؟"

وہ کچھ نہ کہہ سکی، بس خوفزدہ نگاہوں سے بھابی کے پیٹ کو گھور کر رہ گئی ——

بھابی جیسے رازداری کے ساتھ بولی: "وہاں اسے دیکھیں گے —— اسی عورت کو ......"

اس کا دل چاہا کہ زور سے چیخیں مارے اور بھابی کے بال نوچ کر رکھ دے —— اس کے پیٹ کو پھاڑ ڈالے اور یہ جہان ایٹم کے ذرات بن کر فضا میں بکھرے اور تحلیل ہو جائے —— مگر وہ کچھ نہ کر سکی، بڑی بے قرار ہو کر اضطراری کیفیت کے ساتھ اس نے اپنا سر شانوں پر مارتے ہوئے کہا: "نہیں بھابی —— میری طبیعت ٹھیک نہیں!"

بھابی چلی گئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور اس روز صبح سویرے اخبار پڑھتے ہوئے سہیل نے اسے خبر پڑھ کر سنائی: "ارے دیکھا تم نے —— فرانس نے بھی ایٹم بم کا تجربہ کر ڈالا —— بھئی کامیاب تجربہ ......"

وہ چیخ اٹھی —— "سہیل!"

وہ گھبرا کر اخبار چھوڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا "کیا ہوا —— تجھے تو ہوا؟"

اس نے اپنے نچلے لب کو دانتوں سے کاٹ کاٹ لیا اور جواب میں کچھ نہ بولی —— اور اسی وقت بھابی کے ہاں سے نوکر نے یہ اطلاع آکر پہنچائی —— "بی بی کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔"

اس نے مدہوشی کے سے عالم میں یہ خبر سنی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے میکے میں وہ عورت اپنا ایک بچہ چھپا کر فرما

مانگ گئی ہو ——— اور وہ معذور بچہ روتا ہوا بتلا رہا ہے "فرانس! افرانس!" ہاں! ماں بچے کا وطن وہی ملک ہے!

اور اس کا بھائی اپنے بچے کو دیکھ کر حیران کھڑا ہے اور بھابی آنسوؤں میں اُنگلی بے خوشی سے بھرپور نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی جھلک ہے۔ خطبہ پڑھتی جا رہی ہے اور ماں باپ پر یہ کر لوگوں کی جیبوں کو ٹٹول رہی ہیں۔ جیبوں کے دھاگے بکھر رہے ہیں اور نوٹوں کی گڈیاں بکھری پڑی ہیں ———!

اسے کسی طرح سے یہ یقین نہ آیا کہ وہ بچہ صحیح سلامت حالت میں تھا۔

سہیل نے اس سے کہا کہ وہ اپنے بھتیجے کو دیکھنے چلے تو اس نے انکار کر دیا ——— اس کا شوہر بہت حیران ہوا اور زور دینے پر بھی جب وہ ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوئی تو اس کا سبب پوچھنے لگا مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ بھی کچھ یونہی سا دکھائی دینے لگا۔۔

اس کا شوہر اکیلا گیا اور سب سے معذرت کر دی کہ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ نہیں آ سکی۔ اس کی ممی اور ڈیڈی یہ سنتے ہی اسے دیکھنے آئے اور وہ بستر میں لیٹی جان بوجھ کر کروٹیں بدلنے لگی ———

پھر کچھ وقت اور گزرا ——— اور بہت کچھ اور ———

پھر اس روز وہ اکیلی گھر میں تھی۔ اس کی نوکرانی باورچی خانے میں باورچی سے میٹھی گفتگو میں مصروف۔ اسے متلی محسوس ہوئی اور اپنے کمرے میں آتے ہی وہ لیٹ گئی۔

جب زیادہ خراب ہونے لگا تو اس نے چاہا کہ آواز دے کر نصیبن کو باورچی خانے میں سے اپنے پاس بلا لے مگر اس کی آواز نہ نکل سکی ——— گھبرا کر اس نے اٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جیسے جواب دے دیا ——— جھنجھلا کر اس نے چاروں طرف دیکھا ——— وہ اکیلی تھی ——— اکیلی اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا ——— تنہا! نہ کوئی ساس نہ نند، ماں نہ باپ ——— نوکر نہ چاکر اور نہ ہی اس کا شوہر ——— وہ تو وقت جاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ جلدی آ جاؤں گا ——— چھٹی لے لوں گا ——— مگر ابھی تک وہ نہ آیا تھا اور باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی نصیبن اس کی حالت سے بے خبر تھی ———

وہ چونک گئی۔ اس نے دیکھا باہر کسی کی آواز آتی ہے ——— کوئی بھیک مانگ رہی ہے ——— اس نے بیٹھ کر سامنے کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ———

دہشت زدہ ہو کر وہ پلنگ پر جیسے ڈھے گئی ——— وہی عورت بڑھیا ——— بھیک مانگ رہی ہے ——— اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پیٹ میں کسی معذور بچے نے کروٹ لی ہے ——— وہ خود بھی تو اپنے پیٹ کی ریڑھی میں اپنے معذور بچے کو لیے بیٹھی ہے ——— ور ——— اب ——— اب!

وہ بھی اپنے بچے کو لے کر بازاروں میں پھرے گی ——— وہ بھیک مانگے گی ——— نہیں اسے بھیک مانگنے کی ضرورت کیا ہے؟ وہ بھیک نہیں مانگے گی وہ تو صرف اپنے بچے کی نمائش کرے گی ——— ایٹمی دور میں پیدا ہونے والا معذور بچہ ——— ہاتھ پیر سے محروم ——— گل گل کرتا گوشت کا ایک جاندار لوتھڑا ——— ایٹم کی اولاد ——— وہ اس کا بچہ نہیں!!

اسے شدت سے یہ محسوس ہونے لگا جیسے اس کے پیٹ میں اس کا بچہ نہیں، ہائیڈروجن کا ایک بگولا ہے جو ایک دم اس کے

پیٹ کو چاک کر کے فضا میں تحلیل ہو کر ساری دنیا میں زہر پھیلا دے گا —— زہر —— زہر!!

اور دیکھو! اسے ہر طرف آگ نظر آ رہی ہے۔ سیاہ دھواں فضا میں پھیل رہا ہے — وہ صحرا کے بیچ میں تنہا کھڑی ہے اور ایٹمی تجربے اس کی ذات پر کیے جا رہے ہیں —— وہ ایک قربان گاہ ہے اور کچھ نہیں —!

اور فضا میں شور مچ رہا ہے — دیکھو! لوگ امن کی علمبردار سفید فاختاؤں کا شکار کر رہے ہیں۔ یہ فاختائیں مر رہی ہیں — انھیں بچاؤ —— انھیں بچاؤ —! ورنہ دنیا کا امن تہ و بالا ہو جائے گا — پھر سکون کھو جائے گا —— جیسے اس کا سکون ختم ہو رہا ہے!

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچہ نہیں جن رہی بلکہ بستر مرگ میں وقت کو زندگی عطا کر رہی ہے — اس کی رگ رگ میں کسمساہٹ پیدا ہوئی اور آنکھیں پتھرانے لگیں — ہوا میں سفید فاختاؤں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ پیدا ہونے لگی — نہیں یہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ فاختاؤں کی نہیں یہ تو موت کے فرشتوں کے پروں کی صدا ہے۔ سارا آسمان سفید سفید فرشتوں کے سفید پروں سے بھر گیا ہے — ابابیل نہیں — یہ امن کی فاختائیں نہیں یہ تو موت سفیدی کا روپ دھار کر آئی ہے۔

اس کے بدن کے سارے حصوں میں درد نے اپنا گھر کر لیا اور تکلیف کے مارے اس نے اپنے دانت بھینچ بھینچ لیے۔ پھر اس نے جیسے آخری بار ایک لمبا سانس لیا اور خود کو سفید پروں والے فرشتے کے حوالے کر دیا — اور اس کا بدن خود بخود ڈھیلا ہو گیا —

اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے ادھر ادھر دیکھنا چاہا۔ مگر فضا میں جیسے فرانس کے ایٹم بم کے تجربے کا دھواں ابھی باقی تھا۔ اس دھوئیں کی چادر میں سے ہر چیز پھیکی پھیکی، مدھم مدھم تھی۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر سفید پروں والے فرشتے نے آہستہ سے جھک کر کہا: "اپنے بچے کو دیکھ لیجیے۔"

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں — سفید — سفید — ہر چیز سفید — اور سامنے نرس کھڑی تھی وہ کہہ رہی تھی۔ "بچے کو دیکھو......"

"نہیں — نہیں!" وہ درد بھری آواز میں چلائی "نہیں! میں اسے نہیں دیکھ سکتی — میں نہیں دیکھنا چاہتی۔"

اور اس نے آنکھیں زور سے بند کر کے دیوانوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

پریت کیے دُکھ ہوئے

صالحہ صدیق

سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ہم لوگ کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بار بار میرا دل بھر آ رہا تھا لیکن میں زبردستی ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بھی بہت اداس تھے۔ سیمی میری گود میں بیٹھی میرے آویزوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ میرے برابر میں آکر بیٹھ گئے۔ دروازہ بند کیا اور سیمی کو اپنی گود میں لے کر اسے پیار کرنے لگے۔ اتنا چوما کہ وہ چیخنے لگی: "ڈیڈی چھوڑیئے۔ ہم نہیں رہتے آپ کے ساتھ۔ ممی دیکھئے نا!"

میں خاموش رہی۔ بھائی جان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ ان کے برابر میں بھابی جان بیٹھی اپنے اسکارف کو درست کر کے باندھ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک کار ہمارے پھاٹک کے اندر داخل ہوئی۔ یہ اس وقت رات کے گیارہ بجے کون آیا تھا۔ بھائی جان نے کار روک لی۔ آنے والی گاڑی بھی رک چکی تھی اس کا دروازہ کھلا اور تیزی سے ایک شخص ہماری طرف لپکا۔ ارے یہ تو اپنا شہاب ہے۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "بھائی جان، بھابی جان یہ" اور پھر ہم سب حیران ہو گئے۔ پچھلی سیٹ پر وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور سیمی کو پیار سے چپت لگا کر بولا "تمہارے ڈیڈی تین سال کے لیے جرمنی جا رہے ہیں اور ہم انھیں چھوڑنے بھی نہ آتے۔ بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے۔"

اب مجھ سے آنسو ضبط نہ ہو سکے اور موٹے موٹے دو قطرے چھلک پڑے۔ وہ تو شکر ہے اندھیرا تھا۔ کوئی دیکھ نہ سکا۔ ائیرپورٹ پر شہاب نے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ ہمارے پاس رہے گا۔ "سیلوا اچھا ہے" میں نے سوچا کچھ تو دل بہلے گا۔ بلا کا شریر لڑکا ہے۔ یوں تو بھائی جان بھی میرے جانی ہیں مگر مجھے ان سے زیادہ اس چھوٹے بھیا پر پیار آتا ہے۔ اس کی ہنسانے والی باتیں، مسکراتا ہوا چہرہ اور کچھ بے شعور طریقے اور پھر ملازمت کے چکر میں سدا کا پردیسی۔ وہ ایک ہفتہ اس کی رونق میں آنکھ جھپکتے گزر گیا۔ چلتے وقت اس نے مجھے ایک بڑے سے ڈبے میں طرح طرح کے پینٹس (PAINTS) دیے اور بولا "آپا! تم اکیلی گھبراؤ گی۔ خالی وقت میں تصویریں بنایا کرو۔ تمہارے ہاتھ میں تو فن ہے ہی۔"

اس کے جانے کے بعد گھر بڑا سنسان ہو گیا۔ اوپر کی منزل میں بھائی جان اور بھابی جان رہا کرتے تھے۔ بے بی سارا دن بجلی میں رہتی۔ میرا کام تو بس یہ رہ گیا تھا کہ ان کے خطوں کا انتظار کرتی رہوں اور تصویریں بناتی رہوں۔ ایک دن شہاب کا خط آیا، لکھا تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں پر کوئٹہ چلنا چاہیے تاکہ برفباری دیکھی جائے۔ میں تو گھر میں پڑے پڑے اکتا ہی گئی تھی اس لیے سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوئی۔ بھائی جان اور بھابی جان بھی فوراً رضامند ہو گئے اور دو دن بعد ہی ہم تینوں اور بے بی ریل سے روانہ ہو گئے۔ بستی کے اسٹیشن سے شہاب بھی سفر میں شریک ہو گیا۔ بڑا ہی خوبصورت موسم تھا۔ سفر بہت ہی اچھا گذرا۔ کوئٹہ کے پلیٹ فارم پر جبکہ ہمارا سامان اتر رہا تھا، ایک صاحب آئے

اور بھائی جان سے لپٹ گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بڑے زور شور سے گلے مل رہے ہیں۔ ان کا سر بگلے کی طرح سفید تھا اور جسم ضرورت سے زیادہ موٹا۔ تعارف سے پتہ چلا کہ یہ بزرگ دور پرے کے ہمارے ماموں ہوتے ہیں اور برسوں سے یہیں رہتے ہیں۔ بولے "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے بچے (یعنی ہم) میرے ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہریں۔"

عجیب اتفاق تھا۔ بہت بحث کے بعد لاچار ان کی ماننی پڑی اور ساتھ ہو لیے لیکن ان کا گھر دیکھ کر ہم دونوں عورتیں تو بہت ہی خوش ہوئیں کیونکہ یہ گھر واقعی جنت کا نمونہ تھا۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے سرے پر یہ چھوٹا سا بنگلہ سبزہ اور رنگ برنگے پھولوں سے گھرا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس کے عقب میں ایک کمرہ تو بالکل ڈھلان پر کھلتا تھا۔ اس کے آگے پتلا سا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے سے ہی دو ستون بڑے شاعرانہ انداز سے گلے مل رہے تھے۔ یہاں سے دور دور تک بڑا اچھا نظارہ ہوتا تھا میں نے سوچا یہاں سے برفباری کا پورا مزا لوٹا جا سکتا ہے۔

ماموں جان کی دو لڑکیاں تھیں۔ پہاڑی حسن سے سرشار۔ ان کے نام رامش اور نازش تھے لیکن انھیں پیار میں رامی اور نازی کہا جاتا تھا۔ رامی نازی سے دو سال بڑی تھی۔ بھائی جان اگرچہ عمر میں ماموں جان سے کہیں چھوٹے تھے مگر شطرنج کے دونوں برابر کے شوقین نکلے۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر سارا سارا دن باغ کے کسی کونے میں بیٹھے کھیل میں محو رہتے۔ رامی اور نازی بڑی جلدی ہم سے گھل مل گئیں مگر مردوں کے سامنے خاص طور پر شہاب کی موجودگی میں وہ بہت کم بولتیں۔ مجھے ان کا یہ شرمیلا پن بڑا پیارا لگتا تھا۔ ان کو دیکھ دیکھ کر بھائی جان کے دل میں بھی دیورانی کے ارمان جاگ رہے تھے۔ میں سوچتی تھی کہ کیسے افسانوی طریقہ پر یہ ملاقات ہوتی ہے۔ اس کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ یوں ایکا ایکی [illegible] تصدق بھابی اتنی پیاری سی مل سکتی ہے مگر یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ان میں سے کون سی اپنے شہاب کے لیے زیادہ مناسب رہے گی۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ہم لوگ شام کی چائے پی رہے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کچھ ناموں کا ذکر تھا بھائی جان کو رامش نام زیادہ پسند تھا اور مجھے نازش۔ پتہ نہیں شہاب کو کیا سوجھی ایک دم بولا "مجھے تو رامش پسند ہے۔" اس کا مطلب نام سے تھا مگر وہ ایسا بے ڈھنگا جملہ بولا تھا کہ خود ہی سٹپٹا گیا اور کہنے لگا "وہ اس لیے کہ...... میرا مطلب ہے اس کے معنی بڑے اچھے ہیں...... یعنی رنگ۔" تیزی سے میں نے بات ٹالی۔ بھائی جان نے بھی موضوع بدلنے کے لیے جھٹ الٹے سیدھے معنے گنوانے شروع کر دیے مگر اتنی دیر میں رامی کا چہرہ پسینوں سے تر ہو چکا تھا۔ کسی لڑکی کا اتنا سرخ چہرہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کسی بہانے اٹھ کر چلی گئی۔ شہاب کی آنکھیں شرمندگی کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ بہت ہی بے تکا سا ماحول ہو گیا۔ اس کے بعد جتنی بار بھی میرا رامی سے سامنا ہوا مجھے یہی آواز گونجتی معلوم ہوئی کہ "مجھے تو رامش پسند ہے۔ مجھے تو رامی......"

ہماری واپسی کے دن قریب آ رہے تھے۔ برفباری زور شور سے ہو رہی تھی۔ پہلی جنوری کو نئے سال کی خوشی میں ماموں جان نے بڑی شاندار پارٹی دی۔ بہت سے لوگ آئے۔ ان میں کئی نوجوان رامی اور نازی کے امیدوار بھی تھے۔ اس دن ان دونوں بہنوں نے خلافِ عادت شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنی تھیں اور لپ سٹک بھی لگائی ہوئی تھی۔ کسی بات پر رامی کو بے بی پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ اس نے اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا لیکن جونہی بے بی کو گود سے اتارا میں نے دیکھا کہ رامی کے ہونٹوں کے نقوش بے بی کی پیشانی پر بن گئے ہیں اس نے بھی دیکھا اور شرمندہ سی ہو کر بولی "اوہ معاف کیجئے گا۔ میں نے بے بی کا منہ گندا کر دیا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ......"

"کوئی بات نہیں" میں نے جواب دیا۔

"چلو۔ بے بی تمہارا سنہ دکھاؤ ہیں" اس نے بہت کہا لیکن بے بی بالکل نہیں مانی۔ پارٹی اس وقت عروج پر تھی قہقہوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ ہم سب MUSICAL CHAIRS کھیلنے لگے۔ ایکدم مجھے خیال آیا کہ بے بی باہر چلی گئی ہے۔ اندھیرا ہو چلا تھا میرا دل دھڑکا کہ کہیں بچی گر گرا نہ جائے۔ میں اسے ڈھونڈتی ہوئی باہر دوڑی۔ دیکھا کہ ان دو ستونوں کے پاس شہاب اسے گود میں لیے کھڑے ہیں۔ میری جان میں جان آئی۔ پاس گئی تو ٹھٹک کر رہ گئی اور میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ شہاب بے بی کی پیشانی کا پیار لے رہے ہیں بالکل اسی جگہ جہاں وہ سرخ دھمکی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ میں اُلٹے پیروں وہاں سے لوٹ آئی۔ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ پورے دو ہفتے رہنے کے بعد۔ سردی زوروں سے پڑ رہی تھی۔ چلتے وقت نازی نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کے گھر کی تصویر بنا کر بھیجوں اور اس میں برفباری کا منظر دکھاؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ ضرور بناؤں گی۔ واپسی کا سفر اتنا اچھا نہ گذرا کیونکہ ایسے لگتا تھا جیسے شہاب اپنا تمام چلبلا پن برف کی تہوں میں کہیں چھپا آیا ہو۔ وہ بظاہر بڑا خوش تھا مگر اس کی ہنسی، اس کے مذاق سب مصنوعی تھے۔ پنڈی کے سٹیشن پر وہ اتر کر چلا گیا۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور اپنے کمرے میں جا کر تھوڑا سا رویا ہوگا۔ ہم گھر پہنچے تو دیکھا ان کا خط آیا رکھا ہے۔ میں نے جلدی سے اس کا جواب لکھا۔ گھر ٹھیک ٹھاک کرایا۔ بے بی کا سکول بھی کھلنے والا تھا۔ اس کے یونیفارم تیار کیے اور زندگی اپنے پرانے ڈھب پر چلنے لگی۔

ایک دن میں بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی کہ بے بی گاتی ہوئی اندر گھسی۔

ڈمرال ڈلاون ڈولن کی
ممانی اچھی صورت کی!

وہ ساتھ ساتھ تالیاں بجاتی جا رہی تھی۔ مجھے بڑی پیاری لگی۔ پاس بلا کر پوچھا "تمہاری اچھی صورت والی ممانی اس وقت کیا کر رہی ہیں؟" میرا مطلب بھابی جان سے تھا۔

وہ بولی "یہاں تھوڑی ہیں؟"
میں نے کہا "اوپر ہوں گی نا۔ تم اوپر ہی سے تو آ رہی ہو آخر"
بولی "واہ! وہ تو کوئٹے میں ہیں"۔

میں اچھل پڑی۔ یا اللہ یہ چار سال کی بچی نے کیسے کہہ دیا۔ کیا قدرت نے اتنی سی بچی کے دل میں بھی یہ بات ڈال دی یا یہ شہاب حرام خور کی شرارت ہے؟ بڑا پاجی لڑکا ہے۔ مجھے کوئٹے میں گذارے ہوئے وہ سب دن یاد آ گئے خاص طور پر وہ پارٹی والی شام۔ اس کے بعد مجھے نازی کی فرمائش یاد آئی۔ اس شام میں اس گھر کی تصویر بناتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔

دن گذرتے رہے۔ خزاں کے دن آ چلے تھے۔ پت جھڑ شروع ہو چکی تھی۔ شہاب کا خط کبھی کبھی آتا رہتا تھا البتہ ان کے خط بڑی پابندی سے مل رہے تھے۔ ستمبر ختم ہونے والا تھا۔ شاید ۲۹ تاریخ تھی۔ اس منحوس دن مجھے ایک خط ملا۔ یہ نہ ان کا تھا نہ شہاب کا۔ میں نے بیتابی سے کھولا۔ کوئٹے سے ماموں جان نے لکھا تھا کہ نازی کی کسی کیپٹن سے منگنی ہو رہی ہے۔ ہم سب کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ مجھ پر تو جیسے بجلی ہی آن گری۔ میں تڑپ ہی تو گئی۔ دوڑی دوڑی گئی۔ بھابی جان کو خط دکھایا۔ مسکرا کر بولیں "چلو تو کیا ہوا۔ دوسری بہن کیا کم ہے؟"

بلکہ چھوٹی زیادہ اچھی ہے۔" مجھے عمر میں پہلی دفعہ بھابی جان پر غصہ آگیا۔ مگر ان بیچاری کا کیا قصور۔ انھوں نے پارٹی والا واقعہ شاید ہی دیکھا تھا۔ نہ انھیں شہاب کے دل کی دھڑکن کبھی سنائی دی تھی اس لیے میں چپ رہی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ دل چاہا رو دوں مگر آنسو چھلکنے کے بجائے اندر کہیں گھٹ کے رہ گئے۔ ماموں جان نے یہ بھی لکھا تھا کہ انھوں نے الگ سے ایک دعوت نامہ شہاب کو بھی بھیج دیا ہے۔

اس کے بہت دنوں بعد تک شہاب کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں انتظار ہی کرتی رہی۔ دو مہینے بڑی خاموشی سے گذر گئے گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ میں نے شہاب کو لکھا کہ وہ چھٹیاں ہمارے ساتھ گذارے۔ اس کا جواب جو آیا تو میں سخت حیران ہوئی کیونکہ اس نے لکھا تھا کہ وہ اس سال بھی برفباری دیکھنا چاہتا ہے کوئٹہ جائے گا۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر میرا بالکل ارادہ نہیں تھا میں [illegible] سے ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن شہاب کے آگے کس کی چلتی ہے۔ وہ خود مجھے لینے آگیا اور بہت اصرار کیا تو میں مان گئی۔ بھائی جان اور بھابی جان پہلے ہی پی اور ایبٹ آباد کا پروگرام بنا چکے تھے اس لیے وہ ہمارے ساتھ اس بار نہیں گئے۔

پھر سے ایک سال بعد انھی تاریخوں میں ہم کوئٹہ پہنچے۔ ماموں جان نے بڑے جوش سے ہمارا استقبال کیا، بہت ہی خوش ہوئے۔ سٹیشن سے گھر تک کے راستہ میں یہی شکایتیں کرتے رہے کہ تم راحی کی منگنی پر کیوں نہیں آئے۔ مجھے راحی کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ صرف اپنے حجاب کی وجہ سے وہ شہاب کی محبت کا اعتراف نہ کرسکی ہوگی اور اب شہاب سے مل کر کہیں وہ تڑپ نہ جائے۔ کچھ یہی اندیشہ خود شہاب کو بھی تھا۔ ہم جب وہاں پہنچے اور ٹیلے پر چڑھ رہے تھے تو شہاب کی گردن جھکی ہوئی تھی شاید ذہنی خیالات کی وجہ سے۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ راحی اسے دیکھ کر کسی بہانے دوپٹہ کا پلو آنکھوں پر سے رگڑ ڈالے گی۔ اس کی مسکراہٹ میں غم کی جھلک ہوگی۔ اس کا لباس سادہ ہوگا۔ اس کی انگلی میں کوئی انگوٹھی نہ ہوگی...... کوئی نہیں...... خاص طور پر اسے وہ منگنی کی انگوٹھی تو سخت ناپسند ہوگی لیکن جب چڑھائی ختم ہوئی اور ہم ان سنتریوں کے پاس سے ہوکر برآمدے میں پہنچے تو وہاں دونوں بہنیں کھڑی تھیں۔ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ جس ستون سے راحی لگی کھڑی تھی اس پر سرخ پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ خود راحی نے سرخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کاجل کی جھکتی ہوئی دھار اس کی آنکھوں کی چمک کے سامنے ماند پڑی ہوئی تھی۔ اس کی تیسری انگلی میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ بڑے انداز سے اس نے دونوں ہاتھ اٹھایا اور مسکرا کر سلام کیا۔ کمزور دھوپ کی چمک میں انگوٹھی میں سے شعاعیں پھوٹیں۔ جب ہم اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو پتہ چلا کہ آج شام راحی کے منگیتر کی دعوت ہے۔ نازی نے کہا "چلیے آج ہم آپ کا ان سے بھی تعارف کرا دیں گے۔"

شام ہوئی تو شہاب چپکے سے کہیں نکل گیا۔ کیپٹن آیا۔ واقعی بڑا خوبصورت نوجوان تھا۔ بالکل راحی کی طرح، لیکن کسی بات میں شہاب کا پاسنگ بھی نہیں یا شاید یہ صرف میرا خیال تھا۔ شاید حسد کی دھیمی دھیمی آنچ میرے سینے میں بیدار ہو رہی تھی۔ راحی ساڑھی کے پلو سے سر ڈھانپے شرمائی ہوئی بیٹھی تھی۔ کیپٹن کے مذاق پر چپکے چپکے ہنس رہی تھی۔ کتنی خوش نظر آرہی تھی وہ۔ میرا دل چاہا اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھوں کیا اس کی روح بھی یونہی ہنس رہی ہے؟ کیا اسے واقعی کیپٹن بہت پسند آیا ہے یا یہ سب کو دھوکا دے رہی ہے۔ فریب دے رہی ہے اپنے آپ کو، اپنی بہن کو، کیپٹن کو، مجھ کو، شہاب کو، خود اپنے آپ کو! وہ جان بوجھ کر دھوکا کھا رہی ہے۔ اس کی روح بیتاب ہے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹے جا رہی ہے۔ وہ رونا چاہتی ہے مگر ہنس رہی ہے ——— کیوں؟ صرف اس لیے کہ اب عقلمندی کا تقاضا یہی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا مگر وہ جھکی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہا میں اسے جھنجھوڑ کر پوچھوں "کیا تم واقعی خوش ہو۔ بتاؤ، دیکھو تمھیں میری قسم سچ سچ بتا دو۔"

مگر میں بھابھی سے پوچھ نہ سکی کہ بھابھی آپ کو کیسی لگتی ہوں میں بھی۔ ہم تو کیپٹن کے لطیفوں پر بس ہنستی رہی۔ کیا رامی بھی میری طرح یونہی ہنس رہی ہے؟ مجھے یہی خیال تنگ کیے جاتا تھا۔ میرے ذہن پر رامی کے وہ سارے نقش ابھر رہے تھے۔ ایک بھرپور رامی کا غمگین سراپا۔۔۔۔ بیلا بکھرے ہوئے پریشان بال، سرمگیں سرخ سرخ روئی آنسو شاید خون کے ہیں کو کیپٹن پونچھ کر کہہ رہا ہو، افسوس ہے رامی ہند وہ۔ اس کے سیاہ لباس کو نازی نے فریج ڈالا ہوا اور زبردستی اس کو سرخ ساڑھی پہنا دی ہو۔ ماموں جان نے اس کی زلفیں سلجھا کر ان میں سرخ ربن ڈال دیا ہو اور اب وہ اسی لیے یوں بیٹھی ہنس رہی ہے اس نے آنسوؤں کو دفن کر دیا ہو، سیاہ لباس کو جلا دیا ہو۔۔۔۔ اور پھر آپ ہی آپ میرے ذہن پر رامی کا روتا سراپا ڈوبنے لگتا ——— بے وفا اور خودغرض رامی کا جس کو محبت نہیں شوہر کی تلاش ہو۔

میں کھوئی کھوئی ان دونوں تصویروں کو دیکھ رہی تھی مگر باوجود کوشش کے باوجود یہ نہ پہچان سکی کہ ان میں سے کون سی رامی میرے سامنے سرخ ملبوس میں کیپٹن کے لطیفوں پر ہنس رہی ہے۔ میں نہ پہچان سکی، بالکل نہیں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں آنکھیں پھاڑے رامی کو گھور رہی ہوں۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ رامی ایک معمہ تھی۔ مجھے اب معلوم ہوا کھانے پر شہاب کو نہ پا کر ماموں جان نے شور مچایا کہ "بلاؤ اسے کہاں چلا گیا ہے۔" نازی بولی "باہر گئے ہیں شاید۔" رامی نے کہا "نہیں، وہاں ستونوں کے پاس بیٹھے ہیں، میں نے دیکھا تھا۔" کیپٹن طنزیہ مسکراہٹ چھپانے لگا۔ میری جان ہی تو جل گئی۔ شکر ہے رامی مسکرا نہیں رہی تھی نہیں تو میرا پارہ ضرور چڑھ جاتا اور جانے میں کیا بک جھک دیتی۔ ماموں جان بولے "وہاں کیا کیا کر رہا ہے؟" میں نے جلدی سے جواب دیا "وقت ہی کچھ اتنا خوبصورت ہے۔" میری بات کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ نازی ڈوبتے ہوئے سورج اور سرخ آسمان کو دیکھ کر بس ذرا سا مسکرا دی۔ بیوقوف!

تھوڑی دیر بعد شہاب آ گیا۔ اُف خدا! اس کا بے اداس چہرہ کہیں سارا بھانڈا ہی نہ پھوڑ دے۔ میں تو ڈر ہی گئی۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا۔ وہ بہت ہی خاموش تھا۔ اتنی شدت کا اداس میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی ذرا سے اس کی پلکوں کو اگر چھو لے گا تو ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگ جائیں گے۔ اس کی شکل بڑی کھسیانی ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ وقت گذرا اور جب دوسری صبح طلوع ہوئی تو میں حیران ہی رہ گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔ شہاب کی آنکھیں اگرچہ رات بھر جاگنے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں مگر وہ اب رات والا شہاب نہ رہا تھا۔ وہ رات بھر میں بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اپنی پرانی عادتوں پر لوٹ آیا تھا۔ بات بات پر اس کی وہی چہلیں تھیں۔ گھر میں وہی اودھم بازی پھر سے شروع ہو گئی۔ "کس قسم کا انسان ہے یہ" میں سوچتی رہی۔ رات بھر میں اس نے جانے کیا سوچا کیا سمجھا ——— اس کی باتوں میں یہ پہلے جیسی مٹھاس کہاں سے آ گئی! اس کے قہقہوں میں کس چیز کی جھنکار سمٹ آئی ہے۔ وہ کیوں اتنا خوش دکھائی دے رہا ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہا کہ اس کی رامی کی کیپٹن سے منگنی ہو گئی ہے؟ کیا اسے اب اس کا رنج نہیں؟ کیا پہلی محبت آخری نہیں ہوتی؟ آخر باتوں ہی باتوں میں میرے منہ سے نکل گیا "شہاب آخر تمھیں آج ہو کیا گیا ہے؟ کیا رات کوئی خواب دیکھ لیا جس کے نتیجہ میں تمھارے جسم میں پر لگ گئے؟"

بولا "خواب؟ نہیں تو۔ خواب تو میں دکھاؤں گا اب۔"

میرے منہ سے بیساختہ نکلا "کس کو؟" اس نے پہلے رامی اور پھر نازی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں جھک گئیں۔ جانے کیوں؟ میں کچھ بھی کچھ نہیں سمجھی۔ بس اتنا ضرور دیکھا کہ نازی کی نگاہوں میں عین اسی وقت خلوص کی دھیمی دھیمی خوشبوئیں پھوٹنے لگیں۔ وہ کچھ ایسی لڑکی لگی جو مذہب کو نہ جانتے ہوئے بھی عبادت کر کے خوش ہونا چاہتی ہو۔ شہاب نے میرے سوال کا مختصر سا جواب دیا "دیکھنے والے دیکھیں گے۔"

کیا مطلب ہوا اس کا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔

شہاب کا موڈ اس شام ایسا تھا کہ وہ بے بات کے بھی ہنسے جا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح بے اختیار ہنس رہا تھا۔ سب گانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ بہت اصرار پر وہ مانا اور پھر اس نے ایک غزل سنائی۔ یہ غزل میں شاید کبھی نہ بھول سکوں گی۔ "پریت کیے دکھ ہوئے" میرا تو وہم بھی نہ تھا کہ ایسے اچھے موڈ میں وہ یہ غزل سنائے گا لیکن جب اس نے گانا شروع کیا تو ایسا لگا کہ دنیا جہان کا درد سمٹ کر اس کے گلے میں آ گیا ہے۔ سوز سے اس کی آواز بھاری ہوئی جاتی تھی [illegible] خاموش تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا [illegible] کر دوں کہ "یہ غزل مت گاؤ شہاب! خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔ بس کرو شہاب اب چپ ہو جاؤ۔" مگر [illegible] دیکھ کر میں خاموش رہی۔ وہ کھویا ہوا تھا اور گا رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر یہ [illegible] گاتا۔ تو اس کے دل کے تمام آنسو منہ عام پر آ جاتے [illegible] ان آنسوؤں کو چھپانے ہی کے لیے تو وہ [illegible] اتنا خوش بنا ہوا تھا۔ اس نے ٹھان لیا [illegible] ان آنسوؤں کو چھپائے رکھے گا۔ کسی کو خبر نہیں ہونے دے گا [illegible] آنکھوں کے پیچھے [illegible] تھا [illegible] جذباتی ہونے لگا۔ وہ بہت [illegible] میرا دل [illegible] اس کے ذہن سے غزل کے الفاظ [illegible] پاگل [illegible]

[illegible]

[illegible]

اس شعر پر وہ [illegible] احساس [illegible] پہنچ گیا ہے۔ وہ نازی کی [illegible] دیکھنے [illegible] رہے تھے۔ شہاب اب سنبھل چکا تھا۔ بولا:

"آپا! اللہ نے نازی کی [illegible] ہیں۔ وہ [illegible]"

میں نے جواب دیا "لڑکی [illegible]"

شہاب بولا "کوئی بات نہیں نازی [illegible]"

دیکھنے لگی۔ ماں نے کن سے تاثرات چھپانے کے لیے [illegible]

دوسری شام بے وجہ ہی اداسی پھیلی جا رہی تھی۔ [illegible]

چلئے سب پکچر دیکھنے چلتے ہیں۔"

میں نے جان کر بہانہ بنا دیا [illegible] تھی [illegible]

واقعی اس کے [illegible] نازی اور شہاب [illegible]

لگ رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا [illegible]

دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

دوسرے دن ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ میں نے [illegible]

دونوں جیت رہے تھے اور خوش بھی تھے۔ اتنے میں بے بی کہیں سے روتی ہوئی آگئی۔ بے وجہ روئے جاتی تھی۔ میں نے بہت پیار کیا مگر وہ روئے چلی گئی۔ آخر میں نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا "خبردار جو ایک آنسو بھی اب ٹپکا" مگر یہ سن کر وہ اور بھی رونے لگی۔

شہاب بولا "آپا! آنسو بہانا آسان کام ہے ان کا پینا مشکل"

میں نے چونک کر شہاب کی طرف دیکھا۔

تیسرے دن ہم لوگ ٹہلنے گئے ہوئے تھے۔ سامی نازی شہاب اور میں۔ ایک دکان پر ایک مرغ ٹائی دیکھ کر شہاب نے کہا "نازی یہ ٹائی مجھے دلوا دو" نازی نے بغیر جواب دیے پرس کھولا اور ٹائی دلوا دی۔ اگلی دکان سے اس نے ایک چھلا خریدا اور نازی کو دے کر بولا "یہ تم رکھ لو [illegible] نا بابا میں احسان کسی کا نہیں لیتا"

مجھے شہاب کی اس بھولی بھالی بات پر بہت ہنسی آئی۔ پگلا کہیں کا۔ لو اور سنو۔ بھلا یہ تو دیکھو کون چھلا دینے کا۔ ارے چپکے ہی [illegible] نے رامی اور میرے سامنے ایسا عہد کر کیوں کیا ——

[illegible] ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ رخصت کے وقت نازی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور جب ٹرین [illegible] رو رہا تھا۔ میں نے پیار سے پوچھا "کیوں رو رہے ہو شہاب؟" مگر وہ خود ہی بولا "تم نے شیشی [illegible] ہی دی ہوئی ساڑھی پہن رکھی تھی آپا!"

[illegible] نے جواب دیا۔

[illegible] اسے دلوائی تھی اور آپا وہ چھلا بھی تو [illegible] اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔

[illegible] نے دیکھا تھا [illegible] اس کے جوڑے میں تمہارے پسندیدہ پھولوں کا گجرا بھی تو تھا" خوشی سے [illegible] علاج آسان [illegible] وہ رو کیوں رہا ہے۔ شاید جدائی کا رنج ہو گا۔ خیر اب میں کچھ [illegible] نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے [illegible] شہاب اسے سارا بہت خیال [illegible] جانے پر کبھی [illegible]

[illegible] ہو رہے ہیں بلکہ [illegible]

[illegible] تھے۔ میں [illegible]

[illegible] کیا [illegible] نے بہت منہ پر طمانچہ مار کر مجھے [illegible] سے دھکا [illegible]

[illegible]

[illegible] وہ دھیمے [illegible]

میرا دل چاہا میں اس کے بال نوچ لوں، اس کا چہرہ لہولہان کر دوں۔ "ظالم مرد!" مگر جب میری اس سے نگاہیں ٹکرائیں میں پگھل گئی اور صرف اتنا کہہ سکی۔

"شہاب! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے بہت بُرا کیا، بہت بُرا کیا۔ سوچو تو نازی پر کیا بیتے گی ——— تم نے رامی ہی نہیں نازی کو بھی دھوکہ دیا ہے۔ نازی بیچاری کا کیا قصور؟ یہ ناٹک کھیلنے کی ضرورت ہی کیا تھی شہاب۔ آخر کچھ تو سوچو......"

بولا "تو پھر میں اور کیا کرتا؟" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ میں اسے بچوں کی طرح سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔ واقعی ٹھیک ہی تو کہتا تھا وہ۔ "تو پھر میں اور کیا کرتا؟ تو پھر میں اور کیا کرتا؟" مجھے ایسا لگا ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ میں کوئی گا رہا ہے "پریت کیسے دکھ ہوئے" کیا یہ شہاب گا رہا تھا؟ کیا یہ رامی گا رہی تھی؟ یا کیا یہ نازی گا رہی تھی؟

آپا

محمد طفیل

میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ ایک تانگہ آ کر رُکا۔ اُس پر سے ملازم اُتر کر آیا اور پوچھا "طفیل صاحب ہیں؟"

دفتر کے منتظم نے جواب دیا "ہیں"

ملازم نے جا کر تانگے میں بیٹھی ہوئی خواتین سے کہا "ہیں"

ان میں سے ایک صاحبہ نے کہا "بلاؤ"

ملازم نے آ کر کہا "بی بی بلاتی ہیں"

میں نے کہا "عرض کر دیجئے۔ خود ہی تشریف لائیں"

چنانچہ تانگہ پر سے دو مسمات اُتریں۔ ایک برقعہ میں تھیں اور ایک بغیر برقعہ کے، بے پردہ خاتون نے تعارف کرایا "یہ شکیلہ ہیں"۔ "آپا" ____ اور بڑی حیرت سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ حالانکہ پردہ دار خاتون سے مصافحہ کرنا عجیب لگا۔ مگر میں نہ جانے یوں کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔

شکیلہ نے تعارف کرایا "یہ شہلا کی سہیلی رضیہ ہیں"

شکیلہ کون ہیں۔ پہلے یہ بتا دوں۔ پھر آگے چلوں ____ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں اور مشہور افسانہ نویس! برسوں سے مراسم تھے مگر آمنا سامنا پہلی بار ہوا۔

اب شکوے! "آپ وقت مقررہ پر پاکستان کیوں نہیں پہنچیں؟ جو تاریخ آپ نے لکھی تھی۔ اُس دن میں اسٹیشن پر گیا تھا۔ تاکہ کسٹم وسٹم کے چکر میں، آپ کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑے۔ مگر آپ نہ آئیں۔ آج آئیں بھی تو بغیر اطلاع کے"

"میں چاہتی تھی کہ بغیر اطلاع کے پہنچوں"

"آخر کیوں؟"

"اچانک ملاقات پر زیادہ خوشی ہوتی ہے نا!"

"ہوتی ہوگی" ____ یہ تھا شکیلہ کی سادگی کا پہلا وار جو خطا گیا۔ میں نے سوچا اگر شکیلہ مجھے بتا کر آتیں۔ اسٹیشن پہ ملتیں تو شاید بھائی بھی اپنی بہن سے ملنے کا حق ادا کر سکتا۔ مگر اُس وقت میں چپ ہی رہ گیا۔

رضیہ کہنے لگیں "ہم آپ کا مکان ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے تھک گئی ہیں۔ صبح سے ڈھونڈھ رہی ہیں۔ گڑھی شاہو کا ایک ایک کونہ چھان مارا ہے۔"

"ٹیلیفون کر لیا ہوتا۔"

"وہ بھی کیا تھا۔ کوئی صاحب بولے تھے۔ طفیل صاحب ابھی آئے ہی نہیں' رہتے وہیں ہیں۔ جہاں سے آپ بول رہی ہیں۔ ——— مجبوراً دفتر آئی ہیں۔"

"اچھا تو پھر چلئے گھر۔"

چنانچہ ہم اُسی تانگہ پر گھر کی طرف چلے۔ راستے میں شکیلہ نے بتایا۔ رضیہ کہتی تھیں۔ تمہارا بھائی فراڈ ہے۔ گھر کا جو پتہ بتایا وہاں تو وہ رہتے نہیں۔ اس لیے واپس چلو۔"

میں نے ہنس کر کہا "رضیہ کا اندازہ غلط نہیں۔"

گھر کے پاس آکر میں نے تانگہ رکوایا تو رضیہ اور شکیلہ کے منہ سے مارے حیرت کے ایک ساتھ نکلا "ارے۔"

"کیا بات ہے؟"

"یہیں کھڑے ہو کر ہم نے آپ کا پوچھا تھا۔ مگر کسی نے بتایا ہی نہیں۔ یہ جو آپ کے مکان کی بغل میں ڈاکٹر صاحب ہیں۔ یہ تو کہتے تھے "طفیل صاحب موچی دروازے میں رہتے ہیں۔"

"اچھا۔"

"جی ہاں۔"

"قصہ یہ ہے۔ میں کسی سے بولتا نہیں ہوں۔ شام آیا۔ صبح چلا گیا۔ یہ سب لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں۔ مگر کسی کو یہ معلوم نہیں۔ میں کون ہوں۔ کیا کرتا ہوں۔ کیا نام ہے۔"

شکیلہ نے کہا "آپ نے اپنے نام کی تختی ہی لگائی ہوتی۔"

"یہ سمجھ کے نہیں لگائی۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔"

"شان ٹپکتی ہے تو ٹپکے۔ ہم ایسے لوگوں کا تو بُرا حال نہ ہو۔"

سامان اُوپر آیا۔ شکیلہ نے ایکدم گھوم کر سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ بڑی اترا کر رضیہ سے کہہ رہی تھیں۔ میرے بھائی کے پاس دو ریڈیو سیٹ ہیں۔ دو صوفہ سیٹ ہیں۔ یہ دیکھ الماری کتنی خوبصورت ہے۔ تصویریں دیکھو کتنی شاندار ہیں۔ غالباً یہ چغتائی کی ہے۔ غرض شکیلہ رضیہ سے بڑی شان میں باتیں کر رہی تھیں کہ میرا بھائی یہ ہے اور میرا بھائی وہ ہے اور وہ میں نہ مانوں۔ میں نہ مانوں کی تفسیر بنی شکیلہ کو چھیڑ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا۔ شکیلہ میں اتنی معصومیت ہے کہ بالکل پگلی معلوم ہوتی ہے۔

شکیلہ بڑی گپ باز ہیں۔ اتنی کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی گپ باز خاتون کوئی نہیں دیکھی۔ مردوں میں بھی کوئی نہ دیکھا۔ یہ گھنٹوں ہی بول سکتی ہیں۔ ایک بات ماننی پڑتی ہے کہ ان کی باتیں بور قسم کی نہیں ہوتیں۔ بھلاوے ہی بھلاوے ہوتی ہیں جس میں خلوص' معصومیت اور بیوقوفی سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اگر خلوص، معصومیت اور بیوقوفی (وہ آدمی شریف ہی نہیں جو بقدر ضرورت بیوقوف نہ ہو) میں سے ایک چیز

بھی کم ہوتی تو شکیلہ کی باتوں میں اتنی دل کشی نہ ہوتی جو مرہ سے اپنا بنا لے۔

ایسا بھی ہوا کہ شکیلہ بول رہی ہیں (اپنی تینوں خصوصیات سمیت) اور بولتی چلی جا رہی ہیں، اور میں حسبِ عادت کہیں اور پہنچا ہوا ہوں۔ جھنجھلا کر شکیلہ پوچھتیں "بھئی کہاں ہو؟"

"یہیں ہوں۔"

"میں بھلا کیا کہہ رہی تھی؟"

"بس یہی کہ کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"میری باتیں غور سے سنو۔ روز روز میرا تمہارے پاس آنا نہ ہوگا۔ میں تمہیں دیکھنے کے لیے اتنی دور سے آئی ہوں اور تم ہو کہ ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے ہو۔ کیا میری باتیں تمہیں ناپسند ہیں؟"

"نہیں آپا نہیں۔ بالکل نہیں۔"

ایک بار انھوں نے میری اس حرکت پر، اپنی باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میں پریشان ہو گیا اپنی انا کی خاطر، شکیلہ سے کچھ نہ کہا۔ مگر مجھے محسوس ہوا۔ جیسے روح کی تسکین کے سارے دروازے بند ہو گئے ہوں۔

ایک صبح میں شیو کر رہا تھا کہ باورچی خانہ میں شکیلہ کی باتیں سنیں۔ عجیب باتیں تھیں وہ، میری بیوی سے کہہ رہی تھیں "چوری میں بڑا مزا ہے۔"

"ہوگا۔ میں اس مزے سے ناآشنا ہوں۔"

"ہائے ہائے بڑے مزے ہیں۔"

"اچھا۔"

"تو بھی چوری کیا کر۔"

"جب مجھے خود ہی سب کچھ مل جاتا ہے تو میں کیوں چوری کروں۔"

"خاوند ہزار روپیہ اپنے ہاتھ سے دے دے مگر اس کی ایک اکنی چرانے میں، ہزار روپوں سے زیادہ کا لطف ہے۔"

"یہ بات ہے تو میں بھی چرایا کروں گی۔"

"ہاں ہاں ضرور!"

"اختر صاحب کو میری چوریوں کا سب علم ہے۔ وہ مجھ سے چھپا چھپا کے روپے رکھتے ہیں۔ تنخواہ لا کر تو مجھی کو دیتے ہیں۔ البتہ کتابوں کی رائلٹی یا امتحانوں کے پرچوں سے جتنا روپیہ آتا ہے۔ اُسے مجھ سے چھپا کر رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا۔ انھوں نے روپے رکھے ہم نے موقع پا کر چرا لیے۔ گھر میں شور مچ گیا۔ میرے روپے کس نے چرائے ہیں۔ میں انجان سی بن کر کہتی "پتہ نہیں کس کم بخت نے چرائے ہیں۔"

ایک بار اختر صاحب کو پرچوں کی جانچ کا روپیہ آیا۔ فوراً ہی ان کے باہر جانے کا پروگرام بن گیا۔ انھوں نے نوٹ گن کر لفافے میں رکھ دیئے اور لفافے کے اوپر لکھ دیا کہ اتنے روپے رکھے ہیں اور تالا بند کر کے چابی ساتھ لے گئے۔

میں نے ان کے جانے کے بعد، تالے کو چابی لگوائی۔ دس دس کے تین نوٹ نکال مزے کرتی رہی۔ اختر صاحب واپس آئے

تو پھر شور مچ گیا۔ روپے کس نے چرائے ہیں۔ ہم نے حسبِ عادت کہہ دیا۔ "میں کیا خبر، آپ ہی بھول گئے ہوں گے"۔
کہنے لگے "تو روز کہہ دیتی ہے کہ میں بھول جاتا ہوں۔ اب کے تو میں لفافے پہ لکھ کے گیا تھا کہ اتنے روپے ہیں۔ اب کے کیسے بھول گیا"۔

شامتِ اعمال میری ننھی بھانجی آ نکلی۔ اختر صاحب نے اس سے بھی پوچھا۔ میں سمجھتی تھی۔ یہ ذرا سی بچی ہے۔ اسے کیا خبر، مگر صاحب اُس نے توتلی زبان میں، میری طرف اشارہ کر کے بتا ہی دیا "ماسی نے چرائے ہیں"۔

اتنی ہی باتیں ہو پائی تھیں کہ میں شبد کر کے باورچی خانہ میں گیا اور پوچھا "کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

دونوں ہنس پڑیں، اور ہنستی ہی چلی گئیں۔

شکیلہ کا اپنا کوئی بچہ نہیں۔ اولاد کے غم نے بے چاری کو نڈھال کر رکھا ہے۔ بات بات پر رو دیتی ہیں۔ شکیلہ اپنی ذات میں اگر ایک طرف دلچسپیوں کا مرقع ہیں تو دوسری طرف غموں کی پوٹ بھی، آزردہ خاطری کی کوئی ذرا سی بھی بات ہو جائے تو پھر چھم چھم ہی چھم۔

شکیلہ اپنی زندگی سے بڑی بے زار ہیں اور ساتھ ہی اتنی بے احتیاط کہ مصیبتوں کو خود دعوت دیتی ہیں۔ دکھ ہی دکھ جو جھیلے خالی نہیں۔ ذہنی دکھ، شادی کے فوراً بعد اختر صاحب بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری بھی مہلک۔ اختر صاحب ہسپتال داخل ہوئے تو یہ بھی چوبیس گھنٹے وہاں موجود، ڈاکٹر منع کرتے تھے۔ مگر یہ نہ مانتی تھیں۔ کہتی تھیں، شوہر کے بعد، خود جی کر کیا کروں گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ختم کرنے کی ایک ترکیب سوچی، وہ یہ کہ پاس کی وارڈ میں جو سب سے خطرناک مریضہ تھیں۔ اُن کی تیمار داری میں دن رات جُتی رہتیں۔ اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیتیں، ساتھ لیٹ جاتیں۔ مریضہ حیران کہ لوگ مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔ مگر یہ ہیں کہ یوں مجھ پہ قربان ہیں۔ بات ہی عجیب تھی کہ موت کے کنارے کھڑے ہونے والے لوگ صحت کو ترس رہے تھے اور جو صحت مند تھے۔ وہ موت چاہتے تھے۔

شکیلہ کو پھولوں کا بے حد شوق ہے۔ انھوں نے گھر پہ طرح طرح کے پھول لگا رکھے ہیں۔ دن رات ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں اور خوش رہتی ہیں۔ انھیں اس حد تک پھول خولیا ہے کہ اختر صاحب سے بھی بھڑ جاتی ہیں۔ وہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ کسی بھی چیز سے اتنا پیار اچھا نہیں ہو سکتا۔

ایک دن ہم لارنس گارڈن گئے۔ بہار کے دن، پھول اپنے جوبن پر، شکیلہ انھیں دیکھ کر کھل اٹھیں۔ باغ کی اور پھولوں کی بہت تعریف کرتی رہیں چھوڑے جا رہی تھیں۔ ایک جگہ رُک کر پوچھنے لگیں "طفیل اس پھول کا نام بتاؤ!"

"مجھے کیا معلوم"

"اس کا یہ نام ہے"

"بھلا اس کا؟"

"بھئی مجھے کچھ پتہ نہیں"

"اچھا تو جناب نرے ایڈیٹر ہی ہیں"

"جتنی دیر ہم باغ میں رہے۔ شکیلہ نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول ہمارے ہاں بھی ہیں۔ ان پھولوں کی خوشبو بڑی اچھی ہوتی ہے۔ یہ پھول بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ پھول بہت کم ہوتے ہیں —— اخاہ یہ پھول کتنے خوبصورت

ہیں۔ بھئی واہ وا!

پھلوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ جتنے دن یہ ہمارے ہاں رہیں میں پھل منگواتا رہا۔ یہ انھیں ہاتھ ہی نہ لگاتیں۔ میں انھیں کہتا۔ یہ کھائیے۔ او ہنھ —— یہ کھائیے۔ او ہنھ —— ایک دن میں نے عاجز آ کر کہا۔ اچھا کل میں آپ کے لیے او ہنھ پھل ہی لاؤں گا۔ اس پر بے اختیار ہنسیں مگر پھلوں کو ہاتھ نہ لگایا۔

میں نے پوچھا "آپ کو کوئی بھی پھل پسند نہیں؟"

"ہے تو"

"کون سا؟"

"کھیرے ککڑیاں"

میں اتنے زور سے ہنسا کہ میرے پھیپھڑوں کو سال بھر کی ورزش ہو گئی۔

"بھئی ہنسے کیوں جا رہے ہو؟"

"جسے آپ پھل کہہ رہی ہیں، وہ تو ترکاریاں ہیں"

"اچھا"

اچھا سے ایک بات یاد آئی۔ شکیلہ کا تکیہ کلام "سمجھا" اور "اچھا" ہے۔ سمجھا زیادہ، اچھا کم، یہ بات ذہن میں رکھیں کہ بھاری لفظ کو بڑا کھینچ کے بولتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شبہ ہوتا ہے جیسے یہ ترنم میں کچھ کہہ رہی ہوں۔

اب آپ اُن کی گفتگو سنیں:-

"سمجھا (سمجھا) صبح اٹھی تو طبیعت خراب تھی سمجھا۔ تھوڑی سی چائے پی سمجھا۔ دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ سمجھا"

اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ سنئے۔ جب یہ کسی کی گفتگو سنتی ہیں تو یوں ساتھ دیتی ہیں "اچھا" ے لفظ کو خوب کھینچ کے پڑھیے گا۔ "اچھا" صرف ان کا ہوتا ہے۔ باقی سب مخاطب کا۔

"میں صبح دفتر گیا۔ اچھا —— دیکھا تو فلاں دوست بیٹھا ہے۔ اچھا —— اس نے کہا بھئی ہمارا یہ کام جل کے کرا دو۔ اچھا ——"

جب یہ خود بول رہی ہوں تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ وہ بیچ میں بول سکے (کم از کم میری تو مجال نہیں) جب کوئی دوسرا بول رہا ہو۔ پھر بھی کسی کی مجال نہیں کہ وہ ہر فقرے کے بعد "اچھا" سنے بغیر آگے بڑھ سکے۔ انھیں باتیں سننے کا شوق ہے۔ باتیں کرنے کا شوق ہے۔ سنانے کا زیادہ، سننے کا کم، ادھر میں ایسا بدھو نہ سننے کا شوق، نہ سنانے کا۔ میرا خیال ہے شکیلہ مجھ سے مل کر قطعاً خوش نہ ہوئی ہوں گی۔

ایک رات میرے چھوٹے بھائی کو یہ سوجھی کہ کل شکیلہ آپا چلی جائیں گی۔ اس لیے آج کی رات جاگ کر کاٹی جائے۔ پہلے بھی رات کو گیارہ بارہ بجے تک باتوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس لیے میں نے ناک چڑھا دی۔

بھائی نے کہا "تاش کا پروگرام رہے"

شکیلہ بولیں "سمجھا! طفیل آج تاش ہو گی"

"مجھے نہیں آتی" دیپر شکیلہ ہی کے انداز میں سر کے ساتھ، "ہم بھی"

بہرحال دھر لیے گئے۔ بڑی بہن تھیں (شکیلہ مجھ سے سات برس بڑی ہیں) انکار نہ ہو سکا۔ بیٹھ گئے۔ میں اور میرا بھائی پارٹنر، شکیلہ اور میری بھابی پارٹنر، خوب خوب ہاتھ ہوئے۔ شکیلہ کو یہ گھمنڈ تھا، میں عمدہ کھیلنے والی ہوں۔ اس لیے میرے مقابلے میں کوئی کیا جیتے گا۔ ادھر اپنی قسمت میں، کسی بھی معاملے میں، خدا نے ہار لکھی ہی نہیں۔ اس لیے مات ہوتی تو کیسے ہوتی۔

شکیلہ اور میری بھابی کا پسینے پسینے بُرا حال ہو گیا۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ نیند نے اپنی کارستانی زوروں پر شروع کر دی۔ میں جماہیوں پر جماہیاں لے رہا تھا۔ مگر ان پیٹنے والی، اللہ کی بندیوں نے، مجھ پر ترس نہ کھایا۔ مجبور ہو کر میں نے بیگم کو آواز دی۔

"اے نیک بخت! چائے بنا کر پلا دے"

"میں نہیں اٹھ سکتی"

"اری اُٹھ جا، جنت میں مکان ملے گا"

"مجھے نہیں چاہیئے۔ جنت میں مکان!"

"یہ دیکھو سو روپیہ، بطور انعام لے لے، اگر اس وقت اٹھ کر چائے بنا دے"

"مجھے نہیں چاہیئے سو روپیہ"

شکیلہ بولیں۔ اری کم بخت سو روپیہ مل رہا ہے۔ اٹھ کر جلدی سے چائے بنا دے۔ اگر طفیل مجھ دس روپے دینے کا وعدہ کرے تو ابھی اٹھ کر چائے بنا دوں"

خیر چائے نہ دس روپے لینے والی نے بنائی، نہ سو روپیہ پانے والی نے، ہم کھیلتے رہے اور صبح تک کھیلتے رہے۔

شکیلہ کو کھانے پینے کی چیزوں سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ ہزار نعمتیں ان کے سامنے رکھ دیجئے، قطعاً لطف اندوز نہ ہوں گی۔ کھائیں گی، تو وہ بھی اتنا، جتنا کہ ایک برس کا بچہ، بغیر ڈکار لیے کھا لے۔

ایک دن یہ مجھ سے گویا ہوئیں "طفیل آج بہت زیادہ کھا لیا ہے۔ کباب اچھے تھے۔ سالن بڑا مزے دار تھا"

"چلو اچھا ہوا آج آپ نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا"

"بلکہ آج تو دو دن کا اکٹھا کھا لیا"

"آخر کتنا کھایا؟"

"بھئی ڈیڑھ چپاتی کھا گئے"

کھانے کا حال تو آپ نے سن لیا۔ اب ذرا چلنے پھرنے کا بھی حال سن لیں ـــــ "آج ہم بہت پیدل چلے۔ بہت پیدل چلے۔ بس تھک گئے"

"آخر کے میل؟"

"بھئی ہم انارکلی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پیدل ہی تو چلتے چلے گئے"

یہ سارا فاصلہ کوئی دو فرلانگ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس لیے میں نے بادام لے لیں تاکہ میری بہن کو کہیں نظر نہ لگ جائے۔

شکیلہ کو نقادوں سے بڑی شکایت ہے۔ کہتی ہیں۔ نقاد بھی گروہ بندی کا شکار ہیں۔ ہر ایک نقاد دوسرے نقاد کے پیچھے ہی چلا جا رہا ہے۔ ناک کی سیدھ میں۔ خود سے کچھ سوچتا ہی نہیں۔ نہ کوئی نئی بات ہی کہتا ہے۔ ہر نقاد تبصرہ نگار ہے تخلیقی تنقید کسی کے ہاں نہیں۔ انھوں نے خواتین افسانہ نگاروں کے ساتھ عموماً زیادتی کی ہے۔ جنھیں بس دو تین نام ہی یاد ہیں۔ لے دے کے انھی کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً عصمت، ہاجرہ، خدیجہ اور بس۔ — حجاب کو بھی کوئی زیادہ لفٹ نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ اپنے اسٹائل اور پختگیٔ فن کے اعتبار سے منفرد اور جداگانہ ہے۔ تسنیم سلیم چھتاری کو بھی کوئی نہیں یاد کرتا۔ حالانکہ اس کے فن میں جتنا خلوص ہے وہ کسی کو بھی نصیب نہیں۔ مگر نقاد جب بولتا ہے۔ یہی کہتا ہے عصمت، ہاجرہ اور خدیجہ۔"

میں نے چھیڑا: "آپ نے اپنا نام نہیں لیا؟"

"جی ہم کیا ہیں؟"

"خواتین"

"ہاں "خواتین" تو ہیں۔ مگر افسانہ نگار نہیں ہیں۔"

"جس طرح آپ خاتون ہیں اور افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اسی طرح باقی افسانہ نگار خواتین نے بھی نقادوں سے کہہ دیا ہے کہ ہم عورت ہیں۔ افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا تذکرہ افسانہ نگار خواتین کے ساتھ نہ کیا جائے۔"

"یہ بات ہے تو کیا عصمت، ہاجرہ اور خدیجہ نے نقادوں سے کہہ رکھا ہے کہ ہم افسانہ نگار ہیں؟"

"ہاں ہاں انھوں نے ضرور کہا ہوگا۔ ورنہ نقادوں کو پتہ نہ چلتا کہ خواتین بھی افسانہ نگار ہو سکتی ہیں۔ یہ لوگ کان سے کام لیتے ہیں۔ ذہن سے نہیں۔"

"اب دیکھو جیلانی بانو کتنے اچھے افسانے لکھتی ہے۔ مگر نقاد چپ ہیں۔ بولیں گے تو اتنے: ایک نئی لکھنے والی جیلانی بانو بھی ہے —— چھی چھی چھی!

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی باتونی کیوں نہ ہو۔ شکیلہ کو اس سے یہی شکوہ ہوگا کہ آپ بڑے چپ چپ رہتے ہیں —— چنانچہ ایک دن مجھ سے —— مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ آپ بالکل چپ شاہ ہیں۔ آپ کی خاموشی نے تو مجھے بالکل بور کر کے رکھ دیا ہے۔ اب یہ طے کیجیے کہ ہم گھڑی سامنے رکھ کر باتیں کریں گے۔ ایک گھنٹہ تم بولو۔ ایک گھنٹہ میں بولوں گی۔

میں نے سراسیمہ ہو کر اس کے جواب میں کہا تھا "آپا آپ ہی بولتی جائیں۔ مجھے حالات نے بولنا سکھایا ہی نہیں۔"

"اب تو آپ کے حالات بڑے اچھے ہیں۔"

"میں ماضی کی بات کرتا ہوں۔ بچپن ہی میں آدمی بولنا سیکھتا ہے۔"

"اب چھوڑو بھی ماضی کو۔"

"جس دن میں نے ماضی کو پیشِ نظر نہ رکھا۔ اس دن میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"چلو ہٹو۔ بکواس نہ کرو۔"

"پھر میرے حالات بھی کون سے زیادہ اچھے ہیں؟"

"بڑے بے ایمان ہو تم۔"

اس طرح باتوں باتوں میں شکیلہ نے مجھے بکواسی، بے ایمان تک کہا۔ یقین مانیئے۔ میں یہ سب کچھ سن کر بھی بے حد خوش ہوں۔ اس لیے کہ ان میں بہن کا پیار ہے۔ خلوص ہے۔ کوئی اور مجھے ایسے کہہ کر تو دیکھے میری غیرت کو کیا کیا جوش نہیں آجاتا۔

میں نے سنا تھا کہ شکیلہ نے اپنی شادی کے فوراً بعد، اپنا سارا زیور بیچ، روپیہ غریبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ اچھی کی ہے۔ اس لیے کہ آج کل ایسے لوگ کہاں، یہ بات تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تھی۔

میں نے باتوں باتوں میں شکیلہ سے پوچھا تھا۔ آج کل آپ کے من بھاتے مشاغل کون کون سے ہیں؟ جواب ملا۔ یوں تو کچھ نہیں ـــــ گھر گھر جا کر چندہ ضرور اکٹھا کرتی ہوں۔

"کس لیے؟"

اس لیے تاکہ اُردو کے چند ایک اسکول چلائے جا سکیں۔ اگر ادھر توجہ نہ دی گئی تو پھر پندرہ بیس برس کے بعد بھارت میں اُردو جاننے والا کوئی نہ ہو گا۔

یہ بھی باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ان کے ہاں قیمتی چیز کوئی نہیں۔ اس لیے کہ ضرورت مند لوگ میاں بیوی کو گھیرے رہتے ہیں۔ نقد روپیہ ایسے "فضول خرچ" لوگوں کے پاس رہنا کہاں ہے۔ جو ان کے پاس رہتا۔ اس لیے جتنا بھی قیمتی سامان تھا۔ وہ بھی سب کام آگیا۔

اتنا درد مند دل، جو غریبوں اور محتاجوں کے لیے عملی ہمدردی رکھتا ہو۔ کسی اور کو کاہے کو نصیب ہوا ہو گا ـــ ایک دن اخبار سامنے آیا تو میں نے جلی جلی سرخیاں دیکھ کر چھوڑ دیا۔ انھوں نے پڑھا تو مجھ سے کہا "یہ بھی کچھ پڑھا؟"

"کیا؟"

"لو سنو"۔

"ایک جوڈیشل مجسٹریٹ کے بارے میں خبر آئی ہے کہ انھوں نے شقاوت و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ مجسٹریٹ صاحب ایک روز سو کر جو اٹھے تو ان کے ہاتھ کی گھڑی گم تھی۔ بہت تلاش کی گئی۔ لیکن گھڑی نہ ملی۔ مجسٹریٹ صاحب کو اپنے گھر کی ملازمہ پر چوری کا شبہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو اتنی بے دردی سے مارا کہ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر، اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر ہی میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے نوکرانی کے بھاگ جانے پر اس کے تینوں بچوں کو تختۂ مشق بنانا شروع کیا اور اس اقبالِ جرم کی مہم میں ایک مقامی تھانیدار کی امداد بھی حاصل کر لی۔ ان بچوں کی پٹائی سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ان کے اختراع پسند ذہن نے ایک انتہائی وحشیانہ سزا ایجاد کی کہ تینوں بچوں کے جسم میں کیلیں ٹھونکنی شروع کر دیں۔ بچوں کی عمریں علی الترتیب سات سال، پانچ سال اور تین سال تھیں۔ بچے اس سزا کی تاب نہ لا کر چیخیں مارتے مارتے

بے ہوش ہو گئے۔ ان کی چیخیں اتنی بلند اور دل دوز تھیں کہ آس پاس کے لوگ موقع پر جمع ہو گئے اور ہجوم میں شاید اشتعال اور غم و غصہ پیدا ہو گیا اور فساد کا اندیشہ ہونے لگا۔ اتنے میں ایک مقامی پولیس کا ایک دستہ موقع پر پہنچ گیا اور اس نے بچوں کو تو فوراً ہسپتال پہنچایا اور ہجوم کو بھگا کر منتشر کیا۔ ہسپتال جا کر معلوم ہوا کہ سات سالہ لڑکی کے جسم میں ۲۶ کیلیں، پانچ سالہ لڑکے کے جسم میں ۱۴ کیلیں اور تین سالہ بچی کے جسم میں تین کیلیں ٹھونکی گئی تھیں۔"

یہ خبر سن کر میں نے کہا "توبہ توبہ ظلم کی انتہا ہو گئی۔"

شکیلہ نے کہا "یہ خبر ابھی ختم کہاں ہوئی ہے۔ آگے لکھا ہے"۔

"لطف یہ کہ اس سارے ظلم و شقاوت کے بعد تلاش کرنے پر گھڑی خود مجسٹریٹ صاحب کے تکیہ کے نیچے سے برآمد ہوئی۔"

جس دن شکیلہ کو ہندوستان واپس جانا تھا۔ اس دن انھوں نے صبح ہی صبح شور مچانا شروع کر دیا "طفیل جلدی جلدی دفتر جاؤ اور پھر جلدی ہی واپس آجاؤ" میرا خیال یہ تھا "بہن واپس جا رہی ہے۔ اس لیے آج دفتر ہی نہ جاؤں —— چائے پینے کے بعد یہ امر پھر بڑھ گیا "جا نے کیوں نہیں؟"

مجبوراً اٹھا۔ کئی بار قدم رکے بھی، کہ آج نہ جاؤں۔ یوں گومگو کے عالم میں کھڑا ہی تھا کہ پھر شکیلہ کی آواز آئی "یہ جاتے کیوں نہیں ہو؟ دھوپ تیز ہو رہی ہے۔"

مجبوراً دفتر چلا گیا۔

ان کی گاڑی دو ڈھائی بجے چھوٹتی تھی۔ بارہ بجے گھر واپس آیا تو شکیلہ قدرے خفا۔ میں حیران یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھا "جناب اس قدر ناخوش کیوں ہیں؟"

"تم بڑے سنگدل ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"تمھیں علم تھا کہ میں آج واپس جا رہی ہوں۔ پھر بھی تم دفتر چلے گئے۔"

"میں کہاں جاتا تھا۔ آپ نے ہی تو دھکے مار کے نکالا تھا۔"

"میں تو بار بار اس لیے کہتی تھی تاکہ تم جلدی سے یہ کہہ دو کہ میں آج نہیں جاتا۔ مگر تم میرے دل کی بات سنے بغیر میری زبان پر ہی اعتبار کر کے چلے گئے۔"

کھانا وانا کھانے کے بعد، سامان تانگے میں رکھا جا رہا تھا۔ بچوں سمیت سب حیران اور چپ تھے کہ شکیلہ آپا کیوں جا رہی ہیں۔ ان کا ایک سوٹ کیس میں نے بھی سیڑھیوں سے اتارا۔ یقین کیجئے وہ سوٹ کیس مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے کسی عزیز کی میت اٹھائے سیڑھیوں سے اتر رہا ہوں۔

شکیلہ ہمارے ہاں میری بہن اور میرے گھر والوں کی مہمان بن کر آئی تھیں۔ مگر شکیلہ کی باتوں نے، خلوص نے، محبت نے، سب کو

پنا بنا لیا۔ اب میری یہ انفرادیت ختم ہو گئی کہ شکیلہ صرف میری بہن ہیں ۔ اب جسے دیکھو وہ شکیلہ ہی کی باتیں کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کو یاد کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ عجیب جادوگرنی ہیں یہ، جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ جیت لیا۔

یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں۔ حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ بہن تو بس بہن ہی ہوتی ہے۔ سگی، سوتیلی، منہ بولی، یہ سارے ہی اضافی اور فضول لفظ ہیں۔ جب کہ خون کے رشتے کی بات بھی، میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔

یہ سید ہیں۔ وہ بھی اصلی، براہ راست رسول مقبولؐ کی چوبیسویں پشت میں، اس لیے قلم رکھتا ہوں۔ توبہ استغفار کرتا ہوں۔

سمندر کی لہریں

جاویدہ اخلاق

اس کی پرسکون زندگی سب کے لیے باعث تعجب تھی۔ پٹرول پمپ کے سامنے بڑا سا موڑ گھومتے ہی بائیں ہاتھ کھائی کی طرف وہ ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے میں دو چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچوں اور ایک نوکر کے ساتھ رہتی تھی۔ کبھی کبھی صبح کے وقت وہ بید کی جگمگاتی ٹوکری اٹھائے خرید و فروخت کے لیے آتی جاتی نظر آتی مگر روزانہ شام کی سیر اس کا ایک ایسا معمول تھا جس میں گزشتہ کئی مہینوں سے کبھی ایک دن بھی فرق نہیں آیا تھا۔ پاس پڑوس کے تمام لوگوں کے لیے وہ ایک معمہ تھی۔ ایک ایسی انجانی پہیلی جس کا بوجھنا مشکل تھا لیکن اگر کوئی خوش پوش پڑھی لکھی خاتون کہیں اکیلی رہائش اختیار کر لے تو لوگوں کا تجسس ایک بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس اکیلی بے معنی زندگی کے پیچھے کون سا افسانہ ہے؟ تمام ان گھڑت کہانیوں اور استفہامیہ نظروں کے جواب میں وہ خاموش رہتی۔ شاید وہ کسی زمانے میں بے حد حسین ہو گی مگر اب ایک اندرونی مستقل اذیت سے چہرے پر درماندگی کے آثار تھے اور آنکھیں ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتی تھیں جیسے زندگی نے تھکا دیا ہو۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک مغرور خود پسند عورت ہے جو ازدواجی زندگی کی بندشوں کی قائل نہیں اور بڑی بیدردی سے ایک گھر بسانے کا وقار، کسی انسان کی محبت و الفت اور ایک بستے گھر کی خوشیوں کو روند کر اس کے احساس سے بھی بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس کا اطمینان قابلِ نفرت تھا۔ یہ صحیح تھا یا غلط بظاہر وہ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی جس میں کوئی اضطراب نہ تھا کوئی ہلچل نہ تھی یا شاید وہ کرب و فشار کی حدود سے بھی آگے نکل چکی تھی جہاں پہنچ کر ہر احساس خود بخود سکون پذیر ہو جاتا ہے اور کوئی اذیت باقی نہیں رہتی مگر گزشتہ پانچ مہینوں میں شاید یہ پہلا دن تھا کہ آج شام وہ باہر نہیں جا سکی تھی۔ ایک مانوس سی تحریر ایک جانے پہچانے خط نے یادوں کے کتنے چراغ روشن کر دیے تھے کہ وہ محو ہو کر رہ گئی تھی۔

فضا شام ہی سے تیرہ و تاریک تھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد دھند کا غبار سا نیچے پھسل کر تمام گھاٹی کو ڈھانپ لیتا اور بارش کی آواز تیز تر ہو جاتی۔ دور پہاڑیوں پر چند لمحوں کے لیے روشنی کی قطاریں سی جگمگاتی نظر آتیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتیں۔ ان خیالات و واقعات کی طرح جو ماضی کی تاریکی میں سے ابھرتے اور چند لمحوں کے لیے اس کے دماغ میں جھلملا کر پھر سے غائب ہو جاتے۔ کتنے عرصے کی طویل خاموشی اور ڈس لینے والی بیگانگی کے بعد آج اسے اپنے خاوند کا خط موصول ہوا تھا۔ گزشتہ پانچ مہینوں میں یہ اس کا واحد خط تھا جس کے ایک ایک لفظ نے اس کے دل و دماغ پر اتنے چرکے لگائے تھے کہ اس کی روح بھی شدتِ درد سے چلا اٹھی تھی۔ ان گزشتہ

چند لمحوں میں اس پر کیا کیا عذاب نہیں بیتے تھے۔ کتنے تپتے ریگ زاروں اور کون کون سے جہنموں میں سے اسے گزرنا پڑا تھا اور اب سب کچھ گزر جانے کے بعد ایک عجیب ہولناک سناٹے نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ پوری گزشتہ زندگی کا خیال دل میں بھر آیا تھا۔ اس وقت اس کو وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جن کو وہ قطعاً بھول چکی تھی اور سمجھتی تھی کہ اب اس کی زندگی میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ کھڑکی سے چند گز کے فاصلے پر ایک پہاڑی نالہ کف اڑاتا، پتھروں سے سر پھوڑتا تیزی سے بہہ رہا تھا، اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا اس سفید سفید جھاگ کے بلبلوں میں ایک ناٹک ہو رہا ہے، گزری ہوئی عمر کا تماشہ اور وہ اس میں محو ہے۔ ماضی سے حالات و واقعات نکل نکل کر آتے اور بہتے چھلتے پانی اور جھاگ کے پردے پر رقص کرتے ہوئے رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ چونک کر پلٹی۔ کمرہ روشن مگر سرد تھا۔ درمیانی میز پر چند کتابوں کے اوپر ایک کھلا خط کھڑکی سے آنے والی نم آلود ہوا میں آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ سامنے کے کمرہ میں اس کے دونوں بچے سوتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر فرشتوں کی سی معصومیت اور مسکراہٹ تھی۔ دروازہ کے پاس اس کا پرانا ملازم دودھ کی خالی بوتل اور ایک ہاتھ میں تھرمس تھامے کھڑا تھا۔ اسے یہ سب کچھ کسی خواب کے منظر کی طرح لگ رہا تھا۔

"دو بجے ہیں ۔۔۔ بیگم صاحب!" وہ اسے متوجہ پاکر بولا۔

"ٹھیک ہے، رکھ دو" اس کو اپنی آواز عجیب سی لگی۔

"بیگم صاحب! صبح ساڑھے سات بجے ٹیکسی آ جائے گی اور ہم دس بجے کی ٹرین پکڑ سکیں گے"

"ٹھیک ہے!" اس نے پھر وہی مختصر سا جواب دیا۔

وہ چند لمحے اس کے مزید حکم کا انتظار کرتا رہا اور پھر خاموشی سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

بارش لگاتار ہو رہی تھی نالے کا پانی اور شور تیز ہو گیا تھا۔ پانی اب بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتا، شور مچاتا رواں دواں تھا۔ انسانی احساسات و جذبات، خوشیوں اور غموں سے بے نیاز۔ ایک دن اسی نالے کے کنارے اس کے پرانے ملازم نے ایک اشرفی پڑی پائی تھی جس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر تھی۔ اسے ان سربلند چوٹیوں، چیڑ کے گھنے جنگلوں، پہاڑی نالوں سے شدید محبت تھی مگر ان سربلند و پُر شکوہ اور گنگناتے آبشاروں نے اسے کھوٹے سکوں، رنگین دھوکوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ دیا اور اب اسے ایسا معلوم ہوتا تھا اس کے چاروں طرف کھوٹے سکوں کے انبار لگے ہیں اور وہ ان کے بوجھ تلے پسی چلی جا رہی ہے۔ تمام احساسات، جذبات، یہ خوشی و غم، بے پایاں محبت اور ناقابلِ برداشت نفرت سب باتیں کھوکھلی، عارضی اور نقلی نظر آ رہی تھیں۔ کسی چیز پر اعتماد نہ رہا تھا۔ شاید تغیرات اور حوادث کا نام ہی زندگی ہے۔

کئی برس پیشتر جبکہ اس کا شعور بھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس کی منگنی کر دی گئی۔ وہ سٹپٹا سی گئی، کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی یا شاید اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ کہیں دور گھاٹیوں میں شہنائی سی بج اٹھی اور اس کے خوابیدہ احساسات و جذبات جھنجھنا اٹھے۔ طبیعت میں یکایک سنجیدگی سی آ گئی۔ بچپن دور کھڑا اسے حیران نگاہوں سے تکتا رہتا۔ ایک نئی زندگی، ایک نیا تجربہ، خوشی اور خوف کے ملے جلے احساسات میں وہ گم سم سی رہتی جیسے پرندہ اپنی پہلی اڑان سے پہلے دبک سا جاتا ہے۔ شادی کا دن نزدیک آ گیا۔ ایک دن اسے اکیلا پا کر اس کا بھائی آہستہ سے آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو افروز! تم میری بہن ہو، اس لیے مجھے بھی تمہاری بہتری کا اتنا ہی خیال ہے جتنا کہ گھر کے باقی افراد کو۔ تمہیں جس انسان کو سونپا جا رہا ہے وہ اونچی سوسائٹی کا فرد ہے۔ پڑھا لکھا امیر آدمی جو شکوک چال چلن کا، نہ اس کے ساتھ ایک کامیاب زندگی نہیں گزار سکتیں ابھی وقت ہے شادی سے انکار کر دو۔ دنیا میں اچھے انسانوں کی کمی نہیں۔" وہ کئی دنوں سے کہہ رہا تھا۔

وہ مسکرا دی "میرا خیال ہے جو کچھ ہو رہا ہے صحیح ہے۔"

"بے وقوف، نادان لڑکی!" وہ جھنجھلا کر چلایا۔ "وہ ایک کھوٹا سکہ ہے تم زیادہ دنوں تک زندگی کے بازار میں نہیں چلا سکو گی اور ایک دن اچانک شرمساری اور ایک دل سوز حیرت و ناکامی کا شکار ہو کر رہ جاؤ گی۔"

"کھوٹے سکے بھی دنیا میں چلتے ہی رہتے ہیں ایک نو کھا تجربہ ہی سہی۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر زعفران کے پھول لہلہا اٹھے اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم ابھی نادان ہو۔" اس نے رک کر ہانپتے ہوئے دھیرے سے کہا اور چپکے سے چل دیا۔

شادی کے بعد اسے ایک بالکل نئی زندگی، اعلیٰ مہذب سوسائٹی اور رنگین کہانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اونچے پہاڑوں کے سائے میں ایک خوابیدہ سی وادی کے پرسکون ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں نیلی جھیلیں، آہستہ خرام دریا، سیب کے درخت اور بادام کے ہلکے گلابی اور سفید رنگ کے نرم و نازک اُجلے پھول تھے۔ اس نے آنکھ کھولی تو صرف پُرشفقت ماں باپ، محبت کرنے والے بہن بھائی اور ایک باوقار گھرانا دیکھا تھا اور بس۔ چاروں طرف سکون ہی سکون تھا اور یہی سکون اس کی فطرت بن چکا تھا۔ مگر یہاں سمندر کا راگ تھا، رنگین بادلوں اور قرمزی شفق کے سایے میں جھومتے ہوئے ناریل کے درخت، رومان انگیز ہوائیں، رنگ برنگی کاروں کی ختم نہ ہونے والی قطاریں، سمندری اور ہوائی جہازوں کا شور، جگمگاتے سنیما ہال، ریستوران، کیفے اور ہوٹل تھے۔ چاروں طرف رنگینی، بیقراری اور قہقہے تھے۔

شروع شروع میں وہ گھبرا سی گئی مگر اس کے خاوند نے صرف اس سے محبت ہی نہیں کی بلکہ ایک پُرخلوص دوست کی طرح اس کا ساتھ دیا۔ اس کا رویہ ہمیشہ نرم اور پُرشفقت ہوتا۔ رفتہ رفتہ اس کی توجہ اور کوشش سے وہ ان ہنگاموں، پارٹیوں اور پکنکوں کی عادی ہو گئی جیسے زندگی کا لازمی حصہ ہوں۔ وہ دونوں ہر دل عزیز تھے۔ انھیں آپس میں شدید محبت تھی اور اسی نسبت میں ڈوب کر وہ اس کی کمزوریوں خامیوں کو بھی نظر انداز کر جاتی۔ کبھی کبھی اس کی شراب نوشی اور گھر سے غیر حاضری پر معمولی سا جھگڑا بھی ہو جاتا مگر ہر بار وہ اتنی منت، اتنے پیار سے منتا کہ وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اکثر دونوں کو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا اور وہ سوچ میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ سگریٹ کی راکھ جھٹکتے ہوئے کہتا۔ "فریدی! میرا خیال ہے اب گھر میں ایک چھوٹی سی بچی ہونی چاہیے، گڑیا سی، اور اس کی شکل و صورت بالکل تمہاری طرح ہو۔" وہ زیرِ لب مسکراتا۔

"لڑکی کیوں؟ لڑکا ہونا چاہیے۔" وہ چڑ جاتی۔

"مگر میں پہلے لڑکی چاہتا ہوں۔" وہ اپنی ضد پر قائم رہتا۔

دن گزرتے رہے اور وہ بچے صرف ان کے تصور میں ہی جھانکتے رہے۔ کوئی خواب بھی حقیقت نہ بن سکا اور خلا وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہ حیرت انگیز طریقے سے بدل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے شراب نوشی زیادہ کر دی۔ اب وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا۔ گو عیش و آرام اور تفریحات میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا مگر زندگی بجھی سی گئی تھی۔ کچھ عجب سی بے اطمینانی تھی جس کے اظہار سے دونوں کتراتے۔

سنا ہے گارڈ روی نے صحیح کہا ہے کہ " انسان میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے عشق کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اگر اس کو تسکین حاصل ہو جائے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی وہاں اب ایک سیری آجاتی ہے طبیعت اکتا جاتی ہے اطمینان مفقود ہو جاتا ہے اور یہ مرض لاعلاج ہے۔"

وہ یہ سب کچھ سمجھتی۔ اس تبدیلی اس بیگانگی کو شدت سے محسوس کرتی مگر خاموش رہتی اور پھر اچانک اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے وطن جانا پڑ گیا جس دن وہ روانہ ہونے والی تھی وہ قدرے پریشان و متفکر سا نظر آتا تھا۔ ہوائی جہاز کے روانہ ہونے سے چند لمحے پیشتر اس نے اس کے چہرے پر ایک ایسی گہری اداسی کی جھلک دیکھی تھی کہ گھر پہنچنے تک اس کے دل سے تمام شکوک اور بدگمانیاں زائل ہو چکی تھیں۔ وہ اس پرسکون ماحول میں واپس پہنچ کر پھر سے اس کے لیے مضطرب ہو گئی۔ اس نے کئی دفعہ جلد واپس جانے کا ارادہ کیا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو جاتی اور پھر اس دن اس کی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ وہ بالکل اسی طرح کا دن تھا جس دن اس کی شادی ہوئی تھی۔ تمام رات لڑکیاں ڈھولک کے ساتھ گاتی رہیں۔ صبح رخصتی کے ہنگاموں میں کسی نے ایک خط لا کر دیا۔ وہی جانی پہچانی عزیز تحریر! اس نے بےقراری سے لفافہ چاک کیا مگر چند لمحوں تک اسے سمجھ ہی نہ آسکی کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ الفاظ بڑے بڑے دھبوں کی طرح آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔

"فریدی! میں نے مجبوراً دوسری شادی کر لی ہے۔ وہ ایک انگریز عورت ہے۔ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے اس لیے اب تم واپس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور تھا۔ امید ہے تم بھی مجھے جلد بھول جاؤ گی۔"

اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ سیبوں کے شگوفے اور بادام کے اجلے پھول جل کر خاکستر ہو چکے ہیں۔ نیلی جھیل میں لاوا ابل رہا ہے۔ دریا کے سانولے ٹیلوں میں آگ لگ گئی ہے اور زندگی بھر ایک کنارے کا مسافر دوسرے کنارے سے نہیں جا سکتا۔ زعفران کے کھیت جھلسے پڑے ہیں اور چشمے سوکھ گئے ہیں۔ اسے یہ سب کچھ ایک خواب نظر آ رہا تھا۔

وہ گھر کے کسی فرد کو حقیقت سے آگاہ کیے بغیر اچانک تیاری کر کے روانہ ہو گئی۔ کار اور ریل کا سفر اس نے سوتے جاگتے کی سی حالت میں طے کیا اور پھر ہوائی جہاز اسے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں میں گم ہو گیا۔ تمام رات وہ جگمگاتے شہروں پر، برستے بادلوں کے اوپر چاند کی کرنوں میں پرواز کرتی رہی۔ وہ خوفزدہ تھی۔ صبح اسے لینے کوئی نہیں آئے گا کسی کی منتظر نظریں آسمان کو نہیں تکیں گی اور رکوتی ہاتھ بڑھا کر اس کے لیے کار کا دروازہ نہیں کھولے گا۔ اس نے کسی کو اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا، وہ کہاں اور کس کے پاس جا رہی ہے؟ یہ وہ انسان نہیں تھا جس نے آسمانی صحیفوں کے درمیان انتہائی محبت اور فخر کے ساتھ اسے قبول کیا تھا جس نے اسے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔ یہ کوئی اور تھا جسے وہ ہرگز نہیں جانتی تھی۔ وہ پہلا انسان نہ جانے کہاں کھو گیا؟ انھوں نے اکٹھے کتنے سہانے خواب دیکھے تھے کتنی دلفریب شامیں، رنگین راتیں اور مسکراتی صبحیں تھیں کتنی خوشیاں اور قہقہے تھے۔ وہ ان سب کا بوجھ اٹھائے اس وسیع دنیا میں اسے کہاں ڈھونڈتی پھرے گی۔ چند معمولی الفاظ تمام گذشتہ زندگی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں مگر وہ پہلی نظر، ایک لمس، ایک بوسہ۔ وہ ہلکی سی لرزش ایک سسکی چند آنسو، خنک چاندنی اور اجلے پھول، دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہو کر غیر فانی ہو جاتے ہیں۔

اسے لینے کوئی نہیں آیا تھا مگر اسے اپنے گھر کا راستہ بخوبی معلوم تھا اور اب وہ اپنے خوشنما فلیٹ کے دروازے پر ایک اجنبی کی طرح کھڑی کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ کسی نئے نوکر نے اسے پہچانے بغیر دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تمام ماحول اجنبی سا نظر آ رہا تھا۔ کارنس پر سے اس کی تصاویر اٹھا دی گئی تھیں۔ کمرے میں نقشہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہی گھر میں

کسی اجنبی کی طرح چاروں طرف غیر مانوس متحیر نگاہوں سے گھور رہی تھی۔
"جی! صاحب اور بیگم صاحب ابھی دونوں سوئے ہوئے ہیں۔ آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں؟" نوکر نے اسے نامانوس دیکھ کر خود ہی سوال کیا۔
وہ چونک پڑی۔ ہاں وہ ملنے ہی تو آئی تھی یہ گھر اس کا تو نہیں تھا "صاحب سے بولو ان سے کوئی ملنے آیا ہے" اور پھر چند لمحوں کے شدید انتظار کے بعد وہ ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "اوہ تم! تم کیوں آ گئیں فریحہ؟"
"میں اپنے گھر آئی ہوں۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔
"مگر میں تمھیں سب کچھ لکھ چکا ہوں فریحہ! اور تم بھی تو میری عادت کی وجہ سے مجھ سے اکتا چکی تھیں۔ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔ اب دوبارہ اس کی نظروں میں یہ تماشہ بنا کر آخر تمھیں کیا حاصل ہوگا؟"
"میں تمھارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" اس نے حسرت آلود لہجے میں پوچھا۔
"دیکھو تم چلی جاؤ۔ اس کے اٹھنے سے پہلے چلی جاؤ۔" وہ گڑگڑایا۔
"کہاں چلی جاؤں؟" اس نے یوں خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے اس کے لیے زمین و آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔
"تم اُدھر ہوٹل میں چلی جاؤ۔ وہاں کئی گھرانے ہیں جن سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ تم اپنی کسی سہیلی کے پاس ٹھہر جاؤ۔ وہاں مفصل گفتگو ہو سکے گی۔ میں لباس تبدیل کر کے وہیں آتا ہوں مگر اب خدارا جلد از جلد چلی جاؤ۔"
وہ خاموشی سے اپنا سوٹ کیس اٹھائے لفٹ کا انتظار کیے بغیر لڑکھڑاتے قدموں سے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی اور وہ ریلنگ کے سہارے جھکا چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ایک موڑ —— دوسرا موڑ —— ہر موڑ پر اس کی ساڑی کا رنگین پلو ہوا میں لہرا کے غائب ہو جاتا۔ کتنی سیڑھیاں کتنے موڑ! ان گنت گمشدہ یادیں، جلتے اشک اور جگمگاتے قہقہے۔ لاتعداد احساسات و جذبات اُمڈ اُمڈ کے اسے اپنی یاد دلاتے رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ نیچے اتر کر لوگوں کے سیلاب میں ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی تھی مگر وہ اسی طرح گم سم کھڑا تھا، نہ جانے کتنے لمحے جو ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔
اور پھر بہت عرصہ بعد اس نے اپنے ایک دوست سے بہت رازداری کے انداز میں آہستہ سے کہا تھا "میری دوسری شادی جلد ہی ناکام ثابت ہوئی اور پھر اسی طرح فریحہ بھی مگر مجھے قطعاً کوئی غم نہیں۔ میں اب ایک تن تنہا انسان ہوں، تمام احساسات و جذبات سے بے پروا مگر ایک احساس باقی ہے۔ ایک صبح میرے ذہن میں مستقل اذیت بن کر رہ گئی ہے۔ وہ لمحہ جب وہ میرے اصرار پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اکیلی سیڑھیاں اترتی ہوئی سڑک کے بے پناہ ہجوم میں غائب ہو گئی تھی اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ اکثر آرام سے بیٹھے بٹھائے وہ صبح اچانک میرے ذہن میں جاگ اٹھتی ہے اور پھر کہیں سکون باقی نہیں رہتا۔ شاید وہ تمام عمر —— زندگی بھر اسی طرح میرے ذہن میں سیڑھیاں اترتی رہے گی اور کبھی نہ اتر سکے گی —— ایک لامتناہی سلسلہ —— کتنی عجیب بات ہے —— ہے نا؟ گو یہ سب کچھ سوچا سمجھا کارہے کیونکہ اب وہ ایک دوسرے انسان کی بیوی ہے۔ مگر یہ سیڑھیاں؟ یہ مستقل اذیت ——" وہ آہستہ آہستہ عجب اذیت اور مایوسی کے لہجے میں بڑبڑا رہا تھا۔
اور وہ دوسرا آدمی —— ایک پڑھا لکھا، خوبصورت اور معزز انسان —— سب سے وہ اپنے خاوند کی موجودگی میں کئی دفعہ مل چکی تھی

ہمیشہ وہ اس سے متاثر اور مرعوب سا نظر آتا۔ چونکہ وہ اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ اس کی عزت کرتی تھی۔ سلجھے ہوئے مذاق اور بلند معیار کا خوش پوش و خوش گفتار انسان جو ہر سوسائٹی میں بے حد پسند کیا جاتا خصوصاً عورتوں میں، وہ اس سے کئی دفعہ سرسری طور پر مل چکی تھی مگر آنے والے حالات کا کسے علم تھا۔

زندگی کی اداس شاہراہ پر چلتے چلتے ایک موڑ پر وہ اتفاقیہ اسے مل گیا۔ کسی دوردراز شہر میں، جہاں قدرت اور حالات نے انہیں اچانک اکٹھا کر دیا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ ایک کو گزشتہ خوشگوار دنوں کی یاد کی وجہ سے، دوسرے کو اس اجنبی شہر میں ایک مانوس و لطیف رفاقت کے احساس سے۔ پھر ہمدردی تھی مگر آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آتے گئے۔ دونوں کی زندگیوں میں ایک خلا تھا جس کو عارضی طور پر ایک دوسرے کی موجودگی و ہمدردی پُر کر دیتی۔ وہ دل شکستہ بے سہارا تھی۔ اس کی زندگی سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور وہ بھی شاید زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ اگر وہ کئی دفعہ حسن و رومان کی دنیا میں سے گزرا تھا تو کتنی بار ویران صحراؤں کی دل دوز تنہائی کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ پُرفسوں محبت، اذیت ناک بیگانگی، رنج و راحت کے معنی جانتا تھا یا پھر زیست کی بے ہنگم راہوں اور رفتاروں کی افراط نے قدرے تھکا دیا تھا کہ اسی چشمے کے کنارے ٹھہر جانے کے لیے دل چاہنے لگا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے یا شاید محبت کرتا ہے تو آخر ایک دن اس نے اس کا اظہار کر ہی دیا۔ وہ خوش تھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی، اسے بے حد پسند کرتی۔ اس کی موجودگی ہی اسے سکون و راحت بخش دیتی تھی مگر پھر بھی وہ خوفزدہ سہمی سہمی کئی روز تک سخت تذبذب کی حالت میں اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس کی محبت لٹ کر غیر فانی ہو چکی تھی، اس کی زندگی بن گئی تھی، وہ اب محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ وہ بے حد بے پایاں محبت اس پر لٹا دینا چاہتی تھی تاکہ اس میں ڈوب کر گزشتہ تلخی کو سراسر بھول جائے لیکن اگر یہ بھی سراب ثابت ہوا۔ زندگی کے بازار میں اگر یہ انمول رتن بھی دغا دے گیا تو؟ اس کے بلند کردار کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے کھوٹا ہونے کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی بلکہ شاید وہ بے حد قیمتی تھا۔ عجیب و غریب پیارا سا، جس پر قدیم مصری نبت لکھیں اور کسی ناقابلِ فہم زبان میں عبارت کندہ تھی اور کوئی انسان وہ عجیب و غریب زبان سیکھے بغیر اس کی مالیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ شاید وہ بھرے ہوئے مندروں کے کنارے عظیم الشان معبدوں میں پوجا گیا تھا کسی حسین دیوی کے ماتھے پر جھلملاتا رہا تھا۔ نیل کے کنارے قلوپطرہ کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا۔ شاید انتہائی ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور کسی سیزر کسی مارک انطنی نے اسے رشک سے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کسی ان جانے ڈر سے لرز رہی تھی، کانپ رہی تھی مگر اس کے مضبوط ہاتھوں کا سہارا پاکر سنبھل گئی اور شادی کے بعد تو تمام محبت و پرستش اس نے اس کے لیے وقف کر دی تھی۔ کتنے شیریں لمحات تھے وہ بھی اور اب ان کے دو ننھے بچے تھے۔ وہی بچے جو اس کی پہلی ناکام زندگی میں اکثر اس کے تصور میں جھانکا کرتے تھے۔

پھر زندگی بے حد پُرسکون تھی مگر یہ سکون بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور کچھ عرصے کے بعد ہی وہ اس کی سطح کے نیچے لہروں کا ہلکا ہلکا تلاطم محسوس کیا کرتی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی بدل رہا تھا۔ بیزار اور چڑچڑا سا۔ وہی بے اطمینانی، وہی سکون کی آرزو، نت نئے ہنگامے۔ زندگی کا وہی پرانا تماشہ، صرف وقت، مقام اور کردار بدل گئے تھے۔ خلا کوئی نہ تھا مگر تشنگی مٹ جانے پر وہ اکتا گیا تھا اور دن بدن اس کی بیزاری اور جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی بدلتی ہوئی عادات پر بھونچکا سی رہ جاتی۔ تمام خوش فہمیاں غلط ثابت ہو رہی تھیں۔

بعض اوقات وہ بالکل بدلا ہوا انسان نظر آتا۔ طنز و مایوسی اس کی فطرت بن چکے تھے۔ خود کو فرضی رنج و غم میں مبتلا دیکھ کر اسے تسکین ہوتی۔ اس کی طبیعت میں ایک ایسی اذیت پسندی سی آ گئی تھی جس کے باعث وہ کرب و پریشانی پا کر کے راحت محسوس کرتا۔ اپنے آپ کو دھوکا دینے کی خاطر وہ اکثر اوقات بڑے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے ہلکے سے بہرے پن اور ان چند سفید بالوں کا تذکرہ کرتا جو قبل از وقت رنگ بدل گئے تھے جیسے وہ لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کے کان نغمات کی سماعت کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ احساسِ حسن مٹ چکا ہے اور روح پر بڑھاپا چھا رہا ہے حالانکہ وہ اتنا حساس تھا کہ پودوں کو اگتے ہوئے اور پھولوں کو کھلتے ہوئے سن سکتا تھا اور اس کا دل ہر لحظہ پکار پکار کر کہتا کہ "ابھی تو میں جوان ہوں"۔ جب دل و دماغ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تو اس ذہنی کشمکش اور کوفت سے عاجز آ کر وہ پتھر کے اس بت کی طرح ساکت و صامت رہ جاتا جو اردگرد کی گہما گہمی اور رنگینی سے بے پروا ہزاروں برس پیشتر کے ہنگاموں اور یادوں میں کھو چکا ہو۔

وہ پہروں اس کے متعلق سوچتی، کیا وہ زندگی بھر اس پُراسرار ناقابلِ فہم عبارت کو پڑھنے میں ناکام رہے گی۔ شاید اس نے اسے اپنا کر غلطی کی تھی اور محبت کی کامیابی ہی اس کی شکست ہوتی ہے مگر وہ اپنی ان تمام باتوں کو ایک ایسی عجیب و غریب بیماری سے تعبیر کرتا جس کا کوئی نام نہ تھا، جو لاعلاج تھی اور اس کا باعث نامعلوم۔ واقعات اپنے آپ کو دہرا رہے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے خاموش ہو جاتی شاید وہ بیماری تھی کوئی جنسی بیماری؟ اور فرائیڈ کا نظریہ صحیح تھا کہ "وہ خواہشات و جذبات جن کا مجبوراً اظہار یا تکمیل نہ ہو سکے ایک مریض دماغ کی تخلیق کرتی ہیں جس سے ناقابلِ تشخیص ذہنی بیماریاں، بے بنیاد توہمات اور بلاوجہ بے اطمینانی و افسردگی پیدا ہوتی ہے جو انسانی بلندی و ترقی میں حارج ہوتی ہیں کیونکہ ایک ارفع و اعلیٰ روح کا مسکن صرف صحت مند دل و دماغ ہی ہوتا ہے۔"

مگر اسے سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوتا جب وہ اپنے دل و دماغ کی بغاوت اور اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے غیر شعوری طور پر اپنی تمام ناکامیوں، پریشانیوں اور تکلیفوں کا باعث اسے گردانتا۔ لہروں کا ہلکا ہلکا تلاطم آخر کار خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر گیا اور ایک دن کسی معمولی سی بات پر ناراض ہو کر وہ اس کی لاعلمی میں چپ چاپ ہی نئی جائے تقرر پر روانہ ہو گیا۔ اس نے اس کے لیے کوئی پیغام تک نہیں چھوڑا تھا۔ گھر واپس آ کر جب اس نے اس کا خالی کمرہ دیکھا تو گھبرا سی گئی۔ قیمتی سکہ پُراسرار طریقے پر غائب ہو چکا تھا اور ایک دفعہ پھر وہ بھرے بازار میں لاکھوں مسکراتی ہوئی نظروں کا نشانہ بنی ہکا بکا کھڑی تھی۔ کیا اس کی تمام محبت و پرستش کا یہی صلہ تھا؟ حادثات کو کیوں اس کی زندگی سے اتنی دلچسپی ہے۔ اس کا کوئی بھی خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

زندگی کی یہ دوسری شکست سب کچھ جلا کر خاکستر کر گئی۔ کوئی احساس کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔ خوشی نے سمٹ کر غم کے احساس سے بھی بیگانہ کر دیا۔ نفرت نہ کر سکی مگر محبت کو بھی بھول گئی جیسے وہ کبھی اس کی زندگی میں آئی ہی نہ تھی۔ سب کچھ فراموش کر بیٹھی، کوئی اذیت باقی نہ رہی۔ مئی جون کی بے پناہ گرمی سے گھبرا کر وہ چند دنوں کے لیے یہاں آئے تھے مگر وہ اسے سڑک کے کنارے انہی خنک سایوں تلے اکیلا چھوڑ کر چل دیا جہاں وہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ سر سے پاؤں تک برف کی ایک سِل۔ احساسات و جذبات سے عاری جسے کسی کی طنز، کسی کی ہنسی، کسی کی پُرتجسس مضحکہ خیز نظریں تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ لوگوں کی رائے زنی سے بالاتر، وہ ایک ایسی مطمئن زندگی گزار رہی تھی جو لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتراض تھی کہ آج اچانک چار مہینے بعد کاغذ کے ایک ٹکڑے نے تمام گذشتہ گھاؤ ہرے کر دیے تھے اور کتنی بھولی بسری یادیں سلگ اٹھی تھیں۔ ایک طویل خط میں اس نے حسبِ عادت اسے متہم کرتے ہوئے اس کے خلاف تمام زہر اگلنے کے بعد آخر میں اپنی

ندگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ اب بھی اسے اسی طرح چاہتا ہے اور اس کا منتظر ہے۔ خط ملتے ہی وہ فوراً اس کے پاس آنے کے لیے روانہ ہو جائے۔

اور خط مل چکا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس کی تیاری بھی مکمل ہو چکی تھی مگر وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ جا کر کیا کرے گی۔ یا پھر سے وہ زندگی، وہ لازوال محبت، وہ بے پناہ خلوص اور اندھا اعتماد واپس آ سکتے ہیں؟ وہ احساسات و جذبات جو کبھی اس کے تھے وہ اسے واپس مل سکتا ہے؟ محبت کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ جب دل چاہا بیج بو دینے سے فصل پک کر تیار ہو جائے۔ وہ تو ایک جنگلی خودرو بیل کی طرح زمین کی تہوں سے لدی پھندی نیلے پانیوں کے کنارے اتنی خاموشی اور آہستگی سے بڑھتی ہے کہ کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا اور جب کوئی انسان اس محبت کو کسی چشمے کے کنارے، کسی سیب کے درخت تلے، کہیں سجے سجائے کمرہ میں، بھرے بازاروں یا راہ چلتے سڑک پر قتل کر دیتا ہے تو وہ زخمی طائر کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی لامحدود خلاؤں کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ پھر چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ اُجلے پھولوں کی جگہ کانٹے اُگ آتے ہیں۔ محل ویران اور ریگستان سنسان ہو جاتے ہیں اور وہ انسان تمام زندگی اس محبت کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے مگر وہ کبھی پلٹ کر نہیں آتی۔

وہ گزشتہ بہاروں کا تصور لیے اس کا منتظر تھا مگر اب اس کے پاس ان بہاروں کے خزاں دیدہ نقوش کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ اب اسے کیا دے سکتی تھی۔ یہ خالی بے رنگ زندگی، کالی راتیں، جلے ہوئے پھول اور مردہ احساسات و جذبات وہ اسے کسی وقت بھی تحفۃً پیش کر سکتی ہے ـــ اتنی جلدی کیا ہے اب؟

وہ آہستہ آہستہ چلتی میز کے قریب آئی۔ خط تہ کر کے لفافہ میں ڈالا اور کارڈ پر ان لکھتے ہوئے نوکر کو جگا کر کہا کہ وہ صبح نہیں جا رہی اس لیے وہ اسے جلدی نہ جگائے' اور پھر اسی پرانے اطمینان و دلجمعی کے ساتھ جو لوگوں کے لیے باعثِ حیرت و نفرت تھی' اپنے بیڈروم کی طرف چلی گئی '' داخل ہو گئی۔

———————

فیض احمد فیض

○

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے تری یاد میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہُوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہُوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سُنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گُل کا ماتم

حالی کی قطعہ نگاری

ڈاکٹر سید عبداللہ

فارسی قطعہ قصیدے کی ہم عمر صنف ہے۔ اس کا مقصد کسی حقیقت کا مختصر مگر مسلسل بیان ہے اور تسلسل بیان کی یہ کوشش ابتدا ہی سے فارسی شاعری میں ظہور پذیر ہے۔ اس کو دیکھ کر پرانی فارسی، اُردو شاعری کے متعلق بعض لوگوں کے یہ خیالات بلکہ توہمات سچ مچ دیکھنے بلکہ ہنسنے کے لائق ہیں کہ پرانے شاعر تسلسلِ بیان پر قادر نہ تھے۔ دراصل ہم پر ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب ہم اپنی ہستی کے منکر اور اپنی ہر چیز کے مخالف ہوگئے تھے۔ میں نے جن توہمات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک مضحکہ خیز واہمہ یہ تھا کہ ہمارے کلاسیکی شاعر مضمون کے تسلسل کو نہ مانتے تھے اور نہ اس کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ کلیم الدین احمد اس معاملے میں اتنے نیک نام ہو چکے ہیں کہ اب ان کا ذکر کرتے ہوئے ان پر رحم آتا ہے لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کیونکہ وہ بچارے تو محض ٹھوکر کے دامن میں گھومنے کے جرم میں مارے گئے اور یہ قصور صرف کلیم کا نہیں اصل غلطی تو اس ذہن کی ہے جس نے آج سے ایک سو سال پہلے ہر مشرقی کو بے جرم دار پر کھینچنے کی رسم ڈال دی تھی۔

خیر، یہ تو محض جملہ معترضہ تھا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ قطعہ کی صنف ذوقِ تسلسل کی تشفی کے لیے وضع ہوئی اور آزادی (یعنی قصیدے کے عام رسوم و قیود سے آزادی) اس کی ایک بنیادی صفت قرار پائی چنانچہ مطلع کی قید سے آزاد قطعہ مسلسل مضمون کو ادا کرنے کے لیے وقف ہوا اور آج تک اس کی یہی صفت اس کی شناخت کی بنیادی علامت ہے۔ اس کے باقی اوصاف قطعی نہیں اور ان میں تقریباً ہر دور میں رد و بدل ہوتا رہا۔

قطعہ (ق ط ع) لغوی معانی کے اعتبار سے ٹکڑے یا کٹے ہوئے کسی جز کو کہتے ہیں اور جب اس میں اصطلاح کا رنگ پیدا ہوا تو بھی یہ بنیادی معنی اس میں باقی رہا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مضمون کا تسلسل اور ربط اور اس کی جزئیت اس کی بنیادی صفت ہے۔ گویا قطعہ کسی وسیع تر اور طویل تر بیان کے لیے نہیں یہ تو حقیقت کی ایک جھلک دکھانے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ یہ اصل میں قصیدے کا ایک کٹا ہوا ٹکڑا ہے جس میں بعض صفات قصیدے کی پائی جاتی ہیں اگرچہ اس میں مطلع نہیں ہوتا مگر اس کا یہ دستور رہا ہے ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ بعد میں ارتقا یافتہ قطعے کی قصیدے سے بجز اس کے کچھ مشابہت نہ رہی کہ قصیدے کی طرح یہ رباعی اور غزل سے مختلف چیز ہے اور یہ بھی کہ اس میں بھی قصیدے کی طرح ایک مرکزی مضمون موجود ہوتا ہے۔

قطعہ کی ہیئت و ساخت کے متعلق مختلف زمانوں میں مختلف تجربے ہوئے ـــــ اور یہاں ہیئت سے میری مراد تعداد اشعار بھی ہے جو کم از کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ دس بارہ اشعار تک پہنچی ہے۔ (بعض اوقات شاید اس سے بھی زیادہ) مگر متوازن قطعہ ہمیشہ مختصر

ہو رہا ہے) اور اس کی داخلی روح سے بھی۔ فارسی شاعری میں لمبے قطعے بھی ملتے ہیں اور مختصر ترین مربع قطعے بھی (جن کو لوگ غلطی سے رباعی کہہ دیتے ہیں حالانکہ رباعی ایک مستقل صنف ہے جس کے مستقل قواعد و آداب ہیں اور معنوی لحاظ سے اس کی روح قطعے کی روح سے مختلف ہوتی ہے) بعض لوگوں نے قطعے کو مختصر قصیدہ قرار دیا ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں۔ قطعے اور قصیدے میں کئی باتوں کا فرق ہے۔ قصیدہ مطلع دار ہوتا ہے اور قطعہ بے مطلع۔ اسی طرح دونوں کے مضامین کی روح جدا جدا ہے مثلاً قطعہ و قصیدہ میں ایک بڑا فرق ابتدا ہی سے یہ رہا ہے کہ جہاں قصیدے میں تخیل اور مبالغہ کی رنگ آمیزی اور فرضی بلکہ خلافِ حقیقت تصویر سازی کا عام زور رہا ہے وہاں قطعے میں حقیقت بلکہ واقعاتیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے اس لحاظ سے تسلسلِ مضمون کے علاوہ قطعے کی اصلی روح اس کی حقیقت نگاری ہے۔

فارسی کے قطعات میں بڑی تعداد ایسے قطعوں کی بھی ہے جن کو واقعاتی بلکہ تاریخی کہنا چاہیے۔ سلجوقیوں کے زمانے میں ایسے قطعات کا بڑا رواج تھا چنانچہ انوری کے قطعات بڑی حد تک واقعاتی ہیں۔ وہ تو مضامین تجربہ کو بھی واقعہ کی صورت دیتا ہے اور عام مگر تعجب خیز واقعاتِ زندگی کو قطعات میں پیش کرتا ہے۔ بعد میں قطعات کی واقعاتی روح میں تغیر آ گیا اور قطعے نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ فارسی میں سعدی اور ابن یمین وغیرہ کے قطعے خاص طور سے مشہور ہیں جن میں صرف حقائق کا برجستہ بیان ہے تاہم قطعے کی کہانی یا واقعہ کی ادھوری سی صورت بالعموم مدِ نظر رکھی جاتی رہی ہے مثلاً سعدی کا یہ قطعہ:

گلے خوشبوئے در حمام روزے — فتاد از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اسی طرح اردو میں بھی قطعے میں واقعہ یا حکایت کو لانے کا رواج رہا مثلاً میر کا یہ قطعہ دیکھیے جو ایک غزل کے اندر ہے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

اس قطعے کے پہلے مصرعے میں ایک واقعہ ہے۔ تیسرے مصرعے میں مکالمہ ہے اور آخر میں ایک حقیقت کا انکشاف ہے۔ انہی اجزا سے یہ قطعہ مکمل ہوا ہے۔ میر کے ایک دوسرے قطعے میں محض ایک قول پر بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی مکمل واقعہ تو نہیں مگر واقعہ کا ابتدائی پلاٹ ضرور ہے:

بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاش کہ — یک مژہ رنگِ فراری اس چمن کا آشنا
بوئے گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن — خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

میر کا یہ قطعہ ایک غزل کے اندر ہے اور یہ بھی میر کی توسیعات میں سے ہے کہ انھوں نے قطعے کے بہت سے قاعدوں کو بدل ڈالا یہاں تک کہ ان کے بعض قطعات میں قصیدے و رباعی کی طرح مطلع بھی ہے۔ بہرحال علی العموم واقعہ کا بیان قطعے کی داخلی خصوصیت ہے۔ اگرچہ بعض شاعروں کے یہاں محض بیانِ حقیقت ہی قطعے کا مقصد معلوم ہوتا ہے یعنی حقیقت کا کوئی رُخ، اخلاقی فلسفیانہ اور دنیوی زیرکی کا کوئی نکتہ واقعہ بنائے بغیر بھی قطعے کا موضوع بن جاتا رہا۔ مثلاً سعدی کا یہ قطعہ:

عمر گراں مایہ دریں صرف شد — تا چہ خورم صیف و چہ پوشم شتا
اے شکم خیرہ بہ نانے بساز — تا نہ کنم پشت بخدمت دوتا

بہرحال یہ سب لوازمات اور تجربات ہیں جس طرح جدید دور کے قطعہ نگاروں نے (مثلاً اختر انصاری اور ندیم قاسمی وغیرہ) نئے قطعے میں ہیئت، وزن و معنی کے کئی تجربے کیے ہیں اور قطعے کے پرانے آداب و شرائط کا التزام نہیں کیا۔

قطعے میں ساخت اور روح کے ان خصائص کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرزِ ادا کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اظہار میں مبالغہ آرائی و تخیل کا اختراع قطعے کی روح کے لیے ناگوار ہے۔ قطعے میں اصل شے شوخی و برجستگی ہے جس کے ذریعے زیرکی اور دانش کی بات برجستہ انداز میں ذہن نشین اور دل نشین ہو جاتی ہے۔ قطعے کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کا "سپاٹ پن" ہے یہاں تک کہ واقعہ کے بیان میں بھی برجستگی اور رنگینی کی ضرورت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قطعے کے لیے چند چیزیں ضروری ہیں۔ اوّل بیان کا تسلسل، دوم مناسب اختصار، سوم برجستگیٔ ادا اور شوخی و ذہانت، چہارم کسی حقیقت یا دانش کا ابلاغ۔ ان صفات کے علاوہ واقعہ، حکایت یا مکالمہ کا بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ سب شعراء نے اس کا التزام نہیں کیا۔ میری دانست میں دو اشعار والے قطعے میں اور رباعی میں جو شے مابہ الامتیاز ہونی چاہیے وہ ایک تو خود وزن کا اختلاف ہے اور دوسری یہی بات کہ رباعی میں حقیقت کا بیان حکایت کا رنگ اختیار نہیں کرتا مگر قطعے کی ایک مخصوص صفت، یہ ہے کہ اس میں بیانِ حقیقت کے لیے حکایت یا واقعہ کا ڈھانچہ تیار کرنے سے بات زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رباعی کی روح نسبتاً سنجیدہ ہے۔ اس میں طنز و لطیفہ بعض کی چبھن یا حقیقت کی درشت بیانی مناسب ہے، البتہ قطعات میں برجستگیٔ ادا اور لطیف نکتہ آفرینی بھی کافی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ جس چیز کو ہم قطعہ بند کہتے ہیں کیا وہ بھی قطعہ ہوتا ہے، یا . . . . . . اس سے کوئی مختلف چیز ہے۔ غزل میں آئے ہوئے قطعہ بندوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ تسلسل کے لحاظ سے تو یہ قطعہ ہی ہوتا ہے مگر اس میں مکمل قطعے کی صفات نہیں پائی جاتیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل میں "قطعہ بند" لانے کی ضرورت کیا ہے؟ بظاہر اس سے منہ کا مزا بدلنا مقصود ہوتا ہے اور غزل کی پریشاں خیالی کے اندر مربوط مضمون کا پیوند لطف دیتا ہے۔ یہ قطعہ بند عموماً مختصر ہوتے ہیں مگر میرؔ و غالبؔ کی غزلیات میں قدرے طویل قطعے بھی ہیں بلکہ ایک غزل میں ایک سے زیادہ قطعے بھی ہیں مثلاً غالبؔ کا مشہور قطعہ ؏

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

قطعہ بند نگاری کی یہ خاص کوشش اردو میں میرؔ و سوداؔ کے یہاں کچھ زیادہ ہے جس کے سماجی و سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں مگر ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد اب میں حالیؔ کی قطعہ نگاری کا تجزیہ کرتا ہوں۔

حالیؔ اور اکبرؔ — جدید زمانے کے دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں قطعہ نگاری کا شعور خاص طور سے نمایاں ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اکبرؔ کو حالیؔ کے مقابلے میں قطعے پر زیادہ قدرت ہے مگر حالیؔ کے قطعے بھی خصوصیات کے مالک ہیں اور ان میں حالیؔ کا رنگِ طبیعت جھلکتا ہے۔

حالی کے متعلق ایک بات تو واضح ہے کہ وہ قطعہ نگاری کے اصول سے باخبر تھے۔ انھوں نے قطعے کو اصلاً واقعے سے وابستہ کچھ کر اسی کو بیانِ حقیقت کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے قطعوں میں اخلاق و موعظت کا رنگ غالب ہے اور اس موعظت و بیان کو اپنے زمانے کے اخلاقِ اجتماعی کی اصلاح مدِ نظر ہے (اور اس حد تک اس کو مسدس کے سلسلے کی شے ہی سمجھنا چاہیے) مگر ایک حصہ ایسا بھی ہے جس میں عالمگیر فلسفیانہ حقائق بیان ہوئے ہیں۔

حالی نے اپنے قطعات کے متعلق تو خود بھی اظہارِ رائے کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے اپنے قطعات و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیے ہیں جو شاید کہیں کہیں مطائبہ کی حد تک پہنچ گئے ہوں۔ زمانے کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں پیدا ہوئیں یا جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگی انہی پر قطعے لکھے ہیں۔ اسی طرح حکایات و قرآنِ کریم سے بھی استفادہ کیا ہے مگر ان میں کہیں ترمیم کہیں اضافہ بھی کر لیا ہے۔

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ حالی کی نظر میں قطعہ نگاری ایک فنِ خاص ہے جس کے چند اصول ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ حالی نے قطعات میں کنایہ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس میں لطیف مزاحیہ رنگ بھرنے کا بھی اقرار کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قطعہ کسی حقیقت یا فلسفیانہ نکتے کے برجستہ بیان کا وسیلہ ہے اور غور کیجیے تو مضمون کی خاص نوعیت کے باوجود اس میں کوئی بات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس کے اندازِ بیان میں شوخی، برجستگی اور انوکھا پن پیدا نہ ہو اور اس کا سب سے بڑا حربہ طنز و کنایہ ہے۔ حالی نے قطعات میں طنز و کنایہ کو کہاں تک موثر بنایا ہے اس کا ذکر تھوڑی دیر کے بعد آتا ہے۔

حالی نے مضمون کو موثر بنانے کے کئی حربے اختیار کیے ہیں مثلاً حکایت کا استعمال، مناظرہ و مکالمہ، خود سے خطاب اور تمثیل کا استعمال ـــــ ان سب کا مقصود بعض اخلاقی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں میں کہہ سکتا ہوں کہ حالی نے قطعہ نگاری کا ایک نیا تجربہ کیا ہے اس میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں اور کہیں کہیں لڑکھڑائے بھی ہیں۔ کامیابی ان کی یہ ہے کہ انھوں نے طویل حجم والے قطعات کا تجربہ کر کے اردو میں مختصر نظموں کے رجحان کو ترقی دی ہے ـــــ میری رائے میں یہ ان کا غیر معمولی کام ہے کیونکہ طویل قطعے کو نباہنا کوئی آسان کام نہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر بے مطلع نظم قطعہ بن سکتی ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ قطعے میں خیال آرائی کی مطلق گنجائش نہیں، اس کے برعکس نظم کی بعض اقسام تخیل کے زور سے چلتی ہیں۔ اسی طرح رباعی لکھ کر اس کو قطعہ کہہ دینا بھی بے اصولی بات ہے۔ قطعہ چار مصرعوں میں سمیٹا جا سکتا ہے مگر قطعے کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ اس کا دامن رباعی سے وسیع ہو تاکہ بات قدرے کھل کر کہی جا سکے۔ قطعے کی دوسری سرحد اس سے بھی زیادہ صبر آزما ہے یعنی اگر تعدادِ اشعار میں ناموزونیت پیدا ہو جائے (یعنی شعر زیادہ ہو جائیں) تو مضمون بھٹکا ہوا ہو جاتا ہے ـــــ حالی ان صبر آزما مراحل میں کہیں کامیاب ہوئے ہیں اور کہیں پاؤں سنبھال نہیں سکے مگر ان حالات میں شاید کوئی دوسرا بھی سنبھل نہ سکتا۔

مختصر یہ ہے کہ حالی ان باتوں کے شناسا تھے اس لیے انھوں نے قطعے کی بنیادی شرائط سے اطلاع کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے اور قطعے کی تکنیک کا خاص خیال رکھا ہے اور اس نقاد شاعر سے یہی توقع تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود حالی کے قطعات میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں جن کا تعلق ان کے علم اور شعور سے نہیں ان کے رنگِ طبیعت سے ہے۔ حالی کا یہ طبعی خاصہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بات کو پھیلا کر بیان کرنا چاہیں وہاں ایک طرح کی بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے ـــــ اور اگر

نمک پیدا ہوتا بھی ہے تو پھیکا پھیکا ——!

ان کے بیان میں سپاٹ پن بہت ہے اور کنایہ و خفا کی چھپی ہوئی تاثیر ان کے سب قطعات میں موجود نہیں۔ سادہ زبان میں صاف صاف بات کہنے کی صورتیں زیادہ ہیں اور بعض قطعے تو خود ان کے اپنے ہی قول کے مطابق بالکل بے نمک ہیں اور ان کے بعض قطعے ایسے بھی ہیں جو جسم کے عدم تناسب کے سبب اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں۔

قطعاتِ حالی کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ ان کا موعظتی طرزِ خطاب زیادہ کھلا کھلا ہے۔ قطعہ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ تمام گفتگو کا نتیجہ شاعر کی زبان سے ادا نہ ہو بلکہ بیان اندر سے خود بخود اپنا نقش مرتسم کرتا جائے مگر حالی اکثر اپنی ہی زبان سے نتیجہ یا اصلاحی سبق بھی سنا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس انکشاف طریقِ بیان سے قطعے میں وہ بات نہیں رہتی جو کنایہ کی زبان میں اگر ادا ہوتی تو بڑی تاثیر دکھا سکتی تھی۔

ایک اور بات یہ کہ حالی اپنی عام عادت کے مطابق بیان میں اختصار کی جگہ بے ضرورت پھیلاؤ کے طالب رہتے ہیں شاید عادت کے زیرِ اثر انھوں نے چھوٹے قطعوں سے اکثر دامن بچایا ہے اور لمبے مکالموں یا حکایتوں کا سہارا ڈھونڈا ہے جو طولِ بیان کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قطعے میں واقعہ کا ہونا پسندیدہ ہے مگر قطعے کی حکایت اور عام حکایت میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً عام حکایات میں اختصار ضروری نہیں سمجھا جاتا مگر قطعہ کی حکایت میں اختصار بنیادی چیز ہے۔ الا یہ کہ سلجوقیوں کے زمانے کے قطعات کی طرح قطعے کو تاریخی واقعہ نگاری کا وسیلہ بنانا مقصود ہو۔ غرض قطعے میں واقعہ نگاری مدِنظر نہیں ہوتی واقعہ نگاری کا محض احساس دلانا مقصود ہوتا ہے۔ سعدی کے حکایتی قطعات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں واقعہ نگاری کی طرف بہت کم میلان ہے۔ ان کے یہاں واقعہ محض اظہار کا بہانہ ہے۔ بہرحال حکایت میں واقعہ پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا اور واقعہ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ صرف واقعہ کی روح کا انکشاف مدِنظر ہوتا ہے اور یہی سعدی نے کیا ہے۔

حالی کے یہاں طولِ بیان اور پھیلاؤ کا میلان کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی واقعات سے کسی حقیقت ہی کا انکشاف کرتے ہیں مثلاً قطعہ (چیونٹیوں کا بیڑا بن جانا) قطعہ (ایک خود پسند امیر زادہ کی تضحیک) قطعہ (بدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی) قطعہ (نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام) قطعہ (ناشستہ لوگوں کا نرتا و سائل کے ساتھ) وغیرہ وغیرہ ——— ان میں سے اکثر میں حالی نے زندگی یا کسی اخلاقی حقیقت ہی کا انکشاف کیا ہے مگر ان میں سے بعض قطعات بے ڈھنگے ہو گئے ہیں مثلاً "قوم کی پاسداری" اور "چیونٹی بازی کا انجام" بہت اچھی حکایتیں ہو سکتی تھیں مگر ان میں آخر تک پہنچتے پہنچتے حکایت کا زور کم ہو گیا ہے یوں ان نظموں کا ڈھانچہ قطعاتی ہی ہے لیکن بیان کا زور کم ہے اور آخر میں تو عبارت کی لہر بہت کمزور پڑ جاتی ہے۔

حالی کے زوردار قطعے وہ ہیں جن کے آخر میں تضمین ہے ایسے قطعے جیسے ہوئی تضمین کے اردگرد بُنے گئے ہیں۔ ہر ایک قطعہ آخری شعر کی تضمین کی طرف بڑھتا گیا ہے اور آخر میں مصرعِ تضمین پر پہنچ کر اثر کی انتہا ہو جاتی ہے مثلاً مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر ——— کہ پڑھیے، اس قطعے میں ایک وحدت یا تمرکز ہے جس کے اردگرد باقی اشعار لپیٹے گئے ہیں اور قطعے کی تفصیل اثر کو کمزور کرنے کی بجائے اثر میں اضافہ کر رہی ہے۔ "چیونٹیوں کا بیڑا بن جانا" بھی ایک تضمینی قطعہ ہے۔ اس میں واقعہ کی برکت بھی ہے اور بیان بھی اور تضمین نے تو خاص زور پیدا کر دیا ہے۔

میں کہہ آیا ہوں کہ قطعے میں دو چیزیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ ایک چیز تو ہے کسی حقیقت کا اظہار جو واقعہ و مکالمہ کی صورت میں ہو تو بہتر ہے اور دوسری اس کا برجستہ اندازِ بیان جس میں طنز کی یہ دھار تاثیر کو گہرا کر رہی ہو۔ حالی بیانِ حقیقت اور واقعہ و مکالمہ کی حد تک تو ٹھیک

رہتے ہیں مگر ان کے قطعوں میں طنز کی دھار زیادہ تیز ہے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق وہ "مطائبہ" تک تو پہنچتے ہیں مگر یہ مطائبہ پھیکا سا ہوتا ہے۔ اگر مطائبہ سے ان کی مراد طنز ہے تو ان کے طنز یہ فقرے کوئی کسک پیدا نہیں کرتے، ان کو تو چٹکی سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ شاید اس صفات حالی کی عادت ہی یہ ہے کہ وہ چٹکی کاٹنے میں بھی دل سے ہنستے ہیں اور نشتر چلانا تو ان کی طبیعت کے سخت خلاف ہے۔ ان تصریحات کے ثبوت کے لیے ان کا یہ قطعہ ملاحظہ کیجئے ؎

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری — جو تھا سو ہمہ تن غم اپنا کھا رہا تھا
دنیا سے اٹھ گئے سب تھے جو مرید صادق — یہ کہہ کے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری — یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور شیخ کو بھی رلایا

یہ قطعہ کتنا سپاٹ، کتنا خشک، کتنا بے نمک ہے۔ اس قطعے کے آخری مصرعے میں طنز بھی ہے تو بہت ہلکا اور پھیکا۔ یہاں اگر سعدی یا اکبر ہوتے تو خدا معلوم کیسے نشتر چلاتے مگر حالی کے اس قطعے کے آخری مصرعے میں رونے رلانے کے ذکر کے باوجود کوئی اثر نہیں شاید چند مصرعے اور ہوتے تو تفصیل سے کوئی گہرا یا کم از کم اثر پیدا ہو جاتا مگر اس حالت میں تو ادھورا اثر ہی معلوم ہوتا ہے۔ حالی قطعے میں طنز کو نباہ نہیں سکے۔ اس قسم کا ایک اور قطعہ ملاحظہ کیجئے ؎

افسر کا بگڑتا ہے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام — اپنے ماتحتوں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقت باز پرس — اپنے ماتحتوں کے سر تھوپتے ہیں اپنی خطا

اس قطعے میں ایک عادت، ایک کج روی کی نشان دہی ہوتی ہے مگر تاثیر پیدا نہیں ہوتی اس لیے کہ بات سپاٹ انداز میں کہی گئی ہے اور سپاٹ اندازِ بیان اطلاع یا علم کی حد تک ٹھیک ہے، متنبہ کرنے یا چونکا دینے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ — اور یوں کہنے کو تو حالی نے ظرافت کی بیشتر اقسام سے کام لیا ہے مثلاً تضاد و نما حقیقت یا حقیقت نما تضاد (PARADOX) سے یا تنزکی یہ نزکی فقرے بازی سے، یا لفظی نکتہ آفرینی سے یا تکیۂ کلامی سے یا تمثیل سے، وغیرہ وغیرہ — یہاں تک کہ اکبری انداز کی WIT سے بھی کام لیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے یہ انداز بہت کم اختیار کیا ہے اور یہ اچھا ہی کیا ہے کیونکہ دنیا کا اصول مسلّم ہے "ہر کارے و ہر مردے" — دراصل حالی اس میدان کے مرد نہ تھے۔ یہ میدان اکبر ہی کے اشہبِ قلم کے لیے مخصوص تھا۔ حالی نے اکبر کے رنگ میں جو قطعہ لکھا ہے وہ درج ذیل ہے ؎

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو — تختِ پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ ان مقننوں نے — عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اس کی قبل از بلوغ شادی — کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک ان کے گویا عقل و دانش — ہے کنگڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

اس قطعے کے آخری مصرعے میں لفظی مزاح موجود ہے مگر اکبر کے اسی قسم کے قطعات کو اس کے برابر رکھ کر دیکھئے تو فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔

سطورِ بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں حالی کے قطعات پر خواہ مخواہ اعتراض کر رہا ہوں۔

میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی کے قطعات پر ان کی طبیعت کا اثر پڑا ہے جس کی وجہ سے ان میں سے بعض کچھ خشک ہو گئے ہیں اور وہ قطعے کے پھیلے ہوئے جسم میں بعض اوقات جان نہیں ڈال سکے ورنہ یہ امر واقعہ ہے کہ نئے دور میں حالی نے قطعہ نگاری کا ایک علمی معیار قائم کیا ہے ——— اور قطعے کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سعدی سے جا ملا ہے۔ انھوں نے قطعات کی تعداد اشعار کے بارے میں اپنے ذوق کو رہنما بنایا ہے اور اگر غور کیا جائے تو قطعے میں تعداد اشعار کی جو آزادی ہے اس کے پیش نظر تعداد اشعار، موضوع و مضمون کی نوعیت کے مطابق اور ذوق کی رہنمائی ہی سے متعین ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے کسی قاعدہ و قانون کی ضرورت نہیں۔

حالی کے دیوان میں کچھ لمبے قطعے بھی ہیں جو موزوں طول سے کچھ زیادہ ہی لمبے ہیں اور دیوان میں بھی ان کو قصائد ہی کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہ قطعات بعض واقعات تاریخی یا موضوعات وقتی کے ساتھ وابستہ ہیں اور بعض کا رنگ ڈھنگ مرثیے کا ہے۔ ان سب میں مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے مگر یہ نثری قسم کی نظمیں ہیں ان میں ایک آدھ کے ماسوا کسی میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ ان کے اصل اور معیاری قطعات وہی ہیں جن کے ذکر میں کہہ آیا ہوں کہ حالی نے خود کو جہاں بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہاں ہی ان کے یہاں ایجاز سے اعجاز پیدا کیا ہے مثلاً حالی کی رباعیات اور غزل دونوں میں اختصار کی ضرورت نے بڑا حسن پیدا کیا ہے۔ حالی کی بعض رباعیوں میں مرابع قطعات کا رنگ پایا جاتا ہے اور ادا کی شوخی و برجستگی اور آخری مصرع کے زور نے ان میں بھی بڑی قوت پیدا کر دی ہے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ حالی کی رباعیات ان کے قطعات سے زیادہ موثر ہیں مگر قطعہ نگاری میں بھی وہ اصول شناس ثابت ہوئے ہیں ——— ان کے قطعات واقعہ یا مکالمہ کی بنیاد پر کھڑے ہیں اور ان میں مطائبہ کا لطیف رنگ بھی پایا جاتا ہے مگر ان کے طنز میں چونکہ عمومی طور پر ملائمت پائی جاتی ہے اس لیے طویل بیان کے بعد ملائم طنز یہ بیان نرم پڑ جاتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوا اور طنزیہ بیان میں چبھن ہے (مثلاً "دلی کی شاعری کا تنزل" میں) وہاں قطعہ خوب چست بیٹھا ہے۔

بہرحال حالی کے قطعات ان مختصر نظموں کے پیش رو ہیں جن کی حسین تر شکل شبلی، اقبال، اکبر اور ظفر علی خان کی واقعاتی اور تاریخی نظموں میں ملتی ہے جو یقیناً حالی کے قطعات (اور دوسری نظموں) سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہوں گی۔

اردو ادب اور تحقیق

مظفر علی سید

نقاد اور محقق ہمارے زمانے کے بدنام ترین لفظ ہیں۔ نقاد کا لفظ طعنے کے طور پر ہر اس آدمی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو زیرِ نظر رکھتا ہو اور محقق، حقہ پینے والوں کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے معنوی غزنویوں سے لے کر رسالے اخبار پڑھنے والوں تک کے لیے یہ دونوں لفظ مرعوبیت کی ایک ایسی فضا کے آئینے ہیں کہ ان سے نفرت زیادہ ہوتی ہے اور احترام کم محسوس ہوتا ہے۔

ہمارا زمانہ تقسیمِ کار کا زمانہ ہے۔ ایک صاحب ہیں وہ پیچ کسنے کے ماہر ہیں مگر دائیں سے بائیں کی طرف۔ اگر آپ کو الٹے رخ کا پیچ کسوانا ہے تو کسی اور ماہرِ خصوصی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ صنعت و حرفت میں اس تقسیمِ کار کے بغیر گزارہ نہیں مگر علم و ادب میں یہ چیز کچھ اس طرح داخل ہو گئی ہے کہ ایک خرادیے کا بڑھئی ہونا تو سمجھ میں آتا ہے ایک شاعر کا عالم ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

محمد حسین آزاد نے آبِ حیات لکھی تو اس بات پر غور کرنا پسند نہ کیا کہ یہ تنقید کی کتاب ہوگی، ایک تحقیقی کارنامہ ہوگا یا ایک ڈرامائی مرقع۔ بعد کے لوگ اس الجھن میں پڑ گئے کہ یہ کیا ہے۔ کسی نے کہا ڈرامائی مرقع ہے کسی نے کہا تنقید کی کتاب ہے۔ دو ایک حضرات نے یہ بھی ماننا شروع کر دیا ہے کہ اپنے وقت کا بہت بڑا تحقیقی کارنامہ بھی ہے۔ آزاد نے ایک موضوع انتخاب کیا۔ اس کے لئے مطالعہ، معلومات، سوجھ بوجھ، ذہانت، ذوقِ ادب اور تخیل سب کی ضرورت تھی اور چونکہ ان میں سے کوئی چیز ان پر حرام نہ کی گئی تھی، انھوں نے سب کو ملا جلا کر ایک ایسی تحریر ہمارے سامنے پیش کی کہ اردو کا ایک عام پڑھنے والا اسے مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور ایک مشکل مزاج عالم اس میں نت نئی باتیں دریافت کرتا رہتا ہے۔

غالب نے آتش کے بارے میں کہا ہے کہ اچھے شاعر تھے مگر یک فنی تھے۔ اس بلیغ فقرے میں ایک جہانِ معنی مضمر ہے۔ آتش اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے غزل کے سوا کچھ نہ کہا اور اس کے باوجود غزل میں کسی نئے انداز یا اسلوب کے حامل نہ بن سکے۔ جو ادیب یا شاعر اپنے آپ کو ایک ہی صنفِ کلام تک محدود کر لیتا ہے وہ اس میں بھی کوئی مجتہدانہ شان پیدا نہیں کر سکتا۔ ہمارا زمانہ اس کے برعکس سوچتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سوچتا نہیں کہتا ہے۔ فلاں صاحب غزل بہت اچھی کہتے ہیں، فلاں رباعی کے استاد ہیں، فلاں نے قطعات اچھے لکھے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ یہ بات بہت کم لوگ سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں کہ مختلف اصنافِ کلام، لفظوں کی مختلف ترتیب پیش کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی ترتیب ایسی نہیں کہ ایک پر حرام ہو اور دوسرے پر حلال۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا ذہن ہی ایسا ہو کہ ایک خاص ترتیبِ الفاظ سے باہر نہ نکل سکے مگر یہ کہ سب ذہن ایک سے ہو جائیں یا ایک ایسی

خواہش ہے جو بنیادی جمہوریت بھی پورا نہیں کر سکتی۔

ہمارے ہم عصر جو خود کو تخلیقی فنکار سمجھتے ہیں اکثر اوقات نقادوں سے گلہ رکھتے ہیں۔ اس شکوے شکایت کی عام سطح اتنی اُونچی ہے کہ اگر اُن کا نام کسی لمبی فہرست میں آجائے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض حالات میں یہ گلہ نقادوں سے بڑھ کر اس صنف کلام سے ہونے لگتا ہے جسے تنقید کہا جاتا ہے۔ یہ بات اب عام طور سے مانی جاتی ہے کہ تنقید ایک حقیر صنفِ ادب ہے اور اس کے لکھنے والے اس سے بھی زیادہ حقارت کے مستحق۔ نقاد لوگ اس حقارت کا انتقام اپنے تخلیقی ہم عصروں سے لینے کی بجائے ایک اور طبقے سے لیتے ہوئے پائے جاتے ہیں، وہ طبقہ جو محققین کرام کے نام نامی سے موسوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تنقید حقیر ہے تو تحقیق حقیر تر۔ نقاد تو پھر بھی زندہ ادیبوں کے کسی کام آتے ہیں یا آسکتے ہیں، یہ محقق لوگ تو گڑے مردے اکھاڑتے رہتے ہیں اور ان کتابوں یا مصنفوں پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا اور کوئی نہیں جاننا چاہتا۔

تخلیق، تنقید اور تحقیق ہماری زبان میں باہم دست و گریباں ہیں۔ اگرچہ اس جنگ و جدل کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی زبان کے چند ایک محقق حضرات نے سترھویں صدی کے شاعروں پر توجہ کی۔ ان کا کلام نئے سرے سے مرتب کیا، اس پر حواشی اور دیباچے لکھے جن تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں ان شاعروں نے نغمہ گری کی تھی اُسے واضح کیا۔ یہ کلام اُن کے ذریعے بہت سے نوجوانوں میں رائج ہوا اور وہ نوجوان جو نئے زمانے میں نئی قسم کی شاعری کرنا چاہتے تھے اُن کو اس پرانی شاعری میں کئی ایک ایسی خوبیاں نظر آئیں جو انگریزی ادب میں فراموش کر دی گئی تھیں اور جن کو ایک نیا موڑ دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان محقق حضرات کے ذریعے انگریزی شاعری کا نیا دور پہلی مرتبہ سامنے آیا، اس نے شاعری کے ایک نئے دور کو جنم دیا اور اس طرح روایت کا تجربے سے رشتہ بندھا۔

تجربہ اور روایت کی بحث ہمارے دور کی مقبول بحثوں میں سے ہے اور ہم اپنے نقادوں کو اس بحث کی دونوں اطراف میں بڑی آسانی سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے ادب ہمہ تن روایت ہے۔ دوسرا کہتا ہے یہ چیز ہمہ تن تجربہ ہے۔ ایک کہتا ہے کہ حال، ماضی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے اور چاہے نہ چاہے اُسے پیدا ہونا ہی پڑتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود جنم دیتے ہیں او تخلیقی ادب کا ماضی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ایک گروہ غالب کا یہ شعر پڑھ کے سناتا ہے ؎

هرزه مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اور دوسرا یہ شعر ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی　　　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

دونوں گروہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ شعر ایک ہی آدمی نے کہے تھے اور محقق حضرات خصوصاً اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ غالب نے پہلا شعر کب کہا اور دوسرا کب۔ وہ اس بات کو جان سکتے تھے کہ پہلا شعر اس نے اس وقت کہا جب وہ اپنے نکالے ہوئے راستے کو ماضی کی شاہراہ سے مربوط کرنا چاہتا تھا اور دوسرا شعر اس وقت کہا تھا جب اس کا واسطہ ماضی پرستوں سے پڑا تھا جو باندھی ہوئی لیک پر چلنے پر فخر کرتے تھے اور جو بھی کوئی نیا راستہ نکالنا چاہتا تھا اس کو گمراہ سمجھتے تھے۔

انگریزی کے ایک جدید ناول نگار، شاعر اور ادیب JOHN WAIN نے پروفیسر لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے نزدیک، جب اُن کی اماں جان کی شادی ہو گئی تو شاعری ختم ہو گئی۔ کسی ایسے ہی مفروضے کی بنا پر ہمارے اساتذہ، جدید ادب پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اور کرم خوردہ مسوّدوں سے روحانی غذا حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک بھی اعتراض کی گنجائش نہیں کہ اپنا اپنا شغل ہے۔ مگر ان اساتذہ کے ہاتھوں میں علم و فضل کی دولت سے زیادہ، طباعت و اشاعت کے وسیلے ہیں اور وہ اس طاقت کے زور پر نہ صرف یہ کہ اپنی بات منوانا چاہتے ہیں بلکہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے ذریعے، درسی اور امدادی کتابوں کے بل پر اپنا نقطۂ نظر رائج کرنے کی پوری کوشش بھی کرتے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ ہمیں اپنے تہذیبی ورثے کو محفوظ اور شائع کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیئے۔ اردو ادب اور زبان کے بیشتر کارنامے یا تو قلمی نسخوں کی صورت میں یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں میں رہ گئے تھے یا فارسی زبان میں طبع ہوئے تھے جس کا رواج گھٹتا جا رہا تھا۔ کلکتہ، پٹنہ، لکھنؤ، علیگڑھ، رامپور، دہلی اور حیدرآباد دکن کی لائبریریاں ایسے قلمی نسخوں سے پٹی پڑی تھیں جن پر توجہ کی ضرورت تھی۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، بوڈلین، پیرس اور برلن کے عجائب گھروں اور کتب خانوں میں بے شمار قدیم تحریریں محفوظ تھیں۔ بقول اقبال ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو مغرب میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

ہماری وزارت تعلیم اور یونیورسٹیاں اس قومی امانت کو واپس لینے یا اس کی عکسی نقلیں حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھیں مگر اس کام کی اہمیت کا احساس ہی نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اہل علم کے دل سی پارہ ہوتے رہے اور علم ہماری دسترس سے دور ہوتا گیا۔

ہماری نت نئی حکومتوں کو یہ الزام تو دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے لیے کچھ نہ کیا مگر وہ مختلف ادارے جو سرکاری امداد سے وجود میں آئے اس کی کسی حد تک تلافی کر سکتے تھے اگر ہمارے اہل علم، اپنے کام کے بارے میں صحیح نقطہ نظر اور دیانت سے کام لیتے۔ ان کے مقابلے میں تو تجارتی اداروں نے ہی بہتر کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ امداد یافتہ اداروں نے آج تک اردو کی کوئی ایسی پرانی کتاب شائع نہیں کی جو پہلے اُن سے بہتر حالت میں نہ چھپ چکی ہو۔ فغان دہلی، دیوان شیفتہ اور حیات جاوید ایک امدادی ادارے نے شائع کیں اور یہ تینوں کتابیں مطبوعہ ایڈیشنوں کی نقل ہیں، کتابت کی بے شمار غلطیوں کے اضافے کے ساتھ۔ نہ ان کتابوں کو نئے انداز سے مرتب کیا گیا، نہ ان میں نیا مسالہ شامل ہو سکا، یہاں تک کہ ان کی ظاہری صورت بھی پہلے سے بہتر نہ بن سکی۔ معلوم نہیں اس انداز کے کام کے لیے سرکاری امداد کی کیا ضرورت تھی۔ بلکہ اس سے بہتر کام تو بغیر امداد کے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یہی عالم کراچی کے ایک امدادی ادارے کا ہے جس نے بیش قرار امداد پانے کے بعد صرف "باغ و بہار" کا ایک ایڈیشن شائع کیا اور وہ بھی ایک برطانوی ایڈیشن کی نقل۔ پاکستان کی کسی یونیورسٹی نے اردو ادب سے متعلق کوئی کتاب شائع نہ کی۔ حالانکہ آزادی سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کبھی کبھار ایسی غلطی کر دیا کرتی تھی۔

بزم اقبال، اقبال اکیڈمی، مجلس ترقی ادب، ادارہ ثقافت اسلامیہ، اکادمی، اردو ٹرسٹ، اور انجمن ترقی اردو کی جدید مطبوعات میں اول تو محض دس پانچ کتابیں ایسی نکلیں گی جو اردو ادب سے متعلق ہوں۔ پھر کئی برسوں کی امداد کے بعد بھی ہنوز روز اوّل کا سا معاملہ ہے ہمارا قومی ورثہ بدستور کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن رہا ہے یا ان عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں

ان اداروں کے مقابلے میں ہندوستان کے افراد، تجارتی فرموں اور چھوٹے چھوٹے اداروں کا کام دیکھیں تو غیرت سے آنکھیں جھک جاتی ہیں بسلطنتِ مسلمان تو امداد کے بغیر ہی ایسا کام کر گزریں اور ہم امداد کے باوجود کچھ نہ کر سکیں، اس سے شرمناک بات کیا ہوگی۔

قومی ورثے کو محفوظ کرنے کا نعرہ لگا کے امداد حاصل کرنا اور اس کو کارِ دیگر میں لگانا، شاید اس سے بہتر کام ہمارے اہلِ علم کے بس میں نہیں تھا۔ ایک صدی پہلے ایک ہندو تاجر نے تاجرانہ مصلحتوں سے کام لے کر اس قومی ورثے کو چھاپ کے بیچنے کا ارادہ کیا اور یوں نولکشور پریس وجود میں آیا۔ اس اکیلے آدمی نے اپنے تنخواہ دار ملازموں کی مدد سے وہ کام کیا کہ ہمارے امداد یافتہ ادارے اہلِ علم کی امداد سے بھی شاید ایک صدی تک نہ کر سکیں۔ منشی نولکشور تو خیر ایک لاجواب شخصیت تھے، ہمارے ادارے تو نظامی پریس کا پور تک کا مقابلہ نہیں کر سکتے جس نے اردو ادب کی کئی ایک کتابیں دیدہ زیب انداز میں چھاپ کے انھیں رواج دیا۔ اس ادارے کی پشت پر بھی اس زمانے کے وہ ایک اہلِ علم تھے جو نام نمود اور بیش قرار معاوضوں کی بجائے علمی کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔

یہاں یہ سوال کرنا بالکل ٹھیک ہوگا کہ آخر اس قومی ورثے میں ایسے کیا لعل جڑے ہیں کہ اسے محفوظ کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچایا جائے۔ کیا ہم عصر اور جدید ادب کافی نہیں ہوتا؟ کیا اس کام پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے سے مردہ پرستی کا رجحان پیدا نہیں پاتا؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ماضی سے بے تعلقی ماضی پرستی کو جنم دیتی ہے، ہم اپنے قومی ورثے سے جتنی گہری واقفیت پیدا کریں گے اسی قدر نئے کام کی طرف راغب ہوں گے۔ ہمارے دور میں بدترین قسم کی مردہ پرستی کا رواج ہے اور اس کا اصلی باعث یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کے کارناموں اور شخصیتوں سے اچھی طرح واقفیت نہیں رکھتے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں کون واقعی قابلِ احترام ہے اور کیوں؟ جب ہم یہ جان لیں گے تو عزت و احترام کی بنیادیں بھی مضبوط ہو جائیں گی۔ اور اپنا معیارِ نظر بھی بلند ہوگا۔

ہمارے تخلیقی فن کار اس قسم کے کام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اس حد تک وہ بالکل درست ہیں کہ جس انداز میں یہ کام ہمارے یہاں ہوتا ہے اس سے نہ ہونا ہی بہتر ہے مگر اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ماضی کا تمام ورثہ دریا برد کر دینا چاہیے۔ یہ غلط فہمی بھی عام طور پر پائی جاتی ہے کہ تخلیقی فن کار کو ایسے کاموں سے دور رہنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اگر سچا ہے تو تخلیق کے لیے زہر کا حکم نہیں رکھتا، اکسیر کا کام دیتا ہے۔ شبلی، حالی اور آزاد کی تخلیقی صلاحیتوں نے علم و فضل کی دولت سے جلا پائی تھی اور آج بھی یوں ممکن ہے۔ ان سے ذرا چھوٹے پیمانے پر حسرت موہانی کی شخصیت ہے جنھوں نے ماضی کا ورثہ محفوظ کرنے کی انفرادی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کی شاعری دبنے کی بجائے اور نمایاں ہوئی۔ "انتخابِ سخن" کی گیارہ جلدوں میں اُردو غزل کی روایت کا بہترین حصہ محفوظ ہو گیا ہے اور ان میں ایسا ذخیرہ بہت سا ہے کہ حسرت موہانی اس طرف توجہ نہ کرتے تو اب تک تلف ہو چکا ہوتا۔ تیس ایک سال پہلے کئے گئے اس کام پر ہمارا زمانہ اب تک کوئی خاص اضافہ نہ کر سکا۔ شاہ حاتم، قائم، مصحفی، جرأت وغیرہ سے ہماری جو واقفیت ہے۔ آبِ حیات کے بعد حسرت موہانی ہی کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے زمانے نے ان ناموں کی قدر کرنا تو سیکھ لیا مگر اس قدردانی کا جو حق تھا اُسے ادا نہ کیا۔

حسرت موہانی مرحوم کا یہ کام بحیثیت تحقیقی کام تو نہیں کہا جا سکتا مگر اُسی قسم کے شاعروں کی تخریبِ جہالت کے مقابلے میں یہ کام بھی علمی ہی کہلائے گا۔ تحقیقی کام اسے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ترتیب و تدوین کے جدید علمی اصول یہاں استعمال نہیں کئے گئے۔ یہ جدید علمی اصول، یورپ کی درسگاہوں اور کتب خانوں میں متعین کئے گئے۔ ان میں سے بعض ہماری کلاسیکی زبانوں کے علماء کی نظروں سے بھی اوجھل

نہیں تھے مگر اردو زبان میں تحقیقی کام یورپ کے علماء نے ہی شروع کیا اور اردو ادیبوں شاعروں کے کارنامے انہی لوگوں کی سعی و اہتمام سے طبع ہوئے۔ جس طرح ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اردو صرف و نحو اور لغت پر کام کا آغاز کیا اسی طرح اردو طباعت بھی انہی کی زیرِ نگرانی کلکتے میں پھلی پھولی۔ کلیاتِ میر اور انتخابِ سودا فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہوئے۔ اگرچہ یہ کام دیسی منشیوں نے انجام دیا مگر ڈاکٹر گلکرسٹ کی علمی بصیرت کا دخل یہاں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ گارسیں دتاسی جس کا نام اب اردو خوانوں کے لیے نیا نہیں۔ اردو ادب کے سلسلے میں فنِ تحقیق کے امام کی حیثیت کا مالک ہے۔ یہ فرانسیسی عالم جس نے پیرس میں بیٹھ کر اردو سیکھی اور اس کی تعلیم سے لے کر طباعت تک کے انتظامات کیے، اردو ادب کی تاریخ میں ہی نہیں سارے مشرقی علوم کے وسیع میدان میں ایک انوکھی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے کارناموں کا ابھی تک صحیح اندازہ نہیں کیا گیا۔ اس کی "تاریخ ادبیات ہندوستانی و ہندوی" اگرچہ پوری طرح اردو میں ترجمہ نہیں ہوئی مگر یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ جزوی غلطیوں اور تسامحات کے باوجود اردو کے ادیبوں شاعروں کی اس سے بہتر کوئی بائیوگرافیکل ڈکشنری موجود نہیں۔ اس کے خطبات اردو میں طبع ہو کر اپنا علمی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے اردو ادب پر بہت سا کام کیا۔ فرانسیسی زبان میں کئی ایک اردو تحریروں کے ترجمے کیے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ اردو شاعری کے چند ایک کارنامے جدید علمی اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیے۔ چند قصوں کے علاوہ اس سلسلے میں اس کا سب سے بڑا معرکہ کلیاتِ ولی کی ترتیب و تدوین تھا۔ جس سے ہمارے یہاں پورا فائدہ اٹھایا نہیں گیا، نہ اس کے طویل دیباچے سے جو اب تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔

دتاسی کے علاوہ دوسرا بڑا نام ڈنکن فوربس کا ہے جس نے ایک عمدہ ہندوستانی انگریزی لغت کے علاوہ "باغ و بہار" کا بہترین ایڈیشن بھی نئے سرے سے مرتب کر کے شائع کیا جس کی اہمیت کا یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے علماء اب تک اس کی نقل کیے چلے جاتے ہیں۔ افسوس کہ دتاسی اور فوربس کی طرح کے لوگ یورپ میں پیدا ہونے بند ہو گئے ورنہ یہ کام اس سے بہت آگے جا سکتا تھا۔ مشرقیات سے دلچسپی رکھنے والے یورپی علماء نے عربی، فارسی اور ترکی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اردو زبان کی وسعت اور معنویت کو فراموش کر دیا۔ کی براؤن، نکلسن، روزن، اور ان کے بعد آربری نے اردو ادب کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور ان کے پڑھائے ہوئے ہندوستانی طلباء نے بھی ان کی طرح فارسی عربی ادب پر ہی توجہ دینا پسند کی۔ مولوی محمد شفیع، پروفیسر اقبال مرحوم اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے خود اردو ادب پر کوئی خاص کام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جدید علمی بنیادوں پر اردو ادب کی دنیا میں تحقیق و تفتیش کا کام ہمارے علماء نے بڑی دیر میں شروع کیا اور اس نئے دور کی سربراہی ایک پرانی قسم کے عالم نے کی۔ مشہور شاعر اختر شیرانی کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم مستشرقین کے شاگرد نہ تھے مگر برٹش میوزیم کی ملازمت کے دوران میں جدید علمی اصولوں سے انھوں نے ضرور آگاہی پیدا کی ہو گی۔ "پنجاب میں اردو" اور "تنقید شعر العجم" ان کے مشہور کارنامے کہے جاتے ہیں۔ دوسری کتاب فارسی شاعروں پر نئی تحقیق پیش کرتی ہے مگر انہی کی ایک دوسری کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کی طرح اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پرتھوی راج راسو پر کچھ تاریخی کام کیا اور محمد حسین آزاد کی تحقیق میں غلطیاں نکالیں۔ "مقالات شیرانی" میں قصہ چہار درویش اور میر جعفر زٹلی پر ان کے مضامین کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مرغوب اندازِ تحقیق خوردہ گیری اور نکتہ چینی کا ہے۔ ان کی توجہ اس بات پر زیادہ مرکوز رہتی ہے کہ پچھلے لوگوں نے کیا کیا غلطیاں کیں اور کیا کیا حماقتیں ان سے سرزد ہوئیں۔ ان کا علم و فضل اس قابل تھا کہ اس سے کوئی مثبت قسم کا کام لیا جاتا۔ "پنجاب میں اردو" اس قسم کا ایک کام تھا اور قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ

"مجموعۂ نغز" بھی جو انھوں نے ایڈٹ کرکے پنجاب یونیورسٹی سے شائع کیا۔ پنجاب میں ان کا طویل قیام اور شاگردوں کے حلقے پر اُن کا اثر اس بات کا متقاضی تھا کہ اردو ادب میں تحقیق کا ایک نیا دور شروع ہوتا مگر ان کی ذات سے خوردہ گیری اور تفاصیل پرستی کے رجحانات نے پرورش پائی اور تحقیقی کام میں مذہبی مناظرے کا سا انداز پیدا ہوا۔ ندوہ اور علیگڈھ سے ان کی لڑائیاں ساری عمر چلتی رہیں اور بہت سا وقت اور کاغذ ان پر برباد ہوا۔ انجمن ترقی اُردو نے بھی جو ان کی مویّد اور ہمنوا تھی۔ اُن سے کوئی اچھا کام نہ لیا۔ اور اس طرح ایک نہایت وسیع النظر عالم ذاتی اور گروہی منافستوں کا شکار ہو کے رہ گیا۔ شیرانی مرحوم نہ پوری طرح پرانی قسم کے عالم تھے نہ پوری طرح نئی قسم کے۔ وہ درختوں کے پتوں اور ان کے رگ ریشوں پر بے حد توجہ کرتے تھے اور درخت کو بھول جاتے تھے۔

اسی زمانے میں انجمن ترقی اُردو نے منشی نولکشور کے انداز پر مگر خالص علمی دعووں کے ساتھ قومی ورثے کو محفوظ کرنے کا پروگرام شروع کیا۔ ان دو اداروں میں کوئی فرق تھا تو یہ کہ منشی نولکشور کی توجہ قومی سرمائے کے تخلیقی حصّے کو محفوظ کرنے پر مرکوز تھی اور انجمن نے اس کے علمی حصّے کو اپنا مخصوص میدان بنایا۔ شاعروں کے دیوان، مثنویاں اور قصّے کہانی کی کتابیں انجمن کے زیر اہتمام بھی طبع ہوئیں۔ مگر ان میں کوئی ایسی نہ تھی کہ بنیادی اہمیت کی مالک ہوتی یا کوئی بڑا کام سمجھی جاتی۔ زیادہ تر توجہ شعراء کے تذکروں پر کی گئی۔ مولوی عبدالحق معتمد انجمن نے بہت سے تذکرے مرتب کرکے انجمن کے زیر اہتمام طبع کرائے۔ میر، گردیزی اور قائم کے تذکرے، مصحفی کے تین تذکرے مخزن شعراء، گلشن ہند اور چمنستانِ شعراء انھوں نے ایڈٹ کرکے چھاپے۔ اس کے علاوہ ذکر میر، سب رس، قطب مشتری، من لگن، دیوانِ تاباں دیوانِ اثر، مثنوی خواب و خیال، باغ و بہار، آرائش محفل (افسوس) اور رانی کیتکی کی داستان بھی ان کے دیباچوں کے ساتھ طبع ہوئیں — ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ انھوں نے چند ایک مضامین بھی لکھے اور بیجاپور کے ملک الشعراء "نصرتی" پر ایک پوری کتاب تصنیف کی۔ ملک کے اہل علم نے ان کے ساتھ تعاون کیا اور انجمن کے لیے کتابیں مرتب اور تصنیف کیں۔ شیخ چاند مرحوم کی تصنیف "سودا"، احسن مارہروی اور ان کے بعد نور الحسن ہاشمی کی مرتبہ "کلیات ولی" مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرتبہ "دیوان یقین" اور "دیوان نظیر" نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا مرتبہ "تذکرہ میر حسن" اور مسعود حسن رضوی کا مرتبہ "دیوان فائز" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آزادی کے بعد انجمن مہاجر ہوئی تو یہ کام جاری نہ رکھا جاسکا اور "دیوان فغاں" کے علاوہ کوئی نئی کتاب انجمن نے شائع نہ کی اور یہ دیوان بھی خود انجمن کے قائم کردہ معیار کو برقرار نہ رکھ سکا۔

ترجمہ اصطلاحات، انگریزی اردو لغت اور قواعد پر مولوی عبدالحق کے دقیع کام کا ان کتابوں میں اضافہ کیا جائے تو ایک بہت بڑی علمی شخصیت کی تصویر اُبھرتی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ انجمن کے وسائل بھی بہت وسیع تھے اور بہت سے اہل علم کا تعاون اُسے حاصل تھا۔ پھر بھی جدید علمی اصولوں پر مولوی عبدالحق کا انداز ترتیب اور ان کے دیباچے پورے نہیں اُترتے۔ منشی نولکشور آنجہانی کی طرح اُن کا مقصد بھی قومی ورثے کو محفوظ کرنا تھا، اور اس محدود مقصد کو سامنے رکھا جائے تو ان کے کام کی اہمیت نمودار ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد یہ کام جاری نہ رہ سکا تو اس کی بڑی وجہ مولوی صاحب کا بڑھاپا ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے اہم کاموں میں وہ اب بھی جوانوں کی طرح مستعد ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ اپنے طویل تجربے اور اختیار سے کام لے کر نوجوان محققوں کی ایک جماعت تیار کرتے۔ مگر شیخ چاند مرحوم کے بعد کوئی ایسا نوجوان انجمن نے پیش نہ کیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن رضوی اپنے ذاتی کتب خانے اور انفرادی کام کے لیے معروف ہیں اور ایک متوازن طبیعت

کے مالک ادیب، اُستاد اور نقاد سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے ذاتی کتب خانے سے کام لے کر انھوں نے اردو ادب سے متعلق چند ایک متن شائع کیے ہیں اور وقتاً فوقتاً تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے علمِ تحقیق کے جدید اصولوں کی تربیت کسی غیر ملکی یونیورسٹی میں نہیں پائی۔ مگر یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ وہ ان اصولوں سے ناواقف نہیں ہیں۔ ان کے یہاں خورده گیری اور تفصیل پسندی کے سے رجحانات بھی نہیں ملتے بلکہ وہ نورد و دقائق کے کام سے کوئی دلچسپی رکھتے نظر نہیں آتے۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے جب "اندر سبھا" کے بارے میں یہ بحث چل رہی تھی کہ دربار اودھ سے اس کا کچھ تعلق تھا یا نہیں تو انھوں نے چپکے سے امانت کی لکھی ہوئی ایک ایسی شاہی تحریر پیش کر دی کہ جس سے سارا قضیہ از خود صاف ہو گیا۔ یہی مزاج اور دستاویزی انداز ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں ملتا ہے اور ان کے مضامین کو سنجیدگی اور متانت کا ایک خراب پہلو بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کے نام اور کام سے بالعموم بے توجہی برتی جاتی ہے۔ اور اس کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کے وہ مستحق ہیں۔ انھوں نے چپکے چپکے کام کیا ہے اور اس لیے ہمارے علمی نقار خانے میں ان کی آواز دب سی گئی۔ پھر چونکہ ان کا کسی ادارے سے کوئی تعلق نہیں رہا، اس لیے بھی ان کی تالیفات و تصنیفات کو اشتہار نہیں مل سکا۔ فارسی مرثیے پر ان کا مضمون، رباعیاتِ انیس اور روحِ انیس کے دیباچے اور ان کی مرتبہ کتابوں میں سے فیض میر، مجالس رنگین، دیوان فائز اور متفرقات غالب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حال ہی میں ان کی دو کتابیں "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" اور "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" شائع ہوئی ہیں جن سے اردو ڈرامے کے آغاز پر پہلی بار صحیح روشنی پڑی ہے۔ ان کے تحقیقی مزاج کا اندازہ کرنا ہو تو ان کی تصنیف "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے نہ صرف سطحی اعتراضات کرنے والوں کو سنجیدگی سے جواب دیئے ہیں بلکہ آبِ حیات اور اس کے مصنف کو اردو تحقیق کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ خراجِ تحسین ادا کیا ہے جو ہم پر کوئی اسی سال سے قرض تھا۔ آبِ حیات اپنے اندازِ تحریر ہی کے اعتبار سے اردو زبان کی بہترین کتابوں میں سے نہیں بلکہ اس میں بڑی بلاغت سے بے شمار کنایوں کا ذخیرہ بھی آ گیا ہے۔ جو بے انصافی اس کام کے حق میں صفیر بلگرامی، مولوی عبدالحی مصنف گلِ رعنا، فرحت اللہ بیگ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے ہاتھوں ہوئی تھی اس کتاب نے بڑی حد تک اس کی تلافی کر دی۔

ایک اور قابلِ احترام شخصیت جو اردو ادب کی تحقیق سے وابستہ ہے مولوی امتیاز علی عرشی صاحب ہیں۔ وہ رضا لائبریری، رامپور کے مہتمم ہیں اور ان کے کام کی پشت پر والیِ ریاست کی علم دوستی اور ہندوستان پریس رامپور کی طباعت ہے۔ مگر انھوں نے اپنے بلند علمی معیار کی مدد سے ان ذرائع کو بہت اچھی طرح استعمال کیا ہے۔ شاہ عالم کی نادراتِ شاہی، انشاء اللہ خاں کی دونوں نثری کہانیاں اور مکاتیب غالب کے جو ایڈیشن انھوں نے شائع کیے ہیں وہ کئی لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے لیے انھوں نے جو "دیوانِ غالب" مرتب کیا ہے اُسے بڑی آسانی سے دیوانِ غالب کا بہترین علمی ایڈیشن کہا جا سکتا ہے۔ امداد علی یکتا کے تذکرہ "دستور الفصاحت" کو انھوں نے جس طرح ایڈٹ کیا ہے وہ ان کے تحقیقی مزاج اور انداز کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ جو اردو شعرا کے تذکروں کی تاریخ ہے۔ اپنی جگہ ایک الگ تصنیف کا درجہ رکھتا ہے جس طرح "مکاتیب غالب" کا دیباچہ غالب کی زندگی کا ایک عمدہ خاکہ بھی ہے۔ مسعود حسن رضوی کی طرح وہ تنقیدی نظر بھی رکھتے ہیں جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کون سا کام ان کی محنت کا مستحق ہے۔ اس کے بعد وہ دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ دونوں سے کام لیتے ہیں اور اپنی تحقیق کے نتائج سنجیدگی آمیز سادگی کے ساتھ

واضح کر دیتے ہیں اور اس لیے ان کی تحقیق بھی ذاتی منافشوں سے بہت دور ہے۔ ان کے کام کی رفتار بہت زیادہ تیز نہیں اور اس کی بڑی وجہ ان کے کام کا انداز ہے مگر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اُردو کی ان بڑی کتابوں کو بھی نئے سرے سے مرتب کریں جو اب تک اچھی طرح پیش نہیں کی جا سکیں مثلاً کلیات میر، کلیات سودا وغیرہ۔ اب تک ان کی توجہ بیشتر غالب کو ملی ہے اور اس کام میں مولوی مہیش پرشاد، غلام رسول مہر، مالک رام اور مختار الدین احمد نے ان پر کچھ اضافہ کیا ہے مگر انھوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کو کوئی دوسرا آسانی سے ہاتھ نہ لگا سکے۔

ادبی تحقیق کے میدان میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کے ساتھ احترام سے زیادہ خوف کے جذبات وابستہ کئے جاتے ہیں اور جو حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی مزاج کو منطقی انتہا تک لے گئے ہیں۔ یہ ہیں قاضی عبدالودود، مشہور عالم اور محقق جو پٹنے کے ایک بیرسٹر ہیں اور اپنا رسالہ "معاصر" نکالنے کے علاوہ بہت سے ادبی اور تحقیقی جرائد میں مضمون لکھتے ہیں۔ خوردہ گیری اور تفصیل پرستی کا جو رجحان شیرانی مرحوم کے یہاں نظر آتا ہے، وہ قاضی صاحب کی ہر تحریر کی ہر ہر سطر میں ملے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدھ معمولی سی کتاب کے علاوہ ان کی کوئی تصنیف یا تالیف دیکھنے میں نہیں آتی۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی عالم اور محقق ایسا ہو جو اُن کی زد سے بچا ہو۔ محمد حسین آزاد، نواب نصیر حسین خیال، شاد عظیم آبادی، گارسیں دتاسی اور مولوی عبدالحق نیز اُن کے محبوب شکار ہیں۔ ان کے تحقیقی مزاج کا بہترین نمونہ ان کا مضمون "غالب بطور محقق" ہے جس میں انھوں نے غالب کو جاہل محض ثابت کرنے اور اس وجہ سے اُسے رد کرنے پر اپنی پوری علمی طاقت صرف کر دی ہے اور سینکڑوں کتابیں، مضامین اور قلمی تحریروں کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے زیادہ توجہ اس بات پر صرف کی ہے کہ فارسی لغات نویسوں کے خلاف غالب کا جہاد کس پائے کا تھا۔ یہ سوچنا انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ اس جہاد کا باعث کیا تھا اور یہ بھی کہ غالب کے خلاف جو پرچم انھوں نے بلند کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ ان کے اس طرح کے مضامین سے غالب کی شہرت کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ ان کا اپنا اور چند ایک نوجوان محققین کا مزاج اس سے ضرور بگڑ گیا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کو قاضی صاحب جیسا وسیع المطالعہ عالم آج تک نہیں ملا۔ مگر یہ بات بھی اُردو زبان و ادب اور اس کے مختلف اداروں کی بدقسمتی کی ایک دلیل ہے کہ اُن سے آج تک کوئی ایسا کام نہیں لیا گیا جو اردو ادب کے بھی شایانِ شان ہو اور ان کی علمی حیثیت سے بھی فروتر نہ ہو۔ خود اُن میں تنقیدی نظر کی اس حد تک کمی ہے کہ کام کرنے سے پہلے یہ غور نہیں کرتے کہ وہ اُن کی توجہ کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اُن کے علمی دبدبے کے سامنے بڑی آسانی سے ماند پڑ جاتے ہیں مگر ان اساتذہ کے پُر اغلاط کام پر توجہ کرنے کی نسبت کام سے اپنے آپ کو محروم رکھنا قابل معافی گناہ نہیں، اس سے تو بزعم خویش فہم کے علماء کو معاف کر دینا زیادہ آسان ہے جو جتنا بڑا جوہر رکھتا ہے اس سے اتنی ہی بڑی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ایک نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں مگر اُن کی پرانی تحریریں زیادہ تر تحقیق و تفتیش سے متعلق ہیں اور اُن کی تنقید سے زیادہ محنت اور گہرائی کی حامل "اردو شعراء کے تذکرے" اُن کا ایک طویل مضمون ہے جو کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ خان آرزو کی اردو فرہنگ "نوادر الالفاظ" کو انھوں نے عالمانہ انداز میں ایڈٹ کیا ہے۔ ان کی انگریزی تصنیف "اُردو نثر۔ سرسید کے زیر اثر" تنقید سے زیادہ تحقیق کا کارنامہ ہے۔ اُن کا تحقیقی مزاج بھی سنجیدگی اور متانت کا حامل ہے۔

اردو ادب اور زبان میں تحقیق کا ایک میدان ”دکنیات“ بھی ہے جس میں مولوی عبدالحق کے علاوہ شمس اللہ قادری، ڈاکٹر محی الدین زور، عبدالقادر سروری، نصیر الدین ہاشمی اور سید محمد قادری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان علما نے اردو ادب کے اس ابتدائی دور کو مرکز توجہ بنا کر بڑا قابل قدر کام کیا ہے خصوصاً ڈاکٹر زور صاحب نے۔ یہ کام بھی کافی دیر سے ماند سا پڑ گیا ہے اور لکھنؤ کے ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے علاوہ کوئی نیا آدمی اس طرف راغب نہیں ہوا۔ یوں ہند و پاکستان کی بہت سی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو زبان اور ادب کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان اداروں کا ہر معلم اردو اگر شاعر نہیں تو نقاد یا محقق ضرور ہے۔ جدید تعلیم اور جدید علمی فضا نے ان معلموں کو کسی نہ کسی ادبی یا علمی سرگرمی میں مصروف ہونا تو سکھا دیا ہے مگر صحیح علمی مزاج نہیں دے سکی۔ ان میں سے اکثر بیشتر غیر علمی نتائج نکالنے کے ماہر ہیں اور تالیف کو تصنیف بنا کے پیش کرنے کا کام بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“، نورالحسن ہاشمی کی ”دہلی کا دبستان شاعری“، ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ”اردو تنقید کا ارتقا“ اور ان کی مرتبہ ”کلیات میر“، خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ”میر تقی میر — حیات اور شاعری“ کے بارے میں لوگوں نے بہت کچھ کہا سنا ہے اور یہاں اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جدید علمی اصولوں کی بنیاد پر یہ کام کیے جاتے تو ان کی صورت بہت مختلف ہوتی۔ عشرت رحمانی کی تالیفات ”زہرِ عشق“، ”آغا حشر“ اور ”اردو ڈرامے کی تاریخ اور تنقید“ اسی تحقیقی مزاج کو پیش کرتی ہیں۔ ان تالیفات میں دوسروں کے کام سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور شاید ہی کہیں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ دوسروں کے کام کے ساتھ یہ فیاضانہ سلوک بھی علمی دنیا میں یادگار رہے گا۔ جناب تمکین کاظمی بھی جنھوں نے حال ہی میں ”فریادِ داغ“ کا ایک ایڈیشن چھاپا ہے اور داغ کی سوانح عمری تحریر کی ہے۔ اسی نہج کی تحقیق کے ماہر ہیں۔

معلمین اردو کی تحقیقات کا موضوع فقط وہ ادیب اور شاعر ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی امتحان کے نصاب کا حصہ ہیں۔ جو خوش قسمت اس دائرے میں نہیں آئے۔ اُن کو ہاتھ لگانا ان کے نزدیک گناہ سمجھا جاتا ہے۔ امدادی کتب کو ہمارے زمانے میں علمی اور ادبی کارنامے بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک بھی خیریت تھی اگر ان کتابوں میں کوئی نئی بات یا کوئی ذاتی کام پایا جاتا۔ ایسی تالیفات میں جلد بازی اور عبارت آرائی کے نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں اور چونکہ مولفین کی اپنے موضوعات سے کوئی گہری واقفیت نہیں ہوتی اس لیے ان میں جا بجا اسقام رہ جاتے ہیں۔ ان اسقام نے محققین کے ایک نئے گروہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا ہے اور نوجوانوں کی تحریروں کا موضوع زیادہ تر وہ تالیفات ہیں جو معلمین اردو نے اپنے طلبا کی رہبری کے لیے مرتب کی ہیں۔ ان نوجوانوں کی تحریروں میں ناآسودہ ذہن کی کارفرمائیاں بھی ہیں اور ان کی عیب جوئیاں اکثر اوقات ”طبقاتی نزاع“ کی یاد دلاتی ہیں مگر ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہی کام بہتر انداز میں بھی کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث کی تالیف ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ اور ”مصحفی“ پر ڈاکٹر وحید قریشی کے مفصل مضامین کا یہی عالم ہے۔ وحید قریشی ہمارے جانے پہچانے نقاد ہیں اور یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے پرانے بزرگ تو تحقیق چھوڑ کے تنقید کی طرف راغب ہو رہے ہیں اور نوجوان تنقید نگار تحقیق کی طرف لوٹتے ہیں۔ اصولاً اس میں کوئی خرابی نہیں اس لیے کہ مطالعہ رائے کو جنم دیتا ہے اور رائے کو صائب بنانے کے لیے مزید مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے مگر ہمارے اکثر نوجوان اس چکر سے نکلتے ہی نہیں۔ حال ہی میں ہندوستان کے ذہین اور باخبر نقاد ڈاکٹر محمد حسن بھی تحقیق کی جانب مائل ہوئے ہیں اور مبتلا کا تذکرۂ شعرا مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے نقاد جب تحقیق کی جانب مڑتے ہیں تو اپنے تنقیدی پس منظر کو فراموش کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں اور کسی پرانی طرز کے عالم میں

کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ وحید قریشی، ڈاکٹر مختارالدین احمد اور نثار احمد فاروقی پر قاضی عبدالودود کے تحقیقی مزاج کا اثر بھی ہے اور یہیں خوردہ گیری اور تفصیل پرستی کا رجحان ہمارے زمانے کا عام رجحان بن کے رہ گیا ہے۔

پھر بھی محققین کے اس گروہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اصابت رائے کو محنت مشقت کے ساتھ ملا کر عمدہ نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اردو کی نثری داستانوں پر ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب اور اردو تھیٹر پر ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے مضامین جدید تحقیق کے روشن پہلو کو پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح آمنہ خاتون نے انشاء اللہ خاں کی زندگی اور کلام پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ ایک پرانے بزرگ کلب علی خاں فائق رامپوری کا نام بھی اسی ضمن میں لینا چاہیے۔ اردو کے بڑے شعراء پر انھوں نے جو تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ انھیں پڑھ کر کون ہے جو ان کی طبیعت کے توازن اور مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا قائل نہ ہو۔ نگار کے داغ نمبر میں حیات داغ پر ان کا مضمون، شیفتہ کا غیر مطبوعہ کلام (معارف)، سودا (ماہ نو) حیات مومن (اورینٹل کالج میگزین) اور میر، ادبی معرکے میں (صحیفہ)، ہماری تحقیق میں ایک نئی آواز کو پیش کرتے ہیں۔ ہمارے محققین نے آج تک اس اختصار کے ساتھ کسی بڑے شاعر کی زندگی کی صحیح اور مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فائق صاحب کے ان مضامین میں دو خوبیاں ایسی ہیں جو ہمارے زمانے کے کسی ادبی محقق میں بیک وقت نہیں ملتیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جس شاعر کو موضوع بناتے ہیں۔ اس کو اپنے سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں (ہمارے محقق حضرات اس بات کے عادی ہیں کہ سماجی پس منظر کو الگ پیش کیا جائے اور شاعر کو الگ)۔
دوسرے وہ شاعر کے کلام کو اس قدر غور اور توجہ سے پڑھتے ہیں کہ وہی ان کا سب سے بڑا ماخذ بن جاتا ہے (یہ خوبی یوں بھی ہمارے محققین میں خال خال پائی جاتی ہے اور اکثر اوقات غلط نتائج بھی پیدا کرتی ہے)

اس جائزے کے بعد ہمیں دیکھنا ہے کہ ارباب تحقیق کی محنت اور مشقت سے ہمیں کیا حاصل ہو سکتا تھا اور کیا واقعتہً حاصل ہوا ہے۔ جس قومی ورثے کے محفوظ کرنے اور نئے دور تک مناسب شکل میں اور تاریخی پس منظر کے ساتھ پہنچانے کا مقصد یہ تحقیق انجام دے سکتی تھی۔ اس میں اسے محض ایک ابتدائی قسم کی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور یہ کامیابی بھی زیادہ تر افراد کی مرہون منت ہے۔ ابھی تک اردو زبان و ادب کے بڑے بڑے کارنامے حشرات الارض کی خوراک بن رہے ہیں، بدیسی عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت ہیں یا غلط ملط انداز میں طبع ہوتے ہیں۔ ان حالات میں عام پڑھنے والوں کے لیے تو کجا، اچھے خاصے نقادوں تک کے لیے ہمارا ادبی ماضی اچھی طرح واضح نہیں ہے۔ تنقیدی کام کرنے والا جب کسی موضوع پر کوئی کام کرنے بیٹھتا ہے تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حاضر مسالہ اس کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا اور اگر اُسے یہ کام کرنا ہے تو تعبیر، تشریح اور تاویل وغیرہ کو ملتوی کر کے اُسے خود تلاش اور تفحص سے کام لینا پڑے گا۔ اکثر اوقات وہ اپنے اصلی کام کو بھول کر یہ خدمت سر انجام دیتا ہے اور ماضی کی قدر و قیمت معین کرنے کا فریضہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

اردو ادب اور زبان کے بارے میں تحقیق کے کئی شعبے ایسے ہیں جن میں مزید کام کی بے حد گنجائشیں ہیں اور جن کے بغیر نہ اردو ادب اور زبان کے مختلف ادوار کا صحیح نقشہ سامنے آ سکتا ہے، نہ ہمارا ماضی ہمارے لیے کسی فیضان یا تخلیقی انگیخت کا باعث بن سکتا ہے۔

سب سے پہلے ماضی کے ادباء و شعراء کے کارناموں کی ترتیب و تدوین ہے۔ اب تک اردو کے کئی ایک اچھے شعراء مثلاً

جرأت، مصحفی، قائم، آبرو، درد، حاتم، میر حسن وغیرہ کے دیوان پوری طرح مرتب نہیں ہو سکے۔ بڑے شاعروں میں سے میر، سودا اور انیس کا کلام جدید علمی بنیادوں پر اب تک مرتب نہیں ہوا۔ ان کے مروج دیوان اور کلیات سے سب سے بے اطمینانی پائی جاتی ہے مگر کوئی محقق اس اہم کام کو ہاتھ نہیں لگاتا۔

ہمارے زبردست شعراء و ادباء کے خطوط بھی محققین کی توجہ کے منتظر ہیں۔ اب تک محض غالب کے خطوط پر اچھا کام ہوا ہے یا غالب کے بعد آنے والے چند ایک لوگوں پر — مثلاً سرسید، حالی، شبلی، داغ، امیر مینائی اور اقبال۔ اب تک کا مطبوعہ ذخیرہ ادبی تنقید کے مقاصد کے لیے سخت ناکافی ہے۔

ہمارے قدیم ادباء و شعراء کی مستند سوانح عمریاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ شہباز نے نظیر اکبر آبادی اور حالی نے غالب کی زندگی پر لکھ کر اس کام کا آغاز کیا تھا۔ ان کے بعد شیخ چاند کی سودا، عرشی کی حیات مومن، غلام رسول مہر کی غالب اور مالک رام کی ذکر غالب، انیس اور دبیر کی سوانح عمریاں، میر اور مصحفی کے مختصر سوانح لکھے گئے۔ یہ کام بھی ابھی ابتدائی منازل میں ہے۔

سوانحی کام کے سلسلے میں رد و قدح اور بحث مباحثہ ہمارے ارباب تحقیق کے درمیان بہت ہوتا رہتا ہے۔ کسی کی تاریخ وفات متعین کرنے کے سلسلے میں، کسی کے فلاں شہر میں وارد ہونے کا سن نکال لینے کے بارے میں ہمارے محققین آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں مگر آج تک کوئی اچھی بیاگرافیکل ڈکشنری اردو ادیبوں اور شاعروں کے حال میں ایسی نہیں لکھی گئی جو سب ادب دوستوں کے کام آسکے اور جو دتاسی کے بعد کے دریافت شدہ مواد کو بھی سمیٹ سکے۔

ہمارے قدیم ادباء و شعراء کے بارے میں سوانحی اور تنقیدی مواد فارسی میں موجود ہے اور فارسی زبان کا رواج تو جیسے ہمارے زمانے میں اٹھتا ہی جا رہا ہے۔ کئی ایک محققین کرام کی فاحش غلطیوں کی بنیاد فارسی سے ان کی ناواقفیت ہے مگر اس کے باوجود ہمارے شعراء کے زبردست تذکروں کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ میر کی خود نوشت سوانح عمری اور انشاء اللہ خاں کی کتاب "دریائے لطافت" کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ مگر پڑھنے والوں کو یہاں بھی خوب تر کی جستجو ہے۔ اردو ادب اور زبان کے بارے میں کچھ کام انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی موجود ہے اور اس کام کا غالب حصہ بھی اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوا۔

اردو زبان اور ادب نے برصغیر ہندو پاکستان کی تاریخ کے جس دور میں نشو و نما پائی اس پر مذہبی اور سیاسی مورخین نے اچھی طرح توجہ نہیں دی ہے۔ اورنگ زیب کے بعد کا عہد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور بے شمار سیاسی آویزشوں سے بھرا پڑا ہے اور اس لیے ایک پریشان کن موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی ہمارا کوئی محقق کسی ادیب یا شاعر پر قلم اٹھاتا ہے تو اپنے طور پر اس دور کی تاریخ لکھنے لگ جاتا ہے۔ نہ وہ اس کام کے شایاں محنت کرتا ہے نہ کسی مضبوط تاریخی شعور کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ تحقیقی کارناموں کے تاریخی حصے بے حد الجھے ہوئے اور اصل کام سے جدا جدا لگتے ہیں۔ "اردو ادب کا تاریخی پس منظر" ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ادب دوست مورخ کا منتظر ہے۔

اردو طباعت اور صحافت کی تاریخ بھی ہمارے کئی ایک تحقیقی مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اور ان کے ابتدائی ادوار کو اب تک کسی نے موضوع بنا کر مستقل کام نہیں کیا۔ کئی ایک الجھنیں اور غلط فہمیاں اس کام کے بغیر رفع نہیں ہو سکتیں۔

اردو زبان کے صرف و نحو اور لغت پر بھی تاریخی اور تحقیقی کام اب تک ملتوی ہوتا رہا ہے۔ زیادہ تر کام جو اردو زبان کی تاریخ

پر ہوا ہے۔ بدترین صوبائی عصبیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ شیرانی مرحوم نے "پنجاب میں اردو" لکھی تو بہت سے لوگوں کی توجہ اس قسم کے صوبائی جائزوں کی طرف مبذول ہوئی مگر شیرانی مرحوم کا ایک تو پنجاب سے کوئی پیدائشی تعلق نہ تھا، دوسرے انھوں نے صوبائی انداز کے دعووں سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر ان کے بعد آنے والے لوگ اس قسم کے خطروں سے نہ بچ سکے۔ پھر بھی لسانیات کے میدان میں ڈاکٹر محی الدین زور، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، احتشام حسین اور حال ہی میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے کام کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہے۔ "دکنیات" کے علاوہ یہ دوسرا موضوع ہے جس میں ہمارے محققین نے کوئی خدمت انجام دی ہے۔ ایک تو اس خدمت کو وسیع ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کام اس انداز میں کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو زبان اور ادب کو نیا راستہ ملے۔

بوڑھا اور رات

ابوسعید قریشی

مغرور برف پوش بلندیاں، پتھریلے نشیب، پگڈنڈیاں، جنگل، مرغزار، کھیت، ندیاں... مغلیہ مصوری کی طرح سب کچھ ایک ہی جگہ اکٹھا ہو گیا تھا اور اس پس منظر پر بیٹے جیسے گھونسلوں کے جھنڈ — جھونپڑے۔

بوڑھے سپاہی کا گھر بھی اسی منظر کا حصہ تھا۔

اس کے اخروٹ بادشاہوں کی طرح ٹوٹ جاتے، اس کی خوبانیوں کی گٹھلیاں باداموں سے بڑی اور میٹھی نکلا کرتیں اور اس کے کھیت کے چاول پر کلمہ طیبہ لکھا جا سکتا لیکن اس کے باوجود اس کے کانوں پر کاہلی نہیں جمی تھی۔ وہ کہا کرتا: "حرکت میں برکت ہے" اور اس کی بوڑھی رگوں میں خون اب بھی اسی رفتار سے دوڑ رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی وہاں آیا تھا اور اس کو چٹانیں کاٹنی، جنگل صاف کرنا، ندی کو بند باندھنا اور زمینوں کا سینہ چیرنا تھا۔

اس کے خاندان میں سپاہی کا پیشہ مقدس فریضے کی طرح چلا آیا تھا۔ ہر کنبے میں ایک جوان ایسا ضرور رہتا جو فوج کی نوکری کرتا، اس کے کسی بزرگ کا قول تھا کہ اپنی تلواروں کو ہمیشہ تیز رکھو، نہ جانے کب ان کی ضرورت پڑ جائے۔

فتح محمد خود بھی جنگ کے کئی میدان دیکھ چکا تھا اور اس کے بدن پر کرچ، کرچیوں، سنگینوں اور گولیوں کے کئی نشان تھے۔ اور اس روز اپنے بیٹے فتح علی کو رخصت کرتے وقت بوڑھے سپاہی کو وہ تمام معرکے یاد آ گئے جن میں اس نے "علی" کا نعرہ لگایا تھا۔ بیٹے کو سینے سے لگاتے وقت اس کو محسوس ہوا جیسے مجاہدوں کا ایک لشکر بھی وہی نعرے لگا رہا ہے:

"علی علی بہادرو!
علی علی دلاورو!"

"جب تک اس نعرے کی گونج باقی ہے بیٹا!" بوڑھے نے کہا، "تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہئے۔"

نوجوان نے اپنے باپ کے ہاتھ چومے، انھیں آنکھوں سے لگایا اور رخصت لیتے ہوئے کہا: "بچھیا کو رات اندر ہی باندھنا بابا! چیتے کو اس کی خوشبو آ جاتی ہے، اور کھیت میں الاؤ جلائے رکھنا ورنہ ریچھ مردار ایک چھلی نہیں چھوڑیں گے۔ تین چار دن سے لومڑی بھی آ رہی ہے چوزوں کے پیچھے۔"

"اللہ کے سپرد! اللہ کے سپرد! وہی رکھوالا ہے سب کا ——!" بوڑھے نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا ـــ "اب جاؤ! خدا تمھاری مرادیں پوری کرے۔"

شہر کو جانے والی پگڈنڈی چٹانوں کے پیچھے چھپ گئی۔ بوڑھے نے چشمے کے کنارے چیڑ کے پتوں پر شکرانے کے دو نفل پڑھے کہ اللہ نے آج میرے بیٹے کو بھی اس قابل کیا ـــ اور وہ پھر کام میں لگ گیا حتیٰ کہ سورج سفیدوں کے پیچھے چھپ گیا اور چاند چیڑوں کے پیچھے سے ابھرا۔

عشا کی نماز کے بعد اس نے اپنے بیٹے اور مجاہدوں کی سرخروئی کے لیے ہاتھ اٹھائے جو رضاکارانہ اپنے وطن کے اس حصے کی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے جس پر حریص ہمسایے قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ دعا کے بعد اس کو اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا اور مصلے پر ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن یکایک ڈربے کی جانب سے مرغیوں کا شور بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی گدی کتے کی گمبھیر سنائی دی۔ ـــ بوڑھا سمجھ گیا کہ لومڑی آئی ہے۔

اس کا ہاتھ اپنی بندوق کی طرف بڑھا لیکن جب وہ باہر پہنچا تو چاند اور الاؤ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ لومڑی کی گردن کتے کے منہ میں ہے۔

"نامعقول ـــ اب کہاں جائے گی بچ کر؟" ـــ اور دروازے میں کھڑا وہ لومڑی اور کتے کا تماشہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ لومڑی کی جدوجہد ختم ہو گئی۔

"موتی!"

موتی نے لومڑی کو چھوڑ دیا اور دُم ہلاتا ہوا اپنے مالک کی طرف بھاگا۔

"شاباش موتی شاباش!" بڈھے نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جیتے رہو! جیتے رہو!"

ڈربے کے باہر لومڑی کی لاش کچی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ بوڑھے کو وہ میمیں یاد آگئیں جو عالمگیر جنگ ختم ہونے کے بعد اتحادی فوجیوں کے پیچھے پیچھے گھوما کرتی تھیں اور جن کے ہونٹ مرغ کھائی ہوئی لومڑیوں کی طرح لال تھے۔

مکار! ایک رات تو مجھ کو بھی بہکانے آ گئی تھی فتنے! توبہ ہے ـــ کیسی ظالم مہک آ رہی تھی کافر کے کپڑوں سے ـــ بخشیو پاک پروردگار ـــ آہی چلا تھا شیطان کے بہکانے میں، پر اس وقت وہ یاد آ گئی تھی جنتی ـــ یوں لگ رہا تھا جیسے پاس کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے" اپنے بیٹے کی ماں کو بھول گئے؟" ـــ اور پل بھر کو اس کی آنکھوں کے آگے پانی بھری دھند چھا گئی۔

مگر موتی غرّایا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا حکم ہے۔ لومڑی کی خوبصورت چمکدار کھال پھر بوڑھے کے سامنے اُبھری۔ لومڑی کا چھوٹا سا خوبصورت منہ کھلا ہوا تھا۔

گلوبند بنتا ہے کھال کا ـــ ولایت میں تو سالیاں اس طرح پہنے پھرتی تھیں جیسے انھی کی کھال ہو۔ اری سر تو اتار بیکو جانور کا ـــ پر نہیں وہ بھی رہے گا۔ فیشن! فیشن! ـــ اور کبھی کبھی تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا منہ کس کا ہے۔ یہ عورت ہے یا بھیڑیا لومڑی ـــ وہ تو سچ مچ بھوکی تھی اس دن والی ـــ کتنا تو کھانا کھا گئی تھی ـــ بھوکی نہ ہوتی تو کالے آدمی کے پیچھے کیوں آتی کم بخت! ـــ ایسی جنگ سے بچائیو مولا جس میں جیت نہ ہو ـــ فتنے! فتنے! اللہ نہ کرے جو آج تیرے وطن پر بھی کسی کا قبضہ ہو جائے تو تیری بیٹیاں

جھنجھیاں بھی ——— وہ اپنے تصور سے کانپ اٹھا ——— اس دن سے بچا بیٹھ پولا ——— اس دن سے پہلے موت آ جائے!

اور اس کے ساتھ اس کے دل میں ممبروں کے خلاف جو نفرت کا جذبہ بلند ہوا تھا رحم میں تبدیل ہو گیا اور وہ شکست خوردہ موتی کی کھال پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کوئی کسی ذلیل و خوار کو سہارا دیتا ہے ——— سب کے گناہ بخش دے غفور الرحیم ——— اور سب کو بھوک سے بچا لے ——— بھوک ہی سب گناہوں کی ماں ہے موتی ——— چاہے وہ روٹی کی ہو چاہے مرد عورت کی ایک دوسرے کے لیے، دولت کی ہو یا اقتدار کی ہو یا ہوس کی! زر، زن، زمین، جو کہہ گئے ہیں بڑے سچ ہی کہہ گئے ہیں ——— اور شیطان بھی بھوک ہی کا دوسرا نام ہے پیارے! پر یہ ملاؤں کے سوچنے کی باتیں ہیں، تو اپنے کھیت کھلیان اور ڈھور ڈنگر کی فکر کر۔

اچھا بھئی موتی! اب اس کو ٹھکانے لگائیں ——— اس نے لومڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کھال کی تو بناؤں گا صدری ——— اپنے لیے ——— باقی سب تیرا ——— خوش ہے اب تو ——— موج ہو گئی ——— تو بھئی آدمی ہو کہ جانور پیٹ بھرنے کے لیے سب کو کام کرنا پڑتا ہے۔

لومڑی کی کھال اتارنے کے بعد اس نے اپنا منہ ہاتھ دھویا اور چھپر کے نیچے آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

اچھا بھئی موتی! ذرا دھیان رکھنا!

اپنا نام سن کر کتے نے دم ہلائی اور غرایا جیسے بوڑھے کی بات سمجھ گیا ہو۔

یہ تو جاگتوں کی دنیا ہے میرے بھائی! یہ بڑا بد کسی بڑھاپے کا کہ فتح محمد اب نیند میں بھی اونگھ جاتا ہے اور ایک وہ بھی عمر تھی کہ تین تین رات کا پہرہ دیا اور پلک نہ جھپکی۔ نیند! ایسے ہی تو نہیں مل جاتی۔ جس نے جان کو سکھ پہنچایا اس کو مل گئی ——— ارے تو بہت سو گیا موتی!

وہ ہنسا، جماہی لی اور سو گیا جیسے بچہ سو جاتا ہے اور خراٹے لینے لگا۔

دفعتاً کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں ——— بوڑھا بڑبڑایا ——— کم بختوں نے نیند حرام کر دی لیکن کتوں کا کام ہی بھونکنا ہے ——— اور پھر وہ کروٹ بدل کے سو گیا۔

مگر کتوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اب کے ان میں موتی کی آواز بھی شامل تھی۔

شور قریب آ گیا۔ موتی کی آواز میں غصہ تھا، وحشت تھی ——— یکایک اس کے فاصلے بدلنے لگے۔

بوڑھا چونک پڑا۔

چاند کی روشنی میں ایک سیاہ بگولا مکی کے کھیت میں گھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مکی کے ڈنٹھل ٹوٹنے کی آواز آ رہی تھی جیسے خنزیر جانگلوں کی ٹولی کھیت میں گھس آئی تھی۔ موتی کبھی سائے کی ایک طرف دکھائی دیتا کبھی دوسری طرف جیسے وہ موقع تلاش کر رہا تھا کہ کب اور کہاں حملہ کروں ——— اور پھر ریچھ اور کتا آپس میں گتھ گئے۔ بوڑھے سپاہی کا ہاتھ بندوق کی لبلبی پر تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کب فائر کروں۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں کتا گولی کی زد میں نہ آ جائے لیکن اتنے میں دونوں جانور آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور پھر کھیت کے پیچھے سے ایک وحشیانہ چیخ سنائی دی، بوڑھا سمجھ گیا کہ ریچھ کا پلہ بھاری ہے اور ریچھ کے بدن میں موتی کے گڑے ہوئے دانتوں کے تصور سے اس کے اپنے دانت بھی کچکچا اٹھے جیسے وہ بھی دشمن کے گوشت میں گڑے ہوئے تھے۔

ایک اور چیخ ——— اور کالا بگولا فتح محمد کے سامنے کھیت سے نکل کر پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگا۔ بوڑھے کی بندوق سے ایک شعلہ لپکا، ایک اور دردناک چیخ اور کالا بگولا رات کے سایوں کی طرف بڑھا۔ سوکھی ٹہنیاں ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ بگڑ بوتی اپنی کمر چاٹ رہا تھا۔

کیا ہوا موتی! ادھر آ ——— ارے! ——— بوڑھے سپاہی کی پیشانی پر ان گنت پہاڑیاں اُبھر آئیں ——— داؤ لگا ہی گیا ٹونیا جاتے جاتے۔ اوہ ذرا دیکھ تو بیٹے دے بابا۔ ہے بےغیرت میرا ایل بھی نہیں گذر سکتا ——— ہونہہ! کوئی بات نہیں، خیر ہے۔ بچاؤ ہوگیا بچہ جی! ایسے ہی ناخن لگا ہے۔ خون تو ابھی بند ہو جائے گا ——— اس نے چٹکی بجائی ——— ابھی! ریشم کی راکھ، کیا سمجھے:

اس نے اپنی جیب سے ریشمی لنگی کا ایک ٹکڑا نکالا جس کو وہ رومال کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اس کو ماچس دکھائی۔

یہ لے ——— کیسا ہی زخم ہو، خون بند کرنے کے لیے اس سے بہتر دوائی انگریز بہادر بھی نہیں جانتا ——— یہ لا فضل کرے گا اپنا ——— اور اس مردود سے میں کل نبٹ لوں گا۔ اوّل تو ایل جی سے دن نکلنے سے پہلے ہی اس کا دھڑن تختہ کر رہا ہوگا، اب تو نکل گیا ہے نا گرم گرم۔

سینہ ٹھنڈا ہو لینے دو ذرا، پھر دیکھیو تماشہ۔ بھالو بہادر رہتا، ڈگ ڈگی بجانا چاہتا تو بات ہی کیا ہوتی ———

اور اب اس بڑھیا کے منہ بھی کچھ ڈال دیں ——— اس نے بندوق سے خالی کارتوس نکال کر نیا کارتوس بھرتے ہوئے کہا ——

فتح علی کیا کہہ رہا تھا اس دن ——— ہاں! کہہ رہا تھا کہ بابا اب تو رائفل لے لو اور اس کو آرام دو۔ لیکن فتح محمد نے اسے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ بیٹا! اس کا میرا پرانا ساتھ ہے۔ اتنا پرانا کہ تیری عمر بھی اتنی نہیں ہوتی ابھی۔ تیرا چاؤ فوج میں پورا ہو جائے گا۔ رہا میں تو ایک تو اس کے ساتھ کچھ انسیت ہوگئی ہے، دوسرے اصل بات یہ نہیں ہوتی کہ بندوق نئی ہے یا پرانی، اصل چیز تو نشانہ باندھنے والی آنکھ ہے اور انگلی جو یہ جانتی ہے کہ لبلبی کب دبے گی ——— نہیں سمجھے! خیر کوئی بات نہیں، ایک روز آپ سے آپ سمجھ جاؤ گے، اس کا بھی وقت مقرر ہوتا ہے جیسے بیجوں کے پھلنے، انگور کی بیل میں بور، اور مکئی کے بھٹوں میں دانے پڑنے کا وقت، فصلوں کی کٹائی اور پن چکیوں کے چلنے، حملے کی تیاری اور حملہ کرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جس نے یہ بھید پا لیا وہ زندگی میں کبھی خطا نہیں کھائے گا ——— رہی رائفل، تو فوج میں تو خیر ٹھیک ہے کہ جتنی دور سے مار کر سکو اتنا اچھا ——— وہ بھی یوں کہ آج کل کی جنگیں ہی ایسی ہیں لیکن گھر میں رکھنے کے لیے بارہ بوری اچھی —
رائفل میں سو عیبوں کا ایک عیب تو یہی ہے کہ خدا نہ کرے نشانہ بال برابر بھی چوک گیا تو گولی کہاں سے کہاں نکل گئی اور کون جانے کہیں کوئی بچہ پھول ہی چن رہا ہو، یا کوئی مسافر ہی سستا رہا ہو پیڑ کی چھاؤں میں ——— نا بابا رائفل کو دور ہی رکھو گھر سے ——— اب تم کہو گے کہ بارہ بوری رکھنی ہے تو دونالی کیوں نہ ہو ——— سو اس میں بھی بھید ہے۔ دونالی ہوتی تو خطرہ کم ہوگیا نا کہ ایک نہیں تو دوسرا کارتوس تیار ہے ہی نا ——— لیکن جب خطرہ ختم ہوگیا تو بات ہی کیا رہ گئی بچے ——— نہیں سمجھے! کہا نا ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔

کارتوس بھرتے وقت اس کو یہ سب باتیں یاد آگئیں ——— اور اب وہ وقت قریب آ رہا ہے بیٹا جب یہ ساری باتیں آپ سے آپ تیری سمجھ میں آجائیں گی اور تجھ کو خطرے میں مزا آنے لگے گا ——— کیوں ہوتی، خطرہ نہ ہوتا تو آدمی بھی ڈنگر بن جاتا ——— کھاؤ پیو اور جگالی کرو ———

جگالی کے تصور سے اس کو اپنی گائے کی بچھیا کا دھیان آگیا اور اس کی مونچھیں پھڑک اٹھیں ——— بچھیا لیتی گائے! ———

اور وہ سوچنے لگا کہ بچپن میں لڑکپن اور جوانی میں بڑھاپا پہلے ہی سے موجود رہتا ہے جیسے رات کے پیٹ میں دن اور دن کے سینے میں رات، آج میں کل اور کل میں آج، زندگی میں موت اور موت میں زندگی! ——— اللہ کی شان ہے اور اس کا رسول بھی جھوٹا نہیں [illegible] فتح محمد [illegible] سوچ رہا تھا کہ اس زندگی کے بعد بھی زندگی ہے جس طرح ان پہاڑوں سے پرے بھی پہاڑ ہیں [illegible] ابھی کل جب وہ [illegible] تو کیا معلوم کہ میں مٹی کو چاندی بنا دیکھوں گا یا نہیں۔ تو اس نے اپنی بیوی کو خواب میں دیکھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ [illegible] بات کا پتہ [illegible] بیٹے کا بال بیکا نہیں ہو گا! مجھ کو بھی تو پہلے پتہ نہ تھا کہ ماں باپ نے ——— اور جب وقت [illegible] چارپائی پر [illegible] بیٹھی تھی [illegible] جب فتح محمد [illegible] ہو رہا تھا تو وہ صندل کی طرح ہو رہا تھا۔ پھول کی طرح کھل گئی تھی اور [illegible] بچھڑنے کے بعد فتح محمد کا بڑھاپا [illegible] زور سے چارپائی پر گرا تھا کہ اس کی [illegible] کھل گئی تھی لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ ابھی اٹھ کر [illegible] سارے [illegible] پھیلی ہوئی تھی اور فتح محمد نے کہا تھا کہ [illegible] کی وہ بات [illegible] کا [illegible] ——— [illegible] اور [illegible] ہم کو بھیج [illegible] لی!

[illegible] اپنے پروں کو گرتا [illegible] لگے جیسے [illegible] کرتا تھا اور [illegible] کا سراپا بیان کرتا کبھی کبھی چکور کی آواز گنبد کی طرح [illegible] فضاؤں میں اچھالتی ہوئی سنائی دیتی اور [illegible] ہوئے [illegible] کی طرح غائب ہو جاتی۔ فتح محمد کے ذہن میں پھر اپنی بیوی کا نقش ابھرا اور پھر سارے میں [illegible] جہاں زمانہ [illegible] کھیتوں کی حد [illegible] پہاڑوں کی [illegible] فتح محمد تھا نہ فتح محمد کی بیوی، [illegible] نہ سائے، فاصلے تھے نہ [illegible] آواز تھی نہ خاموشی!

اور جانے یہ کیفیت کب تک طاری رہی اور پھر ایک جھٹکے کی آواز سنائی دی اور فتح محمد کی آنکھ کھل گئی مگر اس کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں کہاں تھا اور کہاں ہوں۔ کون ہوں کہاں ہوں؟ کہ اتنے میں ایک [illegible] اور پھر [illegible] سنائی دیا۔

اس کو دھچکا سا لگا، بہت اپنے صحیح فاصلے پر آ گئی، ہر بات واضح ہو گئی۔

کتا بھونک رہا تھا۔ گائے ڈکار رہی تھی، مرغیاں کٹ کٹا رہی تھیں اور بچھڑا ممیا رہا تھا۔ فتح محمد کے تصور میں سیاہ اور سفید دھبوں کی ایک عراقی ہولی لہرا ابھری اور بچھڑے کی آواز رات کی تاریکیوں میں ڈوب گئی اور صرف گائے کے ڈکارنے کی آواز باقی رہ گئی اور [illegible] سب آوازیں اس کے درد و کرب میں غرق ہو گئیں اور یہ جانتے ہوئے کہ میں رہین کے سب سے [illegible] جانور کا بچا نہیں کر سکتا، اس نے اپنی بندوق کے دستے پر اپنا سر مارا اور اپنی نیند کو کوسنے لگا ——— جو سوتے کھوتے۔ ایک آواز نکلی جیسے کہ ہو گیا فتح محمد! [illegible] تک یہ سپنا دیکھ رہا تھا کہ یہ گائے بن گئی ہے اور تیرے بیٹے کی ہونے والی بیوی اس کا دودھ دوہ رہی ہے۔ یہ [illegible] ہے کہنا ہی رہ گیا کہ اللہ کے بندے یہ کنڈی ٹھیک نہیں ہوا کے ہاتھ مارنے پر بھی کھل سکتی ہے، پر تیرا تو نشہ ٹوٹا جا رہا تھا جانے کے بغیر کل پہ ٹال دی بات ——— اب منہ اندھیرا بیٹھ کے:

گائے پھر ڈکاری ——— دراصل وہ مسلسل ڈکار رہی تھی لیکن اپنے خیالات میں محو بوڑھا سپاہی پل بھر کو اس کے وجود سے بے خبر ہو گیا تھا، اس کی آواز سے سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

اللہ تجھ کو صبر دے ——— اس نے گوری کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— اور پھر سوچنے لگا کہ اس بے زبان جانور نے آخر کیا قصور کیا تھا جس کی یہ سزا ہے! ——— اور جیسے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے رات کی طرف دیکھا۔ ڈھلتی رات کے اندھیروں نے اس کے ذہن کو اور بھی دھندلا دیا ——— [illegible] کی پھیلی ہوئی باہیں دھند میں لپٹے ہوئے

پہاڑوں کی چوٹیاں اور جھینگروں کی متواتر چیخ بھی یہی سوال کرتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

یہ اپنے بھید کوئی ہی جانتا ہے فتے ا —— تو کیوں اس چکر میں پڑتا ہے —— جو کام تجھ کو سونپا گیا ہے تو اسی کو نبھالے تو بہت ہے۔

چاند کسی غار میں چھپ گیا، وادی پر پہاڑوں کے سائے پھیل پڑے اور سارے منظر پر رات کا جادو موت بن کر چھا گیا —— ناگن جیسی ڈستی پھنکارتی رات، ایسی ہی رات، برسوں پہلے ایک عورت کو اٹھا کر لے گئی تھی اور اس کے نومولود بچے کو پیچھے چھوڑ گئی تھی، آج وہ رات بچے کو لے گئی تھی اور ماں کو بین کرنا چھوڑ گئی تھی۔

دوشیزے سپاہی کا منہ ہوا میں بلند ہوا اور اس کے گلے سے ایسی آواز نکلی جس طرح برسوں سے سوتی ہوئی توپ کا دہانہ جاگ اٹھے۔

سمجھ ہوں گا تجھ سے! —— اور پھر وہ بڑبڑانے لگا —— جانوروں کی معصوم بچیا اور وہ کوڑھی —— مولا تیرا انصاف سمجھ میں نہیں آتا۔

پہاڑوں کے پیچھے ایک سفید لکیر سی پھیل گئی۔ —— اور بوڑھا سوچنے لگا کہ سورج کے بیٹے کہیں ہونے ہوتے ایسا کیوں ہوا؟ مگر گاشے بدستور بین کر رہی تھی اور سپاہی اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا اور پھونک رہا تھا۔ کبھی وہ اس کی ٹانگیں چاٹنے لگتا اور کبھی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا جیسے دلاسا دے رہا ہو۔

جانوروں کو بھی تو معلوم ہوتا ہے نا —— بوڑھے نے کہا۔ یہ بھی باتیں کرتے ہیں —— سمجھ کی بات اور ہے، وہ تو آدمی بھی کبھی کبھی آدمی کی بات نہیں سمجھتا۔

گاشے کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔

صبر کر بیٹی، صبر کر —— بوڑھے نے کہا —— آدمی بھی تو آخر صبر کرتا ہے نا —— ہر آدمی آدمی ہے —— ویسے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، درد ہو گا تو رونا ضرور آئے گا۔ آدمی ہو یا جانور —— اور یہ بھی سچ ہے کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ میں بھی رویا تھا جب فتح علی کی ماں چلی گئی تھی، تو بھی رو —— اس نے گاشے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا —— اور اب ڈیوٹی!

اس نے اپنے ٹرنک کا ڈھکنا صاف کیا جس پر مٹے مٹے رنگوں میں اس کی پلٹن کا مسکوٹ، عقاب پر تول رہا تھا۔ صندوق سے اس نے گرم پٹیوں کا جوڑا نکالا اور اپنی پنڈلیاں کسنے لگا جیسے برسوں گزرے پریڈ پر جاتے ہوئے کسا کرتا تھا۔ اس کے کانوں میں بگل کی آواز گونج اٹھی۔

مگر یہ رونے کی آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ —— وہ چلتے چلتے چونک پڑا، کوئی بڑھیا بین کر رہی ہو جیسے —— مر گیا ہو جیسے کوئی کسی کا۔

اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے، اپنے خیالات میں مگن وہ کالے جنگل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب اس کے سامنے کالے بیروں کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ روایت تھی کہ بھورے ریچھ بیر کھانے کے لیے اکثر ادھر آ نکلتے ہیں۔ فتح محمد کو یقین تھا کہ ایل جی کے سپاہی نے سوزی کو ان جھاڑیوں سے ادھر نہیں جانے دیا ہوگا۔

اس نے ایک مدت ہوئی تمباکو چھوڑ دیا تھا اور جب سے اس کی سونگھنے کی طاقت بہت تیز ہو گئی تھی۔ جھاڑیوں کی جانب سے بدبو کے جھٹکے سے اس کو یقین ہو گیا کہ ریچھ کہیں نزدیک ہی ہے۔

کتا بھونکا اور اس کے ساتھ ہی جھاڑیوں میں جنبش ہوئی اور ایک بھورا تودہ لڑکھڑاتا ہوا بوڑھے کی طرف بڑھا جیسے کوئی چٹان لڑھک پڑی تھی۔

بوڑھا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ریچھ سب سے پہلے آدمی کے چہرے پر حملہ کرتا ہے کیونکہ اس کو خود اپنے چہرے سے نفرت ہے۔

موتی او موتی! ٹکٹکی باندھ کے دیکھ اپنی!

حملہ کرتے وقت ریچھ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ — شیخ محمد کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جنگلی انسان مادر زاد ننگا کھڑا ہے —

بوڑھے شکاری کی ساری نفرت بندوق کی نلکی کے پیچھے اس کی آدھ کھلی آنکھ میں سمٹ آئی اور شعلہ بن کر لپکی۔

سیسہ دشمن کی ٹھوڑی توڑتا ہوا اس کی کھوپڑی سے نکل گیا اور وہ بوڑھے سے چند گز کے فاصلے پر ڈھیر ہو گیا۔

مردود! بوڑھے نے مردہ ریچھ کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ تو سمجھتا تھا کہ میری فصلوں میں بھنگڑا ناچ کر تو بچ نکلے گا — اور پھر موتی سے مخاطب ہو کر — تیرا بھی بدلہ لے لیا بیٹا، اب تو خوش ہے نا — چل اب اس کی ریچھنی کو ڈھونڈیں۔ اس وادی کے اس طرف جو پہاڑ ہے اُدھر چلتا ہے۔ — یہ حرامی اُدھر ہی سے آتے ہیں، خانہ خراب!

کتا چلتے چلتے رُک گیا، زمین کو سونگھنے لگا اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

کیوں موتی مل گیا کھوج! شاباش، اب زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔

دفعتاً ایک پہاڑی کے موڑ پر اسے آبشار کا شور سنائی دیا — سن رہا ہے نا موتی — یہیں آتا ہو گا وہ حرامی پانی پینے کے لیے — کمینہ، رذیل، چھپ کر حملہ کرتا ہے سفلہ — پر تجھ کو تو معلوم ہی ہے، تیری برادری سے تو اس کی پرانی دشمنی ہے — تیار ہو جا اب!

یکایک اس کا چہرہ بھیگ گیا اور وہ سمجھ گیا کہ آبشار آ گیا۔

پگھلی چاندی کی ایک چادر پہاڑ کے اوپر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے اوپر رنگوں کی پھوار اڑ رہی تھی۔ بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کی اس پھوار کو پکڑنا چاہا اور اپنی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ پھوار سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اسی کا جزو ہوں، میں بھی پھوار ہوں اور یہ ساری دنیا رنگوں کا کھیل ہے جس کی حقیقت صرف روشنی ہے۔

گڈریے اس آبشار کو پریوں کا جھرنا بھی کہتے تھے، اس کا پانی اوپر سے گرتا اور تھوڑی دور زمین کے متوازی بہتا ہوا یکایک غائب ہو رہا تھا۔ یہاں زمین کی سطح پر کچھ ایسے سوراخ تھے کہ پانی کے اوپر غبار سے تیرتے ہوئے نظر آتے اور چھوٹی بڑی گھنٹیاں بجتی رہتیں۔ مشہور تھا کہ ان بلبلوں پر پریاں ناچتی ہیں۔ ان کی پازیبوں کی صدا بے خبر سیاحوں کو ادھر کھینچ لاتی ہے اور جب وہ پاؤں دھونے کے لیے پانی میں اترتے ہیں تو پریاں انھیں نیچے کھینچ لیتی ہیں۔

جل ترنگ کی آواز سے بوڑھے کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

سُنا تو نے مرتی! کہتے ہیں پریاں رہتی ہیں اس جھاگ میں — اور یہ پھوار ان کی اوڑھنیوں کے رنگ ہیں — پریاں! —— وہ ہنسا —— یہ سب ڈھکوسلے ہیں میرے یار —— ہاں باجہ ضرور بج رہا ہے —— روٹ مارچ ہوا کرتا تھا جیسے۔

کسی کُتے کی چیخ سے مارچ کا نغمہ سیاپلٹن کی طرح بکھر گیا۔ تھکا ہوا کتا جو ابھی ابھی پانی پینے کے لیے بڑھا تھا اپنے مالک کے دیکھتے دیکھتے کہیں غائب ہو گیا۔

پہلے بھتیجا پھر بچیا اور اب تو —— کون جانے —— بڈھے نے کہا —— آج تری ٹھیک ہی کہتے ہوں —— خیر —— تیرا میرا یہیں تک کا ساتھ تھا —— کیا سمجھا —— جیسے فوج کے سپاہی، کوئی کہاں کا کوئی کہاں کا۔ کام ختم اور پھر رخصت —— پر تیرا کام تو ابھی باقی ہے فتح محمد —— جب تک وہ کوڑھی زندہ ہے تجھ کو چھٹی نہیں مل سکتی —— پر مرتی یار! یہ اچھا نہیں کیا تو نے —— اچھا آدمی اب اکیلا ہی دو دو ہاتھ کرے گا چیتے سے —— ایک بار آجائے سامنے —— چیر ڈالا —— ایک ایک ہڈی نہ الگ کر ڈالی بچیا کی تو مونچھیں منڈوا دوں گا۔

اس نے ماحول کا جائزہ لیا، کچھ عجیب پُراسرار چٹانیں تھیں جن پر سبزے کا نشان تک نہیں تھا اور ابھی ابھی وہ ایسے سبزہ زار سے گزر کر آیا تھا کہ زمین نظر نہیں آتی تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ یہ کوئی دوسرا ہی ملک ہے، اور یہ کہیں کہیں برف کی چٹانیں یوں چمک رہی تھیں جیسے کسی نے انھیں خاص طور پر کاٹ کر وہاں لگا دیا تھا۔

ہر قدم پر وہاں طلسمات کا عالم تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی دنیا ہے۔ سفید پتھر کی سلوں سے پانی کے جھرنے پر رہے تھے جیسے اس کی گائے کے تھنوں سے دودھ کی دھاریں بہا کرتی تھیں۔

گائے کے تصور سے اس کو پھر بچیا یاد آ گئی۔

شفقی! تجھ کو اس معصوم پر بھی رحم نہ آیا —— جڑوں سے ناخن نہ نکال دیے تیرے تو فتے کو باپ نہ کہیو —— جبڑا چیر کر رکھ دوں گا خدا کی قسم —— ایک ذرا سامنے آ جا۔

آگے چل کر پہاڑوں کے اندر ستون بنے ہوئے نظر آئے۔ کچھ نیچے سے اوپر جاتے ہوئے جیسے چھت کو اٹھانے کے لیے بڑھ رہے ہیں اور کچھ اوپر سے نیچے آتے ہوئے جیسے فرش کو سہارا دینے کے لیے —— اور ان کے پیچھے روشنیاں جھلملا رہی تھیں، وادیاں تھیں، دھند تیر رہی تھی اور ہوا بانسری بجا رہی تھی۔

آج تو کس دنیا میں آ نکلا بندے؟ آنا ہی تھا تو ادھر تو چالیس برس پہلے آیا ہوتا۔ یہاں تو میں بھی مان لوں کہ پریاں رہتی ہیں اور چالیس برس پہلے تو ہر جوان عورت پری لگتی ہے یارے —— فتح محی کی ماں ساتھ ہوتی اور یہیں کسی غار میں ڈیرہ ہو جاتا تو یہی پرستان تھا۔

یکایک اس کا پاؤں کسی چیز سے پھسلا۔

انتڑیوں کا ڈھیر اور کھال کا ایک ٹکڑا۔

کھال سفید تھی۔

بوڑھے کے چہرے پر درشتی چھا گئی جیسے ان حسین پہاڑوں اور غاروں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ان کے بجائے بنجر پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔

نہیں ہونا چاہیے اس ظالم کے بچے کو ـــــ اس نے آہستہ سے کہا جیسے اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا ـــــ اور پھر وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا جیسے جنگ میں شبخون مارنے کے موقعوں پر۔

دفعتاً اس کی نظر پڑی ایک چٹان کے قدموں میں گڑ گئیں۔ اس نے اپنا سانس روک لیا ـــــ اور پھر پہاڑوں اور وادیوں میں ایک للکار گونجی۔

نکل کوڑھی! تیری موت کا وقت آپہنچا۔

چٹان کے سائے میں سوتا ہوا چیتا چونک پڑا۔ لیکن اس کے پیچھے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ آگے کو بڑھا۔

بوڑھے سپاہی کی آنکھ شست کے پیچھے پہنچ گئی۔

چیتا اچھلا ـــــ بوڑھے کی انگلی لبلبی پر سخت ہو گئی اور بندوق کا گھوڑا آہستہ سے کارتوس کی ٹوپی پر گرا ـــــ لیکن کارتوس پرانا تھا ـــــ اور فائر کی آواز کے بجائے صرف چیتے کی غراہٹ سنائی دی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا ـــــ ایک چنگھاڑ گونجا اور ایک آدمی ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔

یکایک بوڑھے نے اپنا بازو درندے کے منہ میں ٹھونس دیا ـــــ اس کا دوسرا ہاتھ اپنے شکاری چاقو کی طرف بڑھا اور چاقو بار بار چیتے کے پیٹ میں اترنے لگا۔

بوڑھے کا خیال تھا کہ چیتے کے منہ میں ہاتھ ڈالنے سے موذی کا سانس رک جائے گا لیکن چیتے کے دانت دور تک اس کی کہنی تک اتر گئے ـــــ کہنی کے اس طرف بازو تھا اور اس طرف درد کی لہر۔

دفعتاً اس کو اپنی حالت کا احساس ہوا اور کوئی نامعلوم طاقت اس کو اپنے اندر ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے حلق سے پھر وہی نعرہ بلند ہوا جس سے میدانِ جنگ میں دشمنوں پر ہیبت طاری ہو جایا کرتی تھی اور شکست فتح میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

"یا علی ـــــ!"

آسمان کے گنبدوں، پہاڑوں کی چوٹیوں، آبشار کی لہروں، غاروں کی گہرائیوں ـــــ بلندیوں، نشیبوں، وادیوں، میدانوں سے گونجتی ہوئی، مردِ کے سینے کی یہ پکار سارے میں پھیل گئی۔

نعرے کے ریلے نے چیتے کو جیسے پرے پھینک دیا اور جس طرح ماہر پہلوان اکھاڑے میں غیر متوقع طور پر اوپر آ جاتا ہے، چیتا نیچے تھا اور بوڑھا اوپر۔

اس کا چاقو والا ہاتھ پھر بلند ہوا۔

مردود!

لعین!

کوڑھی!

لیکن اس کا دوسرا ہاتھ اب تک چیتے کے منہ میں تھا ـــــ چیتے نے یکایک موت کی جھرجھری لی اور ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کا منہ کھل گیا۔

بوڑھے نے اپنا بازو کھینچنا چاہا لیکن درد کا ایک ریلا آیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

[illegible] بعد جب کوہ پیماؤں کی ایک جماعت اُدھر سے گزری تو انھوں نے دیکھا کہ برف کے نیچے دو چیتے پڑے ہیں ——— !

ان میں سے ایک نے جو بے شمار جنگلی جانوروں کا شکار کر چکا تھا کہا کہ اتنا بڑا درندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اور اتنا بہادر انسان! ——— اس کے دوسرے ساتھی نے کہا، جس کے بال برف کی طرح سفید تھے اور جو اس بات کی تحقیق کر رہا تھا کہ انسان کی قوتِ برداشت کی حد کیا ہے ——— کائنات میں آدمی کا کیا مقام ہے؟

